

خودنوشت سوانح عمری

شاه محمد عبده
رحمۃ اللہ علیہ

شیخ محمد عبداللہ

آتشِ چنار

ایک آپ بیتی

پبلشرز

علی محمد اینڈ سَنز سِریٹگو۔ کشمیر

© مجملہ حقوق مصنف کے قانونی وارثوں کے حق میں محفوظ۔ کتب کے اقتباسات یا اُن کے ترجموں کی اشاعت اور نقل یا نشر کا ہوں سے اُن کا استعمال قانونی وارثوں کی اجازت کے بغیر کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی تصور ہوں گے۔

- طابع و ناشر : علی محمد اینڈ سَنز - سریٹگو کشمیر۔
- مطبع : ہے۔ کے آفٹ ہرنلز - جامع مسجد دہلی - ۶
- پہلا ایڈیشن : ۱۹۸۷ء
- قیمت : ۱۲۵/- روپے

یہ کتاب ”ساج کپنی“ ترکمان گیٹ۔ دہلی سے بھی مل سکتی ہے۔

انتساب

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے اُس جاں بہ لب سرفروش کے نام جس نے شہادت سے پہلے آخری ہنسی لیتے ہوئے راقم سے کہا تھا۔

”شیخ صاحب! ہم اپنا فرض ادا کر چکے..... آگے آپ کی ذمہ داری ہے..... قوم سے کہیے کہ اپنا فرض..... نہ بھولے!“

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے غلم اور بکلیں اُس عشاق کے تقاضے

شیخ محمد عبداللہ

سرینگر، ۱۶ اگست ۱۹۸۲ء

کشمیر جسے روحانی خوبیوں سے تو تیز کیا جا سکتا ہے.....
..... مگر بہ زورِ شمیر..... ہرگز نہیں۔

”کھن پڈت“ (راج تنگی، ۲۱۱۳۹)

”کرتل مچھڑم پتہ گروم در آؤ“

(میں نے تلوار کو توڑ کر اُس سے در آتی ڈھال لی)

نندو ریشی (وفات: ۱۳۳۹ء)

جس خاک کے ضمیر میں ہوا تشبہا پناہ
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجبند

اقبال

(۱۸۶۶ء - ۱۹۳۸ء)

۱۰۰

۱	پیش گفتار	۱	پیش گفتار
۲	پیش لفظ	۲	پیش لفظ
۳	پہلی بات	۳	پہلی بات
۴	(ب) باب اول	۴	(ب) باب اول
۵	باب (۲)	۵	باب (۲)
۶	باب (۳)	۶	باب (۳)
۷	باب (۴)	۷	باب (۴)
۸	باب (۵)	۸	باب (۵)
۹	باب (۶)	۹	باب (۶)
۱۰	باب (۷)	۱۰	باب (۷)
۱۱	باب (۸)	۱۱	باب (۸)
۱۲	باب (۹)	۱۲	باب (۹)
۱۳	باب (۱۰)	۱۳	باب (۱۰)
۱۴	باب (۱۱)	۱۴	باب (۱۱)

کثیر جے روحانی خوبیوں سے تو تیز کیا جا سکتا ہے....
.... مگر بہ زور شمشیر..... ہرگز نہیں۔

کلمہ "میدت" "راج ترنگی" (۲۱۳۹)

”کہ قتلہ مجھ پر ہو گا مگر میں در آؤں“

(میں نے تلوار کو توڑ کر اُس سے درانتی ڈھال لی)

نمده ریشی، وفات: ۱۳۳۹

جس خاک کے ضمیر میں ہوا تشبہ چھنار

ممكن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

اقبال

(P19FA-1A66)

باب (۳۲)	افراد اور اقوام	۳۳۶
باب (۳۳)	دکشمیر، چھوڑ دو	۳۵۶
باب (۳۴)	اسیری کے کوائف	۳۷۲
باب (۳۵)	طوفان سے پہلے	۳۹۰
باب (۳۶)	دردن خانہ ہنگامے تھے کیا کیا	۴۰۲
باب (۳۷)	آگ، خون اور روشنی	۴۲۰
باب (۳۸)	آمدنی میں چراغ	۴۳۰
باب (۳۹)	لڑشیں اور نوزشیں	۴۴۷
باب (۴۰)	میدان جنگ کی گھن گرج	۴۵۵
باب (۴۱)	پہلی عوامی کابینہ	۴۶۱
باب (۴۲)	ایک طالع آزمائے کے مرتب	۴۶۸
باب (۴۳)	اقوام متحدہ - بڑی طاقتوں کی شرط	۴۷۷
باب (۴۴)	انقلاب آفرین اقدامات	۴۸۹
باب (۴۵)	سازشوں کے سائے	۵۰۳
باب (۴۶)	دفعہ ۳۷۰ کا طلوع	۵۲۰
باب (۴۷)	آئین ساز اسمبلی	۵۳۳
باب (۴۸)	سبھی اپنے تھے جن کے ہاتھ پر تہمتیں لگے تھے	۵۵۳
باب (۴۹)	ہاں، جرم وفادار کیجئے کس کس پر ہوشیاری	۵۷۲
باب (۵۰)	دفا بازی کے ذخیرے	۵۸۳
باب (۵۱)	قویٰ نرسے کی رات	۵۹۳

۶۰۳	جس کے چھوڑ کے سے	باب (۵۲)
۶۲۳	در آباد، کشمیر، مہاراجہ	باب (۵۳)
۶۳۵	بخشی بڑا درس کارپوریشن	باب (۵۴)
۶۴۷	اسیر بے قصیر	باب (۵۵)
۶۶۶	موسیٰ دیکھو کشمیر میں	باب (۵۶)
۶۷۷	ظالموں کے چٹکے چھوڑ گئے	باب (۵۷)
۶۹۲	تقسیماتی اور مجنوں کی فوجداری کا	باب (۵۸)
۷۰۰	حضرت بن قتل کیس	باب (۵۹)
۷۱۱	مقدمہ سازشیں	باب (۶۰)
۷۳۳	جوشنا نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا	باب (۶۱)
۷۴۶ بدلا ہوا زمانہ تھا	باب (۶۲)
۷۵۸	گلا کی اذان اور مچا ہد کی اذان اور	باب (۶۳)
۷۷۱	جواہر لال کے ساتھ آفریں طاقتات	باب (۶۴)
۷۷۹ ٹوٹی کہاں کند!	باب (۶۵)
۷۹۰	فریضہ حج اور بیرونی ممالک کی سیر	باب (۶۶)
۸۰۹	جلا وطنی کی صعوبتیں	باب (۶۷)
۸۱۶ اور جاؤ گت ہار گیا	باب (۶۸)
۸۲۷	کشیہ کارڈ - حکمت عملی کی تبدیلی	باب (۶۹)
۸۳۹ وہ اپنی ٹونہ بدلیں گے	باب (۷۰)
۸۶۰	دھماکے شبنم	باب (۷۱)

باب (۶۳) جنتا کی یلغار پسپا ہوگئی
باب (۶۴) آن برہمن زادگان زندہ دیں !

(ج) نصیحت جات

۱) قومیتوں کا حق خود ارادیت
۲) کشمیر جدید کی جانب
۳) پیغام اور پروگرام
۴) میرا پیغام اور ہے !

پیش گفتار

میرے نامور شوہر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم و معذور نے اپنے آخری برسوں میں اپنی ہنگامہ خیز زندگی کی رونما و قلم بند کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اور جس وقت انھیں اپنے معبود کا بلاوا آگیا۔ اس سے چند یوم پہلے تک وہ اس کے آخری صفحات لکھوا رہے تھے۔ وہ اس سرگذشت کی اشاعت کو اپنی قوم کے متین اپنی ایک اور ذمہ داری سے شبک دوشی خیال کرتے تھے۔ جس قوم کے لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کی تھی اور اپنی عمر کا بہترین حصہ جیل خانوں اور جلاوطنی کی آزمائشوں میں بسر کیا تھا۔ انھوں نے ہر دسمبر ۱۹۵۷ء یعنی اپنی ششترویں سالگرہ کا دن اس کی تدفین کے لیے مقرر کر دیا تھا اور اسی حساب سے کتاب کی خطاطی وغیرہ کے مراحل طے کیے جا رہے تھے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور وہ ۸ ستمبر ۱۹۵۷ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اُن کا سانحہ ارتحال پوری قوم کے ساتھ ساتھ ہم سب کے لیے اس قدر ہوشربا تھا کہ کچھ مدت تک میں اپنی مدد و تہجد ہی نہیں رہی۔ اس کتاب کی اشاعت کی طرف سے قوتہ نہیں کی جا سکی۔ یہ مسودہ شیر کشمیر کی رحلت کے وقت عزیز محمد یوسف شینگ

پ
کی تحویل میں تھا۔ جو سرگذشت کی تحریر میں مرحوم رہنما کا ہاتھ بٹاتے آئے تھے۔
آنکھوں نے شیر کشمیر کی وفات حسرت آیات کے دوسرے تیسرے ہی روز یہ امانت
میرے حملے کی۔ اس میں اکثر حصہ کتابت شدہ تھا اور صحت چند ابواب کی کتابت
باقی تھی۔ سارا مسودہ کتابت اور غیر کتابت شدہ ہم سب کے سامنے شیر کشمیر کی
نظر سے گذر چکا تھا اور وہ آسے شرف منظوری عطا فرما چکے تھے۔ چنانچہ میں نے
اسے ایک متابع عزیز کی طرح سنبھالے رکھا۔ پھر حالات نے جو عجیب کر دئییں۔
وہ تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان کی وجہ سے کتابت کی اشاعت میں تاخیر ہوئی گئی۔
اس دوران بہت سے کرم فرماؤں نے اپنی عادت کے مطابق طرح طرح کی قیاس
آرائیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے۔ اس دستاویز کی
قوی اور تاریخی اہمیت و افادیت کے پیش نظر کسی حد تک یہ بات ناگزیر بھی تھی۔
بہر حال ان سب حاشیہ آرائیوں کا مسکیت جواب کتاب کی اشاعت ہی تھی۔
چنانچہ ضروری مراحل پورا کرنے کے بعد اب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہے
الحمد للہ۔

ہماری خواہش تھی کہ کتاب بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہو لیکن
انگریزی ترجمے میں کچھ دشواریاں حاصل ہوتی گئیں۔ ادھر موت و حیات کے پورا سارا
معاملے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اور ان کے بارے میں پیش قیاسی نہیں کی
جاسکتی۔ اس لیے میں یہ اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ اپنے مترجم اور قوم کے سردار
کی اس امانت کو جلد از جلد قوم اور آنے والی نسلوں کے سپرد کر کے اپنا وہ فرائض
خداوندی انجام دوں جو ان کی رفیقہ حیات ہونے کی حیثیت سے میرے ذمے
واجب الادا ہے۔

میں یہ بات پورے دھوکے سے کہنا چاہتی ہوں کہ اس کتاب کو بالکل اسی
صورت اور انہی الفاظ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ جن کی میرے مرحوم شوہر نے
منظوری دی تھی اور جو ہمارے پاس مقدس امانت کی طرح محفوظ رہی۔ جیسا کہ
سارا زمانہ جانتا ہے کہ وہ بے حد جوشی، راست باز اور بے باک شخصیت کے مالک
تھے۔ وہ اقبال کے اس قول کے قائل تھے ع

”کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق“

آنکھوں نے اس کتاب میں بھی اپنا یہ شہرہ پوری شان کے ساتھ نبھایا ہے
اور واقعات و شخصیات کے بارے میں اپنی رائے صاف الفاظ اور دو ٹوک
لہجے میں بیان کی ہے۔ یہ آمار خود ان کی تاریخ ساز زندگی کی طرح متنازعہ و غیر
CONTROVERSIAL ہو سکتی ہیں۔ مگر اس بارے میں کسی شک و شبہ
کی گنجائش نہیں کہ یہ شیر کشمیر کے خیالات و نظریات کا آئینہ ہیں اور انکھوں نے
انہیں لفظ بلفظ اسی صورت میں شائع کرنے کی منظوری عطا فرمائی تھی جس
کے متن کے ساتھ کسی قسم کی چھڑچھاڑ ایک بدترین خیانت کا ارتکاب کرنے
کے مترادف ہوتی۔ جس کا راقم الحروف اور شیر کشمیر کے قومی جانشین ڈاکٹر
فاروق عبداللہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا شیر کشمیر کی دلاویز یاد
کے ساتھ ساتھ ایک عظیم مرتبہ کی قومی امانت میں تحریک کرنے کا گناہ کبیرہ
بھی ہوتا۔

شیر کشمیر نے ان یادداشتوں میں کتنی صداقت شعاری سے کام لیا ہے۔
اس کا ایک اندازہ کرنے کے لیے صحت اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے
کہ ۱۹۴۷ء میں ان کی زندگی کی ایک بڑی آزمائش میں ان کے سیاسی حریفوں

ٹ ڈاکٹر کرن سنگھ اور سید میر قاسم نے حال ہی میں اپنی جو سرگزشتیں شائع کی ہیں۔
 ان میں شیر کشمیر کے VERSION کی بڑی حد تک تائید کی گئی ہے۔

میں اپنی دختر فخرتیا جان اور فرزند شہزی ڈاکٹر محمد علی متوکی بے حد ممنون ہوں
 کہ انھوں نے کتاب کے مسودے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت
 میں تھیل کروانے میں گہری دلچسپی لی۔ عزیزم شیخ تنذیر احمد نے تصاویر کے
 انتخاب وغیرہ میں بڑی محنت کی۔ محمد یوسف ٹینگ صاحب کا شکریہ ادا کرنا بہت
 ضروری ہے۔ انھوں نے بسیار مشکلات کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ بڑی عرق
 ریزی سے کام لیا اور اپنے آپ کو اس اعتماد کے اہل ثابت کیا جو بابائے قوم نے
 انھیں اس قومی فریضے کے لیے چن کر ان پر کیا تھا۔

اس کتاب کی اشاعت سے میں ایک بہت بڑے بوجھ کو اتارنے کی
 بھرپور انگیزہ کیفیت محسوس کرتی ہوں۔ اور اب عاقبت میں اپنے باوقار شوہر کے ساتھ
 کسی شرمندگی کے بغیر آنکھیں چار کر سکونگی۔ انشاء اللہ۔

بابائے قوم نے یہ کتاب بڑی دلسوزی اور دردمندی سے قلم بند کی ہے۔
 اس لیے مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری آئندہ نسلوں کے لیے علامہ اقبال کے اس
 شعر کے مصداق ثابت ہوگی۔

اندھیری شب ہے تجھ اپنے قافلے سے ہے تو
 تیرے لیے ہے میرا شعلہ نوا قندیل

سالون ہائیش

سرینگر
 ۱۰ نومبر ۱۹۸۵ء

دیکھ کر جہاں شیخ محمد عبداللہ



ڈاکٹر کرن سنگھ اور سید میر قاسم نے اپنی جو سرگزشتیں شائع کی ہیں۔
 ان میں شیر کشمیر کے VERSION کی بڑی حد تک تائید کی گئی ہے۔

راولپنڈی ۱۹۴۷ء میں صدر ریورسہ خان پشیمان صاحبہ کی گرامر سکول کے ساتھ فوٹو گریہ کر رہے ہیں



قوام متحدہ کے خزانہ دار سر ارون ڈیکسن کے ساتھ

پیش لفظ

جن لوگوں نے شیخ محمد عبداللہ کو ان کے آخری دنوں میں دیکھا۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ تقریباً گھوڑے کی زین پر سوار رہتے ہوئے اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ استعارے کے مطابق اپنی آخری سانس تک زندہ بکتر پہنے رزم گاہ و جدوجہد میں مصروف آرا تھے۔ اور ایک اور بڑے معرکے کے لیے جت لگانے کے لیے پھر پھر تیار رہتے تھے۔ لیکن اہل سے کس کو مفر ہے؟ وہ بھی رزم خیر و شر میں تقریباً دوا و شجاعت دیتے ہوئے کام آئے۔ ان کی وفات سے کچھ ہی عرصے قبل دہلی سے شائع ہونے والے ایک انگریزی اخبار نے لکھا:

”شیخ عبداللہ جوں جوں بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں، وہ چنار کے

درخت کی مانند نظر آتے ہیں۔ جس کے سر پر برن کا تاج سجا ہوا ہو۔“

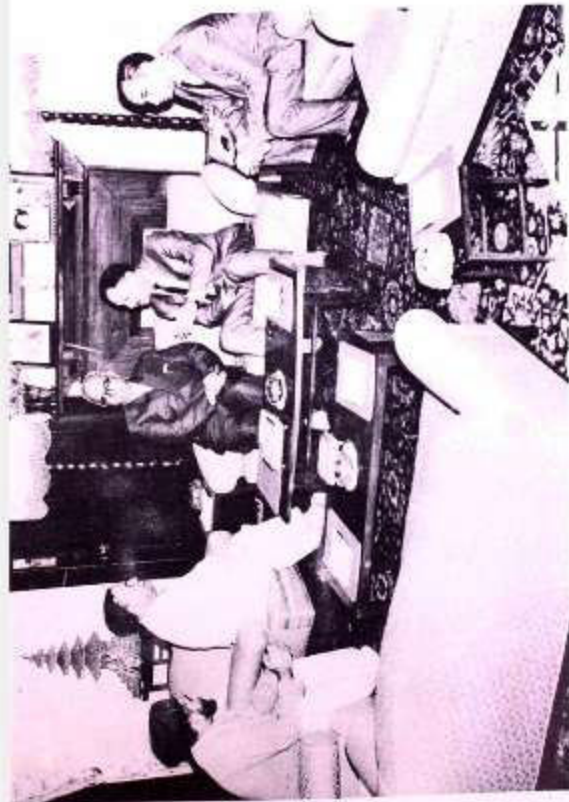
اپنے دوسرے معرکوں کی طرح وہ آخری وقت تک اپنی اس سرگذشت

پر کام کر رہے تھے۔ میری آن سے آخری ملاقات اگست ۱۹۷۷ء کے تیسرے

ہفتے میں ان کی خواب گاہ میں ہوئی اور اُس دن بھی وہ اپنی تیزی سے بگڑتی

ہوئی صحت اور نقاہت کے باوجود کتاب کا اختتامی باب EPILOGUE لکھواتے

رہے۔ وہ اپنے بستر پر کیے سے ٹیک لگاتے نیم دراتے تھے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں



راولپنڈی ۱۹۶۸ء: صدر الباقی خاں اور وزیر خزانہ مفتاحی بھٹو کے ساتھ ایک ملاقات۔

ایک معویہ جنگ سورما کی سی دل دہلا دینے والی چمک تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بڑھا شیر اپنے قنیادی حینادوں کی طرح قانون قدرت کا ٹیکہ توڑ کر میدانِ عمل میں آخری بار چھپنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد اُن کے شہپر قضا کے ہاتھوں میں آگئے اور پھر انہیں اس باب کو مروجہ صورت میں قلم بند دیکھ کر منظور کرنے کی جہالت ہی نہیں ملی جٹ۔

نہ ہے زمان نہ مکان الا لاہ الا اللہ

یہ سلسلہ بات سے کہ میں مولانا آزاد روڈ والی کوٹھی میں اُن سے ملنے گیا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور سورج ڈھلنے کا وقت، شیخ صاحب اپنے دلکش چین زار میں تشریف فرما تھے۔ اُس وقت اُن کا مزاج معمول سے زیادہ ہی شگفتہ تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اپنے دل میں مدتوں سے چلنے والی ایک آرزو کو ڈرتے ڈرتے زبان پر لانے کی جرأت کی۔

”شیخ صاحب۔ خدا آپ کا سایہ تمہا قوم پر بہت دیر تک قائم رکھے۔

لیکن میری حقیر رائے میں آپ پر آئندہ نسلوں کا ایک قرض باقی ہے“

شیخ صاحب نے اپنا بلند ہتھکڑ لگا کر میری بات کا ٹی ”ساری عمر تو قرض ادا کرتے ہی گذاردی۔ اب تم مجھے پھر بقیہ ادا کروں میں شائل کر رہے ہو۔ بولو کیسا قرض ہے؟“

میں نے اپنا سارا حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا ”آپ کو اپنی شاندار زندگی کی سرگزشت قلم بند کرنی چاہیے..... ہماری تحریک اور تاریخ کو اس کے بانی اور سالار کارواں کی زندگی میں ہی سرحد کے آس پار اور اس پار مسخ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں..... فضل ایزدی سے تحریک کے

رہنمائے اعظم اور دامائے راز کی حیثیت سے آپ اس سرگزشت کو اصل ناظر میں پیش کر چکے ہیں یہ آپ کے دوسرے تاریخ ساز کارناموں سے زیادہ آئندہ نسلوں کے لیے فیضان کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔“

شیخ صاحب اپنے وجہ چہرے کو اپنی پتیلی سے سہارا دیئے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں جو مجھے نیلی لگتی تھیں، مجھے بڑی تمکنت سے تاک رہی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی اور میں موموم اندیشوں میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں میں نے کوئی بے ادبی تو نہیں کی ہے؟ اُن کے چہرے پر اُن کی دلتواؤں مسکراہٹ جیسے سیٹ کردہ گئی اور غور و فکر کے آئندہ دہانہ ہونے لگے۔ کچھ تانیوں کے لیے، جو مجھے شب بھر کی طرح بہت طویل لگے وہ بڑی آہستگی اور نرمی سے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگے:

”اس میں میرے ساتھ محنت کون کرے گا..... یہ بڑی مشقت

کا کام ہے۔“

میری جان میں جان آئی اور جرأت کر کے جواب دیا۔

”اگر مجھے کسی قابل سمجھن تو میں اسے اپنی سعادت مندی سمجھوں گا۔“

شیخ صاحب کے ہونٹوں پر پھر ہنس کی روپوشی کرانِ طلوع ہو گئی۔ آنکھوں نے مجھے جواب دینے کی بجائے زرا دور مٹھی ہوئی اپنی صاحب زادی ثریا جان کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اُن سے کہا۔

”وہ نیلے چلے جلدی دو نوٹ یک تمہارے پاس ہیں انہیں لے آؤ۔“

ثریا جان نے جواب دیا۔ ”دونوں سی۔ وہ دہلی والی؟“

شیخ صاحب نے جواب دیا۔ ”ہاں وہی۔ وہی۔“ ثریا جان اندر چلی گئیں

اور جب اُن کے آنے میں کچھ دیر ہو گئی تو کہنے لگے "شاید وہ بھی کھو گئی ہیں۔"
انالٹھ....."

اتنے میں شریا جی نوٹ بک لے کر آئیں۔ شیخ صاحب نے انہیں کھولنے کے بغیر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "انہیں دیکھ لو..... یہ میں نے کوئلہ دی ہیں میں نظر بندی کے زمانے میں بکھرائی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بتا دینا کہ تمہاری کیا رائے ہو؟ مجھے جیسے ایک گنج بے بہا مل گیا تھا میں سیدھے گھر گیا۔ ان کی دوق کروائی صبح تک کرتا رہا اور پھر سویرے اُن سے ملنے گیا۔ جب انہوں نے استفسار کیا تو میں نے اُن سے عرض کی کہ "یہ تو بہت اچھی ہے....." البتہ کہیں کہیں تاریخوں، سنتوں وغیرہ کی غلطیاں بھی رو گئی ہیں۔" میں نے چند غلطیوں کی نشان دہی بھی کی۔ وہ ہمیشہ صحیح بات چاہے وہ جھوٹا آدمی بھی کرے مان لیتے تھے۔ اپنی اس معقول روش کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے گئے۔

"بھئی۔ میری زندگی اتنے طوفانوں اور تحزروں سے گذری ہے....

ساری چیزیں کہاں سے یاد رہیں گی اور پھر بات میں سے بات نکلتی

ہے..... اب اس عمر میں تو حافظہ بھی ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔"

میں نے عرض کی کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ آپ اپنے تاثرات

کرواتے جائیں۔ تاریخوں اور ناموں وغیرہ کے حوالے ڈھونڈنا ایک منتشی کا

کام ہے..... یہ میں کروں گا۔"

بات میرے دل سے نکلی تھی اس لیے مستعجاب ہو گئی۔ دوسرے دن اتوار تھا

شیخ صاحب نے مجھے آئے کو کہا، آس دن ہم دن بھر کام کرتے رہے اور انہوں

نے مجھے ازراہ شفقت اپنے ساتھ بیچ میں بھی شریک ہونے کا اعزاز بخشا۔ دو

تین دن کے بعد جب میں اُن اور اق کو صاف کر کے اُن کے پاس لے گیا۔ تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق انہیں بڑے غور سے پڑھا۔ جس وقت وہ پڑھ رہے تھے۔ میں اس عظیم شخصیت کے پُر حلال چہرے کے آثار پڑھاؤ کا مشاہدہ جائزہ لے رہا تھا۔ جس کی جھڑیلوں میں ہماری تاریخ اور تقدیر کے کتنے ہی اسرار و رموز چھپے ہوئے تھے۔ اور ایک طالب علم کی گھبراہٹ کے ساتھ امتحان کا نتیجہ سننے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پڑھ کر فارغ ہوئے۔ اپنا چشمہ اتارا اور ازراہ کرم فرمایا۔

"مجھے لگتا ہے کہ جس آدمی کی مجھے تلاش تھی۔ وہ تم ہی ہو۔ تم نے اچھی

کوشش کی ہے۔ اب اس سلسلے کو آگے بڑھانا ہوگا۔ لیکن بات یاد

رکھنا کہ میں بہت سے مخصوص میں مشغول رہتا ہوں۔ تم پیچھا کرو گے۔

تبھی یہ کام پورا ہو سکے گا..... اگر کسی وقت میں نے جلدی میں

تعمین جھڑک بھی دیا تو حوصلہ نہ ہارنا..... آج سے میرے گھر کے

دروازے صبح و شام تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔"

وہ اپنا قول نبھاتے رہے اور بعض اوقات خودی معروضیات کو چھوڑ کر اور اہم

شخصیات کو ٹال کر میرے ساتھ نکل جاتے وہ کہتے کہ گھر میں رہے تو یہاں کچھ بھی

نہ کرنے دیں گے.... مجھے یاد ہے کہ انہوں نے ایک شام مجھے گل اتوار کو صبح

مشیک نو بجے آنے کے لیے کہا تھا۔ میں اپنے تسلی کی وجہ سے زرا دیر سے پہنچا

اور پانچ دس منٹ تک باغ میں انتظار کرتا رہا تاکہ میری تاخیر اس میں ٹھپ

جائے۔ شیخ صاحب کچھ دیر کے بعد نیلے کو اُن کے ماتھے پر بل تھے۔ وہ زرا سختی

سے بولے "تم تو نیچے کیوں نہیں آئے؟"

میں نے ڈر کے مارے چالاک سے کام لینا چاہا۔ جناب میں تو نوکری پانچ منٹ پہنچ گیا تھا۔

شیخ صاحب ایک مستمطر لطفانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے ”دیکھو میں اپنی خوب گاہ کی کونکلی سے بارغ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ تم ساڑھے نو بجے کے بعد آئے۔“

بہر کیف ہم ان کی رہائش گاہ کے علاوہ چشمہ شاہی گیسٹ ہاؤس اور داچی گام بھی جا کر کام کرتے رہے۔ اور جائزوں میں جتوں میں ان کی سرکاری رہائش گاہ کے علاوہ ایک دن بارغ باہر کے بنگلے میں بھی مصروف رہے۔ وہ ڈکٹیشن دیتے اور پھر باب ختم ہونے کے بعد مجھے وہیں پڑھنے کے لیے کہتے۔ اُس وقت بھی وہ کچھ جملے وغیرہ تبدیل کروا لیتے۔ پھر دوسری نشست میں صاف کیے ہوئے باب ان کو دکھاتا۔ وہ اُس کا غور سے ملاحظہ کرتے اور بعض اوقات جملوں پر ہی نہیں الگ الگ الفاظ پر بھی بحث کرتے تھے۔ وہ بڑے سخت HARD TASK MASTER تھے۔ چنانچہ ایک دن جب ”یار پرستی“ اور ”احباب نوازی“ کی ترکیبات پر بڑی دیر تک بحث ہوئی تو میرے کمزور اعصاب ایک لمحے کے لیے جواب دینے لگے اور میں نے رنج ہو کر کہا،

”جناب۔ یہ الفاظ تو ہم معنی ہیں۔“

کہنے لگے۔ ”نہیں۔ ہر لفظ کا اپنا محل اور مقام استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے زبانوں میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں۔ ورنہ کسی خاص چیز یا کیفیت کے لیے ایک ہی لفظ ہوتا۔۔۔۔۔ لفظ کا موزون استعمال ہی سب کچھ ہے۔“

میں یہ سن کر ستائے میں آ گیا۔ وہ ایک شاعر کی سی لطافتِ احساس کے ساتھ اتنی گہری بات کہہ گئے تھے۔ بہر حال۔ پچھلے باب سے اُن کی پوری تشغی

ہوتی تو پھر ہی مجھے جانے کی نوبت آتی۔

ایک بار ہم داچی گام کے سبزہ زار میں بیٹھے ہوئے کام کر رہے تھے میں نے اُن سے کہا ”سر۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں پانی پی کر آ جاؤں۔“

وہ ایک باپ کی سی شفقت کے ساتھ کہنے لگے ”پانی تو ہمیں منگوا لیں گے لیکن تم نے ایسا پہلی بار کہا ہے۔ لگتا ہے تم تھک گئے ہو۔۔۔۔۔ لہذا آج کام بند“ اُس کے بعد انھوں نے پیرے سے کہا عمدہ سی کافی پلاؤ۔“ اور ہم سبزہ زار میں شہلے لگے۔ وہ مجھے جواہر لال نہرو مولانا آزاد وغیرہ سے وابستہ اس جگہ کی کچھ یادیں سناتے لگے۔

شیخ صاحب نے بعد میں بہ حیثیت وزیر اعلیٰ مجھے سٹیٹ آرکائیوز میں ۱۹۴۵ء کے بعد کا وہ سرکاری ریکارڈ دیکھنے کی اجازت بھی دلوائی۔ جو ابھی تک عام مطالعے کے لیے کھلا نہیں ہے۔ میں شاید ڈاکٹر کرن سنگھ کے بعد دوسرا شخص تھا۔ جس نے ان محفوظ دستاویزات کا مطالعہ کیا۔ میں نے اپنے مطالعے پر تقریباً ہر اہم فائل میں شیخ صاحب ہی شیخ صاحب کا ذکر دیکھا یعنی ع۔ جددہ دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

میں نے کتابوں کے حوالے بھی نکالے۔ اور اتراتا ہوا یہ سارا دفتر ان کی خدمت میں لے آیا۔

شیخ محمد عبداللہ ہر کام کے عملی پہلو کا گہرا احساس رکھتے تھے میرے حوالوں کو دیکھا بھالا اور پھر میرا دل رکھنے کو کہا،

”محنت تو سہت کی ہے۔ اور محنت کرنا مجھے بہت پسند ہے میں اپنی طالبِ علمی سے ہی بڑی محنت سے کام کرتا رہا ہوں۔“

میں پھولانہ سہارا تھا کہ کچھ لحظوں کے بعد وہ بڑے ملایم لہجے میں
فہمائش کے انداز میں کہنے لگے۔

”دیکھو... کتابوں اور خاکوں میں ہی میری تلاش کرتے پھر دو گے
تو کھو جاؤ گے... میری زندگی تو ایک سمندر ہے۔ اس کو کوئی ایک
ہی شخص ٹٹول نہیں سکتا تم تو پیر و مہرشد کے سلسلے کے قابل نہیں
ہو۔ لیکن اس بارے میں مجھے ہی اپنا گورو مانو۔ اور میرے پیچھے چھپے
چلی کر اپنی تلاش کا دائرہ مقرر کر لو۔“

قصہ مختصر یہ سلسلہ ۱۹۷۸ء تک برابر جاری رہا۔ انھوں نے میری
درخواست پر اُس مسودے کو جو ہر جولائی ۱۹۷۸ء تک دوسری باران کے
وزیر اعلیٰ کے حلف لینے پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ استاذی آل احمد سرور کو
مجھجا۔ جنھوں نے ازراہ عنایت زبان کی حد تک اس کی نوک پلک سنوارنے
کے لیے اُس کے کچھ جملوں یا الفاظ میں تبدیلی کی۔

جب مئی ۱۹۷۹ء میں دفاتر جموں سے سرٹنگ آگے تو انھوں نے کہا کہ
کتاب کو جلد از جلد شائع ہونا چاہیے۔ وہ پبلشرز سے پہلے ہی اقرار نامے پر
دستخط کر چکے تھے۔ چنانچہ ہم نے مسودے کا بیشتر حصہ کتابت کے لیے دیدیا۔
لیکن ایک دن میں نے اُن سے عرض کی،

”سر۔ کتاب کا مینا یہ صرف ۱۹۷۸ء تک پہنچا ہے۔ اسے تو مکمل اور
UP-TO-DATE... کرنا پڑے گا۔“

ہوئے اس کے بعد کون کون سے اہم واقعات ہوئے ہیں۔؟
میں نے جواب دیا ”یہ ایک صاحب کی ملیں گی...“

میں جلد مکمل نہ کر پایا تھا کہ وہ ہلے۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور کوئی بات؟“
میں نے کہا کہ ”جناب کا EPILOGUE جس میں آپ اپنے تحریکات کی روشنی
میں آئندہ نسلوں کے لیے اپنے پیغام کا پتھر پیش کریں گے۔“

چنانچہ چند دنوں کے بعد کام پھر شروع ہو گیا۔ لیکن وہ جون کے پہلے
ہفتے میں ڈوڈے کے دورے پر تشریف لے گئے جہاں وہ ڈاکٹروں اور سہیلی کو اشریا کٹ کے
مشورے مسترد کر کے باڑہ ہزار فٹ بلندی پر واقع ایک پہاڑی گاؤں لال
درمن بھی گئے۔ نتیجہ ظاہر تھا وہ وہاں سے ہی بیمار ہو کر آ گئے۔ میں۔ ارجون کو
حاضری دینے گیا۔ تو مجھے بتایا گیا کہ وہ بہت علیل ہیں۔ آج کسی سے نہیں ملیں گے۔
دوسرے روز یعنی ارجون کو مرزا محمد افضل بیگ کی وفات کے دن میں
اُن کے پاس چلا گیا۔ اُس دن رسائی ہو گئی۔ وہ بہت آداس اور نحیف لگ
رہے تھے۔۔۔۔۔ کتاب کی بات ہی نہ ہو سکی۔

چند دنوں کے بعد جب اُن کی طبیعت زرا سنبھال لینے لگی تو ڈکٹیشن کا
سلسلہ شروع ہونے لگا۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ کتاب کا انتساب لکھو۔
میں نے عرض کی کہ یہ تو بعد میں بھی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اُن پر اُسے
وہاں حادثات کی پرچھائیں جیسے پڑھ چکی تھی۔ کہنے لگے ”ایک لمحہ غنیمت
ہے۔ کتاب چاہے ۵ دسمبر کو ہی کیوں نہ نکلے یہ پہلے ہی چھپ کر آجانی چاہیے۔“
میرا اگلیہ یہ سن کر دھک سے رہ گیا۔ انھوں نے انتساب لکھا کر منظور کر لیا۔
اُس کے بعد اُن کی صحت بہت تیزی سے بگڑنے لگی۔ میں نے ان ابواب
کوصات کر کے لکھا۔ تو مقدمہ نے انھیں یہ دیکھنے اور منظور کرنے کی فرصت نہیں
دی اور بقولِ قیصر۔

دیجھا اس بیمارچی دل نے آخر کام تمام کیا

اس لیے دیانت کے تقاضوں کے تحت دان الجواب کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی شیخ صاحب کبھی دیکشن (DICTATION) دیتے وقت مجھ سے کچھ تفصیلات وغیرہ کا ذکر کرتے۔ لیکن ساتھ ہی کہتے کہ کتاب کو چونکہ میری زندگی میں چھپنا ہے۔ اس لیے انھیں اس میں درج نہ کرنا۔ یہ تفصیلات ایک عظیم اور کارکشاد و کارساز شخصیت کی زندگی پر بصیرت افزا روشنی ڈالتی ہیں۔ انشاء اللہ انھیں بھی پیش کرنے کی باری آجائے گی۔

شیر کشمیر کی خواہش تھی کہ اس کتاب کی اردو اصل اور انگریزی ترجمہ ایک ساتھ چھپیں اور یہ بالکل صحیح بات تھی کیوں کہ اردو کا دائرہ محدود ہے اور ان کے مباح اور مشتاق ساری دنیا میں موجود ہیں۔ انگریزی ترجمہ ان کی ضرورت بھی پوری کر لیتا۔ اس سلسلے میں لندن یونیورسٹی کے پروفیسر رالفت رسل سے بھی رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اُس زمانے میں رسل صاحب کی مصروفیات ایسی تھیں کہ وہ کشمیر نہ آ سکتے تھے۔ بعد میں کشمیر یونیورسٹی میں مسٹر ایٹیاہ الٹی چیوٹ کے سربراہ پروفیسر مقبول احمد نے کچھ الجواب کا ترجمہ کیا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ سہل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ شیخ صاحب نے ملک کے مشہور طباعتی ادارے وکاس سے اقرار نامے پر دستخط کر لیے اور ان کو ترجمے کا کام سونپا۔ لیکن جب چند الجواب کا ترجمہ ان کے پاس نمونے کے طور پر آ گیا۔ تو شیخ صاحب نے اپنی مخصوص تجویزی سے ان کو پڑھا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ الفاظ اور واقعات کے EMPHASIS میں فرق

سے نفس مضمون متاثر ہو گیا ہے اور مترجم کشمیر کی سیاسی اور تہذیبی دفنا کو پوری طرح احجاز نہیں سکا ہے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ وکاس کا مترجم راقم السطور کے ساتھ بیٹھ کر ترجمہ کیا کرے۔ وکاس والوں نے تحریری طور اس انتظام پر رضامندی بظاہر کی تھی۔ لیکن بعد میں شیخ صاحب کی علالت اور انتقال سے بہت سے دوسرے مضمونوں کی طرح یہ معاملہ بھی رہ گیا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اُن کے سرگزشت لکھنے کا معاملہ اخباروں میں آ گیا تو منہدی۔ ملیا لم تلگم اور کٹر زبانون کے پبلشرسوں نے بھی حقوق حاصل کرنے کے لیے اُن کو خط لکھے جو میرے پاس محفوظ ہیں۔

اس سرگزشت کے بارے میں اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے تاریخ کی کسی لکھی کتاب کی طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔ یہ کسی METHODOLOGY کی قید میں اسیر نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم انسان کے مالا مال ذہن کی آزادانہ پرواز ہے۔ جس میں کئی بار شعور کی رود STREAM OF CONCIIOUSNESS کا سا ماجرا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی ابتداء میں ہی بعد کے واقعات کا ذکر چھڑتے ہیں اور پھر کبھی بہت بعد کا ماجرا بیان کرتے ہوئے ابتداء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مکتبی نوار شیخ دان اسے شاید تکرار قرار دیں۔ لیکن اس سے اس معرکتہ اللہ شخصیت کی ذہنی کیسٹری کی ترکیب پر روشنی پڑتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کن واقعات و شخصیات و نظریات و تاثرات نے اُن کے ذہن پر اتنے گہرے نقوش ثبت کیے تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک بڑے بلند مرتبہ تازہ نگار تھے۔ مکتبی نوار شیخ نہ تھے ج

نہ کہ خدائے شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا۔

شیخ محمد عبداللہ کا طرز بیان اُن کے جزی کر دار کی طرح بہت بے لوث اور بے باک ہے اور اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے

آئیں جوں مرداں حق کوئی دے پاکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
جب کبھی راقم اسطور نے ان کی توجہ بعض کم خوشگوار تاثرات کی طرف دلائے کی جسارت کی تو وہ ایک خود آگاہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے یہ کہہ کر آپس آکے رہے۔

”تم تو ایک مددگار AID ہو۔ ان بکھڑوں میں کیوں دخل دیتے ہو؟ مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ وہ چپ چاپ کر کے لکھو۔“

لیکن قارئین خود اندازہ کر پائیں گے کہ انھوں نے اپنے سخت ترین سیاسی رقیبوں اور حریفوں کے بارے میں بھی بہت تلامیم اور تہذیب اندازین تبصرے کیے ہیں۔ وہ بہت ہی شائستہ بزرگ تھے۔ اگرچہ اُن کے مشہور زمانہ حلال سے بڑے بڑوں کا تذکرہ آپ ہوتا تھا۔ لیکن کسی نے اس جملائی عالم میں بھی اُن کی زبان سے کوئی غیر شائستہ بات نہیں سنی اس تحریر میں وہ اور زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ اگرچہ تاثرات کی برجستگی کو مجروح کرنے کے حق میں نہ تھے لیکن اُن کا انداز بیان بہر حال تہذیب و تحیز کی اعلیٰ سطح پر ہی رہتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے سیاسی مخالفین کی تنقید کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیوں کی توصیف میں بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ محمد علی جناح جو اہل لال نہرو اور بخشی غلام محمد جیسے حریفوں کی صفات اور اچھے کاموں کو اُجھارنے میں وہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ جناح صاحب کے بارے میں وہ بار بار کہتے تھے کہ مٹان ہوج چک نہ تھی اور وہ بہت کم کسی کی رائے کو خاطر

میں لاتے تھے۔ اگرچہ ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن اُن کی ذاتی دیانت شک و شبہ سے بالاتر تھی اور انھیں کسی قیمت پر خریدنا نہ جاسکتا تھا۔“

دل دوراں ر WILL DURANT نے لکھا ہے کہ عظیم ہستیاں اقوام کے باطن میں چھپی ہوئی تخلیقی قوتوں کے ڈھکن کھول دیتی ہیں اور اس قوت کو تاریخ کا رخ متعین کرنے اور آئے نئی شکل و صورت عطا کرنے میں خرچ کرتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ کسی شخصیت کی عظمت کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ وہ عام رویش کو کس طرح بہاد کے خلاف جاکر بدل دیتا ہے واقعات اُس کی معرفت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اور وہ قومی اعتقادات اور اجتماعی آرزوؤں کی علامت بن جاتا ہے۔ ایسے بڑے آدمی بے شمار وجوہات کا اثر اور بے شمار اثرات کی وجہ بنتے ہیں۔ بلکہ کشمیر کی طویل اور واقعات سے بھری پری تاریخ میں شیخ محمد عبداللہ کی عزت و عظمت کی بہت ہی کم شخصیات نظر آتی ہیں۔ وہ ماضی کی جڑوں سے غوطہ کھاتے ہیں۔ حال کو تسخیر کرتے ہیں اور مستقبل پر اپنی پرجھپٹیاں ڈال رہے ہیں۔ جب تک کشمیر کی شادابی قائم اور اس کے عوام کا وجود قائم ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کشمیریوں کے اجتماعی شعور و لاشعور میں زندہ جاوید رہیں گے۔ وہ اپنی زندگی میں ہی ذات کا حصار توڑ کر ابدیت اور اسطور کے بقائے دوام میں داخل ہو گئے تھے اور تاریخ کا حصہ بننے کے بعد بھی ہماری شناخت کے پرچم اور علامت کے طور پر ہماری نفسیات پر چھائے رہیں گے۔



جسٹس امیج جیسرہ

ظ
شیخ محمد عبداللہ کی زندگی گذشتہ نصف صدی میں کشمیر کی تواریخ ہے
اور تقریباً ہر اہم دستاویز ان کے ساتھ منسلک ہے۔ ان دستاویزات کو فیملیوں
کی شکل میں درج کیا جاتا تو یہ کتاب ضخامت کا بوجھ نہ سنبھال سکتی۔

یہ کتاب اس عظیم الشان کشمیری کی آپ بیتی کے لحاظ سے ایک شاندار
دستاویز کے طور پر توجہ اور حوالے کا مرکز اور محور بنی رہے گی۔ ہم کتنے خوش
قسمت ہیں کہ ہماری تاریخ اور تقدیر کا دھارا موڑنے والی اس بلند قامت
ہستی نے واقعات و حوادث میں اپنی صدیقہ INSIGHT کی کرنیں ڈال کر
ان میں نئے مفہوم اور تازہ معنی پیدا کیے ہیں۔ ان کے ساتھ اختلافات کی
گنجائش تو رہے گی۔ لیکن ان کو کسی صورت میں نظر انداز BY PASS نہیں کیا
جاسکے گا۔ ع

خودی سے مرو خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں!

(اقبال)

محمد یوسف مہتاب

۲۲۵۔ جواہر نگر۔ سر سید
۱۰ نومبر ۱۹۸۵ء



اپنی شریک حیات کے ساتھ



محمد اہل بہسود کے ساتھ آخری ملاقات۔

”وہ ہر خوں جو میری صدا ہے“
(فیض)



وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ۔

پہلی بات

میری زندگی میں دھوپ اور چھاؤں ایک دوسرے کا اس توڑ، تسلسل اور تیزی سے پچھا کرتے رہے ہیں کہ مجھے سستانے کی فرصت بہت کم نصیب ہوئی۔ یہ ایک عاشق اور ایک سپاہی کی زندگی کا تانا بانا ہے۔ جو بظاہر دو مختلف رنگوں سے بنا ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر ان میں ایک باطنی ہم آہنگی نظر آئے گی۔ میری زندگی میں رومان پرست اور سپاہی کی یہ آویزش میری جستجو کی نوعیت میں ہی مضمر تھی۔ اپنے وطن عزیز کی تقدیر سوارانے کے خواب دیکھا بھی اسی بندہ عاجز کا مقدر ہو چکا تھا۔ اور اُن خوابوں میں رنگ بھرنے کا قرعہ نال بھی ”من دیوانہ“ کے نام ہی لکھا گیا تھا۔ اگر میری جدوجہد کو میرے عشق نے اذنِ عمل عطا کیا تو میرے عشق کو میری جدوجہد سمجھلا دیتی اور بھڑکاتی رہی۔ بار بار ایسا ہوا کہ میری صبح ایک ایسے میدان کارزار میں پھوٹی جہاں میں جوش اور شجوت سے سرشار اپنے ہمسروں کے کندھوں سے کندھا مٹلائے

آسمان بار امانتِ نخواست کشید

قرعہ نالِ جامِ من دیوانہ زندہ

تھا۔ لیکن ٹینگ صاحب کے التماس میں خلوص تھا یا حسن قبول کی ساعت تھی۔ میں فوراً ہی آمادہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کام میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس کام میں ہاتھ بانے کے لیے مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ از غیب نکلی آیا ہے۔ یہ سلسلہ سرٹنگ اور جوتوں دونوں جگہ جاری رہا۔ کبھی کبھی میری مصروفیت اس کی پیش قدمی میں حائل ہو جاتیں۔ مگر ٹینگ صاحب ان یادداشتوں کو ترتیب سے لکھ کر لاتے۔ وہ کچھ اس لگن سے میرا پچھا کرتے رہے کہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عمل میں کوئی دو سال کے قریب لگ گئے اور ایک اچھی خاصی کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا۔ ٹینگ صاحب کشمیر کی قدیم اور معاصر تواریخ پر اچھی نظر رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے تاریخی حوالوں، مسنن وغیرہ کی جانچ پڑتال اور ترتیب میں بڑی محنت سے میرا ہاتھ بنایا۔ اور مسودے کی شیرازہ بندی کی۔ حتیٰ کہ اُن کے شوق اور ریاض کے بغیر یہ کتاب ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے آخری مرحلے پر مسودات کو دیکھا بھالا اور اُن کی مناسب درست کی۔ میری خواہش اور ٹینگ صاحب کے مشورے پر اقبال انسٹی ٹیوٹ سرٹنگ کے ٹائریکٹر اور اُردو کے شستہ استاد پروفیسر آل احمد ستر نے بھی مسودات کو ایک نظر دیکھا اور کچھ مناسب طورے دیئے۔ ان مراحل سے گذر کر اب کتاب آپ کے سامنے ہے۔ ایک اور بات جس کا ذکر ضروری ہے یہ ہے کہ میں جب وطن عزیز سے پلٹے ہوئے غلامی اور ظلم کے حضرتوں سے تہہ آرمائی میں مصروف تھا۔ اُس وقت میری ساری توجہ میرے وطن کی سلامتی اور سر بلندی کے مقصد پر مرکوز تھی۔ اُن کرے کو سوں میں اس جان بوجہ و جہد کی کہانی بیان کرنے کا

خیال ذہنی عیاشی کے برابر ہی سمجھا جاتا۔ بہر کیف ہمیں اُس وقت قوی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں نئی راہیں نکالنی تھیں۔ چنانچہ صحیفہ نگاری کے فن کو بھی ہم فراوش نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری تحریک کا مقصد آزادی تقریر کے ساتھ ساتھ آزادی تحریر بھی تھا۔ اسی شوق میں، ایں ریاست کے کچھ اولین جریدوں اور اخباروں کا بانی اور ممدار بھی بنا۔ صحافت سے میرا وادہ است تعلق رہا۔ لیکن میں نے کبھی اپنی یادداشتوں کا کوئی روزنامہ نہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لیے میں یہ اوراق محض اپنی یادداشت کے سہارے لکھ رہا ہوں۔ میرے پاس تحریک حریت کی کچھ نادر اور نایاب دستاویزات تھیں۔ اور جہاں تا کاندھلی جواہر لال نہرو، جناح صاحب اور برصغیر کی کچھ اہم ترین ہم عصر شخصیات سے خط و کتابت کا ریکارڈ بھی، لیکن میری بار بار کی گرفتاریوں کے بعد پولیس کے طوفانی چھاپوں میں سب سے پہلی شامت انہی کا قذات کی آجاتی چنانچہ وہ ساری دستاویزات اب وقت کے اندر سے کونین میں ڈوب کر گم ہو چکی ہیں۔ مجاہد منزل ہماری تحریک کا دل رہ چکا ہے۔ وہاں بھی قومی دستاویزات کا ایک بیش بہا گنجینہ موجود تھا۔ مگر ۱۹۷۹ء کے بعد مجاہد منزل کو بھی قیدی بنایا گیا۔ اور یہ بے بہا دستاویزات یا تو ضائع کر دی گئیں یا تحریک کی جڑوں اور قربانیوں سے بے خبر لال مچھلکڑوں نے انہیں بیچ بائع کر محض سو دو سو روپے آراستہ کرنے پر خرچ کر دیا۔ اسی طرح سے ہمارے لیے حوائے کی اصل دستاویزات سے استفادہ ناممکن بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اس عالم میں مجھے اپنے حافظے پر ہی زور ڈالنا پڑا۔ میری عمر کو پہنچ کر حافظے کا چراغ بھی ٹھٹھانے لگتا ہے۔ چنانچہ بہت سے واقعات کے

مختلف پہلو یا تو غلطی نسیاں میں رہ گئے ہیں۔ ورنہ انہیں طوالت کلام کے خیال سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے شعار کے مطابق مختلف واقعات و شخصیات کے متعلق صاف گوئی سے کام لیا ہے اور میرا مقصد صرف واقعات کا صحیح پہلو پیش کرنا ہے۔ کسی کی دلآزاری کرنا نہیں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ستر بہتر برس کے طویل عرصے پر پچھلے ہوئے اس بیان کو چند سو صفحت میں سمیٹ لینے کی کوشش میں اُس گرم نفس اور شہر بار کیفیت کی بازیافت ناممکن ہے جس نے ہمیں تحریک کے مختلف مرحلوں میں آمادہ پیکار رکھا۔ اُس ولولہ انگیز فضا کو کبھی آ جا کر گرا نہایت مشکل ہے جس کی کوکھ میں یہ واقعات پیش آئے اور تاریخ کی لامتناہی زنجیر کی کڑیاں جوڑتے گئے۔ کشمیر کی تواریخ اگرچہ بے حد درخشاں رہی ہے لیکن ہمارے زمانے تک پہنچنے پہنچنے خود کشمیر تواریخ کے ان ٹکڑوں کے نیچے پڑا باپ رہا تھا جو صدیوں کی غلامی نے وجود میں لائے تھے۔ زمانے نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ میں نے اس کو اندھی صدیوں کے اس ملبے سے باہر نکالا۔ اس کتاب میں ایک عظیم قوم کی اپنی شخصیت اور شناخت کے لیے مسجود اور کشمکش کا ماجرا دیکھا جاسکتا ہے۔ مجھے یہ خیال کسی حد تک تسکین دیتا ہے کہ اس ملک و تاز کا دامن کشمیر کی تواریخ سے پیوست ہے۔ ہماری تحریک کی بہت سی سرگشتیں، تفسیریں اور تاویلیں لکھی گئی ہیں اور یہ بات و شوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آئندہ بھی اس کی بے شمار روئیدادیں اور تعبیریں لکھی جائیں گی۔ شاید یہ کہنا مبالغ نہ ہو کہ اُن سبھی بیانیوں میں اس بندہ عاجز کے روز و شب بھی ناک جھانک کرتے رہیں گے۔ کیونکہ میرا تو اقبال کے الفاظ

میں کچھ وہی ماجرا ہے ع

اڑائے کچھ ورق لائے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے

جن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان میری

سچ پوچھیے تو یہ کتاب پیش کرنے سے میرا مقصد اپنی کہانی سنانا نہیں بلکہ اپنی قوم کے تئیں اپنی ایک اور ذمہ داری سے شکستہ دوش ہو جانا ہے تاکہ آئندہ نسلیں میرے تجربے کی روشنی میں اپنی سمت سنوارتی رہیں۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات کا خیال بے قرار کرتا ہے کہ میں اپنے ان گنت ساتھیوں اور تحریک حریت کے کچھ شاندار مجاہدوں کے نام اور کام کا اس کتاب میں یا تو ذکر ہی نہیں کر سکا یا ایسا کرتے ہوئے مجھے صرف اشروں پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اس معذوری کا تعلق بھی بیانے کے بہاد، اختصار کے تقاضوں اور کچھ صورتوں میں حافطی کی کوتاہیوں سے ہے اور اس سے ان عاشقان پاک طینت کے نام اور کام پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیے۔ مجھے توقع ہے کہ جب بہتر اوقات میں ہماری قوم اپنے شعور کی مشعل جلا کر تحریک آزادی کشمیر کے مفصل اور معتبر تواریخ مرتب کرنے کا بیڑا اٹھائے گی تو اس کہکشاں کے سبھی چاند سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ ہمارے قومی مطلع پر جگمگے نہ لگیں گے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کتاب کشمیر کے تواریخ لٹریچر کی سرحدوں میں توسیع کرتی ہے۔ تواریخ کی فہم و بصیرت کشمیریوں کی قومی روایات کا حصہ ہے۔ بقول خواجہ لال نہرو ہندوستان کو کشمیر نے ہی تواریخ نویسی کا فن سکھایا۔ چنانچہ ہندوستان میں سب سے پہلی اور مستند تاریخ کشمیر کے فرزند کاہن پنڈت نے لکھی ہے۔ اسی

تواریخ عرفان و ادراک نے سلطان زمین العابدین کو بھی اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اپنے درباری متمدنوں کے ذریعے واقعات کو اپنے زمانے تک نقلیند کر وائے۔ اس کے بعد آج تک کی تواریخ کے متعلق کشمیر میں بہت اعلیٰ اور معیاری کتابیں تحریر کی گئی ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک ناچیز ہوں مگر قدرت نے مجھے ایک تقدیر ساز اور انقلاب آفرین تحریک کی ساریانی اور حدی خوانی کا شرف عطا فرمایا۔ اس لحاظ سے میری کہانی میرے عہد میں کشمیر کی آپ بیتی بن جاتی ہے۔ اور ہماری عظیم تواریخ کا ایک حصہ۔ فرد اور قوم کے تعلق پر کوئی سخن سرائی کیے بغیر میں غالب کے اس شعر میں پوشیدہ رمز کے ساتھ یہ کتاب آپ اور کشمیر کی آئندہ نسلوں کو سونپ دیتا ہوں۔ ع

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور مجھ میں کل

کھیل۔ پتوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

میں نے اس کتاب کا نام علامہ اقبال کے مشہور شعر سے مستعار لیا ہے۔ آگ زندگی جوش اور حرارت کی علامت اور چٹا کر کشمیر کی شہادت ہے۔ اس شعر میں کشمیر کے مستقبل کے متعلق خوش امید کی بشارت دیکر رہی ہے اور زیرِ اربعین کا دل ہے کہ اگر جہندی میرے خوبصورت وطن کا مقدر ہے۔ اس طرح "آتش چٹا کر" کی ترکیب میری ترجمان بن گئی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ

شیخ محمد عبداللہ

جنوری ۸، ۱۹۸۷ء

میں اُس کا ٹھہر ہی تبدیل ہو گیا۔ اُس کے چاند جیسے چہرے پر بڑھاپے کی جھریاں اُبھر آئیں اور اُس کی کالی زلفیں روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو گئیں۔ چنانچہ اُس کرامت سے متاثر ہو کر وہ حضرت کے طلقہ امداد میں شامل ہو گئی۔ صورہ کا گرد و پیش بھی تاریخ کے وزن و وقار سے گراں قدر نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے بلائی محلے نوشہرہ میں وہ تازہ کی جگہ واقع ہے۔ جہاں کشمیر کے دانشمند عوام دوست اور دُور اندیش بادشاہ سلطان زین العابدین بڑشاہ نے اپنا دار الخلافہ تعمیر کیا تھا مومنین کے مطابق اُس نے یہاں ”راہِ دَآذ“ کے نام سے اپنا محل تعمیر کیا تھا جو محالیں لکڑی کا بنا تھا اور کشمیر کے طرز تعمیر کا عمدہ نمونہ تھا۔ اس محل کے بارہ طبقے تھے اور اس لئے اس کو موجودہ دور کے فلک پیاؤں SKY SCRAPERS کا پیش رو اور دُنیا کا پہلا فلک نما کہا گیا ہے۔ یہ شاندار مارت جب بڑشاہ کے بعد خانہ جنگی کے دنوں میں جل کر تباہ ہوئی تو ایک سال تک اس کے کندھرات سے دھواں اُٹھتا رہا، کشمیر میں یہ روایت اب بھی عام ہے کہ اُس سال کے دوران اگر کسی کو انگڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اس جگہ کی خاک کترے اُنہیں چُن لیتا تھا۔ موزخ حسن کے مطابق مُغل دور میں صورہ اپنے شہر بار بار غارت کے لئے بھی مشہور تھا۔

صورہ دلدار جانے والی شاہراہ پر واقع ہے اور اس کی آبادی تمام تر مسلمانوں پر مشتمل ہے، جو میرے بچپن میں یا تو محنت مزدوری کر کے اپنا پیسٹ پالتے تھے یا چھوٹی موٹی دستکاریوں سے روزی روٹی کماتے تھے۔ چند ایک گھرانے زراعت پیشہ بھی تھے۔

میرے خاندان کے متعلق مشہور تواریخ ”کشمیر“ کے مصنف نے لکھا ہے کہ افغانوں

①

بچپن اور ابتدائی تعلیم

میری پیدائش وادی کشمیر کے ایک ایسے مقام پر ہوئی جو اس کی راجدھانی سرینگر اور نواحی دیہات کے سنگم پر واقع ہے۔ صورہ نامی یہ چھوٹا سا محلہ ہری پریت پہاڑی کے شمال میں ایک پُر فضا جگہ پر آباد ہے۔ یہ آٹھار کی دلدلی جھیل کے مشرقی کنارے پر بسا ہوا ہے اور اس سے تھوڑی ہی دُور کشمیر کی سب سے خوبصورت جھیل ڈل واقع ہے۔ صورہ ایک قدیم بستی ہے۔ حال ہی میں ایک میڈیکل انسٹیٹیوٹ کی تعمیر کے سلسلے میں ہونے والی کھدائی کے دوران یہاں پُرانے زمانے کی کچھ خوبصورت مورتیاں، مٹی کے ظروف اور دوسرے آثار ملے ہیں۔ صورہ کے بالکل نواح میں وہ مشہور جگہ بھی موجود ہے، جس کا کشمیر کے مشہور رشی اور ناہر مریاض حضرت شیخ نور الدین دہلی کی زندگی میں ذکر آتا ہے۔ روایت کے مطابق حضرت کی پاکباز زندگی سے خاک کھا کر اُس وقت کے فسر و خوں نے اُن کا زہد قلوبے کے لئے ایک چال سوچی۔ ایک مسک شہاب نازنین عزت یا دُن مزی کو سولہ سنگار کر کے اُن کے پاس بھیج دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ نے اپنے مرقعے سے سر اٹھایا اور ایک غصہ آلود بگاہ اس خوبصورت جاسوس پر ڈالی تو چشمِ دُور

میرے والد شیخ محمد ابراہیم اسی تجارت سے وابستہ تھے۔ پہلے پہلے تو انہوں نے پھوٹے پھانے پر یہ کام شروع کیا۔ لیکن اپنی محنت و دیانت اور ہیاقت سے جلد ہی ایک درمیانی درجے کے کارخانہ دار کی حیثیت تک پہنچ گئے۔ ہمارے کنبے کی مالی حالت ایک اوسط درجے کے گھرانے کی جیسی تھی۔ نہ بہت زیادہ ٹھاکھٹھے اور نہ ہی عسرت کی زندگی۔ کشمیری شال اگرچہ ایک وقت یورپ کی منڈیوں میں ہاتھوں ہاتھ بیچے جاتے تھے لیکن یورپین جنگوں کے نتیجے میں جب فرانس کی، جو یورپ کے روساء کا مرکز اور عیش کا راہ نمائ تھا، مالی حالت کمزور ہو گئی تو کشمیری شال کی مانگ ماند پڑ گئی۔ پھر صنعتی انقلاب کے زیر اثر خود فرانس میں کشمیری شالوں کے چر بے مشینی کر گھوں پر تیار ہونے لگے تو کشمیری شال کی تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ اُس کے بعد مصر میں کشمیری شال کی مانگ بڑھ گئی۔ یہ ایک خاص نقشہ اور بناوٹ کا شال ہوتا تھا اور مصری جینٹ کھلاتا تھا۔ اس نے کلاسیک کافی شال کی جگہ لی۔ لیکن پھر اس کی مانگ بھی کم ہوتی گئی۔ اب رفل اور سوزن کاری شال کا سرتارہ چمکنے لگا۔ اور اترتر اس تجارت کا دساؤ بن گیا۔ اس کی مانگ کچھ اتنی بڑھی کہ کشمیر کے شہر اور گاؤں میں رفل شال تیار ہونے لگے۔ زمانے کے چلنے کے مطابق ہمارے خاندان نے بھی رفل شال کی تجارت میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اترتر کے بیوپاریوں سے خام مال لے کر اسے شہر و دیہات کے کاریگروں میں بانٹے اور ان کو مختلف نقشوں کے مشابہ ڈیزائن اُبھارنے کی تلقین کرتے۔ مال تیار ہو جاتا تو کام کی نوعیت کے مطابق کاریگروں کو اجرت ادا کی جاتی۔

میرے والد میری پیدائش سے کوئی پندرہ دن پہلے وفات پا گئے تھے۔ اور

اس طرح میں نے ایک یتیم کی حیثیت سے دنیا میں آنکھ کھولی۔ اُن کے بعد کنبے اور کاروبار کی دیکھ بھال کا بوجھ میرے ایک بڑے بھائی شیخ محمد فیصل کے کندھوں پر آن پڑا۔ میرے والد نے عین بچاگ کئے تھے۔ پہلی بیوی کسی عارضے سے وفات پا گئیں۔ لیکن اُن کے بطن سے ایک بیٹی زیدہ تھیں۔ والد مرحوم نے دوسری شادی کی اور اس بچاگ سے تین فرزند اور ایک دھنڑرہ گئے تھے۔ فرزندوں میں شیخ محمد فیصل، شیخ عبدالکبیر، اور شیخ عبدالغفار تھے اور ایک بیٹی کا نام فدیہ رکھا۔ دوسری بیوی بھی چل بسیں تو والد صاحب کو گھر کا کام کاج دیکھنے بھانے اور بچوں کو سنبھالنے کے لئے تیسرا نکاح کرنا پڑا۔ اسی بچاگ سے میرے دو بڑے بھائی شیخ محمد تقی و شیخ غلام محمد الدین اور ایک بہن جان بیگم پیدا ہوئے۔ میں اپنے والدین کی آخری اولاد تھا۔ میری والدہ کا نام خیر النساء تھا۔ اُن کا مائیکہ بھی میری نصیال جامع مسجد کے قریب واقع تھی اور میرے ماموں پیشے کے اعتبار سے زرگر تھے۔ جو اُن دنوں خاصا معزز پیشہ شمار کیا جاتا تھا۔

میرے والد کی وفات کے وقت میری والدہ کے بطن سے پیدا ہوئے میرے دو بڑے بھائی بھی غامی چھوٹی عمر کے تھے۔ اس لئے یتیم بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کی ساری ذمہ داری ہماری والدہ کو ہی سنبھالنا پڑی۔ دیگ دان (چوہا، چوکر، شتر کر، تھا، لہذا اس بڑے سے کنبے میں ہماری پرورش ایک سوتیلے ماحول میں ہوئی۔ اُن دنوں کشمیر بچے معنوں میں امدید منگتی تھا، نہ بچکی کی روشنی تھی نہ سرکاری نکلون کا پانی۔ دھان کوٹنے یا گٹھن سے پانی لانے کا کام گھر کی عورتوں کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ شاد و نادر کوئی با استعداد گھرانہ ان کاموں کے لئے کوکر رکھ لیتا تھا۔ میری والدہ ہمارے کھانے پینے اور پرورش کی دوسری ذمہ داریات کے لئے اپنے سوتیلے بیٹوں کی

محتاج تھیں۔ جو گھر کے مالک و مختار بن گئے تھے میری والدہ دینی طور پر دینی لکھی نہیں تھیں لیکن وہ کافی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست رکھنے والی خاتون تھیں۔ وہ چھوٹی موٹی باتوں اور رنجشوں کو بھلا دیتیں اور گھر میں ایک شفیق ماں کی طرح پاسبانی کرتیں۔ اُن کی سلیقہ مندی اور تدبیر کا یہی فیض تھا کہ اُن کے سوتیلے بیٹے اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اور گھر کے انتظامات میں اُن کی رائے کو وزن دیتے تھے۔

لیکن میری والدہ کی اپنی اولاد ابھی کمانے کے قابل نہ تھی۔ اُٹا اُن کی دیکھ رکھ اور پڑھانی پر خرچ آتا تھا۔ اِس لئے اُنہیں اپنے سوتیلے بیٹوں کے طے اور کبھی کبھار جھڑپاں بھی ہونا پڑتی تھیں۔ بچاری کو کبھی کبھار ذہنی گرفت کے علاوہ جہانی افیتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں لیکن وہ تو کُلی اور صبر و شکر کے ساتھ یہ سب کچھ سہتی رہیں۔ لیکن گھر کے شیرازے کو مضبوطی سے تھامے رہیں۔ اِسی اثنا ہم نے کچھ کچھ ہوش سنبھالا تو ہم سے بچاری والدہ اور خود اپنی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ہم اکثر اُٹاں جان کی حالت دیکھ کر اُنہیں مشورہ دیتے کہ ہم اپنے بڑے بھائیوں سے الگ ہو کر اپنا دیگ دان شروع کریں گے۔ اُس صورت میں میں محنت مزدوری تو کرنا پڑے گی۔ لیکن روز کی بیس روپے خات مل جائے گی۔ اُٹاں بڑی حوصلے والی اور دُور اندیش خاتون تھیں وہ ہماری دیوٹی کر کے معاملے کو ٹال جاتیں لیکن فائدان کا بٹوارہ پسند نہ کرتیں۔ غالباً اُنہیں اپنے تجربے کی بنا پر اِس قسم کے بٹوارے کے عواقب کا ہم سے بہتر اندازہ تھا۔ لیکن ہم عمر میں بڑھتے گئے اور آہستہ آہستہ اس ناروا سلوک کے خلاف دُشمن طے گئے۔ ہمارے ہرے ہوئے تیرہ دیکھ کر بھائی صاحبان کا سلوک کچھ کچھ سدھرنے بھی لگا مگر جب تک والدہ زندہ رہیں ہمارا دیگ دان مشترک ہی رہا۔

اِس قسم کے ماحول میں ہماری تعلیم و تربیت کا جو حال ہو سکتا تھا اُنس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ میری والدہ کی بڑی آرزو تھی کہ ہم لوگ کبھی پڑھیں اور ابھی تعلیم سے آراستہ ہوں۔ لیکن گھر کی ناسازگار فضا کی وجہ سے میرے بڑے بھائی شیخ محمد مقبول (انٹرا ریٹ۔ اے) سے آگے نہ بڑھ سکے۔ انہوں نے ہمدانیہ ہائی اسکول کی ہائیڈ ماسٹری سنبھال لی اور اُن کا مشاہرہ نوے روپے فی ماہ مقرر ہوا۔ جو اُن دنوں بڑی بات تھی۔ میرے دوسرے بھائی فیض غلام محی الدین چوتھی یا پانچویں سے آگے نہ بڑھ سکے اور اُن کو گھر میں ہی نوگرہری کے کارخانے میں کام پر لگا دیا گیا تاکہ وہ بھی کچھ کماسکیں۔

اُن دنوں مسلمانوں میں مدرسے کی تعلیم حاصل کرنے کا رواج بہت کم تھا اُن کو اپنے بچوں کو تعلیم دلانے سے دل چسپی بھی نہ تھی جس کا بڑا کارن مسلمانوں کی غریبی اور اُن کے تئیں حکومت وقت کی حوصلہ شکنی اور بے نیازی تھی۔ اگر کوئی کھاتا پیتا مگر انا اپنے بچوں کو پڑھانے کی طرف مائل بھی ہو جاتا تو پہلے پہل اُن کو مکتب بھیجنا لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ جہاں اُنہیں عربی اور فارسی کی لکھا ئی اور پڑھائی سکھائی جاتی تھی۔ چنانچہ مجھے اور میرے بڑے بھائی شیخ عبدالکبیر کے فرزند شیخ غلام نبی کو، جو میرا ہم بسن تھا، مفتاحہ میں تھلے کے مکتب میں قرآن مجید پڑھنے کے لئے داخل کیا گیا۔ ہمارے اُٹاں کا نام آخون مبارک شاہ تھا۔ وہ ایک صوفی منش اور مرثیوں مرثیہ بزرگ تھے۔ ہم سے محبت کرتے اور ایک شفیق باپ کی طرح ہمیں پیارا اور نرمی سے پڑھایا کرتے۔ آخون صاحب کی اچلیہ اتون جی کہلاتی تھیں۔ وہ ہم کو ایک شفیق ماں کی طرح پالتی پوتیں اور کہلاتیں پلاتیں۔ اِس طریقہ تعلیم میں یہ خوبی ہے نظیر تھی کہ شاگرد کو اولاد کی طرح رکھا جاتا اور اُنس کو پیار، محبت اور اُنس و الفت کے رشتے میں بانہہ بڑا کر کے

دل میں تعلیم کی لگن پیدا کی جاتی۔ اس طرح سے استاد اور شاگرد کے درمیان وہ فاصلہ اور بے اعتمادی پیدا ہونے کی نوبت نہ آتی جو آج کے طرز تعلیم کا خاصہ اور اس کی بہت سی غلطیوں کا سبب ہے۔

میں سے کلام پاک سے میرے والدہ تشریف لے کر ابتدا ہوئی جو اللہ تعالیٰ ایک پوری طرح سرسبز و شاداب ہے۔ انھوں صاحب تم کو تاکید کرتے کہ ہم قرآن پر آواز بلند اور لحن کے ساتھ پڑھیں۔ جس کے نتیجے میں اُن دنوں میں ہی یہ شراغِ حاکمِ قدرت نے میرے لہجے میں ایک دلنواز دھماکا اور شیش وریخت کی ہے۔ تم قرآن شریف کے بعد میرے شاہ صاحب سے فارسی کی سکھائی کتابوں کی زبانِ حق، فلسفان، ہنرستان، پندنامہ، بلاغِ منظم وغیرہ کا درس لیا۔ اس کے علاوہ مکتب میں ارکانِ اسلام کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ بعد میں گھر کے بزرگ میں مسجد میں اپنے ساتھ لے جایا کرتے اور میں نے نماز میرے معمول کا لازمی جزو بن گئی۔ اقتدار کا ایوان بویا زندان کی غلوت، ہر مقام پر نماز نے مجھے ہمارا اور سکون دیا ہے۔ گھر میں اُن دنوں شیخ ایک آدھ پارہ قرآن کی کوچنی آواز سے تلاوت بھی لازمی تھی اور بچپن کے اسی آئینے میں جب میرا ذہن و ضمیر کئی کئی کی طسیرِ نرم تھا، قرآن کی لازوال اور سرمدی آیات میرے حافظ پر نقش ہو گئیں اور پھر زندگی بھر کر کے کونوں میں مجھے اپنی توت شفا سے بہرہ ور کرتی رہیں۔ الحمد للہ۔

مکتب سے فارغ ہونے کے بعد ہم کو ایک پرائمری سکول میں داخل کر دیا گیا جو انہیں حضرت الاسلام کے انتظام میں چلتا تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔ یہ سکول ہمارے محلے کے نواح میں نوشہرہ کی سٹی میں قائم تھا۔ لیکن یہاں کے انتظام اور طریقہ تعلیم سے مایوس ہو کر میں نے اپنی تعلیمی کے نزدیک ترحمے و ڈیٹارنگ میں منتقل ہونا چاہا۔

نوشہرہ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کیا اور میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کرناٹکا کا ایسا ہوا کہ یہ احتجاج میری عمر کی طویل جدوجہد کا پہلا چہرہ ثابت ہوا۔ میں نے اس نامعقول روش کے خلاف حضرت الاسلام کے ذمہ دار اراکین بلکہ انپیکٹر سکولز سے جو حضرت الاسلام کے سکولوں پر بھی اختیار رکھنا تھا، فریاد کی۔ لیکن انصاف حاصل کرنے کی یہ سہارت آئیز کو شش کا سیاب نہ ہو سکی۔ پھر کسی کسی طرح وڈیو ٹائنگ سکول کے ہیڈ ماسٹر میرے آگے آئے اور میرا شوق دیکھ کر انھوں نے مجھے سرٹیفکیٹ کے بغیر اپنے سکول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ اس ہر بانِ استاد کا نام حسام الدین تھا اور یہ قول، سرٹیفکیٹ کے باشندے تھے۔ اسی اثنا میں جبکہ ہم نے پرائمری سکول کی صرف دو مہاتیں پاس کی تھیں، میرے بڑے بھائیوں نے مجھے اور میرے بھتیجے غلام نجی کو سکول جانے سے روک دیا۔ جن زورِ زبردستی سے رفوگری کے کارخانے میں بٹھا دیا گیا اور ہمارے ہاتھ میں قلم کی بجائے رفوگری کی سوئی تھما دی گئی۔ اس دوران مجھے پیساری کی دکان پر بھیج دیا گیا۔ جہاں میں سودا سلفت بیچتا تھا۔ اُن دنوں کا ایک واقعہ میرے صفحہِ زہن پر تازہ ہے۔ میں دکان میں اپنی شہست پر بیٹھا قرآن شریف کی ایک سورۃ لحن کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ میں اپنی دھن میں غواور مست تھا۔ لیکن جب تلاوت ختم کرنے کے بعد اپنی نظر اٹھائی تو دیکھا کہ گاندہ بل علاقہ کے کچھ گوجر جو اس طرف سے گزر رہے تھے میری جیسی آواز میں کلام اللہ سن کر رُک گئے تھے اور اس کی تاثیر سے اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے تھے۔ بعد میں انھوں نے مجھے دعائیں دیں اور اپنا راستہ لیا۔ کچھ مدت یوں ہی لگتی رہی۔ لیکن پھر ہمارے کنبے کے دانشمند اور جہاں بیہ نانی نے، جس کا نام محمد رمضان تھا، غلام نجی کے والد اور میرے چچا شیخ عبدالکبیر کو جو خود بھی پڑھے لکھے



سربراہی راہی کرشنن کے ساتھ۔



جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر پی اے اے کے ساتھ۔



بچے اُن کی کبھی محبت تھے۔



جس وقت وہ سب کا اُن کا ہوا۔



سلاوی کوئٹہ کے صدر کنینڈا کے خاندان کے جرنل میکانائٹ کے ساتھ

یہاں سربراہان کوئٹہ کے خاندان کے جرنل میکانائٹ کے ساتھ





برطانوی چیمبرلین برطانوی اعلیٰ درجہ کا سفیر۔



شیخ کبیر الرحمن عثمانی قوم کے ساتھ۔

تھے، ہم دونوں کو مدرسے بھیجے پڑھائی کر لیا۔ پنانچہ میں نے پانچویں جماعت کا امتحان
وینڈر ٹانگ کے پرائمری سکول سے پاس کر لیا اور گورنمنٹ ہائی سکول دلاور خان باغ میں
داخلہ لے لیا۔ وہاں حاجی محمد اسماعیل نامی ایک بڑے نیک نصاب اور پارسا بزرگ میرے
پہلے فارم ماسٹر تھے۔ میں نے نصاب کے مضامین کے علاوہ سائنس اور ڈرائنگ اختیاری
مضامین کے طور پر لے لئے۔ آخر میرے دو بڑے بھائی مشق محمد مقبول اور مشق غلام محی
الدین کاروبار میں مباحثہ برائے اور گھر کی آمدنی میں اپنا حصہ ادا کرنے لگے تھے اس کا
فوری فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تعلیم جاری رکھنے میں کوئی الجھن نہیں ہوئی۔ مجھے فتح کول میں
واقع اپنے سکول تک کوئی دس سال کا فاصلہ آتے جاتے ہوئے روزانہ لے کرنا پڑتا تھا۔
لیکن سکول میں تعلیم پانے کا تصور ہی ایک ایسا انعام تھا کہ اس مشقت کو بھی خوشی
برداشت کر لیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس بات کا خیال کر کے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی کہ پیدل
چلنے کی مشق میں جو وقت صرف ہوتا تھا اس کی وجہ سے مجھے سکول کے کیل کود میں
حصہ لینے کا موقع نہ ملتا تھا۔ گو میں لوہپن میں کبڈی اور گلی ڈنڈا قسم کے کچھ کھیل بھی کھار
کیلا کرتا تھا لیکن کبھی بات یہ سہ کہ میرے لوہپن کے مصائب و مسائل نے مجھے اس
قسم کے شغل اختیار کرنے کی کم ہی ہمت دی۔ بہر کیف۔ دل کے یہ داغ سینے میں
پھنپائے ہوئے ہیں میں نے ششدری میں جناب یونیورسٹی سے جو ششدری تک میرے اقتدار
سنجھاں تک کشمیر میں امتحانات منعقد کرنے کا حجاز ادارہ تھا، میرٹھ کا امتحان پاس کیا۔
ششدری میں جب میری حکومت نے کشمیر یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی تب کہیں جا کر اس
صورت حال کا فائدہ ہوا۔ میرٹھ کے بعد سرگڑھ کے سر پر تاپ کالج میں ایٹ۔ ایس سی
میں داخلہ لے لیا۔ میرا ارادہ میڈیکل تعلیم حاصل کرنے اور ایک ڈاکٹر بننے کا تھا اس لئے

مضامین بھی اسی سنا بہت سے چن لئے۔ اب میرے روزانہ پیدل چلنے کی مشق میں
دو تین میل اور چڑھ گئے۔ کیونکہ لیس۔ پنی کالج اور دُور واقع تھا۔ میں صبح تڑکے گھر سے
نکلنا اور دن بھر کی اعصابی محنت کے بعد سنا بعد میرے گھر لوٹنا۔ یہ بالکل کشمیری محاورے
کی صورت تھی یعنی اذان کے وقت روانہ ہونا اور چراغ جلنے کے وقت واپس آنا۔
اس کا نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ یعنی کہ کچھ ہی دیر بعد اس مشقت سے میرے دل پر
بوجھ پڑنے لگا اور مجھے دل بڑھنے کا عارضہ لگ گیا۔ یہ میری دوسری شدید بیماری
تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے بچپن کی سب سے پہلی یاد بیماری سے ہی تعلق رکھتی ہے۔
جب میری عمر تین چار سال ہی کی تھی تو فوج پریمچک کا حملہ ہوا تھا۔ اُن دنوں اس کے
ٹیکہ کا چلن بھی نہ تھا۔ ہزاروں بچے اس بلا سے بے درمان کے بنے پڑے جاتے تھے لیکن
میں کسی طرح سے بچ ہی بچلا۔ کیوں اور کیسے۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ بہر کیف دل
بڑھنے کی شکایت پر مجھے درگجن، سرگڑھ کے مشن ہسپتال میں ایک عام بیمار کی حیثیت سے
داخل کر دیا گیا۔ اُن دنوں وہاں میرے ایک بھتیجے غلام محی بنی برطانوی تھے۔ جن کی
ٹانگ میں درد تھا۔ ڈاکٹر ارسلٹ اینٹ نیو اور ان کے برادر اس ہسپتال کو چلا رہے تھے
اور اُن کے بھتی کمال اور انسان دوستی کے ڈنگے بن رہے تھے۔ ہسپتال تختہ سلیمان کی
پہاڑی جس پر ڈوگرہ نگرانوں نے شکر آچاری کا نام چپکا دیا ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی

لے پُرانی فارسی اور سنسکرت تاریکیوں میں شکر چاریہ کا نام کہیں پر نہیں آیا ہے۔ اس پہاڑی کو کھن پڑت
(۱۹۳۹ء) گوپاڑی کے نام سے "داغ بیل" میں درج کرتا ہے۔ فارسی تاریخوں میں اس کے لئے تختہ
سلیمان کا نام استعمال کیا گیا ہے۔ ڈوگرہ جہاز یا نیپرسنگھ (۱۸۵۰ء - ۱۸۸۰ء) کے بھتیجے ناموں کو جگہ ملنے
کا جو سبب ملے اس کی اس کے تحت اس پہاڑی کا نام شکر چاریہ اور اسلام آباد کا انتہا جگہ رکھ دیا گیا۔

پر واقع ہے اور یہاں فہر کا بڑا خوشحوت منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس ہسپتال کو ۱۹۳۷ء میں، جب میں نے حکومت کی عین سنبھالی، سرکار کی بھڑائی میں لیا گیا اور اب یہ امراض سینہ کے علاج کے لئے مخصوص ہے۔ کچھ دیر ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد میری تندرستی بحال ہو گئی۔ لیکن اس تلخ تجربے کی روشنی میں میرے بڑے بھائی شیخ محمد محبوب نے مجھے کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دیدی۔ وہ بورڈنگ کالج اور کالج کی فیس اپنی نگہ سے ادا کرتے تھے۔ میرے زمانہ طالب علمی میں ایک انٹرشپنڈنٹ مسٹر میکڈونلڈ ایس۔ پی کالج کے پرنسپل تھے۔ انڈر اس فزکس کے پروفیسر تھے۔ ان کے بیٹے ہول ملٹونز مال ہی میں ملک کی شیعہ افواج کے کمانڈر انچیف رہ چکے ہیں۔ سردار بہادر ستھو علم نباتات BOTANY کے۔ مسٹر وائس انگریزی کے۔ مولوی ابراہیم عربی کے۔ عثمانی صاحب فارسی کے پروفیسر تھے۔ برجیشن مدن بڑی آن بان والے استاد تھے۔ چین کا کھیلوں نمائندوں میں خوب ہی لگتا تھا۔ ہمارے بورڈنگ کے پرنسپل میکڈونلڈ ایک مہذب اور استاد نگیر لسانی تھے۔ دو سال تک زیر تعلیم رہنے کے بعد میں نے مسٹر وائس میں کالج سے الٹ۔ ایس۔ سی کا امتحان اچھے نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ چین کے دن عام طور پر لڑکوں کے لئے بے فکری اور خوش وقتی کے ہوتے ہیں لیکن کچھ تو اُس وقت کے کشمیر کے سیاسی و سماجی حالات اور کچھ میرے خاندان کے خواہش معاملات کے سبب میرا دل کچھ خاصا سخت رہا۔ میں بھی عام طور پر تفتیش اوقات کے بجائے محنت و مطالعے کا عادی تھا۔ اور اپنے بستی سے لوگ تار تھا۔ اُن دنوں کی ایک یاد میرے حلقے پر نقش ہے، ایک دن میرا ایک بڑا بھائی پٹواری سے ہمارے گھر کی زمینوں کا خسرو لے آیا۔ میں اب پڑھ لکھ سکتا تھا۔ میں نے یوں ہی ایک نظر گوشوارے پر

ڈالی۔ جہاں میرے بھائیوں کے نام درج تھے۔ میرے نام کا کوئی اندراج نہ تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اپنے بھائی کی توجہ اس طرف دلائی۔ میری حیرت کی اُس وقت استہاد رہی جب بھائی صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور انہوں نے زور سے ایک حقیر میرے گال پر جڑ دیا۔ اُس حقیر کی چنگاریاں میرے حلقے میں ابھی تک بھوک رہی ہیں۔ پھر میں نے کبھی اس موضوع کو چھڑنے کی ہمت نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ چواری کے کاغذات میں وہ ضرورت اب بھی جون کی تون ہوگی۔

میری ایک اولین یاد میری والدہ کی عبادت گزاری سے متعلق ہے۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن پھر بھی نماز اور روزے کی بڑی پابند تھیں۔ میں اُن کو شروع و ختم سے نماز ادا کرتے اور دُعا مانگتے دیکھتا تو میرے دل میں اُن کی پیروی کرنے کا شوق لہریں مارنے لگتا۔ وہ نماز ادا کرتے وقت کتنی معصوم اور کتنی پاک باز لگتیں۔ رات کو نماز کے بعد کبھی کبھی مجھے بادشاہوں اور پریوں کے قصے سنایا کرتیں اور میرا چھوٹا سا ذہن نہ معلوم کن کن دنیاؤں کی سیر کرتا اور مڑے اٹھاتا تھا۔

▲▲▲

(۲)

استدائی آزمائشیں

ایعت۔ ایس سی پاس کرنے کے بعد میں اپنی جگہ مطمئن بیٹھا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں چونکہ یہ مضامین بہت کم لوگوں کے اختیار کرتے ہیں اس لئے حکومت مجھے ڈاکٹری کی تربیت حاصل کرنے کے لئے نامزد کرے گی لیکن بہت جلد میری یہ خوش فہمی حقائق کے ایک ہی علمائے سچے سے کاغذ پر پھوٹ کر رہ گئی۔ میں نے نامزدگی حاصل کرنے کے لئے حسب مفاد و فرائض دی لیکن میرا نام بائبل آئید وادوں کی اس فہرست میں شامل کرنے کے لائق نہیں سمجھا گیا جو ہمارا جاہری سنگم کے پاس منظوری کے لئے پیش کی گئی تھی۔ ہمارا جاہری سنگم نئے نئے گندئی نشین ہوئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے نام پر نادر مذہب "انصاف" کی تشہیر کرنے میں بڑے چاق و چوبند تھے۔ انہوں نے اس فہرست کو اس لئے مشرب منظور ہی مٹا نہیں کیا کیونکہ اس میں دکھاوے کے لئے بھی ایک مسلمان کا نام موجود نہ تھا۔ جب یہ فہرست واپس آگئی تو میں نے پھر قسمت آزمائی شروع کی۔ نہ معلوم میری گردن کی رگوں میں پھپھن سے ہی کیا ایسی خابیت ہے کہ مجھے آسانی سے گردن ٹھونکنا کافی نہیں آتا۔ قدرت نے چاہی ہو اور خوشامد کے کارگر ہتھیاروں سے بھی مجھے لیس نہیں

کیا ہے۔ اُن دنوں بھی جب کسی حاکم کی دہلیز پر ماتھا ٹیکنے کو خوش تیزی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی حاکم کے پاس جانے کا مجھے اتفاق ہوتا تھا تو میں نہ تو اُس کے آگے ہاتھ جوڑتا اور نہ گورگڑا کر بات کرتا۔ اُنسا اپنے حق کی تان پھیر دیتا۔ جو اُن دنوں کھلی بدتیزی اور سرکشی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس طور طریقے کا مجھے یوں نمایاں اٹھانا پڑا کہ کوئی افسر مجھے نہ لگاتا۔ اس بات کی بہت میرے بھائی صاحبان کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔ وہ بچارسے میرا بھلا چاہتے تھے۔ اس لئے میری اس روش سے انہیں پریشانی ہونے لگی۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی مقبول صاحب نے، جو دنیا کے چلن سے واقف ہو گئے تھے، مجھے ایک مرتبہ ڈانٹ بھی پلائی کہ یہ "حق حق" کی رٹ لگاتے دسے تو عمر بھر جھجک مارتے رہو گے اور آگے بڑھنے کا موقع کبھی نہ ملے گا..... ہونہار اور ہوشیار بڑے افسروں وغیرہ کی اکثر نئے عقائد پیش کر کے نرم کرتے ہیں۔ تم اپنے گھر سے شال ووشالہ کر کے افسروں کو رام کرلو۔ پھر دیکھو ٹھنڈا کام کس طرح ہو جاتا ہے۔ میرے بھائی صاحب میرے فہم بھی تھے۔ اور میں اُن کی بڑی تعظیم کرتا تھا۔ مگر نہ معلوم کس طاقت نے مجھے کہ کھولایا کہ چاہے میرا کام سنے یا نہ سنے، مجھے نہ کسی کی جھوٹی خوشامد ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی کی نصحی گرم کرنے کا مجھے آتا ہے۔ بھائی صاحب میری اس دُنیائے ناشائسی پر مایوس ہوئے اور انہوں نے معاملہ کو وہیں پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد تیرے معلوم تھا۔ فہرست ہمارا جگہ کے پاس واپس بھیج دی گئی۔ اس میں وزن شعر کے لئے ایک مسلمان امیدور غلام حسن کا نام شامل کیا گیا۔ بچارسے نے نہ معلوم کیا کیا پاپڑ میں کر اس فہرست میں جگہ پائی تھی۔ میں اور میرے ایک اور ہم جماعت ڈاکٹر سنفی محی الدین، جو اب لندن میں سکونت پذیر ہیں، رہ گئے۔ اس فہرست میں ڈاکٹر

گواہت لال کا نام بھی بھیجا گیا تھا۔ جو بعد میں کثیر کے ایک ممتاز معالج بن کر مشہور ہوئے۔ مفتی محمد الدین کے والد مفتی صدر الدین پنجاب میں رہتے تھے ان کا وہاں اثر و رسوخ تھا۔ پنجاب گورنمنٹ نے مفتی محمد الدین کو میڈیکل کالج میں داخلہ دے دیا۔ کثیر گورنمنٹ نے بھی الدین پر اعتراض کیا کہ چونکہ وہ بڑا پتلا اور غریب اس لئے تربیت حاصل کرنے کے نااہل ہے، پنجاب میں سرفصل کشین کا زمانہ تھا۔ وہاں بھی الدین کو داخلہ مل گیا۔ اور جب سندے کر آیا تو کثیر میں پہلے آفسر بن گیا۔ بعد میں کثیر گورنمنٹ کے مسلم ٹیچر روپیے سے تنگ آکر لندن چلا گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

ادھر مجھے اپنی زندگی کا پہلا عظیم صدمہ اٹھانا پڑا۔ میری والدہ ہم کو بے باوجود چھوڑ کر چلی گئیں۔ والدہ کی شفقت کے خلیں ہی میری اور میرے بھائیوں کی پرورش ہوئی تھی اور انہوں نے ہیں یہ احساس تک نہ ہونے دیا تھا کہ چارے والد دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی دانشمندی کے صدرتے والد مرحوم کے بعد ہمارے کنبے کا اتحاد قائم رہ سکا تھا اور ہماری لاج رہ گئی تھی۔ اور ان کی دور اندیشی کے خلیں ہی میری تعلیم و تربیت کا سلسلہ آگے بڑھا تھا۔ وہ دن میرے اور میرے بھائیوں کے لئے بڑی آزمائش اور جدوجہد کے دن تھے۔ ہم عام طور پر گھر سے باہر ہی رہا کرتے۔ مقبول صاحب ملازمت کے سلسلے میں شہر میں رہتے۔ محمد الدین صاحب تجارت کے سلسلے میں امرتسر وغیرہ میں ہوتے اور میں گھر سے دور شہر کے بورڈنگ ہاؤس میں۔ یہ تو ذی الجہنی تفریق کے عرنے کا دن تھا۔ گھر میں عید الاضحی منانے کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ اس لئے بھی لوگ وہیں رہا کرتے تھے۔ والدہ کو یوں تو کوئی خاص حکایت نہیں رہی تھی۔ وہ اپنا تک باتیں کرتے کرتے بکرا لگیں اور گر پڑیں۔ ہمارے دیکھنے ہی دیکھتے

ان کی پاک روح قفسِ عنبری سے پرواز کر گئی اور ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔ وہ دماغ کی نس پھٹ جانے سے انتقال کر گئیں تھیں۔ دوسرے روز ساری رات عید کی مسرتوں سے مرشارتھی لیکن ہم اپنی سب سے پیاری شاعر کے ٹٹ جانے پر آنسو بہا رہے تھے۔ میں تو خاص طور پر بہت بے حال ہو کر رہ گیا۔ بیٹوں تک والدہ کے ہی خیال میں گم سم بیٹھا رہا۔ یوں تو میری شکر کر کے خاموش تھا لیکن انھیں نہ جانے کیسے ساون کی گٹھاؤں کی طرح جھڑی برساتے لگیں۔ مجھے بار بار علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آتے تھے۔

میرے تیری بہت میری خدمت گر رہی

میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا تو پل ہی

خاکِ مقدس پر تیری لے کر یہ فریاد آؤں گا

اب دُعا ہے تم شب میں میں کیے یاد آؤں گا

والدہ نے اپنے آخری برسوں میں بڑی مشکلوں کا سامنا کیا لیکن ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ آیا۔ میں ان کی آخری اولاد تھا۔ اس لئے قاعدے کے مطابق انہیں مجھ سے خاص اُنس تھا۔ زندگی میں میں نے بعد میں بڑی اونٹنی بچ دیکھی لیکن وہ صبح کی کشمکش کی طرح پاکیزہ اور راحت فرا شفت چھ کبھی نصیب نہ ہوئی۔ شاید دنیا میں ماں کی مائتا سے بڑی رحمت نمودارندی کا تصور کیا بھی نہیں جاسکتا۔

اس صدمے کے بعد دنیا کے کاروبار نے پھر اپنی طرت متوجہ کیا۔ ڈاکٹر بننے کی ہوس پوری تو نہ ہو سکی۔ اس لئے میں پھر آگے بڑھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ کثیر میں بی۔ ایڈ کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ لیکن جنوں کے پرنس آف ویلز کالج میں یہ نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ میں جنوں گیا اور کالج میں داخلہ لینے کے لئے بڑی دھڑوہپ

کی۔ کالج کے پرنسپل ایک مسٹر شوری ہوا کرتے تھے۔ جب میں نے داخلہ لینے کے سلسلے میں اُن سے ملاقات کی تو وہ بڑی بے رٹنی سے پیش آئے۔ اور سخت سست الفاظ کہہ کر مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ جنوں میں اُن دنوں انجمن اسلامیہ نام کی ایک جماعت کام کر رہی تھی۔ میں بے چارگی کے عالم میں صدر انجمن جنرل سمندر خان کے پاس گیا اور اُن کے سامنے سارا ماجرا بیان کیا۔ جنرل صاحب نے اپنے چند ساتھیوں سمیت میرے ساتھ پرنسپل کے پاس چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن عین وقت پر میرے موانع کی عجیب آغوش دینے کا کام بگاڑ دیا۔ میں شوری صاحب کے سامنے گڑگڑاوا نہیں سکا اور میرے منہ سے ”حق کا خلافت سن کر انہوں نے میرا مقدمہ اپیل اور ویل کے بغیر خارج کر دیا۔ پرنسپل کے دفتر سے بے نیل و مراہٹکے تو جنرل سمندر خان نے میری دھلاس بندھاتے ہوئے کہا کہ ”بھئی تمہارا کام نہ ہونے کا مجھے بہت افسوس ہے، مگر تمہارا حوصلہ قابلِ داد ہے۔ بد قسمتی سے کشمیری مسلمانوں کا داخلہ فوج میں ممنوع ہے ورنہ تمہاری جرأت تو ایسی ہے کہ تم فوجی ملازمت میں نام پیدا کر لیتے۔ اگر تم شوری کی ذرا سی خوشامد کر لیتے تو تمہارا کام ہو جاتا۔ لیکن تم اپنے حق اور مسلمانوں کی مظلومی کی بات کر کے اُس کی دھکتی گک چیر لے رہے۔“

جنوں سے خالی ہاتھ لوٹنے کے بعد مجھے اپنا تعلیمی شوق پورا کرنے کے لئے ریاست سے باہر جانے کے لئے رخصت سفر باندھنا پڑا۔ میں نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں۔ بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ اُن دنوں عبداللہ یوسف علی کالج کے پرنسپل تھے۔ بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لینے کی کوشش مجھے ہوا ماکے فدیروں کی کونسل کے سیکریٹری ٹاکر جنک سنگھ کے وعدے کی وجہ سے بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں بی۔ ایس۔ سی کروں تو وہ وعدہ کرتے ہیں کہ مجھے ضرور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے

لئے سرکاری خرچے پر باہر بھجوا دیں گے۔ لیکن یہ بھی ایک وعدہ معشوق ہی ثابت ہوا کیونکہ جب بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے پھر حکومت کے دروازے کھٹکھٹائے تو انہیں کسی کونسل کی تجویز کی طرح بند ہی پایا۔ کوئی چارہ نہ رہا تو میں نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ یہ سفر بے تقریباً بے مقصد دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ میرا ارادہ کتنے ساتھیوں اور قانون کی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ لیکن یونیورسٹی حکام نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے میں نے ایم۔ ایس۔ سی کے لئے کیمٹری کو کھنچ لیا۔ اُن دنوں حکومت کی طرف سے ان مضامین میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے لئے کچھ وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ جو تقریباً لادبی طور پر غیر مشغلوں کو ہی ملتے تھے۔ میں نے اس وظیفے کے لئے درخواست کی۔ اُن دنوں آغا سید حسین رضوی ریاست کے وزیر تعلیم تھے۔ جب اُن کے پاس درخواست پہونچی تو انہوں نے مجھے اپنے پاس طلب کر لیا۔ اور بڑی لجاجت کے ساتھ اپنی بے بسی کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ تو مسلمانوں کی نمائندگی کے نام پر یہاں مامور ہیں۔ آپ کو اُن کے حقوق کی پاسبانی کرنی چاہئے۔ انہوں نے منہ بنا کر جواب دیا کہ ”میری مثال تو ایک گرامافون مشین کی سی ہے اُس پر جو ریکارڈ لگے گا وہی بچے گا۔ میری اپنی کوئی آواز نہیں ہے۔“ اُن کے اس استدلال پر میں بھوک اٹھا اور میں نے جواب دیا کہ ”اُس صورت میں تو آپ کو یہ گڑی چھوڑ دینی چاہئے۔ کوئی گنگھارام یا مینا داس آپ کی جگہ آئے گا تو میں اُس سے نہ پٹ لوں گا۔“ پچھارے آغا صاحب بھی بیٹھی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔ لیکن نہ ہی گڑی چھوڑ سکے اور نہ میری کچھ مدد کر سکے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر سید

اتحادیوں کے لائق ہوتے مگر اس مستود تھے۔ اور ان کی شخصیت کی چھاپ ہر جگہ نظر آتی تھی۔ علی گڑھ اُس وقت مسلمانوں کے ذہنی تلاطم کا اعلیٰ مرکز بن گیا تھا۔ پروفیسر ایم۔ ایم شریعت قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ اور ڈاکٹر پرنسپل شیعہ کیسے کے صدر۔

یہ ہندوستان میں تحریک خلافت کے پُر پوش اُبھار کے بعد اس کی ناکامی کا وقت تھا۔ اور اس نے ہندوستانی مسلمان مایوسی کا فکار ہو گئے تھے۔ لیکن ملک کی آزادی کے لئے ایک نئی بیداری کے شعلے جھلک رہے تھے۔ میرے لئے بھی اس تناؤ سے بھری ہوئی اور جذبات انگیز فضا سے لاتعلقی رہنا ممکن نہ تھا۔ میں ملک کے حالات سے کبھی کبھی بخشش میں آجاتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے باطنی تلاطم پر مضبوطی کا بندھ باندھ رکھا اور ایم۔ ایس سی، کا امتحان سینئر ڈویژن میں پاس کر لیا۔ میرے ہم جماعت حکیم غلام مرتضیٰ مرحوم نے بھی میرے ہی ساتھ امتحان پاس کر لیا۔ ہم ۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء کو علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر نیکلے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشمیر جا پہنچے۔ میں پہلا کشمیری مسلمان تھا جس نے سائنس میں ایم۔ ایس سی، کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ میں نے وطن آکر اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے ولایت جانے کے لئے درخواستیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن حکومت نے ولایت جانے کے لئے پوئیس سال کی زیادہ سے زیادہ عرصہ کو عہد مقرر کی تھی ہم اُس کو بھانہ چکے تھے۔ اس لئے ہماری درخواستیں سرسری سماعت کے بعد ہی ٹھکانے لگا دی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چوبیس سال کی یہ حد کمال چالاک سے مقرر کی گئی تھی۔ اور اس کا مقصد مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع سے محروم رکھنا تھا۔ وہ بھارسے یا قوتعلیمی اداروں کا رخ ہی اختیار نہ کر سکتے تھے، اگر جاتے بھی تو غری کی اُس حد کو بھی پانہ سکتے اور اس طرح حکومت اُن کی آنکھوں میں خاک بھونک کر اپنے

پسندیدہ اُمیدواروں کی جھولیاں بھر دیتی۔ میں اب اپنی مسلسل ناکامیوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس نظام سے کسی انصاف کی اُمید رکھنا پختہ سے دودھ مانگنے کے برابر ہے۔ رفتہ رفتہ میں اپنی انفرادی ناکامی کو ایک قوم کی اجتماعی ٹھیکڑی سے جوڑنے لگا۔ اُس دام کے ہلکے ہلکے فائدوں میں میرے ذہن پر آشکارا ہو رہے تھے۔ جو بڑی عیاری سے ہم رنگ زمین بنا کر بچھا دیا گیا تھا۔ تاکہ ہماری قوم اس کے پھندے میں گرفتار بھی ہو لیکن فوفا دادا اور دادی کے لئے پھر پھرانے کی فرصت بھی حاصل نہ کر سکے۔

یہ بات ۱۹۲۱ء کے پُر آشوب سال کی ہے۔ مجھے اُس وقت کیا معلوم تھا کہ میں ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوں۔ ایک قوم کی صدیوں سے کٹی ہوئی انگلیں اپنے اظہار کے لئے پرتول کر اندر ہی اندر چل رہی تھیں۔ اور قدرت اس آتش فشاں کا دہانہ کھولنے کے لئے میرے دل میں ایک مقدس الاؤ بھڑکار رہی تھی۔ بہت جلد وادی گل والہ میں اس آگ کے شعلے روشن ہونے والے تھے۔

▲▲▲

طوفانِ حوادث

میں نے پہلے دو ابواب میں مدرسے کی رسمی تعلیم کا ذکر کیا ہے لیکن میرا شعور اندر
بہی اندر ایک دوسرے مکتب سے اپنا اصل درس لے رہا تھا۔ اور میرے ذہن کا غیر گوندھ
رہا تھا۔ یہ مکتب میرے ارد گرد پھیلی ہوئی دسیج مگر خداوند سے برتر زندگی کا تھا۔ غالب
نے شاید اسی مکتب کے درس ہجرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

اپنی بنیاد کو بے طوفانِ حوادث مکتب

لہذا توجہ کم از سبیل اُستاد نہیں

مشاہدہ ہے کہ صبح بچھوٹے سے پہلے اندھیرے کا احساس اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ روشنی
میں کشمیر کے جیسے فرزندوں کے جوان اور چوڑے پچھلے سینوں سے صبح کی شفق کی جولان
دھارا چھوٹ بھی اُس سے قبل ظلمت کی گنگھور گشتائیں کس طرح دام بلاق طرح چھائی
ہوئی تھیں اُس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہیں اُس زمانے کو بھیسنے کا موقع
ملا ہے۔

گھسے باجر میرا مارا ماحولِ محنت کشوں اور مزدوروں کا تھا۔ میرے پردوں میں

پچھم کی طرف شالباغ رہتے تھے۔ شمال کی طرف شانہ سازوں اور محنت پیشہ لوگوں کی چھوڑ پیا
تھیں۔ اور مشرق میں تینی اور رنوگر گڈر بسر کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں کے بچوں بالکون کے
ساتھ میں نے اپنا بچپن گزارا۔ یہ غلیبی، تھابی اور سبکی کا ماحول تھا۔ میرے گھر کی کچی دیواریں
مجھے غم داندہ کی اُن لہروں سے ڈور نہیں رکھ سکتی تھیں۔ جو چاروں طرف مومیں مار رہی تھیں۔
یہاں یہ لکھ رہا ہوں اور میری یادداشت کے پردے پر ایک دل گداز سائے کا نقش ایسے تازہ
ہو گیا ہے کہ میرے دل کی وہ چوٹ پھر بری ہو گئی ہے۔ جو کوئی پون صدی قبل کی تھی، ہمارے
گھر میں رنوگر کی کا جو کارخانہ تھا اُس میں بڑی تیلوں، کاکا لڑکا عبدالاحد بھی میرے
ساتھ کام کرتا تھا۔ یہ ایک پرنشورش اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اور اپنی غریبی کے باوجود
نفاست پسند اور سلیقہ مند مزاج کا مالک تھا۔ وہ چند دن کارخانے سے غیر حاضر رہا۔ اور یہ
بتا دیا گیا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ایک دن اپنا تک اُس کے فوت ہو جانے کی خبر ملی۔
جس کو سن کر میں ہستے ہستے نکلیا۔ میں غمناک آنکھوں سے اُس کے گھر ماتم پُرسی کے لئے گیا۔ اور
دہاں باتوں باتوں میں اُس کے والدین سے اس ناگہانی موت کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے
جگر سودا میں بھر جکر جو ماجرا سنایا اُس نے میرے سارے وجود کو گھلا کر رکھ دیا۔ بات یہ
تھی کہ اُن کا گھر ایک سا ہونکا رکھ موقوف تھا۔ جو ہر صبح اُن کے دروازے پر سود بیاج کی رقم
وصول کرنے کے لئے آئے جھکتا تھا۔ چونکہ اُن کے پاس ادائیگی کا ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے انہیں
شود غوار کی جلی کٹی مسٹنا چرٹی۔ میرا ساتھی بڑے ششاس مزاج کا نوجوان تھا۔ وہ اس دفعہ روز
کی بے ہوشی سے بچنے کے لئے گھر کے خربے میں ہر ممکن بچت کرتا رہتا۔ جو تھوڑے بہت
چاول یا روکھی سوکھی روٹی ملتی اُس کو کجا کر اپنی دو چھوٹی بہنوں کے پیٹ کی آگ بجھاتا
تھا۔ اور خود اکثر دیشتر چاول کے ٹھوسے پر گڈر اوقات کر لیتا۔ جو دراصل چوپایوں کی خوراک

ہے۔ نتیجہ معلوم تھا۔ اُس کی صحت برا بگڑتی گئی۔ وہ چار غیرت کے مارے اندر رہا اندر
گھل گیا۔ اور آخر کلاس کا کام تمام ہو گیا۔ یہ واقعہ سن کر مجھے تھوڑی سی آنکھیں اور میں تڑپے
میں آگیا۔ میرے ذہن و ضمیر نے اس کا بڑا گہرا اثر قبول کر لیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے
اُس سے پوچھنے لگا کہ ایک طرف تو میں ہوں کہ وہ دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھا لیتا ہوں اور
دوسری طرف نمود میرے ہی گھر کے آگے میں میرا ہمسایہ ہے جو صحت مزدوری کرنے کے
باوجود مجھ سے کھا کر اپنی بھوک مٹانے پر مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ اُس کے نوکے کی منفعت
کی وجہ سے ہمارے کنبے کی خوشحالی کا پڑاؤ روشن رکھنے کی سبیل پیدا ہو گئی تھی۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ میرے حافطے کی لوح پر محفوظ ہے۔ میں بن بلوچ کو پوچھ
گیا تھا۔ اور میرے بھائی مجھ سے گھر کے چھوٹے بڑے کام کرواتے رہتے تھے۔ جب سال کی
تجارت میں مندا پڑ گیا تو ہماری بڑی بڑی زمینیں کاریگروں کے پاس واجب الادا رہیں۔ اور
ہیں ان کی وصولی کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ گاندربل تحصیل کے ڈب دوڑاؤ
کے ایک کاریگر کے پاس بھی ہماری کچھ رقم واجب الوصول تھی۔ عدالت نے ہمیں اس رقم
کی وصولی کے لئے ڈگری دیدی مگر وادوں نے مجھے بقایا دار کی منقولہ جائداد کی قوتی کے
لئے متعلقہ سرکاری کارندوں کے ساتھ بھیجا۔ اُس بچا سے کے گھر میں ہمیں چند چھٹی پڑانی
پٹائیوں اور ٹیکری کے کچھ گھر بیلو استعمال کے برتنوں کے ہوا اور کوئی چیز ہی نہیں ملی۔ میں
نے یہ حال دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ میرا ضمیر مجھے زبان حال سے مجھے پکارنے لگا کہ ایسے ہی
کاریگروں کی ہنرمندی کے عقیق قوت خوشحال زندگی گذارتے ہو۔ اب اگر شال کے یوپار
میں مندا پڑ گیا ہے تو اس بچا سے کا قصور کیا ہے؟ ایک پتا تو اُس پر یہ پڑی کہ اس
غریب کی کمائی کا ذریعہ چمن گیا ہے اور یہ ہمارے سہارے کا کچھ اور محتاج ہو گیا ہے۔

لیکن ہم اُنہا اس کی رہی ہوئی پوچھی سے سے محروم کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کا اور کیسا انصاف
ہے؟ اُس کے معصوم بچوں اور اہل و عیال کا کیا ہوگا؟ اس احساس سے مجھ پر ایسی جذباتی
کیفیت طاری ہو گئی کہ میں نے سارے دعویٰ نامے اور قرقی کے کاغذات کاریگر کے سامنے
ہی رکھ کر ڈالے۔ اور بڑے اُداس من کے ساتھ خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ جب میرے بھائیوں نے
وصولی کی رقم مانگی تو میں نے اُن کے سامنے اپنا دل کھول ڈالا۔ وہ مجھ سے ناراض تو
ہوئے لیکن میری باتوں کا کوئی جواب اُن سے نہ بن پڑا اور بڑا تڑپے ہوئے اپنے
گروں میں چلے گئے۔

ایک اور دن کا ذکر ہے کہ میں صبح سویرے اپنے محلے کے بازار کی طرف گیا۔ کیسا
دیکھتا ہوں کہ چنگی وصول کرنے والا سرکاری کارندہ ایک دیہاتی کو بڑی بے دردی سے
پیٹ رہا ہے۔ جا ڈول کے دن تھے۔ اور یہ کم نصیب دیہاتی جنگل سے ایندھن اکٹھا کر کے
ان لکڑیوں کو ٹٹوں پر لاکر شہر میں بیچنے کے لئے جا رہا تھا۔ کسٹم کی چوکی پر مقررہ چوکی ادا
کرنے کے بعد وہ جب چلنے لگا تو چنگی کے کارندے نے اُس کے بوجھ کی سب سے موٹی
لکڑی کا تقاضا کیا۔ ٹٹو بان جانتا تھا کہ یہ لکڑی گئی تو اُس کے مال کا ادعا مول اُتر جائے گا۔
اس لئے وہ بچکانے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ چوکی کے کارندے نے اُس پر دھڑ بھڑ برساتنا
شرع کر دیتے۔ اور غریب دیہاتی پٹائی سے تڑپ کر چیخنے پٹانے لگا۔ میں موقع پر پہنچ
کر کچھ بچاؤ کرنے لگا اور میں نے اس مار گٹائی کا سبب جاننا چاہا۔ بے چارہ لکڑیاں اور وہ
کرکٹے لگا کر اُس نے چنگی ادا کرنے کے علاوہ کئی لکڑیاں کارندے کو مفت دی تھیں لیکن
کارندے کا پیٹ بھر بھی نہ بھرا۔ اور وہ موٹی موٹی لکڑیاں بھتیانے لگا۔ لکڑیاں سے کہا
کہ اگر یہ لکڑیاں چلی گئیں تو اُس کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ اس کھٹی ہوئی زبردستی

احوال کے لئے موقع پر آیا۔ اُس کو اپنی پٹا نشانے کے لئے محلے کے کچھ لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ میرے برادر اکبر شیخ محمد طیل بھی موقع پر موجود تھے۔ محلے والے اُن کی کافی عزت اور تعظیم کرتے تھے۔ افسر مذکورہ نے سب سے پہلے پوچھا کہ "افسر محلہ" کون ہے؟ لوگوں نے یک زبان ہو کر میرے برادر اکبر کی طرف اشارہ کیا۔ محلے کے افسر نے یہ سننے ہی اُردو بکھانا اور کسی اشتعال کے بغیر ایک زور کا چاٹنا بھائی صاحب کے گال پر مارا۔ یہ سب کچھ اس قدیر ان کُن تھا کہ مجھے پرستانا چھایا۔ میں خود یہ ماہر دیکھ کر چند ثانیوں کے لئے ہلکا ہلکا رہ گیا۔ افسر مذکورہ نے کوئی قصور بتائے بغیر محلے کے سب سے معزز شخص کے ساتھ یہ ناروا اور ناشائستہ سلوک کیوں کیا۔ اِس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ دراصل اُن دنوں جاگرم لوگ اسی زبان میں اپنی رعایا کی دادرسی کرنے کے عادی تھے۔ اور اِس طرح سے دوسرے لوگوں پر دھونس بھی بجا دیتے تھے۔ تاکہ انہیں فریاد کرنے کا یا راہی نہ رہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد افسر مذکور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے گھر آ کر میرے بھائی صاحب کی ڈھارس بندھائی۔ لیکن اِس کے گھوننے سے میرے اپنے دل و دماغ کے اندر جس شدت سے جھنجھٹا تھے اُس کا کوئی مداوا انہیں کر سکتا تھا۔ میں اندر ہی اندر گڑبگڑنے لگا کہ آخر ہم مسلمانوں نے ایسا کیا لگا، کیا ہے کہ ہمارے ساتھ اس قسم کا دل آزار سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ریاست میں سب سے زیادہ آبادی اُن کی، سرکاری خزانے کو بھرنے والے وہ، پھر اُن پر بخلائی کی یہ تابڑ توڑ بیاغ کیوں اور کب تک؟

سرکاری کارندوں کی بھاری اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ چھوٹی سطح کے ملازمین کی اکثریت کشمیری پنڈت صاحبان کی تھی اور عوام کا براہ راست واسطہ

کو دیکھ کر میری جوان رگوں میں خون کھولنے لگا۔ میں چٹکی کے اہلکار سے کہنے لگا کہ اُس کو چٹکی کے پیسوں کے علاوہ کوئی اور چیز طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اہلکار نے میرے بگڑتے تہور دیکھ کر کٹڑ ہاسے کو تو چھوڑ دیا لیکن مجھے دھکی دی کہ وہ مجھے اس مداخلت کا مزہ اعلیٰ افسروں کے پاس شکایت کر کے چکھوائے گا۔ اور چوائوں کہ چند دنوں کے بعد میری بیٹی کسٹم کے ڈپٹی انسپکٹر کے سامنے ہوئی۔ جب میں نے اُس کے سامنے تمام واقعات رکھے تو شاید وہ میرے بچے کی درد مندی اور غلطی سے متاثر ہو گیا اور ہلکی سی سرزنش سننے کے بعد اُس سے میری جان چھوٹی۔

کشمیر کی وادی میں غذائی صورتحال بس اتفاق پر منحصر رہتی ہے اور موسم کے ماتھے پر ہلکی سی تبدیلی کیا پڑی کہ کشمیر میں بھیانک قحط مڑنا ہو گئے۔ چنانچہ ہماری ساری تاریخ اِس قسم کے خوفناک قحطوں سے بھری پڑی ہے جن میں گھروں کے گھر اُڑ گئے اور خاندانوں کے خاندان اکھڑ گئے۔ اس نازک صورت کے پیش نظر حکومت پہلے سے ہی سرینگر شہر کے باشندوں کے لئے اناج کی فراہمی کا بندوبست کرتی آئی ہے۔ میرے بچپن میں حکومت نے کسانوں سے زمین کے مالیک کا بیشتر حصہ جس کی صورت میں وصول کرنا شروع کیا جس کو ٹنڈو کہہ کر میکارا جاتا تھا۔ دیہات میں غلہ وصول کر کے اِس کو کشتیوں وغیرہ کے ذریعے سرینگر پہنچایا جاتا تھا۔ جہاں اِس کا ذخیرہ کرنے کے لئے بڑے بڑے گودام تعمیر کیے گئے۔ اس طرح سے فوڈ کورڈول کے سرٹھے کی داغ بیل پڑی۔ بیونیشی کی مدد میں رہنے والے لوگوں کو براہ ہندی پر اناج دیا جاتا تھا۔ ہمارا محلہ میونیشی کی حدود سے باہر تھا۔ اِس لئے ہمیں راشن لینے کا حقدار نہیں سمجھا گیا۔ محلے والوں نے چندیاں حاصل کرنے کے لئے محلے کے مالکوں کے پاس ڈھائی دی۔ جس کے نتیجے میں محلے کا ایک افسر پرنسپل

ان سے ہی پڑتا تھا۔ میں نے یہ نتیجہ اذکیا کہ مسلم اکثریت کے ساتھ ان کے اس سلوک کی بنیادی وجہ مذہبی امتیاز اور تعصب تھا۔ یہ اگرچہ ایک ادھوری حقیقت تھی لیکن ماضی کی تاریخ پر نظر ڈال کر اس کو تقویت ملتی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے عجیب سوالات ادھم چارے تھے۔ چنانچہ ایک دن میں نے اپنی والدہ سے سوال کر ڈالا۔ ”ہم پر کون حکومت کرتا ہے؟“ والدہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا ”کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا ہم ہے“ میں نے پوچھا ”پھر کئی مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی کیوں ہوتی ہے؟“

والدہ بھلا اس منطقی بحث کا کیا جواب دیتیں۔ نزاع ہو کر انہوں نے میرے گال پر ہلکا سا تھپڑ مارا اور مجھے خاموش کر دیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے واقعات آہستہ آہستہ ایک نرسٹر کی طرح آپس میں جڑتے جا رہے تھے۔ اور میری زندگی کی دیگر متقین کر رہے تھے۔ میرے باطن میں غیر محسوس طور پر کھونٹے والی سیاپ کا ایک حسزن اکٹھا ہو رہا تھا۔ جو تجھے نئی سمتوں کی طرف دھکیل رہا تھا۔ تقدیر میرے سفر کو کشمیر کے مستقبل کا ہم راہ کامیاب بناتی تھی۔

قدرت کا پُرکار ہر بات کو کیسے آنے والے حوالہ کی غائب کشائی کرنے والا تھا۔ اس کا تو کسی کو اندازہ نہ تھا۔ لیکن خیال و خواب کی دنیا پر انگریزی محاورے کے مطابق ڈونسا ہونے والے واقعات اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ ان ہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے ایک رات ایک بڑا ہی عجیب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میری ایک بھتیجی عروسی کے سبز اور شاندار جوڑے میں لمبوس اپنے مکان کی بالائی منزل کی بارہ دری، جس کو کشمیری زبان میں ”کانی“ کہتے ہیں، میں ایک مٹھی مسند پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک قیمتی ہیرا چمک رہا تھا۔ جس کی کرنیں اس قدر جگمگ جگمگ کر رہی تھیں

کہ نہ صرف ساری بارہ دری بقیع نور بنی ہوئی تھی بلکہ روشنی کھڑکیوں سے چھن چھن کر باہر لپک رہی تھی۔ اور ہر چہ کو چمکا رہی تھی۔ میری بھتیجی اکیلی بیٹھی ہوئی تھی کہ میں سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کی پیشانی سے یہ میرا اٹار کر اپنی ٹٹھی میں لے لیا اور میری ٹٹھی بھی اس کی چمک دیک سے روشن ہونے لگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ساتھ والے مکان کی طرف پتلے لگا۔ میرا بھتیجا بھی میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ اتنے میں مجھے یوں لگا کہ میرے بھائی صاحب ہمارا بھائی اس غرض سے کر رہے ہیں کہ اس ہیرے کو میرے ہاتھ سے چھین لیں۔ میں تیز تر دوڑا جھڑتا ہوا دوڑے مکان میں جا پہنچا۔ اور جلدی مبدلی ہیرے کو چٹائی کے نیچے چھپا دیا۔ لیکن یہ چٹائی بھی اس کی روشنی سے چمکنے لگی۔ میرے بھتیجے نے یہ عالم دیکھ کر مجھ سے یہ میرا مانگ لیا۔ میں نے اس ہیرے کو اٹھا کر اپنے بھتیجے کے حوالے کیا۔ قدرت کی کارسازی ملاحظہ ہو کہ میرے بھتیجے کی بیٹیلی میں پہنچتے ہی روشنی مجھے غائب ہو گئی۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک بے نور لٹکر رہ گیا۔ میں صبران ہو گیا اور اپنے بھتیجے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اس نے اس جوہر کو کیا سے کیا بنا دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ بھتیجے میاں کھسیا سے ہو گئے اور انہوں نے یہ بارہ رنگ پھر مجھے لٹا دیا میرے ہاتھ پر پڑنے کی دیر تھی کہ یہ پتھر پھر تاباں ہو گیا۔ میں نے اپنے بھتیجے کے آہٹ دیکھ لیا۔ نا کہ یہ تاخیر جتن میں نہیں ہے بلکہ میرے ہاتھ میں ہے۔ ابھی میں اس جوہر کو تھامے ہی ہوا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اس خواب کی تعبیر یہ بھی کہ میں حکومت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے دلیخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن جب میں نے اس کی تعبیر ایک سین رسیدہ ٹیکر ماٹرسے، جو خوابوں کی تعبیر بتانے میں شہرت رکھتا تھا، پوچھی۔ تو اس نے کہا کہ دلیخہ تو چھوٹی بات ہے تم دنیا میں اس قدر شہرت حاصل کرو گے کہ

دوست دشمن سبھی دنگ رہ جائیں گے۔ میں اس تیسری پر قہقہہ مار کر ہنس پڑا کیونکہ بظاہر
اُس وقت اس قسم کی خوش فہمی کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ لیکن اب سوچتا ہوں
تو قبائل کے اس شعر کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ گم و تار
بوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

▲▲▲

(۳)

ساحل سے سمندر کی جانب

اپنی ذات اور خانوادے کے کنوئیں سے مجھے کبھی کبھی جب نظر اٹھانے کا موقع ملتا
تھا تو مجھے ظالم اور مظلوم کی ایک بے رحم کشمکش نظر آجاتی۔ اچانک میرے دل میں ایک ہلک
سی اٹھتی کر میں ذات کا جھڑپ توڑ کر کشمکش میں کود پڑوں مظلوم کی پاسداری کروں اور اگر
اُس کو ظلم سے نجات دلا سکوں تو اسی کشمکش میں جان دے دوں۔

مستشرقین کے موجد بہار کی بات ہے کہ ریٹم خانہ کے مزدوروں نے کارخانے کے
اندر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ پہلی بار مظلم ہوئے اور انہوں نے اپنے
مطالبات منوانے کے لئے جدوجہد کی۔ وہ ضروری بارے میں جمع ہو گئے۔ حکومت نے
رسالہ فوج کو، جو نئے نئے لئے ہوئے تھی، اُن پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔ اور اس طرح
بہت سے مزدور زخمی ہو گئے۔ شہر میں شاید ہی کوئی متحدہ ایسا رہا جو یہاں کا کوئی باشندہ
اس زمیں نہ آیا ہو۔ اس شہر میں سخت اضطراب پھیل گیا اور مزدوروں نے ایک بھاری
جلوس نکالا۔ جس میں اُن کی عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ حکومت کی
زیادتیوں کی دہائی دے رہے تھے۔ اور شہر کے ختافت بازاروں سے گزر رہے
تھے۔ یہ اس قسم کا پہلا احتجاجی جلوس تھا، جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی

وجہ سے شہر میں سنسنی پیدا ہو گئی اور میں نے بھی اس کا بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ میرے اندر کوئی قوت جیسے بند تو ذکر باہر آنے کے لئے تڑپ اٹھی۔

ایک اور واقعہ جس کا میرے ذہن پر بڑا گہرا اثر پڑا، انہی دنوں پیش آیا۔ ہند کے برطانوی وائسرائے لارڈ ریدنگ اپنی بیگم سمیت کشمیر کے دورے پر آنے والے تھے۔ یہ ایک بڑے بڑے ملک کی بات ہے۔ ان دنوں کشمیری مسلمانوں میں ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف زبردست ناراضگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان کو داد دہی کا ایک ہی راستہ نظر آیا۔ کسی طرح ہمارا جے کے انگریز آقاؤں تک فریاد پہنچا دی جائے۔ شاید وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ کر ہمارا جاکو اصلاح احوال کی صلاح دے۔ چنانچہ سر سیکر کے چند مسلمان معززین چوری چھپے بلے اڈا انہوں نے ملے کیا کہ جب وائسرائے کی آمد پراس کا دریائی جہاز جہلم میں سے گزرے تو کناروں پر جمع لوگ سیاہ جھنڈیاں دکھا کر وائسرائے کی توہین مسلمانوں کی ذہول حالی کی طرف دلایں۔ انہوں نے اپنی شکایات کو انتہائی زار دارانہ طریقے سے ایک یادداشت کی صورت دی۔ حکومت کے شک و شبہ سے بچنے کے لئے ان کی مشورت قبرستانوں کی تہائیوں میں ہونی تھی۔ یادداشت پر خواجہ سعد الدین شال، خواجہ حسن شاہ نقشبندی، میر واعظ کشمیر مولوی احمد اللہ ہمدانی، آغا سید حسین جلالی، مفتی شریف الدین اور دوسرے اصحاب نے دستخط کئے تھے۔ اور اس میں مسلمانان کشمیر کی حالت زار کا نقشہ اعداد و شمار کی مدد سے کھینچے ہوئے وائسرائے سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ان شکایات کی تحقیقات کروا کر ان کے ازالہ کی تدبیر کریں۔ یادداشت میں کل ستروہشت نکات درج تھے اور خاص طور پر کسانوں کو زمین کے حق ملکیت کی واپسی کا سوال اٹھایا گیا تھا۔ جو حکومت نے چھین لیا تھا۔ اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں

میں ان کی جائز نمائندگی کا سوال اٹھاتے ہوئے انکشاف کیا گیا تھا کہ جہاں وادی کشمیر میں غیر مسلم گزٹڈ آفسروں کی تعداد چار سو اکیس ہے جو ساڑھے سولہ لاکھ روپے سے زائد کا مشاہدہ پاتے ہیں، وہاں مسلمانوں کو گزٹڈ آفسروں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں جو ڈیڑھ لاکھ روپے سے کم تنخواہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی سہولیات، بیگار کے خاتمے، مسجدوں اور دیگر مقامات کی ونگڈاری کے مطالبات بھی درج کیے گئے تھے۔ یہ ساری روڈاد صیغہ رازی میں رکھی گئی تھی۔ وائسرائے کے ساتھ ان کی میم ایس بھی تھیں۔ ان کا دریائی جہاز جب شاہی شان و شوکت کے ساتھ خاقانہ عثمانی کے سامنے سے گزرا تو کینارے پر جمع مسلمانوں نے پانک سیاہ جھنڈیاں لہرائیں اور فریاد، فریاد، فریاد، فریاد، کے نعرے زور زور سے بلند کئے۔ یہ شور و غل چا تو وائسرائے، اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہمارا کشمیر اور دیگر عائدین سلطنت کی توجہ اس طرف کو ہو گئی۔ اور ہجوم نے کسی طرح عرضداشت کا مسودہ، جو منشی سراج الدین، سمیت کشمیر ریذیڈنسی کے چند مقامی اہلکاروں کی مدد سے ترتیب اور تیار کیا گیا تھا، وائسرائے تک پہنچا دیا۔ اس کا ردوائی سے سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ وائسرائے نے اپنی سامراجی روایات کے مطابق عرضداشت ہمارا جاکے پاس بھیج دی جس نے اپنے ماتحت تین افسروں کی ایک کمیٹی کے ذریعے، جس میں ان کے ایک قریبی رشتہ دار رائے بہادر جگ سنگھ بھی شامل تھے، تحقیقات کا ڈھونگ رچا کر اسے داخل دفتر کر دیا لیکن جن مسلمان معززین نے اس پر دستخط کر دیے تھے ان کا سراغ لگا کر ان سے نیشا شروع کر دیا۔ خواجہ سعد الدین شال کو، جو سر سیکر کے ایک رئیس خاندان کے ستم و چڑاغتھے، گرفتار کر لیا گیا اور ان کے ریاست میں

داخلہ پر پابندی عائد کر کے انہیں جلا وطن کر دیا گیا۔ خواجہ حسن شاہ نقشبندی کے صاحبزادے خواجہ نور شاہ نقشبندی کو، جو تحصیلدار تھے، ملازمت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ان کے بیٹے جلاوطنی کو بردباری کے منصب سے ہٹا دیا گیا اور جلاوطن کر دیا گیا۔ جاگیر بھی ضبط کی گئی۔ میر واعظ کو درباریوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا اور انہیں تنبیہ کی گئی۔ باقی دستخط کنندگان کو بھی سی سرزنش کی گئی۔ کیونکہ انہوں نے معذرت چاہی اور چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اگرچہ یہ واقعہ بجائے خود بے علامت تھا لیکن اس سے مسلمان عوام سے تعلق ہی رہے۔ کیونکہ اس ساری کارروائی کو عوام سے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ نہ تو ان کو اعتماد میں لینے کی کوئی کوشش کی گئی تھی اور نہ ہی ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوئی تدبیر کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارا ڈرامہ اوپر ہی اوپر کھیلایا اور سماج کے بڑے قلوب میں کوئی لہر پیدا نہ کر سکا۔ لیکن میرے لئے اس واقعہ کی حدائے بازگشت بہت دلوں تک موجود رہی۔

بات یوں ہے کہ جب کچھ ہی عرصے کے بعد میں نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ حاصل کر لیا تو کشمیر کے واقعات کو گونج وہاں بھی پہنچے لگی تھی۔ خواجہ سعد الدین شال اور خواجہ نور شاہ نقشبندی لاہور میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ دونوں بزرگ لاہور میں ایک پڑائے معزز کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ نظام الدین کے یہاں رہتے تھے۔ میرے لئے یہ گھر سے باہر رہنے کا پہلا موقع تھا۔ اس لئے پہلے پہل گھر اور انہوں کی یاد بہت شادی سی لیکن جلد ہی میں پڑھائی میں مگن ہو گیا۔ البتہ کبھی کبھار تہمت ملتی تو میاں نظام الدین کے یہاں شال صاحب اور خواجہ نور شاہ سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے چلا جایا کرتا۔ ایک دن کا ذکر

ہے کہ میاں صاحب کے دیوان خانے میں محفل سخن آراستہ تھی۔ باتوں باتوں میں شال صاحب اور نور شاہ صاحب نے اس بات کا لگہ کرتے ہوئے اپنے رنگ کا اظہار کیا کہ کشمیری عوام نے ان کی جلا وطنی پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہمیں بالکل بھلا دیا ہے اور ہم ہیں کہ ان کی خاطر مصائب اٹھا رہے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ انہی دنوں ہمارا جاہری سٹیج ایک میسرے مسلمانوں کو کھلونے دے کر بھلانے کے لئے سربراہی کی عید گاہ چلا گیا تھا اور مسلمانوں کے تین خیر سگانی ظاہر کی تھی۔ خواجہ صاحبان کا شکوہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس وقت جہازہ کے پاس فریاد بردار کرنی چاہیے تھی اور انہیں خاموشی سے رخصت نہ ہونے دینا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر اپنے منہ چھٹ انداز میں اس خیال سے اختلاف کیا۔ میں نے کہا یا دداشت پیش کرنے والوں نے عوام کو اپنے حریفے اور ارادے سے قطعی طور پر بے خبر رکھا تھا۔ اس لئے جب آپ لوگوں کو جلاوطن کر دیا گیا تو کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی اصل وجہ کیا تھی۔ اگر عوام کو اعتماد میں لینے کے لئے میلان پہلے سے ہوا کیا گیا ہوتا تو حکومت کو یہ اقدام کرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ میاں نظام الدین صاحب، میاں امیر الدین اور ان کے کچھ اور ہم نشین احباب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ میرے بزرگ خواجہ صاحبان سے کوئی جواب نہ پڑا تو وہ برہم ہونے لگے۔ اور لکھار کے لہجے میں مجھ سے کہنے لگے ”اب دیکھتے ہیں کہ تم کیا کر دکھاؤ گے۔“ میں نے جواباً عرض کیا ”ان شاء اللہ وقت آنے پر دکھائیں گے ہم سے کیا ہو سکتا ہے۔“ بات آئی گئی ہوئی۔ لیکن جیسے میرے ذہن و ضمیر میں ایک نئے عزم کی چنگاری سلگ اٹھی۔ قریب الوطنی میں انسان کے حب الوطن کی جس کچھ زیادہ ہی تیسرے ہو جاتی ہے۔

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں

لاہور کے قیام نے مجھے کچھ اور وجوہات پر ہٹو کے دے دے کے بیدار کیا اور ایک روحانی کرب سے آشنا کر دیا۔ میں نے کشمیری مسلمانوں کو بڑے بڑے قاتلوں کی صورت میں اپنے خوبصورت وطن سے پنجاب کے چیل اور سرنگھار میدانوں کی طرف جاتے دیکھا یہ لوگ اپنی سرزمین سے روزی نہ پا کر لڑیں کی تلاش میں پنجاب کا رخ کرتے تھے۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اپنی شاداب سرزمین اُن کے پیٹ کی آگ بجھانے کے سلسلے میں کسی ہاتھ کی کوکھ کی طرح خشک ہو گئی تھی۔ جس سے اُنکے والی گھاس بھی زعفران بن جاتی ہے۔ ملاحہ عرفی جیسے شاعر نے اس کی تعریف میں کہا تھا کہ اگر کوئی بھلسا ہوا پرندہ بھی کشمیر پہنچ جائے تو اُس میں نئی زندگی پیدا ہوگی اور اُس کے بال و پر اُڑا کر آگ آئیں گے۔ ان مزدوروں کو ہاتھال اور مری جیسے برقی کوہستان بیدار طے کرنا پڑتے تھے اور یہ ہزار وقتیں برداشت کیے آگے بڑھتے۔ ہر ایک کے ساتھ کھاتے پینے کی کچھ مشایا اور مٹی کے چند ٹوٹے پھوٹے برتن ہوتے تھے۔ جہاں شام ہو گئی وہیں ڈیرا اُمداد یا۔ ننگی زمین اُن کا فرش اور کھلا آسمان سایہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات پہاڑوں کی چوٹیاں نمودار کیستے ہوئے وہ برقی طوفانوں کی نذر ہو جاتے۔ نہ مکھن دفن کی نوبت آتی تھی اور نہ جنازے اور فاتحہ کی باری۔ اُن کی بے گورو کفن لاشیں گدھ اور دوسرے آدم خود جانوروں کا تغذیہ بن جاتی تھیں۔ کچھ عیسویوں کے مارے سخت جان پنجاب کے شہروں میں پہنچ جاتے تو وہاں بھی غم و الم کے سایے اُن پر منڈلاتے ہی رہتے۔ دن بھر گلی کو چوں

میں مزدوری کی تلاش میں خاک چھانتے۔ کوئی لکڑہارے کا دھند کرتا تھا کوئی اپنے شانوں پر بھاری بھر کم بوجھ ڈھونڈتا تھا۔ کوئی کسی دوکاندار کی خدمت گاری اختیار کرتا تو کوئی پکنا پینے کا کام کرتا۔ دن بھر خون پسینا ایک کر کے چنڑے کھا لیتے تھے جن میں اکثر دھکی سٹوکی سے شکر پڑی کرتے تھے اٹھ جاتے۔ رات کسی مسجد یا سرائے میں گزارتے اور وہاں بھی اُن کو بے زبان مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا۔ کئی بار میں نے کچھ کشمیری مزدوروں کو روٹی کے لئے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ مجھے شرم سی محسوس ہوئی۔ اور میں نے ایک مزدور سے پوچھا ”کیا تم مزدوری نہیں کرتے کہ بھیک کی نوبت آگئی ہے؟“ مزدور نے جواب دیا کہ ”جی ہاں۔ ہم مزدوری ضرور کرتے ہیں بہت ہوا تو دن میں بارہ سولہ آئے کماتے۔ لیکن ہم اس پونجی کو جمع کرتے ہیں کیونکہ واپسی پر سرکاری مالیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ بال بچوں کے لئے کچھ کپڑے لئے بنانے پڑتے ہیں۔ اور کچھ چائے، نمک ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ اگر ہم اس پیسے کو اپنا پیٹ پالنے پر ہی خرچ کر لیں تو یہ سب اخراجات کہاں سے ادا کریں گے؟“ مزدور نے یہ لفظ کچھ اس بلے سانھی اور سادگی سے کہے کہ میں اس جواب سے تڑپ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ کشمیر کے ہمارا جا اور اس کے مصاحبوں کا جاہ و شہم اور محاشات بات ان مزدوروں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کا صدقہ ہے لیکن خود بچاڑے یہ جانوروں کی طرح دیارِ غیر میں سٹو کریں کھاتے پھرتے ہیں۔ میرے دل کے زخم اُس وقت اور بھی شدت سے رسنے لگے جب میں نے لاہور کے گلی کوچوں میں کشمیری مزدوروں کی لاشیں پڑی ہوئی دیکھیں۔ راہ گیر اُن پر ایک نظر ڈال کر ایسے کئی کاٹ کر بچل جاتے تھے جیسے یہ انسانوں کے جسم نہ ہوں بلکہ ناموس کے ڈھیر ہوں۔ ان کے کفن دفن کا انتظام کرنے کی فکر بھی کون کرتا۔ ان لاشوں کی بے پرواہی

کھلی آنکھیں گویا عدائے دو جہاں سے فریاد کرتی اور غالب کا یہ شعر پڑھتی نظر آتیں ۔

مجھ کو دیارِ فیس میں مارا وطن سے دور

رکھ لی میرے خدا سے میری بے کسی کی شرم

ان بد نصیبوں کو جیتے جی زندگی کی کوئی راحت تو نصیب نہیں تھی۔ لیکن مرتے ہوئے اپنی مادرِ وطن کے مٹیائے انجمن کی شہنشاہ سے بھی محروم رہتے۔ چونکہ کوئی دعویدار نہ ہوتا اس لئے انہیں ہسپتالوں میں زیرِ تربیت طلباء کی چر بھار کا تختہ مشق بننا پڑتا۔ زندہ کشمیریوں کی حیثیت اور غیرت پر توہین اور ہتک کے تازیانے برسائے جاتے تھے۔ انہیں ”ہتھو“ کے ہتک آمیز نعوت سے پکارا جاتا۔ عام مزدور کی بات چھوڑ دیجئے۔ خود مجھے کئی بار اپنے پنجابی دوستوں کے اس حقارت آمیز سلوک کا شکار بننا پڑا۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ اس نفرت انگیز ذہنیت کی ضرب کتنی کاری ہوتی ہے۔ اور کیسے محبت اور غیرت کے سرخیوں میں اُبال پیدا کر دیتی ہے۔ میرے لئے اس قسم کے مناظر ہمیشہ بے حد صبر آزا ماہوتے تھے۔ اور یہ میری رگوں میں اس انداز سے خون بہاؤں اُچھال دیتے کہ اگر میرا بس چلتا تو میں اتنی وقت اس اہانت کا بدلہ چکا دیتا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں اُن دنوں پروفیسر دل محمد کا بڑا شہرہ تھا۔ ڈاکٹر احمد نرسکس کے پروفیسر تھے۔ یہ صاحب کچھ عرصہ تک کالج کے قائم مقام پرنسپل بھی رہے۔ میں ریواز (REWAZ) ہوسل میں رہتا تھا۔ اُن دنوں وہاں فتح عبدالغفار دانی بلکہ سماجی مفکروں پر چھائے ہوئے تھے۔ اور اُن کا رسالہ ”مزن“ مرغوب عام و خاص تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم لالہ لاچنت داسے سرکنڈہ ریجیات خاں سرحد شفیق وغیرہ کا سیاسی دنیا میں دب دب تھا۔ نوائین میں یگم شاہ فواز کا خوب

چرچا تھا۔ لاہور میں کشمیری برادری کا بھی ایک الگ دائرہ تھا۔ لاہور بلکہ پنجاب میں بسنے والے کشمیریوں میں اُن دنوں رواج تھا کہ وہ اپنی برادری میں ہی رشتے ناٹے کرتے۔ محمد دین قوٹی صاحب اپنے کشمیری اعتبار میں کبھی کبھی نچمت سے ہی میں کشمیریوں کی مظلومیت کا کوئی اٹھانہ محتاط سے انداز میں کرتے تھے۔ میاں امیر الدین، مستید عمن شاہ وغیرہ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اور کشمیری گاما پہلوان کے بہتر نماں ہونے کا ذکر بڑے فخر سے کرتے۔ ہم نے بھی اس عظیم پہلوان کو کئی بار اکھاڑے میں داؤ پیچ کا مظاہرہ اور اپنی شہ زور نگاہ کا دکھائے دیکھا۔

لاہور کے قیام میں ہی میں نے سب سے پہلی سینا دیکھی۔ اُن دنوں غملوں میں مکملے وغیرہ نہ ہوتے تھے اور یہ خاموش غمیں کھلاتی تھیں۔

لاہور میں اپنے زمانہ قیام میں، میں نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شہرت بھی سنی، اُن کے کلام سے میں پہلے ہی آشنا ہو چکا تھا اور کئی نظمیں تو مجھے ازبہر تھیں۔ میں نے لاہور میں کئی کشمیری دوستوں سے سنا کہ علامہ کشمیر کے معاملات سے گہری دل سپی رکھتے ہیں اور کشمیری مسلمانوں کی حالت زار سے وہ شدید ذہنی اور روحانی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ میں نے علامہ کو پہلی بار انجمن حمایتِ اسلام کے ایک جلسے میں دیکھا۔ جہاں انہوں نے اپنی نغمہ پری اثر آفرین لہن میں سنائی۔ اُن کے کلام کا مفہوم اور پھر اُن کی آواز کا جادو۔ میرا وجود موسیقی شمع کی طرح پُپ پُپ بجھنے لگا اور میں تاثیر کی کسی اور ہی دنیا میں پہونچ گیا۔ اُس وقت مجھے ایک مہووم سا اندازہ ہوا کہ مجھ کی کس طرح سوسے ہوئے دلوں کو مہووم اسرائیل کی طرح بیدار کر سکتا ہے۔ اور کس طرح پتھروں کو مہووم بنا سکتا ہے۔ اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے گلے کو بھی غلائے لایزال نے اپنی نعمت بے پایاں

کے ایک قطرے سے مرشار کر دیا ہے اور اس کی آواز ایک دن کثیر کے دشت و جبل میں گونج کر اس کے سامنے پر جی ہوئی غلامی اور نلاکت کی برف کو چھلانے میں کارگر ثابت ہوگی۔ بعد میں کچھ دوستوں کے ساتھ علامہ کے حضور بھی حاضری دینے لگا لیکن ہم سب اُن کی کوہ وقار شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ بہت دنوں تک صرف نُسٹے رہے اور اپنی طرف سے مجالِ سخن نہ لائے۔ لیکن آہستہ آہستہ خود علامہ کے الفاظ میں ہی:

کرتے ہیں خطاب آئے ہیں جواب آخر
ہماری بے محنتی بڑھنے لگی لیکن اس کی تفصیل بعد میں۔

لاہور کے قیام میں ہی میں نے بلبل ہند مسرور جونی نائیڈو کی بہتے ہوئے آبشار جیسی تقریر کی روانی کو دیکھا۔ انہوں نے ہمارے کالج میں تقریر کی اور میں اُن کے انداز بیان اور گرمی گفتار پر عرشِ عشق کراٹھا۔ اُن دنوں لاہور میں مولانا قنفذ علی خان کے اخبار زمیندار کا بڑا شہرہ تھا۔ اُس کی پٹ پٹی سرخیاں اور جوشیلی مگر سنگائی نظمیں بڑی پسند کی جاتی تھیں۔ میں بھی اُس کے بے باک اندازِ نگارش کا قائل ہو گیا۔ ہنوا اخبارات میں بلاپ اور پرتاپ کا طوطی بولتا تھا اور اُن کی اپنے مسلمان معامروں سے خوب چٹمک رہتی تھی۔ پنجابی سیاست کا سارا رنگ اِن اخبارات میں جھلکتا تھا۔ اور انگریزی میں ٹریون اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کا سیکر چلتا تھا۔ اسی دوران میری ملاقات مولانا محمد تقی لاہوری سے ہوئی جو آزاد خیال احمدی تھے اور مزاحیہ امجد کو نبی کی بجائے صرف مجتہد مانتے تھے۔ وہ بڑے شعلیق بزرگ تھے اور مذہبی امور پر اُن کی نظر گہری تھی۔ بعد میں میں نے اُن کی تفسیرِ قرآن مجید بھی دیکھی اور مولانا ابوالکلام کے ترجمان القرآن کے بعد اس تفسیر میں عام عاصی اثر ہوا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں قیام کے دوران مجھے ہاتھ لگا نہ جی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ہاتھ لگا نہ جی وہاں طلباء کی دعوت پر آئے ہوئے تھے۔ اُن دنوں انہوں نے ملک میں آزادی کی ایک نئی جوالا شعلہ دیا تھی اور ہم اُن کو بڑے شوق کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ کوئی خصلہ بیان مقرر تو نہیں تھے لیکن اُن کی قلندرانہ ادائیں ایسی تھیں کہ دور سے دیکھنے والے کا دل جھین پیتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی شخصیت میں تیسرے قلوب کی جو قوت موجود تھی اُس کا فوراً اندازہ ہو جاتا تھا۔ ہر دستہ و مقام اس کی غایت پہنچتی ہوتی ہے۔

قیام علی گڑھ کا وہ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا جو ہمارے استاد ایم ایم شریف کی ذات سے وابستہ ہے۔ انہوں نے ایک بار طلبائے خطاب کیا اور اُس کے دوران انہیں نصیحت کی کہ اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ ہمت اور حوصلے سے جدوجہد کرنی چاہئے۔ اُن کی آواز میں ایک ردھک کی کیفیت تھی۔ یہ بات اُن کی زبان سے نکلی اور میرے دل میں ترائو ہو کر رہ گئی۔ میرے ارادوں میں اس سے ایک نئی تازگی پیدا ہوئی اور میں نے زندگی کے مشکل مرحلوں پر اسے یاد کیا ہے۔

میرے علی گڑھ کے قیام میں وہاں تین دانش پانسلر بیٹے۔ جب میں گیا۔ تو ڈاکٹر ضیاء الدین تھے لیکن اُن کی تقرری کے سلسلے میں کوئی جھجکا چل رہا تھا۔ کچھ دیر کے

لہ ایم ایم شریف علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد تھے۔ وہ پروفیسر بھی رہے اور قائم مقام دانش پانسلر بھی۔ پنجاب کے مشہور سیاسی رہنمایاں افتخار الدین کے والد بیسی تھے۔ انہوں نے اقبال کی برالیاں اور تحفۂ اسلامیہ پر وسیع کام کیا ہے۔ اُن کا اشتغال تقسیم کے بعد لاہور میں ہوا۔

لئے ایم ایم شریف قائم مقام وائس چانسلر رہے اور جب میں علی گڑھ چھوڑ رہا تھا تو اُس وقت سر اس مسعود اس منصب پر فائز تھے۔ میرا علی گڑھ میں حیدری منزل اور آفتاب ہوٹل میں قیام رہا۔ میرے ساتھ اور بھی کشمیری طلباء علی گڑھ میں زیر قیام تھے۔ جن میں سے مجھے اس وقت توفیق مرحوم کے علاوہ محمد رجب، غلام الدین اور غلام احمد مختار کے نام یاد آ رہے ہیں۔ یہ بھی تقریباً میرے ہی ساتھ فارغ التحصیل ہو کر آ گئے۔

▲▲▲

واقع کی شہر پر وفاداران اذلی یعنی آغا سید حسین وزیر تعلیم، جنرل سمندر خان، کرنل غلام علی شاہ، مرزا غلام مصطفیٰ و رفیقہ ایک جوانی بیان شائع کیا۔ جس میں سرایتکین کی حق گوئی کو جھٹلانے کی تمسخر آمیز کوشش کی گئی۔ ان کے تردیدی بیان کا کلب لٹاب یہ تھا کہ ریاستی مسلمان نہایت پُر سکون زندگی گزار رہے ہیں اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی نسبت خوش حال اور فارغ البال ہیں۔ جب میں نے علی گڑھ میں سنا کہ کچھ نہ خرید اور جاہ پرست مسلمان اپنے ضمیر کو گردی رکھ کر یہ بیان دے رہے ہیں تو میں جھلٹا اٹھا۔ میرا پیمانہ صبر چھلک گیا اور میں نے ایک خط لاہور کے اخبار "مسلم آؤٹ لک" میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ جس میں میں نے کشمیر دربار کی اس ناپاک حرکت کو طشت از بام کر دیا۔ اُس وقت پنجاب کے ہندو اخبارات سرایتکین کے بیان کا اثر زائل کرنے کے لئے طرح طرح کی شکایتیں تراش رہے تھے۔ میرے بیان سے تصویر کا دوسرا رخ سامنے آگیا۔ سیاسی میدان میں کھلے بندوں قدم رکھنے کی یہ میری پہلی کوشش تھی جب میرا یہ خط شائع ہوا تو مجھے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔ جیسے میرے گلے میں بند ایک چیخ باہر نکل گئی تھی۔ اس چیخ کا میرے گرد و نواح پر تو واہجی سا ہی اثر پڑا لیکن اس نے میری نفسیات کی بیڑیاں جیسے توڑ کر رکھ دیں۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ عمل اور آزادی کی دادیوں میں پہنچ گیا۔ میرے حوصلوں میں نئی جولانی اور میرے دلوں میں نئی جوانی آنے لگی اور میں نے اپنے آپ کو آئینوالی جدوجہد کے لئے پرتوتے ہوئے پایا۔

ادھر علی گڑھ میں ہماری تعلیم کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں حکیم غلام مرتضیٰ، وغیرہ کے ساتھ واپس وطن روانہ ہو گیا۔ اور ۱۲ اپریل ۱۹۳۲ء کو سرایتک

پہنچ گیا۔ لیکن فضا میں ایلین بنرجی کے نعروں کی گونج باقی تھی۔ اور کشمیر دربار نے اس کے اثرات کو ذرا مل کرنے اور اس کی آواز کو بھنگ کرنے کے لئے چند وظائف کا اعلان کیا تھا۔ جن کے لئے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے عرضیاں مانگی گئی تھیں۔ اُس وقت جو چند مسلمان مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ہوئے تھے، اُن میں، میں بھی تھا اور میں نے بھی ایک درخواست دروغ دی۔ لیکن نتیجہ معلوم۔

اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ کشمیر دربار نے ایک حکم کی رو سے ملازم بھرتی کرنے کے لئے ایک سول سرورس ریکروٹمنٹ بورڈ قائم کیا۔ ملازمت کے حصول کے لئے ہر امیدوار کو ایک کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ عرضی گزارنے والے کے تعلیمی معیار، اُس کے مضامین کی نوعیت اور اُس کی عمر کے بارے میں بھی استفسار کئے جاتے تھے۔ حکومت کے ساتھ ہمارا جو سابقہ رہا تھا اُس کی وجہ سے ہمیں اس اقدام کی دال میں بھی کچھ کالا نظر آیا۔ ہم نے حکومت کی اس فوارشس پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ آج تک حکومت مسلمان ملازموں کی قلت کا یہ جواز پیش کرتی تھی کہ تعلیم یافتہ مسلمان نہیں ملتے۔ لیکن اب تعلیم یافتہ مسلمان خاصی تعداد میں سامنے آرہے ہیں تو حکومت کے پرانے شکاری اُن کا راستہ روکنے کے لئے یہ نیا جال لے کر آئے ہیں۔ امتحان لینے والے، پرچے مرقب کرنے والے، اور نتائج ترتیب دینے والے سب کے سب غیر مسلم تھے اور اسی لئے ہمیں کچھ ایسا احساس ہو رہا تھا۔

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی

کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

ہمارے اندیشوں کی وجوہات بڑی واضح تھیں۔ ان امتحانات میں جہاں ہندی

اور سنسکرت کو اختیار ہی زبانوں کا درجہ دیا گیا تھا وہاں اُردو، فارسی اور عربی کو یکسر
 نکال باہر کر دیا گیا تھا۔ ساٹھ فیصدی اسمیاں حکومت بورڈ کی طرف رجوع کے بغیر
 بھرتی کر سکتی تھی۔ باقی چالیس فیصد اسایسوں کے لئے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ امیدوار
 اپنی اعلیٰ نسب کی سند پیش کرے۔ اگر کوئی مسلمان ان تمام مرکاؤں کو پار کرنے میں
 کامیاب بھی ہو جاتا تو اُس سے پنشن کے لئے حکومت نے ایک اور تلوار اپنے پاس
 محفوظ رکھی تھی۔ یعنی وہ کسی امیدوار کو وجہ بتائے بغیر مسترد کر سکتی تھی۔ ظاہر تھا کہ حکومت
 نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جن کی عمر بہر حال بائیس سال سے زیادہ تھی، رسوم اور
 ظاہریوں کی اوٹ میں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ ہم لوگ اس چال کو بھانپ
 گئے۔ اور اس کا توڑ کرنے کے لئے میں نے اپنے قبیل کے مسلمان نوجوانوں سے رابطہ
 قائم کرنا مناسب خیال کیا۔

اس سے کچھ عرصہ قبل ہم نے فتح کدل میں مفتی ضیاء الدین صاحب کے مکان پر
 ایک دارالمطالعہ کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ ریڈنگ روم کا تو دواصل بہانہ تھا۔ اصل
 مقصد یہ تھا کہ اس کی اوٹ میں ہمیں آپس میں مل بیٹھنے اور تبادلہ خیال کا موقع میسر
 ہو سکے۔ ان محفلوں میں ہم ملازمت اور شخصی معاملات کے علاوہ ملکی معاملات پر
 بھی گفتگو کیا کرتے تھے۔ اور کشمیر کی حالتِ زار پر بھی آئسو بہاتے تھے۔ ریڈنگ روم
 میں بہت سے ساتھی آنے لگے تھے۔ ہم نے اس کو منظم بنیادوں پر چلانے کے لئے
 ایک کمیٹی قائم کی۔ جس کا صدر محمد رجب کو اور جنرل سیکریٹری راقم الحروف کو بنایا گیا۔
 کمیٹی کے ممبروں میں حکیم مکی، پیرزادہ غلام رسول، پیرزادہ احمد شاہ فاضلی، حکیم غلام
 مرتضیٰ اور مفتی جلال الدین شامل تھے۔

اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ ہم نے کشمیریوں اور خاص طور پر کشمیری مسلمانوں

کے اہل حالات کے متعلق دنیا کو باخبر کرنے کے لئے ابتدائی گوشیشوں کا آغاز کیا۔ ہم نے لاہور سے چھپنے والے اردو اخبارات کو مراسلے بھیجے اور اس کے علاوہ لندن سے شائع ہونے والے روشنی خیال جرمیڈے انٹرنیشنلس کے مدیر رجنی پاتم دست سے بھی رابطہ قائم کر لیا۔ اور پہلی بار کشمیر کے حالات کا تاریک پہلو دنیا کے سامنے آگیا۔ اُن دنوں ایک ممتاز اہمیان جو ہمارے ریڈنگ روم میں تشریف لائے، کلکتہ کی جامع مسجد کے خطیب مولانا آزاد سبحانی تھے۔ مولانا حریت پسند تھے اور حریت نواز بھی۔ انہوں نے ہماری مشورت کو سراہا اور ہمیں ایک عوامی تحریک شروع کرنے کی ترغیب دی۔ جب حکومت کے کانوں میں اس رابطے کی ہشک پڑی، تو اُس نے مولانا کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن اُس وقت وہ ریاست کی مدد سے باہر جا چکے تھے۔ البتہ اُس نے حکومت کو ریڈنگ روم پارٹی کی سرگرمیوں پر کڑی نگرانی رکھنے پر اکسایا۔

ریڈنگ روم پارٹی کی ایک ایسی ہی نشست میں، میں نے اپنے ساتھی نوجوانوں کی توجہ ملازمین کی بھرتی کے تازہ قواعد کی طرف دلائی اور اس بات پر زور دیا کہ ان کے خلاف احتجاج کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ باہمی مشورے سے طے پایا کہ دینیسی کونسل کو، جو ہمارا جاہری سنگھ کی ولایت یا تارکے دوران ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک و مختار تھی، ایک یادداشت پیش کی جائے۔ یہ طے پایا کہ یادداشت میں قواعد کی ناانصافیوں اور کوتاہیوں کی وضاحت کر کے ان میں تناسب ترمیم کی استدعا کی جائے۔ یہ فیصلہ ہوا تو دوسرا سوال پیدا ہوا کہ میوزئم کا مسودہ کون منبأ الفاظ اور چیرلے میں تیار کرے۔ اُس وقت نواب غلام احمد صاحب عثمانی کشمیری مسلمانوں میں سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ ہلاکے ذہین بھی تھے۔ حکومت نے انہیں سسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر تعینات کیا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ



کے بعد کچھ من گھڑت الزامات کی بنا پر انہیں قلیل نشن پر نکال باہر کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں بیکاری اور حقہ نوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم اُن کے پاس چلے گئے اور انہیں اپنی پتلا سنائی، عشائی صاحب کی قوی حیت کی رگ پڑکی اور انہوں نے یادداشت مُرتب کرنے کی حامی بھری۔ میمورنڈم تیار ہوا تو ہم نے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے اس پر دستخط لینے کی قہم شروع کر دی۔ بہت سے دوستوں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ لیکن کچھ ایسے حضرات بھی تھے جو ڈر کے مارے دستخط کرنے سے مُنکر ہو گئے۔ ادھر ہمارا روزانہ کامیل بول اور ووڈ ڈھوپ حکومت کی نظروں میں کھٹنے لگی۔ چنانچہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا سلسلہ کچھ اور کڑا ہوتا گیا۔ محکمہ جاسوسی کے دو انسپکٹروں مکیم حبیب اللہ اور عبدالکریم کو مصوٰعیت کے ساتھ یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ لیکن ہمیں جرد و جہد کا بخارہ لگ چکا تھا۔

بجلا یہ دکاوشیں یہیں کہاں ڈرانے والی تھیں۔

بڑھتا ہے اور ذوقِ گُنے یاں سزا کے بعد

▲▲▲

(۶)

کڑکے ہیں بہت اہل محکمہ برسرِ دربار

یادداشت پر دستخط ثبت کر داکے ہم نے اسے وزارتِ کونسل کے صدر سٹر ویک آفیلڈ کی خدمت میں روانہ کیا۔ بیچ پوچھے تو اس بات کی کہیں کم ہی امید تھی کہ کونسل میں اس کی کوئی شرفناوی ہوگی۔ لیکن اُس وقت ہم لوگوں کو ایک خوشگواہی پہنچا ہوا۔ جب کونسل کی طرف سے میرے نام ایک خط آیا، ایک نہ شد و شد۔ خط میں صرف میمورنڈم وصول ہونے کی اطلاع ہی درج نہ تھی بلکہ ہدایت کی گئی تھی کہ ہم اپنے دو نمائندوں کو کونسل کے سامنے پیش ہوں اور گفتگو کرنے کیلئے بیٹھ دیں۔ اس واقعے سے صرف ریڈنگ روم پارٹی ہی میں ہلکے نہیں چا بلکہ کثیر مسلمانون کے سارے تعلیم یافتہ طبقے میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ معاملے پر غور کرنے کے لئے عشائی صاحب کے گھر پر بہت سارے تعلیم یافتہ مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ جن میں کچھ سرکاری ملازم بھی تھے۔ کافی غور و خوض کے بعد مجھے اور میرے ایک اور ساتھی عبدالعزیز غاضلی کو، جو علی گڑھ سے قانون کا امتحان پاس کر کے لوٹے تھے، کونسل کے سامنے پیش ہونے کی ہدایت کی گئی اور ہمیں مناسب ہدایات اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ یہاں یہ ذکر ہے محل نہ ہو گا کہ جب میمورنڈم بھیجے گی نہر پبلی تو حکومت کے نمک خواروں میں ایک کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے اپنے آپ کو بادشاہ

سے زیادہ وفادار ثابت کرنے کے لئے اس اقدام کی مذمت کی اور حکومت کو تجویز پیش کی کہ ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ یہ مشورہ دینے والوں میں منشی اسد اللہ وکیل، مفتی شریف الدین، مرزا غلام مصطفیٰ اور خواجہ عبدالرحیم ہانڈے جیسے بزرگ شامل تھے۔ جب ہم سیکرٹریٹ پہنچے تو ہمیں ایک بیرونی کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کونسل کے ممبران مسٹر ویک فیلڈ (چیزمین)، عطا کرنا سنگھ (سیکرٹری) پی کے واٹن وزیر خزانہ جنرل جنگ سنگھ مشیر مال اندر کے کمرے میں مشورے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر کے بعد وزیر تعلیم آغا سید حسین صاحب کو کونسل کی میٹنگ میں طلب کیا گیا۔ اُن کو ہمارے کمرے سے ہی گزرتنا تھا۔ چنانچہ ہم سے اُن کی علیک سلیک بھی ہوئی۔ اندر جا کر کونسل کے ارکان اور اُن کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اُس کا تو ہمیں علم نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جب وہ کچھ دیر کے بعد باہر جاتے ہوئے پھر ہمارے درمیان سے گزرے تو اُن کے چہرے پر ہلکی سی ”شکراہٹ“ تھی۔ ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہوں نے ہمیں حوصلہ دیا کہ ہمیں کسی گھبراہٹ یا خوف کے بغیر اپنی شکایات کو کونسل کے سامنے رکھنی چاہئیں۔ باتے جاتے آہوں نے ہم کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تاکہ ہم اُن کو کونسل کے روبرو ہونے والا ماجرا سنا سکیں۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے بلادا آیا اور ہم ممبران کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم نے مناسب آداب وغیرہ بجالائے تو ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ اور کونسل کے ارکان نے ہم پر سوالات کی پوربش شروع کر دی۔ اگرچہ یہ اس قسم کا پہلا موقع تھا لیکن خدائے بزرگ نے ہمیں جس ہمت کے ساتھ اس نفسیاتی دھماکے کا مقابلہ کرنے کی توفیق دی اُس کا شکر ذکر کرنا سب سے بڑی ضرورت تھی۔

پہلے تو مسٹر ویک فیلڈ اور مسٹر واٹن نے ہمیں بتایا کہ ہمارا جاکی حکومت کشمیر کی

مسلمانوں پر کس قدر ”مہربان“ ہے اور مسلمان اس کی مخالفت کر کے کس طرح ”نمک حرامی“ کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مسٹر واٹن نے حکومت کی دریا دلی کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُس نے حال ہی میں اکاؤنٹس جنرل کے دفتر میں دو تین مسلمان ملازمین کو بھرتی کر لیا ہے۔ میں نے سارا حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا کہ واقعات پر نظر ڈالی جائے تو حکومت کے تازہ اقدامات کا نشانہ مسلمانوں جن لوگوں کو ملازمتوں سے دور رکھا ہے، جو حال ہی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آ گئے ہیں، میں نے یہ بھی کہا کہ مسلمان کسی بے جا رعایت کے طالب نہیں بلکہ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ بات خود حکومت کے کام کاغذ اور نیک نامی کے لئے ضروری ہے کہ اُن کو مطمئن کیا جائے۔ چونکہ میں اعداد و شمار ایس ہو کر گیا تھا اس لئے میرے دلائل کا توڑ آسان نہ تھا۔ مگر کونسل کے ارکان خاص طور سے مسٹر واٹن نے مجھے ڈولنے کی کوشش کی اور گرج کر کہا اس قسم کی سرگرمیوں کا مزا پکھلایا جائے گا۔ میں نے بڑے ادب لیکن مضبوط آواز میں جواب دیا کہ حکومت نے اگر اس وقت ہماری آواز کو نظر انداز کر کے ملازمتوں کی بھرتی کے طریقہ کار میں اصلاح نہ کی تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ میرے اسی اظہار پر ارکان کونسل کو تو آگیا اور انہوں نے سلسلہ کلام توڑ دیا۔ وہ ان الفاظ کو ایک دل سے ملے نوازان کی فریاد سمجھ اور اسے پس پشت ڈال دیا۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ الفاظ دراصل اُن شعلوں کے زنج ہیں جو جلد ہی کشمیر کی سرزمین کو لاوے کا سمندر بنانے والے تھے۔

کونسل سے خارج ہونے کے بعد ہم دونوں آغا سید حسین کے ارشاد کے مطابق اُن کے گھر پہنچے اور ساری کیفیت اُن کو سنادی۔ میں مزید بحث تو تھا ہی۔ ان کے گھر میں اُن سے شکوہ کیا کہ اگرچہ کامیاب میں مسلمانوں کے نمائندے سے متعلق جانتے ہیں۔

لیکن آپ اُن کی بھلائی کے لئے کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ آغا صاحب میرے سوال سے تھوڑا سا جھینپ گئے اور اپنی مشکلات کا ذکر کونے لگے۔ مگر اُن کے جواب سے کوئی بات نہیں بنی۔ میں نے تقریباً گستاخانہ لہجے میں عرض کی کہ جہاں تک مسلمانوں کے نام پر ذاتی مفادات بھرنے کا تعلق ہے اُس میں تو آپ کا فی پویشید ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن قوم کی بگڑتی ہوئی حالت کو آپ بڑی آسانی کے ساتھ فراموش کر رہے ہیں۔ انہوں نے میری باتوں کا تو ضرور بُرا مانیا ہوگا لیکن ہمیں اخلاق سے رخصت کر دیا۔ بعد میں ہم نے اپنے ساتھیوں اور ہم نیاوں کو سارا ماجرا سنایا۔ اُن پر تھوڑی سی مایوسی چھا گئی۔ اور ہم نے معاملے کو فی الحال ہوں کا قول رہنے دیا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ خبر سن کر ہماری کچھ ڈھاکس بندھ گئی کہ کونسل کے چیرمین ویک فیلڈ صاحب ہمارے جوابات سے کافی متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے اس متاثر کا اظہار بھی کیا تھا۔ انہوں نے یہ تذکرہ اپنے پرسنل اسسٹنٹ فلینڈیل راجہ سے کیا تھا۔ یہ صاحب جموں کے باشندے تھے۔ اور انہوں نے یہ خبر جموں کے چند مسلم فوجیوں تک پہنچائی تھی۔ جموں کے جنرل حکمران خاندان کا وطن تھا۔ یہ حکمران وہاں کے لوگوں کو کشمیر یوں سے بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہاں کشمیریسی پابندیاں بھی نہیں تھیں۔ اور چند مسلم فوجیوں نے انہیں اپنی اسلامیہ کی پاسبانی میں وہاں بیٹنگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نام کی ایک انجمن بنائی تھی جس کے سرکردہ کارکنوں میں چودھری غلام عباس، مسٹر یحیٰ یعقوب علی سردار گجر رحمان، اللہ رکھا ساہو، غلام حسید غوری، عبدالجبار قریشی، مولوی محمد حسین وغیرہ شامل تھے۔ یہ انجمن کبھی کبھی جلسے وغیرہ بھی بلاتی تھی۔ جن میں مسلمانوں کی شریکات کا اظہار اور اُن کے بڑے کی مانگ بھی کی جاتی تھی۔ حق بات یہ ہے کہ اُس دور میں امدی فرقے کے لوگ شعور کے لحاظ سے آگے

تھے اور وہ مسلمانوں میں احساسِ بلی آجا کر کرنے میں پیش پیش تھے۔ جموں کے ان دوستوں میں مسٹر یحیٰ یعقوب علی نے جو امدی تھے، کافی بیداری پیدا کی تھی۔ کشمیر میں اس قسم کی سرگرمی کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ بہر کیف جموں کے فوجیوں کی بھلائی پہل اور ویک فیلڈ صاحب پرائس کے اثر کی خبر پہنچی تو انہوں نے ہم سے رابطہ قائم کرنا مناسب خیال کیا اور اپنے ایک شاخندے عبدالجبار صاحب قریشی کو ہمارے پاس بھیج دیا۔

ہمارے میورنڈم پیش کرنے کا کوئی فوری نتیجہ تو نہیں نکلا۔ لیکن ہمارے نعرۂ ستانہ نے کچھ دنوں کے لئے حکومت کے غامض ایوانوں میں کھلبلی مچا دی۔ اُدھر ہم نے اپنی آواز بلند کرنے کی ضرورت کو اور زیادہ شہرت کے ساتھ محسوس کیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس آواز کی نشر و اشاعت کے لئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں۔ اُس زمانے میں خریر و تقریر کی آزادی ایک نیالی چیز کے برابر تھی۔ ریاست سے مسلمانوں کا کوئی اخبار شائع نہ ہوتا تھا۔ البتہ جموں سے ایک ہندو اخبار ”ہنسہ“ چھپتا تھا۔ جو ہمارا جاکے قصیدہ خوانی اور اس کے ظالمانہ نظام کی تعریف کر کے اپنے وجود کو قائم رکھنے کی سعی کرتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور سے ”ریلاپ“، ”ہنراپ“، ”ٹریبون“ اور کچھ دوسرے ہندو اخبارات ریاست کے ہندو ہمارا جاکے ہندو مفادات کی حفاظت کے لئے اُن کے جائزہ و جائزہ اقدامات کی حمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔ لاہور سے کچھ ایسے اخبارات بھی ضرور شائع ہوتے تھے جن کے مدیر مسلمان تھے۔ لیکن اگر وہ دوبار کشمیر کے خلاف فراسائزہ کھولتے تو اُن کا ریاست میں فوراً داخلہ بند کر دیا جاتا۔ ایک کشمیری شہزاد محمد اکبر خان فوجی، جنہوں نے بعد میں کشمیر کے بارے میں بہت سی تاریخی کتابیں لکھنے کے سلسلے میں غامض نام لکھایا، ایک ہفتہ دار اخبار لاہور

سے ہی نکالا کرتے، جو کبھی کبھی نسیعت سی آواز میں کشمیری مسلمانوں کی شکایات کی طرف مکتوبت کی توجہ مبذول کرتا رہتا تھا۔ دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کی صلہ سمجھوری بلند کرنے کے لئے تقریباً کوئی پالیسی فارم بھی موجود نہ تھا۔ ریاست سے ہجرت کرنے والے کچھ دردمند مسلمانوں نے اس صدی کے آغاز میں کشمیری کا نفرنس کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی۔ اس جماعت کے بانیوں میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی شامل تھے۔ اور اسی کے ایک اجلاس میں انہوں نے یہ ولولہ انگیز قطعہ پڑھا تھا:

پنجرہ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا

ان کے اعتراض ہیں بے پروا بال کیا

تو اس دستِ جناحیں کو یارب جس نے

روحِ آبادی کشمیر کو پا مال کیا

اس کا نفرنس کی اصل غرض وفایتِ قویہ تھی کہ پنجاب گئے ہوئے کشمیریوں کی محرومیوں کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ چنانچہ اسی کی کوششوں سے پنجابی کشمیریوں پر فوج میں ملازمت کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ یاد رہے کہ کشمیر میں غیر ملکی محکوموں نے ان کی بہادری سے سہم کران پر فوج میں بھرتی کے دروازے بند کر دیے تھے۔ اور یہ سایہ کشمیر سے ہجرت کرنے والے کشمیریوں کا تعاقب کرتے ہوئے پنجاب بھی پہنچ گیا تھا۔ یہ جماعت کبھی کبھی خون کے رشتے کے زہرا ترانے ان بد نصیب کشمیری بھائیوں کے لئے بھی بے قرار رہتی تھی۔ جو پر پنجاب کا گھیراؤ ڈھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ مسلمانوں میں اس کے سیکریٹری سید محمد شاہ تھے۔ یہ جماعت محمد کشمیری طلباء کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے قرضِ مسند بھی دیا کرتی تھی۔

میں ولایت جانے کے لئے سرکاری وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا

لیکن میرے سینے میں اب ایک ہولناک روشن ہو چکی تھی۔ میں اپنی فراغت کا وقت حکومت کے مختلف محکموں میں مسلمانوں کے تناسب کے، اعداد و شمار جمع کرنے میں صرف کرتا۔ میں نے اس سلسلے کا آغاز کوئٹہ، جمل کے محکمہ کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے سے کیا۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھتے ہوئے میں مرحوم غلام احمد عثمانی صاحب کی مدرسہ اخباروں کے لئے مضامین مرتب کرتا رہتا تھا۔ اور اس درپے کے ذریعے دنیا کو یہ دکھانے کی کوشش کرتا تھا کہ کشمیریوں کو کس بے دردی سے چکلا جا رہے ہیں جنوں تیار ہوتا تو اس کی ایک ناپ شدہ نقل جنوں عبد الحمید قریشی کے پاس، جن سے سرینگر میں ربط قائم ہو گیا تھا، بھیجا کرتا تھا تاکہ وہ اس کا ترجمہ کر کے لاہور کے مشہور اخبار روزنامہ "انقلاب" میں شائع کرنے کے لئے روانہ کر دیں۔ "انقلاب" کے مالک و مدیر امداد کے دو مشہور ادیب اور مسلمانوں کے حقوق کے جری علمبردار مولانا غلام رسول تھراو جناب عبد الحمید سالک تھے۔ ان حضرات سے قریشی صاحب نے پہلے ہی معاملہ کر رکھا تھا۔ ملکہ احتیاطاً کچھ اور ناموں پر اخبار جاری کرنے کے اجازت نامے بھی معامیل کر کے گئے تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا تھا کیونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ حکومت "انقلاب" کی حق گوئی کی تاب نہ لائے گی کہ اس کا داخلہ کشمیر میں بند کر دے گی۔ اس لئے پیش بندی کے طور پر مختلف ناموں پر ڈیپلیٹیشن حاصل کئے گئے تھے۔ تاکہ ایک اخبار کا داخلہ بند ہو تو دوسرے نام سے صرف حق کی شیخ فزول کی جاسے۔ اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ "انقلاب" کے صاحب نذر حیدر خان نے بڑی توجہ، دردمندی اور بے باکی کے ساتھ ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اور اپنے طاقتور قلم کی کیرڈوں سے ہماری شکایات میں جان ڈال دی۔ جب اس شخص نے اپنے قلم کی صورت اختیار کرنا شروع کی تو کشمیر و دہاکے اردو پر بل پڑ گئے، ہمارا اندیشہ

درست ثابت ہوا۔ "مفتاب" میں شکل کے کشمیری سہلانوں کی منظومیت کے متعلق دو ایک مرسلے ہی شائع ہوئے ہوں گے کہ اس کا داخلہ کشمیر میں ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن ادارہ "انقلاب" بھی تیار بیٹھا تھا اس نے "کشمیر" کے نام سے ایک اور اخبار جاری کر دیا۔ اور اس کو کشمیریوں کی منظومیت کا نقیب بنا دیا۔ حکومت کشمیر اس نئے اخبار کی تاب نہ لاسکی اور اس پر پابندی عاید کر دی گئی۔ لیکن ادارہ "انقلاب" نے ایک تیسرا پرچہ "منظوم کشمیر" لکھنے میں ہماری مدد کی۔ ان اخبارات کے لئے قحاق کی فراہمی کی ذمہ داری میری تھی۔ میرا ان دنوں معمول تھا کہ دن بھر مختلف سرکاری محکموں کی خاک چھانتا۔ لوگوں کی منت سہادت کر کے اعداد و شمار جمع کرتا۔ شام کو عشائی صاحب کے دیوان خانے میں حاضری دیتا۔ ان سے مضمون کے لئے اشارات وغیرہ حاصل کرتا۔ اس کے بعد اس کے ٹائپ کروانے کا انتظام کرتا اور پھر چوتوں کسی نہ کسی ذریعے سے عبدالحمید قزحی کے پاس بھجواتا۔ یہ ساری کارروائی میں لکیلے انجام دیتا۔

مجھے یاد ہے کہ جب اخبار "کشمیر" کا بنڈل میرے نام عشائی صاحب کی معرفت آیا تو وہ بہت ہی جڑ بڑ ہو گئے۔ انہیں یہ غدشہ لاحق ہوا کہ جہوز ہوائ پر کوئی آغا آجائی اور وہ سرکاری کتاب کا نشانہ بن جائیں گے۔ عشائی صاحب کا قصہ بڑا طوفانی ہوا کرتا تھا۔ جب یہ چڑھی ہوئی آمدھی کچھ آڑگی تو میں نے انہیں یقین دلایا کہ بنڈل میرے مشورے کے بغیر ہی ان کی معرفت بھیجا گیا ہے اور آئندہ اس غلطی کو نہ دہرایا جائے گا۔ اس پر وہ کچھ ٹھنڈے پڑے۔ اب ایک اور مرحلہ ان پرچوں کی تقسیم کا تھا۔ میں اپنے ایک اور بے روزگار ساتھی محمد رجب کے ہمراہ جو علی گڑھ میں میرے ساتھ زیر تعلیم تھے اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لینے کے بعد اب مارے مارے پھر رہے تھے، اسلام آباد کی اسکول پونچھا۔ اخبار کا بنڈل میری ہدف میں ٹھپا ہوا تھا۔ ہم نے اسکول

میں ان پرچوں کو استادوں اور لڑکوں میں مختص تقسیم کر دیا۔ پرچوں کا عوام میں پہنچنا تھا کہ شہر میں ایک عجیب سنسنی سی پھیل گئی اور ہر طرف سے اخبار کے لئے تھانے آنا شروع ہو گئے۔ اب لوگ ہفتہ بھر اخبار کے لئے شہارے کے لئے آنکھیں بچھائے بیٹھے رہتے تھے اور اس بات کا انتظار کرتے تھے کہ دیکھیں نئے شمارے میں کس محکمے کا کچا پٹھا کھولا جاتا ہے۔ پرچے کی قیمت یوں تو ایک پیسہ رکھی گئی تھی لیکن وہ دودھ روپے میں بھی دستیاب نہ ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ کچھ دیر یوں ہی چلتا رہا اور اس نے بیلدری کی نوک کو اونچا کرنے میں یقینی طور پر بڑا اہم رول ادا کیا۔ جہاں تریبانوں پر تسلسلے پڑے ہوتے تھے وہاں محکم کی نوک سے شہارے پھوٹ رہے تھے اور غفلت کی شب تار پر آجائے کے تیر بر سار ہے تھے۔

⑤

میدان جنگ میں

ہمارے ہر سسٹمکے تعلیم و تربیت یورپی ماحول میں ہوئی تھی لیکن انہوں نے مغرب کی دانشمندی کی بجائے اُس کی تزک جبرک کو زیادہ اپنایا۔ وہ پیش و عشرت کے برے دیبا تھے۔ جب وہ تخت نشین ہوئے تو صرف اُن کی سواری کے گھوڑے کو سات لاکھ روپے کے ہیرے جواہرات سے سجایا گیا تھا۔ اُس کے بعد اُن کے زین پہن میں پیش پسندی کا خاصا دخل رہا اور خاص طور پر وہ رقص و ریش کے برے دلدار تھے۔ اُن کا مروت یورپ کی تفریح گاہوں میں ہی مرت ہوتا۔ لندن کے مشرق آسے کی حیثیت سے تو فرین کے فتنے زبان زد عام رہے لیکن کثیر میں بھی اُن کے فرصت کے اوقات رقص و نغمے میں گزر رہے تھے مشہور مغنیہ ملکہ پھوج نے اُن کے دربار سے ایک خاص نسبت حاصل کر لی جس کا بڑا چرچا رہا۔ مشرق کے ابتداء میں وہ مصری گول میز کانفرنس، جو برطانوی حکومت نے بلائی تھی، میں شمولیت کے پہلے ٹوپ گئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی ہمارا فی تارا دیوی بھی تھیں۔ وہیں فرانس کے شہر کینس میں اُن کے ولی عہد کرن سسٹمک کا جنم ہوا۔ تارا دیوی ہمارے کی پوتھی پوری تھیں۔ ہمارے کی پہلی شادیوں سے کوئی اولاد میراثہ ہوئی تھی۔ تارا دیوی سے اُن کی شادی مشرق میں ہوئی تھی مگر پہلی اولاد منٹیس مانگ مانگ کر اب کہیں چوتھے

۶۱

سال میں ہوئی تھی۔ ہمارے کے بے چراغ خاندان میں ولی عہد کی پیدائش ایک بے حد خوشگوار واقعہ تھی۔ ہمارے کے نمک خواروں اور وفاداروں میں بھی اس خبر سے دھوم مچ گئی اور انہوں نے ہمارے کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ریاست میں ایک طرف تو سرکاری طور پر جشن منایا گیا اور سرینگر میں زبردست چراغاں کیا گیا دوسری طرف جاگیرداروں نے سرینگر میں ایک میٹنگ بلائی جس میں ہمارا جا کی ولایت سے واپسی پر اُن کو ایک استقبال دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ میٹنگ در خاندان کے پیر مٹال اور وزیر و زلت پنڈت بن کاک ورنے بلائی تھی۔ در صاحب اس طرح اپنے آپ کو ہمارا جا کی نظروں میں اُبھارنا چاہتے تھے جس کے ساتھ اُن کی بہت سی مراعات وغیرہ جڑی ہوئی تھیں۔ میٹنگ میں بن کاک ورنے کو استقبال کا صدر مقرر کیا گیا۔ یہ فیصلہ چند مسلمان جاگیرداروں کو ناگوار گذرا۔ جن میں خواجہ نور شاہ نقشبندی، پیش پیش تھے۔ اس عقلمند کے چھپے منصب اور جاہ حاصل کرنے کی رقابتیں بھی شامل تھیں لیکن اس کا ایک سبب مسلمان جاگیرداروں کا یہ احساس بھی تھا کہ اکثریتی فرقے سے تعلق رکھنے کے ناطے ہمارا جا کو استقبالیہ ایڈریس پیش کرنے کے لئے وہ زیادہ موزوں لوگ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بن کاک ورنے کی کٹی سے عہدگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مسلمان جاگیردار اور رئیس ہمارا جا کو الگ استقبالیہ پیش کریں گے۔ اس غرض کے لئے جو اخراجات ضروری تھے اُن کو تیار کرنے کے لئے خاص خاص اشخاص سے چندہ جمع کرنے کی ہم شروع کی گئی۔ سارے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے رئیس حضرات کو چند تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ خواجہ غلام احمد عثمانی نے مجھے بھی اس کام میں مدد ملایا۔ میر تقی میر کی

درگاہ خانیاہ کے سجادہ نشین تھے۔ لیکن مزاج اور خیالات کے لحاظ سے وہ نئے زمانے کے تقاضے بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں مسلم متعزین کا ایک جلسہ طلب کرنے کی اجازت بنایت کی اور حسن اتفاق سے مجھے بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت دیدی گئی۔ کوئی دو دھاتی سوکے قریب نواص جمع تھے۔ اور یہ میرا ان سے پہلا تعارف تھا۔ اللہ نے میرے گھر میں مٹھاس کی جو نعمت عطا کی ہے اس سے کام لے کر میں نے کلام مجید کی تلاوت کی۔ جس سے مجھے پراہیک عجیب کیفیت جاری ہوئی۔ کلام الہی کی تاثیر کے دلوں کی جہیں کھل گئیں تو میں نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس میں مسلمانوں کی تڑپن حالی کی طرف توجہ دلائی۔ چونکہ چوٹ میرے دل پر براہ راست لگی تھی اس لئے جگ بیتی میں آپ بیتی کا مزا پیدا ہو گیا۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کی حالت زار کا علاج قریانیوں کا چڑھا واپیش کرنے سے ہی ہوگا۔ جب تک جہل خاوں اور عذاب و عقاب کا ڈر دلوں کو ڈراتا رہے گا۔ مسلمانوں کی مقیبتوں کا کوئی علاج نہ ہو سکے گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آزمائش کے پہلے مرحلے کے لئے میں اپنے آپ کو سب سے پہلے پیش کرتا ہوں اور انشاء اللہ جسم و جان کی کسی قربانی میں میرے قدم کبھی دگمگائیں گے نہیں۔ تقریر تو میں نے کر ڈالی اور اس سے مجھے میں زندگی کی ایک لہر بھی پیدا ہو گئی۔ لیکن جاگیر داروں اور حکومت کے لئے توڑنے والوں کے اوسان خطا ہونے لگے۔ شاید وہ بچتا رہے تھے کہ انہوں نے کیوں ایک نواز کو دعوت دے کر یہ بلا ٹوٹی۔ بہر حال انہوں نے مجھ پر زور ڈالا کہ میں اپنے الفاظ واپس لے لوں لیکن میں نے جواب دیا کہ میں صداقت کو نہیں مٹھا سکتا۔ اگرچہ دوسری طرف سے کافی شور مچا میں اپنی بات پر اڑا رہا اور کسی طرح بات ٹل گئی مگر بقول اقبال وح

دل سے حوالت نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اس بات کے بھی پر لگ گئے اور اس کا ہر چا عام لوگوں تک پہنچ گیا وہ میری ذات میں دل چسپی کا اظہار کرنے لگے۔ مجھے مسلمان روسا کی کمی کا کنویر منتخب کیا گیا اور ہم نے ہمارا جے تار کے ذریعہ استقبال پیش کرنے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے وعدہ اندیشی سے کام لیتے جیسے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے استقبالیوں میں شمولیت سے معذوری ظاہر کی اور یہ معاملہ ٹپٹ گیا۔

ان ہی دنوں کشمیر کے میر واعظ مولانا امجد اللہ صاحب کا انتقال ہوا۔ مولانا ایک خدا ترس عالم دین، مجذوب صفت بزرگ اور بہت اچھے و احفظ تھے۔ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کے جنازے کے لئے مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع ہو گیا۔ اتنے بڑے اجتماع کی نظیر ہم نے پہلے نہیں دیکھی تھی میں نے اس موقع پر جلوس کی تنظیم وغیرہ میں مدد چڑھ کر قبضہ لیا اور حوام کے ساتھ سیری شناسانی کا دائرہ کچھ اور وسعت پذیر ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد سننے میر واعظ کی حیثیت سے مولوی عتیق اللہ کی دستار بندی کی تقریب جامع مسجد میں منعقد ہوئی۔ مجھے بھی اس موقع پر تقریر کرنے کے لئے کہا گیا اور میں نے پہلی مرتبہ جمعہ میں خطاب کیا۔ کچھ ہی دنوں بعد اسلامیہ ہائی سکول میں مرحوم میر واعظ کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ میں نے وہاں بھی تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں نے سکول کی انتظامیہ کمیٹی کے چنار کان کی گنڈ پینی کی توان میں سے ایک صاحب خواجہ غلام محمد مالک مجھے ٹوکنے لگے۔ بس پھر کیا تھا۔ حاضرین کی ایک بڑی تعداد اٹھ کھڑی ہوئی اور انہوں نے ملک صاحب پر برسنا شروع کیا۔ وہ بچا رہے اس خلاف توقع واردات پر ہلکا کر

بیٹھے لیکن میری ہمت بندھ گئی کہ اہل وطن اب مجھ کو اپنا بھرم اور دساڑ مجھے لگے ہیں بقول اقبالؔ

ابھی نخل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

یہ میری زندگی کا عجیب زمانہ تھا۔ میں صبح سویرے اپنی سائیکل پر گھر سے نکلتا۔ دن بھر سرکاری محکموں کے چکر لگا کر کچھ کام کی باتیں جمع کرتا۔ کبھی کبھی عسائی صاحب کھانے کے لئے کہتے۔ لیکن بسا اوقات غالی پریٹ ہی بسر کرنا پڑتی بہت ہوا تو بازار سے ایک آدھ نان تنگ خرید کر دن بتا دیتا۔ رات کو چراغ جلے پر بندے بھی گونسلوں کا رُخ کرتے اور میں بھی گھر واپس لوٹتا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ آدھ گھروالے یہ اس لگائے بیٹھے تھے کہ کسی سرکاری محکمہ میں ملازم ہو کر ان کا بوجھ ہلکا کروں گا وادھر میرے دل میں یہ عزم کہ جس مظلوم قوم کو جھجھوٹنے کا علم اٹھایا ہے اُسے نہ پھوڑوں۔ اُس وقت ظلم کا قلعہ اس قدر سنگلاخ اور مضبوط نظر آتا تھا کہ اس میں کوئی شکاف نہ پڑنا محال نظر آتا لیکن میں بھی اس ترنگ میں تھا کہ یا تو اس قوم کو کھویا ہوا وقار واپس دلانے میں کامیاب ہو جاؤں یا اسی جدو جہد میں اپنا سر چٹخ کر جان دیدوں۔ اُس وقت واقعی قوم کی حالت زار گویا ہم سے یوں ہم کلام ہو رہی تھی

کائناتوں کی زبان نہ کہ گئی پیاس سے یارب!

ایک آبلہ پا وادی پُر خار میں آوے

فرق یہ تھا کہ قوم کی مظلومیت نے میرے پاؤں میں ہی نہیں، میری نوح میں بھی آبلہ پیدا کر دیے تھے۔

لیکن بہت کم دوست میری اس حالت کو سمجھ پاتے تھے۔ میں اپنے بھائی

صاحبان سے کہا کرتا کہ میں قوم کی خدمت کے لئے وقت صرف کرتا ہوں تو انہیں ناراض نہ ہونا چاہئے کیونکہ قوم کا بھلا ہوگا تو ہمارا بھی بھلا ہوگا۔ لیکن کچھ قویہ بات اس زمانے کے شعور میں سامنے والی نہ تھی اور کچھ خائفی کے تندہ پیلے بھی تھے ہر اسل ان کر رہے تھے۔ جو چھوٹا موٹا قومی کام میں کرتا رہتا تھا اس کے لئے بھی کچھ اغراجات کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور خود اپنے جسم و جان کا رشتہ بیوست رکھنے کے لئے بھی۔ اس کے علاوہ جو سرگرمیاں ہم کر رہے تھے ان کے لئے بھی کچھ کم سے کم اغراجات کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر مل بیٹھنے کے لئے کوئی کمرہ یا بیٹ پالنے کے لئے چند روپے۔ چنانچہ کچھ خرچے کا انتظام کرنے کے لئے میں نے آخر کار ملازمت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور محکمہ تعلیم میں نوکری حاصل کرنے کے لئے عرضی پیش کی۔ مجھے گورنمنٹ ہائی سکول باغ دلاور خان میں ساٹھ روپے ماہانہ مشاہرے پر بطور سائنس ماسٹر کے مستعین کیا گیا۔ تنخواہ کے علاوہ بیس روپے کی رقم الاؤنس کے طور پر بھی ملتی تھی۔ گویا مکمل ملاکے اتنی روپے ماہوار کی آمدنی ہو گئی تھی۔ نوکری کی یہ زنجیر تو پہن لی لیکن بہت جلد واقعات نے دکھا دیا کہ اگرچہ زنجیر کے ساتھ میرا رشتہ تو بھر آستوار رہنے کو تھا لیکن نوکری کی زنجیر میرے پاؤں کو جکڑنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ بقول شاعر

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے

تو لوت آئے تیرے سر بلند کیا کرتے

۸

شکستِ زنجیر

میرا گھر شہر سے چھ میل دور تھا۔ میں ملازمت کرنے کے لئے مشکل سے گھر آ جا سکتا تھا۔ لیکن اس طرح میرے دل کی مراد بر نہیں آ سکتی تھی۔ مجھے قوی کام کا جو چرکہ پڑ گیا تھا۔ اُس کے لئے فردی تھا کہ شہر میں ہی رہوں تاکہ بار دوست میرے پاس آتے رہیں اور دوسرے مسائل پر نگھو ہوتی رہے۔ اس لئے میں نے سکونت کے لئے شہر میں ہی ایک کمرہ لیا۔ میری یہ رہائش گاہ ایک گیراج کے اوپر تھی جو خواجہ غلام احمد جو لڑکی ملکیت تھا۔ خود جو لڑکا صاحب بھی میری رہائش گاہ کے قریب فوج کدل میں ہی رہتے تھے۔ خواجہ صاحب نے مجھے یہ کمرہ کسی کرائے کے بغیر ہی رہنے کے لئے عطا کیا۔ میرا اسکول چونکہ شمس ہی تھا اس لئے مجھے سرکاری اوقات سے پہلے اور بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پلٹے پلٹنے کے کافی مواقع ملتے تھے۔ چونکہ گھر میں خاندان داری کا بھید بھی نہ تھا لہذا گنگو وغیرہ میں بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس چھوٹے سے کمرے میں فوجیوں کا ہجوم رہنے لگا۔

ان فوجیوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جو مولوی عبداللہ وکیل کے درس و تدریس سے متاثر ہو کر اب قومی کاموں کے لئے میں سرشار رہنے لگے تھے مولوی عبداللہ صاحب کا مکان میرے پڑوس میں ہی واقع تھا۔ وہ تھے تو ایک مذہبی عالم

لیکن اپنے مکان میں وہ جو درس دیتے تھے اُس میں بلی اور قومی مضامین کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔ اور اُن کا دلکش انداز بیان دلوں میں پچھے ہوئے قومی دلولوں کو ہمیز کرتا تھا۔ اُن کے درس سے قومی شعور کی چنگاریاں بھی نکلتی تھیں جو دلوں میں پھیلنے کے کچھ عرصہ بعد شعلوں کی نشوونما کرنے لگیں۔ میں بھی کئی مرتبہ اُن کی درس گاہ میں گیا اور ان کے طرزِ کلام سے لطف اندوز ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب ایک دردمند شخصیت کے مالک تھے اور اپنی مظلوم قوم کی نجات کے لئے کافی جذبہ رکھتے تھے۔ اُن کے یہاں میرا اُن کے فرزند مولوی عبدالرحیم سے تعارف ہوا۔ جو لکھنؤ یونیورسٹی میں قانون کی اعلیٰ تعلیم پارہے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں جلد ہی دوست بن گئے اور تحریک کی ابتدائی منزلوں میں سنگ سنگ رہے۔ اسی اثنا میں جموں صوبے میں چند واقعات ایسے پیش آئے جن سے وہاں کے مسلمانوں کی دلآزاری ہوئی اور اُن میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ پہلی واردات یہ ہوئی کہ ۱۲۹ اپریل ۱۹۱۹ء کو جو عید کا دن تھا میونسپل کمیٹی کے ایک باغ میں نماز عید ادا کی گئی نماز کے بعد امام صاحب نے خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ امام صاحب جن کا نام منشی محمد اسحاق تھا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک دو گھر سب انسپکٹر باجویم چند دپٹی انسپکٹر بزل پولیس چودھری رام چند کی ہدایت سے آگے بڑھا اور اس نے بڑی عورت سے امام صاحب کو خطبہ بند کرنے کے لئے کہا۔ پولیس آفیسر کے مطابق خطبہ نماز کا قطعہ نہ تھا بلکہ حکومت کے خلاف کوئی تقریر تھی۔ یہ سراسر دہشت گردی اور مداخلت تھی۔ اور اس پر مسلمانوں میں بغض و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جموں میں مسلمانوں کے کئی اجتماعات میں اس باتنا سب حرکت کی مذمت کی گئی۔ ابھی یہ زخم پراپی تھا کہ جموں کی پولیس لائن میں ایک ہمیز کا نیشنل بھوڑا مرنے ایک دوسرے مسلمان

کانشیل کے سامان سے، جب وہ بی بی گرنے میں مصروف تھا۔ قرآن پاک پھین کر اُس کی بے حرشتی کی۔ اس واقعہ کی خبر باہر پھیلی تو زخموں پر نمک پڑ گیا۔ اُدھر سے ہمتوں سے پندرہ میل دور موضع ڈھکڑ میں ڈوگرہ شاہی کے کارندوں کی مدد سے مسلمانوں کو نماز جمعہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔ دینی عینت مسلمانوں کی دھکتی ہوئی رگ ہے۔ مرکز اس رگ کو چھڑ کر آگ سے کھیل رہی تھی چنانچہ دیوں میں بے اطمینانی کا جولا اندر ہی اندر پک رہا تھا، ان واقعات کی نفی زنی سے پھوٹ پڑا۔ جموں یلگ مینز ایسوسی ایشن نے مذہبی جذبات کے ساتھ اس جھڑپ خانی کے خلاف ایک بڑا پوسٹر چھاپ کر اسے ساری ریاست میں شتہر کرنے کے لئے پھیلا دیا۔ پوسٹر میں ان واقعات کے خلاف شدید احتجاج کرنے کے علاوہ مسلمانوں سے اُٹھ کھڑے ہونے اور جلوس چلے اور ہڑتال کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ ہمارے پاس بھی ایک بڑا سائمنڈل ان اشتہاروں کا بھیج دیا گیا۔ اب ان پوسٹروں کو شہر میں پھانپان کرنے کی نوبت آئی تو ہم نے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ شہر کے ہر محلے میں دو دو نوجوان یہ کام کریں۔ اور اگر ان میں سے کسی کو گرفتار کر لیا گیا تو دوسرا ساتھی فوراً میرے پاس اس کی اطلاع دے کر آئے۔ قدرت کا کرنا کہ ایک نوجوان محمد اسماعیل نامی کو، جس کو اُس محلے میں پوسٹر پھانپان کرنا تھا، جہاں میں رہتا تھا، پولیس نے سب سے پہلے گرفتار کر لیا۔ یہ ہماری تحریک کا سب سے پہلا سیاسی قیدی تھا۔ پولیس نے اُس کو پوسٹر چھانپ کرستے ہوئے گرفتار کر لیا اور اس کی کلائیوں میں پٹھانڈی ڈال دی۔ اُس کو زینہ کدل تھانے میں لے جاتے ہوئے جب وہ میری رہائش گاہ کے سامنے سے گزرنے لگے تو میں شور سن کر کھڑکی سے جھانکے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کے پیچھے پیچھے لوگوں کا ایک بڑا جھوم جا رہا ہے۔ جب عوام نے

مجھے دیکھا تو انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر لیا۔ اُس دن میں سکوں سے رخصت ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مگر باآخرو جلوس کے ساتھ میں بھی تھانے کی طرف روانہ ہوا۔ جب ہم لوگ تھانے پر پہنچے تو لوگوں کی تعداد اور تصور دیکھ کر تھانے والے ڈر گئے اور انہوں نے محمد اسماعیل کو چھوڑ دیا۔ اس سے لوگوں کو کچھ اور حوصلہ مل گیا۔ اور وہ اُسے جلوس کی شکل میں جامع مسجد کی طرف لے جانے لگے۔ راستے میں جھوم اور بڑھٹا گیا۔ جامع مسجد پہنچتے پہنچتے کوئی پندرہ ہزار کی گنتی ہو گئی۔ میرے ساتھ مولوی عبدالرحیم خواجہ غلام نبی لکھار بھی تھے۔ چنانچہ ہم لوگوں سے خطاب کرنے لگے۔ جلسہ جاری تھا کہ کسی آنی ڈی کے دو اسپیکر حبیب اللہ اور عبدالکریم پوری وردی میں مسجد میں داخل ہو گئے۔ لوگوں کی نظریں ان بارودی

افسروں پر پڑیں تو ان میں دھنسا جھگڑا مچ گئی۔ اور وہ ہر طرف سے بھاگنے لگے۔ کسی نے اپنے پیچھے اپنا جوتا چھوڑا تو کسی نے اپنی جاکر متشکل سے دو تین سو لوگ اپنی جگہ جمے رہے۔ وردی پوٹن سپاہی یا کانشیل کو دیکھ کر جو دہشت ہوتی تھی اُس کے پیش نظر یہ کوئی جراتی کی بات نہیں تھی۔ مگر یہ بات جراتی کی ضرورت تھی کہ میں میرے دو اور ساتھی نہ صرف اپنی جگہوں پر ڈرتے نہ رہے بلکہ ہم نے بھی ہاتھ بٹونے لوگوں کو واپس آنے کے لئے پکارا۔ اصل بات یہ تھی کہ یہ دو پولیس والے کسی کو گرفتار کرنے کے لئے نہیں بلکہ جلوس کی رپورٹ تیار کرنے کے لئے آئے تھے۔ انہوں نے بھی بھاگتے ہوئے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ گرفتاری کے لئے نہیں آئے ہیں۔ تب کہیں طلسم پھر گیا میں نے پہلی مرتبہ کھلی جگہ پر عوام سے خطاب کیا۔ میں نے اپنی تقریر آغا شہر کاغذی کی نظم سے

آہ جاتی ہے فلک پر دم لانے کے لئے
بادلوں کا جادو دیر و راہ جانے کے لئے

نبیائت درد انگیز لہن میں سنانے سے شروع کی میں دیکھا کہ اس نوسے نے دلوں پر مضطرب کا کام کیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت کو اَنزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی سَبۡبِلٍ کِی تلاوت شروع کر دی توضیح کے بند ٹوٹ گئے اور لوگوں پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے اپنی تقریر میں کہا:

”جب تک حکومت قرآنِ کرم کی توہین کرنے والوں کو سزا نہیں دے گی ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے اور جب تک مسلمانوں کو حقوق نہیں دیے جاتے تعلیم یافتہ مسلمان ایکی میٹن سے باز نہیں آئیں گے۔“

یہ تقریر بھی ایک بجلی کا کرکڑا تھی۔ جس نے کشمیر کی زمین کو ہلاکے رکھ دیا۔ سارے شہر میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ گویا شہر خوشال کے نوبت پہاڑ پر سیسکھوڑ نقادوں پر چوٹ پڑ گئی جو اور وہ ایک ساتھ بجنے لگے ہوں۔ عوام کے سادہ مرگڑنوں اجتماعی ذہن نے عجیب عجیب پرمیگوئیوں کو جنم دیا۔ مثلاً یہ کہ مورہ کا ایک بوڑھا پستلا جھانی لٹاٹے نحت و نزار نوجوان ماسٹر عبداللہ بوسرکاری مدد سے میں اُمتاد بھی ہے حاکم اعلیٰ کے ملاوت تقریر کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ رسم کشمیر میں پیدا ہوا ہے تو کسی نے کہا کہ آسمان سے فرشتہ اُتر آیا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ واقعہ یہ تھا کہ میں ایک بڑی قوت کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا بنگا تھا اور میری حالت دہی تھی۔

مقام گنگو کیا ہے اگر میں کیا ہوں

یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیا کیا ہے

بات چونکہ دل سے نکلی تھی اس لئے کچھ کام بھی کر گئی۔ پناہی جلسہ ختم ہونے پر

دس پندرہ ہزار کا مجمع اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتا ہوا میرے ساتھ آگیا۔ میں اپنی رہائش گاہ پر پہنچا تو مجھ سے ایک اور بار تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ میں اُن کے اصرار پر اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر بولا۔ اُن دنوں لاؤڈ اسپیکر وغیرہ تو رائج نہیں تھے اس لئے سارا زور گلے پر ہی ڈالنا پڑتا تھا اس طرح سے یہ دن گزر گیا اور دوسرے روز میں اسکول اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوا۔ اس دوران میرا عظمیٰ یوسف شاہ مرحوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر آتے تھے اور اُن پر بھی نئے خیالات کی پرچھائیاں پڑ گئی تھی۔ انہوں نے دیوبند کے کچھ جلیل القدر عالم مجاہدوں کی آنکھیں بھی دھیمی تھیں اور تحریکِ خلافت کے جوش و جنون نے بھی اُن کو متاثر کیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ دن پہلے متعارف ہوئے تھے۔ میری خوش الحانی اور جرات کے قائل ہو گئے تھے۔ جلال الدین صاحب کے گھر میں انہوں نے ریڈنگ روم پارٹی کے ساتھیوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مجھے اپنا لیڈر چنیں کہ اس طرح سے اُن کے کام میں قرینہ پیدا ہوگا۔ بعد میں نئے میر واعظ صاحب نے اندراہ کرم مجھے جامع مسجد کے ایک اجتماع میں ”میرالیدر“ کہہ کر متعارف کرایا اور لوگوں سے کہا کہ جو کچھ یہ کہیں وہ میرے بھی خیالات سمجھ جائیں۔ میر واعظ کو اُن دنوں کشمیری مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جو مقام حاصل تھا اُس کی وجہ سے اُن کا یہ تلاوت ایک بہت ہی بڑا سرمایہ ثابت ہوا۔ اور لوگ مجھے اپنے ذہنوں کے ساتھ اپنے سینوں میں بھی جگہ دینے لگے۔

ادھر اب ہر جمعہ کو جامع مسجد میں میر واعظ کے وعظ کے بعد اجتماع ایک جلسے کی صورت اختیار کرتا تھا۔ جن میں تلاوت قرآن پاک اور نعت خوانی کے بعد تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ میری تلاوت ان جمعوں میں خاص طور پر پسند کی

جاتی تھی۔ اور سامعین پر کلام ایزدی کی تاثیر سے رقت طاری ہوتی تھی یہیں میں نے علامہ اقبال کے حیات پرور اور حیات آفرین کلام کو بھی پیش کرنا شروع کیا۔ یہ کلام سیدھے عوام کے دلوں میں ترازو ہو جاتا تھا اور جلسہ ایک شلغم سمندر کی طرح موجیں مارنے لگتا تھا۔ تقریروں میں ہم کشمیریوں کی زبانوں میں اچھا کر انہیں جدوجہد پر گامیا کرتے تھے میرے دوست موصی مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار بھی میرے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ ہر جلسے کے اختتام کے بعد عوام کا ہجوم پھر جلوس کی صورت میں غریبوں کے لئے رہائش گاہ تک مجھے چھوڑنے کے لئے آتا تھا۔

یہ صورت حال حکومت کب تک برداشت کرتی۔ آخر کار اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اس کا تذکرہ شروع کر دیا۔ ان دنوں کشمیر کے گورنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رسلے زادہ ترکو کہ چند تھے۔ انہوں نے شہر کے چند محترنین کو جن میں خان صاحب مرزا غلام مصطفیٰ خواجہ عبدالدین شال، منشی اسد اللہ دیکل، مولوی محمد عبداللہ دیکل، خواجہ غلام محمد الدین گلگو، خواجہ غلام محمد الدین کلاوس، میر تقی اللہ گیلانی، خواجہ عبدالرحیم بانڈے اور مفتی شریف الدین شامل تھے کو اپنے دفتر میں بلا کر مشورہ دیا کہ وہ تقاریر کا سلسلہ شروع کرنے والے ان سر پرستوں کو جو ان کو سمجھا، سمجھا کر اسے بند کر دیاں کیونکہ ان تقاریر کے ذریعے عوام میں حکومت کے خلاف بد نظمی پیدا ہوتی ہے۔ مرزا غلام مصطفیٰ، مفتی شریف الدین اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے نے آؤ دیکھا نہ آؤ نہ تو انہوں کو قید کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن باقی اکثرین شہر نے، جن میں مولوی عبداللہ دیکل پیش پیش تھے، اس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ جب لوگوں تک معاملہ پہنچا تو قید کا مشورہ دینے والے چار اصحاب کے خلاف سخت عیاذی پھیل گئی اور ان پر پھبتیاں کہی گئیں۔ ادھر حکومت نے جامع مسجد کے دروازے پر یہ نوٹس

چسپان کروائی کہ کوئی شخص ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر مسجد میں جلسہ یا تقریر نہ کرے۔ اس زمانے میں جامع مسجد کا انتظام ایک سرکاری کمیٹی کے ہاتھ میں تھا۔ جس کے پیر مین گورنر ہوا کرتے تھے۔ گورنر نے شہر کے چار برگزیدہ اشخاص مرزا غلام مصطفیٰ، مفتی شریف الدین، خواجہ عبدالرحیم بانڈے اور مفتی اسد اللہ دیکل کی امانت سے حضرت بل میں ایک جمعہ کو ایک عوامی جلسہ بلایا۔ حکومت کا خیال تھا کہ ان کے چار مصاحبین کا عوام میں خاص اثر و رسوخ ہوگا۔ لہذا وہ ان کے ذریعے نوجوانوں کی اس سرکش ٹولی کا مسدود بن کر دیا جائے گا۔ ہم کو اس کارروائی کی اطلاع ملی تو میں اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ اس دن نماز جہاد ادا کرنے کے لئے جامع مسجد کی بجائے دھواں حضرت بل پہنچ گیا۔ مسجد کے اندر میں نے پہل کر کے عوام کو غبار دیا کہ سرکاری وفاداروں نے جلسہ کیوں بلایا ہے اور اس لئے اس میں شرکت کرنے سے اجتناب کیوں فروری ہے لیکن جلسہ شروع ہوا تو بہت سے تماشائی اکٹھا ہو گئے۔ بول ہی گورنر صاحب تقریر کرنے کے لئے آٹھ کھڑے ہوئے تو ہمارے نوجوانوں نے ان پر ایسے سوالات کی بوجھاؤ شروع کر دی جن کے جوابات ان کے پاس نہ تھے۔ گورنر لا جواب ہو کر دھمکیوں پر اتر آئے اور نوجوانوں کو گرفتار کرنے لگے۔ ادھر حاضرین میں جوش پیدا ہونے لگا۔ اور ہجوم کی طرف سے اسٹیج پر پتھر پھینکنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گورنر صاحب سرکاری جاہ و دشمن میں رہنے والے عالم تھے، اس بلائے ناگہانی سے گھبرا گئے اور اپنے چار نمک خواروں کے ہمراہ دم دبا کر بھاگ نکلے اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے کے گھر میں، جو قریب ہی واقع ہے، پناہ گزین ہو گئے۔ دوسری جانب ایک انبوہ کثیر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم نے سیدھے جامع مسجد کا رخ کیا اور گورنر کی نوٹس کی دھمکیاں بکھیرتے ہوئے وہاں

تھے۔ "ماستر قید اللہ" کو دیکھنے کے لئے لوگ میری رہائش گاہ کے پاس کھڑا ہوا کرتے اور جب میں نکلتا تھا تو بڑی مشتاقانہ لہجہ ہوں سے مجھے تانا کرتے۔ میں ان لہجہ ہوں میں چھپی ہوئی محبت تو محسوس کرتا تھا لیکن کبھی کبھی مجھے حجاب بھی آتا تھا۔ اور میں دل ہی دل میں کوہشتا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے جو باتیں منسوب کرتے ہیں کیا میں ان کا حق نبہا بھی سکوں گا؟ لوگ میرے ہاں نوچنے کے یا دار کا کے طور پر ساتھ لے جاتیں۔ انہیں شاید اپنی بے کسی نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے معجزوں کی توقع رکھیں۔ میں ایک عام انسان تھا اور ان توقعات سے اور بھی بوجھ محسوس کرتا حکومت تحریک پر ہر پور وار کرنے کے لئے اندر اندر سے تیاریاں کر رہی تھی۔ اور جب وہ مستعد ہو گئی تو اس نے پہلی کاری ضرب لگانے کے ارادے سے مجھے منظور آباد تبدیل کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ حکومت کا خیال تھا کہ میں سرحد کے دور چلا گیا تو اس شوش کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ میں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ اُس وقت ریاست کے ناظم تعلیمات ایک آمرشی انگریز مسٹر میکڈرمٹ تھے۔ یہ ایس۔ پی۔ کالج میں میری زمانہ طالب علمی کے دوران پرنسپس تھے۔ ذاتی طور پر وہ بڑے شریف انفس اور ہمدرد تھے اور مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور جب میں اُن کے دفتر پہنچا تو میرے منتظر آباد نہ جانے کی وجوہات پوچھیں میں نے پناہیہ سکول کو اُن کے سامنے دل کا ماجرا بیان کیا۔ مسلمانوں کی حالت زار کا ذکر سنایا اور کشمیریوں کی زبان حالی کی تصویر کھینچ دی۔ جب میں یہ درد بھری داستان بیان کر رہا تھا تو میری آنکھیں بھر آئیں اور آنسو جھک پڑے۔ ٹیک دل انگریز بھی میرے کرب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ سرکاری ملازمت سے روپیہ کمانا مسیرو

جلسہ کیا اور معمول سے کچھ زیادہ ہی تند و تیز تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں حکومت کے چار نمک خوراں کی بھی مذمت ہوئی۔ اُن کی رہی سہی عوامی ساکھ اس طور مٹی میں مل گئی کہ پھر وہ یہ دھڑکے نہ سنا سکے۔ حکومت نے اس محاذ پر مرنے کی کھائی تو وہ ہمارے میٹھ پیچھے گھات لگا کر بیٹھ گئی۔ میر واعظ صاحبان کشمیر کی مذہبی اور مجلسی زندگی میں اہم مقام رکھتے تھے اور دربار میں بھی اُن کی پذیرائی تھی۔ چنانچہ حکومت نے میر واعظ مولوی کو قیامت شاہ پر دوبارہ ڈالنا شروع کیا کہ وہ جامع مسجد میں ہیں جلسہ کرنے کی اجازت نذر دیں اور اپنے وعظ میں ہماری مخالفت کریں۔ لیکن مولوی یوسف شاہ اس تقاضے کو ٹالتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خواجہ غلام احمد عثمانی نے اس نازک موقع پر میر واعظ خاندان کی ہمدردیاں تحریک کے حق میں حاصل کرنے کے لئے نمایاں کام کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میر واعظ عتیق اللہ اُن دنوں علالت کے سبب مددگار کے مشن ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں اور عثمانی صاحب اُن کی مزاج پڑی کے لئے وہاں چلے گئے اور ساتھ ہی عرضی گنڈاری کہ میں اُن کی ہمدردیوں کی بدستور ضرورت ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے بڑی منگس مزاجی سے ہمیں دلاسا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اُس وقت میر واعظ حکومت کے جھانے میں آکر ہماری مخالفت پر اتر آتے تو ہماری مشکلات دوہرہ ہو جاتیں۔

اُدھر سر پھروں کے "سرخنے" کے طور پر میرا نام حکومت کی دستاویزات میں درج ہو چکا تھا۔ چنانچہ قیامت کے لئے بھی بھول شامراج

قرعہ قال ہستم من دیوانہ زدن

حاکمان وقت کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمیں میرے ارد گرد ہمنور کی طرح حرکت کر رہی ہے۔ میرے نام پر مجھے جمع بھی ہوتے تھے اور جوش میں بھی آجاتے

مقتصد حیات نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندہ رہنے کے اسباب کی تلاش کے لئے ہے۔ میرا اصل مقصد تو اپنی مظلوم قوم کو ذلت و ادبار سے نکالنے کے لئے جدوجہد کرنا ہے میں نے اپنے خدا سے یہ عہد کیا ہے کہ یا تو میں اس مظلوم قوم کو اپنا گویا ہوا و قار اور انسانی حقوق واپس دلانے میں کامیابی حاصل کروں گا یا اسی جدوجہد میں جان کی بازی لگا دوں گا۔ جہاں تک سرکاری ملازمت کا تعلق ہے میں اپنے منصب کے فرض کو بھی یہ بخوبی انجام دے رہا ہوں۔ دس بجے سے چار بجے تک باقاعدگی سے اسکول حاضر رہ کر اپنا کام کرتا ہوں۔ میرے زیر تعلیم طلباء کے نتائج سے ظاہر ہے کہ میں اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں برت رہا ہوں۔ لیکن مدرسے سے واپس آنے کے بعد میرے اوقات پر میری قوم کا حق ہے۔ میں نے سرکاری ملازم ہو کر چند کمزور کے لئے اپنا خیر فروخت نہیں کیا ہے اور نہ کبھی ایسا کر سکتا ہوں۔ حکام متعلقہ کا فرض ہے کہ وہ میرا کام دیکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ میں وقت پر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہوں یا نہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی اخلاقی تمدنی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے کے لئے کوشش کرے۔ اگر حکومت میری اس فرض شناسی کا برا متاں ہے تو میرا استعفیٰ منظور کر لے۔ انگریز ناظم تعلیمات نے غور سے میری باتوں کو سنا۔ پھر کہا کہ حکومت کے قواعد کے مطابق میں جو ہیں گئے حکومت کا ملازم ہوں۔ اس کی منشا کے برخلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میں نے جواباً کہا کہ اسی صورت میں، میں استعفیٰ دینے پر مجبور ہوں۔ مرزا گورنمنٹ نے مجھے رخصت کرتے ہوئے جب آٹھواں ہاتھ دیکھا تو ان کی آنکھیں بھی دہل باگیں۔ انہوں نے مجھے رعایتیں دیں اور جاتے جاتے پیر ایک مرتبہ اپنے فیصلے پر غور کرنے کا مشورہ دیا۔ کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ تعلیم کے وزیر نواب خسر و جنگ کے

یہاں میری طبیعت ہوئی۔ غالباً ناظم تعلیمات نے ان کو ساری روزگاری سنا دی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے شفقت سمجھے کچھ میں اندر بلایا اور نصیحتاً مجھے اپنے ارادے سے باز آنے کے لئے کہا۔ مجھ پر پھر مذبات غالب آئے لگے۔ اور میں نے انہیں اپنی پینا سنی شروع کر دی۔ مختصراً میں نے ان کو اس بارے میں کسی شبہ میں نہیں رکھا کہ جس کام کو میں نے اپنا مقصد حیات بنالیا ہے اس کو میں کسی تحریک یا تعبہد میں اگر ترک نہیں کر سکتا۔ وہاں سے میں رخصت ہو کر آیا تو چند دنوں کے اندر وزیر مومن نے میری برطرفی کا حکم نامہ بھجوادیا۔ حکومت کو قواعد کے ماتحت میرا استعفیٰ منظور کرنا چاہیے تھا مگر اس نے میری برطرفی کا حکم نامہ بھجوادیا۔ حالانکہ نتیجہ دونوں کا ایک ہوتا۔ لیکن حکومت کے دل میں میرے خلاف کدورت کا خبار بھرا ہوا تھا۔ اس کا اظہار اس انتہائی اقدام کی صورت میں سامنے آگیا۔ بہر حال میں نے اسے مولانا حالی کا یہ شعر یاد کرتے ہوئے قبول کر لیا۔

تقریر بزم عشق ہے بے صرف مقصد
بڑھتا ہے اور دوق گنہاں سزا کے بعد

جب میں ملازمت کی بیڑیوں کو کاٹ کر آنا دھو گیا تو اس کا مشن منانے کے لئے میرے ساتھیوں نے خافقہ معنی میں ایک جلسہ طلب کر لیا۔ میں خانقاہ متعلق پہنچا تو کیا دیکھا ہوں کہ ایک عظیم اجتماع جمع ہو گیا ہے۔ مجھے دیکھ کر جمع بے قرار ہو گیا۔ میں نے اپنی تقریر میں اپنے استعفیٰ کے فیصلے کا اعلان کیا۔ اور اس کی وجوہات بیان کر کے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار پھوٹ نکلی پڑھوں نالے میں تغیرِ قلب کی قوت ہوتی ہے۔ میرے مژدہ کا جمع پر بھی اثر ہوا اور وہاں بھی ایک انتہائی جذباتی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ برس

مقصد کے لئے میں کفن بردوش ہو کر نکلا ہوں اس کے لئے ملازمت کی قربانی تو ایک ادنیٰ اسی قربانی ہے۔ اگر میری جان کی بھی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ بھی پیش کر دوں گا۔ اس پر جلسے میں ہوش و غروش کا سیلاب آگیا۔ جب جلسے کے اختتام پر میں گھر کی جانب روانہ ہوا تو عوام نے ازراہ محبت مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شاید اسی جلسے کی روداد بیان کرتے ہوئے لاہور کے اخبار "انقلاب" نے میرے نام کے ساتھ "شیر کشمیر" کا لقب بھی جوڑ دیا۔ جو بعد میں ہماری تحریک حریت کا بلبل جنگ اور شناختی پرچم بن گیا۔ اُس پیمان کی یاد آتی ہے تو مجھے کبھی کبھی میر تقی میر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

موسم آیا تو شاخ دار پہ میسر
سر منصور کا ہی بار آیا

▲▲▲

۹

پیمانِ اول

"ملازمت کے بندھن توڑ کر میں نے آزادی کے رقصِ شر میں اپنے آپ کو مکمل طور پر بھونک دیا۔ اب ہم نے شہر کے اطراف و اکناف میں جلسے کرنے شروع کر دیے۔ جن میں ہزار ہا مردوزن شریک ہوا کرتے تھے۔ ان میں ہمارے علاوہ عبدالصمد درزی نام کا ایک کارکن بھی تقرر کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو عافری پچاس ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کی غلامی کے بعد ایک سوئی ہوئی قوم کسی مست ہاتھی کی طرح بھومتی ہوئی اُٹھتی ہے اور جو طوفانِ ہجوم کے اُٹھتے ہیں وہ تنکوں سے ہالے نہیں جاتے۔ میرے گلے میں رعد کی سی گرج پیدا ہو گئی تھی۔ میں اقبال سے کافی متاثر تھا اور اُس کا انقلاب انگیز کلام کچھ ایسی کیفیت سے پیش کرتا تھا کہ عوام کے مفرد فون میں ابال آ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ آفاstrکی کچھ بلی نقیوں بھی پیش کرتا تھا۔ حکومت ہم پر ہاتھ ڈالتی تو کیسے؟ کیونکہ عوام کا ایسا پارہ پڑھا ہوا تھا کہ اس موقع پر کوئی مداخلت خون خرابے کا باعث ہوتی، اسی دوران ہمارا جہری سٹجھ بھی ولایت سے واپس لوٹ آئے۔ انہوں نے ملک کی یہ حالت دیکھی تو ایک بیان جاری کر دیا جس میں درپردہ انداز سے پولیس اور عدالت کے استعمال کا اشارہ دیا گیا تھا۔ لیکن فی الحال حکومت نے گنگو کی اوٹ سے شکار

کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارا جانے اپنے سیاسی معاملات کے وزیر جی، ای، سی وکیلنڈر کے مشورہ پر ریاستی مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد طلب کیا۔ جو ان کے پاس اپنی شکایات اور مطالبات پیش کرے۔ جنوں کے مسلمانوں کی طرف سے وہاں کی ننگ مینز مسلم ایسوسی ایشن نے مندرجہ ذیل چار افراد کو اپنے نمائندوں کے طور پر نامزد کیا۔

۱۔ مسز یحیٰ علی ۲۔ سردار گوہر رحمان ۳۔ چودھری غلام عباس خان۔

۴۔ شیخ عبدالحمید ڈیو کیٹ۔

جنوں کے مسلمان نمائندگان کا انتخاب ایک چھوٹی سی میٹنگ میں ہوا تھا۔ لیکن ہم نے کشمیر میں اس انتخاب کو رائے عامہ بیدار کرنے اور ان کی قوت کا مظاہرہ کرنے کے مقصد سے تبدیل کر لیا۔ میرے ذہن میں اس میورنڈم کا حشر موجود تھا جو خواجہ سعد الدین شال اور ان کے ساتھیوں نے لاہور ریڈنگ کو پیش کیا تھا۔ اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ ان کی بلا وطنی پر ان کو اپنے ہم وطنوں کی مدد چاہی اور بے نیازی کے کتنے ٹیکوں سے گئے تھے۔ میری رائے میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت عوام کو اعتماد میں لینے کی کوشش

نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی عوامی قوت کے بے پناہ مخزن POWER HOUSE کو تحریک کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ کشمیر کے سات نمائندگان کو ایک جھریے جلسے میں عوام خود چن لیں۔ اس طرح ایک تو ان نمائندگان کی نمائندہ حیثیت شک و شبہ سے بالاتر ہو جائے گی اور دوسری طرف حکومت بھی ان کی آواز کے وزن اور وقار کو نظر انداز نہ کر سکے گی۔ غرض قسمتی سے میرے دوسرے ساتھی میرے ہم خیال تھے۔

انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کرنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ہم کشمیری مسلمانوں

کے باہمی تفرقات پر پشت ڈال کر انہیں بڑے مقاصد کے لئے ایک اسٹیج پر جمع کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ایک غلام قوم کا مقصود ہوتا ہے۔ اُس وقت کشمیری مسلمان طرح طرح کے حقوق اور گھٹ بندریوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ وہ نہایت غیر ضروری امور پر باہم دست و گریبان تھے۔ اور ان کے بڑے مفادات اس آڑ میں ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے تھے۔ حنفی، اہل حدیث، احمدی، اہل سنت، شیعہ، مسیحی وغیرہ کے باہمی مناقشات نے مسلمانوں کا جما جاتی شیرازہ پارہ پارہ کر دیا تھا۔ خود حنفی مسلک کے لوگ شیعہ اور کوہٹ کے ذہنی گردہوں میں بٹ گئے تھے۔ کشمیر کے مسلمان اقبال کے اس شعر کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔

یہ اُمت روایات میں کھو گئی

حقیقت خرافات میں کھو گئی

میر واعظ دوست شاہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے میر واعظ صاحبان کو میر واعظ کلان کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا اور ان کے پیر و کار "کوٹ" کہلاتے تھے۔ میر واعظ کے خاندان کی ایک اور شاخ سے تعلق میر واعظ بھٹانی تھے۔ میر واعظ کہلاتے تھے۔ ان کے پیر و کار کو "ڈیک" کہتے تھے۔ یہ تعداد اور شمار میں میر واعظ کلان کے پیروں سے بہت کم تھے۔ مگر دونوں گروہ شہر کے دل میں اکٹرا۔ سر پرکار رہتے تھے۔ اور ان کی کدورت نے مسلمانوں میں بڑا انتشار پیدا کیا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ اگر ہمیں اجتماعی حقوق کے لئے بڑی لڑائی لڑنی ہے تو پہلے مسلمانوں کو ایک متحدہ محاذ میں پر دیا جانا چاہیے۔ پینا سچر ہم نے ان متعارب گروہوں کو گفت و شنید اور صلح و صفائی کے ذرائع استعمال کر کے ایک جگہ پر جمع کرنے کی کامیابی حاصل کر لی۔ حق یہ ہے کہ اس نازک کام کا بیڑا اٹھانے میں خواجہ غلام احمد عثمانی

اور خواجہ سعد الدین شال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۲۱۔ جون ۱۳۳۷ء کو ہماری دعوت پر ٹیکہ کہتے ہوئے فرزند ان کشمیر کا ایک ٹٹاٹھیں مارا ہوا مسندِ خاقانہ معلّٰی کے عہد میں جمع ہوا۔ اس اجتماع کو کشمیر کی تحریک آزادی کا رسمی افتتاح اور اصلی آغاز سمجھنا چاہیے۔ کتنی موزوں اور برص بات تھی کہ تحریک آزادی کی بنیاد اس خاقانہ فیض پناہ کے پُر مسطوط کنگروں کے ساتھ میں ڈال دی جائے۔ جو امیر کبیر میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدانی کے نام سے منسوب ہے۔ شاہ ہمدانی نے پچھانو سال قبل اسی جگہ اسلام کے نور کی مشعل فروزاں کی تھی۔ جس نے چودھویں صدی عیسوی میں جنگ و جدل، فقر و فساد اور بد حالی اور پائمالی سے ختم حال کشمیریوں کے لئے امن اور آشتی کا راستہ روشن کیا تھا۔ انہوں نے ایک زوال آلودہ تہذیب کے کھنڈروں پر اُمید کا پرلغ جلا یا تھا۔ وہ صرف کشمیر کے لئے اسلام کا دینی تحفہ ہی نہیں لائے بلکہ انہوں نے ایک ترقی پذیر تمدن اور اس کے علوم و فنون بھی اپنے ساتھ لائے۔ جن میں قانونِ بافی، پیر پاشی، کاغذ سازی اور اسی جسم کی بسیلوں رفیتیں شامل ہیں۔ شاہ ہمدانی صرف ماضی کے ہی نہیں بلکہ مستقبل کے نقیب اور صرف دین ہی کے نہیں وائش کے علمبردار بھی تھے۔ اور اسی لئے علامہ اقبال نے اپنے آسمانی سفر یعنی ”جاوید نامہ“ میں اُن کو کشمیر کی آزادی کا نشان قرار دیا اور اُن کو ان غیر خانی الفاظ میں خراجِ عقیدت ادا کیا۔

خُطّہ را آن شاہِ دریا آستین

داو علم و عصمت و تہذیب و دین

آفرید آن مردِ اسیسراںِ صغیر

باہرِ پناہِ غریب و دلپذیر

اس عظیم اجتماع کے سامنے اسٹیج پر کشمیری مسلمانوں کے نمائندے برسوں کے افتراق و انتشار کے بعد گلے مل رہے تھے۔ اسی موقع پر میر واعظ یوسف شاہ نے اپنے حریف میر واعظ احمد اللہ ہمدانی کو اقوت کے جذبے کے تحت گلے لگا لیا۔ اور مولوی عبداللہ وکیل کے ساتھ، جو اُس وقت احمدی مسلک کے علمبردار تھے، تصافح کیا۔ حالانکہ دونوں اپنے مذہبی مسلک میں بعد المشرقین اور اتباعِ فِی الدین تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ”خیمہ ہائے ما جہادِ ہائیکے است“ والا حاورہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔ ان ڈرامائی واقعات نے مجھے میں آگ لگا دی۔ میں بھی موقع کی فضا سے متاثر ہونے بغیر رہ سکا اور تلاوتِ کلام پاک کے بعد میں نے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ اپنی تقدیر کو بدلنے کے لیے کروٹ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اب غفلت کا زمانہ گزر گیا۔ اب یا تو ہم اپنا حق حاصل کر کے دم لیں گے یا اس جدوجہد میں سرکھٹ ہو کر جان کی بازی لگا دیں گے اس اجتماع میں میں نے یہ نظم ترنم سے سنائی۔

اے خداوندِ زور دست و بازوئے حیدر نہیں

پھر اٹھنا ہے عتِ کفر و درِ صیبر نہیں

اس موقع پر میری تلاوتِ قرآن سے ایک عجیب عالم طاری ہو گیا اور ایک کشمیری شاعر نے مولانا رام کی شاعر اس موقع کی متابعت سے میرے حق میں استعمال کیا۔

ایں ہمہ آوازِ اہل شاہ بود

گرچہ از معلقومِ عبداللہ بود

جمع کے ساتھ ہم سب نے قرآنِ مقدس کو شاید بنا کر یہ بیان کیا کہ ہم کبھی

قوم کے تئیں اپنی وفاداری میں متزلزل نہ ہوں گے۔ جب مجمع بلی اور قومی نعروں سے گوج اٹھا تو میں نے سات نمائندوں کے نام ایک ایک کر کے مہور کی منظوری کے لئے پیش کئے۔ اور عوام فلک ننگاں نعروں سے اُن کی تائید کرتے گئے۔ خواجہ غلام احمد عثمانی بڑے ذہین شخص تھے لیکن کسی وجہ سے عوام میں اُن کے تئیں زیادہ صحتِ ظن نہ تھا۔ اس لئے اُن کے نام کی تائید ایک لکھ کے اس ہماری اجتماع سے حاصل کرنے میں مجھے اپنا سارا زور بیان صرف کرنا پڑا۔ بہر حال عوام نے کچھ متاثر کے بعد اُن کے نام کی بھی منظوری دیدی اور اس طرح سے مندرجہ ذیل عمائدین مسلمان کشمیر کے معتبر نمائندوں کی حیثیت سے چن لیے گئے۔

۱۔ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ - ۲۔ میر واعظ احمد اللہ ہمدانی - ۳۔ آغا سید حسین جلالی - ۴۔ خواجہ غلام احمد عثمانی - ۵۔ منشی شہاب الدین - ۶۔ خواجہ سعد الدین شال - ۷۔ راقم الحروف شیخ محمد عبداللہ۔

جلسہ ختم ہوا تو عوام کا بوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ نمائندگان اور جلسہ منظم کرنے والے قریب ہی واقع ہمدانیہ مڈل سکول میں چائے نوشی اور گفتگو کے لئے چلے گئے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے پیچھے ایک ایسی چٹکاری چمکے گی جو کشمیر کے صدیوں سے کپنے والے توالا کھئی کا دہانہ کھول دینے کا سبب بنے گی۔

عبدالقدیر ایک غیر معروف شخص تھا۔ جس نے بارود کے اس ڈھیر میں چٹکاری لگا دی پشاور میں تعینات یوکر شائر رجمنٹ کے انگریز سپرٹ کے ساتھ غانمان کی حیثیت سے کشیدہ آیا ہوا تھا۔ مہاجر تعلق منانے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اور اُس نے نسیم باغ میں ایک ہاؤس بوٹ میں رہائش اختیار کی تھی۔ عبدالقدیر حضرت بل نماز کے لئے آیا کرتا اور کبھی کبھی نماز کے بعد وہاں مسلمانوں کی مظلومیت کے بارے

میں تقریریں بھی کرتا تھا۔ عبدالقدیر فرصت کے اوقات میں ہمارے جلسوں وغیرہ میں بھی شرکت کرتا تھا۔ یہیں اُسے مسلمانوں کی حالت زار نے متاثر کیا۔ اس دن سے کچھ ہفتے قبل وہ جامع مسجد کے ایک جلسے میں مجھ سے ملا تھا اور اُس نے ہماری تحریک سے گہری وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ایک ان پڑھ غیر ریاستی باشندے کے اس جذبے کی تعریف بھی کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ عافقاہِ معلیٰ کے اس جلسے میں وہ بھی موجود تھا۔ جب ہم چلنے نوشی کے لیے چلے گئے، تو اُس نے اپنا دفتر کھول دیا چونکہ عوام بوش کے عالم میں تھے۔ لہذا اُس کے ارد گرد ایک ٹھہرٹ لگ گیا۔ اُس کی تقریر کی رپورٹ سرکار کی سی، آئی، ڈی نے یوں قلم بند کی ہے۔

”مسلمانو! اب وقت آگیا ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ یادداشتوں اور گلدستوں سے ظلم و ستم میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور نہ توہینِ قرآن کا مسئلہ ہوگا۔ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور ظلم کے خلاف لڑو۔“ عبدالقدیر نے راج محل کی طرف اگلے سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا اُس کی اینٹ سے اینٹ بجادو۔“

ہم اس وقوع سے بے خبر اپنی محکماتِ عملی بنانے میں مصروف تھے۔ اُن دنوں عوام میں عجیب غریب دلدہ پیدا ہو گیا تھا۔ میرے لیے گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ ہر طرف ”خیر کشمیر زندہ باد“ کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ یہ نعرہ اب تحریک کا پرچم اور شناختی علامت بن گیا تھا۔ اور اُن کی کشمیری قومیت کا پہلا اظہار ASSERTION بن کر سامنے آیا تھا۔ ہم تقریباً روزِ اشام کو مختلف جگہوں پر جلسے منعقد کرتے تھے۔ جہاں لوگ تقریریں سننے کے علاوہ تحریک کو

آگے بڑھانے کے لیے نقدی اور زیورات بھی پیش کرتے تھے۔ کچھ دن بعد افواہ پھیلی کہ شہر میں گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔ ہم یہ سمجھ کر شاید ہمیں گرفتار کیا جائے گا۔ اس لئے میں، مولوی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی گلکار رات کو ایک پڑوسی کے مکان میں شب باشی کے لیے چلے گئے۔ صبح معلوم ہوا کہ پولیس نسیم باغ کے ایک ہاؤس بوٹ سے کسی عبدالقدیر کو گرفتار کر کے لے گئی ہے اُس وقت تو ہم اس کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ لیکن بعد میں اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہ ہوئی۔ عبدالقدیر کے خلاف رنیر پٹیل کوڈکی دفعہ ۱۲۴ (دلت) اور ۱۵۳ کے تحت بغاوت اور قذاری کا مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ چونکہ اُس کو ہماری تحریک سے ہمدردی کی پاداش میں دھر لیا گیا تھا۔ اس لیے ہم نے مختصرے کی پیروی کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے تو کچھ دنوں اُس کو سنٹرل جیل سے پیدل سیشن رنج پنڈت کیشن لال کچلوکی عدالت میں سماعت کے لئے ہانکا جاتا تھا۔ لیکن جب لوگ اُس کے ارد گرد جمع ہونے لگے تو حکومت نے سنٹرل جیل میں ہی مقدمے کی سماعت کا حکم صادر کیا۔

اُدھر ہمارے جلسوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو گلاؤ کدل میں ایک بڑا عوامی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں میرے علاوہ مولوی عبدالرحیم اور گلکار صاحب نے بھی تقریریں کیں۔ ہم نے عبدالقدیر کے مقدمے کی بند کوٹھری میں سماعت کرنے کی مذمت کی اور عوام کو قربانیوں کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی۔ جلسہ کوئی آدھی رات تک جاری رہا اور ہم تھکے ماندے رات گئے گھروں کو لوٹے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے دن کشمیر کی پیاسی دھرتی پر ہمارے نو جوانوں کے لال لال ہونے کی گرم دھارا صبح کے شفق کی طسرح پھوٹ

بکھلے گی اور ہماری تحدیر کا ایک نیا عنوان جیسے کشمیری سپوتوں کے مقدس نون سے رقم ہوگا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ عبدالقدیر کی نسبت سے یہ غمیں واقعہ ہماری تحریک آزادی کے شوکے چراغ میں طلسماتی روغن ڈال دینے کا باعث بنے گا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہماری تحریک کا ابتداء میں ہی ہم اُس خنیں موڑ پر پہنچ جائیں گے جس موڑ پر پہنچنے کے لئے ہندوستان کی تحریک آزادی کو بیسوں برس انتظار کرنا پڑا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کا حادثہ ہماری تحریک میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں ۱۹۱۹ء میں رونا ہونے والا جلیان والا باغ کا سانحہ رکھتا ہے۔

ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب!

ہم نے گاؤں دکن کے طبع میں عوام سے درخواست کی تھی کہ وہ دوسرے روز یعنی ۱۳ جولائی ۱۹۹۷ء کو سنٹرل جیل نہ جائیں۔ جہاں عبدالقدیر کے مقدمے کی پیشی مقرر تھی۔ جیل میں اجازت کے بغیر کسی کا داخلہ ممنوع تھا۔ اور ہم خون خولہ کو روکنے کے رعا دار تھے۔ لیکن یا تو سبھی لوگوں تک ہماری بات نہیں پہنچی یا جذبات اس قدر مشتعل تھے کہ اسٹے ہوئے قدم نہ رُک سکے۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو سید مقبول بھتی، سید می الدین اندرابی اور محمد بیچا رفیقی سماعت نے دہاں جانے کی ترغیب دی تھی۔ ہم نے مولوی عبداللہ وکیل کو عبدالقدیر کا وکیل صفائی مقرر کیا تھا۔ جب ۱۳ جولائی کو مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو عدالت کے باہر ہزاروں کا جھگڑا لگ گیا۔ جو عبدالقدیر زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔ جو نبی وکیل صفائی مولوی عبداللہ وکیل جیل کے اندر جانے لگے تو عوام کا ایک دہانے کے ساتھ اندر گھس گیا۔ جیل کے جھگڑم کی سبھی گم ہو گئی۔ لیکن وکیل صفائی نے ہماری ہدایات کے پیش نظر لوگوں کو سمجھا کر جیل کے احاطے سے باہر جانے پر راضی کر لیا۔ انہوں نے عوام کو یقین دلایا کہ ان میں چند آدمیوں کو عدالت کی کارروائی سننے کے لئے اندر

بٹوایا جائے گا۔ اسے میں نماز کا وقت ہو گیا اور لوگ باغ میں نماز ادا کرنے کے لئے صفیں بنا کر بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں جیل کے اہلکاروں نے گورنر راسے زادہ ترک کر کے چند کونسلے کی اطلاع کر دی۔ اور وہ مسیح پولیس کے ایک دستے کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ پہلے تو اس نے جیل کے ملازموں کو اس بات پر لتاڑا کہ انہوں نے کس طرح ہجوم کو جیل میں گھسنے دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے جیل کے باہر کھڑے پراسن لوگوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ پولیس نے اندھا دھند گرفتاریاں شروع کر دیں تو ہجوم بھی پیش میں آگیا۔ اور اس نے جواب میں پتھر اڑا شروع کر دیا۔ گورنر نے اپنی کوتاہ اندیشی میں پولیس کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ ہندو قوت کے دہانے آن لوگوں کی غارت کر دیے گئے۔ جو باغ میں نماز کے لیے صفت بستہ تھے۔ ایک مسلمان دیوار کی بلندی سے اذان دے رہا تھا۔ پولیس کی گولی سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جوش و جنون کا یہ عالم تھا کہ اس کی جگہ فوراً دوسرے آدمی نے لی اور وہ اذان کو جاری رکھنے لگا۔ اُس کا سیدھی جھون ڈا لگیا۔ اس طرح بائیس سرفروش جام شہادت نوش کر گئے۔ زخمیوں کی تعداد تو سینکڑوں تھی۔ ظالم کا ہاتھ اس صفائی سے اٹھا تو مظلوم بھی مرنے مارنے پر تیار گئے۔ انہوں نے جیل کی پولیس لائن میں آگ لگادی اور اس کے سازو سامان کو خاکستر کر ڈالا۔ انہوں نے ایک شہید کا کُترنا اٹھایا، جو اس کے خون ناحق سے نفس زبا دی بنا ہوا تھا، اور اس خون میں پریم کے نیچے زخیوں اور شہداء کو چار پائیوں پر بٹا کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہداء کے کشمیر کی سرخ روئی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ مشرک کفیلہ نے بعد میں اعتراف کیا کہ "سارے شہیدوں کے زخم ان کے سینوں پر تھے پشت پر نہیں۔"

یہ اتفاق بھی عجیب ہے کہ ۱۴ جولائی کی ۱۴ تاریخ کو پیرس کے

باشندوں نے باسٹائیں کے زندان پر دھاوا بول کر فرانس کے عوامی انقلاب کی ابتدا کر دی جس نے بعد میں ساری دنیا میں آزادی کے بے شمار لالہ روشن کر دیے۔ کثیر کے باشندے بھی صدیوں کے ظالم اور جبروت شد کے میناروں کو اپنے خون کی موجوں سے خستہ و خراب بنا رہے تھے اور اُس دن بھی جولائی کی تیرہویں تاریخ تھی۔ میں اُن دنوں فح کدں والے کمرے سے فوب بازار کے ایک مکان میں آ گیا تھا۔ اُدھر تحریک کا اُبھار چل چلا جاتا تھا۔ میرے کمرے میں آمدورفت کا سلسلہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ گیران کے مالک بھی مجھے اب اس کے اوپر والے کمرے میں ٹھہرانے کے روادار نہیں تھے۔ اغلب ہے کہ اُن پر حکومت کی طرف سے مجھے بے دخل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ بہر حال ۱۳ جولائی کو میں اس نئے مکان میں جو فوب بازار ٹپل کے بالکل پاس نالہ کے کنارے پر ہے مقیم تھا۔ مشیت کو جو منظور تھا اُس کا اشارہ اُس دن کے موسم سے ملا۔ کوئی دو پہر کے وقت ایسی اندھی چلی کہ ٹھڈا کی پناہ اور چابکچے کے قریب تو بالکل اندھیرا چھا گیا۔ یہ سماں اتنا غیر معمولی تھا کہ فیکٹریز کے اُن اشیات کی یاد آ جاتی تھی جو اُس نے "جولین سیزر" میں لکھے ہیں:

BUT NEVER TILL TO NIGHT, NEVER TILL NOW,
DID I GO THROUGH A TEMPEST DROPPING FIRE
EITHER THERE IS A CIVIL STRIFE IN HEAVEN
OR ELSE THE WORLD, TOO SAUCY WITH THE GODS,
INCENSES THEM TO SEND DESTRUCTION.

ترجمہ: "میں نے اس سے پہلے دیکھا،
کوئی شعلہ بار آندھری نہیں دیکھی

یا تو آسمان میں کوئی باہا کار فحی ہے
یا دنیا، دو تانوں سے بیزار ہو کر،
انہیں تباہی نازل کرنے پر اُگسا رہی ہے۔"

میں اس ماجرے سے جہان تھا کہ ایک نوجوان ہانپتے ہانپتے میرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ بے حد عذرت زدہ تھا۔ اس لیے اُس کے بیان میں ربط نہ تھا۔ اُس نے کہا کہ جیل میں "مارشل لاء" ہو گیا ہے اور گولیوں سے بہت آدمی مارے گئے ہیں۔ میں نے پہلے یہ خیال کیا کہ یہ نوجوان مارشل لاء کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ ممکن ہے جیل میں کچھ گرفتار یا ہوئی ہوں۔ جس کو یہ مارشل لاء کا نام دے رہا ہے۔ لیکن جب نوجوان تھوڑا سا سنبل گیا تو اُس نے یہ اطلاع دی کہ عوام کا ہجوم لاشوں اور زخمیوں کو لے کر ایک جلوس کی صورت میں شہر کی طرف آ رہا ہے۔ اس خبر سے مجھے سخت تشویش پیدا ہو گئی۔ ایک تو حقیقی جانوں کے اتلاف کا صدمہ تھا۔ دوسری یہ فکر تھی کہ کہیں معاملہ بڑھ کر فرد و دار و خدا کی صورت اختیار نہ کرے۔ مولوی عبد الرحیم اتفاق سے میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کو فوراً یہ ہدایت دے کر روانہ کر دیا کہ وہ عوام کو جامع مسجد آگے نہ بڑھنے دیں اور شہداء کے صدارت قبول کو جامع مسجد میں ہی روک کر رکھیں۔ تھوڑی دیر بعد مولوی عبد الرحیم واپس آ گئے۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لوگوں کو سمجھانے بھجانے کی اُن کی تمام کوششیں اکارت گئی تھیں۔ اور لوگ زخمیوں کو لے کر جہاز گنج کے شفا خانے کی طرف چل پڑے تھے۔ مولوی صاحب نے یہ خبر دی کہ لوگ سڑت مشتعل ہیں اور مزید کدوں و بہوری کدں میں ٹوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ یہ دہشت انگیز جبرن کر میں تو دیکھی جاتے واردات کی طرف چل پڑا۔ پوچھتا پوچھتا پتہ چلا کہ

لوٹ مار کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ چند مسلمان ایک شہید کا جسدے کرکٹس کے مکان واقع واہ پورہ کی طرف جا رہے تھے اور ایک اور زخمی کو دوسری چارپائی پر طبی امداد کے لیے ہمارا گج ہسپتال لا رہے تھے۔ جب یہ ہمارا گج پہنچے تو پنجاب کے ہندو دوکانداروں نے، جو ہمارا گج میں بیٹھ کر کشمیر کی ساری تجارت پر غلبہ جمائے ہوئے تھے، اُن کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ جب غمزدہ مسلمانوں نے کھتری دوکانداروں کو انسانی ہمدردی کے طور پر اس خونِ ناحق پر دروکان بند کرنے کو کہا تو ان سیٹھ ساہوکاروں نے دلاسا دینے کی بجائے انہیں کو سنا شروع کر دیا۔ اس پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چند مسلمانوں نے کچھ ہندو دوکانداروں پر ہل بول دیا اور اُن کا مال و اسباب ادھر ادھر چھینک ڈالا۔ ایسے موقعوں پر بد معاشرلوں کی چال بازی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر لوٹ کا مال اپنے گھروں میں بھی چھپایا مگر جب حالات معمول پر آ گئے تو پولیس کی تلاشی کے دوران نہ صرف یہ مال برآمد کیا گیا بلکہ اُن کے ذاتی اثاثے پر بھی ہاتھ مصافح کر لیا گیا۔

میں جب زینہ کدل ہانڈا سے گذر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمی کپڑے کے تھان اٹھائے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔ بہر حال میری منزل جامع مسجد تھی وہاں میں نے قبل عام کا یہ سفاکانہ منظر دیکھا تو میرے آنسو پھٹک پڑے۔ لیکن یہ گریہ و زاری کا موقع نہ تھا۔ میں نے شہداء کی لاشوں کو ایک قطار میں چارپائیوں پر رکھوایا۔ ہماری کسپری کا یہ عالم تھا کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے کوئی وسیلہ ہم نہ تھا۔ حکومت ان کی جبرگیری کے بدلے اپنی سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ادھر سرجم زخمیوں کی دیکھ بھال کی تدبیر کر رہے تھے ادھر حکومت نے (CARALRY) رسالہ فوج کا ایک دستہ ہمارا گج کی طرف روانہ کیا۔ یزوں سے مسلح گھوڑسوار سپاہیوں نے

مار پیٹ اور بے رحمی کا طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔ اور مسلمانوں کی دھڑا دھڑا گزرتاریاں شروع ہو گئیں۔ کسی نہ کسی طرح نمائندگان میں سے چند اصحاب جامع مسجد پہنچ گئے۔ جن میں میر واعظ محمد یوسف شاہ، خواجہ غلام احمد عثمانی اور خواجہ عبداللہ شال کے نام نمایاں ذکر ہیں۔ جامع مسجد کے اندر چاروں طرف آہ و بکا کا شور برپا تھا۔ شہیدوں اور زخمیوں کے عزیز و اقارب اُن کی چارپائیوں کے ارد گرد دہائیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اور ہم بے صبر جہرا اپنے دل کے زخموں کو چھپائے اُن کو دلاسا دے رہے تھے۔ اتنے میں ایک زخمی نے، جو جان کنی کی حالت میں تھا، مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور اپنی نعتِ آواز میں مجھ سے یوں مخاطب ہوا "شیخ صاحب! ہم نے ہٹنا فرض ادا کر دیا ہے، اب آپ کی ذمہ داری ہے، قوم سے کہیے کہ وہ اپنا فرض نہ سمجھیں۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہی اُس نے آخری پچھلی لی اور اپنی جان، جان آفرین کے پیر دکروی۔ کچھ دیر کے بعد نواب مسرور جنگ فوجی دروی زیب تن کئے ہوئے جامع مسجد میں آئے۔ اُن کے چہرے بشرے پریشانی تھی۔ لیکن جب انہوں نے ہمیں بھاننے کے لئے زبان کھولی تو میں نے شہداء کی خون سے لت پت لاشوں کی طوت اشارہ کرتے ہوئے اُس سے کہا کہ اس قبل عام کے بعد محض زبانی صبحِ خورشید سے مسلمانوں کے دلوں پر پھانسا رکھنا مشکل ہے۔ ہم ان شہداء کے خون کا بدلہ لے کر رہیں گے اور قوم کے کھوئے ہوئے حقوق کی جو امانت انہوں نے ہمارے سپرد کی ہے اس کو واپس حاصل کر کے ہی دم لیں گے۔

رات ہونے لگی تو ہم نے مسجد کے چاروں دروازے بند کر دیا دیے تاکہ حکومت کے کارندے تاریکی کا فائدہ اٹھا کر قزاق بن کر نہ آئیں اور شہیدوں کی لاشوں کو اٹھا کر نہ لے جائیں۔ ہم نے جوانوں کی ایک ٹولی کو رات بھر لاشوں پر

میرے پاس پہنچا دیا گیا۔

جنوں شہر سے چوچار نمائندے چن لیے گئے تھے وہ چند دن پہلے سرسبز پہنچ گئے تھے۔ ہم نے ان سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور حکام و کدوں کے نزدیک ایک ہاؤس بوٹ میں ان کے قیام و طعام کا بندوبست کیا تھا۔ ۱۳ جولائی کو حالات بگڑ گئے تو ان میں سے تین نمائندوں، چودھری غلام عباس، سردار گوہر رحمان، اور میری یعقوب علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ معجزی فیروز پور، شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ پر ہاتھ نہ ڈالا گیا۔ یہ نمائندے ہم سے پہلے ہی بادامی باغ کے دوسرے کوارٹر گارڈ میں پہنچا دیے گئے تھے۔ ہماری گرفتاری کے بعد تحریک کی باگ ڈور میرا وظہ مووی محمد توسیف شاہ، خواجہ غلام احمد عثمانی، خواجہ سعد الدین شال اور باقی نمائندگان کے ہاتھ میں رہی۔ ان کے سامنے اولین مسئلہ شہداء کی تجویز و تکفین کا تھا۔ حکومت اس سلسلہ میں نمائندگانہ یا کسی مجلس کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس موقع پر خواجہ نور شاہ نقشبندی کو یہ خیال آیا کہ ان شہیدوں کو کسی جگہ ایک ساتھ دفن کر دینا چاہیے۔ تاکہ یہ مقدس یادگار قوم کی انگلیں جگا تی رہے۔ انہوں نے حکومت کے اہلکاروں کے حواس پر خاک ڈالتے ہوئے کہا کہ درگاہ نقشبندیہ کے مزار میں ان کو اکٹھے دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔ تاکہ شہیدوں کو اپنے اپنے محلے کے قبرستان میں لے جانے کی نوبت نہ پائے۔ جس سے جرم جمع ہو سکے ہیں۔ فواب حضور جنگ اس تجویز کے دودس عواقب کا یا تو اندازہ نہیں کر سکے۔ یا وقتی مصلحت کا پاس کرتے ہوئے اس پر آمادہ ہو گئے۔ اور اس طرح سے شہیدوں کو اس خفاقاہ کے صحن پاک میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔ اور اُس وقت سے لے کر یہ جگہ ہماری امیدوں اور آرزوں کا آفتخ بن گئی ہے۔ ہر سال ۱۳ جولائی کو یہ مزار بابر لڑنے

پہرہ دینے کی ذمہ داری سونپی۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے سمیت مسجد کے فوارے میں ایک مکان میں رات بسر کرنے کے لیے چلا گیا۔ نیند تو خیر کیا آتی۔ آخر شکاری کرتے رہے۔ رات کو میں حالات کا جائزہ لینے کے لئے باہر آیا تو ایک گڈ سے میں گر پڑا۔ کچھ زخم لگے۔ مرہم پٹی کروانی پڑی۔ لیکن اُس وقت میرے زخموں کی اہمیت ثانوی تھی۔ کچھ قویہ ہے کہ اُس شام کو شہر میں کسی مسلمان گھر میں نہ چل رہا تھا اور نہ خود و فوش ہوا بلکہ سارے شہر میں ایک قوی ماتم کا سماں چھا گیا۔ ۱۴ جولائی کی صبح دواگرہ فوج نے جامع مسجد کے چاروں طرف گھیر ڈال دیا۔ جگہ جگہ مشین گن نصب کر دیے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی غنیم پر چڑھا پٹی کی جارہی ہے۔ ہمارا جاک فوج کے سربراہ ایک انگریز بریگیڈیر سدر لینڈ تھے۔ وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر گوپال تھا پال کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ میں مسجد کے اندر تھا۔ لیکن جب میں نے سنا کہ میری گرفتاری کا حکم ہے تو مسجد سے باہر آیا۔ سدر لینڈ کی مجھ سے مدد پوچھ رہی تھی تو اس نے، چانک میرا نام پوچھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ میرا ہی نام عبداللہ ہے تو اس نے تھا پا کو حکم دیا کہ مجھے اُسی وقت گرفتار کر لیا جائے۔ تھا پال نے فوراً میرا بازو پکڑ لیا۔ لیکن میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا کہ میں اپنی مرضی سے گرفتار ہونے کو تیار ہوں۔ مجھے فوراً حراست میں لے کر ایک پولیس گاڑی میں بادامی باغ کی چھاؤنی کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں مجھے میرا وظہ مووی محمد توسیف شاہ جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ تانچے پر سوار تھے میں نے انہیں براہ آواز بلند پکارا، اپنی گرفتاری سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ اب صورت حال کو سمجھالیں۔ چھاؤنی پہنچا کر مجھے ایک کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ رات کو میرے ساتھیوں مووی عبدالرحیم اور خواجہ غلام نبی جگہ کار بھی گرفتار کر کے

کی آہوں سے مُعطر اور اشکوں سے منور ہو جاتا ہے۔ جب تک کشمیریوں کے دل میں قومی غیرت کا چراغ روشن ہے یہ قومی یادگار شاداب اور بارون رہے گی۔ اور وہ اس الاؤ سے خلوص، اقتصاد اور جدوجہد کے شہسارے پختے رہیں گے۔

ہنا کر دندوش رستمے ہنماک و خون غلطیدند
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

*

(۱۱)

جس کشمیر کو خون سے سینچا...

کشمیری جاننازوں کے سینوں کی فصیل چیر کر خون کی ندیاں بہانے والی ڈوگرہ سرکار گھبراہٹ میں اپنے بدترین ہتھکنڈوں پر اُتر آئی اور مضامات میں مارشل لا نافذ کر کے دہشت کا عالم پیدا کیا گیا۔ ہر طرف فوج پھیلا دی گئی۔ اور گھوڑ سوار نرہ برہا سپاہی مرکون پٹخت کرتے رہے۔ لوگوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل ریگنے پر مجبور کیا گیا اور سینکڑوں لوگوں کو باندھ سلاسل کر دیا گیا۔ فوج اور پولیس کے بل بوتے پر مسلمانوں پر اُن علاقوں میں جہاں اُن کی تعداد زیادہ نہ تھی، حملے کیے گئے۔ اُن کی جائیدادیں لوٹی گئیں اور انہیں بے حق کر لیا گیا۔ لوگوں سے ہندو کی نوک پر ہمارا جا کی جے کے نعرے لگوائے جاتے تھے۔ لیکن شہر میں ممکن احتجاجی ہڑتیاں رہی اور حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود دکان داروں نے دوکانیں کھولنے سے انکار کر دیا۔ ساری وادی میں زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی اور لوگوں نے اپنا کاروبار بھی چھوڑ دیا۔

اُدھر میں اپنے دوستاقتیوں کے ہمراہ باوامی باغ کے کنارے گھاڑی میں پھر بیٹھا رہا تھا۔ ہم باہر کے حالات سے متعلق ناواقف تھے۔ ایک رات یوں ہوا کہ اچانک کواڑ کواڑ کی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا گیا اور ہمیں باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ اب ہم چند

پولیس آفیسروں کے آنے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے ہتھکڑیاں ہمارے ہاتھوں میں ڈالنے کے لئے جھنجھٹائیں۔ گھوڑا صاحب نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنی دونوں ہتھیلیاں پیش کرتے ہوئے کہا "لو ہیناؤ! ہمارے لیے یہ لوہے کی زنجیریں بہنیں بلکہ سونے کے کنگن ہیں۔" ہم کو ایک لاری میں سوار کر کے کڑے فوجی پہرے میں بٹھا دیا گیا۔ لاری میں فوجیوں کی بڑی تعداد بندوقین تلسے بٹھا دی گئی تھی۔ پہلے قوم اس فیال میں رہے کہ ہمیں کشمیر سے باہر کسی مقام پر لے جایا جا رہا ہے۔ لیکن بخوشی دودھ پلے کے بعد گاڑی کا رخ شمال کی طرف ہوا تو ہم سمجھے کہ ہمیں سنٹرل جیل لے جایا جا رہا ہے۔ رات کا سناٹا تھا لیکن ناکوں پر فوج بہرہ دے رہی تھی اور ہر نوڑ پر مشین گن پڑھا دیے گئے تھے۔ ہماری گاڑی سنٹرل جیل جانے کی بجائے کاشمی دروازے میں مڑ گئی۔ ہماری منزل اب صاف طور پر ہری پرت کا قلعہ تھا۔ مندر کے قریب ہمیں لاری سے اترنے کے لئے کہا گیا۔ ہم کو گپٹنڈی سے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے کہا گیا۔ جس کے اوپر قلعہ واقع ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہمیں دو دو کیل ساتھ اٹھانے کے لئے بھی کہا گیا۔ یہ بالکل محال تھا کیونکہ ہمارے دونوں بازو ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہم نے کیل اٹھانے سے انکار کر دیا کسی نہ کسی طرح قلعہ کے دروازے پر پہنچ گئے تو وہاں کھڑے ایک فوجی دستے نے، جو بندوقین تانے ہوئے تھے، ہمیں گھیر لیا۔ قلعہ کا دروازہ کھلا تو ہمیں ایک اور فوجی دستہ کھڑا نظر آیا۔ ایک سپاہی آگے بڑھا اور اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ "تم میں سے پہلے کون اس کو ٹھری میں جاسے گا؟" ہمارا ماتھا خشک کہ ہماری آغوشی گھڑی آن پہنچی ہے اور ہمیں اس کال کو ٹھری کے اندر لے جا کر کسی اندھے کنویں میں دھکیل دیا جائے گا۔ دو گرہ شاہی ابتدا سے ہی اس قلعے میں اپنے باغیوں اور سرکشوں کو ترسیخ

کرتی رہی تھی اور اس کا ذکر ہم نے بھی سن رکھا تھا۔ اب ہم موت کے اس کوں کے آنے سامنے تھے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہم ڈرنے کی بجائے ایک اور کشمکش میں لگ گئے۔ ہم جنوں میں سے ہر ایک سب سے پہلے اندر جا کر شہادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گھوڑا صاحب تو بالکل ہی چل رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف غایب ہو کر غامی بلند آواز میں کہا کہ آپ لوگ مجھے اپنا لڈر تسلیم کر چکے ہیں۔ لہذا مجھے ہی پہلے اندر جانے کی سعادت بخشو۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے۔ اب ہماری قوم کو ہماری غیر موجودگی میں تحریک کو زندہ رکھنا ہوگا۔ ویسے بھی مجی کی نگاہ دنیا سے زیادہ آخرت پر ہوتی ہے۔ ہماری جدائی غامی ہوگی اور ہم دوسری دنیا میں پھر گلے ملیں گے۔ فوجی چپ چاپ میری اس گفتگو کو سن رہے تھے اور کچھ تو خاصے متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب لوگ دگرے تھے۔ اور ایک ظالم سرکار نے انہیں یہ ناخوشگوار کام سونپ دیا تھا۔ ورنہ من حیث القوم تو یہ بڑے جمولے بھالے اور شریف ہوتے ہیں۔ میرے دوساتھی بھی میرے امرار کے آگے بے بس ہو گئے۔ میں اپنے دو کیل لے کر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ چاروں طرف قبر کا سا گھپ اندھیرا تھا۔ کسی کھڑکی اور روزن وغیرہ کا نشان تک نہ تھا۔ زمین ننگ دھڑنگ اور نرم آلود تھی۔ میں کھڑا رہا۔ باری باری میرے دوساتھی بھی اندر آ گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ناکہ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے رچایا گیا تھا۔ بہر حال ہم چند کیل بچھا کر پڑے رہے۔ اور اس ادھیڑ میں پڑنے کے کہ سیرہونی دنیا سے کیسے رابطہ قائم کریں؟ غلام تہی گھلکار کا دماغ ایسی اسکیموں کے لیے بڑا چلتا پڑتا تھا۔ انہوں نے اپنا کوڈ تجویز کر لیا۔ اب اس بات کی تلاش ہونی کہ کس دریسے سے اپنا پیغام باہر اپنے ساتھیوں تک پہنچائیں۔ صبح دس گیارہ بجے کہ قریب

ڈاکٹر عبدالقادر نامی ایک صاحب ہمارا ملاخہ کرنے کے لئے آئے۔ مجھے رات کو سردی لگنے سے ہلکا سا تونیا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کوٹھڑی کی حالت دیکھی تو سیپاہیوں سے سفارش کر دی کہ ہمیں دن میں دھوپ میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ جب باہر گئے تو دیکھا کہ قلعہ کے نیچے بٹھے ہیں جو درمی نظام عباس، مستری یعقوب علی، اور سردار گوہر رحمان کو زیرِ حراست رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے کھانے وغیرہ کے متعلق ہدایات دے کر رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد روزانہ وہ قلعہ کے اندر آتے رہے۔ سلام و دعا کے بعد وہ ”آں الٰہ کما کان“ دہراتے تھے۔ جس سے یہ اشارہ مقصود ہوتا تھا کہ باہر کے حالات جوں کے توں ہیں۔ باورچی، نان، وغیرہ قویٰ ہرے میں آتے جاتے تھے۔ لہذا وہ ہمارے اچھی ذہن رکھتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ پہرے دار ہی ہمارے دوست بن گئے اور ہم ان سے ہی شہر کی خبریں سننے لگے۔ شہر میں پورے آٹھ دن تک مکمل ہڑتال رہی۔ وہ ایک ہی مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے لیڈروں کو رہا کرو۔ فوج نے بڑی کوشش کی تھی کہ ہڑتال ٹوٹ جائے لیکن فوج نے غلطی و تشدد کے باوجود اس سے منس نہیں ہوئے۔ انہیں قوت کے لئے عوام کو ہرن پر ایک ٹانگ پر کھڑا کر کے چلنے کو کہا جاتا اور ہمارا جہاد کی بجائے کانغرہ لگانا پڑتا تھا۔ سڑکوں پر عوام کو پیٹ کے بل ریٹنگ کے لئے کہا جاتا تھا۔ جب یہ حیلے بھی ناکام ہو گئے تو فوج نے شہر میں روٹ مارچ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر گلیوں میں دھما چوکوی چا دیے تھے اور لوگوں کو اپنے جیٹی سامانی ہلاکت کا مظاہرہ کر کے مرغوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بالآخر فوج ہو کر حکومت نے مشائی صاحب، میر واعظ محمد یوسف شاہ، مولوی عبداللہ وکیل اور خواجہ نور شاہ نقشبندی کو ہمارے پاس بھیجا کہ سمجھوتے کی کوئی

سبیل پیدا ہو اور زندگی پھر معمول پر آ سکے۔ حکومت کا منشا تھا کہ ہمیں گزشتہ سال کی طوع سے تحریری ضمانت مل جائے کہ آئندہ ہم باغیانہ تقریریں نہیں کریں گے۔ ہم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے یہ دلیل پیش کی ہم اپنے حقوق اور انصاف چاہتے ہیں۔ اس میں بغاوت کا کیا سوال ہے؟ ہم نے بغاوت کی ہے اور نہ کریں گے۔ حکومت تنگ آچکی تھی۔ اس لئے اتنی ہی یقین دہانی کافی تھی اور ایکسٹن دن کے بعد ہمیں رہا کر دیا گیا۔

ہماری رہائی سے ماحول میں یک لخت تبدیلی پیدا ہو گئی۔ عوام کی غوشی کا ٹھکانا بھی نہ رہا۔ لوگ اس رہائی کو اپنی فح کی فوج سمجھنے لگے۔ چند دن کے بعد میں نے جامع مسجد کے ایک استقبالیہ جلسے میں تقریر کی اور عوام کو عزم و ہمت سے کام لینے کی تلقین کی۔ اور یہ بھی کہا کہ مکمل فتح مندی انشاء اللہ ہماری ہوگی۔

کشمیر میں جو تقدیر ساز واقعات رونما ہو رہے تھے ان کی گونج کشمیر کے باہر اور خاص طور پر پنجاب میں زور و شور سے مٹانی دینے لگی۔ بدقسمتی سے وہاں کے ہندو پریس نے اس ہل چل کو غلط اور مظلوم کی کشمکش کے زوہ میں دیکھنے کی بجائے تعصب کی عینک لگا کر دیکھنا پسند کیا اور اس تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ بعد میں ہماری تحریک کے ہر اہم اُستاد چڑھاؤ پر اخبارات نے اسی روش کو اپنا مسلک بنایا۔ ان دنوں لاہور کے تین روزنامے ”میل“، ”پربت“ اور ”ٹریبون“ خاصے بائیس ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ اور وہی کشمیر کی تحریک کے متعلق شو شہ بازی کرنے میں پیش پیش تھے۔ دراصل یہ دوسرے کچھ کشمیر کے ایک ہندو وزیر مشرپی کے واسطے تیار ہارے تھے۔ مشرپی کیلئے ہمارا جہاد ہر سبک کے منظرِ نظر تھے۔ اور اس نے ان کو ریجنی کونسل کا چیئرمین مقرر کر دیا تھا۔ مشرپی کو یہ بات

ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اور وہ ویلفیلڈ صاحب کا پتہ کاٹ کر خود وزیراعظم بننا چاہتے تھے۔ لہذا مسٹر وائل کی شہ پر ہندو پریس نے سرسز ویلفیلڈ پر بھانت بھانت کے الزام عائد کر دیے اور آخر کار ہارا جانے ان کو بڑی بے ہوشی کے ساتھ نکال باہر کر دیا۔ اُدھر وائل صاحب بھی اپنا منہ لے کر رہ گئے۔ کیونکہ وہ ایک تو وزیراعظم بنیں گے اور دوسرے اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہمارا بچہ نے راجہ ہری کرشن کو وزیراعظم مقرر کیا۔ جو تھوٹے پنجاب کے رہنے والے لیکن کشمیر کی سرزمین سے بھی رشتہ جتناتے تھے۔ اور یہاں ان کی جاگیریں بھی تھیں۔ اس کے برعکس نیر جہاندار اختیارات اور مسلم پریس نے تحریک کی حمایت اور کشمیر کی منت گیرانہ پالیسی کی شدید مکتہ چینی کی۔ اخبار "انقلاب" لاہور کے مدیران مولانا تہار اور مولانا سالک نے جو ابتدا سے ہی ہماری پیٹھ سٹھ تک رہے تھے، اپنا سارا زور قلم صرف کر کے ڈوگرہ راج کے قلم و ستم کو بے نقاب کر دیا۔ کشمیر کے حالات نے جو کورٹ لی تھی اس نے پنجاب کے باغیہ لوگوں کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ ان میں بہت سے لوگوں کی رگوں میں کشمیری خون دوڑ رہا تھا۔ کیونکہ ان کے آباؤ اجداد شہ صدیوں میں کشمیر میں روئے نما شدہ اہری سے گہرا کر پجرت کر گئے تھے۔ علامہ اقبال اسی معزز صفت کے میر کاروان تھے۔ اور انہوں نے اپنے قابل لحاظ اثر کو استعمال میں لا کر کشمیریوں کے حق میں آواز بلند کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ ہم سر جولائی کو میان افضل حسین نے مسلمانوں کا ایک جلسہ شمل ہند بنایا دوں پر طلب کیا۔ یہ جلسہ سرسز و افتخار علی خان کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ اور اس میں چند سرسز وادہ اصحاب نے شرکت کی۔ اجلاس میں کشمیری مسلمانوں کی موخر امداد کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کیا گیا اور کشمیر کمیٹی کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ جماعت قادیان کے خلیفہ سرتا بشیر الدین محمود احمد کمیٹی کے صدر اور مسٹر عبدالرحیم درو اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ہم

ابھی قلم ہری پرست میں ہی بندھے کو کمیٹی کا ایک وفد حالات کا جائزہ لینے کے لئے خواجہ عبدالرحیم کی صدارت میں کشمیر پہنچ چکا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو کشمیر کمیٹی کی ہدایت پر سارے ہندوستان اور ریاست کے اندر زور و شور سے "یوم کشمیر" منایا گیا۔ جس کا مقصد کشمیر کے حالات کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرنا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے مقامات پر جلسے ہوئے اور قراردادیں پاس کی گئیں۔ سرسز میں اس دن عظیم الشان ریلیاں دی۔ مزایہ شہداء پر ایک عظیم اجتماع منعقد ہوا۔ جس میں ہزاروں کے قریب دُغیران کشمیر نے بھی شرکت کی۔ جمع اس وقت زار و قطار گرہ کرنے لگا جب ڈوگرہ فوج کی گولیوں سے شہید ہونے والے فوجیوں کے بچے ایشجہ پر آئے۔ وہ شہیدوں کے خون میں لت پت پٹے پٹے بھی ساتھ لائے تھے۔ میں نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ شہیدوں نے اپنی جان قربان کر کے کشمیر کی نجات کی راہ روشن کی ہے اور اب ہمیں صبر و استقلال کے ساتھ ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چکا مون رہنا چاہیئے۔ مولوی محمد یوسف شاہ اور کچھ دوسرے ساتھیوں نے بھی تقریریں کیں۔

اُدھر راجا ہری کرشن کوں بھانپ گئے تھے کہ مسلمانوں کے رہنماؤں سے رابطہ قائم کیے بغیر حالات پر قابو پانا مشکل ہے۔ مسٹر ویلفیلڈ جو ایک تجربہ کار افسر تھے، کو ای کی ٹینک کی حوصلہ افزائی کے الزام پر نکال باہر کیا گیا تھا۔ اور اس وقت راجہ ہری کرشن کوں نے ہمارا جا کو یقین دلایا تھا کہ وہ تین مہینے کے اندر بغاوت کی سرکوبی کریں گے۔ لیکن اب حالات ان کے قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ راجہ ہری کرشن کوں نے قسم، رہنماؤں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک شرط کی کسی چال چلی۔

نواب سرتہ شاہ پنجاب کے بڑے گڈی نشین پیر صاحب کے صاحبزادے

تھے۔ اُن کے والد نے حزب اللہ نام کی ایک جماعت بنائی تھی۔ پنجاب میں اُن کا فاعلا اثر شروع تھا۔ ایک قوتیروں کی حمایت حاصل تھی دو سرے حکومت ہند بھی اُن پر بڑی ہریان تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پنجاب میں راجہ صاحب نے شاہ صاحب کے خاندان کے ساتھ کافی پیکیں بڑھائی تھیں اور اب وہ اُنہیں کثیر میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

پنجاب انگریزوں کے نقطہ نظر سے بڑی اہمیت کا صوبہ تھا۔ اس صوبے سے انگریز اپنی فوج کے لئے رنگروٹ بھرتی کرتے تھے۔ اس لیے اُنہیں یہاں کسی سیاسی افراد کی کانجھ ہرگز پسند نہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ہند نے کافی تدابیر اختیار کی تھیں۔ مثلاً صوبے میں صنعت اور کارخانوں کو فروغ دینے کی بجائے تیراوت پر زور دیا جاتا تھا۔ تاکہ محنت کشوں کی مرکزیت کی سبیل پیدا نہ ہو۔ زمین کے بڑے بڑے سببے فروغی خدمات کے عوض تقسیم کیے جاتے تھے۔ اس طرح حکومت نے اپنے وفاداروں کے ذریعے دیہی زندگی پر گرفت کر رکھی تھی۔

دوسری طرف پیر رستی اور ضعیف الاعتقادی کو عام کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں، پیروں اور گڈی نشینوں کی سرپرستی کر کے اُن کے دائرہ رسوخ کو وسیع کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اور پھر اُن کے ذریعے اپنے راج کی کونٹیاں مضبوط کروائی جاتی تھیں۔ قادیان میں مرزا غلام احمد صاحب نے اپنی جماعت کا ایک بڑا مرکز قائم کیا تھا اور اُنہیں انگریزوں کی واضح سرپرستی حاصل تھی۔ اس طرح پیر جماعت علی شاہ بھی ایک بڑے مجاہدہ نشین تھے۔ اور اُن کے عقیدے میں تہا اُن کوں کے شمار میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران یہ فوجی بھرتی کو کامیاب بنانے کے لیے لوگوں کو توجہ دیتے تھے کہ اگر وہ انہیں باوجود

لیں تو ان کی برکت سے اُنہیں جنگ میں گولی نہیں لگے گی۔ سید پر شاہ صاحب نے شاید نواب کا خطاب ایسی ہی خدمات کے صلے میں حاصل کیا تھا۔ بہر کیف سید پر شاہ نے سرینگر اکوٹ مسلم نمائندگان اور حکومت کے درمیان رابطے کا کام انجام دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک سمجھوتے طے ہوا۔ جس پر مسلمانوں کی طرف سے اُن کے نمائندوں نے دستخط کیے اور حکومت کی طرف سے راجہ ہری کرشن کوں وزیر اعظم نے۔

یہ سمجھوتہ وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر طے پایا۔ اور اس کی شرائط طے کرنے میں مولوی یوسف شاہ، مولوی عبداللہ وکیل اور خواجہ سعد الدین مثال نے بڑے حصہ کر رکھا لیا۔ عثمانی صاحب کسی معروفیت کی وجہ سے شریک بحث نہ ہو سکے۔ اس لیے اُن کو رات گئے ایک سرکاری گاڑی بھیج کر بلا یا گیا۔ آتے ہی اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا سب نمائندگان نے سمجھوتے پر دستخط کر لیے ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُنہوں نے کہا کہ لایسے پھر میں بھی دستخط کروں۔ اور کسی تامل کے بغیر اپنے دستخط کر دیے۔

مجھے سمجھوتے کے متنی سے زیادہ اس کے سیاسی اور نفسیاتی حقائق پر اطمینان تھا۔ اور اس لحاظ سے یہ ہماری فوج کے برابر تھا۔ پہلی بات یہ تھی کہ یہ پہلا سمجھوتہ تھا جس پر مسلمان نمائندگان کے بالمقابل ریاست کے وزیر اعظم نے اپنے دستخط کیے تھے۔ اور اس طرح سے ہیں برابر کا فرق تسلیم کر لیا تھا۔ دویم ہمیں حالات کا جائزہ لینے اور اپنی حقوں کی ترتیب کے لیے کچھ وقفے کی ضرورت تھی۔ جو اس سمجھوتے کی بدولت ہمیں ہاتھ آ رہا تھا۔ ۱۳ جولائی کا سامنہ ایک دھماکے کی صورت میں رونما ہوا تھا۔ اور اس کے بعد حالات تیزی کے ساتھ کروٹیں لے رہے تھے۔ ہمیں اس نئی تبدیلی کے امکانات پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ ایک اور اہم بات یہ تھی کہ ہماری

تحریک عام طور پر ابھی شہر سرینگر تک ہی محدود تھی، مضافات میں عوام واقعات کی اصل نوعیت سے واقف نہ تھے۔ میرے نام کا قلاب دیکھ بھنگے لگا تھا، خوش اعتمادوں نے درختوں کے پتوں پر "شیر کشمیر" کے حروف کے رقم ہونے کی شہرت کر دی تھی۔ اس بات کا اتنا ہرجا ہوا کہ ہمارا جاہری سنگھ نے اپنے راج محل میں ایسے پتوں کو چشم خود ملاحظہ کرنے کیلئے طلب کر لیا تھا۔ لیکن گاؤں کے لوگ میری شکل سے ابھی نا آشنا تھے۔ ہم نے سمجھنے کی ایک شرط کے تحت یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ ہم وادی کے اہم قصبوں کا دورہ کر کے عوام کو صبر و سکون سے رہنے کی تلقین کریں گے۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے ہمارے لیے ٹرانسپورٹ دینا کرنے کی بھی ذمہ داری لی تھی۔ اور میں اسے تحریک کو وسعت دینے اور اس کی عوامی بنیاد وسیع کرنے کا شہری موقع خیال کرتا تھا۔

▲▲▲

(۱۲)

غلط فہمی اور اس کا ازالہ

ہم نے صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے وادی کے اہم قصبوں کا دورہ کرنے کا آغاز کر دیا۔ اب پہلی بار تحریک اپنے قلب سے باہر پھیل رہی تھی۔ ہم نے اسلام آباد، سوپور وغیرہ میں بھاری جلسے منعقد کیے۔ وہاں ہمارا بڑے اشتیاق سے استقبال ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری وادی ایک لمبی میند سے انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور ایک نئی صبح سے ہم کنار ہورہی ہے۔ اور ہم نوجوانوں کی قسمت میں بقول اقبال قدرت نے یہ سعادت رکھی ہے ۵

ناظر شاہ رحمت کا مدی خواں ہونا

ہم نے ان کیٹیوں کے نام پر اپنی عظیم کامراندانی دھماکچہ کھڑا کیا۔ اور ایک فائدہ اس سمجھوتے کا یہ ہوا کہ حکومت نے پہلے ہی واد میں جن سینکڑوں افراد کو فرضی جرائم میں کال کوٹھریوں میں دھکیل دیا تھا اور بہت سے ملازمین کو معطل یا بطرف کیا گیا تھا ان کی نجات کی بھی سبیل نکل آئی اور میں اس کو ایک اہم کامیابی تصور کرتا تھا۔ کیونکہ اس طرح سے عوام کا معاملہ بنے رہنے کی تدبیر ہو گئی تھی۔ اگرچہ ذاتی طور پر میں جانتا تھا کہ وزیراعظم اپنے اقرار کا پابند نہیں رہے گا لیکن میں حکومت کے ساتھ بڑی محنت

کے لیے منصوبہ تیار کرنے کی تہمت چاہتا تھا اور اس سمجھوتے نے اس کی راہ ہموار کر دی تھی۔

لیکن سمجھوتے کا اعلان ہونا تھا کہ اس کی نسبت زبردست بدگمانیاں پیدا کی گئیں۔ عوام پر اس قدر اثر ڈالا گیا کہ انہوں نے بہن ہی کو سنا شروع کر دیا۔ حکومت کے اجنٹ میدان میں تھے اور انہوں نے عوامی ہندوؤں کی نقاب پر عوامی بغض و غضب کا رنچ ہماری جانب پھیرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ہم پر غداری کا الزام مانا گیا۔ رات کو مشتمل نوجوانوں کا ایک گروہ چھپانے کے کمری رہائش گاہ پر پہنچا۔ مگر اتفاق سے میں وہاں پر موجود نہ تھا۔ اور اس طرح بلا مل گئی۔ بعد میں مجھے یہ چونکا دینے والی اطلاع ملی کہ مولوی محمد عبداللہ وکیل نے انہیں میرے خلاف لگایا تھا۔ حالانکہ یہ بزرگ سمجھوتے پر دستخط کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ مجھے آج تک اُن کے اس اقدام کی وجوہات سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ بہر حال۔ ہم نے ایک بڑی ہی کشیدہ صورتحال میں نمائندوں کی ایک خاص میٹنگ مولوی یوسف شاہ صاحب کے گھر پر بلائی۔ ادھر ہم حالات کا جائزہ لے رہے تھے ادھر میرا غلط منزل کے باہر مشتمل مسلمانوں کا ایک بھاری ہجوم ہو گیا۔ اُن کے تیرہ دے ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا قائل کر دیا گیا تھا کہ نمائندگان حکومت کے ہاتھوں میں یک گئے ہیں خود میٹنگ کے ادر مولوی یوسف شاہ کے چھوٹے بھائی مولوی یحییٰ بڑے بھگتے ہوئے تھے۔ وہ سمجھوتے کا سارا الزام عثمانی صاحب کو دے رہے تھے۔ عثمانی صاحب بھی بڑے دُورِ اشتعال تھے۔ دونوں کے درمیان تو تو میں میں کی فوجت آگئی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے مولوی یحییٰ کو بتایا کہ عثمانی صاحب کو مورد الزام ٹھہرانا سراسر زیادتی ہے۔ کیونکہ وہ تو سمجھوتے پر پہلا دستخط کرتے ہوئے کے وقت تک وہاں

پر موجود ہی نہ تھے۔ لیکن یحییٰ صاحب بے وقوف غضب ناک رہے۔ وہ فہم کرتے رہے کہ عثمانی صاحب مجلس نمائندگان سے استعفیٰ دے کر نکل جائیں۔ عثمانی صاحب بھی ترنگ میں آکر مایل ہونے لگے۔ اس مرحلے پر میں نے اپنا ہوج بند کر کے انتباہ دیکر عثمانی صاحب کو استعفیٰ کی اجازت دی گئی تو میں بھی اُن کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ کیونکہ ایک بے گناہ ساتھی کو عوام کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے قربانی کا بکرا بنانا انصاف کا خون ہوگا۔ سچائی کا تقاضا ہے کہ ہم جرأت اور بہت کے ساتھ سمجھوتے کی ذمہ داری قبول کریں۔ عوام کے سامنے جائیں اور انہیں اس کی افادیت پر قائل کریں۔ مسیروا غلط یوسف شاہ کی سادہ لوحی کی بھی حد نہ تھی۔ وہ مجھے ایک طرف آٹھا کر لے گئے اور پوچھنے لگے کہ کہیں عثمانی صاحب نے واقعی ہم لوگوں کو تو جکڑ نہیں دیا؟ میں نے حیران ہو کر اُن سے پوچھا کہ یہ باتیں آپ کہہ رہے ہیں؟ سمجھوتے کی شرائط کتنے کرتے وقت آپ وزیرِ اعظم سے جو کلام تھے۔ بچارے عثمانی صاحب تو وہاں موجود ہی نہ تھے۔ پھر پھر صیغے کا سوال کہاں سے آیا؟ اور اگر سمجھوتہ کرنا واقعی غلط تھا تو اس کی ذمہ داری ہم سب کو قبول کرنی چاہیے۔ عثمانی صاحب تو اس کے سبب کم ذمہ دار ہیں۔ بالآخر طے پایا کہ جامع مسجد میں جلسہ تلاء کو عوام کے سامنے ساری صورت حال پیش کی جائے۔ ادھر ہم میٹنگ میں مصروف اس سنجیدہ صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ ادھر میرا غلط منزل کے باہر عوام کا ایک بھرا ہوا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اور ہمارے خلاف ہذبات کے عالم میں شور و غوغا مچانے لگا۔ میٹنگ میں سناٹے کی سی کیفیت چھا گئی۔ اور میزبان حضرت تو سٹپٹانے لگے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں کھڑکی سے لگ کر ایستادہ ہو گیا۔ میں نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے عوام سے کہا کہ وہ قومی قیادت کو غصے دل و دماغ اور سکون کے ماحول میں سوچنے سمجھنے کا موقع دیں اور یوں

بے قابو ہو کر ہر کسی غلط اقدام کے لئے مجبور نہ کریں۔ میں نے مضبوط جہجے میں کہا کہ ہم دباؤ میں آکر کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ جس سے قومی مقصد کو گزند پہنچنے کا احتمال ہو۔ چنانچہ عوام نظریں جھکائے مگر کچھ بڑبڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے۔ اور میزبان صاحبان کی جان میں جات آئی۔

چنانچہ سمجھوتے کے دوران بعد یعنی ۲۸ اگست ۱۹۳۹ء کو جامع مسجد میں جلسہ ہوا۔ شہر کی تقریباً ساری مرد آبادی آمد آئی تھی۔ مولوی یوسف شاہ نے معاہدے کی شرائط لوگوں کو سنائیں اور اس کا پس منظر بھی لوگوں کو سمجھایا۔ میں نے اپنی تقریر میں سمجھوتے کے فائدہ آجا کر کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ کیا یہ ہماری حیات نہیں ہے کہ ایک مطلق العنان حکومت عوام کے نمائندوں سے برابری کی سطح پر آتی ہے اگر حکومت ہم سے بغل گیر ہونا چاہتی ہے تو ہمیں اسے ایک موقع دینا چاہیے۔ اگر دوماہ کی مقررہ میعاد میں اس نے اپنے وعدے پورے نہ کیے تو میں پہلا شخص ہوں گا جو کفن بردوش ہو کر عدالتے احتجاج بلند کرے گا۔ قوم کا فرض ہے کہ وہ ہم پر اعتماد کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام بڑی حد تک مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے۔ کچھ لوگ تو جاتے وقت زار و قطار آئندہ رہا رہے تھے۔ کچھ دن بعد میں خواجہ سعد الدین شال اور عثمانی صاحب بارہمولہ، سوہور، اسلام آباد وغیرہ گئے۔ سوہور میں کچھ لوگوں نے اس وقت احتجاج کی طرف جوتے پھینکے جب خواجہ سعد الدین تقریر فرما رہے تھے۔ لیکن جب ان کو ہم نے حقیقت حال سے روشناس کیا تو ان کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ دونوں اطراف سے شرائط کی پابندی کی نگرانی کے لئے ایک کمیٹی کا اعلان ہوا جس میں صوفی محمد اکبر، مولوی محمد یاسین، حاجی رفیع دار، اور محمد رجب بخش کو بطور ممبرین لیا گیا۔ اسی طرح جہاڑہ اور بارہمولہ میں بھی کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی۔ اسلام آباد میں جو کمیٹی بنی اس میں منشی میر الدین،

خواجہ غلام محمد زندہ دل اور محی الدین ریشی کو بطور ممبرین لیا گیا۔

ان ہی آیا مکے دوران مولانا ابوالکلام آزاد کرنل ہاکر کی محبت میں کشمیر آئے۔ وہ کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے آئے تھے۔ میں نے مولانا سے فواب خسرو جنگ کی کوٹھی میں ملاقات کی، یہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور انہوں نے تحریک کے مقاصد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے کچھ نصیحت آموز مشورے دیے۔ بعد میں کوئی بائیس برس بعد مولانا صاحب نے اپنے ۹ جولائی ۱۹۴۷ء کے خط میں اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مجھے لکھا تھا۔

”میرے عزیز عبداللہ! میرا آپ کے ساتھ ایک دوگانہ تعلق ہے۔ ایک تو کشمیر کی نیست ہے جو آپ کے ساتھ میری عوامی وابستگی کا نشان ہے۔ دوسرے ذاتی اور نجی ۱۹۳۹ء سے آپ کو ایک عزیز دوست کی نظروں سے دیکھتا رہا ہوں۔“ سر سیکر میں انجمن ترقی اسلام کے تحت ایک ہائی اسکول چل رہا تھا۔ اس کی بنیاد میرا غلط رسول شاہ نے اس صدی کی کروڑ پر ڈالی تھی۔ اس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ اس اسکول کے لیے میں نے شہر میں چندے کی تہم شروع کی تھی۔ جہاں جہاں میں جاتا تھا، لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے۔ میں نے راجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے اب حکومت کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا تھا۔ میں نے حکومت کو چٹاونی دی کہ اگر اس نے مقررہ وقت تک اپنے وعدے پورے نہ کیے تو ہم پھر میدان میں کود پڑیں گے۔ آدھ راجہ ہری کشن کو بھی اپنے داؤد بیچ کھیل رہے تھے اور جوں جوں ان کے داؤد غلط پڑتے جاتے تھے وہ سراپہ ہو کر ایک فیصلہ کن ٹکڑے لینے کے لیے پرتوں رہے تھے۔ چنانچہ انہیں پھر یہی سوچی کہ مجھے منظر ہٹانا ان کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اس طرح سے میری دوسری گرفتاری

کی ممکن تیاری کر لی گئی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو میں ایک ہاؤس بوٹ میں اسلامیہ اسکول کے لیے چندہ لینے کے لیے داخل ہوا۔ واپس آیا تو مجھے پولیس کا ایک دستہ انتظار میں ملا۔ ڈی، آئی، بی پولیس مسٹر عبدالغفور خان نے مجھے ہنڈپر وزیر اعظم کے مکان کے مین سامنے گرفتار کر لیا اور سیدھا باندی باغ چھاؤنی پہنچا دیا۔ میری ذات اب عوامی سمندر کے جوار بھانے کے ساتھ بڑھ گئی تھی۔ اور مجھ پر ہاتھ ڈالنا اس سمندر کو لاکارنے کے برابر تھا۔ یہ خبر بجلی کی سی تیزی سے شہر و دیہات میں پھیل گئی اور پھر سے عوامی زندگی میں ٹپل جی گئی۔ ہڑتال، جلے، جلوس، مظاہرے، یہ اب روزمرہ کی باتیں تھیں۔ تحریک کو چلانے کے لئے ایک حزب بنگ (وار کونسل) کے قیام کا اعلان ہوا، جو ہاتھ سے لکھے ہوئے پوسٹروں کے ذریعے، جنہیں رات کے گھپ اندھیرے میں دیواروں اور کھجیوں پر چسپان کیا جاتا تھا، لوگوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ مفتی جلال الدین خان قادیانہ مفتی کے اسٹیج سے وار کونسل کے پہلے وائٹیر کی حیثیت سے عوام کے سامنے آئے۔ وہ کہیں تھے اور مجھے بعد میں بتایا گیا کہ جب وہ اسٹیج پر آئے تو کانپ رہے تھے۔ لیکن جی کوا کر کے چار لفظ بول ہی گئے۔ اور انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن لوگوں کا تانا باننا بندھا ہی رہا۔ اور پچیس ہزار کا جمع لگ گیا۔ چونکہ مسجد کے باقی دروازے بند تھے اس لیے صرف مشرقی دروازے پر ساری ریل پیل تھی۔ اُدھر لوگ اس کثرت سے آ رہے تھے کہ اندر جانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ دفعہ ۱۱ سالہ فوج کے چالیس سواروں نے آؤ دیکھا تہ تاؤ اور کسی وارنگ کے بغیر مسلمانوں کے جم غفیر پر گھوڑوں پر سوار ہو کر پڑھاٹی کر دی۔ اُن کی اس سفاکانہ حرکت سے جمع میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ دروازے کی طرف دوڑنے لگے۔ باہر تو

فوج نشانہ باندھے کھڑی تھی۔ اُس نے مسجد کے دروازے پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ خون کے قنارے چھوٹے اور دروازے کے سامنے انسانی لہو کا دھارا بہنے لگا۔ چار افراد وہیں دم توڑ گئے۔ درجنوں شدید زخمی ہو گئے۔ یہ سب خونِ ڈرامہ چند منٹ میں ختم ہو گیا اور رسالہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اس سارے نالگم کے ہدایت کار گورنر تھا کر کر تار سنگھ تھے۔ اور فوج کا چھٹا آٹ اسٹاف سدر لینڈ خون کی اس ہولی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر رہا تھا۔ اسی روز کاؤکل میں عورتوں اور بچوں کے ایک جلوس پر رسالہ کے نیرہ برادران نے اپنی تیرہواں نوکیں استعمال کیں۔ بہت ساری معصوم جانیں گھوڑوں کی سموں کے نیچے پھل ڈالی گئیں۔ اور گولیوں سے بہت سی خواتین لہو لہان ہو گئیں۔ بسنت باغ میں دوسرے جلوس پر گولیاں چلانے سے آٹھ مسلمان جام شہادت نوش کر گئے۔ فوج مردہ ہمداد زخمی اپنے ساتھ لے گئی۔ صحت ایک شہید کی لاش عوام کے ہاتھ آئی اور اُس کو انہوں نے جامع مسجد پوچھا دیا۔ ظاہر تھا کہ ہری کشن کول اپنی وہ صلت ظاہر کر رہا تھا۔ جس کا مظاہرہ اُس نے پنجاب کے کچھ اضلاع میں کیا تھا اور جس کی بنا پر ہمارا ہرنے اُسے کشمیر کی شورش فرو کرنے کے لئے اپنے آؤ جبکہ طر پر چین کیا تھا۔ وہ اب اپنی لطیفی عیاری کو علیانہ باغ کے جلاؤ کرنل ڈائر کی سفاکی کے ساتھ ملا کر اس مہلک آمیزے سے کشمیریوں کو تیز کر لینا چاہتا تھا۔ لیکن واقعات نے دکھا دیا کہ عوامی تحریک کی فوج نظریہ کے ساتھ نیکو کر اُس کا سارا غرض پاش پاش ہو گیا۔

اُن دنوں شہر میں جذباتِ تلقینا پی پڑتے ہوئے تھے۔ لیکن کشمیری مسلمانوں نے اپنی رعاداری اور شرافتِ نفس کا ثبوت یوں دیا کہ انہوں نے کسی غیر مسلم کو کوئی گوند نہ پہنچائی۔ غیر مسلموں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بھردری دکھائی اور

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے شہر میں شور و شغب مچا کر قیوناز فہ کردیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرسبز گیسے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پرقافز کیے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنڈے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیام صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان با مشاغل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پست نڈت کا نسیل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گولیوں سے بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں قلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گھنگ بج گیا ہے۔ میرا عظم مولوی محمد توسعت شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانہار میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک پارما اور قلند رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وادی پہنچے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمبند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے دن میں داؤ پر شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو پرائیک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نار شو" کہتے ہیں لگے۔ "نار شو" گولی کے لپے سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے خیر میں شورش سے گھبرا کر قیونازد
 کر دیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے
 آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس
 وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے
 تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں
 نے سر سبک سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں
 ایک پُرامن ہجوم پرقانون کے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے
 ڈنڈے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیام صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس
 کے زندان بائٹل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پستل
 کا نیشنل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گولیوں سے
 بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا
 کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گھنٹ بج گیا ہے۔ میرا عظمیٰ مولوی محمد توسعت شاہ
 نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو بچا کر کہ وہ خانیار میں
 ہوجائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی
 مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف
 روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانہار میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک
 پارما اور قلندِ رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے
 ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیرِ فیض میں لہراتے ہوئے
 آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وادی پہنچے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم
 کا عسکری کمبند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے دن میں داؤدِ شجاعت
 دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو
 پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نارٹو" کہتے ہیں لگے۔ "نارٹو" گولی کے
 لپے سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے خیر میں شورش سے گھبرا کر قیوناز فہ کردیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرسنگھ سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پرقافرنکے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنڈے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیادہ صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان بائٹیل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پست منت کا نٹیل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گویوں سے بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گھنگ بج گیا ہے۔ میرا عظم مولوی محمد توسعت شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانہار میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک پارما اور قلند رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے دن میں داؤدِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نارثو" کہتے ہیں لٹکے۔ نارثو، گولہ کی جگہ سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے خیر میں شورش سے گھبرا کر قیوناز فہ کردیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرسنگھ سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پرقافرنکے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنکے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیام صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان بائٹیل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پست نڈت کا نٹیل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گویوں سے بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گھنچا بج گیا ہے۔ میرا عظم مولوی محمد توسعت شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانہار میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک پارما اور قلند رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے دن میں داؤدِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نار شو" کہتے ہیں لگے۔ "نار شو" کڑی کے لیے سے ڈنکے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے خیر میں شورش سے گھبرا کر قیوناز فہ کردیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرسنگھ سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پرقافرنکے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنڈے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیام صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان بائٹیل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پست نڈت کا نٹیل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گولیوں سے بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں قلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گنگا نچ لگا ہے۔ میرا عظم مولوی محمد توسعت شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیاہ میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیاہ کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانیاہ میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک پارما اور قلند رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھسان کے رن میں داؤدِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نارٹو" کہتے ہیں لگے۔ "نارٹو" گولی کے لپے سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

چھلیاں پکڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بعد میں اس کا نام نارٹروپلین مشہور ہو گیا۔
 شہر سرسنگ کے دوسرے حصوں سے بھی لوگ گھبراہڑوں، کدالوں، پتھریوں اور تلواروں سے
 مسلح ہو کر نکلے۔ اور غامبار پھونچے۔ سرکاری بیان کے مطابق مجمع تین سو اٹھاونوں سے
 بھی لمبی تھا۔ لیکن یہ مبالغہ آمیز ہی ہے۔ البتہ کچھ پھٹی پڑائی شکاری بندوقیں ضرور
 اُن کے ساتھ تھیں، حکومت کی نظر میں صرف غدار اور بغاوت کے برابر تھا۔ لیکن یہ دراصل
 ایک عوامی انقلاب تھا۔ بہرکیت۔ عوام کے بچے تھوڑے بچاؤں کو ہمارا جاہری سنگھ
 نے بڑا سب زبرد کھایا اور اپنی فوج اور پولیس کو محکمہ دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی
 بارکون اور تھانوں سے باہر نہ نکلیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی کوئی حرکت کی ہوتی تو
 اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سرسنگ خون کی گلیاں میں ڈوب جاتا۔ ہمارا بے
 اس کے برعکس نواب خسرو جنگ، چیت آف دی ملٹری اسٹاف، ریگیڈ برسر لینڈ،
 خواجہ سلام شاہ وغیرہ کو مسلم نمائندگان کے ساتھ بات چیت کی سلسلہ جنبانی کے
 لیے بھیجا۔ انہوں نے زیارت و دیگر صاحب پر پہنچ کر خواجہ سعد الدین شال،
 مولوی محمد یوسف شاہ، مولوی احمد اللہ جھانی، مولوی عبداللہ وکیل، آغا سید
 حسین جلالی، وغیرہ کو ہمارا جاسے گفتگو کی دعوت دی اور عوام کے سامنے بھی یہ
 تجویز پیش کی گئی۔ عوام کے جذبات کی لود اپنی تھی اور وہ نمائندگان کے ہمارا جاسے
 پاس جانے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن انہیں یقین دلایا گیا کہ حالات کو سدھار پر لانے
 کے لئے اُن کی جو بھی بات چیت ہمارا جاسے ساتھ ہوگی، اُسے عوام کے سامنے پیش کیا
 جائے گا۔ چنانچہ تین نفوس مولوی یوسف شاہ، خواجہ سعد الدین شال اور مولوی عبداللہ
 وکیل اُن کے ساتھ راج محل گئے۔ جہاں ہمارا جاسے صاحب نے انہیں انتظار کی تلخی کا خوب
 مزا چکھا کہ بعد میں مشن باریابی سے نوازا۔ ہمارا جاسے فیض میں تھے۔ اور انہوں نے

کشمیری زبان میں وفد کے ارکان کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ اُن کا قصہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تو
 نواب خسرو جنگ نے اُن کو یاد دلایا کہ مجمع اُن کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اور بہتر ہے کہ یہ
 انہیں پُر امن طور پر منتشر ہونے کے لیے کہیں۔ چنانچہ انہیں نمائندگان بے نیل و مرام
 اور کچھ سپہ ہوتے واپس آئے۔ دیر ہو چکی تھی۔ انہوں نے عوام کو کسی دیکھی طرح منتشر
 ہونے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن انہیں اصل واقعات بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہیں بتایا
 کہ آئندہ کے لائحہ عمل کے متعلق ان کو بعد میں اطلاع دی جائے گی اسی رات خواجہ
 سعد الدین شال کو اپنے گھر سے گرفتار کر کے باجمی باغ چھاونی کے ایک کوارٹر گزارڈ
 میں رکھ دیا گیا اور عثمانی صاحب اور بخشی غلام شہید کو کوٹلی باغ تھانہ میں پہنچا
 دیا گیا۔

لیکن دوسری صبح کو صورتحال نے ایک اور ہلکا کھایا۔ شہر میں ۱۹ اہل آرمینس
 نافذ کر دیا گیا۔ جو برما کے اُس قانون سے مشابہ تھا جس کو وہاں مشن میں مسلح طاقت
 کھلنے کے لیے نافذ کیا گیا تھا۔ حکومت نے اپنی فوجی قوت کا بھرپور مظاہرہ کر کے
 عوام کو دہشت زدہ کر کے ان کا حوصلہ توڑنے کی منظم کوشش کی۔ لیکن لوگوں نے
 فوری ردعمل دکھاتے ہوئے اس کا توڑ کیا۔ انہوں نے ہمارا جاسے حق میں بلند ہونے
 والے نعروں کے جواب میں اُس کی مذمت میں نعرے بلند کرنا شروع کیے حکومت
 مزاحم ہو گئی اور اُس نے مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ گرفتاریوں کا ایک
 ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے اپنی پیٹ میں ساری وادی کو سہ لیا۔ طرح طرح کے
 ستم اکیلا دیکھے گئے۔ شہر میں چار مرکزوں پر گرفتار شدگان کو لایا جاتا تھا اور اُن پر
 بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے تھے۔ ان تازیانوں سے بعض لوگوں کے جسمانی
 نظام پر ہمیشہ کے لیے ایسے اثرات مرتب ہو گئے کہ پھر انہیں ساری زندگی ان کا مداوا

جب عوامی بغض و غضب کا طوفان چاروں طرف سے پھوٹ پڑا تو راجہ ہری کرشن کوئل اور مٹھا کر تار سنگھ نے سازش کے آئودھ ہجیرا سے اس کاڑھ موڑ دینا چاہا۔ اس سازش کا اصل مقصد مجھے تختہ دار تک پہنچانا تھا تاکہ روز روز کا دربار سر ہی ختم ہو جائے۔ سلیم کاٹل ہونے پر سرنگ شاہراہ پر بھجوا دے گئے۔ آگے واقع ہے اور اس مرکز پر نقل و حرکت کے سلسلے میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی پل کو رات کی تاریکی میں نذر آتش کر دیا گیا۔ سازش میں کھڑے ہل کے عبدالغنی مکر و عبداللہ بٹ خانیاری اور دوسرے لوگوں کو قتل کیا گیا۔ اور اس کا منشا یہ ظاہر کیا گیا کہ سازشوں نے میرے اہل اسے پر کشمیر کا رشتہ جہوں سے کاٹ دینے کا غدارانہ اقدام کیا ہے۔ واردات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا اور چودھری فیاض احمد سیشن جج کو ٹریبونل کے چیرمین کی حیثیت سے مقرر کیا گیا۔ لیکن کسی طرح سے اس نام نہاد سازش کی اصلیت کا سراغ کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود کو مل گیا۔ انہوں نے فوراً وائسرائے ہند لارڈ ولنگٹن کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ جہاں جا ہری سنگھ کو دل طلب کر لیا گیا۔ حکومت پھر گہرا گئی اور اس نے ایک جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے کچھ دوسری فتنہ سازیاں اختراع کرنے کا شعرا اختیار کیا۔ اس طرح سے پہلی بار تحریک پر باہر کی بجائے اندر سے دار کرنے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو تحریک آزادی کے مختلف مرحلوں میں نور و ظلمت کی کشمکش کی طرح ہمارا بچھا کرتا آیا ہے۔

راجہ ہری کرشن کوئل ایک جہاں دیدہ اور گنگا گنگا قلم کے آدمی تھے۔ انہوں نے میر واعظ یوسف شاہ کو، جن کے ساتھ جہاں جاتا صاحب میری دوسری گرفتاری کے بعد ہی کچھ بیٹگیں بڑھانے لگے تھے، مولانا کے ایک معتقد اور اپنے واقع کار خواہ غلام محمد چشت کے ذریعہ اپنی کوٹھی پر بلوایا۔ وہاں چکنی پیٹری باتیں کر کے مولانا

کرتے ہوئے ہی بنی۔ سرسنگ کی موجودہ نمائش گاہ کے آگے تازیانہ مارنے کا مرکز قائم کیا گیا۔ جہاں قصاب زدگان کو عوام کی ہنگاموں کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا اور ان کے ننگے بدن پر کوڑے لگاتے جاتے تھے۔ عوام پر تعزیری جرمانے عاید کیے گئے اور جلدیوں کی مضبوطی کے حکم صادر ہوئے۔ لیکن عوام کے جوش کا عالم بدستور جوں کا توں رہا۔ ظلم و ستم کی یہ لہر اس قدر وحشیانہ تھی کہ پہلی مرتبہ ہندوستان کے ان اخبارات نے جو ہمارا جاکے ہر اقدام پر آتنا و صحت قنا کہتے تھے اس بربریت کی کڑی تنبیہ چینی کی۔

ہندوستان اور پنجاب میں اس ظلم و بربریت کی خبریں پہنچیں تو وہاں بھی ایک جذباتی انقلاب برپا ہو گیا۔ مجلس احرار کے تحت مسلمانوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے اور ان کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لیے جموں کی سرحد کے پاس ریاست میں گھس جاتے کے لیے اپنے جتنے بھیجے۔ چونکہ کشمیر کے انقلاب کی لہر اب جموں میں بھی تومیں مار رہی تھیں۔ لہذا سرحد پار سے ان جھٹوں کی آمد نے جو "چلو چلو مومنو۔ رنج کرو کشمیر کا" کا رجز الاپ رہے تھے، ڈوگرہ حکومت کو حواس باختہ کر دیا۔ صرف ایک ماہ میں کوئی پانچ ہزار کے قریب احراری رضا کار ریاست کی سرحدوں پر گرفتار کیے گئے۔ اس کے بعد حکومت نے سرکار لکھنؤ سے باضابطہ طور پر فوجی کمک طلب کی۔ مہر نومبر ۱۹۳۱ء کو انگریزی لشکر میرپور پہنچ گیا۔ اور اس نے عورت جھٹوں کے داخلے کے خلاف ہی کارروائی نہیں کی بلکہ میرپور کو مٹی اور راجوری کی تحصیلوں میں غیر مسلم باغیہ داروں کے خلاف مظلوم کسانوں کی بغاوت کو بھی بے دردی سے کچل کر رکھ دیا اور اس سلسلے میں انگریزی بمبار جہازوں کو بھی استعمال کیا گیا۔

دارورسن کی آزمائش

ادھر یہ شور مچ رہا تھا، ادھر میں بادامی باغ کے کوارٹر گارڈ میں اپنی زندگی کے انتہائی پُر آشوب دن کاٹ رہا تھا۔ میرے کوارٹر گارڈ کے سامنے ایک کنگلی قائم کی گئی اور اُس پر ایک شخص کو باندھ لیا گیا۔ میری نظروں کے سامنے اُس کے ننگے جسم پر کوٹے برسائے گئے۔ مجھے احساس تھا کہ ہری پرت کی تکنیک کا یہ دوسرا روپ ہے۔ اور یہ سب کچھ مجھے خوت زدہ کرنے اور میرا معاملہ توڑنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ میں یہ سب کچھ دیکھ کر سہم سا گیا۔ خدا کے سوا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ میں دل ہی میں سوچتا تھا کہ اب مجھوں کے سامنے غریباں بدلتی کا غذاب سہنا ہوگا اور نہ معلوم مجھ پر اور بھی کیا کیا ستم ڈھائے جائیں گے۔ اس کہمیری میں میں نے مجبوراً تحقیق کی طرف رجوع کیا۔ ہاتھ نہ دھوکر نماز پڑھی اور اس بلائے بے درماں سے مخالفت کی دعا کی۔ جب سے مجھے اس فوجی میل خانے میں لایا گیا تھا نہ مجھے کپڑوں کا دوسرا جوڑا دیا گیا تھا نہ نہانے دھونے کے لیے پانی قریب کیا گیا تھا۔ حد یہ ہے کہ نجامت بنانے کے لیے کسی نانی کو بھی نہیں لایا گیا۔ کمرے میں اینٹوں کا فرش تھا۔ رسیوں سے بٹا گیا ایک کھٹ

کی ٹوب آؤ بھگت کی گئی۔ انہیں بتایا گیا کہ حکومت کو مولانا کے منصب اور پیشوائی کا پورا پورا احترام ہے۔ اور انہیں ہمارا جاہری سنگھ کے بعد ریاست کی سب سے معزز شخصیت تصور کرتی ہے۔ حکومت کو مسلمانوں کے مطالبات سے انکار نہیں ہے لیکن اُن پر غور کرنے کے لیے سازگار ماحول کی ضرورت ہے۔ اگر مولانا چاہیں تو شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے اسیروں کو کسی بھی وقت رہا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن خود حکومت کی ذمہ داریوں کا احساس کرنا بھی میرا عطا صاحب کی انصاف پسندی ہوگی۔ اس طرح سے اُن کی خود نمائی کے جذبے کو ٹوب تکسین دے کر انہیں نرم کر دیا گیا۔ جب وہ بسج گئے تو غلام محمد پنڈت کے ذریعے اُن کے حضور ایک خطبہ رقم بھی پہونچائی گئی۔ بے چارے میرا عطا صاحب تا بڑ توڑ نفسیاتی حملے کے آگے پہوڑاں لگے۔ اور اُن کی طرف سے ایک دستخطی تار داسرائے کو بھیج دیا گیا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ یہاں کے حالات پُر سکون ہیں، ہم سب ہمارا جاہر سادہ کے وفادار ہیں اور اُن کے ساتھ میل بیٹھ کر تمام اندرونی مسائل امن اور آشتی کے ساتھ طے کرنا چاہتے ہیں۔ تحریک میں یہ رخنہ پیدا کرنے پر ہمارا راجہ خوشی سے چھوٹے نہ سمائے۔ انہوں نے میرا عطا صاحب کے لیے چھ سو روپیہ سالانہ نقد وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے لیے اُن کی خدمت میں ایک مخلص فادر بھی پیش کیا گیا۔ نعلت میں نوگز والے ولایتی محل کے دو تختان، پینی ریشم کے چار تختان، ایک دو شاہ پشمینہ کا اور چاندی کی ایک شیشی شامل تھی۔ یہ کارروائی انتہائی رازداری سے کی گئی اور اس کا رنج آسمین پہلو یہ بھی تھا کہ مسلم فوجیوں میں سے ہمارے ایک ساتھی عبدالعزیز فاضل کو بھی وزیر اعظم اپنے شیعے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے۔ فاضل صاحب نے حق تک ادا کرتے ہوئے میرا عطا صاحب کو ہم سے برگشتہ اور بدظن کرنے میں اچھا خاصا پارٹ ادا کیا۔

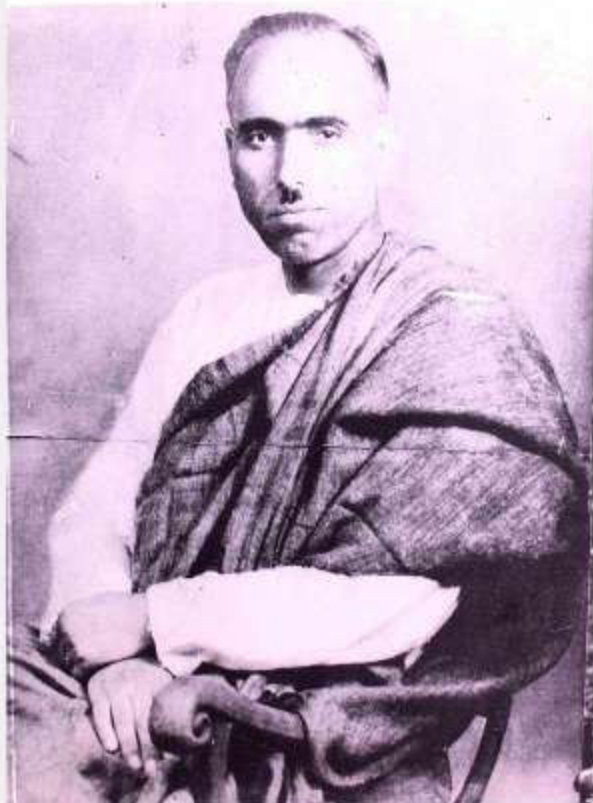
تھی۔ اور رفع حاجت کے لیے ایک کنٹر رکھا گیا تھا۔ چند چھٹی پڑائی مکملیں اور سنے
 بچھانے کے لیے دی گئیں تھیں۔ صبح اور شام دو وقت کال کو ٹھری کا دروازہ کھلتا تھا
 اور ایک لوسہ کی تتالی میں کچھ چاول اور وال یا کبھی کھار بیزی کھانے کو دیتے تھے۔
 بیت الخلاء جانے کی ضرورت ہوتی تو ہتھکڑیاں پہنا کر چار مسل فوجیوں کی حفاظت میں
 مجھے بیت الخلاء تک لے جایا جاتا تھا اور جب تک میں بیت الخلاء کے اندر رہتا تھا،
 چار مسل سپاہی بندوثیں تانے باہر پہرہ دیتے رہتے تھے۔ میں باہر آجاتا تو مجھے ہتھکڑیوں
 کے زیور پہر پہنا دیے جاتے تھے اور اپنی کو ٹھری میں بند کر دیا جاتا تھا۔ جس دن کی
 میں بات کر رہا ہوں اُس دن نماز ادا کرنے کے بعد چار پانی پر میری آنکھیں لگ گئی۔
 خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نامافوس شخص دھٹلے ہوئے کپڑوں کا ایک جڑالے کر
 اندر آتا ہے اور مجھ کو بھاڑ کر کہتا ہے۔ ”اٹھو گرم پانی آیا ہے۔ نانی بھی ساتھ ہے،
 حجامت بنا کر تھادھو، اور کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔“ اتنا کہہ کر ابھنی غائب
 ہو گیا اور جھکے کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایک سکون سا مل گیا کہ شاید کوئی
 اچھی خبر ملنے والی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ کشمیر کا گورنر ٹھاکر پور
 سنگھ میری کال کو ٹھری کے باہر کھڑے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے مجھ کو مخاطب کر کے کہا
 ”سناؤ کیسے مزاج ہیں“ میں نے جواب میں کہا ”اچھا ہوں“ ٹھاکر صاحب ایک سستم
 خزانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے ”تمہارے اندر تین بھالائیں روشن ہیں۔ تم جوان ہون
 تعلیم یافتہ ہو اور پھر لیڈر بھی ہو، اب یہاں تم ذرا ٹھنڈے پڑ جاؤ گے پھر تمہیں عقل
 آجائے گی، اُن کے اس عروت آمیز لب و لہجے اور گفتگو کے میرے تن بدن میں لگ
 سی لگ گئی اور میں نے تن کر جواب دیا کہ آپ میرے جسم کو پانچ سو سال کر سکتے ہیں
 لیکن میری روح آپ کے قبضے میں نہیں آسکتی۔ وہ تمام ریاست میں گھوم پھر رہی ہے۔



سنگھ سنگھ کے ساتھ ہونے والی ملاقات



شکوئی بندہ رہا تیرگوئی بندہ نواز۔



”باغی عید اللہ کی ہے“ شیخ صاحب کشمیر چھوڑ دو (۱۹۴۰-۴۱ء) کے زمانے میں جب یہ نعرہ کشمیر کے کوہ و جبل میں گونجتا تھا۔



صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ۔



نشاط پاش۔۔ جواہر لال نہرو اور پادشاہ خاں کے ساتھ۔

انٹرنیشنل کے نائب صدر کے ساتھ۔



مستقیم ٹیوی ریڈیو، قوالب کی تعمیر و تعمیرات اور دروازے کو بالکل اچھا ہے
پریزیڈنٹ کی کنفرینس میں شریکیت کے ساتھ۔

امید ہے کہ کبھی آپ کا حکمرانی کا فٹہ ہرن ہو گا تو آپ مقول باتیں کریں گے۔ یہ ترکی بہ ترکی جواب سن کر تھا کر کرتا رہا کھکھکھ کھکھکھ ہو گئے اور وہاں سے کھڑے ہوتے چل دیے۔ لیکن میں اُس وقت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جب سچ ایک سپاہی پکڑوں کا ایک دھلا ہوا جوڑا اور بالٹی بھر گرم پانی لے آیا۔ اُس کے ساتھ ایک نانی بھی تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور بھادھو کراس انتظار میں بیٹھا رہا کہ اب آئندہ کیا پیش آئے گا۔ سپہر کے قریب وزیر اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ دیوان جون ناتھ کرے میں داخل ہو گئے۔ اور مزاج پرسی کے بعد مجھ سے خوب باتیں کرنے لگے۔ وہ بڑی ہمدردی کے لہجہ میں مجھے سمجھانے لگے کہ میں حکومت کی مخالفت کرنے کی روش چھوڑ دوں۔ لیکن میں مرثی کی ایک ٹانگ کے ہی مصداق اسی بات پر اڑا رہا کہ حکومت پہلے مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ کرنے پر رفا مند ہو جائے۔ گھنٹہ بھر خوب چپک چپکے توروہ مجھے اپنے ساتھ ایک بند کار میں لے گئے۔ میں دل ہی دل میں حیران تھا کہ یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟ انہوں نے مجھے اپنے مکان پر پہنچایا وہاں کار سے نکل کر جب میں دالان سے گزرنے لگا تو پیچھے سے اُن کے مالی نے دھیمی سی آواز میں کہا کہ تو ہوشیار رہیے، رخصت اندر سے اُس کو خرید گیا ہے، میری سمجھ میں بات نہیں آئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن کرے میں پہنچا تو دیاں میں سے میرا غلطیوسٹ شاہ اُن کے برادر اصغر مولوی جیسی شاہ اور خواجہ غلام قحط پٹنٹ کو موجود پایا۔ علیک سلیک کے بعد جب میں میٹھے لگا تو مولوی یوسف شاہ صاحب نے مجھے باہر کے حالات سنائے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا کہ خود انہوں نے مشکلی حالات کا کیسے مقابلہ کیا اور بڑھا پڑھا کر اپنی کارکردگی سنائے لگے۔ جب وہ خود ستانی کا اچھا غامسا انتظار کر چکے تو مطلب کی بات پر آ گئے۔ اور کہا راجا صاحب دراجا ہری کرشن کوں نے



خاتمہ چکداری کے قانون پر دستخط کرتے ہوئے اسی وقت کے مشیر مال بیگ صاحب کے ساتھ۔

سائے کے مطالبات مان لیے ہیں۔ آپ سب کو بہت جلد رہا کیا جا رہا ہے۔ صرف ایک شرط رکھی گئی ہے کہ آئندہ آپ عام جلسوں میں تقریر نہ کریں گے۔ میں نے جواب میں کہا کہ وزیر اعظم کے وعدے کے ایفاء کا عملی ثبوت کیا ہے؟ مولوی صاحب نے سیدھا جواب دینے کی بجائے کہا کہ آپ کو ان کی بات پر یقین کرنا چاہیے۔ میں نے پوچھا کہ جن مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟ مولوی صاحب بولے کہ ان کی رہائی کے سوال پر بھی راجہ صاحب نے ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا ہے۔ میں پھر بولا کہ اگر یہ بات درست بھی ہے کہ حکومت مسلمانوں کی تمام شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے تب میری تقریروں پر پابندی لگانے کی کیا تکلف ہے؟ حکومت کے ساتھ محرواؤ اگر ختم بھی ہو جائے تو بھی مسلمانوں کی کردار سازی اور اور ان کی سماجی اصلاح کے لیے میں مصروف عمل رہنا ہوگا۔ اور اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ ہم تقریروں کے ذریعے انہیں قرآن و حدیث کے احکام سے روشناس کریں کیونکہ اس راہ مستقیم میں ان کی خجالت کے تمام سامان ٹھہر جائیں۔ میری اس گفتگو کی مولوی صاحب تاب نہ لائے اور انہوں نے ایک طنزیہ انداز میں استفسار کیا کہ کیا تم قرآن و حدیث پر عبور رکھتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ قرآن و حدیث کا جاننا ہر مسلمان کا فرض ہے اور میں بھی مقدور کے مطابق ان کا علم رکھتا ہوں۔ میرے جواب پر میری واقعہ کے چھوٹے بھائی کوئی صاحب کوتاہو آگیا اور وہ تھوڑی سی درشتی کے ساتھ بولے۔ اگر تم میرا خیال صاحب کی تجویز سے اتفاق نہ کرو گے تو وہ (میرا غلط) تحریک سے کہنا کہ کش ہوں گے؟ ان کی گفتگو کے اس پر ایسے سے میں چونک پڑا اور دالان میں کھی ہوئی مانی کی بات میرے ذہن میں گونجنے لگی۔ لیکن حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے میں نے بڑے نرم ہلے میں جواب دیا کہ تقریر بازی میرا پیشہ نہیں ہے۔

اگر میرا چپ سادھے رہنا اور سیاست سے الگ تھلک رہنا قوم کے مفاد میں ہوگا تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ نمائندگان کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ جو ان کا فیصلہ ہوگا میں اس پر کاربند رہوں گا۔ اس طرح سے گفتگو کا رخ بدل گیا اور معاملہ ٹل گیا۔ میزبان نے نفیس ٹینک چلے اور میوے سے ہماری تواسف کی اور مجھے پھر بند موٹر کار میں واپس اپنی کال کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ ایک دو روز کے بعد مجھے رہا کر دیا گیا اور سیدھے مولوی یوسف شاہ صاحب کے گھر پہنچا دیا گیا۔ نمائندگان کی میٹنگ طلب ہوئی اور معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جب تم نمائندگان نے مولوی یوسف شاہ کی تجویز مستی تو وہ سناٹے میں آ گئے اور انہوں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ مولوی صاحب نے پانسو پلٹے بکھا تو ان کا رنگ فق ہو گیا۔ مجھے اور عثمانی صاحب کو سراہی کے عالم میں الگ لے کر کھانا پی آواز میں بولے کہ وہ راجہ ہری کرشن کوں کو زبان دے چکے ہیں کہ آئندہ تقریریں نہیں ہوں گی۔ اب وہ ان کو کون سا منہ دکھائیں گے۔ مولانا کی اس بات کا جھلکا کیا جواب تھا۔ بہر حال ہم نے ان سے کہا کہ فی الحال عام جلسوں میں صرف مولوی صاحب ہی بولیں گے۔ اور اس وعدہ میں ہم دیکھیں گے کہ حکومت اپنے وعدوں پر کہاں تک عمل کرتی ہے۔ معاملہ ٹل گیا۔ لیکن دوسرے بعد کو یہ صورت قائم نہ رہی۔ میں اس دن کسی ناخوشگوار واقعے کو ٹال دینے کی غرض سے جامع مسجد نہیں جانا چاہتا تھا۔ پناہ میں نے سیدھا امیر اکلن کا رخ اختیار کیا۔ مگر شبن اتفاق سے وہاں مجھے احرار لیڈر مولانا مظہر علی اظہر ملے۔ جو ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے میری بانیوں میں باہنیں ڈال کر قبضے سے جامع مسجد ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے عذر تراشا مگر وہ جامع مسجد جانے پر تیار رہے۔ اور میرے تامل کے باوجود بہت مضر رہے۔ آخر ان کی بے تابی کے آگے سبیری

کچھ مٹی نہ چلی اور ہم دونوں جامع مسجد میں بیٹھ گئے عوام کچھ کربے قرار ہو گئے اور مجھے ان کا اصرار دیکھ کر گھر خاموشی توڑتے ہی بنی۔ میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ میرے بولنے کی نوبت نہ آئے مگر لوگ مجھے کہ مسجد سے نکلے ہی نہ تھے۔ بہر صورت میں نے اپنی تقریر میں سیاسیات کا ذکر کرنے سے اجتناب کیا۔ اور عوام کو صرف اپنے بچوں کا تعلیم دینے کی تلقین کرتے ہوئے اسلامیہ اسکول کے لیے چندے کی اپیل کی لیکن سرکاری ایجنٹوں نے نہ معلوم مولوی یوسف شاہ کے کان میں کیا پھونک دیا کہ وہ آپسے باہر ہو گئے۔ کائناتی مسجد ہمارے ایک اجتماع کے سامنے بولتے ہوئے کہا۔ "بغیر دانشی موچکے ریش تراشیدہ اور انگریزی پوشاک میں بلبوس کچھ لوگ منبروں پر کھڑے ہو کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ لوگ خود تو سنت محمدی کی پیروی نہیں کرتے پھر انہیں مسلمانوں کی پشت پناہی کا کیا حق ہے؟" مولوی صاحب کے حکومت سے بھی راز و نیاز جاری تھے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت بل میں جہاں وہ ان دنوں وعظ خوانی کے لیے جاتے تھے پھری ہوئی عوامی تحریک کو یہ لوری سن کر اڑانے کی کوشش کی۔ "حقائق اور دنیاوی آرام و آسائش کا طلب گار ہونا مومن کی شان کے شایان نہیں! اگر اللہ ہم پر مہربان ہو جائے اور ہم صحیح مسلمان بنیں تو حقوق کی کیا بات ہے سلطنتیں ہمارے قدموں میں گر سکیں گی۔ لہذا امن و سکون سے دھواور فتنوں سے دور رہو۔" مولانا نے اپنی تقریر میں قادیانیوں پر بھی جھینٹے اڑائے اور اشدادوں اور کیناویوں سے مجھے بھی اُس زمرے میں ڈال دیا۔ مولوی صاحب نے عوام کو اشتعال دلاتے ہوئے کہا کہ آئندہ کسی نوجوان کو جامع مسجد میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اور اگر کوئی نوجوان ایسا کرنے کی جسارت کرے تو اس کو جوئے مار کر نیچے اتارنا چاہیے۔ ظاہر تھا کہ مولوی صاحب کھلم کھلا ہمارے

خلاف میدان میں اُتر آتے تھے۔ میرے لیے اس چیلنج کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اور میں نے بھی اس فرسودہ قیادت کے آگے ڈٹ جانے کی ٹھان لی چنانچہ بسنت باغ کی ایک مسجد میں، میں نے ایک زوردار جوابی تقریر کی۔ اور مولوی یوسف شاہ کی پیشترے بازیوں کو طشت از باہم کر دیا۔ اب سرینگر کے مسلمان واقع طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک طرف مولوی یوسف شاہ اور ان کے معتقدین تھے، جن کا اثر ان کی رہائش گاہ کے آس پاس چند محلوں تک ہی محدود تھا۔ ان میں وازہ پورہ کے آتشپازوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے مقابلے میں ہمارے حامیوں کی تعداد سارے شہر میں تھی۔ مولوی یوسف شاہ کے حامی بکرے کھلانے اور ہمارے حامیوں کو "شرک کثیر" کی نسبت سے "خیر" کہہ کر تھپکارا جانے لگا۔ پہلے پہل تو مولوی صاحب نے اپنی اجارہ داری کو چیلنج دیکھ کر ہمیں طاقت اور سکے کے زور سے زیر کرینا چاہا لیکن جب ہمارے حامیوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تو میدان میں ہسپا ہو کر رہ گئے۔ اقبال نے شاید اسی موقع کے لیے کہا تھا

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے کے مٹا ہوں غمازی

میر واعظ مولانا آمل اللہ جلدی اور بیشتر پیرزادوں نے ہمارا ساتھ دیا اور چند جھڑپوں کے بعد مولوی یوسف شاہ میدان چھوڑ کر جاگ گئے۔ اُدھر عوامی تحریک کی کامیابی نے ہمارا جاکو اس بات کا قائل کر دیا کہ تیغ و تنگ سے اس طوفان کو روکا نہیں جاسکتا۔ مناسب یہی ہے کہ اس کا تذکرہ محنت و مشن اور مبلغ ہوئی ہے کیا جائے۔ چنانچہ تین اکتوبر کو ہمارا جلسہ اپنی ۳۶ ویں سالگرہ پر ایک دربار عام بلایا، جس میں جاگیرداروں، ذیل داروں اور دوسرے

وفا داران ازلے نے شرکت کی۔ البتہ مسلمان اس دربار سے عام طور پر غیر حاضر رہے۔ جہاں جا
نے اس دربار میں کچھ مہووم سے اعلانات کیے اور ریاست کے تمام فرقوں کو دعوت دی
کہ اگر وہ اُن کے حضور اپنی شکایات پیش کرنے کے لیے آوے ہو جائیں تو وہ ان پر ہمدردی
سے غور کریں گے۔ دراصل ہندوؤں اور سکھوں سے مطالبات طلب کرنا وزن شعر قائم
رکھنے کے برابر تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کی شکایات کا وزن بھی کم کرنا تھا۔ اس
لیے ان فرقوں نے جو یادداشتیں پیش کیں اُن میں "غالب و ذلیلہ عوار ہو و دشاہ کوڈھا"
کا سلب و ایچہ کار فرما تھا۔ البتہ جان و مال کی حفاظت اور مضبوط حکومت کے قیام کا
راگ الاپ کر انہوں نے درپردہ اکثریتی فرقہ کے خلاف مظالم کی حمایت کی تھی۔ وہ جہاں جا
کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ اور اُن کے اوپر ہی طبقے کو مسلم اکثریت پر جو
فوقیت حاصل تھی اس کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ البتہ سکھ حضرات کا میوئرٹم
حسب معمول دل چسپی کے سامان فروغ کرتا تھا۔ اگرچہ ریاست میں اُس وقت اُن کی
تعداد مشکل سے پچاس ہزار کے قریب تھی لیکن انہوں نے سرکاری ملازمت میں ایک
تہائی حصے کا مطالبہ کیا تھا۔ کشمیری پنڈت صاحبان نے اپنے میوئرٹم میں اپنی
ہوشیاری اور مسلم آزادی کا ثبوت دیا تھا۔ ہم نے اس کے برعکس ریاست
کے عوام کے اجتماعی مفادات کو پیش نظر رکھ کر محسوس تجاویز پیش کی تھیں۔ ریاست کے
آئندہ آئینی اور اقتصادی ڈھانچے کے متعلق پہلی بار ایک واضح خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اس
میں جہاں آج کا مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی حکومت اور اسمبلی کو نمائندہ بنائیں اور اقتدار
میں عوامی نمائندوں کو شریک بنائیں۔ اور یہ دور رس نوعیت کی تجویز تھی۔

مجھے میوئرٹم کے جہاں آج کا کوٹیشن کرنے کا سامان اب تک یاد ہے۔ ہم سب
نمائندگان کو جہاں آج کے محل واقع پنڈر شاہی بلالیا گیا۔ محل کے محلّوں میں کرسیاں

لگی ہوئی تھیں۔ جہاں استقبالیہ وزیراعظم راجہ ہری کرشن کوٹ نے کیا اور انہوں نے
ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ہم کچھ دیر تک جہاں آج کی آمد کا انتظار کرتے رہے اور
اس دوران راجہ صاحب ہمارے ساتھ خاصی خوش مزاجی کے ساتھ گپ شپ میں
مصروف رہے۔ بالآخر جہاں آج صاحب محل سے خرامان خرامان سیدھے ہماری طرف
آئے۔ ہم سب دستوں کے مطابق تعظیم اٹھ کرے ہو گئے۔ راجہ ہری کرشن کوٹ نے باری
باری جہاں تعارف جہاں آج سے کرایا۔ اس کے بعد نمائندگان کی طرف سے خواجہ
سعد الدین شال اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے میوئرٹم کو باؤنڈر بلند پڑھنا شروع
کیا۔ یہ میرا اور جہاں آج صاحب کا پہلا سامنا تھا۔ میں جہاں آج کے چہرے کے آثار
پڑھاؤ کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جہاں آج باجی دزدیدہ
بیگم ہوں سے کبھی بھی میرے چہرے پر نظر ڈالتا۔ لیکن جب میرے ساتھ آکس کی
آنکھیں چار ہو جائیں تو فوراً اپنی نظروں کا رخ تبدیل کر لیتا۔ جہاں آج کے لیے میری
ذات ایک سمجھے سے کم نہ رہی ہوگی۔ اُس نے پہلی بار تجھے دیکھا تھا۔ حالانکہ اُس
نے میرے خلاف کافی کچھ سن رکھا تھا۔ شاید وہ بھی غور سے میری شخصیت کا ایک
اندازہ کر لینا چاہتا تھا۔ بہر حال شال صاحب میوئرٹم سننا چکے تو جہاں آج کے ایک
بلے تاثر چہرے کے ساتھ کہا کہ میں اس پر غور کروں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی مزید کوئی
رہنے والا رہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔ اور محفل پراگندگی میں درخواست ہو گئی۔

اس یادداشت کی ترتیب اور اس پر دستخط کرنے کی بھی ایک دل چسپ کہانی
ہے۔ اس کو تیار کرنے میں مجلس احرار کے غلام خاں سے دوسری دفعہ سر ہنر آگئے تھے۔
اور ایک باؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ وہ عرض داشت کی اُس شکل کو پسند نہیں کرتے
تھے جس میں وہ جہاں آج کو پیش کی گئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ مکمل ذمہ دار نظام حکومت

میر واعظ صاحب کے ساتھ آتے تھے۔ کبر و غرور سے مجھے خطاب کرتے ہوئے کہا،
”ہمارے خاندان نے ہی تم کو آسمان پر چڑھا لیا۔ اور تم گناہی سے باہر کر دیا۔ کثیر
بن گئے۔ اب ہم تم کو پھر تمہاری اصل جگہ پر پہنچائیں گے۔ تاکہ تم سمجھ جاؤ کہ تم جو کچھ
ہو ہمارے دم سے ہو اور تمہاری ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔“

میں نے جواب میں قرآن مجید کی آیت وَاَعْرِضْ عَنْ قَوْلِ الْكَافِرِ میں تشابہ پر مبنی
اور کہا کہ ”عزت عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے نہ کہ انسان کے ہاتھ میں۔ میری
عزت میرے اعمال پر منحصر ہے۔ تمہاری خوشی یا ناراضی پر نہیں۔ تم سے جو کچھ ہو سکتا
ہے ضرور کر گزرو۔“

معاہدہ ممکن ہے اور بھی بڑھ جاتا لیکن خواجہ سعد الدین شال اور عثمانی صاحب
نے بیچ بچاؤ کیا۔ اور بات من گئی۔

▲▲▲

۵

کا مطالبہ کیا جانا چاہیے۔ مگر کشمیر کمیٹی والے کہتے تھے کہ اس کے لئے نہ ہارا آجاتیاد
نہ ہوگا۔ اور نہ ہی حکومت ہند کا پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اس کی تائید کرے گا۔ ہمساری
جماعت میں سے کچھ نوجوان اصرار کے نقطہ سرنگاہ سے متنفذ تھے۔ میرے لیے اب اس
اختلاف کو دور کرنا ایک نازک مرحلہ بن گیا۔ میں نے نمائندگان اور تنظیمی کمیٹیوں کے
چیدہ چیدہ افراد کی ایک میٹنگ خواجہ سعد الدین شال کے گھر پر بلوائی اور میں نے کشمیر
کمیٹی، جس پر قادیانیوں کا اثر تھا اور مجلس احرار کے نمائندوں کو اپنے نظریات
اجلاس میں پیش کرنے کی دعوت دی۔ اجلاس خواجہ سعد الدین شال کے مکان پر
ہوا۔ اور بحث و محصل کے بعد کشمیر کمیٹی کا ہی ڈرافٹ معمولی ترمیم کے ساتھ پاس
کیا گیا۔

عرض داشت پر سب نمائندوں کے دستخط لینے ضروری تھے۔ شال صاحب کے
مکان پر ہونے والے اجلاس میں مولوی یوسف شاہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ لیکن وہ
عرض داشت پر دستخط کرنے میں لیت وعل کر رہے تھے۔ اُن کا اعتراض آزادی
تحریر و تقریر کی مانگ پر تھا۔ عاف نظر آ رہا تھا کہ کوئی مشوق ہے اس پر وہ دنگری
میں۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال ڈال دیا گیا تھا کہ یہ مطالبہ اُن کے خاندانی اجارہ داری
اور ذاتی وقار کو خطرے میں ڈال دے گا۔ جو کہ ہر ایرے گیرے کو اسٹیج پر آنے کی
اجازت مل گئی تو اُن کا امتیاز کہاں باقی رہے گا؟ لیکن خواجہ غلام احمد عثمانی اور
خواجہ سعد الدین شال نے اس رم خوردہ آہٹ کو کسی طرح رام کر ہی لیا۔ اور اس طرح
انہوں نے بھی اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

مولوی یوسف شاہ کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ ایک
دوبارہ تیرکلاہی کی نوبت بھی آگئی۔ اُس کے بھائی پیر پکھی شاہ نے جو ایک میٹنگ میں

..... آتے ہیں جواب آخر

حکومت نے عوامی غیض و غضب کے آتش فشاں کو ٹھنڈا کرنے اور کسی حد تک اُن کی اشک ثنویٰ کرنے کے لئے سربراہ جرد لال، جو ریاست کے چیف جسٹس تھے، کی سرکردگی میں ۱۳ جولائی کو سربراہ میں گولی چلانے کے واقعات کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن کا اعلان کیا۔ مسلمانوں نے یہ کہہ کر اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا کہ جو شخص حکومت کا تنخواہ دار ملازم ہو اُس سے کسی قسم کی غیر جانبداری کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے اور انصاف کی امید کی جاسکتی ہے؟ میر واعظ یوسف شاہ کو بھی کمیشن میں مسلم رکن کی حیثیت سے نامزد کیا گیا تھا۔ لیکن مولوی صاحب بھانپ گئے کہ اس طرح سے کھلے ہندوں حکومت کے ساتھ اشتراک اُن کی مشاعرہ فحش کے لئے برق بلا نیز بن سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے فیصلہ کے پیش نظر انہوں نے بھی ممبری قبول نہ کرنے میں ہی مصلحت سمجھی۔ دلال کمیشن کے آگے مسلمانوں کی طرف سے کوئی شہادت پیش نہ ہوئی پھر بھی سربراہ جو نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی جو اعلیٰ دفتر ہو گئی۔

ہماری عرض داشت کے نتیجے میں جہاں آج ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء میں مرلی جے

گھنسی کی سرکردگی میں ایک اور کمیشن مقرر کیا۔ عبدالحمید سالک نے اپنی کتاب ”ذکر اقبال“ میں یہ دلچسپ بحث کیا ہے کہ اس کمیشن کے تقریریں علامہ اقبال کا بھی دخل تھا۔ اُس کے مطابق بھوپال کے نواب حمید اللہ خان علامہ اقبال کے بڑے قدر دان تھے۔ اور نواب بھوپال کا ہمارا جاکشیر بڑا اثر تھا۔ علامہ اقبال نے نواب بھوپال کے ذریعے جہاں آج کو آمادہ کر لیا کہ مسلمانوں کی جائز مانگوں کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کریں اور اس طرح گھنسی کمیشن بنایا گیا۔ کمیشن کے مقاصد کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ ریاست کے مختلف طبقوں اور فرقوں کی شکایات کی تحقیقات کر کے اُن کے ازالہ کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔ گھنسی صاحب ایک انگریز تھے اور پہلے بھی کشمیر دربار کے ملازم کی حیثیت سے مختلف میٹروں سے کام کر چکے تھے۔ اُس وقت وہ حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ کمیشن کے ساتھ کام کرنے کے لیے مسلمانوں نے کشمیری سے خواجہ غلام احمد عثمانی اور جنوں سے چودھری غلام عباس خان کو نامزد کیا۔ کشمیری پنڈتوں کی طرف سے پنڈت پریم ناتھ بزاز اور جنوں کے ہندوؤں کی طرف سے پنڈت لوک ناتھ شرما نامزد کیے گئے۔

حکومت اور مسلمانوں، دونوں کی خواہش تھی کہ میں بھی کمیشن کے ساتھ وابستہ ہو جاؤں کیونکہ عثمانی صاحب کی ذات پر نہ معلوم کیوں زیادہ اعتماد نہیں تھا، چنانچہ جب عثمانی صاحب کا نام تجویز ہوا تو مسلمانوں نے مختلف اہل علم و فضلہ سے میرے نام تجویز کیا۔ اور میں اس نامزدی کی مخالفت کی گئی تھی، لیکن میری مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اور میں سمجھتا تھا کہ کمیشن کے ساتھ تھی ہونے سے زیادہ سودمند بات یہ ہے کہ میں عوام کے ساتھ رابطہ بنائے رکھوں۔ اس کے علاوہ میری اپنی رائے میں عثمانی صاحب کی نسبت عوام میں شک و شبہات بڑی حد تک غیر ضروری اور بے بنیاد تھے۔ اُن میں

خامیاں غرور تھیں لیکن خامیاں کس بشر میں نہیں ہوتیں؟ البتہ وہ ٹرٹس مزاج بہت تھے۔ جس کی وجہ سے دوست بنانے کی بجائے وہ دشمن بنانے میں زیادہ ملکہ رکھتے تھے۔ لیکن وہ قومی احساس سے سرشار تھے۔ اُن کا قومی شعور بہت بیدار تھا۔ اور وہ حق المقدور قوم کی خدمت انجام دینے میں بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ اُدھر اُن کے گھر کی مالی حالت بھی اتنی تھی اور کمیشن کے ساتھ کام کرنے سے کسی حد تک اُن کی مالی امداد ہو سکتی تھی۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر میں اپنے فیصلہ پر ڈٹا رہا اور کمیشن میں کام کرنے کے لیے مشائی صاحب کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

اسی دوران ۵ دسمبر کو ہمارا جرنل ایک انگریز آفیسر ملٹن کی سرکردگی میں ایک اور تحقیقاتی کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس کے ذمے اُن واقعات کی تحقیقات کرنا تھا جو میری دوسری گرفتاری کے بعد سرینگر، اسلام آباد اور شوبیان میں پیش آئے تھے۔ اس کمیشن کے سامنے شہادتیں پیش کرنے کے لیے ہم نے بڑے عدالت کے سامنے اپنا دفاع قائم کیا۔ یہ دفعہ محمد الحق صاحب کے مکان میں قائم کیا گیا تھا۔ مکان کے سین سامنے دو ہاؤس بوٹ لگائے گئے۔ جن میں کشمیر کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے وکیل حضرات اور دوسرے دیگر بھانوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ گواہوں کی تلاش، اُن کے بیانات کی ترتیب اور اُن کو کمیشن کے سامنے پیش کرنا ایک بہت بڑی قانونی مشق تھی۔ جس کا کشمیریوں کو کم ہی تجربہ تھا۔ اس کارروائی کو کامیاب بنانے کے لیے پڑے کچھ نوجوانوں کی بڑی ضرورت تھی اور چونکہ کشمیری مسلمانوں میں تطہیر کی کمی تھی اس لیے تلاش کے باوجود میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ لیکن میری ہم کسی نہ کسی طرح کام چلاتے رہے۔ ہمارے سامنے ایک پیچیدہ مسئلہ یہ تھا کہ ملٹن نہ تو کشمیری سے واقفیت رکھتے تھے اور نہ ہی اردو سمجھ سکتے تھے۔

اس نے گواہوں کے بیانات کے انگریزی ترجمے اور جرح کے موقع پر ان کی ترجمانی نہایت اہم مسئلے تھے۔ اُن دنوں ہم نے اننت ناگ کے ایک تیز و کار فوجان کے بارے میں سنا۔ جس نے حال ہی میں بی اے پاس کر لیا تھا۔ یہ نوجوان مرزا محمد فاضل بیگ تھے۔ اُنہوں نے اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ اور بڑی قابلیت کے ساتھ اسے سرانجام دیا۔ اُن کے علاوہ خواجہ غلام قادر المعروف شیر گاندہل، محمد جمی رفیقی، مولوی عبدالرحیم، محمد وسعت بی، اے (علیگ) اور کچھ دوسرے نوجوانوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا۔ کمیشن نے شہر اور قصبوں میں گھوم پھر کر اپنی شہادتیں قلم بند کیں۔ میں نے بھی کمیشن کے سامنے ایک انگریزی بیان پیش کیا جس میں واقعات کی نوعیت کے علاوہ کشمیر کی کھیتی کے تاریخی اور سیاسی پس منظر کے بارے میں بھی اشارات کیے۔ میں نے اپنے بیان میں اُس صورت حال کا تجزیہ بھی پیش کیا جو ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء سے اُس وقت تک پیش آئی تھی۔

خاص ترائے ہوئے کشمیری پتھروں سے بنائی گئی ایک شاندار عمارت ہے جس کو جہانگیر کی مشہور ملکہ نور جہاں بیگم نے تعمیر کیا۔ کشمیر میں بدھ اور ہندو حکمرانوں نے پتھر سے بہت سے شاندار مسجد تعمیر کیے۔ جن کے کھنڈر آج بھی اپنے معماروں کی چابکدستی اور کاریگری کے گواہ ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد عمارتوں میں چوب کاری کا رجحان بڑھ گیا۔ مسلمانوں نے کشمیر میں لکڑی کا پہلا پل بھی تعمیر کیا۔ اُس سے پہلے کشمیوں کو جو درگاہی پل تیار کیے جاتے تھے۔ بہرگت پتھر مسجد، جسے شاہی مسجد بھی کہا جاتا ہے کشمیر میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ ہے۔ جو سب کی سب پتھروں سے بنائی گئی تھی لیکن یہ مسجد اپنی تعمیر کے بعد بہت دنوں تک نماز کے لیے استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا کرنے کے سلسلے میں بہت سی روایات مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب مسجد بن کر تیار ہو گئی تو کسی نے ملکہ نور جہاں سے سوال کیا کہ اس کی تعمیر پر کتنا سرمایہ خرچ ہوا ہے۔ نور جہاں ناز وادا اور زنا نہ جازیت کا مجسمہ تھی۔ اُس نے اپنے غرور و حسن میں اپنے شاندار کنش، جس پر محل و جواہر بڑے ہوئے تھے، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جتنی اس جوئے میں سے ایک کی قیمت ہے۔ نور جہاں اس قسم کی آزاد خیالیوں کے لیے مشہور تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ عید رمضان کا چاند نظر آنے پر جہانگیر نے بے ساختہ کہا ہا ہا ہا بلال عید رواج فلک ہو یا شد۔

نور جہاں نے اس ہلال کے تقدس پر کوئی توجہ نہ دی اور برجستہ گرہ لگا دی ہا۔
 کلید میکہ گم گشت بود پیدا شد
 اسی طرح وہ اپنے پیرو مشد کے پاس یہ شعر پڑھتی تھی ہا
 چہار چیز کہ دل می برد گددام چہار ہا
 نماز و روزہ تسبیح و توبہ استفاد

احرار اور قادیانیوں کی کشمکش

برٹلن کیشن کے سامنے مئی ۲۸ گواہوں نے اپنے بیانات قلمبند کر لئے لیکن مسلمانوں نے اس کیشن کے ساتھ جو امیدیوں وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ مٹر برٹلن نے حکام کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں غفلت کا مرتکب تو قرار دیا مگر انہوں نے اُن بدترین اقدامات کو سنہ قبول عطا کی جو حکومت نے عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے اٹھائے تھے۔ اپنے سرکاری کردار کے باوجود برٹلن صاحب کے رپورٹ میں کہیں کہیں صداقت کی گونج سنائی دی۔ مثلاً انہوں نے یہ ماننے ہوئے بھی کہ تحریک مسلمان چلا رہے ہیں یہ اعتراف کیا کہ یہ کسی لحاظ سے بھی فرقہ وارانہ نوعیت کی تحریک نہیں ہے۔ برٹلن کیشن کا کام ختم ہوا تو ہم گلینسی کی کارروائی کی طرف لگ گئے۔ اور یہاں بھی مسلمانوں کا اپنا کیس پیش کرنے کے لیے محنت اور عرق ریزی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ہم متعلق کی دستیابی اور ان کی تنظیم و ترتیب میں لگے رہے اور مناسب شہادتیں بھی قلم بند کرتے رہے۔ خود میری شہادت بھی قلم بند کروائی گئی۔ اسی دوران حکومت نے اپنی نیک نیتی کا اظہار کرنے کے لئے پتھر مسجد کو مسلمانوں کے حق میں واکڈار کرنے کا اعلان کیا۔ پتھر مسجد سربراہ کے قلب میں دریائے جہلم کے کنارے

ایک طرف تو مسلم لیگ کے بڑے ہونے اثر و رسوخ سے تھا۔ دوسرے علامہ عثمانیہ اللہ مشرقی کی مجلس خاگساراں بھی اُن پر بازی لے جا رہی تھی۔ وہ روپے کا ایسٹ رین ڈال کر اپنی جماعت کا انہی چالو کرنا چاہتے تھے۔ اور تمام ہندوستان میں پھیل جانا چاہتے تھے۔ راجہ کشمیر میں راجہ صاحب نے تجویروں کے منہ کھول دیے تھے۔ اس لئے ہر ضرورت مند طالع آزمائی کے لیے سرینگر پور پہنچ رہا تھا۔ میری ملاقات وفد کے ممبروں سے اُن کے ہاؤس بوٹ میں ہوئی۔ میں نے سُننے بھٹ بن کر گلہ کیا کہ اُن جیسے اکابرین ملت نے کس طرح سرکاری دعوت پر کشمیر آنا اور پھر حکومت کے نئے توڑا گوارا کیا۔ یہی حکومت ایک طرف تو ان کو فیاضیت کھلا رہی ہے اور دوسری طرف کشمیری مسلمانوں کے خون کی پیاسی بھی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے احراری کرم فرماؤں کی بتایا کہ آپ نے راجہ ہری کشن کوں کا جہان بن کر غلطی کی ہے، عوام کے جہان بننے تو ایجو اسقدر آرام و آسائش حاصل ہوتی۔ لیکن اُن کی مینیاں بیانی قبول کر کے آپ اُن مظلوموں کو جو نفسیاتی سہلا دیتے، اُس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ وفد کے لیڈر چودھری افضل حق نے میری اس تلخ گوئی پر تیوری پڑھائی اور پھر اپنے زور کلام سے سرکاری جہان بننے کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا دل نہ مانا۔ عوام میں بھی وفد کی نسبت بدگمانیاں بڑھتی ہی گئیں۔ بہر کیف سرینگر میں ہفتہ دس دن گزارنے کے بعد مجلس اہوار کے یہ نمائندے واپس چلے گئے۔

میری دوسری گرفتاری کے بعد اکتوبر، نومبر ۱۹۴۷ء میں مجلس اہوار کا یہ وفد پھر سرینگر آیا۔ بد قسمتی سے اس بار بھی وہ سرکاری جہانوں کی حیثیت سے ہی آئے۔ اور اُن کے قیام و طعام کا انتظام پھر سرکار کے ذریعے سے ہی کیا گیا۔ البتہ اب کی بار اُن کا ہاؤس بوٹ دیبا کے شہر آئی کنارے عدالت سے ذرا دُور آئی گندڑ گھاٹ پر

لنگر انداز کر دیا گیا۔ وفد کے ارکان اپنے اوقات کا زیادہ حصہ راجہ ہری کشن کوں کے ساتھ راز و نیاز میں ہی صرف کر دیتے تھے۔ اس طرح سے عوام اُن کو اپنے ہمدردوں میں شمار کرنے لگے اور انہوں نے وفد کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ جب میں ایک بار اُن سے ملنے کے لئے گیا تو وفد کے ارکان نے شکوہ کیا کہ ”یہاں کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کے پاس عام لوگوں کا تالانتا باندھتا ہے وہاں ہم کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔“ میں نے جواب دیا کہ تصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ پہلی بار سرکاری جہان بن کر آئے تو آپ کو علم ہے کہ یہاں لوگوں پر اس کا ایک اثر ہوا۔ پھر آپ کے ہوتے ہوئے سرکار نے یہاں کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھلی اور آپ بدستور اس کی باہنوں میں باہنیں حمایت کرتے رہے۔ آپ کو تو شہیدوں کے گھر جا کر زبانی ہمدردی کرنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ سرکاری موٹریں آپ کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں۔ آپ نے حالات کا چشم دید مشاہدہ کرنے کے لیے معمولی رحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اب آپ پھر سرکاری جہان ہیں اور ہاؤس بوٹوں میں سرکاری دسترخوان کے پتھارے لے رہے ہیں۔ تو جہاں عوام آپ کے پاس آئیں تو کیوں؟ حکومت کی گولیوں سے اُن کے سب گناہ سینے چھلنی ہو چکے ہیں۔ سرکاری تازیانوں نے اُن کے جسم کی کھالیں اُڑھ دی ہیں۔ انہیں بھانت بھانت کے فسر فی متعذرات میں ماخوذ کر کے پریشان کیا جا رہا ہے۔ انہیں علاج و معالجے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے مابراز قانونی مشورے کی ضرورت ہے۔ آپ ان ضروریات میں کہیں ان کی دست گیری نہیں کر رہے ہیں۔ مگر کشمیر کمیٹی اپنے خرچے پر رولڈر ہینج کر اُن کی امداد کر رہی ہے۔ یہ مدد مل کر کمیٹی کے سامنے اگر کشمیری مسلمان اپنا کیس پیش کر کے تو کشمیر کمیٹی کی ہی امداد سے۔ اتنا ہی نہیں، کشمیر کمیٹی کے نمائندے شہداء اور قیدیوں کے گھروں میں جا کر اپنی بساط کے مطابق نقد و جنس سے اُن کا بوجھ ہلکا

کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر وہ آپ کے دیوان خانے کو بھول کر کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کا دامن پکڑ لیں تو اس میں اچھے کی بات کیا ہے؟

کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں رہی

میرے ان دلائل کا اصرار حضرات کے پاس جواب نہ تھا اس لیے مذاق مذاق میں بات کو ٹال گئے۔ لیکن جب وہ لاہور واپس پہنچے تو وہاں اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کشمیر میں رہ کر کیا کرتے ہیں اور آپ نے وہاں کے عوام کے لیے کیا کیا ہے؟ اس کا جواب بھلا وہ کیا دیتے۔ لگے نغلیں جھانکنے۔ لیکن اپنی کوتاہیوں اور کوتاہ بینی پر پردہ ڈالنے کے لیے انہوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ شیخ محمد عبداللہ احمدی بن گیا ہے اور وہاں اب نگیں مسئلہ آئی کا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ ان ہی دنوں مسلم نمائندگان ہمارے کے سامنے اپنے خطابات کو پیش کرنے کے لیے ایک عرضداشت مرتب کر رہے تھے۔ مجلس احرار کی سیاسی لائن نمائندگان کے اجلاس میں زیر بحث آئی اور مسترد ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں یہ عرضداشت کشمیر کمیٹی کے نظریات سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔ احراری حضرات اس بات سے بدگم گئے۔ اور لاہور جا کر انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ہم قادیانیوں کے اثر میں ہیں۔ اور کشمیر کمیٹی کے سربراہ مرزا محمود احمد صاحب، جو احمدی فرقے کے بانی مرزا غلام احمد صاحب کے پوتے تھے، تحریک کشمیر کو قادیانی عقیدے کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ احرار صاحبان نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا کہ فقہ قادیانیت کے مذہب کے لیے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں سے پاک کیا جانا چاہیے۔ اور کسی غیر قادیانی مسلمان کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سونپ دی جائیے۔ احراریوں نے قادیانیوں کے خلاف اپنی ساری قوت میدان میں بھونک دی اور

بالآخر مرزا محمود کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کی میکش ڈاکٹر سر محمد اقبال کو کی گئی تھی جسے انہوں نے کشمیر سے اپنے گھر سے شغف کی اور کشمیریوں سے دلی ہمدردی کی بنا پر قبول فرمایا۔

ذاتی طور پر مجھے مجلس احرار کی روش سے اختلاف تھا اور میں اسے کشمیری مسلمانوں کے مفادات کے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔ کشمیری مسلمان اسی تفرقہ بازی کا شکار ہو کر کہیں کے رہ رہے تھے۔ ہم نے قائد احرار کے انہیں جبری وفاداریوں کی سطح سے اوپر اٹھا کر ایک اجتماعی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن احرار کی روش سے زخموں کے ٹانگے کھلنے کا امکان پھر پیدا ہو گیا تھا۔ میں عقیدتاً احمدیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس فرقہ کے بنیادی عقائد کا نہ زیادہ علم ہی تھا اور نہ اُن سے دل چسپی ہی تھی۔ میری دلچسپی تو مسلمانوں کو شیرازہ مندر کرنے سے تھی۔ تاکہ مشترکہ دشمن کا موثر طور پر مقابلہ کیا جاسکے لیکن بد قسمتی سے احرار کشمیر میں اپنی ناکامی کا سب سے بڑا کارن مجھے سمجھتے تھے۔ اس لیے مجھے اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے انہوں نے مجھے احمدی قرار دیا اور پنجاب کے مسلمانوں میں مجھے بدنام کرنے کی کافی کوشش کی گئی۔ روزنامہ ”زمیندار“ لاہور کے قلمبیاں اور آتش بنگار ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان اُن دنوں ”قادیان کی مادیان“ پر زوروں سے قلم کے چابک چلا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے احرار حضرات کی اچھی غاصی امداد کی۔ آدھر داخلی محاذ پر مولوی یوسف شاہ صاحب نے ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ کسی اور طریقے سے مجھے نیچا دکھانے کے تو انہوں نے بھی مجھ پر احمدی ہونے کا الزام عاید کر دیا۔ کچھ نوجوان بھی مجلس احرار کے اثر میں آ گئے۔ جن کی رہنمائی اندر اندر سے مولوی محمد سعید سعودی، جن کے پاس میں آگے تفصیل سے

ذکر آئے گا، کر رہے تھے۔ خود مولوی مسیح کے اپنے نظریات اور طریق کار پر اجماعی مسلک کی گہری چھاپ تھی۔ اور اُن کے کردار کے تجربے میں اس امر کو بہر حال ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیے۔

جلسہ اجماع نے تمام پنجاب میں کشمیر کے طلسم نہا نام پر اپنی تحریک کی کافی تائیدی کی۔ اعزازیوں نے مظلومین کشمیر کے نام پر کافی رقومات اکٹھا کیں۔ لیکن اس رویہ کو کشمیر کے اندر خراج کرنے کی بجائے اپنی تحریک کو تقویت دینے کے لیے استعمال کرتے رہے۔ البتہ اُس نے کشمیر پر ہر وہ مظالم کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کچھ جتنے ریاست کے اندر ضرور بھیجے۔ چنانچہ اُن کی ایک بھاری جمعیت، مولانا مظہر علی کی قیادت میں سوچیت گروہ کی سرحد کو عبور کرتے ہوئے ریاست میں داخل ہو گئی۔ ریاستی حکومت نے طاقت کے ذریعے مزاحمت کی تو بہت سارے رضا کاروں نے جام شہادت نوش کر لیا۔ لیکن انہوں نے ریاست میں داخل ہو کر ہی دم لیا۔ اُن ہی دفوں کی بات ہے کہ اجماع نے سوچیت گروہ میں صرف دو دن کے اندر اندر ایک شاندار مسجد کی تعمیر مکمل کی، جو آج تک مسجد اجماع کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تو معاملے کا ایک پہلو تھا۔ بہت جلد ہم پر قادیانی حضرات کے اصل مقاصد بھی آشکارا ہونے لگے۔ انہوں نے جب ہماری تحریک کی آڑ میں اپنی تبلیغی مرکزیمیں کو عام کرنا شروع کیا تو میرے ساتھ میرے کچھ اور ساتھیوں نے اس غلط رجحان پر تشریش محسوس کی اور قادیانی حضرات، مجھ سے بھی برگشتہ ہو گئے۔ میری حالت اقبال کے الفاظ میں یوں تھی کہ۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ملا ہوں کو کبھی کہہ نہ سکا قسند

مجھے یاد ہے کہ اپنی شادی کے بعد میں، جس کا ذکر آگے آئے گا، لاہور میں اپنے سسرال والوں کی کوٹھی واقع قلعین روڈ میں قیام پذیر تھا کہ میں نے احمدیوں کی اس بندی ہوئی روش پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میں کشمیریوں کے دوسرے سربراہان و شاخوں کی مانند مرزا محمود احمد نے بھی شمولیت فرمائی۔ مولانا غلام ذول ہر بھی اس محفل میں شامل تھے۔ میں نے اجلاس میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری مسلمانوں کی حالت زار کی سب سے بڑی وجہ اُن کا آپسی نفرت ہے۔ کسی قومی تنظیم کی تحریک اور نصرت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس نفرت کو ختم کیا جائے۔ اور تمام مذاہب خیال کے مسلمانوں کو ایک ہی محور پر جمع کیا جائے۔ اس مقصد کی کامیابی سے تحریک کشمیر کی کامیابی بھی وابستہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہر مذہب خیال سے وابستہ رہنا یہ طے کر لیں کہ وہ تحریک کے پلیٹ فارم کو اپنے ذیلی مفاد کی تبلیغ کی نشر گاہ نہیں بنائیں گے۔ لیکن کچھ عرصے سے قادیانی عقیدے کے دوستوں نے اس پلیٹ فارم سے اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ اگر اس پر روک نہ لگائی جی تو نتائج بہت تباہ کن ہوں گے، مرزا صاحب نے میری تقریر پر ممبروں کے ساتھ سنی اور پھر بولے کہ احمدی جماعت بنیادی طور پر ایک تبلیغی جماعت ہے۔ ہم نے پہلے پہل کشمیر میں اس قسم کی سرگرمیوں پر روک لگا رکھی تھی۔ لیکن وہ ایک عارضی مرحلہ تھا۔ ہمارے لیے مشکل طور پر اس کی پابندی کرنا اور اپنے مشن سے دستبردار ہونا ممکن نہیں ہے! اس پر میں نے دو ٹوک جواب دیا کہ ایسے حالات میں احمدی جماعت کے ہم خیال کارکنوں کا تحریک سے وابستہ رہنا نہ مناسب ہے

اور نہ ممکن۔ کیونکہ اُن کا تحریک کا جُز وین کر تین بی سسر گریوں میں معروف رہتا
 کانفرنس میں فرق واریت کے شعلے بھڑک سکتا ہے۔ جن میں ہمارا سارا حاسن خاکستر
 ہو کر رہ جاتے گا۔ اُس دن کے بعد ہی سے احمدی جماعت کا رویہ تحریک کے ساتھ
 پیٹل پہلے تو سرد و جری کا رہا، بعد میں وہ ہماری مخالفت کرتے رہے اور آخر کار
 کلمہ کھلا ہمارے خلاف صحت آرا ہو گئے۔ ہماری تحریک سے مولوی عبداللہ وکیل،
 خواجہ غلام نبی گلکار اور دوسرے کچھ اہم ساتھیوں کی علیحدگی کی بنیادی وجہ یہ تھی۔
 خواجہ غلام نبی گلکار کی علیحدگی تو ذاتی طور پر میرے لیے بے حد تکلیف و ثابت ہوئی۔
 وہ میرے ہم تن تھے اور میرے اولین رفیقوں میں سے ایک۔ پڑھے لکھے بھی تھے
 لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑے باہمت، حوصلہ مند اور جُری تھے۔ تھے تو بڑے
 پُر غلوں لیکن قادیانی عقیدے کی وجہ سے سیاسی مسائل پر اُن کی ہی رہنمائی قبول
 کرتے تھے۔ ان کو قوم کی زبوں حالی کا بڑا احساس تھا۔ اور ان کا زرخیز دماغ لمبی
 چوڑی اور دور انداز کا لکھنوں کا تانا بانا بنتا رہتا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ پاکستان چلے
 گئے۔ لیکن وہاں بھی اپنے وطن مالوت و کشمیر کے متعلق حکومت پاکستان کی پالیسی
 سے نالاں رہے۔ وہ جموں و کشمیر کے لیے مکمل آزادی کو بہترین حل سمجھتے تھے۔ آخر کار
 یہ سرفروش محب وطن اپنے دل میں کشمیر کی یاد مساتے پاکستان میں ہی رہی ملک
 بقاء ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کا جسدِ حاکمِ ہمد میں بھی مادر کشمیر کے آپٹل میں پھونپنے
 کے لیے بے قرار ہو گا۔

احمدیوں کے ساتھ کیا رہ گئی کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔
 جس سے اُن کی روش کا اندازہ ہو سکے گا۔ ایک بار میں جماعت احمدیہ نے کسی
 تقریب کے سلسلے میں بڑے اہم درسے قادیان بلایا۔ اُن دنوں زمین العابدین صاحب

اُن کے امور خارجہ کے نگران تھے۔ ہم اُن کے مکان تھے۔ ایک بار باتوں باتوں میں
 اُنہوں نے کہا کہ غیر احمدی تو احمدی امام کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن احمدیوں
 کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھیں۔ میں نے جب وجہ
 جاننا چاہی تو وہ کچھ رازداری کے سے پہلے میں بولے کہ احمدی مرزا غلام احمد
 صاحب کو بھی نبی مانتے ہیں اور جو اُن پر ایمان نہ لائے اُسے خارج از اسلام
 سمجھتے ہیں۔ ان حالات میں ہم کیسے کسی غیر احمدی کے معتدی بن سکتے ہیں اُن کی
 اس صاف گوئی سے میری آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا اور ان کی نیت اور حرکت عملی
 کا سارا راز فاش ہو گیا۔ غلام یہ ہے کہ ہمارے درمیان راستوں کی علیحدگی ظالی نہیں
 جاسکتی تھی۔

▲▲▲

زندانی میں شگوئے

احرار کے جتنے جوں مٹوبے کی سرحدوں کے نزدیک ریاست میں داخل ہو رہے تھے۔ اور ان کا فوری اثر وہاں کے حالات پر پڑا۔ سارے مٹوبے میں حکومت مخالفت مظاہروں کا ایک طوفان اُٹھ آیا۔ مٹوبے جوں میں حکومت نے بہت سا خون ناحق بہایا۔ لیکن صورتحال اس بات سے اور پیچیدہ ہو گئی کہ وہاں افزائشی نے فرقہ وارانہ فسادات کی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ۲۱ جنوری ۱۹۳۲ء کو بھڑت (دراچوی) میں وزیر سردار تیرتھ سنگھ اور نصف امر ناتھ کے حکم سے ڈوگر فوجیوں نے مسلمانوں کے ایک اجتماع پر، جو نماز ادا کرنے کے لیے جمع ہوا تھا، گولی چلا دی جس سے چھپڑیل مسلمان جاں بحق ہو گئے۔ شورش نے بغاوت کا رنگ اختیار کیا تو مولو انقلابیہ کو چلانے کے لئے جہاراج نے حکومت ہند کے اشارے سے دو انگریز افسروں مسٹر جارجین اور مسٹر لاٹھو کو ان علاقوں کا نظم و نسق سنبھالنے کے لیے مامور کیا۔ اول الذکر مولو ایڈمنسٹریشن کے منتخب رہنے اور دوسرے صاحب ریاست کے انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے۔ صورتحال اتنی خراب ہوئی کہ جہاراج نے جن کو انگریزوں

کی طرف سے "ہندو چندر پور سلطنت" کا خطاب ملا تھا، پیدل فوج کے علاوہ برطانوی ہوائی بیڑے یعنی رائل ایئر فورس کے جہازوں کو بھی میرپور و فیروزہ بھیجنے کی اپیل کی۔ جہاراج کو انگریزوں نے یہ ایذا دیکھ کر اس کے اس بدنام معاہدہ امرتسر کے اقرار کے مطابق فراہم کی۔ جس کے تحت انگریزوں نے کشمیر کو اس کے عوام، پہاڑوں، جھیلوں، میدانوں اور مرغزاروں کے ساتھ پچھتر لاکھ روپے کی تحفہ رقم کے عوض بیچ دیا تھا۔ علامہ اقبال نے اسی ننگ انسانیت معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے یگ آف نیشنز سے یہ خطاب کیا تھا۔

اے باد صبا گر بہ جینوا گذر گئی

حرف نہ بام مجلس اقوام باز گئے

دہقان و کشت و جوئے خیاباں فروختند

قوس فروختند وچ ارزاں فروختند

مریٹر میں نسبت امن وامان تھا اور ہم ملحق اور مجلس کشن کے معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ لیکن جوں کے حالات نے عوام کے دل دوماغ پران کیا اور اس کی لہریں بے چینی کی صورت میں منظر عام پر آئے لگیں۔ جوں کے واقعات پر احتجاج کرنے کے لیے ہرے ناخافہ تعلق کے اراکے میں ایک جلسہ طلب کیا جس میں حکومت کے مظالم کی مذمت کی گئی۔ اس جلسے میں پونچھ کے ایک عوامی رہنما مفتی ضیاء الدین پونچھ نے بھی تقریر کی۔ اور جلسے سخت ہلچل میں حکومت کی توجہ جوں اور اپنے علاقے کے مسلمانوں کی شکایات کی طرف دلائی۔ حکومت پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ اس نے مفتی ضیاء الدین کی جلا وطنی کا حکم جاری کر دیا۔ جس نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ محاکمہ کرنا سنگ کشمیر کے گورنر

تھے۔ میں نے اُن کے پاس جا کر بلا وطنی کے اس حکم کو واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ شاکر صاحب شکر کو اپنے بچے میں اتنے دیکھ کر خوشی سے چھوٹے نہ سہاتے۔ اُن کے دل میں کھوٹ تھی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ اُن کے تپاک کے پیچھے ایک قیادانہ سازش کا فرما ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس معاملے پر آپ خود وزیر اعظم راجہ ہری کرشن کوں سے بات کریں۔ اتنا کہنا انہوں نے جھوٹ موٹ ٹیلی فون کھڑکانے کی کوششیں شروع کیں اور یوں مجھے جھاندر دے کر دو گھنٹے تک اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ وزیر اعظم کے ساتھ تو کیا بات چیت ہوتی لیکن ان دو گھنٹوں میں مفتی صاحب کو فوج کی حراست میں جوں روانہ کر دیا گیا۔ میں نے سرٹگلیسی کے پاس جا کر احتجاج کیا اور اُن سے کہا کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کریں۔ تاکہ کشمیر کی روم اصلاح فضا پھر بچاؤ جائے۔ اور کمیشن کا کام جاری رہ سکے۔ لیکن انہوں نے مداخلت کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ البتہ انہوں نے مجھے خاموش رہنے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی صلاح دی۔

میں گھر لوٹا ہی تھا کہ مجھے یہ حکم سنایا گیا کہ شہر میں دفعہ ۳۴ نافذ کر دی گئی ہے، اور میری زبان بند کر دی گئی ہے۔ میں نے فوراً اس حکم کی خلاف ورزی کا عزم کر لیا۔ دوسرے روز یعنی ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو جمعہ کا دن تھا۔ میں نے خانقاہ معنی کی دوسری منزل سے ایک مجمع کو خطاب کر کے زبان بندی کے اس حکم کے پڑے فضا سے آسمانی میں اڑا دیے۔ میں نے حکومت کی کارروائی کی مذمت تو کی لیکن عوام کو مشورہ دیا کہ صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اور نہ اشتعال میں آئیں۔ اُسی رات مجھے ہڈوں بوٹ سے، جہاں میں اُن دنوں قیام پذیر تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ میرے ساتھ ہی ساتھ میرے بہت سے رفقاء بھی قید کر لیے گئے۔ سرینگر میں دفعہ ۱۹۔ ایل کا وحشیانہ قانون پھر نافذ کر دیا گیا۔ مجھے باوامی باغ چھاتوئی میں لے جایا

گیا اور دفعہ ۳۴ کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا۔ ایک سرسری سماعت کے بعد مجھے چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی اور سنٹرل جیل پہونچا دیا گیا۔

سنٹرل جیل کے ساتھ یہ میری پہلی جان پہچان تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں سردی عروج پر تھی۔ اور برن بادی بھی چوری تھی۔ ادھر ٹھاکر کرنا تسک نے جو اُس وقت وادی کے مختار تھے، کشمیر میں بربریت کا راج قائم کیا۔ سرینگر کے علاوہ ہندواڑہ، سونپور، بانڈی پور، بارہ پور، اورڈی، مظفر آباد، شوپیان الغرض جگہ جگہ مسلمانوں پر گولیاں چلا کر اُن کے گھروں سے برت کی شقائق سفیدی کو لالہ نار میں مہدیں کر دیا گیا۔ روزانہ سیکنڈوں آدمیوں کو گرفتار کر کے جوق در جوق جیل میں دھکیلا جا رہا تھا۔ ورنہ ولاب سے مشہور عالم دین اور محضرت مولانا افسر شاہ صاحب کے دور برداران مولانا سلیمان شاہ اور سمیت شاہ کو گرفتار کر کے سنٹرل جیل پہونچا دیا گیا۔ ہندواڑہ سے حاجی عبدالرحیم واڑہ، غلام قادر سالار، محمد یونس گنیل، مولوی عبدالعزیز، جیل مونسرے مولوی محمد حسین، حاجی رحیم ڈار، صفی محمد اکبر، محمد حبیب بخش، مظفر آباد سے پیر سام الدین، حاجی قلندر شاہ، ماسٹر عبدالعزیز گرفتار کر کے جیل پہونچا دیے گئے۔ مولانا محمد حمید مسعودی نے اس پنی کالج سے تدریس کی نوکری ترک کر کے خانقاہ معنی کے استیج سے تقریر کی اور سنٹرل جیل پہونچ گئے۔ میری اُن سے یہیں پہلی ملاقات ہوئی۔ اور بعد میں وہ میرے ایک بڑے قریبی اور قابل رفیق کا بننے اکثر سیاسی کارکنوں کو سنٹرل جیل کی بارکوں میں رکھا گیا۔ لیکن حکومت کی نظریں سرخیز کارکنوں کو تنہائی کی کوٹھڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ جیسے جیل کی اصطلاح میں سنگین کوٹھڑی کہتے ہیں۔ مجھے بھی ایک تنگ سی کوٹھڑی میں بند رکھا گیا جس کا

کے اس طرف ہم آنا دے کے ساتھ گھوم پھر سکتے تھے۔ میری کوٹھڑی کے بالکل ساتھ دوسرے سنگین میں بارہولہ کے تختہ مقبول کمرہ قید تھے۔ ایک رات زبردست چھل کود کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو میں تھوڑا سا گھبرا گیا۔ لیکن جب کان لگا کر سننا تو معلوم ہوا کہ کمرہ صاحب بہ آواز بلند بارہولہ میں آسودہ ایک اولیاء حضرت جانا باز دلی مے فریاد کر رہے تھے۔

”چھی پیئے دشمن چپ و راست رنکھتے رنکھتے ژٹکھ یا شہر جانا باز“

ترجمہ: میں چاروں طرف سے دشمنوں کے زینے میں ہوں۔ یا جانا باز! ان کو نیست نابود کر۔

کمرہ صاحب آواز لگنے کے ساتھ ہی ساتھ اچھلے کودتے تھے اور اسی لیے سنگین کے دروازے بند رہے تھے۔ میری رگ نرافت پھڑکی اور میں نے اونچی آواز سے انہیں پکارا کہ آپ کی دعا قبول ہوگئی ہے۔ اب آپ سو جائیے تاکہ آپ کے ساتھی قیدی بھی آرام کر سکیں۔ کمرہ صاحب کو واقعی قرار آگیا اور پھر ہمارے ساتھ وہ بھی رات بھر میٹھی نیند سو گئے۔

اسی دوران عبدالقادر صاحب سے بھی جن کے مقدمے کے سلسلے میں ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو گولی ملی تھی، دو تین بار چوری چھپے ملاقاتیں ہوئیں انہیں تین سال قید کی سزا ہوگئی تھی۔ اور وہ اپنی سزا کاٹ رہے تھے۔ بعد میں انہیں ریاست کی حدود سے باہر بھجوا کر ہار دیا گیا۔

ان دنوں جیل کا پیرنٹنڈنٹ ایک پنجابی ہندو تھا۔ جس نے جیل میں اپنے دہریے کی دھاک بٹھادی تھی۔ ہم نے اس کے زعب کا اثر کم کرنے کے لیے اس سے غرض مذاقیان شروع کر دیں اور اخرا طر خواہ رہا۔ ظالم حاکم کے لیے عزت کا دار

ظول و عرض مشکل سے آٹھ فٹ اور چھ فٹ تھا۔ کوٹھڑی میں ایک کونے میں آٹا پیسنے کی پٹن رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف بیٹنے کے لیے ایک چبوترہ سا بنایا ہوا تھا۔ ایک طرف رفیع حاجات کے لیے ٹین کا ایک برتن رکھا ہوا تھا۔ سوت کاتنے کے لیے ایک چرخہ بھی موجود تھا۔ کوٹھڑی میں آنے جانے کے لیے لوسہ کا ایک مضبوط دروازہ تھا۔ جس میں لوسہ کی سلاخیں پیوست تھیں۔ دروازے پر پوٹیں لگنے والا پڑا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے لیے لوسہ کی زنگ آؤد تھائی رکھی گئی اور کھانا ٹین کی ایک نکی کے ذریعے اس میں ڈال دیا جاتا تھا۔ سبزی، وال وغیرہ اندر پہنچانے کے لیے بھی یہی سی استعمال ہوتی تھی ہر قیدی کو ایک خاص مقدار میں پکی پیسنے کے لیے گندم فراہم کی جاتی تھی۔ پیسنے کے لیے ایک موٹا گرتا اور پا جامہ دیا جاتا تھا۔ میں نے جیل کی وردی پہننے سے انکار کیا اور گندم بھی نہیں پیسی۔ البتہ چرخے پر وقتاً فوقتاً سوت کا تار دہاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے کے لیے چند میلی پھلی اور کمرہ دی سی کلبیں دی گئی تھیں اور کھانا قیدیوں کے عام لنگر سے ہمارا کچھ حصے کے بعد جب یہ صعوبتیں میرے جسمانی نظام کو ناکارہ بنانے لگیں تو میں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بہتر سلوک کے مطالبہ پر زور دینے کے لیے جھوک ہڑتال شروع کر دی۔ حکومت ہمارے فیصلے سے گھبرا گئی اور اس نے ہمارے لیے اسپیش کلاس منظور کی۔ جس کے تحت ہمارے کھانے پینے کے لیے کسی روزانہ دسٹل آنے کی رقم خرچ کی جاسکتی تھی۔ سگریٹ، ٹفٹ وغیرہ پینے کی بھی اجازت مل گئی۔ اور ہمارے لیے الگ کھانا بنانے کے لیے سیاسی قیدیوں میں سے عبدالرحیم واڑہ کو ہمارے ساتھ لگا دیا گیا۔ ہماری سنگین کو ٹھری کے سامنے ایک دیوار چن دی گئی تاکہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ ہمارا ملنا جلنا نہ رہے۔ البتہ دیوار

بڑا کاری جوتا ہے۔

جاڑا بیت گیا تو بہار کی رعنائیاں رنگ بکھرنے لگیں۔ سنڑوں میں سرسبز رنگوں کے ہلستے ہوئے ناگزیر گئیں بنایا گیا ہے۔ جہاں اکبر نے محلات شاہی بنائے تھے۔ اس میں ایک نگار خانہ بھی تھا۔ جس میں اُس دور کے عظیم مصوروں کی نہایت حسین و جمیل تصویریں بھی ہوتی تھیں۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اُس زمانے میں ڈل بھیل کا پانی قلعہ کی دیواروں کو چھوتا تھا۔ اسی جگہ مغلوں نے اپنے محلات بھی تعمیر کئے تھے اور انہی فوجوں کو فیصل کے اندر بند کر دیا تھا تاکہ وہ شہر کے عوام کی زندگی میں کوئی خلل نہ ڈال سکیں۔ بے ذوق و دگرہ حکمرانوں نے اس خوبصورت جگہ کو زندان بنا دیا۔ فیصل کے اندر ہری پریت پہاڑی پر جو قلعہ بنا ہوا ہے وہ افغان گورنر عطا محمد خان کا تعمیر کیا ہوا ہے اور یہ اس خوبصورت پہاڑی پر ایک تاج کی صورت میں لگا پھندا نظر آتا ہے۔ عطا محمد خان نے ششدر سے سلاطین تک حکومت کی اور اُس نے کابل کے تسلط سے بغاوت کر کے کشمیر کی آزاد مملکت کا جھنڈا لہرایا۔ اُس نے کشمیر کے محبوب بزرگوں شیخ نور الدین نورانی اور شیخ حمزہ خندوم کے نام پر سبکے نکالے اور ہری پریت کے اس قلعہ پر خود مختاری کا پرچم نصب کیا۔ اُس وقت سے دہلی کے ڈل قلعہ کی طرح یہ قلعہ بھی سرنگ کے سیاسی اقتدار کا ترخہ بنا تھا۔ بہر حال اس جیل کے باہر سلاطین بادام کے باغات سے لگھا ہوا ہے۔ بہار آئی تو یہ شکوہ ناز رنگ کے چھینٹاڑا تھے جو آئے۔ اور شہنشاہ درخت گلابی مائل سفید پھولوں کے زیور سے لہجہ نہ گئے۔ سرسبز کے مٹن پرست لوگ ہر اتوار رنگو گلوں کی بہار ہونے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں یہاں آتے اور سہاوار کی بھاپ چاروں طرف بھینی بھینی مہک پھیلا دیتی۔ ہری پریت کا ٹیلہ سنڑوں کی جیل کے سر پر کھڑا ہے اور وہاں سے جیل کے مٹن پر سیدھی نظر

جاتی ہے۔ ایک روز کچھ لوگ ٹیلے پر چڑھے اُڑا اُڑا ہوں نے نہیں مٹن میں دیکھ کر ہچکچا کر لیا۔ وہ ماحول ہلا کر سلام کرنے لگے تو میں نے تو میر ہلا کر جواب دیا اور کہا د عیسک اسلام۔ وہ لوگ ہمارے اشارے سے اور زیادہ جھوم جھوم کر کپڑے ہلانے لگے۔ کسی طرح سے سپاہیوں نے یہ مصومانہ اور خاموش نامہ وہیام تاک لیا۔ اُنہوں نے فوراً رپٹ کر دی کہ ہم لوگ آپس میں لگن بھیجتے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہنگامہ مچ گیا۔ بڑے بڑے آفیسر جیل میں آئے تحقیقات شروع ہوئی۔ پہاڑی اور جیل کے درمیان لگن بھیجنے کے تجربے ہوئے۔ ہم نے لاکھ بھلایا کہ یہ مٹن خوش وقتی کا ایک نم تھا۔ لیکن اُن کے دلوں کا چرم مطمئن نہ ہوا۔ ہم پر نگرانی کڑی کر دی گئی۔ اور کچھ چھوٹی موٹی پابندیاں بھی عاید کر دی گئیں۔ بہر حال وقت گزرتا گیا۔ کبھی کبھی ہمارے لیے جیل سے باہر بھی کھانا آتا تھا۔ اور ہم آزاد زندگی کی لذتوں کو چکھتے تھے۔ قیدیوں کی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ اور کبھی جیل کے حکام کے ساتھ جوج جوج ہوتی رہتی لیکن عام طور پر ہم ہنسی خوشی وقت گزاری کرتے رہے۔ ان آزمائشوں کی چھلنی میں گزرنے کے بعد بھی ہماری تحریک کو مزمل مراد کی طرف پیش قدمی کرنا تھی۔

پتھر مسجد سرپرست کے تاریخی احاطے میں طلب کیا گیا۔ اجلاس میں شمولیت کے لئے مندوبین کا باقاعدہ انتخاب کیا گیا تھا۔ جب اجلاس شروع ہوا تو عوام کا جوش و خروش دیرنی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شیعہ لشکر کا آوازہ سن کر خاک کے ذروں میں قوت پرواز آگئی ہے۔ اس موقع پر آل انڈیا کنفیڈریشن نے ایک نمائندہ وفد بھیجا تھا۔ جس میں مسٹر عبدالرحیم دور، مولانا اسماعیل غزوی اور سید حبیب الدین ریاست شامل تھے۔ نئی جماعت کا نام آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس تجویز ہوا تھا۔ اور گارردانی کا آغاز اس کے پرچم کے جو سبز زمین پر سفید ہلال اور تارے پر مشتمل تھا، لہرانے سے ہوا۔ مجھے اتفاق رائے سے کانفرنس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور میں نے ہی اجلاس کی صدارت کی۔

میر و اعظمی دوست شاہ اگرچہ مجھ سے برگشتہ خاطر تھے اور ان کے ساتھ ہمارے تعلقات میں یاں آگیا تھا لیکن انہوں نے بھی اجلاس میں اپنے پیروؤں کے ساتھ شمولیت کی۔ اجلاس شروع ہوتے وقت پتھر مسجد کے احاطے اور اُس احاطے میں، جہاں بعد میں مجاہد منزل لکھتیر ہوئی، اور جہاں اُس وقت بالن کی منڈی قائم تھی، تین دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ پاس ہی سہتے ہوئے دریائے جہلم میں ہاؤس بوڈوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے مندوبین اور مہمان مقیم تھے۔ شاہی مسجد کے تین اطراف میں شاندار گیلریاں آراستہ کی گئی تھیں۔ اور ایک طرف بڑا خوبصورت پنڈال بنایا گیا تھا۔ اتنے بڑے اجلاس کی ترتیب و تنظیم اور انحرام و احاطہ ایک آزمائش تھی اور میں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ ہمارے کارکن اس آزمائش میں پورے اُترے ہیں اور انہوں نے اپنے سُن انتظام کی دھاک بٹھا دی ہے۔ خواجہ غلام احمد عثمانی

جموں و کشمیر مسلم کانفرنس

ہماری تحریک کا دھارا اس وقت تک ایک پہاڑی جھرنے کی طرح پھوٹ کر مستانہ وار چھلک رہا تھا۔ لیکن اب اس کو ایک شیرازہ بند تنظیم کے کناروں میں خرام کے آداب سکھانے کا موقع آگیا تھا۔ اور قومی مفادات کا تقاضا یہی تھا کہ ایک مستند جماعت اُن کے مقاصد کا ہراول دستہ بنے۔ میں نے اس غرض کے لئے اپنے ساتھیوں اور دُوسرے بہت سے زعماء کے ساتھ گفت و شنید شروع کی۔ میں جموں بھی گیا اور وہاں نئی تنظیم کی داغ بیل ڈالنے کے لئے چودھری غلام عباس، میر تقی یعقوب علی وغیرہ سے تبادلہ خیال کیا۔ سبھی لوگ ایک ریاست گیر تنظیم بنانے کے حق میں تھے۔ اس غرض کے لئے مسلم نمائندگان کی ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کو نئی جماعت کے دستور اساسی کی ترتیب کا کام سونپا گیا تاکہ انہی خطوط پر اجلاس بلایا جاسکے اور پھر اس سوسلے کو مندوبین کے سامنے منظور کی کے لئے پیش کر دیا جائے۔ کمیٹی نے ایک آئینی دستاویز تیار کی جس پر ہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے ریاست کے مسلم نمائندگان کا ایک اجلاس ۱۳-۱۵-۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو

برادری وطن کو خواہ ہندو ہوں، یا مسکھ یقین دلاتا ہوں کہ ہم اُن کے دُکھوں کو دور کرنے کے لئے اسی طرح تیار ہیں جس طرح مسلمانوں کے دُکھوں کو۔ ہمارا ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک ہم ایک دوسرے سے صلے کے ساتھ رہنا نہ سیکھیں اور وہ بھی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ایک دوسرے کے جائز حقوق کا احترام کریں۔ اور ایک دوسرے کی ملکیت دور کرنے کی کوششیں کریں۔ پس تحریک کشمیر ہرگز کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے۔“

میں نے گلشنی کیشن رپورٹ اور اُس پر کی گئی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جو مطالبات پورے ہوئے ہیں اُن کے لئے تو حکومت کا شکریہ واجب ہے لیکن ابھی ہمارے بنیادی مسائل جُل کے جُل ہیں۔ چنانچہ میں نے کہا کہ مجھیلٹو اسمبلی کا قیام اصولی طور پر حکومت تسلیم کر چکی ہے۔ لیکن اب اس کو ایک سال کے اندر اندر معرضِ وجود میں لایا جانا چاہیئے۔ میں نے تحریر و تقریر کی آزادی، انجمن سازی کی آزادی، اور ریاست کے پریس ایکٹ کو برطانوی ہند کے ایٹم سے ہم آہنگ کرنے کا بھی مطالبہ کیا اور تعلیم، سواں، سماج، سدھار، صحت و حریت وغیرہ کو فروغ دینے کی اپیل بھی کی۔ میں نے جنوں کے حالات کا بھی ذکر کیا۔ وہاں کے مسلمانوں کی رُخس حالی کی تصویر کھینچی اور مطالبہ کیا کہ جنوں کے مسلمانوں کو اُن کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی دی جانی چاہیئے۔ پونچھ کے سوال پر میں نے خاص طور سے دُنیا کی توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا:

”علاقہ پونچھ صوبہ کشمیر کے ایک ضلع کے برابر ہے۔ وہاں کی آبادی چار لاکھ ہے۔ جن میں اٹھانوے فی صدی مسلمان ہیں اور یہ ساری آبادی نہایت اہتر حالت میں ہے۔ یہ علاقہ مشرقِ ہندوستان کے سرکاری اعلان کے تحت ریاست جنوں و کشمیر میں ایک جاگیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے علیحدہ نظم و نسق، علیحدہ قانون اور انتظام

نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ میں نے اپنے خطبہ عداوت میں تحریک کے پس منظر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا:

”ہمارا جا پرتاپ سنگھ کے عہد میں جہاں سبائی ذہنیت کے وزراء نے مسلمانوں کو پیسے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ مسلمانوں کو اتنا دیا گیا کہ اس کے نتیجہ میں اُن میں نشاۃ الثانیہ کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے جس کا ثبوت رشیم خاں کے سامع، حالیہ واقعات اور میسوریل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حکومت کے لئے ان واقعات میں عبرت و موعظت کے لاکھوں دفتر موجود تھے۔ مگر وہ اُن سے مشنبہ نہ ہوئی بلکہ اُس نے اپنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط بنانا شروع کیا۔“

ان آیام میں مسلمانانِ ریاست نے جو قربانیاں پیش کی ہیں اور جس برائت، بہادری اور دہری کے ساتھ اپنی جائیں ملت و وطن پر نشانہ کی ہیں وہ لائقِ صداقت و شہادت ہیں۔ اور اس موقع پر اُن کی خدمات میں، میں نہایت ہی خلوص کے ساتھ جذباتِ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں۔ یہ قربانیاں دراصل امتحان کی پہلی کڑی تھیں۔ مستقبل میں شاید قوم کو اس سے بھی زیادہ قربانیوں کی ضرورت پڑے گی۔“

میں نے مسلم کانفرنس کی عوامی حیثیت کے بارے میں کہا کہ یہ صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ریاست کے تمام مظلوموں کے حقوق حاصل کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ اور اس کے وجود سے ریاست کے تمام فرقوں کو برابر کا فائدہ حاصل ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں بتایا:

”ہماری طرف سے برابر اعلان کیا گیا ہے کہ تحریک کشمیر کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں ہے بلکہ سب جماعتوں کی شریکات کا ازالہ کرنے کے لئے ہے اور میں اپنے

رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس دو عملی کا سدباب کرتے ہوئے پونچھ میں بھی وہی قوانین نافذ ہوں جو ریاست کے دوسرے حصوں میں جاری ہیں۔ تاکہ جاگیر پونچھ کو کوئی ترقی نہ رہے کہ وہ اپنے لیے ایک قانون ساخت کرے اور ریاستی اسمبلی میں باشندگان پونچھ کے لیے ان کی نمائندگی کے حق کا فیصلہ کیا جائے تاکہ وہاں کے مظلوم باشندوں کے غم و ستم سے نجات کا کوئی راستہ مل سکے۔

کانفرنس زبردست کامیابی سے دو چار ہوئی اور اس میں لاکھوں لوگوں نے میرے اور میرے ساتھیوں کی تقریریں سُنیں۔ اجلاس کچھ اہم قراردادیں پاس کر کے برخاست ہو گیا۔ اجلاس میں شیخ عبداللہ پادریٹ کو جماعت کا نائب صدر چوہدری غلام عباس کو اس کا جرنل سیکریٹری اور مولوی عبدالرحیم وکیل کو اس کا سیکریٹری چُن لیا گیا۔

اجلاس نے ایک قرارداد کے ذریعہ صدر آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی حیثیت سے مجھے اختیار دیا کہ میں چار ماہ کے اندر کانفرنس کی جرنل کونسل کا اجلاس بلاؤں جس میں دیکھا جائے کہ حکومت نے گلشن کشن کی سفارشات پر عمل کیا ہے یا نہیں۔ اگر جواب اطمینان بخش نہ پایا جائے تو کوئی ایسا عمل تیار کیا جاوے جو حکومت کو مجبور کر دے کہ وہ مطالبات کو پورا کرے۔ اجلاس کے افتتاحی دن جرنل کونسل میں جموں اور کشمیر کی نمائندگی کے تناشب پر بڑی گرم گرمی ہوئی۔ کشمیر کے مندوبین کا ایستمدال تھا کہ کشمیر میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت بستی ہے لہذا جرنل کونسل میں انہیں آبادی کے تناسب سے حصہ ملنا چاہیے۔ لیکن جموں کے احباب جن میں چوہدری غلام عباس اور اللہ رکھا راجپوت پیش تھے یہ منفق جتانے لگے کہ کشمیر یوں میں سیاسی شعور تو ہے نہیں، اس کے مقابلے میں جموں کے مسلمان سیاسی طور پر بڑے میل و مغز اور

باشعور ہیں۔ اور انہوں نے ہی کشمیر میں بیماری کی لہر درآمد کی ہے۔ لہذا جرنل کونسل میں جموں کو زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ جموں کے نمائندوں نے جس انداز سے یہ جواب دہی دی پیش کیا اس میں کشمیریوں کے تئیں کمزوری کا احساس اور خدشات کا جذبہ جھلکا تھا۔ کشمیر کے کوٹے کوٹے سے جو نمائندے آئے تھے وہ مولوی قسم کے لوگ تھے۔ جنہیں دنیا کے کینٹ وکم کا کم ہی علم تھا اور سادہ لوح تھے۔ لیکن جموں کے نمائندوں کا انداز محکم اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ ان کے جذبات، بھی بھڑک اٹھے اور فرط حمیت سے ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ خود مجھے بھی اپنے جموں کے دوستوں کا یہ پیرایہ گفتار قطعاً نہیں بھایا۔ میری رگ حمیت کو چرٹ لی۔ چنانچہ میں نے ایک نہایت ہی زوردار تقریر کر دالی میں نے کہا کہ یہ رنج کا مقام ہے کہ قربانیاں کشمیریوں نے دی ہیں۔ انہوں نے اپنے خون سے سرزمین کشمیر کو لالہ زار بنادیا ہے۔ انہوں نے اپنے مال و متاع کو وطن کی راہ میں نٹا دیا ہے۔ لیکن جموں کے سکس رائٹ ساحل ان ہی کو کوس رہے ہیں اور ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

دیکھتا ہے وہ فقط ساحل سے نرم خیر و مشر
کون طوفان کے طماچے کھارہا ہے میں کہ تو

افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے جموں کے ہم جلس اُسی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں جو ہمارے حکمرانوں کا خا صا رہا ہے۔ کشمیریوں کی بیماری اور شعور کا ایک ادنیٰ سا مظاہرہ یہ اجلاس ہے۔ جس کے حسن انتظام پر ہر کوئی مشغول کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کشمیریوں کو لگاؤ و خدشات سے دو تھیں تو یہ بڑی بے انصافی ہے۔ میری تقریر اس قدر زوردار تھی کہ جموںی دوستوں کے پچھلے چوٹ لگنے اور وہ شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ کشمیری احباب نے مجھے ان کے جذبات کی

میچ ترجائی کرنے پر گلے لگایا۔ جب رات کے بارہ بجے کے قریب ہم ہاؤس بوٹ کی جانب جا رہے تھے تو مولوی یوسف شاہ کے برادر اصغر مولوی محمد یحییٰ شاہ نے بے اختیار مجھے گلے لگا کر کہا کہ ادوی اور کہا کہ آپ واقعی شیر کشمیر ہیں میرے دل میں آپ کے متعلق جو بدگمانیاں تھیں وہ اب دور ہو گئی ہیں۔

اجلاس کے کچھ عرصے کے بعد میں لاہور چلا گیا۔ اور جلد ہی خواجہ غلام احمد عثمانی بھی وہاں آ گئے۔ میں نے صورتحال پر غور کرنے کے لیے ۷ دسمبر کو جنوں میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس طلب کیا۔ اجلاس کے اختتام پر ہم نے حکومت کی توجہ اُن مطالبات کی طرف دلائی جو مسلم کانفرنس کے پہلے عام اجلاس میں پیش کیے گئے تھے۔ اور حکومت سے کہا گیا تھا کہ اگر اس نے چار ماہ کے اندر اندر اطمینان بخش اقدامات نہ اٹھائے تو ہم مزید کارروائی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ اجلاس کے بعد میں سرینگر آ گیا اور سیاسی سرگرمیوں میں لگ گیا۔ حکومت ہمارے مطالبات پر بھی نہیں بلکہ اپنی یقین دہانیوں پر عمل کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ بہت سی مسلمان عبادت گاہیں والگڈار کرنے میں بھی بچکا بٹھ سے کام لیا جا رہا تھا۔ اسمبلی کے قیام کے سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی تھی۔ اور عوام اس تعطل پر اب بے چین ہونے لگے تھے۔ میں نے ان تمام امور پر غور کرنے کے لیے ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو سرینگر میں مجلس عاملہ کی ایک اور میٹنگ طلب کر لی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل راجیو پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دی۔

خواجہ سعد الدین شال، چودہری غلام عباس، آغا سید حسین شاہ جلالی، مولوی محمد عبداللہ وکیل، پیر مسام الدین گیلانی، خواجہ غلام احمد بٹ، میاں



ماسٹر عبداللہ سے شیر کشمیر
جنوں و کشمیر مسلم کانفرنس کے پہلے صدر کی خدمت سے

احمد یار خان، مولوی محمد حسین، ہنشی عبدالعزیز، اور عبدالحمید قرشی۔ کمیٹی کے ذمہ یہ کام رکھا گیا تھا کہ وہ غیر مسلم نمائندوں کے ساتھ رابطہ قائم کریں اور ایک مشترکہ تنظیم بنانے کے امکانات پر ان سے گفت و شنید کریں۔ افسوس یہ ہے کہ غیر مسلم لیڈروں نے ہماری اس اپیل کا پھر ایک بار مناسب جواب نہ دیا اور اس طرح سے ایک مشترکہ تنظیم کا قیام پھر کٹھانی میں پڑ گیا۔

اجلاس طلب کرنے کے فوراً بعد میں نے شہر میں عوام سے رابطے کی تجویز کیلئے ایک زوردار ہم شروع کی تاکہ انہیں حالات سے آگاہ کرنے اور مولانا فاضل کیلئے تیار کیا جاسے۔ جلد ہی یہ ہم زوردار شکل اختیار کر گئی حکومت کے سامنے مسئلہ اہم کے واقعات ناچنے لگے چنانچہ وہ گھر گئی۔ وزیراعظم کا لون اپنے وزیر برائے امن و قانون مشرور جاہست حسین کے ساتھ سر میٹنگ پہنچ گئے اور مسلم کانفرنس کے نمائندوں سے گفتگو کا آغاز کر لیا۔ اس سلسلے میں کچھ خطوط کا تبادلہ بھی ہوا۔ اسی دوران ۵ مارچ کو پروگرام کے مطابق مجلس عاملہ کی میٹنگ بھی شروع ہو گئی۔ میٹنگ ۸ مارچ تک جاری رہی اور اس دوران حکومت کے ساتھ گفت و شنید بھی جاری رہی جس کے نتیجے کو بعد میں اخبارات کے لیے بھی جاری کر دیا گیا۔ ”گورنر کشمیر کی درخواست پر میں نے وزیراعظم کے ساتھ ٹیلی فون پر گفتگو کی۔ وزیراعظم نے جواب میں ایک مکتوب تحریر کیا۔ جس میں خواہش ظاہر کی گئی کہ ہمارے مطالبات کے سلسلے میں مزید مذاکرات کیے جائیں۔ میں نے اس بنا پر ان سے ملاقات کی۔ جو دو گھنٹے تک جاری رہی۔ وزیراعظم نے یہ بات تسلیم کرنی کر گلیسنی رپورٹ کی کچھ سفارشات پر ابھی تک عمل نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تاخیر کی وجوہات ان کے قابو سے باہر ہیں۔ وزیراعظم نے معاملات کو تسلسلے میں اپنی زیر دست دل چسپی کا اظہار کیا۔“

کچھ دنوں کے اندر ہم نے وزیراعظم کو ایک مفصل یادداشت پیش کی جس میں ایک مطالبہ یہ بھی درج تھا کہ انجمن سازی اور تقریر بازی پر کسی قسم کی پابندی عاید نہ رہے۔ حکومت نے اس یادداشت میں درج تمام سفارشات کو منظور کر لیا۔



گلیٹنسی کمیشن اور اس کے بعد

میری گرفتاری کے بعد حالات تیزی سے خراب ہونے لگے اور وادی کے بعد ساری ریاست انفراتقری کی پلیٹ میں آگئی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو جوں کے مسلم نمائندگان خود ہمارا جا کو حالات سے آگاہ کرنے اور اُن کی توجہ میسری گرفتاری کی طرف دلائے کے لیے اُن کے محل میں آئے۔ وفد کی قیادت چودھری غلام عباس کر رہے تھے اور اس میں سید محمد امین شاہ، سجادہ نشین، ستری یعقوب علی اور شیخ تمنا امین بھی شامل تھے۔ وفد نے جب ہمارا جا سے ملاقات کی تو وزیراعظم راجہ ہری کرشن کو مل بھی موجود تھے۔ وفد کے ارکان نے بڑی تفصیل کے ساتھ ہمارا جا کو کشمیر کے تازہ حالات، مسلمانوں کے مطالبات اور سرکاری انتظامیہ کی غفلت شہادی سے آگاہ کیا۔ راجہ ہری کرشن کو ان کو بیچ بیچ میں ٹوٹے رہے۔ لیکن وفد کے ارکان اور خاص طور پر ستری یعقوب نے ہمارا جا کو بڑی صاف گوئی سے بتایا کہ اُن کے اعلیٰ حکام انہیں غلط اطلاعات اور مشورہ دے کر اُن کی حکومت کے تینوں بدغنی پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارا جا ہری سنگھ نے

اس کا بُرا نہیں منایا۔ اگرچہ راجہ صاحب لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ آخر میں چودھری غلام عباس نے میری گرفتاری کا مسئلہ اُٹھایا اور ہمارا جا سے کہا کہ اگر وہ حالات کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو شیخ محمد عبداللہ کو فوراً رہا کیا جانا چاہئے۔ چودھری غلام عباس نے ہمارا جا کو بتایا کہ یہ بات واقعی حیرت ناک ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو اُس وقت گرفتار کیا گیا۔ جب وہ حالات کو بہتر بنانے کی سعی میں مصروف تھے۔ اور جب انہوں نے امن و امان بنانے رکھنے کے لیے کام شروع کیا تھا۔ ہمارا جا ہری سنگھ میرے ذکر پر تھوڑا سا بھوک اُٹھے اور جواب میں کہا ”عبداللہ کو کوئی بار جھوٹا گیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے حکومت کو کدور سمجھا۔“ ملاقات ختم ہوئی لیکن اُس کا کچھ نہ کچھ اثر ہمارا جا کے ذہن نے ضرور قبول کیا۔

اُدھر حالات بھی بدستور بگڑتے گئے۔ میرپور وغیرہ میں راجا محمد اکبر خان غازی، مسرانی بخش، خواجہ وہاب الدین وغیرہ نے میس ادا نہ کرنے کی تحریک شروع کی، حکومت تقریباً مفلوج ہو گئی۔ کشمیر میں تو یہیں لوگ موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ ہمارا جانے یہ حال دیکھا تو اُن کو یقین ہو گیا کہ راجہ ہری کرشن کو مل نے انہیں محض حالات میں سرحدار کرنے کے سبب باغ دکھائے تھے۔ لیکن اصل میں انہوں نے نظم و نسق کا بیڑا فرق کر دیا ہے اور ہمارا جا اور اس کی رعایا کے درمیان خون کا ناقابلِ جوہر دیا حاصل کر دیا ہے۔ چنانچہ راجہ صاحب کو چلتا کر دیا گیا۔ اور اُن کی جگہ حکومت ہند کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ایک اعلیٰ افسر آئی۔ جی، ڈی، کالون کو وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ کرنل کالون کی تقرری دسرتے ہند کے اشارے پر عمل میں آئی

گئی تھی۔ اب انگریز سامراج اپنے پٹھو ہمارا جو کچھ چاہے اور عوامی تحریک کو کچلنے کے لیے براہ راست سامنے آگیا۔

میں ابھی پایہ بڑھلا ہی تھا کہ حریفوں نے یہ بے پردگی اڑائی کہ کرنل کالون انگریزوں کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی ایما پر اس فرض کے لیے لائے گئے تھے تاکہ مجھ پر قابو پایا جاسکے اور میں سرکار انگلش کی ہر مرضی کے مطابق تحریک کی رہنمائی کروں میں پروپیگنڈے کے پیچھے اُن عناصر کی شاطرن ذہنیت کام کر رہی تھی جو میری بے باکی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مجھے انگریزوں کے ڈیپارٹمنٹ کے روپ میں پیش کر کے میرا اعتبار کم کر لینا چاہتے تھے۔ اس بہتان کو شہرہ دینے میں مولوی یوسف شاہ کے علاوہ مجلس احرار اور حکومت کے اراکین بھی پیش پیش تھے۔ یہ سارے مجھ سے الگ الگ وجوہات کی بنا پر بغض رکھتے تھے چونکہ میں کشمیری عوام کی تحریک کا نشان بن گیا تھا۔ اور میرے نام نے ایک اسطوری (LEGENDARY) حیثیت سی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے وہ ہر جان نکتا جانور حربے سے اس پر مارا کہ وہ بھڑا دینا چاہتے تھے۔ لیکن نہ تو عوام ہی جھانسنے میں آسکے اور نہ ہی بعد کے واقعات نے اُن کی اس گہمت طرازی کو صحیح ثابت کیا۔ کرنل کالون کے خلاف میں نے جتنی تند و مدے تحریک چلائی وہ تاریخ کا حشر ہے۔ اس طرح سے عرفان بادہ پیا کی یہ کوشش بھی رابنگاں گئی۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے شاعر نے کہا تھا۔

خود خدا ہے کفر کی حرکت پر نمدہ زن
پٹھوں کوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

گلیشی کیشن زوبرتشار سے ہی اپنے کام میں معروف تھا۔ اور اُس نے شکایات، یادداشتیں وصول کرنے کی ایک خاص تاریخ بھی مقرر کی۔ کیشن کا

قیام مسلمانوں کی زبردست تحریک کا نتیجہ تھا۔ اور ریاستی مسلمانوں کا جو خون بہتا بہا گیا تھا اسی کی شرفی سے اس کے قیام کا حکم صادر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے قیام میں بیرون ریاست کی رائے عامہ کے اُس دباؤ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ریاستی مسلمانوں کی تحریک کے نتیجے میں ابھرا۔ ریاست کے رجعت پسند ہندو اس صورت حال سے خوش نہ تھے۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اکثریتی فرسے کو اگر اُن کے حقوق مل گئے تو ہمارے حقوق پر زور پڑے گی۔ بیرون ریاست کا متعصب ہندو پریس اور کچھ دوسرے فرقہ پرست عناصر اُن شبہات کو اور شہرے دے رہے تھے۔ اس لیے انتظامیہ کے ساتھ، جس پر اُن کے ہم مذہبوں کا غلبہ تھا، انہوں نے ریاست کے خرمی امن میں آگ لگانے کی سائیں شروع کر دیں۔ تاکہ کیشن کے کام میں روٹے اٹکے جاسکیں یعنی خیار الدین پرکھی کی بلا ضرورت گرفتاری اور جلا وطنی اشتعال انگیزی کی اسی سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ تھی۔ لیکن جب کیشن اس کے باوجود کام کر رہا تو دوسری ٹرپ چال یہ چلی گئی کہ ہندو جمران کشین سے استعفیٰ دیدیں۔ اور اس کے اعتبار وارٹر کوڑک پہنچائیں۔ جموں کے ہٹلر لوک ناتھ شرمانے ہندو تارکین مذہب کو وراثتی حقوق دینے کے مسئلے کا بقتلہ بنایا اور کیشن سے الگ ہو گئے۔ لیکن پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اس دباؤ کے آگے جھکے سے انکار کر دیا۔ جس پر کشمیری پنڈتوں نے انہیں، اُن ہی کی بنائی ہوئی یووک سے بے الگ کر دیا۔ بزاز صاحب کے خلاف زبردست جہم چلائی گئی۔ اُن کو جمائی اذیتیں پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا گیا اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ اُن کے لیے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ پناہ گزین انہیں زندہ پورہ سے جو پنڈت اکثریت کا علاقہ ہے نقل مکانی کر کے آبی گڈر کے ایک مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ جہاں سے

انہوں نے بعد میں وادی کا پہلا روزانہ اخبار "وہستا" جاری کیا۔ ہمارا جائے کمیشن کو مسٹر لوک ناتھ شرما کی تلخی کے باوجود کام کرنے کی اجازت دی اور ہندو نوکر شاہی کے ویاؤ اور سازشوں کے باوجود کمیشن نے اپنا کام جاری رکھا اور بالآخر ۳۲ مارچ ۱۹۵۷ء کو اپنی رپورٹ اپنی سفارشات کے ساتھ ہمارا جا کی خدمت میں پیش کر دی۔

کمیشن کی سفارشات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ مسلمانوں کی شکایات کس قدر جتنی جانب نہیں۔ یہ ایک نہایت ہی اہم دستاویز تھی۔ اور اس نے حکمرانوں کو بھی قائل کر دیا کہ عوامی شکایات کا ازالہ کرنے کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ پتا نہ چہ ہمارا جائے کمیشن کی خاص سفارشات کو منظور کر دیا اور وزیر اعظم کا نوٹ نمبر ۱۰، ۱۱ اپریل ۱۹۵۷ء کو ایک سرکاری فرمان کے ذریعے ان سفارشات پر عمل درآمد کرنے کے لئے ایک حکم جاری کیا۔

اگرچہ مسلمانوں کی شکایات کے ازالے کے لیے یہ سفارشات صرف پہلے قدم کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن ہم نے پھر بھی ان کا غیر مقدم کیا۔ کمیشن کی سفارشات کے مطابق مسلمانوں کی ان تمام عبادت گاہوں کو جو حکومت کے قبضے میں تھیں، مسلمانوں کے لیے واگزار کر دیا گیا۔ کمیشن نے ریاست میں تعلیم کی ترقی اور خاص طور پر پرائمری سطح پر اس کے پھیلاؤ کی طرف فوری توجہ کی سفارش کی۔ ایک اور سفارش کے ذریعے سکولز میں اور خاص طور پر سائنس کے طور پر مسلمانوں کی بھرتی پر زور دیا گیا۔ اور ایک خاص امر کو اس بات کی نگرانی کے لیے مقرر کرنے کی سفارش کی گئی جو مسلمانوں کی تعلیم کی ترقی کا جائزہ لیتا رہے۔ سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کے سلسلے میں سفارشات کی غی کر کم سے کم تعلیمی قابلیت غیر ضروری طور پر

زیادہ اونچی درجہ کی جائے۔ اور یہ بھی بتایا گیا کہ بھرتی کا ایک ایسا سسٹم وجود میں لایا جانا چاہیے جہاں ہر طبقہ کو اس کا حق حاصل ہو۔ اس کے علاوہ ان سرکاری زمینوں کے جن کو عام لوگ کاشت کرتے ہوں، مالکانہ حقوق منتقل کرنے کی سفارش بھی کی گئی۔ کسانوں کی بہتری کے لیے بہت سی دوسری سفارشات بھی پیش کی گئیں اور بے گھر کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ حکومت کے اعلانے میں بھی کہا گیا کہ "کاربر سرکار کے سلسلے میں باقاعدہ طور پر قواعد کے مطابق اجرت ادا کی جانی چاہیے"۔ بے روزگاری اور غنیمتوں کے فروغ کے متعلق اقدامات اٹھانے پر زور دیا گیا۔ کمیشن کی سفارش تھی کہ غنیمتوں کی ترقی کی طرف ریاستی حکام کو فوری توجہ کرنی چاہیے۔ تاکہ بے روزگاری کا موثر انسداد ہو سکے۔

گینسی کمیشن کی رپورٹ اور ہمارا جا کی طرف سے اس کی منظوری ان لوگوں کے منہ پر ایک چپٹ تھی جو یہ کہتے تھے کہ دراصل ریاستی مسلمانوں کا جھگڑا اپنے ہندو ہمارے اور ہندو باشندوں کے ساتھ ہے اور وہ ان کو ایک آنکھ نہیں بھالتے۔ بیسا کہ وقوع تھی پنڈتوں نے اس رپورٹ کو اپنے لیے ایک مایوس کن دستاویز قرار دیا۔ اور وہ اب کھلے بندوں ہمارے سے بھی ناراضی بتلاتے گئے۔ شیش ناتھ کمیشن کی کامداری کو سبوتاژ کرنے کی تحریک سازشوں کا گروہ بنے لگے اور آہستہ آہستہ دونوں کا بھارتیہ قزاقچہ نعرہ بازی کی صورت میں نمودار ہونے لگا۔ وہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندو ہمارا جا کے خلاف تحریک شروع کر کے وہ ہندو راج کو زنگ بنائیں گے۔ پھر ہمیں وہ بہ ضرورت اپنی طاقت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسکولوں اور کالجوں کے پنڈت طلباء کی طرف سے "روٹی انجی ٹیشن" کا سوانگ رچایا۔ اس انجی ٹیشن کے دوران اسکولوں اور کالجوں کے ہندو طلباء کسی جگہ پر اکٹھا ہو جاتے تو ایک لڑاکا آواز بلند کرنا تھا "بھائیو سے بھائیو"۔ جمع جواب دیتا تھا

”ہاں بھائی۔ ہاں بھائی“ نعرہ باز پھر کھڑا اٹھتا تھا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“ اور ہجوم جواباً تین مرتبہ آواز دیتا تھا۔ ”روٹی۔ روٹی۔ روٹی“ ایسی کیش کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی۔ چنانچہ اس کا اندازہ اس کے تین مطالبات سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ کاشت کے لیے آراغیاں مفت دی جائیں۔

۲۔ صنعتی تعلیم حاصل کرنے کے لیے خاص دینیے دیے جائیں۔

۳۔ بکرا خانے اور دیگر کام جاری کرنے کے لیے روپے دے کر امداد کی جائے۔

یہ مطالبات عوام کو درپیش اہم ترین معاملات کے مقابلے میں بالکل بخیر تھے۔

لیکن ہم نے گلشنی کیش کو جو یادداشت پیش کی تھی اُس کے دائرے میں ان شکایات

کا افساد بھی شامل تھا۔ اور کیش کی مفارقات کو منظور کرتے ہوئے حکومت نے جو

اعلانہ شائع کیا تھا اس میں بھی یہ افساد متغیر تھا۔ لیکن حیدر گرا بہا نہ بسیار۔ انہوں

نے واقعات کو گڑبڑ کرنے اور اعلیٰ شکایات سے توجہ ہٹانے کے لیے یا ایسی ٹیشن

شروع کی۔ پنجاب کے رجسٹر پسند ہندو پریس نے اس کی خوب پیڑھ مٹھائی اور

ہندو مہاسبھاکے صدر ڈاکٹر موہن لال ایک وفد لے کر جہاں جا رہی سنگھ سے ملاقات

کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تاکہ انہیں گلشنی کیش پر عمل درآمد نہ کرنے کی ترقیب

دی جائے۔ لیکن کرنل کائونسل نے ہتھیاری کا ثبوت دے کر اس بیل کو منسوخ نہ

پرھٹے دیا۔ اس ایسی ٹیشن کے ایک نقصان یہ ہوا کہ دادی کے پیڑھ تو اور مسلمانوں

میں پھوٹ چڑھ گئی۔ علاوہ دو صدیوں سے دروادی اور آشتی کے ان رشتوں میں

بندھ کر بھائیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ جنہیں ہمارے مونیوں اور سنتوں نے اپنی

تعلیمات کا دودھ پلایا تھا۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فسادات بھی ہوئے اور فضا میں بڑی

دیر تک تلخی اور کشیدگی چھائی رہی۔

اسی دوران ۴ جون ۱۹۲۰ء کو مجھے جیل سے چھ ماہ کی مدت قید پوری کرنے سے قبل ہی رہا کر دیا گیا اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی تعلیم کی صفوں کو درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اُس وقت تک ریاست کے مسلمانوں کی نمائندگی اُن گیارہ اصحاب کے ہاتھ میں تھی جن کو عوام نے چنا تھا۔ لیکن اب اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ ایک باقاعدہ تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے جس کا اپنا آئین ہو اور جو اس آئین کے تحت منقرہ قواعد و ضوابط کے جو کچھ میں کام کرے۔ ہم سب کی خواہش تھی کہ ہم اس تنظیم میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بھی شامل کر لیں۔ لیکن بد قسمتی سے صورت کچھ ایسی تھی کہ غیر مسلموں کا فعال اور با اثر طبقہ اس بات کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتا تھا۔ اور وہ اس کو ماننے سے گریز کر رہا تھا۔ پنڈت کشپ۔ مندھو، یوگ سبھاکے لیڈر کی حیثیت سے کثیر پیڈنتوں کی رہنمائی کرتے تھے چنانچہ میں اور عشائی صاحب اُن سے مالی کد کے ایک محضرہ کثیر پیڈنت رام چند کول نیکرے گھر پر ملے۔ کافی دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا اور بندھو بھی نے بھی اصولی طور پر ایک متحدہ تنظیم کے قیام کی حامی بھر لی۔ لیکن انہوں نے اعتراض کیا کہ پنڈت جاتی کے لیے یہ فیصلہ قبول کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہوگا۔ لیکن ہم نے اُن سے کہا کہ اس کے باوجود ہندو لیڈروں کو ہمارے ساتھ دھتکار فوج میں بیٹھنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس طرح سے دلوں کے فاصلے پرھٹنے کی بجائے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ بہر کیف ہم اپنی نئی تنظیم کا سامنا بانا جنے میں مصروف ہو گئے۔ دیریں اثنا شہر میں اسلامیہ اسکول کے بچوں کے ایک مجلس پرہو خانہ کے ہفتے کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ گنپت پارکے پنڈت علاقے میں ایک جاتی بوجھی سادھن کے تحت حملہ کیا گیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سپر رازہ

غلام رسول کے حتمی سے کسی طرح معاملہ میں گیا مگر بات پھیل گئی۔ اُدھر پنڈتوں کے ایک اور سرکردہ لیڈر پنڈت جیالال کلم نے اُن کے مرکز شیشی نامہ میں ایک بڑی شعلہ لایا اور دہراؤد تقریر کی۔ جس نے جتنی پرتیں کا کام کیا۔ ہندو پہلے ہی مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اب بے قابو ہو کر اُن پر چھٹ پڑے۔ چنانچہ شہر میں جواری کارروائیاں بھی شروع ہو گئیں اور فرقہ وارانہ فسادات کا کارزار گرم ہو گیا۔ حالات اس قدر ابتر ہو گئے کہ ۲۴ ستمبر کو جہاں جاہری سنگٹھ کی سالگرہ کی تمام تقریبات جو دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں، منسوخ کر دی گئیں۔

اُن ہی دنوں کا ایک المناک واقعہ تجھے یاد آتا ہے۔ سرچر کے ایک محلے بہوری کد میں ایک کشمیری پنڈت گوہند رام کی لڑکی کا قدرتی وجوہات سے انتقال ہو گیا۔ شہر میں حالات کشیدہ تھے اس لیے بے چارہ پنڈت تین دن تک ڈر کے مارے لاش کو گھر سے باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ اور لاش کے مڑ جانے کا امکان تھا۔ میں اُن دنوں امن و امان بحال کرنے کے لیے شہر کا گشت کر رہا تھا۔ بہوری کد مل پہنچا تو اس لرزہ خیز صورت حال کی رپورٹ فہم کن پہنچی میرے دل میں ایک ہلک سی آنکھیں اور مجھے اس بات پر سخت افسوس ہوا کہ کشمیر میں اس قسم کی وارداتوں کی فوبت آپہنچی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی حفاظت کی کوئی پردہ نہ کرتے ہوئے اس کشمیری پنڈت کے گھر کی راہ لی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ بچارے سہے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اور لاش کے ارد گرد آنتو بہا بہا کر بے حال ہو رہے ہیں۔ میں نے لڑکی کی لاش کو اٹھو کر ایک کشتی میں رکھوایا اور جھنڈے سے نیچے ششان گھاٹ تک پہنچانے کے لیے گیا۔ میرے ساتھ لڑکی کے کچھ رشتے دار بھی آخری رسومات میں حصہ لینے کے لیے آئے۔ جب ہم دریا سے گزرے تو مسلمانوں نے مجھے کشمیری پنڈتوں کے

ساتھ دیکھ لیا۔ مزاج بگڑے ہوئے تھوٹے ہی۔ اُن سے دیکھا نہ گیا اور انہوں نے مجھ پر آواز سے کسنا شروع کر دیے۔ میں نے اُن کو نظر انداز کر دیا۔ اور اُس وقت تک واپس نہ آیا جب تک چتا خاموش نہ ہوئی۔ اس واقعے کی خبر بعد میں کشمیری پنڈت حلقوں میں پھیل گئی اور اُس کا بہت اچھا رد عمل ہوا۔

اس وقت مسٹر جاردین امن و قافوں کے ذمہ دار تھے۔ میونسپل کمیٹی میں مسلمانوں کا ایک وفد اُن سے ملا۔ اور اُن کے سامنے فسادات سے متعلق حقائق اور اپنا نقطہ نظر رکھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ فسادات کی ابتدا کشمیری پنڈتوں نے کی اور وہی اس پرتیں چھڑکنے سے پہلے یہ مجھ بیٹھے تھے کہ فسادات ہوتے ہی شہر میں ہندو ڈوڈو گرہ فوج پھیل جائے گی اور وہ فوج کے ذریعے مسلمانوں کا قافیہ تنگ کر میں گے۔ ہمیں بھی یہی کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم نے جاردین صاحب سے درخواست کی کہ ہمارے پروردے تعینات کیے جائیں اُن میں نصیحت مسلمان ہوں اور نصیحت غیر مسلم۔ تاکہ دونوں فریقوں کو حفاظت کا احساس ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ مسلم آزار منسوہ دھرے کا دھراہ گیا۔ پنڈت صاحبان کے بھٹکنڈے کسی حد تک اُٹے پڑنے لگے۔ کیوں کہ وہ تین دن تک گھروں سے باہر نہ نکلی سکے اور مسلمانوں سے دُودھ، مہزی، ترکاری، گوشت وغیرہ حاصل نہ کر سکے۔ آفکار وروہ صلح و صفائی پر آمادہ ہو گئے۔ اور ہم نے بھی اُن کی اس پہل کا غیر متقدم کرتے ہوئے دوستی کا ہاتھ تھام لیا۔ مسلم نمائندوں کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کی اپیل شائع ہوئی۔ جس پر کشمیری پنڈت راہنماؤں نے بھی دستخط کیے تھے۔ دوسرے دن میری سرکردگی

میں مسلمان اور ہنڈرت لیڈروں نے شہر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ ہم نے جگہ جگہ جلسے منعقد کیے جن میں ہندو مسلم بھائی چارے کے موضوع پر تقریریں کیں۔ خوش قسمتی سے ہماری یہ کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ امن وامان قائم ہو گیا اور ہنڈرت اور مسلمان پھر اپنی روایات کے مطابق ہندو و مسازین کر رہے لگے۔

▲▲▲

(۲۰)

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں

مولوی یوسف شاہ اگرچہ ہندو مسلم فسادات کے بعد ابھرنے والے ماحول میں مسلم کانفرنس کے پہلے سالہ اجلاس میں شریک ہونے کے لیے آئے لیکن ان کا دل اس جماعت میں نہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی تھی کہ ان کی عائدانی اجارہ داری پر ضرب پڑی تھی۔ اور اب مسلمانان کشمیر ان کی طرف رہنمائی کے لیے نہ دیکھتے تھے۔ اس کے برعکس میری ذات لوگوں میں احترام کے زیادہ جذبات پیدا کرتی تھی اور میرے جلسوں میں ان کے اجتماعات سے زیادہ لوگ شامل ہوتے تھے۔ مولوی صاحب تھے تو ایک سادہ منش اور شریف انسان مگر ان کو بچی پڑھانے والے حکومت میں بھی تھے اور ہندوؤں میں بھی۔ یہ لوگ عوامی تحریک کو کمزور کرنے کی ایک ہی تدبیر سمجھتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دی جائے میرا واعظ یوسف شاہ صاحب ان کے کہنے سننے میں آگئے۔ دلوں میں فساد کا بیج پڑ گیا۔ اور بہت جلد برگ و بار لائے لگا۔

میرا واعظ صاحب کی چھوٹے میرا واعظ یعنی میرا واعظ بھوانی کے ساتھ بھی چٹک۔ رہتی تھی۔ ان کے آثار تو آپس میں بھائی بھائی تھے۔ لیکن بعد میں انفرادی

مفاوات نے انہیں ایک دوسرے کا رقیب اور حریف بنا دیا تھا۔ میر واعظ کلاں یعنی یوسف شاہ صاحب کے پیرو کو بڑا کہلاتے تھے اور دیوبندی مکتب خیال سے زیادہ نسبت رکھتے تھے۔ میر واعظ خود یعنی ہمدانی صاحبان کے پیرو بڑے کہلاتے تھے اور یہ ”فرنگی محل“ لکھنؤ کے خیالات سے زیادہ نزدیک تھے۔ عقائد کے پھولے پھرنے اختلافات کو یہ خوب ہوا دیتے تھے اور اس طرح اپنے اپنے عاشقوں کو کٹ مروتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ باعث تنازع تھا کہ منبر حبشی ہٹا دیا جائے یا نہ ہٹا دیا جائے؟ کیا چھوڑیں اور شیرینی بانٹ دی جائے یا بیسے یا پھینک دی جائے؟ قربانی کے جانوروں کی ہڈیاں پھینک دی جائے یا نہیں یا دفن کر دیں یا نہیں؟ و علیٰ ہذا امتیاس۔ اپنی غیر ضروری اور غیر اہم باتوں کو اچھال کر ان کے پیروکار برسر پیکار رہتے تھے۔ معاملے نے اس قدر طول کھینچا کہ حکومت وقت کو ان دونوں میر واعظوں کے لیے عہد کا ہوں کا بخوار کرنا پڑا۔ جات مسجد پر بڑے میر واعظ اور خانقاہ متعلیٰ پر چھوٹے میر واعظ کا حتیٰ فائز تسلیم کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں اہل سنت و اہل حدیث جماعت کا بھگوا بھی کافی زور و شور سے چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اہل حدیث اہل سنت و الجماعت کی کسی مسجد میں نماز کے لیے جاتا تھا اور رفع یدین یا آئین بالجہر کا مرتکب ہوتا تھا تو اس کو مسجد کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا جاتا تھا اور مسجد کی چٹائیوں کو تزکیہ کے طور پر دھویا جاتا تھا۔ عدالتوں میں مقدمے دائر ہوتے تھے اور غیر مسلم ججوں کے سامنے مسلمانوں کی قابل تعظیم مذہبی کتابیں مثلاً صحیح بخاری، مشکوٰۃ اور حدیث و فقہ کی کتبیں ہی کتابیں پیش کی جاتی تھیں اور اس میں کوئی شہرم مصوب نہ کی جاتی تھی۔

احمدی اور غیر احمدی کا بھگوا تو تھا ہی اور وہ فتنہ و فساد کا بڑا سبب تھا۔ اہل تشیع ایک طرف تو شیعوں سے بیزار تھے اور دوسری طرف اُن کا آپس میں بھی تضاد تھا۔ اور وہ بھی کئی گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ الغرض مسلمانوں کا شیرازہ ہمیشہ قوم مکمل طور پر بکھر چکا تھا۔ اور حکومت وقت کی اس صورت حال سے چاندی ہی چاندی تھی مسلمانوں کو اپنے حقوق اور اپنی بہبودی کے لیے سوچنے کا موقع ہی کہاں ملتا تھا۔ اُن کے رہنما آپس میں دست بھرجمان رہتے یا قوم کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشی حالت سدھارنے کے پابچیلے؟ ان حالات میں اُس وقت تک کسی قومی تحریک کا خیال لانا محال تھا جب تک کہ قوم کے اُن منتشر اجزا کو کسی نہ کسی طریقے سے ایک لڑی میں نہ پروا جاتا۔ چنانچہ ہم نے اسی کام کو ہاتھ میں لیا اور اس میں خواجہ غلام احمد رشتائی نے میرا ہاتھ بنایا۔ رشتائی صاحب اُن مسلم نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے انجمن شریعۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ سند کی تھی۔ حکومت نے ایک معمولی شکایت پر انہیں تیس روپے مہاجریشن پر ریٹائر کر دیا تھا۔ وہ کافی ذہین تھے اور سرسبز کے ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے اُن کا سرسبز کے طبقہ آمرانہ سے گہرا تعلق تھا۔ تحریک کی ابتداء میں جب ہم نے شہر کی جامع مسجد اور دیگر مقامات پر عام جلسے کرنا شروع کر دیے اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہماری تقریریں سننے کے لیے آنے لگے تو مسلم عوام میں جوش و خروش کی بڑی خوش کن کیفیت پیدا ہونے لگی۔ قدرت نے مجھے خوش گلوئی کی نعمت سے مالا مال کیا تھا۔ میں قرآن مجید کی مقدس آیات اور علامہ اقبال کے دکنش اشعار بہت خوش الحانی سے پیش کرتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کشمیری کھلم کھلا اپنے سینے میں جیوس آہ و فغان کو باہر لاکر ایک سنگین پارہے تھے۔ میرا یہ طرز عوام کو

بہت بھاگ گیا تھا۔ صدیوں کے بعد مسلمانوں کے دبے جذبات ایک نغمہ اور نالربن کر بہہ رہے تھے۔ اس لیے میری ذات بہت جلد مقبول عام ہو گئی۔ شیر کشمیر زندہ باد کے نعرے ہر گئی بلکہ ہر گھر میں بلند ہونے لگے۔ مولوی احمد اللہ کے گذر جانے کے بعد میر واعظ کلان کے خاندانے میں میر واعظ عتیق اللہ اور ان کے بعد میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ کا نام آتا تھا۔ ان کو اپنا چھٹا بیٹا رکھنا بہت سے لیے بہت فردی تھا کیوں کہ اس خاندان کا کشمیر میں کافی اثر و رسوخ تھا۔ اگر وہ تمام فائدہ روش اختیار کرتے تو ہم یقینی طور پر گھائے میں رہ جاتے۔ خوش قسمتی سے مولوی یوسف شاہ صاحب نوجوان تھے۔ تحریک خلافت کے دوران وہ دیوبند میں طالب علم رہ چکے تھے۔ اور اس تحریک کا اثر قبول کر چکے تھے۔ مولوی یوسف شاہ کو ہماری تحریک سے بھی ہمدردی تھی۔ اور اُس نے اپنے بزرگوں کو ہماری طرف مائل رکھا۔ تحریک زور پکڑی گئی۔ اور ہم نے حکومت کے کہنے پر گیارہ نمائندے چن لیے۔ نمائندے نچلتے وقت یہ حکمت عملی ملحوظ خاطر رہی کہ ہر طبقہ خیال کے نمائندے شامل کیے جائیں۔ دونوں میر واعظ نمائندوں کی صف میں آ گئے۔ لیکن ان کی رقابت کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کا غد پر دستخط کرنا ہو تو دونوں میں سے کوئی اپنے حریف کے دستخط کے نیچے دستخط کرے پر ناکادہ نہ ہوتا تھا۔ اور دونوں کا اصرار ہوتا تھا کہ وہی پہلے دستخط کرے۔ ہم نے اس مصیبت کا علاج یہ نکالا کہ کاغذ کی ایک ہی سطر میں ایک میر واعظ صاحب دائیں اور ایک بائیں جانب دستخط کیا کرے۔ راقم الحضور سب سے نیچے دستخط کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھے اپنی روٹی ٹوٹی، جو میں ان دونوں پہنا کرتا تھا، ان کے پاؤں میں ڈالنا پڑی کہ وہ اپنے نجی مسائل کو تحریک کے مسائل سے الگ رکھیں۔ مولوی یوسف شاہ

کو میرے مقابلے میں عوامی سطح پر جو کمزوری محسوس ہوئی اُس نے ان کو اور بھڑکا دیا۔ حکومت تو ان کی رگ انا پر ہاتھ رکھ چکی تھی۔ اُس نے انہیں زور آزمائی کرنے کے لیے اگسا شروع کیا۔ خود میر واعظ کے حامیوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کے مفادات حکومت سے اشتراک کی پالیسی میں ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔ ان میں شال کے ایک مشہور تاجر خواجہ غلام محمد پنڈت بھی تھے۔ انہوں نے ہی حکومت کے ساتھ میر واعظ کی درمیان داری کی اور خود میر واعظ کو ایک آخری محرکہ آرائی کے لیے آمادہ کیا۔ وہ کبھی مجھ پر قادیانیت کا الزام لگا دیتے اور کبھی نصرتیت کا جس کے ثبوت میں وہ ریش اور لباس کی دلیل پیش کرتے تھے۔ بعد میں میرے طرفدار فیروز میر واعظ کے پیروکار بکرا کھلانے۔ اور دونوں کے درمیان میدان کارزار گرم ہوتا رہا۔ یہ فائدہ جی آج بھی کسی دیکھی صورت میں موجود ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ وہ خاندانی وجاہت اور حرص و بوس کا لالچ ہے۔ جو اس خاندان کے افراد کو لائق ہو گیا ہے۔ یہی اس خاندان کا دائرہ رسوخ سکڑ جانے کا باعث بنا ہے۔ اور اب تو اس کے پیروکاروں شہر کے چند حصوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ اپنی دیرینہ اینٹ الگ مسجد بنانے کے ذمے ہی ان کی یہ حالت بنا دی ہے۔ بقول اقبال۔

قوی ناداں چند کلیوں بر قناعت کر گیا

درنگش میں علاج تنگی دامان بھی ہے

۳۰ جنوری ۱۹۴۷ء کا دن تھا۔ میر واعظ محمد یوسف شاہ خاندان نقشبندیہ میں وعظ خوانی کے لیے تشریف لے گئے۔ اور وعظ خوانی کے دوران ہی انہوں نے مجھ پر قادیانی عقیدے سے منسلک ہونے کا الزام عاید کیا۔ لوگ جاتے تھے کہ یہ بہت ان

تراشی ہے اور میرے عقاید سنی حنفیہ مسلک کے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مولانا کو ٹوکا۔ اس بات پر رزم کشی کی ذہانت آگئی۔ اور غافلان آپس میں ٹھٹھکا ہو گئے۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ کثیر یون دونوں "کٹھن گھری" کو مشاعرے کی طرح سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ان آتشبار میزائلوں کا خوب استعمال ہوا اور بہت سے بے گناہ اہل خانہ ہو گئے۔ اس طرح سے اس نئے فتنے نے سرسبز ملک لیکن ہم نے اس اشتعال انگیز سی کو نظر انداز کر دیا۔

اسی دوران مجھے پھر لاہور کا رخ اختیار کرنا پڑا۔ میں وہاں ایک تو مسلمان لیڈروں کے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کی رلے لینا چاہتا تھا۔ دوسرے ہمارے خلاف وہاں سرکاری ایجنسیاں اور راجاؤں و نواز ہندو پریس بورڈ ویگنڈا کر رہا تھا اس کا سلطان بھی کرنا چاہتا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۷ء کو عید الفطر کی تقریب تھی کہ کشمیر سے ایک قیامت نیز فتنہ انگیز مسلمان کی خبر آئی۔ بات یوں ہوئی کہ شہر کے حالات کے پیش نظر حکومت نے میر واعظ یوسف شاہ سے کہا تھا کہ وہ عید کے دن عید گاہ نہ جائیں۔ جہاں مولانا چھائی وعظ خوانی کریں گے اور مولانا چھائی کو کہا گیا تھا کہ وہ عید گاہ میں نماز پڑھیں۔ میر واعظ صاحبان نے اس موقع کو اپنی طاقت آزمائی کے لیے استعمال کرنے کے لئے کمر باندھی۔ مولوی یوسف شاہ عید گاہ پہنچ گئے۔ لیکن اپنے تعلق یعنی جامع مسجد کو کھلا چھوڑ گئے۔ مولانا چھائی نے اس کا فائدہ اٹھا کر جامع مسجد کے منبر سے وعظ خوانی شروع کر دی۔ نتیجہ معلوم تھا۔ مسلمانوں کے دو گروہوں میں بڑے خوفناک فسادات ہوئے۔ جس میں سینکڑوں لوگ مجبور ہو گئے۔ حکومت بھی شعلوں کو ہوا دیتی رہی میر واعظ یوسف شاہ کے حامیوں نے میر سے بیرونیوں کے ساتھ بھی حساب چمکانا شروع کر دیا۔ شہر میں

"شیر بکرا" تنازعے نے بڑی ناخوشگوار گروٹ لی۔ حکومت نے دونوں میر واعظ حضرت کا تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۰ کے تحت بلوہ کرنے کے الزام میں جلالان کر دیا۔ اور ان سے ایک ایک ہزار روپے کی ضمانت نیک جٹنی طلب کر لی۔ میر واعظ چھائی نے حکم کی تعمیل کی لیکن میر واعظ یوسف شاہ اس کو اپنی شان اور منصب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور شاید وہ یہ بھی خیال کرتے تھے کہ حکومت کے ساتھ ان کی جو ملی بھگت تھی، اس کے پیش نظر ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ لیکن انہیں گرفتار کر کے ۲۰ اپریل کو لاہور میں جیل پہنچا دیا گیا۔ ضمن اتفاق ملاحظہ ہو کہ جس دن میر واعظ یوسف شاہ کو گرفتار کر کے لاہور لایا جا رہا تھا اسی دن سے میں بھی میر مقبول گیلانی کے ساتھ جموں سے سرسبز آ رہا تھا۔ گد میں میر واعظ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بے چارے پہلی بار اس ٹٹے میں پھنسے تھے۔ اس لیے اس غار زار کے زائر راہ سے نادانقت تھے۔ اپنا دستہ تک لانا چھوڑ گئے تھے۔ میں نے گد میں ان سے رخصت ہوتے وقت اپنا ہتھوڑا، تولیہ اور صابن وغیرہ ان کے حوالے کیا۔ میر واعظ صاحب زیادہ دیر تک جیل میں تنگ نہ سکے اور ۳۰ مئی کو انہیں سرسبز لا کر رہا کر دیا گیا۔ ان کی رہائی کے بعد کشمیر میں امن رہا۔ کیونکہ شہر کے چند محلوں کے بغیر وادی بھر میں ان کا اثر و بروز غائب ہو گیا تھا۔ رہی وہی کسر انہوں نے چند ہی دنوں کے اندر پوری کر دی۔ مولوی غلام نبی مبارکی صاحب میر واعظ جماعت کے سرسبز اشخاص میں سے ایک تھے۔ انہوں نے چھتہ بل کی مسجد میں ایک بڑی نا عاقبت اندیشانہ اور اشتعال پھیلانے والی تقریر کی۔ جس کے فوراً بعد نعلبند پورہ میں ایک بلوہ ہوا اور ہمارے حامیوں میں سے ایک جوان محمد عسکری والی اپنی قیمتی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کا جنازہ اٹھا تو میں بھی جلوس میں شامل ہوا۔ اور دیکھتے

ہی دیکھتے ایک بڑا اجتماع ہو گیا۔ میں نے خروج کی تدفین کے بعد حاجی طے میں میر
 واعظ اور اُس کے حواریوں کی فتنہ انگیزیوں پر اُن کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ نتیجہ میں مجھے
 حواجہ غلام نبی گولکار، مفتی ضیاء الدین پونچھی اور بخشی غلام محمد کی معیت میں گرفتار کر لیا
 گیا۔ حکومت مجھ پر ہاتھ ڈالنے کے خطرناک عواقب سے واقف تھی۔ اس لیے شہر میں
 پھر دفعہ ۱۹-۱۸ نافذ کر دی گئی اور اخبارات جن میں مسلم کانفرنس کا ترجمان صدقات
 بھی شامل تھا کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو پہلے
 تو اُدھمپور جیل بھیج دیا گیا اور گرمیوں میں یہیں ٹوٹ کے ایک جنگل میں منتقل کر دیا گیا۔
 شکر کا وزن برابر رکھنے کے لیے دوسری جماعت سے منشی اسد اللہ وکیل اور کچھ
 دوسرے کارکنوں کو بھی دھریا لیا گیا۔ ہماری گرفتاری کے خلاف شہر میں مظاہرے
 ہوئے۔ امیر اکمل اور مائیمہ میں حکومت نے گولی چلا دی۔ اُدھر شیر بکر افساد بھی
 زوروں پر تھے۔ حکومت نے فساد زدہ علاقوں میں تعزیری پوکیاں قائم کیں۔
 لیکن ستم ظریفی ملا خطہ ہو کہ ہندو اور سکھوں کے ساتھ ساتھ میر واعظ وقت شاہ
 کے حامی بھی جرمانے سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔ حکومت کے اس حکم نامے کا متن
 بے حد دلچسپ ہے۔

”حضور مبارک آج بہادر نے منظور فرمایا ہے کہ تعزیری چوکی چھ ماہ کے لیے
 مائیمہ میں قائم کی جائے اس کے اخراجات ایک ہزار آٹھ سو اٹھائیس روپے
 ہوں گے۔ اور یہ رقم اُن اشخاص سے وصول ہوگی جو ہندو، سکھ اور مذہب
 یوکت شادی مسلمان ہوں گے۔“

اب جلی جیل سے باہر آگئی تھی اور میر واعظ صاحب کے سر پرستوں کے
 اصلی چہرے ابھی ہوں گے سامنے آگئے تھے۔ عوام میں اس جانبزدانہ اور سراسر

انتقام گیرانہ حکم کا بڑا شدید رد عمل ہوا۔ اور عوام نے پھر احتجاجی تحریک شروع کی۔
 وار کوئل کا قیام پھر عمل میں لایا گیا۔ اور خانقاہ متعلیٰ میں تقاریر کا ایک سلسلہ شروع
 ہوا۔ اب کی بار اس قدر لوگوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کیا کہ
 حکومت عاجز ہو گئی اور اُس نے انہیں جیل لے جانے کے بدلے سرسری سماعت
 کے بعد کوڑے مارنے پر ہی اکتفا کرنا موزوں نہیال کیا۔ اُدھر مسلم کانفرنس کے
 قائم مقام صدر شیخ عبدالحامید اور دوسرے اصحاب نے راستے عامہ کو منظم کرنے کے لیے
 دوروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ حکومت کو پچھسر
 معقولیت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ہمیں، راکٹ سٹروں کو ٹوٹ سے رہا کیا گیا۔
 ۱۵ اگست کی شام کو رہا ہونے والے رہنماؤں کے استقبال میں حضوری باغ میں جلسہ
 ہوا۔ جس میں غیر مسلموں کی بڑی تعداد بھی شامل تھی۔

ہماری رہائی کے بعد حکومت نے پھر تحریک کی تیز دھار کو کند کرنے کے لیے
 مسلمانوں کے اغراق کو شدید بنانے کے لیے چالیں شروع کیں۔ اُن کے ہاتھ میں
 ٹُرپ کا ایک تیسے مولوی یوسف شاہ۔ چنانچہ، اگست کی شام کو مولوی یوسف شاہ
 زیارت پر دستِ پیچھے صاحب واقع سرائے بالا میں داخل ہوئے اور غوغائی کے لیے تشریف لے گئے۔
 انہیں کسی نے بلایا نہیں تھا۔ بلکہ اس علاقے کے باشندے اُن کے آنے سے
 ناراض ہو گئے۔ اس لیے مولوی صاحب اپنے ساتھ اپنے سامعین کی بڑی تعداد بھی اپنے
 قلعے ہی لے آئے۔ جن میں مشورات کی بھی بڑی تعداد شامل تھی مسلمانوں
 کے دو گروہ ٹکرائے۔ خود میر واعظ صاحب کو پولیس بڑی مشکل سے جوم کے
 غیض و غضب سے بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ میر واعظ صاحب کے حامی
 اپنی گلیوں میں اس سپاہی کا بدلہ چکانے پر کمر بستہ ہو گئے۔ حکومت کے کارندے

بھی اُن کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اس طرح اندرون شہر کے علاقوں میں لوٹ مار اور مار پیٹ کے واقعات پیش آئے۔ اپنے اپنے مضبوط گڑھوں میں فریق جماعت کی خوب خبری جاتی تھی۔ جہاں کہیں جماعت نظر آیا، تاڑنے والے نے فوراً آواز لگائی ”یاعلیٰ“ اس کا جواب یوں ہوتا تھا ”مللی“ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اُس کی پگڑی جھین لی جاتے۔ چشم زدن میں پچارے نرغ میں آئے ہوئے شکار کی پگڑی غصا ب ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ”حیدری“ کے نعرے کا جواب ”چادری“ سے دیا جاتا تھا۔ اور شخص مذکور کی چادر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس فتنے کے امان کی زد میں میرے بڑے بھائی مرحوم شیخ محمد مقبول بھی آ گئے۔ وہ ایک علاقے سے گزر رہے تھے۔ جہاں مولوی یوسف شاہ کے حامیوں کا غلبہ تھا کہ اُن پر حملہ کیا گیا۔ اور بڑی مشکل سے اُن کی جان چھوٹی۔ اس لڑائی نے ایسی خوفناک صورت اختیار کی کہ شہر بھر نے اپنی بیویوں کو ایس بنا پر طلاق دی کہ اُن کے مانگنے والے ایک یا دوسرے فریق کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مولوی یوسف شاہ ظاہر داری کے نقاب سے باہر آ گئے۔ انہوں نے جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر کے آزاد مسلم کانفرنس کے نام سے اپنی جماعت قائم کی۔ خواجہ عبدالرحیم بانڈے، ہشتی سدا اللہ دیکل، حضرت محمد زور، ہشتی سدا اللہ سوکالی پورہ، غلام محمد ملک عرف ماہر برہڑو، کنہ کدل، میر وافظا، غلامان کے خاص عقیدت مندوں ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے آزاد مسلم کانفرنس کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کیا اور خواجہ عبدالسلام دلال میر وافظا کے شیر خاص بنے رہے۔

آزاد مسلم کانفرنس کا پہلا اور آخری اجلاس جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ شیر

پارٹی نے اس کانفرنس کا مذاق اڑانے کے لیے ان ہی تاریخوں پر ایک اور کانفرنس بلائے کا اعلان کیا۔ جو بعد میں ”شورہ“ (نئے نواں) کی کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں بھی مندوبین شریک ہوئے اور خوب تقریریں کی گئیں۔ الغرض یہ دور مسلمانوں کے لیے انتہائی تفریق و انتشار کا دور تھا لیکن انتشار کٹھا ہری صورت کے پیچھے قدیم و جدید کی آویزش نہایت واضح طور پر دیکھی جاسکتی تھی۔ ہر سانحہ جب پڑانے اور فرسودہ خول کو توڑ کر نئے نظریات کی جانب لپکتا ہے تو پڑانے اور نئے کی کشمکش صرت ایک لازمی ہی نہیں بلکہ لا بدی امر بھی بن جاتی ہے۔ شاید مولانا رومی نے اسی امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہر بنائے گندہ کا باداں گنشد

اول آن بنیاد را ویران گنشد

مطلب یہ ہے کہ جب تک قدیم تعمیر ٹھٹھائی نہ جائے جدید تعمیر کے لیے راستہ ہموار نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم نے بڑی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں میں اُس نازک مرحلے پر چھوٹ نہ پڑے۔ لیکن تاریخ کی جدلیاتی قوتیں ہم پر خندہ زن رہیں۔ مولوی یوسف شاہ اگرچہ ذاتی طور پر کچھ پڑھے لکھے بھی تھے لیکن وہ جس طبقے کی ترجمانی کرتے تھے۔ اُس کے مفادات پر نئی بیداری سے جھٹ پڑتی تھی۔ لہذا وہ اُس طبقے کے نشان بن گئے اور اُن کے طبقائی کردار نے انہیں شفاء الشانیہ کے ریلے کو رکمانے کے لیے آمادہ کر دیا۔ جس کے آغاز کے لیے انہوں نے بھی ابتدا میں کوششیں کی تھیں۔ مگر جو اپنے فطری بہادری میں اب اُن کے مفادات کے لیے خطہ بن گیا تھا۔ مسلمان اس کشمکش کو شعوری طور سے نہ بھی مگر وجدانی سطح پر پہچانتے تھے۔ انہوں نے محدود دائروں سے نکل کر بڑے مفادات کی پاسداری

کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح سے میر واعظ صاحب اس دھارے میں بہہ کر رہ گئے۔
 آدھر حکومت اور عوامی تحریک کے دشمن بھی افزائی اور انتشار کے رجحانات کو تقویت
 دے رہے تھے۔ لیکن تاریخ کی ناگزیر منطق نے حکومت اور نہ میر واعظ صاحب کی
 تباہی تھی اس نے وقت کے تقاضے کا ساتھ دیا اور آزاد مسلم کانفرنس تحریک آزادی
 کے جھگڑوں کے اجتماع کے متعادلت قرار پائی۔ بعد میں میر واعظ صاحب اور ان
 کے حامیوں نے مخالفت روپ دھار کر کے تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔
 لیکن کشمیری عوام اپنے عمل سے انہیں یہی جواب دیتے رہے۔

بہر رنج کہ خواہی جا مہ می پوشش

من انداز قدرت دای ششنام

لیکن اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

آدھر مسلم کانفرنس کی تنظیم کا ڈھانچہ سارے ملک میں پھیل رہا تھا۔ اور اس
 کے پرچم تلے عوام کی عظیم اکثریت سخاوت اور آزادی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسی
 دوران مولوی محمد اکبر، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سمیع مسعودی، محمد تقی بھٹی
 بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، راجہ محمد اکبر سیرپور، مولوی عبداللہ بساکھی، حاجی
 دلہا الدین، غلام قادر بانڈھے پونچھی جیسے اصحاب اس کی صفوں میں نمایاں
 ہوئے اور اس کی تنظیم میں جڑ گئے۔ بخشی غلام محمد کو رضا کار دستے کی قیادت سونپی
 گئی جن کے لیے خاص وردی بھی مقرر ہوئی اور بینڈ باج بھی ملگوا گیا۔

مسلم کانفرنس کا دوسرا سالانہ اجلاس ۱۵-۱۶-۱۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو میرپور میں
 ہوا۔ اور اس کی صدارت کا اعزاز بھی میرے حصے میں ہی آیا۔ ریاست کے
 اطراف و اکناف سے مندوبین نے اس میں شرکت کی۔ میرے خطبہ صدارت

میں آزادی تحریر پر پابندی، پھیلنا اسمبلی کو تشکیل نہ دینے، مسلمانوں کو سرکاری
 ملازمتوں میں تناسب کے حساب سے حصہ نہ ملنے، زراعت پیشہ اور مزدوروں کی
 غرت حکومت کی لاپرواہی اور کالے قانونوں کے نفاذ پر حکومت کو آٹسے ہاتھوں
 لیا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ اس ذہنیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کے درمیان
 اتحاد کی ضرورت ہے۔ میں نے اسی موقع پر ”اتحاد زندگی ہے اور تفرقہ موت“
 کا نعرہ بھی بلند کیا۔ میں نے اپنے خطبے میں غیر مسلموں کو بھی عوامی تحریک میں حصہ
 لینے کی دعوت دی اور کہا۔

”مسلم کانفرنس کے پیش کردہ مطالبات صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں
 ہیں۔ بلکہ ان سے ریاست کا ہر فرقہ مستفید ہو سکتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ
 آپ اپنے ہم وطن مسلم بھائیوں سے مل کر اس قومی اتحاد کو مضبوط بنانے کے لیے
 آگے نہ آئیں۔“

اجلاس میں شرکت کے لیے ہم نے کشمیریوں کے مرقی، محسن اور کشمیریوں
 کی حالت زار پر آئیں بھانے والے عظیم شاعر حضرت علامہ اقبال کو بھی دعوت دی
 تھی۔ دعوت کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے میرے نام جو خط لکھا تھا اس کا
 عکس کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ البتہ انہوں نے اس خط میں ایک ماہر نباض
 کی طرح ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے
 آپسی اختلاف حل نہ کر لیں اس وقت تک کامیابی حاصل کرنا مشکل ہوگی۔

مسلم کانفرنس سے اتحادیوں کی ملکہ کی نے کچھ اور شگونی کھلائے۔ سرگرم
 میں بینک مینز ایسوسی ایشن مرزا آباد کے خلیے سے مسلم کانفرنس کو بھانے کے لیے
 وجود میں آئی تھی۔ اس ذیلی انجمن کا جوں و کشمیر مسلم کانفرنس سے تو اتفاق تھا

لیکن اس کے نوجوان رہنما مولانا محمد سعید سہوڑی کی قیادت میں اپنا وجود منوانے کے لیے بے قرار تھے۔ میں مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے بعد لاہور چلا گیا تو مینز ایسوسی ایشن نے ایک مسلمان اسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس حکیم حبیب اللہ کی تشریف کو بہانہ بنا کر بڑی سخت ایجینڈیشن شروع کر دی۔ دار کونسل قایم کی گئی اور تقریر بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ادھر ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء کے عید کے دن حکومت نے احتیاط کے طور عید گاہ میں ڈنڈا پولیس تعینات کر دی۔ اور میر داغظ محمود مولانا چھلانی صاحب کے عالی مسجد میں داخلے پر پابندی لگادی۔ رینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو موقع ہاتھ آیا اور اس نے اس اقدام کو مذہب میں مداخلت قرار دے کر ایجینڈیشن تیز کر لی۔ حکومت نے مولانا مسعودی اور اڈا کے اساتذہ صدر الدین مجاہد، محمد حقول، بی بی وغیرہ کو ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیا۔ شہر میں ۱۹-۱۰ میں نافذ کر دیا گیا۔ میر داغظ چھلانی کو سپاہی تقریریں کرنے سے منع کیا گیا۔ لیکن وہ بڑھاپے میں کفنی پہن کر اس حکم کی خلاف ورزی کے لیے اسیج پڑے۔ انہیں بھی گرفتار کر کے لاہور جلا وطن کر دیا گیا۔ بخشی غلام محمد کو ریاضی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور خواجہ غلام فی الدین بھٹانی (زہرہ) خواجہ غلام فی الدین قرہ، خواجہ محمد یوسف قریشی کو خانقاہ مقلیٰ میں تقریریں کرنے کی پاداش میں بارہ سو روپے جرمانے اور ایک ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ صورت حال بگڑتی گئی اور پلوامہ میں پولیس کی گولیوں سے دو جن بھراؤ لکڑہا جل بن گئے۔ میں اس صورتحال کا تشویش و اضطراب سے مٹا کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے سیالکوٹ میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر لیا تاکہ حالات پر متحدہ دل و دماغ کے ساتھ غور کر کے آئندہ لاتعلو عمل طے کیا جائے۔ میری صحت اُس وقت کافی گر چکی تھی۔ میں تین سال

کے عرصے میں تین دفعہ قید کاٹ چکا تھا۔ جہاں مجھ سے سخت مشقت بھی کرائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جب جیل سے باہر بھی ہوتا اُس وقت بھی تحریک کے معاملات میں جسم و جان کی فکر بھول جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اور میرا وزن بھی گھٹ گیا تھا۔ میرا علاج معالجہ جاری تھا اور مجھے آرام کی صلاح دی جا رہی تھی۔ لیکن صورت حال کا تقاضا عمل اور سرگرمی تھی۔ بہرکت اجلاس طلب ہوا تو اُس میں بیس کے قریب ممبران مجلس عاملہ نے شرکت کی۔ جن میں چودہری غلام عباس بھی شامل تھے۔ اکثر ممبران مجلس بدل کر ریاست سے باہر آئے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ نوجوانوں نے جو ایجینڈیشن شروع کی ہے اُس کو ختم کر دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ نوجوانوں کے غلغلے جذبات کا احترام کرنے کے باوجود یہ ایک حقیقت تھی کہ اس ایجینڈیشن سے اصل معاملات سے توجہ ہٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ نوجوانوں نے جس طور مسلم کانفرنس کی رضامندی کے بغیر ہی ایجینڈیشن شروع کی تھی وہ بھی تقابلی نقطہ نظر سے کوئی قابل تعریف بات نہ تھی۔ اور عذر تھا کہ اس مثال کی پیروی میں آہستہ آہستہ انتشار پسند عناصر سر اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اور تحریک کا اجتماعی دھارا کمزور ہو جائے گا۔ لیکن حکومت نے جو منظم رواج رکھے تھے اُس نے مجلس عاملہ کے اکثر ممبران کو جذباتی بنا دیا تھا۔ اور اس لیے میری صلاح کے برخلاف درکنگ کمیٹی نے اپنے آپ کو برخاست کرنے کا فیصلہ کر لیا اور تمام اختیارات ایک ڈیپٹی کمشنر کو سونپ دینے کی صلاح دی۔ مجھے کہا گیا کہ میں ڈیپٹی بننا قبول کر لوں۔ لیکن میں چونکہ اس طرز عمل کو درست نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ پیش کش منظور نہ کی۔ چنانچہ کانفرنس کے جنرل سیکریٹری چودہری غلام عباس کو ڈیپٹی بنا کر سربراہ روانہ کر دیا گیا۔ چودہری صاحب نے

سربراہ میں وزیراعظم کا لون سے خط و کتابت کی اور ذمہ دار اسمبلی کا قیام اور گلیٹنی کیشن کی سفارشات پر عمل درآمد کرنے پر زور دیا۔ لیکن کرنل کا لون نے ہچکچاہٹ دکھائی تو چودھری صاحب نے ہول نافرمانی کا حکم دے دیا۔ ایجنٹین شروع ہوا تو حکومت نے پھر ظلم و جبر روا رکھا اور چودھری صاحب کو گرفتار کر کے چھ مہینے کی سزا سنائی گئی۔

اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ لاہور کے اخبارات تحریک کشمیر کے واقعات کو خوب اُچھال رہے تھے۔ میر واعظ احمد اللہ ہولائی ایک وجہ شخصیت کے مردِ زرگ تھے اور جلاوطنی کی محبت نے اُن کے اراد گرد ایک ہالہ سا بن دیا تھا۔ لوگ اُن کے پاس عقیدت سے آتے اور پُرسش احوال کرتے۔ ایک دن انہیں علامہ اقبالؒ سے گفتگو کرنے کا خیال آیا۔ میں حضرت علامہ کے پاس جاتا ہی رہتا تھا۔ میں نے اُن سے وقت لیا اور مولانا صاحب کو ساتھ لے کر حضرت علامہ کے دولت کدہ پر پہنچ گیا۔ علامہ موصوف نے سرودھ جوکر مولانا کی تنظیم کی اور اُن کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے۔ مولانا صاحب نے اپنا ذکر کھڑا سنانا شروع کیا تو علامہ موصوف کے باطن کا شاعر بیدار ہو گیا۔ انہوں نے مولانا سے مخاطب ہو کر کہا ”کتنا بہتر ہوتا اگر آپ جلاوطنی کو قبول کرنے کی بجائے سرزمین کشمیر پر ہی ڈٹ جاتے اور اپنے سینے پر زخم کھا کر شہید ہو جاتے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ جن مصائب کی داستان آپ یہاں سنا رہے ہیں، ان میں کمی ہو جاتی۔ کیوں کہ بزرگوں کی قربانی نجات کا باعث ہوتی ہے۔“ میر واعظ صاحب سے تو کچھ جواب نہ بن پڑا لیکن اُن کے چہرے پر ملال کے آثار نمایاں ہو گئے۔ جب ہم علامہ سے رخصت ہو کر نکلے تو مولانا نے دل کی بھڑاس علامہ موصوف کو چلی گئی سنانے

سے نکالی۔ کہنے لگے ”خود تو بے روزہ ہیں۔ چار پائی پر بیٹھے ٹھاٹھے سے حق پر رہے ہیں اور تجھے کہتے ہیں کہ سینے پر گولی کیوں نہ کھائی۔ کوئی اپنا ہوتا تو پھر دیکھتا یہ مشورہ کیسے دیتے؟ مولانا کی اس برافروختگی پر میرے من میں لڑو بھٹوت رہے تھے۔ لیکن میں نے اُن کا قصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا کہ ایسی باتوں پر عقدہ کرنا آپ کے شایان نہیں۔

اُدھر حکومت نے اسمبلی کے لیے انتخابات منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اپریل کے تیسرے ہفتے میں ریگولیشن نافذ ہوئی۔ ۱۹۹۱ء شائع ہوا۔ جس میں مجوزہ اسمبلی کے اختیارات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی رنگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی تحریک سے توجہ ہٹ گئی اور ایجنٹین سرور پرٹنے لگا۔ میں نے سیالکوٹ میں اپنے اُن ساتھیوں سے جو ابھی گرفتار نہیں ہوئے تھے، مشورہ کر کے اعلان کر دیا کہ اسمبلی کا موجودہ ڈھانچہ اگرچہ ہماری توقعات سے بہت کم ہے، تاہم ہمیں تدبیر سے کام لینا چاہیے اور انتخابات میں حصہ لے کر حکومت اور دنیا پر واضح کر دینا چاہیے کہ مسلم کانفرنس کی طاقت کتنی ہے۔ میں اپریل ۱۹۹۲ء میں سربراہ چلا آیا تو میرے فطرتاً ہی کو میرے ساتھیوں نے قبول کر لیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ چودھری غلام عباس کی جو اُس وقت اُدھپور جیل میں سزا کاٹ رہے تھے، بغیر موجودگی میں اس فیصلے کا اعلان کیوں کر کیا جائے۔ میں اُن سے تبادلہ خیالات کرنے کے لیے اُدھپور چلا گیا۔ لیکن چودھری صاحب میرے ہم خیال نہ بن سکے۔ میں واپس آیا اور تنظیم کے سامنے سارے حالات رکھے۔ چنانچہ وسیع تر عوامی مفادات کے پیش نظر مسلم کانفرنس نے ہول نافرمانی کی تحریک واپس بلانے اور ایجنٹین لڑنے کا فیصلہ کیا۔ تنظیم کی جنرل کونسل نے اپنی ۲۱ اگست ۱۹۹۲ء کے اجلاس میں میرے اس عندیہ کی اتفاق رائے سے توثیق کر دی۔

میری شادی

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں میری شادی مشربائیکل ہیری نیڈو کی صاحبزادی اکبر جہاں سے ہوئی۔ مائیکل ہیری کا لاڈ کا نام ہیری نیڈو تھا۔ اور وہ سرنگ کے مشہور و معروف نیڈو ہومز کے مالک کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ نیڈو یورپ سے آئے تھے۔ اور پونہ، لاہور اور سرنگ میں ان کے ہومز اپنے زمانے کے بڑے معیاری نعمت کدے تصور کیے جاتے تھے اور وہ یورپی سیاحت سیلانیوں کی بڑی مرغوب قیام گاہیں تھے۔ ہیری نیڈو ٹنگرک میں واقع اپنے ہومز کی شاخ کے انتظام کے سلسلے میں اکٹر ٹنگرک وغیرہ جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کر کے شیخ احمد حسین کا اسلامی نام اختیار کیا۔ اور علاقہ ٹنگرک کی ایک گوجر لڑکی میر جان سے شادی رچائی۔ انہی کے بطن سے اکبر جہاں پیدا ہوئیں۔ جن کے ساتھ قدرت نے مجھے رفاقت حیات کے رشتے میں جوڑ دینا تھا۔ اس نوع کے رشتے اگرچہ آسمان میں طے ہوتے ہیں لیکن اس کا ظاہری انتظام کرنے میں پونچھ کے منفعتی فائدہ دینے نے بہت بڑا حصہ ادا کیا۔ میں اگرچہ پہلے پہل اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے شادی کے

بندھن میں قید نہ ہونا چاہتا تھا لیکن دوست احباب نے میری صحت کی طرف میری توجہ دلائی اور کہا کہ شادی اور گھر کا سکہ میری جسمانی راحت اور ذہنی سکون کا باعث بنے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑی وجہ تھی جس نے مجھے شادی کرنے پر مائل کر دیا۔ میری مقبولیت اور شہرت اب عروج پر تھی۔ میری رہائش گاہ پر میرے معاون اور عقیدت مندوں کا رات دن تانتا بندھا رہتا تھا۔ مرد تو غیر بڑی تعداد میں آتے تھے لیکن عصب نازک کی تعداد بھی کچھ کم نہ ہوتی تھی۔ ان میں جوان رعنا و شیرازیں اور حسین و جمیل عورتیں شامل ہوتی تھیں۔ میں اس وقت شباب کی نازک منزل میں تھا جب کہ ہر ہر قدم پر لغزش کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ عمر کا وہ والہانہ دور ہوتا ہے جب کسی جھنکار اور کسی کھٹک سے آدمی کے اوسان نپٹا ہو جاتے ہیں۔ بقول اقبالؔ

ہے شباب اپنے ہو کی آگ میں جلنے کا نام

اس مرحلے پر اگر انسان حزم و احتیاط کا دامن نہ تھام لے تو وہ باہر تریا سے لفظی پستی کی تحت الٹی اٹک بیٹھ سکتا ہے۔ اسلام نے اس صورت حال میں بھری تقاضا کا خیال کر کے بیاب کا بے خطائے تجویز کیا ہے۔ میں نے بھی جلد از جلد شریعت کے اس حصہ کو اپنے ارد گرد حائل کرنے میں عافیت سمجھی۔ مبادا اس کی عدم موجودگی میں میرا قدم کسی آزمائش کے موقع پر ڈنگا ہٹ کا شکار نہ ہو۔ میرے پاس آنے والی خواہشیں جو شش مقننیت میں میرے کردوں کو چھوئیں، میرے ماتھے بلکہ زخموں کو چھوئیں اور میرے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر رکھ لیں۔ اس بے پناہ یلغار کو مناسب فاصلے پر رکھنے کے لیے نکاح سے بہتر ڈھال مجھے اور کوئی نظر نہیں آئی۔ شادی سے پہلے میری ہونے والی خوش دامن نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ گھر کے سبھی لوگ مجھ اس

ملح گوگرد کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے میں کوئی عجوبہ تھا۔ اور یہ کوئی حیرت انگیز بات اس لیے نہیں تھی کیونکہ لڑکی والے اُس شخص کو خوب جانچ پڑھ لینا چاہتے ہیں جس کے ہاتھ میں وہ اپنی چھٹی بیٹی کی قیمت سو پھینے والے ہوں میرے ساتھ والی میز پر میری بھینے والی ساس اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ خیر و غیریت کے بعد جب لنگھو نے سفیدہ رُخ اختیار کیا تو میں نے اپنی ہونے والی بیگم کو خبردار کیا کہ جس شخص کے ساتھ اُس کا رشتہ طے کیا جا رہا ہے اُس کو اپنے مستقبل کے متعلق کچھ علم نہیں ہے وہ ایک ایسے میدان میں سرگرم ہے جہاں کبھی تخت کی آرائش ہوگی اور کبھی تختے کی آرائش۔ کبھی مالی شان مکانات میں رہائش ہوگی اور کبھی تنگ تاریک کوٹھریاں ہوں گی۔ اس لیے اُسے بغور سوچنا چاہیے کہ وہ اپنی موجودہ آرام زندگی کو ایک غیر یقینی زندگی پر قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوں گی یا نہیں؟

میری بیوی کی تربیت اُن کی والدہ نے ایک خاص مذہبی ماحول میں کی تھی۔ میری ساس ایک پارما اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ اور انہوں نے اپنی بیٹی کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے خاص دل چسپی لی تھی۔ میری رفیقہ حیات نے اگرچہ مری کے ایک انگریز مشنری کا فونٹ کالج میں سینئر کمبرن تک تعلیم حاصل کی لیکن گھر پر انہوں نے قرآن و حدیث کا درس بھی حاصل کیا تھا۔ اُس نے علاقہ پٹن موئخ نہال پورہ کے مشہور درویش اور خدا دوست بزرگ محمد الدین صاحب سے بھی بیعت کی تھی۔ محمد الدین صاحب کاٹل سے کشمیر آئے تھے۔ آپ انگریزی میں ایم اے تک پڑھے ہوئے تھے۔ اور اسلامیہ باقی اسکول سرینگر میں ہیڈ ماسٹر بن گئے تھے۔ بالآخر انہوں نے دنیا کے لہو و لعب سے دل برداشتہ ہو کر درویشانہ زندگی اختیار کی۔ محمد الدین صاحب میری بیوی

پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ اور انہوں نے انہیں اپنی بیٹی سمجھ کر اُن کی روحانی تربیت کی تھی۔

جب اکبر جہاں نے اپنی ماں کے ساتھ بیٹھ کر میری بات سنی تو اُن کی اسلامی تربیت نے بوش دیا۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ”آپ اسلام کے لیے کام کر رہے ہیں اور میں بھی اس راہ میں آپ کے ساتھ ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں!“ اُن کے جواب سے میری تشفی ہوئی اور رشتہ طے پا گیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس ملاقات کے فوراً بعد مجھے پھر گرفتار کر کے آدھوہر میں قید کر دیا گیا۔ جیل سے میں اکبر جہاں کے نام لکھی اور تشفی کے خطوط بھیجا کرتا تھا۔ گرمیوں میں زمیں سے آدھوہر سے ٹوٹ کے ایک بگلے میں منتقل کر دیا گیا۔ اور پھر چھ ماہ کی نظر بندی کے بعد جیل سے رہا کیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد بالآخر میرا نکاح بعض ایک لاکھ روپیہ جرے کے ہمراہ نیڈو کے رہائشی مکان واقع گلہرگ میں اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اکبر جہاں کے ساتھ طے پایا۔ نکاح میرا عطا احمد اللہ ہولانی نے پڑھا۔

شادی کے بعد میں نے کچھ وقت پچھوارہ کے مکان میں گزارا۔ جہاں میں کراہے پر رہتا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک سسرال میں ٹھہرا۔ جن کا رہائشی مکان نیڈوز ٹوٹل کے عقب میں واقع تھا۔ میرے بھائی صاحبان نے میری رہائش کے لیے صورہ میں اپنے آبائی مکان کے ساتھ ہی ایک نیا مکان تعمیر کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا اور بالآخر میں مستقل رہائش کے لیے ادھر منتقل ہو گیا۔ سرری کے موسم میں میری بیوی اکثر لاہور جاتی ہیں اور اپنے والدین کے ساتھ قیام کرتی تھیں۔ جب حالات مجھے اجازت دیتے ہیں بھی لاہور جا کر سسرال والوں کے یہاں ہی قیام پذیر ہوتا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ظاہر کیا۔ میری بیوی میرے لیے گھر

اور گھر سے باہر ایک بچی اور دھن کی بچی رفیقہ حیات ثابت ہوئیں۔ انہوں نے مجھے پہلی بار گھر کے سکون سے آشنا کرایا۔ جو والدہ مرحومہ کی رحلت کے بعد میرے لیے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے میری پر آشوب اور ہنگامہ خیز زندگی میں امکان کی حد تک ایک قرینہ اور ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میرا حال تو اُس وقت یہ تھا کہ

نہ ہاتھ باگ پر نہ نہ پاسے ریگاب میں

لیکن بیگم صاحبہ تو کل اور تنہا کے ساتھ سب کچھ بھینچ رہیں۔ اس کے علاوہ جب آزمائشوں کا وقت آیا تو میری بیوی کا استعمال میرے لیے طاقت کا ایک اہم مرتبہ بن گیا۔ انہوں نے میری غیر ماضی میں گھر کے شیرازہ کو حتی المقدور سالم رکھا چونکہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی دختر تھیں۔ لہذا مشکل اوقات میں اُس کے مانگے والے بھی اُس کے آٹے آئے۔ میں قید و بند یا دوروں وغیرہ کے سلسلے میں گھر سے دور رہتا تو بھی میری بیوی کبھی حریفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔ بلکہ مہر و رشک کے ساتھ اپنے اور بچوں کی زندگی کے معمولات قائم رکھتیں۔ مگر میرے بچوں کی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اس کا دردش مجھے اپنے کندھوں پر لینا چاہیے کیونکہ مجھے قومی معاملات کی نگاہ دور میں اُن بچاروں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا ہے۔ یہ میری بیوی کی لگن اور خوش اسلوبی کا نتیجہ ہے کہ میرے بچوں نے بڑے ہی ناموافق حالات کے باوجود اپنی ترقیق کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ بیگم صاحبہ کا ترجیح نماز اور روزے اور مذہبی فرائض کی انجام دہی کی طرف ہے۔ اور یہ میرے اپنے مزاج کی افتاد کے موافق ہے۔ اس لئے وہ صحیح منوں میں میری رفیقہ حیات ثابت ہوئیں۔ میری بیوی کے استعمال کے اصل جوہر اُس کی اُن سرگرمیوں میں کھلے جو اُس نے قومی معاملات میں میرا توجہ ہلکا کرنے کے لیے انجام دیں۔ بیگم صاحبہ

بنیادی طور پر ایک خدا ترس گھروں کی عاتق ہیں۔ جنہیں قرآن شریف کی تلاوت نماز اور دوسرے اسلامی معمولات کی ادائیگی میں سکون ملتا ہے اور جو اپنے بچوں کے بکھڑوں کو سنبھالنے میں مگن رہتی ہیں۔ لیکن میں قومی حالات کی جس لہر کی زد میں تھا بیگم صاحبہ اُس سے زیادہ دیر تک اپنا دامن نہ بچا سکیں اور وہ بھی اُن لہروں کے تھیلوں میں اُٹھیں۔ انہیں چاروں اچار زمان خلسے کو ترک کر کے میدانِ عمل میں کودنا پڑا اور ہمارے دوش بدوش صفت آرا ہو جانا پڑا۔ یہ اُس وقت ہوا جب میں زندان کی سلاخوں کے اندر بند تھا اور ساری تحریک پر آرام و مصائب کی یورش تھی۔ قومی مفادات کے تقاضوں نے انہیں اس قدر اپنی پیٹھ میں لے لیا کہ انہیں بقول شاعر اپنے پر دے کو اپنا پرچم بنالینا پڑا۔ ”کشمیر چھوڑ دو“ تحریک میں مہاجر ہری سنگھ اور اس کے پیرو نام چند کاک ہماری تحریک پر اپنی پوری قوت سے ٹوٹ پڑے تھے۔ اور وہ اس تحریک کا سارا دم خم توڑ دینا چاہتے تھے۔ اُس وقت بیگم صاحبہ نے گھر کی چلن کو استھایا اور گاؤں گاؤں گلی گلی پھر کر نا امید دلوں میں اُمید کے دیے جلائے لگیں۔ انہوں نے شہیدوں کے وارثوں کی دھڑاں بندھائی اور قیدیوں کے گھروں میں چولہا روشن رکھانے کے بہن کیے۔ جب مہاتما گاندھی ہم دے گرام میں کشمیر آئے تو وہ ہمارے گھر صورہ بھی گئے اور وہاں بیگم صاحبہ نے ہی اُن کا استقبال کیا اور اُن کو کشمیری عوام کے دکھ درد کی کہانی سنائی۔ مہاتما گاندھی نے کشمیر میں اپنی جو پارٹنر سجاوٹیں منقذ کیں اُن میں بیگم صاحبہ سے ہی تلاوت قرآن کرائی۔ جو وہ بڑی صحت اور خوش گلوئی سے کرتی ہیں۔ اُن ہی دنوں کشمیری عوام نے بیگم صاحبہ کی درد مندی ایثار اور ثابت قدمی کو دیکھ کر انہیں ”مادر ہریان“ کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا اور اس طرح بیگم کے کہنے میں اُن کے بچوں کے ساتھ

ساتھ سارا کثیر اور اس کے کبھی لوگ شامل ہو گئے۔ بیگم اس رشتہ دفا نہ رہے میں اپنی
 فرصت، اپنی آسائش اور اپنی عافیت سبھی سے بیگانہ ہو گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر
 پر قبائلی چڑھ آئے تو سترم سیدگان کی مدد کے لیے بیگم نے رید گراس کی تنظیم کی اور دن
 رات مصیبت زدگان کے آسوپھونچنے میں مصروف رہنے لگیں۔ انہوں نے جوں میں
 متوجہ عورتوں کی بازیابی اور بھائی میں بھی کافی بڑا کام کیا اور لیڈی مائونٹ بین ان
 کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد انہیں بخشی سرکار نے کثیر سازش
 کیس میں ملوث کر دیا۔ ان کو اگرچہ محرموں کی صف میں باقاعدہ شریک نہیں کیا گیا
 تھا لیکن اس کے باوجود ان کا نام ہر روز مکرر عدالت اور اخبارات میں گونجنے لگا۔
 اس کے علاوہ ان پر برسر عام حملے بھی کیے گئے اور انہیں اخلاق موزمغا ہرول کا ہدف
 بھی بنایا گیا۔ ایک باحیا اور مذہب پسند خاتون کے لیے یہ صورتحال کس قدر نفرت انگ
 ہو سکتی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ لیکن بیگم خدا کا نام لے کر یہ سب سہتی رہیں۔
 ان کے صبر و شکر نے پھر ۱۹۴۷ء کا وہ دن دکھایا جب درمیانی مدت کے اتفاقیات میں
 بخشی غلام محمد سرینگر سے لڑنے والے پارلیمانی انتخاب میں بیگم صاحبہ کے ہاتھوں ہٹ
 گئے۔ بخشی صاحب کو مرکز کی کانگریس ہائی کمان نے یقین دلایا تھا کہ وہ پارلیمنٹ
 میں آگئے تو انہیں مرکزی کابینہ میں شامل کیا جائے گا۔ بخشی صاحب نے اپنی تمام
 قوت میدان میں بھونک دی۔ میں ان دنوں دہلی میں جلا وطن تھا اور میرے کشمیر
 میں داخلے پر پابندی لگادی گئی تھی لیکن حکومت نے اپنے غور میں بیگم صاحبہ کے
 انور سوخ کا پورا اندازہ نہ کیا تھا اور ان پر اس پابندی کا اطلاق نہ کیا گیا تھا۔ میں
 نے کانگریزی محاورے کے مطابق مخالفین کے ذریعہ بکتر میں یہ جھوٹا سار شگ ف
 تک دیا تو اسی کے ذریعہ حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ ایک بدپھر

ذاتی عافیت بخشی سے بے نیاز ہو کر سرینگر علی جائیں۔ چنانچہ بیگم چپ چاپ سرینگر
 آئیں۔ انہوں نے ایک غیر معروف شخص شمیم احمد شمیم کی رعایت کی اور اس طرح سے
 بخشی غلام محمد کو اپنے شہر میں ہی شکست فاش ہوئی۔ یہ معرکہ بخشی صاحب کا وائزلو
 ثبات ہو۔ جاوٹ جت ہو گیا۔ اور یہی زخم سہلاتے ہوئے اگلے سال اس دلیرفانی
 سے کوپ کر گیا۔ لیکن بیگم صاحبہ کو بے سرو سامانی کی حالت میں یہ ایکشن لوکر کن
 مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح ناوک دشنام کا نشانہ بننا پڑا وہ ایک
 دلخراش داستان ہے۔ انہوں نے بڑی بہت سے مشکلات کا پانسہ پلٹ دیا اب
 یہ اور بات ہے کہ جس شخص یعنی شمیم احمد شمیم کو کامیاب کرنے کے لیے انہوں نے اس
 دھوکہ سہ وہ بھی بعد میں ان کا میری بن گیا اور اپنی ناوک اندازی سے بیگم صاحبہ
 کی ذات کو محفوظ درکھ کر اپنی سرشت کا سزاغ ویا ج

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اس رشتہ سے اللہ تعالیٰ نے میں سات اولادیں عطا کیں جن میں سے دو لڑکیاں
 چند ماہ کی عمر میں ہی وفات پا گئیں۔ باقی تین لڑکے اور دو لڑکیاں ماشاء اللہ چار
 سرمایہ حیات ہیں۔ میری پہلی اولاد ایک بچی تھی جس کا نام ہم نے خالدہ رکھا۔ خالدہ
 بچہ خاندان میں خواجہ غلام محمد شاہ سے بیاہی گئی ہیں اور خیر سے تین بچوں کی
 ماں ہیں۔ ان کے نام بالترتیب افتخار، منظر اور عالیہ ہیں۔ افتخار نے ڈاکٹری کی
 تربیت حاصل کی ہے اس کی شادی شہزادہ میں ہوئی اور اب وہ اعلیٰ تربیت
 کے لیے امریکہ میں ہے۔ میرا سب سے بڑا لڑکا فاروق ہے۔ میں اسلام کے
 خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی باسعادت زندگی سے بڑا متاثر رہا ہوں اور میں
 نے اپنے بڑے لڑکے کا نام ان ہی کے اسم مبارک کی مناسبت سے رکھا ہے۔ فاروق

بھی ایک ڈاکٹر ہے۔ اُس ایک انگریز قانون سے شادی کی ہے اور اُس کا ایک لڑکا عمر اور تین لڑکیاں تھیں، چنانچہ اس کا وہاں - فاروق مشہور میں پارلیمنٹ کے درمیانی عرصے کے انتخابات میں سرنگر سے کھڑا ہوا۔ وہ ملک بھر میں موجود پارلیمنٹ کے لیے واحد امیدوار تھا جسے بلا مقابلہ کامیاب قرار دیا گیا۔ میرے دوسرے لڑکے کا نام طارق ہے۔ اُس کا نام میں نے مراکش کی خاک سے اُسٹے والے مشہور اسلامی فاضل طارق بن زیاد کے نام پر رکھا ہے، جن کی شجاعت کے فضیل یورپ کی حکومتوں میں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔

طارق نے ایم۔ اے تک تعلیم پائی ہے۔ میرے قید و بند کے زمانے میں وہ یورپ کی خاک چھانٹ رہا اور کشمیریوں کے کڑا مقدمہ لڑتا رہا۔ اب وہ سرکاری ملازمت میں ہے۔ میرا تیسرا لڑکا مصطفیٰ کمال ہے۔ یہ اُن دنوں پیدا ہوا جب اتاترک مصطفیٰ کمال کے انتقال کے بعد اُن کی شہرت عروج پر تھی۔ اتاترک نے یورپ کے مرد بہادر "ترک" کو کوئی زندگی عطا کرنے اور پھر اُسے جدید روشنی سے بہرہ ور کرنے کے لیے جو جرات مندانہ کارنامے انجام دیے ہیں اُن کا ہیضہ متعین رہا ہوں۔ کمال اتاترک میں جسمانی اور اخلاقی بہادری کا بڑا نادار و متراز تھا۔ انہوں نے گیلی پولی میں ایتھریز کو میدان جنگ میں شکست دے کر اُن کے ناقابلِ تخییر ہونے کا مفروضہ غلط ثابت کر دیا۔ لیکن اگلے ملاوہ انہوں نے ایک فرسودہ اور رجعت پسند سماج کو توڑنے کے لیے جو بہادرانہ اقدامات کیے وہ اُن کی روشن نیامی اور اخلاقی جرات کی زبردست مثالیں ہیں۔ چنانچہ میں اپنے تیسرے لڑکے کی پیدائش کے وقت میل میں تھا اور وہیں سے میں نے اُس کے لیے مصطفیٰ کمال نام تجویز کیا۔ مصطفیٰ کمال بھی ڈاکٹر ہے اور اپنا وقت شہرگ میں میرے باغ و دیکھ بھال میں

گزارتا ہے۔ ثریا میری آخری اولاد ہے۔ اُس نے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کر لی ہے اس وقت گورنمنٹ زنانہ کالج سرنگر میں پریکٹس لیکچرار تعینات ہے۔ اُس کی شادی سرنگر کے معروف متوفانانہ کے چشم و چراغ ڈاکٹر محمد علی تومسے ہوئی ہے اور ان کی بیٹی نانکہ اپنی شوخی اور مصححوں مادہ شرارتوں کے سبب سارے کنبے کی آنکھوں کا تار بن چکی ہے۔ جب بھی ثریا کا ذکر آتا ہے تو میرے دل میں ایک ہلکے سی اٹھتی ہے۔ مجھے ۱۹۷۴ء کا وہ زمانہ یاد ہے جب میں دہلی میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا، اُس کی شادی اُن ہی دنوں ہوئی۔ مجھے اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔ ویسے بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے میں جیلوں میں رہا۔ ایک باپ کے جذبات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں جب اُس کی لاڈلی بیٹی کی شادی ہو رہی ہو اور اُس کو اپنے گھر سے دور رکھ کر اپنی بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پیرنے اور مصیبت کے دو بول کہنے کی مسرت سے بھی محروم رکھا گیا ہو۔

میری بیوی ۱۹۷۹ء کے درمیانی مدت کے پارلیمانی انتخابات میں سرنگر سے پارلیمنٹ کی ممبر چنی گئیں۔ لیکن جب وہ گھر سے دور دہلی میں رہنے لگیں تو تجھے اندازہ ہو گیا کہ اُن کے بغیر گھر کا بوجھ سنبھالنا کتنا مشکل ہے۔ میری صحت بھی پہلے جیسی نہ تھی اور بیگم کی غیر موجودگی میرے لیے جسمانی اور نفسیاتی دونوں اعتبار سے سوبانِ روح بننے لگی۔ بیگم نے میرا یہ حال دیکھا تو انہوں نے حالیہ پارلیمانی انتخاب میں پارٹی کا منڈیٹ قبول کرنے سے معذرت طلبا کر کی۔ اگرچہ اب بھی اُن کا اکثر وقت عوام اور اُن کے مسائل کے لیے وقف رہتا ہے لیکن صبح و شام وہ ہماری خبر گیری بھی کرتی رہتی ہیں۔ مسکین باغ سرنگر میں ہم نے فریب اور نادار بچوں کی بہبودی اور

تعلیم و تربیت کے لیے ”مکمل اطفال“ کے نام سے جو مرکز شروع کر رکھا ہے، وہ بیگم صاحبہ کی قوشہ کا خاص مرکز ہے اور اُن کی دن رات کی لگن سے یہاں ان بچوں کی کایا پلٹ گئی ہے۔

▲▲▲

(۲۲)

پیر جاسبھا اور اس کے بعد

میرے ساتھ میرے بہت سے رفقاء کو اندازہ تھا کہ جو اسمبلی اس کا نام پیر جاسبھا رکھا گیا تھا، تشکیل دی جا رہی ہے وہ محض ایک دکھاوا ہے تاکہ کشمیر کے عوام اور اُن سے زیادہ اُن کے بیرونی پھروں کا متنبہ نہ کیا جائے لیکن ریاست اور حکومت کا اہم امور ان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ مگر ہم خود حکومت کے جہتا کردہ فورم کو استعمال کر کے دنیا پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس کس طرح ریاستی علوم کی اکثریت کی نمائندہ، حاکمت ہے اور اس کی آواز میں کتنی طاقت ہے۔ ریاست کے اندر اور باہر مفاد خصوصی رکھنے والے عناصر بار بار مسلم کانفرنس کو مخصوص نمائندوں کی فہرست قرار دے رہے تھے۔ اب خود حکومت کے ہاتھوں اس جھوٹ کو تار تار کرنے کا موقع ہمارے سامنے تھا۔ البتہ ہم نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ واقعی انتخابات کو نرا من اور خیر رکھانی کے ماتوں میں منعقد کرنا چاہتی ہے تو سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔ اور دارو گیر کی پالیسی کو ترک کیا جانا چاہیے حکومت نے اول اول تو اس مطالبے کو منظور کرنے کی حامی بھری لیکن جب کانفرنس نامزدگی

داخل کرنے میں صرف ایک یا دو دن رہ گئے اُس نے اپنے وعدے سے منہ پھیر لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ حکومت کا اسمبلی قائم کرنے کا اقدام محض ایک فریب تھا اور اب وہ کسی طرح عوام کے اصل نمائندوں کو اس نام نہاد اسمبلی تک پہنچنے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی۔ لیکن یہ وقت سیدہ کو بی کام نہیں بلکہ عملی اقدام کرنے کا تھا۔ ہم نے مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو تباہوں کے ذریعے تاکید کی کہ وہ نزاکتوں میں جاسے بغیر بے دھوکہ کاغذات نامزدگی داخل کر لیں۔ ہماری توقعات کے خلاف اپنی ہمارے کارکنوں نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور وہ میدان میں ڈٹ گئے۔ آخر سر بیگز میر واعظ یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس نے ہمارے امیدواروں کے خلاف اپنے نمائندے کھڑے کر لیے اور اس طرح تحریک کی پھوٹ کو رسمی شکل میں منکمل کر لیا۔ میں نے خدا کا نام لے کر مسلم کانفرنس کی انتخابی قہم شروع کی اور بہت جلد انتخابی قہم کا پانر مسلم کانفرنس کے حق میں پلٹ گیا۔ میر واعظ کے حامیوں نے یہ صورت دیکھی تو شیر بکرا خانہ سے کی چنگاریاں بھڑکانا شروع کر دیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہم اس سے بڑے مقاصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ان اشتعال انگیز لوگوں کو نظر انداز کر کے اصل مقصد کے حصول پر ہی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ میں نے شہر میں جگہ جگہ جلسے کیے اور عوام کو ذہن نشین کرایا کہ لڑائی کے خطوط اور حدود کیا ہیں۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۷ کو ووٹ ڈالے گئے۔ جب نتائج کا اعلان ہوا تو دوست دشمن سبھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ شہر کی پانچوں نشستوں پر مسلم کانفرنس کے امیدواروں نے میر واعظ صاحب کے نامزدگان کو بڑی طرح پچھاڑ دیا تھا۔ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ میر واعظ صاحب اور اُن کے خاندان کا ایک صدی سے زیادہ عرصے سے سر بیگز میں ڈھکا بختا رہا تھا اور اُن کے ساتھ عوام کے

ایک بھاری طبقے کو مذہبی نوعیت کی عقیدت تھی۔ لیکن تحریک آزادی نے تین چار سال کے ہی عرصے میں عوام کے شعور کو اس قدر بانگ کر دیا تھا کہ وہ میر واعظ صاحب کے بھرم میں نہ آئے اور انہوں نے انہیں قومی معاملات میں مسترد کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھ جیسے نوجوان نے جسے چار سال قبل کوئی جانتا نہیں تھا، اُن کے سباد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اصل میں عوام اصل مسائل سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہیں میری قربانیوں، میرے غلوں اور میری قومی درد مندی کا اعتبار آگیا تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میر واعظ صاحب تحریک کی صفوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ اس کے بعد میر واعظ صاحب کا دائرہ اثر اُن کی رہائش گاہ واقع لاچوری گدل کے ارد گرد چند محلوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور وہیں اپنی ذہنی بجائے لگے۔ آزاد مسلم کانفرنس کے ایک امیدوار خواجہ سعد الدین مشال تھے۔ جو میرا رکن لے کر لے ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب تحریک کے اولین قارئین میں سے تھے اور انہوں نے تحریک کی آبیاری کرنے میں پہلے پہل بہت کام کیا تھا۔ وہ ایک رئیس تھے اور اُن کی سماجی حیثیت بھی قابلِ لحاظ تھی۔ وہ کچھ عرصے سے مسلم کانفرنس سے کھینچے رہتے تھے اس میں کسی حد تک اُن کی عافیت کوشی کے احساس کا بھی دخل تھا لیکن دراصل وہ مسلم کانفرنس میں نئی قیادت کے اُتھار سے ذہنی طور پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور معمولی رشتوں کا پہاڑ بنا کر جماعت سے دور ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے میر واعظ خاندان سے خوشی کا رشتہ بھی جوڑا اور انہیں آخر کار میر واعظ صاحب کی ہم نشینی میں ہی چارہ کار نظر آیا۔ اگرچہ میں اُن کا کافی احترام کرتا تھا۔ یہ کہیں جب ہماری جماعت کے خلاف غم ٹھونک کر سامنے آگئے تو مقابلے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ غلام محمد صادق کو جو بہت مالوکے قورہ خاندان کے چشم و

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے خیر میں شورش سے گھبرا کر قیوناز فہ کردیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرسنگھ سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پرقافرنکے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنکے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیام صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان بائٹیل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پست نڈت کا نٹیل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گویوں سے بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گھنچا بج گیا ہے۔ میرا عظم مولوی محمد توسعت شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانہار میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک پارما اور قلند رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے دن میں داؤدِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو پر ایک خاص قسم کا پھل لگا کر، جسے کشمیری میں "نار شو" کہتے ہیں لگے۔ "نار شو" کڑی کے لیے سے ڈنکے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

چار تھے اور علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے تازہ تازہ وارد ہوئے تھے، اُن کے خلاف کھڑا کر لیا۔ تحریک کے تیز دھارے نے شال صاحب کے جے جے پاؤں بھی اکھاڑ دیے اور مسلم کانفرنس کی عوامی مقبولیت کو ڈرامائی انداز سے نمایاں کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے نہ صرف حکومت کے بدترین اندیشوں کو درست ثابت کر دکھایا، بلکہ اُس نے داخلی طور پر اشتراک پسندوں اور جھگڑوں کو بھی انحراف کا پورا پورا مزہ چکھا دیا۔

پر جاسمجا میں اکثریت ہمارا ہے کہ نامزد کردہ ممبران کی تھی، اور مسلم کانفرنس کے ۱۹ منتخب ممبر اس تعداد کا صرف ۲۸ فی صد تھے۔ لیکن اُن کی نمائندہ حیثیت دو پہر کے سورج کی طرح روشن تھی۔ مسلمان نمائندگان کی صحیح تعداد اگرچہ ۲۱ تھی لیکن میرپور کی نشستوں پر حکومت نے ہمارے امیدواروں کے کاغذات دھاندلی کر کے نامنظور کر دیے تھے۔ مسلم کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے میاں احمد یار خان کو اپنا لیڈر اور مرزا قنواغ افضل بیگ کو اپنا ڈپٹی لیڈر چن لیا۔ پر جاسمجا کا ہلکا جلاں مار اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ (اس اجلاس میں ہمارا جا ہری سنگھ نے بھی شرکت کی، اور وزیر اعظم کالون نے اسمبلی کے اختیارات سے متعلق شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ مسلم کانفرنس کے ایک بزرگ صورت اور صاحب حیثیت ممبر حاجی احمد اللہ شہزاد نے اسمبلی میں ایک عوامی گیت، جو اُن دنوں کشمیر میں زبان زدِ خلاق تھا، ترتیم سے پڑھا۔

گھینسی کمیشن سے مقصود پایا

یہ برب رنگ لایا میاں شیر کشمیر

یہ ایک عجیب اسمبلی تھی اور بقول غالب اس کی تعمیر میں

متضرر تھی اک صورت خرابی کی

ایک بھاری طبقے کو مذہبی نوعیت کی عقیدت تھی۔ لیکن تحریک آزادی نے تین چار سال کے ہی عرصے میں عوام کے شعور کو اس قدر بانگ کر دیا تھا کہ وہ میر واعظ صاحب کے بھرم میں نہ آئے اور انہوں نے انہیں قومی معاملات میں متروک کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھ جیسے نوجوان نے جیسے چار سال قبل کوئی جانتا نہیں تھا، اُن کے سباد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اصل میں عوام اصل مسائل سے آگاہ ہو چکے تھے، انہیں میری قربانیوں، میرے غلوں اور میری قومی درد مندی کا اعتبار آگیا تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میر واعظ صاحب تحریک کی صفوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ اس کے بعد میر واعظ صاحب کا دائرہ اثر اُن کی رہائش گاہ واقع باجوری کدل کے ارد گرد چند عتقوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور وہیں اپنی ذہنی بجائے لگے۔ آزاد مسلم کانفرنس کے ایک امیدوار خواجہ سعد الدین شال تھے۔ جو میرا کدل سے کھڑے ہو گئے تھے خواجہ صاحب تحریک کے اولین قائدین میں سے تھے اور انہوں نے تحریک کی آبپاری کرنے میں پہلے پہل بہت کام کیا تھا۔ وہ ایک رئیس تھے اور اُن کی سماجی حیثیت بھی قابلِ لحاظ تھی۔ وہ کچھ عرصے سے مسلم کانفرنس سے کھینچے رہتے تھے اس میں کسی حد تک اُن کی عافیت کوشی کے احساس کا بھی دخل تھا لیکن دراصل وہ مسلم کانفرنس میں نئی قیادت کے اُتھار سے ذہنی طور پر سمجھوتہ نہیں کر سکے اور معمولی دشمنوں کا پہاڑ بنا کر جماعت سے دور ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے

میر واعظ خاندان سے خوشی کا رشتہ بھی جوڑا اور انہیں آخر کار میر واعظ صاحب کی ہم نشینی میں ہی چارہ کار نظر آیا۔ اگرچہ میں اُن کا کافی احترام کرتا تھا۔ لیکن جب ہماری جماعت کے خلاف غم ٹھونک کر سامنے آگئے تو مقابلے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ غلام محمد صادق کو جو بہت مالوکے قوہ خاندان کے چشم و

ہمارا جانے اپنی ذات میں قانون سازی کے تمام اختیارات محفوظ رکھے تھے۔ اس کے
اسمبلی کے منظور کردہ ان قوانین کو، جو اس کی پسند کے مطابق نہ آتے تھے، رد کر کے
کا حق تھا۔ وہ اسمبلی کے پاس کردہ کسی تجویز کو بھی کالعدم کر سکتا تھا۔ ہمارا جاکے اخراجات
اور خرچے سے متعلق کسی معاملے پر اسمبلی میں بحث نہ ہو سکتی تھی۔ ہمارا پاس بھی وقت کسی
بھی شخص کو کسی بھی غرض کے لیے اسمبلی کا رکن نامزد کر سکتا تھا۔ ان حالات میں یہ اسمبلی
کیا تھی محض ایک سراب تھا اور مسلم کانفرنس کے ارکان نے پہلے ہی اجلاس میں ان
گنجیم مسائل کے تدریجاً شروع کر دیے لیکن جیسا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندازہ
لگا لیا تھا۔ پھر بھی یہ تجربہ عوامی تحریک کے مقاصد کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ایک
قوابلی کی نمائندہ حیثیت کے بارے میں کسی کو غلط فہمی نہ رہی دوسرے یہ بات بھی
آشکارا ہونے لگی کہ حکومت اسمبلی کو صرف ایک کھلونے کے طور پر عوام کے دل بہلانے
کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اسے عوامی نمائندوں کی اختیار و اقتدار کے مسائل میں
آواز بلند کرنا ہرگز پسند نہ تھا اور اس آواز پر کان نہ دھرنا تو بہت دود کی بات تھی۔
چنانچہ جن سے منتخب ہونے والے بسکھ ممبروں اور بدھ سنگھ نے قواس کو برملا طور پر
ایک کھلونا اسمبلی قرار دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کو
چیلنج کرنے کے لیے اس کے افتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ بھی کیا تھا۔ یوان کے فرش پر
مسلمان اور ہندو نمائندوں نے جب اپنے اپنے نقطہ نگاہ کو پیش کیا۔ تو ان کے مابین غلط
فہمی اور بدگمانی کی دھند چھٹنے لگی۔ یہ احساس عام ہونے لگا کہ دراصل مقابلہ ہندوؤں
اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ قانون اور مظلوموں کے درمیان ہے۔ چنانچہ غیر مسلم
اور مسلم ممبران سب ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور آخر کار ۱۹۳۲ء میں یونیاں دیکھ
کر رنگ دھمکی کہ جنوں اور کشمیر کے لگ بھگ تمام منتخب ممبروں نے بیک وقت اور

ایک زبان ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اسمبلی سے واک آؤٹ کیا۔ اس وقت
صرف ایک ممبر پنڈت امر ناتھ کاک ہی ایسے رہے جو اس یک جہتی کے مظاہرے
سے الگ رہے۔

سرو شروع ہوئی تو میں نے میدانوں کا رخ کیا اور لاہور پہنچ گیا۔ اسی دوران
میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ جواہر لال حسب و نسب سے ایک
کشمیری تھے ان کے اجداد نے منٹن شاہ فرخ پور کے عہد میں کشمیر کے ناسازگار
حالات سے تنگ آکر ہجرت کی تھی اور شاہجہاں آباد یعنی دلی کے چاندنی چوک کے
نزدیک نہر سعادت علی خان کے کنارے رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ اسی نسبت سے
”نہرو“ پکارے جانے لگے تھے۔ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو ہندوستان کی
لنگا جی تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔ اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے فائدہ
نے ہندوستان میں تحریک آزادی کے لیے کام کرتے ہوئے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔
نہرو کو ہی صدارت میں ۱۹۴۶ء میں دلی کے کنارے کانگریس نے مکمل آزادی
کا نڈیوشن پاس کیا تھا۔ جواہر لال ہندوستان کے حریت پسند طبقے کے محبوب بن
گئے تھے اور علامہ اقبال جو سیاسی طور پر جواہر لال سے اختلاف رکھتے تھے، ان کے
اس رول پر ایک کشمیری کی حیثیت سے فخر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اپنی وفات سے کچھ
ہی عرصہ قبل انہوں نے اپنے سیاسی حلیت محمد علی جناح کو سیاست کار اور جواہر لال
کو محب وطن کہہ کر یاد کیا تھا۔

جواہر لال کے دلی میں نے علامہ اقبال کی ہی طرح کشمیر کے لیے گہری تڑپ
دیکھی۔ وہ اپنی مادری وطن کو ظلم و جہالت سے نجات دلانے کے لیے بے تاب تھے۔
میں ان کے علاوہ بھی بہت سے قوم پرست لیڈروں سے ملا اور مجھے یوں لگا کہ

جب میرے خیالات ان دوستوں کے موافق نہ ہوتے تھے اُس وقت تو ان کی مخالفت قابلِ فہم ہو سکتی تھی لیکن بظاہر جب حالات کے متعلق میرے خیالات و نظریات اُن کے موافق بھی ہوتے ہیں یہ دوست پھر بھی تصحب کی سینگ لگا کر شک، بدگمانی اور بغض و حسد کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ کر نکال ہی لیتے ہیں ہر حال میرے بیان مندرجہ بالا کا پنجاب کے بہت سے عقلمن میں کافی گرم جوشی سے غیر مقدم ہوا اور بہت سے اخبارات، راہنماؤں اور رائے عامہ کے معتبر اداروں نے اسے ریاستی سیاست کی بنیادیں وسیع کرنے اور قوم پرست سیاست کی طرف ایک بڑا قدم قرار دیا۔

لاہور سے واپس لوٹنے پر میں نے اپنے نقطہ نظر کو مسلم کانفرنس کے سامنے رکھا۔ کچھ تردد رکھنے والی آوازیں ضرور بلند ہوئیں لیکن اکثر فریقی میرے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے تھے۔ یہ کسی حسن اتفاق یا عارضی مصلحت کوئی نہ نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے لیے تحریکِ حریت کی ابتدا سے ہی بنیادیں ڈالی گئی تھیں۔ ہم نے کسی بھی وقت پٹنہیں سوچا تھا کہ ہم اپنے غیر مسلم حمایتیوں کی قیمت پر اپنے حقوق حاصل کریں گے بلکہ ہم ایک نئے کشمیر کا تصور اپنے اقلیتی برادران کی بہبودی کے مواکرہ ہی نہیں سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہم نے بار بار ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بدقسمتی سے ریاست کے اندر اور باہر مفاد و مصلحتوں کی وجہ سے اس جارحانہ انداز سے مرگرم تھا کہ انہوں نے کچھ دنوں تک غیر مسلم حضرات کو غلط فہمی کی دھند اور بدگمانی کے غبار میں گم کر کے ہم سے دور رکھا۔ لیکن اب صورتِ حال واضح طور پر بدل رہی تھی خود ہندوؤں اور سکھوں میں ایسے روشن خیال عناصر پیدا ہونے لگے تھے جو تحریک کے امکانات کا بخوبی اندازہ لگا رہے تھے انہیں بھی یقین ہو گیا تھا کہ ریاست کے تمام لوگوں کی نجات مل بیٹھ کر کام کرنے اور ایک جوکر جدو جہد کرنے میں ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو

کشمیریوں کی نجات تنگ دائروں سے نکل کر ایک قومی دھارے میں شہر آڑہ بند ہونے میں ہی متصف ہے۔ میری ملاقات اُن ہی دنوں مشہور قوم پرست مسلمان لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچھلوسے بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بزرگ بھی کشمیر سے ہی اگر امرتسر میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ بھی اپنے وطن و لاف یعنی کشمیر کے لیے درد مندی کے جذبات رکھتے تھے اور انہوں نے بھی میرے جذبات و خیالات کو تقویت پہنچائی۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہی مکان پر ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کیا جس کو کشمیر کی تحریک آزادی کا ایک اہم موڑ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اور باتوں کے علاوہ کہا،

”کشمیر میں فرقہ وارانہ کھینچاؤ بہت حد تک پنجاب کے فرقہ پرست لیڈروں کے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ ہمارے اندر دینی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کریں۔ میرا آئندہ پروگرام کانگریس کے اصولوں پر کام کرنا ہوگا اور میں مغربی وطن جا کر اس قسم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں جو قوم پرور نظریے کی حامی ہو۔“

میرے اس بیان سے کشمیر کی سیاسی مضامین آتشِ چل چ گئی۔ پنجاب کی کچھ مسلمان جماعتیں تو پہلے ہی اپنے تمسبات و تضادات کی وجہ سے میری بری بن چکی تھیں اب اُن کی رونق کچھ اور بڑھ گئی۔ حد تو یہ ہے کہ کشمیر میں ہندوؤں کے ایک گروہ نے اس پر نظر اور برأت منداہ اور مخلصانہ بیان کو مکرو فریب اور حکمت عملی سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُن دوستوں کی ذہنیت اُس کے بعد بھی بہت کم بدلی۔ انہوں نے مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف نہیں کیا کہ پہلی بار بے زبان کشمیری عوام کی ترجمانی کا حق ادا کرنے میں اپنا فرض ادا کیا۔

بتایا تھا کہ پر جا سمجھا میں ہندو اور مسلمان دونوں کے تئیں حکومت کے رویے نے بھی دونوں کو ایک دوسرے کے دکھ دوسے آشنا کرنے میں اہم حصہ ادا کیا تھا۔ پتلی بات تو یہ ہے کہ ایک متحدہ اور سیکورلیٹ فارم قائم کرنے کا بیج اسی دن بویا گیا تھا جب جولائی ۱۹۴۷ء میں پنڈت پریم ناتھ بزاز سے میری ملاقات چشمہ شاہی کے باغ میں ہوئی تھی۔ بزاز صاحب میرے ہم سن اور ہم عصر ہیں۔ اور میں انہیں اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ گلینسی کمیشن میں ایک ممبر کی حیثیت سے انہوں نے جس تدریس، معاملہ فہمی، دوراندیشی اور جرأت مندی کا ثبوت دیا تھا اس نے میرے دل میں ان کے لیے عزت پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو بتایا تھا کہ مسلمان کو ہندو اور مسلم کے تنگ غافوں میں بانٹنے سے مشکلات گھٹنے کی بجائے بڑھتی جائیں گی۔ اور انہوں نے اپنے مسلک کے لیے غیر مقبولیت کا عذاب بھی سہا تھا۔ چشمہ شاہی کی ملاقات میں مجھے یوں لگا کہ ان کا دل بھی میرے دل کی طرح ایک ہی تال پر دھڑکتا ہے یہیں ابتدائی گفتگو کے بعد اتفاق رائے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں وقت نہیں ہونی کہ کشمیر کی تحریک کو با معنی، با مقصد اور کامیاب بنانے کے لیے اسے ترقی پسندانہ اور جمہوری بنیادوں پر چلانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ ہم اس غرض کے لیے وقتاً فوقتاً تبادلہ خیال کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ہم نے تحریک کو قومی بنیادوں پر چلانے کے لیے ایک اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ”اردو ہفتہ وار“ ”بھرد“ کا جسے میں نے بزاز صاحب کے ساتھ مل کر جاری کیا تھا، پہلا شمارہ مشہور قوم پرست رہنما ڈاکٹر سیف الدین چکولہ نے جنوری بارغ کے ایک جلسے میں جاری کیا۔ بزاز صاحب نے جہاں اس کی دفتری اور ادارتی ذمہ داریاں سمجھائیں وہاں میں اخبار

کے لیے مالی وسائل بہم کرنے میں لگا رہا۔ مولانا محمد سعید مسعودی اخبار کے دوسرے مدیر تھے۔ اخبار نے ملک میں قومی نغیاں اور ترقی پسندانہ خیالات کے پھیلاؤ میں کافی کام کیا۔ اور عوام میں کافی مقبول بھی ہوا۔ لیکن یہی ایک اور آویزش کا نقطہ آغاز بھی ثابت ہوا۔ پنڈت بزاز کو جو بھی محسوس ہوا کہ اب اخبار خود کفیل ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اسے میری امداد کے بغیر جاری رکھ سکتے ہیں تو ان کے من میں چور پیدا ہو گیا۔ انہوں نے حیل بہانے کھڑے کر کے مجھے سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ میں بھانپ گیا کہ ان کے من میں مایا موہ نے مزید لاپسہ۔ لیکن میں ہرگز اس بات کا روادار نہ تھا کہ یہ معمولی بات ہمارے باہمی تعلقات میں رخنے کا باعث بن جائے۔ اس لیے میں نے اخبار سے علیحدہ ہونے اور اس کی ملکیت مکمل طور پر بزاز صاحب کے ہاتھ سونپ دینے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر شمعونا آٹھ پشیں ہمارے مشترک دوست تھے۔ انہوں نے اخبار کے اثاثے کا تخمینہ لگا کر مجھے ایک طے شدہ رقم ادا کروائی اور پنڈت بزاز بلا شرکت غیرے اخبار کے مالک بن گئے۔ جس کو وہ بعد میں بڑی دیر تک کامیابی سے چلاتے رہے۔

پنڈت بزاز ایک ہوشیار آدمی ہیں اور دھن کے کپے بھی۔ سیاسیات میں ایک وسیع نظر رکھتے ہیں اور سب استعداد حق و انصاف کے لیے آواز بھی بلند کرتے رہتے ہیں۔ مگر کسی اصول پر استعلا سے قایل رہنا وہ شاید کوئی خوبی تصور نہیں کرتے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری اصول زور ہے جس نے ان کی بہت سی خوبیوں کو گھٹا دیا ہے۔ بقول غالبؔ

فارت مگر ناموس نہ ہوگر ہو پس زر
کیوں شاہد گئی بارغ سے بازار میں آئے

اسی کمائی کی روشنی دہلی میں اُن کے دولت کدے کی شکل میں مجسم ہو کر ”گلاش آگر“ بن گئی۔ جب سرحد پار سے سیال چاندی کے سونے ٹنک ہو گئے تو اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ اور یہاں یہ تراشا کہ مارشل ایوب خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان میں بھارت ختم ہو گئی ہے۔ بزاز صاحب کی ریڈیو کی ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ شناسائی بھی اس پر جاتی مشورہ ”دولت“ سے وفا داری کی بنا پر ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں جب کانگریس نے انگریزوں کی جنگ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو انگریزوں کو اسے جبری ثابت کرنے کے لیے ہندوستانی اخباروں اور ڈھنڈور جیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں ایم۔ این۔ اے اور اُن کے ہم خیالوں کا گروہ منظم کرنے کا کام مل گیا۔ بزاز صاحب کی سونگھنے کی جس پیسے کے معاملے میں غضب کی واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ نادر موقع دیکھا تو فوراً اس جنگ زرگری میں ایم۔ این۔ اے کے ہتھیار بن گئے۔ حکومت ہند اُن کے اخبار کی ہزاروں کاپیاں خریدتی تھی۔ اور اس طرح ان کو مالا مال کر رہی تھی غرض بزاز صاحب نے سیاست میں ہمیشہ اشرافیہ کے نشان کو اپنے لیے بال ہٹا خیال کیا اور اس سے نباہ کرتے رہے۔

پینڈت بزاز نے کشمیر پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کا اپنی رنگین عینک سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاش وہ اپنی تحریروں میں ایک ناظرِ قرار اور صداقت پسند مؤرخ کا طرز اپناتے! مگر انہوں نے ہمیشہ واقعات و حالات اور شخصیات کو اپنے تعصبات کے آئینے میں دیکھ کر ان کے صحیح عودِ حال سے روک دیے ہیں۔ میری نسبت بھی انہوں نے جگہ جگہ غلط فہمی کی ہے اور تقریباً ہر جگہ مجھے اپنی پسند ناپسند کے رنگوں میں پیش کرنے میں پابندی دکھائی

چنانچہ اُن کی یہ کمزوری اتنی شہرت یافتہ ہے کہ اُن کے اپنے فرقے کے لوگوں نے اُن پر یہ الزام لگایا کہ اُن کے گھنسی کمیشن سے استغنیٰ دینے کی وجہ اُن کی اصول پرستی سے زیادہ مالی نقصان کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ گھنسی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے وہ مشاہدہ وصول کرنے کے حقدار تھے۔ اخبار ”بھارت دھرم“ سے میری ملازمت کی پشت پر بھی اُن کا یہی احساس تھا۔ اخبار کا بلا شرکتِ غیرے مالک بننے کے بعد انہوں نے کئی سیاسی میزبے بدلے۔ وہ نیشنل کانفرنس کی مخالفت اور میر واعظ یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس کی حمایت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کرتے رہے اور وہ بھی اس ڈھٹائی سے جیسے بھارت آزاد مسلم کانفرنس کا ترجمان تھا۔ مولوی صاحب کے پیروں کو بزاز صاحب کی یہ روش بڑی بھائی اور اُن کے حلقے میں اخبار کارانی مقبول ہوا۔ اس طرح سے بزاز صاحب سکون کی کھنک سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن میرے لیے یہ بات ایک اچھے سے کم دہجی کہ بزاز صاحب جو روشن خیالی اور سیکرل سیاست کے اس قدر سرگرم وکیل تھے کس طرح راتوں رات میر واعظ کی قدامت پسند جماعت کے ڈھنڈورچی بن گئے۔ بزاز صاحب نے بعد میں محمد علی جناح کے حق میں لکھنا شروع کیا اور دو قوی نظریے کے خود ساختہ وکیل بن گئے۔ وہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے خلاف خوب خوب نہر اُچھلاتے رہے بعد میں انہوں نے کسان کانفرنس کے نام سے ایک جماعت کو نیشنل کانفرنس کے خلاف کھڑا کرنے میں کافی سرگرمی دکھائی مگر یہ بیل بھی منڈے نہ چڑھ سکی۔ ۱۹۵۷ء میں جب ہم نے تحریک ”کشمیر چھوڑ دو“ شروع کی تو پینڈت بزاز نے اسے ”فٹنڈوں کی تحریک“ قرار دینے میں محمد علی جناح صاحب کی جی بھر کے ہمنوائی کی اور رام چندر کاک کے منظم کے عقیدے لکھے۔ بعد میں کشمیر پر پاکستان کے موقف کے حق میں کئی کتابیں اور رسالے شائع کیے۔ اور حکومت پاکستان سے خوب ہاتھ رنگ لیے چنانچہ

ہے لیکن چاڈو وہ جو سرچڑھ کر بولے۔ وہ بار بار اپنے بیانات کی تردید و تکذیب بھی کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے غیر سیاسی موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہاں اپنے قلم کی روانی دکھائی ہے۔ اس لیے میں نے ذاتی اختلافات کو نظر انداز کر کے جوں و کشمیر کچل اکادمی کے صدر کی حیثیت سے انہیں ۱۹۷۹ء میں اکادمی کا اعزازی فیلو بنایا۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات کسی نہ کسی رنگ میں جاری رہے لیکن ۱۹۷۹ء میں ان کا ایک خاندانی کام برکاری قواعد کی حد بندی کے باعث پورا نہ کیا جاسکا اور وہ مجھ سے بگڑتہ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ۱۹۷۹ء میں میرے خلاف قایم ہونے والے ”عظیم جتنا محاذ“ میں پھلانگ لگائی۔ انہیں اس وقت یہ قطعی طور پر یاد نہ رہا کہ وہ عمر بھر بے پرکاش نرائن، مراری ڈیسائی، بگبیرن رام، اٹل بھاری واجپائی وغیرہ کے خلاف بولتے اور لکھتے رہے ہیں۔ لیکن اتفاق سے یہ محاذ منہ کی کھا گیا اور اس کے ساتھ ہی پنڈت، راز راقوں رات سرینگر سے غائب ہو کر دہلی کے گلشن آگڑہ میں پھر پناہ گزین ہو گئے اور اب وہ وہیں سے غلط سلسلہ رپورٹوں پر مبنی کتابیں لکھ کر میرے ساتھ اپنی پرائیویٹ کو تازہ کرتے رہتے ہیں یعنی

کچھ نہیں ہے تو صداوت ہی سہی

▲▲▲

(۲۳)

کچھ تاریخ ساز واقعات

ادھر کشمیر میں ہماری تحریک وسیع سے وسیع ترمیم افوں کا احاطہ کر کے بچپن سے جوانی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی ادھر ملکی اور قومی سطح پر کچھ ایسے واقعات جنم لے رہے تھے جن کا ہماری آئندہ تاریخ پر بہت گرا اثر پڑنے والا تھا۔ ہندوستان میں جنرل صاحب ایک عرصے کی خاموشی کے بعد کانگریس کی نہایت جیتھ کو چیلنج کر رہے تھے اور مسلمانوں کو قومی دھارے سے الگ کر کے اپنی دوکان چمکا رہے تھے۔ جنرل صاحب کے ساتھ کانگریس میں اچھا سوک نہیں ہوا اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی انا (۱۹۵۵ء) اب کسی طرح بھی اپنا لوہا منوانا چاہتی تھی۔ جنرل صاحب اپنے آپ کو جہات گاندھی سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور سمجھتے تھے۔ اور کسی نہ کسی طرح قومی سطح پر ایک ممتاز مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت کے کانگریسی لیڈروں نے ان کے ارادوں کے استقلال کو نہ پہچانا اور کانگریس کچھ میں تنگ نظری کا جو میلان رہا ہے اس کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے نتائج بعد میں سارے برصغیر کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً سمجھنا پڑے، جو سستے تو کانگریسی کو تباہ نظری کے شکار لیکن مایوسی

میں ستر چنانچہ کی خودی کی شان کے ہتھے چڑھ گئے اور اسی تیز دھارے میں اپنا وجود بھربان کر کے اٹھے۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ ریاستوں کے تئیں اپنا نقطہ نظر واضح کر رہی تھیں۔ اور اس میں کانگریسی نقطہ نظر ریاستوں کے عوام کے حق میں اور مسلم لیگ طریقہ کار ریاستی راجاؤں کے حق میں ٹھیک رہا تھا۔ ہم پر بھی اس کا اثر ہوا اور ہم بے اختیار کانگریس کے دھارے کی طرف کھینچے چلے گئے۔

اُن ہی دنوں برطانوی دارالعوام نے ایک مسودہ قانون پاس کیا جس کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ مشعلہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت ہندوستان کو ایک وفاقی ریاست میں تبدیل کرنا قرار پایا۔ ایکٹ کے نافذ ہونے پر وائسرائے ہند نے ہندوستان کے پانچ سو سے زیادہ والیان ریاست کو دعوت دی کہ وہ چاہیں تو برٹش انڈیا کے صوبوں کی طرح اس وفاق میں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے تمام نوابوں، راجوں اور جہازوں کو تو اقتدار کی چاٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس وفاق میں شمولیت سے انکاری ہو گئے۔ جہاز جاہری سنگھ کا رد عمل بھی بعینہ یہی تھا۔ مسلم کانفرنس کا عندیہ اس سلسلے میں یہ تھا کہ اگر ریاست جوں و کشیر کو مجوزہ وفاق میں شامل ہونا پڑے تو اس میں تمام اندگی کا حق عوام کے ہتھے ہوئے نمائندوں کو ہی دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں اسی ایکٹ کے تحت کانگریس نے برطانوی ہند کے صوبوں میں پہلی ہندوستانی وزارتیں قائم کیں اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہی ایکٹ کشمیر کے ہند کے ساتھ اس مشروطہ افاق کی بنیاد بنا جس پر جہاز جاہری سنگھ نے دستخط کیے۔

۱۹۴۷ء میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ جس کی بازگشت اب تک ریاست کے معاملات میں سنائی دے رہی ہے اور جس نے بعد میں ایک عالمی اہمیت اختیار

کی ہے۔ یہ برطانوی حکومت اور جہاز جاہ کے درمیان ہنگامت کی ٹکرائی سے متعلق معاہدہ تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان کی سرحد پر واقع کشمیر سے اس لحاظ سے خاص طور پر بہت دلچسپی تھی کہ اس کی سرحدوں سے اُن کے دیرینہ حریف روس کی سرحدیں ملتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے انیسویں صدی سے ہی روس کے خلاف جاسوسی اور دوسری سرگرمیاں ریاست کی سرزمین سے ہی شروع کر رکھی تھیں جہاز جاہر نے سنگھ کے وقت میں تو یہاں روسی زبان سکھانے کا ایک خاص کتبہ کھولا گیا جس کا مقصد ان ہی سرگرمیوں کیلئے تربیت یافتہ جاسوس کو تیار کرنا تھا جب روس میں بالمشیک انقلاب رونما ہو گیا تو برطانیہ کی تفریق کچھ اور بڑھی اور گلگت کے فوجی قہقارے اٹھنے لگے جیسا کہ انگریزوں نے مرکز ہونے لگیں۔ جہاز جاہ کی حکومت کو انگریز راج کی طرف سے پشت پناہی مل رہی تھی۔ اور اس کا سنگھ اس عوامی تحریک کی بھرپور موجودگی سے بچنے کے لئے ہمارا تھا چنانچہ اس کو انگریز کا دست شفقت ہی ڈولنے اور ڈوبنے سے بچ رہا تھا۔ ایک شکر گذار جہاز جاہ نے آؤ دیکھنا تماؤ گلگت کے خطے کی ٹکرائی عظیم الشان کو سنبھال لیا۔ اور اپنے سپر سلطنت انگلستان کو خطاب کو حق بجانب ثابت کر دکھا یا۔ اس معاہدے سے جہاز جاہ کے حب الوطنی کے دعووں کا پول کھل جاتا ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی گدھی کی حفاظت کے لیے انگریز کے ہاتھ ساری ریاست کو خودخت کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جہاز جاہ کو یقین تھا کہ انگریز ابھی کئی دہائیوں تک ہندوستان کے سیاہ بونیہ کے مختار بنے رہیں گے۔ اُس کے پر دادا گلاب سنگھ نے خطہ میں ہندوستان کی پہلی تحریک آزادی کو پھیلنے کے لیے اپنے حیدر سات ہزار فوجی دہلی کے محاصرے میں انگریزوں کی مدد کے لیے بھیجے تھے۔ اور اب اس کا پڑ پڑتا ہندوستان کے شمالی دروازے کی

دن بڑے ہوش اور جذبے سے منایا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھائیوں نے بھی حکومت کے اختیار و اقتدار میں عوام کو شریک کرنے کی مانگ کی تاہم یہی اور شخصی حکومت کے ایوان ہل کر رہ گئے۔ ۱۹۳۷ء میں پونچھ میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس میری صدارت میں منعقد ہوا۔ میں نے اس وقت کے اہم ترین مسئلے یعنی ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کو اپنے خطبہ صدارت کا خاص موضوع بنایا۔ میں نے اپنے خطبے میں کہا:

”ذمہ دار نظام حکومت اور خود مختار نظام حکومت کو ہم آج ہی اپنا نصب العین نہیں بنائے لگے ہیں بلکہ یہ مطالبہ تو تحریکِ تحریت کی ابتدا سے ہی معتد اعلیٰ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہا ہے۔ خاص طور سے جب ۱۹۳۳ء میں موجودہ آئین ساز اسمبلی کا آئین مرتب ہو رہا تھا، اس وقت ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ ریاست جموں و کشمیر کے کوٹے کوٹے سے کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے موجودہ آئین کا مطالبہ مسلم اکثریت کے ساتھ متفق نہیں رہا بلکہ اقلیتیں بھی اب بہتر آئین کا مطالبہ کر رہی ہیں۔“

ہماری تحریک کو بعض حضرات ہندوستان کی تحریک کا محض عکس اور غورخہ جیسی قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ دیکھنے کی زحمت برداشت نہیں کرتے کہ ہماری تحریک اپنے مزاج اور ذہن کے لحاظ سے ہر وقت ہندوستانی تحریک سے زیادہ فراخ دل، روادار اور روشن خیال تھی۔ اور ہم نے جو نصب العین اختیار کیے کئی سال کے بعد ہی ہندوستان کی تحریک اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کر لی۔ مثلاً میرے اس خطبہ صدارت کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ اقلیتی فرقہ کی طرف سے جو شبہات ہمارے بارے میں ظاہر کیے جا رہے تھے ان کے

نجیباں انگریزوں کے ہاتھ میں دے کر اپنی نمک حلائی کا ثبوت دے رہا تھا۔ معاہدے کی رو سے ہمارا جاہلگت کے فوجی اور سول انتظامات سے دست بردار ہو گیا اور یہ طاق ساتھ برس کے لیے برطانوی حکومت کی براہ راست نگرانی میں چلا گیا۔ معاہدے میں کچھ رسمی الفاظ ایسے بھی رکھے گئے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ہمارا جاہری سنگھ کی سرکاری ہنگت پر بحال ہے لیکن بعد کے سنگین واقعات کے ایک ہی پتھر سے اس خوش فہمی کا ازالہ کر دیا۔ ہنگت کو برطانیہ کی تحویل میں دے کر ہمارا جانے جس کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا اس کی وجہ سے آج سارے خطے پر اعلیٰ ہنگ کے ہی نہیں بلکہ گرم ہنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر ہمارے سروں کے اوپر ہوئی ہے یہ آخرہ اپنی کوکھ میں کیا کیا ساخت و حادثات لانے والی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس لیے کا مصدق ہمارا جاہری سنگھ ہے۔

۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس سرینگر میں ہوا جس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں پہلی بار غیر مسلم رہنماؤں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا اور اس اجلاس کے منتخب صدر چودہری غلام عباس کا ایک شاندار ردِ یاٹی مجلس نکالا گیا۔ جلوس خواجہ غلام نبی بھٹکار اور منشی غلام محمد نے منظم کیا تھا۔ اور اپنی شان و شوکت اور عوامی شرکت کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ میں اس اجلاس میں مسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے منتخب ہوا۔

دوسرے سال جماعت کا کوئی سالانہ جلسہ نہ ہوا لیکن ۱۹۴۰ء کو ہم نے ساری ریاست میں ”ذمہ دار نظام حکومت کا دن“ منانے کی اپیل کی۔ یہ

جواب میں، میں نے گزارش کی :

”ہمارے پڑوسی ملک برطانوی ہندوستان کے بعض صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور چند ایک میں مسلمان بھی اکثریت میں ہیں۔ وہاں انڈین نیشنل کانگریس نے تحفظ حقوق کی نسبت جو قرارداد پاس کی ہے ہمارا اعلان اس کے معیار سے کافی اونچا ہے۔ ہم نے فرمودہ اور روسی قانونی کا سہارا لے کر علاقائی قلیتوں کو حقوق عطا کرنے کے گریز نہیں کیا ہے اور نہ اس سلسلے میں منطقیانہ موٹگیفوں کی آڑ لی ہے بلکہ ہم نے ہمیشہ غیر مبہم الفاظ میں اپنی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے ہیں اور انہیں سمجھتے ہیں شمولیت کی دعوت دی ہے۔ اس پر بھی اگر ریاست کی اقلیتوں کا اصرار ہو کہ انہیں ریاست میں وہی کچھ چلے جو برطانوی ہند میں اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے دیا جائے گا تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی مقرر نہیں ہے۔ اب ہمارے ہندو اور سکھ بھائیوں کا فرض ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر غرور دار نظام حکومت کی زندگی دراز کریں جس کی سخت گیر پالیسیوں سے ہم اور وہ سبھی یکساں طور ناخوش اور نالاں ہیں۔“

ریاستوں کے کروڑوں عوام کے حق خود ارادیت کو راجواڑے اور ان کا ممبرتی انگریز سامراج جس طرح نظر انداز کر رہا تھا وہ بھی ہمارے دلوں میں تلاطم مچا رہا تھا اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری تحریک ایک تنگ کنوینشن میں قید ہو کر پسنگر و پیش سے بے بھر نہیں تھی۔ اُسے روئے عصر کا پورا پورا جوفان اور شعور تھا۔ کشمیر کے حق خود ارادیت کے جس نعرے نے آنے والے برسوں میں دنیا بھر کے ایوان ہلا دیے ان کے بیچ میرے قطبہ صدارت کے ان الفاظ میں ہمک رہے تھے۔

”گوورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ شالہ کا دوسرا حقہ جو فیڈریشن کے ساتھ

تعلق رکھتا ہے اس کا اثر ریاست اور اس میں رہنے والے عوام پر براہ راست پڑتا ہے کیوں کہ فیڈرل اسمبلی اور کونسل کے ایوان میں برطانوی ہند کے ارکان کے دوش بروش ریاستوں کے عوام کو بھی جگہ دی گئی ہے مگر برطانوی ممبروں نے آئین کو ترتیب دیتے وقت ہندوستانی ریاستوں کے آٹھ کروڑ باشندوں کے حقوق کو جس بے دردی سے نظر انداز کیا ہے وہ اس آئین کی سیاہ تاریخ میں سیاہ ترین صفحہ شمار ہوگا۔ ریاستوں کے آٹھ کروڑ باشندے خاص حیوان تصور کیے گئے ہیں جن کی رائے اور خواہش کو حکومت برطانیہ نے کوئی وقعت نہیں دی۔ اور ان کے نمائندے نامزد کرنے کے اختیارات معدودے چند افراد کے حوالے کیے گئے ہیں۔ جن کے تازہ سلسلہ کے کروڑوں انسان پہلے ہی سے نالاں ہیں۔ اگر ریاستوں کو فیڈریشن میں شامل کرنے سے حکومت برطانیہ کا مقصد ریاستوں کی حمایت حاصل کرنا ہے تو یہ مقصد آٹھ کروڑ انسانوں کے قلوب کو مٹھی میں لینے سے حاصل ہو سکتا تھا۔ قوانین اور جہازوں کی محدود حمایت اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی ہندوستان کے وہ قومی کارکن جو اس وقت آٹھ کروڑ مظلوم ریاستی باشندوں کی ترجمانی کرنے سے بچا کھاتے ہیں وہ فیڈریشن کے نافذ ہونے پر ان ریاستوں کو اپنے دوش بروش کھڑا کرنے میں کامیابی نہیں گے۔ ان حالات میں زیادہ دؤر امتیاز فوٹ اور جہاز بے دہی ہو سکتے ہیں جو یا تو فیڈریشن میں شمولیت سے منہا رہیں یا پھر نامزد نمائندوں کی بجائے مرکز میں جانے والے نمائندوں کے انتخاب کے اختیار اپنی رعایا کے سپرد کریں۔“

تاریخ کے ”اگر“ ہمیشہ دلچسپ خامہ فرسائی کا موضوع رہے ہیں۔ اگر ریاستوں خاص طور پر حیدرآباد اور کشمیر جیسی ریاستوں کے حکمرانوں میں تدبیر ہوتا وہ ہوا کا رخ

بہان لیتے اور اسی وقت سے اپنے ملک کے اختیارات میں عوام کی نمائندگی کی راہ ہمارا کرنا شروع کر دیتے۔ تو آج برصغیر کا نقشہ کتنا مختلف ہوتا؟ بعد میں ان حکمرانوں نے اپنی دبی دبی ہوئی نادرہ بچانے اور اپنی ریاستوں کی شخصیت، بچانے کے لیے جو عین کیے وہ ان کے کسی کام نہ آتے۔ کیونکہ وقت نکل چکا تھا کسی کاریہ مقلد کتنا صحیح ہے کہ زمانہ ایک ایسی عین ہے جو پیچھے سے گئی ہے۔ اگر آپ اس کی دھن کو آگے سے ہاتھ میں لے سکے تو یہ آپ کی نوڈی بن جاتی ہے جو لوگ اس کے آگے نکل جانے کے بعد اس کا تعاقب کرتے ہیں ان کے ہاتھ ضررت کے سوا کچھ نہیں آتا۔

اسی سال محمد علی جناح صاحب پہلی بار کشمیر کی سیاحت کرتے۔ وہ ابھی قائدِ افغان نہیں بنے تھے۔ لیکن ایک معزز ہندوستانی رہنما کی حیثیت سے مسلم کانفرنس نے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ ریاست میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں اور اس لیے ان کا اور ان کے لیڈروں کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ قلوب کریں بلکہ انہیں اپنی سیاسی اور اقتصادی گاڑی کا ایک لازم و ملزوم پہرہ سمجھ کر ان کا بھرپور تعاون حاصل کریں۔ نظر رہے کہ وہ ہماری تحریک کی وسعت کے لیے ہمیں ترغیب دے رہے تھے، قومی اتحاد کے لیے جو جذبہ ابھر رہا تھا اور مذہب و ملت کی جو حد بندیاں مٹ رہی تھیں اس سے کچھ لوگوں کے ماتحتوں پر بل ہی نہیں بلکہ پٹیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ وہ اس اتحاد کو شخصی حکومت کے لیے آخری وار تصور کرتے تھے اور شخصی حکومت کے بلطاعتی کردار کو نظر انداز کر کے وہ صرف یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ ایک غیر مسلم کی حکومت ہے اس لیے اس کو قربت پر بھجانا چاہیے۔ اس غرض کے لیے جب کوئی جائز طریقہ اٹھ نہ آیا تو یہ آوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔

کشمیری پنڈتوں کے ایک تنگ نظر لیڈر شوہر ان فطیر نے مسلمانوں کی دلازاری کے لیے ان کے محبوب پیغمبرؐ کی ذات پر ایک سو قیانا حملہ کر دیا۔ مسلمان کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو جب اس کے پیغمبرؐ کی ذات پر کسی جانب سے حملہ ہو تو اس کی شریاؤں میں خون کھولتے ہوئے پانی کی طرح آبلے لگتا ہے۔ فطیر صاحب کی تقریر جیسے کچھ نہ کم تھی۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے اسے ہندو سبھا کے ترجمان "مارننڈ" میں جل مروت سے شائع کیا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وادی کی فضا لرزے لگی۔ مولوی یوسف شاہ جو سیاسی قلابازوں کی وجہ سے بڑے دھارے سے الگ تھلک ہو چکے تھے اس فضا میں سامنے آ گئے۔ انہوں نے جامع مسجد میں توہینِ رسولؐ پر دفعہ کے بعد ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کی۔ پہوری کمرل میں پولیس جلوس پر ٹوٹ پڑی۔ گولی سے ایک فوجوان شہید ہو گیا۔ اور مولوی یوسف شاہ گرفتار کر لیے گئے۔

میں ان دنوں سرنگر سے ۲۵ میل دور: بجمہاڑ میں تھا۔ جونہی میں نے اس اندوہناک سانحہ کی خبر سنی تو میں نے ایک بیان میں کہا کہ "مذہب کسی خاص شخص کا اثاثہ نہیں۔ اگر مولوی یوسف شاہ دو پہر کا کھانا چیل میں کھائیں گے تو رات کے دسترخوان پر ہم ان کے ہم نوالہ ہوں گے۔" طوفانِ مویں مارنے لگا تو فطیر کی سستی گم ہو گئی۔ اور لگے پنڈت جی گرو گڑا کر معافیا مانگے۔ وہ ہماری پناہ میں آ گئے۔ ہم نے انہیں پشیمان دیکھا تو ہم نے اپنے کارکنوں کے ہمراہ ایک کھلی کار میں انہیں شہر میں گھمایا جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ شخص پشیمان ہو کر اب معافی مانگ رہا ہے۔ لہذا معاملے کو اب قلم کرنا چاہیے اسی سرگرمی سے نپٹنے نہ پایا تھا کہ بڑے بڑے میں فرقہ وارانہ قسادات نے اپنا چمن لہرایا۔ میں

فوری طور پر سردار بھٹہ سمجھ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ اور جب تک وہاں امن وامان قائم نہ ہوا وہیں رہا۔

۱۹۳۷ء کے آخری دن کے ساتھ پہلی پرچاسوا کی زندگی بھی ختم ہوئی۔ مسلم کانفرنس نے اسمبلی کے انتخابات لڑے اور پہلے ہی طرح شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ اُس وقت ووٹ کا حق محدود تھا اور ووٹر آبادی کا صرف پندرہ فیصد حصہ تھے۔ لیکن پیر ضیاء الدین بڈگام اور چودھری عبدالکرم میر پوری نے آزاد امیدواروں کی حیثیت سے چناؤ جیتے۔ مگر وہ بعد میں مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ اسمبلی کا پہلا سیشن ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو راج گڑھ محل سرینگر میں ہوا۔ مسلم کانفرنس کے ممبروں نے صرف علف اٹھانے کی رسم میں شرکت کی اور پہلے ہی دن اجلاس سے واک آؤٹ کر کے اعلان کیا کہ جب تک حکومت اُن کے جائز مطالبات تسلیم نہیں کرتی وہ اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے۔

اسی سال مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانان غلطین کے ساتھ یک جہتی اور یک شوقی کا اعلان کیا گیا۔ ہمارا جاگو انقلاب دیا گیا کہ وہ ہموار ہندوستانی وفاق میں شرکت سے گریز کرے۔ اسی اجلاس میں انٹی فیصد والی مسلم اکثریت کی ریاست جموں و کشمیر کے لیے مسلم وزیر اعظم کی تقرری کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

۱۹۳۷ء کے آس پاس ہی میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ اُن دنوں میں اور بخشی غلام محمد لاہور میں تھے۔ نہرو پنجاب پرورش کا گھریں کے صدر میاں افتخار الدین کے جہان تھے۔ ہم نے پنڈت جی سے ملاقات کے لیے میاں صاحب کی رہائش گاہ پر فون کیا اور وہاں سے

معلوم ہوا کہ وہ صوبہ سرحد کے دورہ پر جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن چلنے والے ہیں۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم ملاقات کے لیے آدھری پہنچ جائیں۔ چنانچہ ہم دونوں ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ پنڈت جی اپنی سرخ و سپید رنگت اور چہرے پر شہ سے کشمیری خدو خال کا دلکش پیکر لگ رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اور ریل کے ٹیبلے میں ہی اس طرح جھگٹنگو ہو گئے جیسے ہم برسوں کے دوست ہوں تلتے میں ٹرین چل دی لیکن گنگو اس قدر دل چسپ تھی کہ ہمیں اُٹھنے کا خیال ہی نہ آیا اور ہم شاہدرہ تک اُن سے باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہاں بخشی غلام محمد تو اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ مگر پنڈت جی مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں اُن کے ساتھ صوبہ سرحد چلا آؤں۔ اُن کے اصرار میں اتنی اپنائیت تپاک اور گرمی تھی کہ میں یوں ہی چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاکہ پنڈت جی سے تبادلہ خیال کا تفصیلی موقع بھی ملے۔ میں نے صوبہ سرحد میں اُن کے ساتھ کئی روز گزارے اور اُن کی شخصیت کو قریب سے دیکھا بھالا۔ اُن کے انداز میں بچوں کی سی معصویت تھی۔ جس پر خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔ اسی دورے میں بادشاہ خان اور دیگر سرخ پوش رہنماؤں سے میرا تعارف ہوا اور بادشاہ خان سے تو دائمی دوستی کے اُس رشتے کی بنیاد پڑی جو زمانے کے زبر و کم کے باوجود آج تک قائم اور سرسبز ہے۔ پنڈت جی سے گنگو کے دوران مجھ سے دریافت کر کے بڑی حسرت ہوئی کہ انہوں نے ہماری تحریک کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ ہماری تحریک کے ساتھ صرف ایک ممتاز سیاسی قائد کی حیثیت سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ایک کشمیری سپوت کی حیثیت سے اپنے وطن مالوت کی تقدیر بدلنے کی کوششوں سے خوب لڑکھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں مادر کشمیر کے ایک فرزند کی حیثیت سے

نوداس بات کا بڑا شوق تھا کہ وہ مجھ سے ملیں جو ان کے الفاظ میں 'سوئی' ہوئی کشمیری قوم کو جگایا تھا۔ انہوں نے مجھ سے تحریک کے متعلق بہتر سوالات پوچھے۔ میں نے سلا بھرا انہیں تحریک کے پس منظر سے واقف کرایا۔ اور ان پر واضح کیا کہ یہ تحریک کسی صورت میں فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تحریک اس وقت تک مسلم کانفرنس کے نام سے جاری ہے لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ باوجود کوشش کے غیر مسلموں نے ہمارے ساتھ اشتراک کرنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پنڈت جی نے مشورہ دیا کہ ہم تنظیم کے دروازے ریاست کے ہر باشندے کے لیے بلا لحاظ مذہب و ملت کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ غیر مسلموں میں بھی اس تحریک کا ساتھ دینے کی توفیق ہو وہ کسی مکاؤٹ کے بغیر ایسا کر سکے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ہندو فرقہ پرست پریس اور جماعتوں کو تحریک پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے کے لیے کوئی دلیل نہ مل سکے گی رخصت ہونے سے قبل میں نے ان کو اور بادشاہ خان کو کشمیر آنے کی دعوت دی جسے دونوں رہتاؤں نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔

کچھ ہی عرصے بعد ہندوستان میں اسٹیٹس پروپلز کانفرنس پنڈت جواہر لال کی قیادت میں قائم ہوئی جس کا مقصد راجاؤں کی عملداری کے تحت ریاستوں کے عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلانا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر مسلم کانفرنس کے زعماء تحریک حریت کشمیر کی ہندوستان کے قوم پرستوں سے حمایت چاہتے ہیں تو انہیں اپنے نظریات میں وسعت پیدا کرنا ہوگی اور جماعت کے نام اور اس کے دستور میں تبدیلی لانا ہوگی جس کا اتفاق سمجھ لیجئے یا مشیت ایزدی کہ کشمیر کے دوسرے عظیم فرزند اور تحریک حریت کشمیر کے دعا گو اور قربی علامہ

سرمہر اقبال نے سلا میں مجھے کچھ اسی قسم کا مشورہ دیا۔ وہ ان دنوں عسلیں تھے۔ میں نے انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی ان کے کشمیر میں داخلے پر سلا سے پابندی تھی۔ اس پابندی کو دایس لینے کی درخواست کی گئی۔ لیکن ہمارا جا کی حکومت نے اکتوبر تک انہیں کشمیر آنے کا اجازت نامہ نہیں دیا۔ اور جب اجازت نامہ آیا تو سردی کا زمانہ آگیا تھا۔ اور اقبال نے دوسرے سال کے لیے اپنا دورہ کشمیر ملتوی کر دیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے سال وہ جنت ارضی کے بدلے جنت فردوس کی سیاحت کے لیے بلائیے جائیں گے۔ جب میں ان سے رخصت ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں۔ اور مسلم کانفرنس کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیے جائیں۔ صرف یہی صورت کشمیر کے لیے آزادی حاصل کرنے کی ہوگی ورنہ آپسی اختلافات کو غرض مند اور مفاد مخصوص رکھنے والے دوست آچھالنے رہیں گے۔

مسلم کانفرنس میں قومی تنظیم کا بیج پہلے ہی مضر تھا اب اس کا پیر بہن بدل کر بسے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی گھڑی بھی آئی پہنچی تھی اور کسی شاعر کے الفاظ میں ہر طرف یہ احساس عام ہو رہا تھا۔

بقدرشوق ہمیں طرف تنگ نائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کیلئے

خواب کی تعبیر نیشنل کانفرنس

مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا عمل کتنا تکلیف دہ اور نازک تھا اس کا کچھ حال تو ان مرحلہ دار واقعات سے معلوم ہو جائے گا جو مسلم کانفرنس کی جنگ نائے کونیشنل کانفرنس کے بے کراں دریائے تپہ میں پیش آئے۔ لیکن اس کا اصلی ماجرا صرف ان لوگوں کے سینوں کی نور پر لکھا ہوا ملے گا، جنہیں ان چڑا شوب دونوں میں اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے دلوں کے خنجر شاداب بنائے اور ضمیروں کے بیاباؤں کو زریز بنانے کے لیے اپنا لہو پانی کی طرح بہا دینا پڑا۔ مجھے ایک طرف تو اپنے ساتھیوں کی ہمدردیوں اور بے لوثیوں سے بار بار مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور دوسری طرف تحریک کے کامیابیاں اور ہوشیار دشمنوں کی، جو کسی نہ کسی طرح تحریک کی اس وسعت پذیری میں روٹے اٹھانا چاہتے تھے، ریشہ دوانیوں سے دودھ دہا کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف اگر مجھے چودھری غلام عباس، اللہ رکھا ساغر اور عبدالجید قرشی کے تابڑ توڑ اعتراضات کا جواب دینا پڑتا تھا تو دوسری طرف مولانا محمد سعید مسعودی، شبثی غلام محمد اور مرزا فضل علی

کی وحلہ یقینی اور بعض حالات میں دشواریاں گھات سے بھی نبرہ آزما ہونا پڑتا تھا۔ مولوی عبداللہ وکیل جیسے لوگ کلمہ کھلا اس نظر سے کے دشمن تھے۔

ان ہی دنوں جنوں میں مسلم کانفرنس کا چھٹا سالانہ اجلاس جون کے آخری ہفتے میں منعقد ہوا۔ اس وقت اگرچہ مشورت کا بڑا دھارا واضح طور پر مسلم کانفرنس کی توسیع کے حق میں بہہ رہا تھا لیکن بہت سے دنوں اور عرصہ کر جموں کے دوستوں میں ایک تذبذب کا سماں طاری تھا۔ میں نے اس صورت حال کو بھانپ کر اپنے خطبہ صدارت میں کہا،

”یہ ضروری ہے کہ جو لوگ موجودہ نظام حکومت میں مبتلائے مصیبت ہیں انہیں ذمہ دار نظام حکومت کے حصول کے لئے ہماری جدوجہد میں شریک کیا جانا چاہیے۔ وہ لوگ کون ہیں؟ وہ صرف مسلمان ہی نہیں، صرف ہندو اور سکھ ہی نہیں، اجموت اور ہمدردی نہیں بلکہ ریاست کے تمام باشندے ہیں۔ بعض مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آٹھ لاکھ کے آٹھ لاکھ غیر مسلم نہایت آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ خیالی خام ہے۔ دراصل ان میں سے صرف پچھتر ایک ہزار ہی ایسے غیر مسلم ہوں گے جو مصائب و آلام سے بچے ہوئے ہیں۔

ہم ذمہ دار نظام حکومت صرف ۸۰ فیصدی مسلمان آبادی کے لیے طلب نہیں کر رہے ہیں یہ تو ریاست کی سو فیصدی آبادی کے لیے مانگا جا رہا ہے۔ اس لیے اس کو حاصل کرنے کے لیے ۲۰ فیصدی ہندو، سکھ، بودھ اور ہر جموں کو بھی شمولیت کی دعوت دینا اور انہیں اپنے ساتھ ملا کر آگے بڑھنا اس لئے ضروری ہے۔“

میں نے دوسری جانب کی غلط فہمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات

بات کا اندیشہ موجود ہے کہ ایسا کرنے سے تحریک کو در پڑ جائے گی اور جماعت کے اندر غیر مسلم غلوں کے ساتھ نہیں بلکہ مفادِ خصوصی کی ترجمانی اور تنگداشت کے لیے مورچہ قائم کر لیں گے اور دوسری طرف مسلم کانفرنس کے دشمن اسلام کے نام پر ہمارے خلاف مفادِ کفر اکر لیں گے حکومت اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر ہماری صفوں کو تیزتر کر دے گی۔ اپنی جگہ یہ حدیثات درست تھے اور میں ان امکانات سے بے خبر نہیں تھا۔ لیکن سیاسی دنیا کے تجربات نے مجھے قائل کیا تھا کہ مفادِ خصوصی رکھنے والوں کا کوئی دین اور دھرم نہیں ہوتا اسی لیے ہیں اپنی صفت آرائی فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم کے نام پر ترتیب دینی چاہیے۔ بہر حال ورکنگ کمیٹی نے بھاری اکثریت سے یہ قرارداد جنرل کنسل کی توثیق کے لیے منظور کر لی۔

اب مرحلہ یہ تھا کہ ہم مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس بلاکر اس قرارداد کی توثیق کرایں۔ لیکن حکومت نے فیالات کی کروٹ سے بوکھلائی۔ سرگوبالا سوامی آہنگو کرنی کا لون کی شکایت دہشی کے بعد ۳۳ قلم میں ریاست کے نئے وزیر اعظم بن کر آئے تھے۔ اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک روشن خیال مڈر ہیں۔ وہ جنوبی ہند کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن کشمیر اگر وہ ایک ظالمانہ نظام کے آلہ کار بن گئے تھے۔ اس لئے وہ اپنی سی نہ کر سکے اور اپنے میزبان طبقاتی نظام کے رنگ میں رنگ گئے۔ ان ہی دلوں میں پروردگار کے راجہ محمد اکبر خان کو، جو ایک شریعت، مخلص اور درد مند سیاسی رہنما تھے، حکومت کے خلاف تقریر کرنے کی پاداش میں تین سال قید سخت اور ایک سو روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ اس بے رحمانہ تعزیر سے ہم بھی متاثر ہوئے۔ ہم نے ہارگت کو ”ذمہ دار نظام حکومت ڈسے“ منانے کی اپیل کی۔ سارے ملک میں ایک رُوح پرورد

کی صراحت کی غیر مسلموں کو اشتراکِ عمل کی دعوت دینا نہ زمانہ سازی ہے اور نہ ڈپلومیسی ہے بلکہ یہ ہمارے دل سے نکلی ہوئی ایک پُر غلوں آواز ہے۔

اس اجلاس میں ہم نے واضح طور پر مسلم کانفرنس کا دائرہ وسیع کر کے ایک قومی تنظیم بنانے کا جو خیال پیش کیا اس سے جماعت کے اندر اور باہر تبادلہ خیال اور تضاد آرائی جاری رہی۔ معاملات کو ایک واضح سمت دینے کے لیے میں نے ۲۴ جون ۱۹۳۷ء کو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کر لیا اور اس میں اس سوال پر غوب بحث ہوئی۔ تقریباً باؤن گھٹے تک اجلاس کی نشست جمی رہی اور مخالفت میں غوبِ خوب دلیلیں دی گئیں۔ ایک مرحلے پر بخشی غلام محمد اور مرزا محمد افضل بیگ بھی چودھری غلام عباس، مولوی عبداللہ دکیل خواجہ احمد دین بانہالی وغیرہ کے ساتھ مسلم کانفرنس کو توڑ دینے کے خلاف رائے دینے لگے۔ لیکن ممبروں کی اکثریت تنظیم کا جامہ بدلنے کے حق میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک وسیع تر قومی مفاد قائم کرنے کے حق میں اس قدر مشیت دلائل موجود تھے کہ مخالفین کی ایک نہ چلی۔ اور انہوں نے بھی اس کی حمایت کرنے میں مرگری دکھائی۔ ورکنگ کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے تمام ترقی پسند عناصر ذمہ دار نظام حکومت کے حصول کے لیے ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی مجلسِ عاملہ سے سفارش کرتی ہے کہ آئندہ ہونے والے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کے نام اور آئین میں اس قسم کی تبدیلی کی جائے تاکہ تمام ایسے لوگ جو اس سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی خواہش رکھتے ہوں۔ بلا تیز مذہب و ملت، رنگ و نسل آسانی کے ساتھ کانفرنس کے رکن بن سکیں۔ چودھری غلام عباس مرحوم اور اُن کے چند ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ اس

فرق دارانہ اتحاد کے نظارے دکھائی دیے اور طول و عرض میں یہ دن انتہائی جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ ان جلسوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ اُدھر شریک نے منظم شکل اختیار کی تو حکومت کے انگریز پھر ڈھیلے پڑنے لگے۔ گوپال موہی آئے تو تھے یہ کہتے ہوئے کہ وہ ریاست میں امن و قانون کی عملداری بحال کریں گے لیکن لگے دار و گیر اور پکڑ و حکم کے پڑنے پر بے آزمائے۔ سرنگری میں دفعہ ۱۲ نافذ کر دی گئی لیکن ہم نے اس پابندی کی دھجیاں اڑاتے ہوئے حضرت بل میں ایک بھاری جلسہ کیا جس میں میرے علاوہ پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا مسعودی، کیشپ بھندو، پنڈت جیالال بکلم اور خواجہ غلام محمد صادق نے تقریریں کیں ہم نے دوسرے دن سرنگری کے پرتاپ پارک میں جلسہ کرنے کا بھی اعلان کیا لیکن ۲۹ اگست کو مجھے گرفتار کر کے چھ ماہ قید سخت کی سزا سنائی گئی کچھ دوسرے لیڈروں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ شہر میں زمر کی پھر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ جلے جلوس ہوئے۔ گولیاں چلیں اور کئی نوجوان پھر پروانہ وار مادر کشمیر کی مانگ میں اپنے لال لال خون سے سیندرو بھرے لگے۔ میری گرفتاری کے دن ایک سرخوش کا ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وزیراعظم آئیگر سیکریٹریٹ سے نکل کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ وہ امیر لکھن پور کے اُس جگہ پہنچے جسے آج لال چوک کہتے ہیں تو ایک نوجوان محمد رجب نامی نے وزیراعظم کی کار پر سوار ہونے کے لیے جھلانگ لگائی۔ کار اُسے روندتی ہوئی کوئی پانچ سو فٹ تک چلی گئی جہاں ایک انگریز نے سرک کے بچوں پر اپنی کار کھڑی کر کے وزیراعظم کی کار کو روکوانے میں کامیابی حاصل کر لی اور اس طرح محمد رجب کی زندگی بچ گئی۔ اُس کے جسم پر دوا پانچ گہرا اور ۲۵ پانچ لمبا زخم آیا۔ ایک ہزار سے زیادہ گرفتار شدہ گان میں چند رہن جو غیر مسلم بھی پہلی بار قید خانوں میں ہمارے

دوش بروش برقعہ بانوں سے آشنا ہونے لگے۔ کٹھنہ جیل میں میرے لیے وہاں کوئی بہت اچھے نہیں کئے۔ ایک تو کٹھنہ کی آب و ہوا ویسے ہی مجھے ماس نہیں آئی۔ ڈسٹرکٹ جیل میں کوئی آسائش بھی میسر نہ تھی۔ میرا کھانا بنانے کے لیے ایک اعلیٰ قیدی کی دیوثی لگا دی گئی تھی۔ یہ قید تنہائی میں رہنے کا میسے لیے پہلا موقع تھا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ اپنے ہم نفسوں سے الگ تھلک رہنا انسان کے لیے کتنے بڑے عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائیں کافی وقت ہوئی لیکن آہستہ آہستہ میں اس کا عادی ہوتا گیا اور میرا زیادہ تر وقت چرخہ کاتنے اور مطالعہ میں صرف ہونے لگا۔ اس علاقے میں طرح طرح کے پرندے بھی ہوتے ہیں جو تھ میسے ہی اپنی سڑکی چھپا ہٹ سے مجھے جگایا کرتے تھے۔ میں نے بھی اُن سے شناسائی پیدا کر لی۔ اور وہ میسے کھڑے تھیں بلا دھوک آنے جانے لگے۔ میں اُن کی پیاری حرکتوں سے لطف اندوز ہوتا اور اُن کو دیر تک چشم شوق سے تاکتا رہتا تھا۔ یہاں وقت بھی آیا کہ مجھے اُن کی رفاقت سے تنہائی میں بہت سکون اور اطمینان حاصل ہونے لگا۔ پرندوں سے میرا یہ شوق بعد میں بھی جاری رہا۔

کٹھنہ کی معیاد امیری کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن منگوا کر پڑھ لی۔ اس مفہم قرآن نے اسلام کی اپنی عالی ظرفی کا جو ہر دریافت کر لیا تھا۔ اور اس کے مطالعے سے میرے قوم پرستانہ خیالات اور راجح ہو گئے۔

اس سے قبل ہم نے اپنے غیر مسلم اتحادیوں کے ساتھ قومی مطالبہ نامی ایک

دستاور شاخ کردی تھی۔ جس میں ذمہ دار نظام حکومت کو ملک کی تمام ملتوں کا علاج قرار دیا تھا۔ اس پر میرے علاوہ مولانا سعید، خواجہ غلام محمد صادق، میاں احمد یار، مرزا محمد افضل بیگ، پنڈت کشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز، سردار بڑہ سنگھ، پنڈت جبالا کل، بخشی غلام محمد، پنڈت شام لال مرآت اور ڈاکٹر شبون ناتھ پٹن نے دستخط کیے تھے۔

مجھے اپنی قید کی میعاد پوری کرنے پر ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو جیل سے رہا کیا گیا۔ سربراہ میں میرے استقبال کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا۔ چپہل ویر سے مجھے ایک گجھی میں بٹھا کر لے جایا گیا۔ جس کو نو گھوڑے کیچھ رہے تھے۔ جلوس کے آگے باوردی گھوڑے سواروں اور سائیکل سواروں کے دستے تھے۔ اور پھر عوام کا ٹٹاٹٹا مارتا ہوا سمندر اُن کے پیچھے تھا۔ شاہی مسجد میں جلوس ختم ہوا اور میں نے ایک بڑے طے میں، جس میں ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں شامل تھے عوام کا شکریہ ادا کیا۔ حکومت متحدہ قومیت کی بنا پر ہماری قرارداد سے ہم اٹھی تھی۔ اور جیسا کہ میرے بعض رفیقوں نے فخر و محسوس کیا تھا اس نے ملک میں اس اقدام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پھیلا دیے تھے۔ ہماری قوم صدیوں کی غلامی سے غیبت و اعتقاد کے روگ میں گرفتار ہو گئی تھی۔ لہذا اس قسم کے واسطے اس کی نفسیات کو فوراً متاثر کرتے ہیں لیکن اگر انہیں صحیح صورت حال سمجھا دی جائے تو ان کی پاکیزہ فطرت فوراً حقیقت دیکھنے لگتی ہے۔ میں نے اپنی شدید اسیری کے آثار و مصائب کو سہلانے کی فرصت نہیں پائی اور میں نے ملک کا دورہ کر کے ان بدنامیوں اور بدگمانیوں کا تار و پود کچھ کر رکھ دیا، جو دشمنوں نے ہماری اسیری سے فائدہ اٹھا کر ملکی عوام کے ذہنوں میں بٹ ڈالا تھا۔ اس دورے کے بعد ملک کی نفسیات (PSYCHOLOGY) ایک

انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہو گئی۔ ۲۷۔ اپریل کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی توثیق کر دی۔ اور اس کے بعد ایک خاص اجلاس طلب کرنا ضروری بن گیا۔

۱۰ اور ۱۱ جون ۱۹۳۵ء کو مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس شاہی مسجد سربراہ میں بلایا گیا اور اس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی۔ صادق صاحب کے بزرگ تحریک کی ابتداء ہی اس کے ساتھ وابستہ تھے۔ جب وہ علی گڑھ میں ہی زیر تعلیم تھے تو میں نے انہیں اور مرزا محمد افضل بیگ کو مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے تار دے کر بلایا تھا۔ صادق صاحب میں ہر انسان کی طرح بہت سی خامیاں تھیں لیکن غیر مذہبی سیاست پر ان کا اعتقاد غیر متزلزل تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں جاری رہنے والی طویل بحث میں اپنی روشنی خیالی اور استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ قویان رہنماؤں کی نئی نسل کے نمائندے تھے۔ اس لیے ہم نے انہیں ہی اس تاریخی سیشن کی صدارت کا اعزاز بخشنا مناسب خیال کیا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں سیشن کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا:

”مسلم کانفرنس کا یہ اجلاس فیصلہ کرے گا کہ آج سے اسے نیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا جائے اور یہ راستہ کاہر کوئی باغشادہ جو باغ ہو، عورت یا مرد بلا امتیاز مذہب و ملت اس کانفرنس کا رکن بن سکتا ہے جس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ وہ ذمہ دار نظام حکومت کے قیام اور شخصی آزادیوں کے حصول کو تحریری طور پر اپنا سیاسی نصب العین ظاہر کرے۔“

خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

بھی اس تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں ان کے ارادوں کے بارے میں ان کی
 کثرت بڑی اچھی گواہ ہے..... ایک بڑی غلط فہمی یہ پھیلانی جا رہی ہے کہ
 شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے تحریک کو بیچ ڈال دیا ہے۔ یا وہ کانگریس
 کے ہاتھوں بک گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم گاندھی جی کے چیلے چائے بن گئے ہیں،
 لیکن یہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نہ کانگریس کے دست نگر ہیں نہ مسلم لیگ گئے۔
 ہم گاندھی اور جناح دونوں کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہم ان کے ہاتھوں اپنی تقدیر
 نہیں دے سکتے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ ریاستی لوگوں کو اپنے حکمرانوں کے آگے
 ٹھکانا چاہیے۔ ہم کو یہ بات منظور نہیں۔ جناح صاحب کا کہنا ہے کہ جاری ریاست
 کی اکثریت کو اقلیت کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ اور ہم اس نظریے کو درست سمجھتے
 ہیں۔ ہم اپنے مطالبات کے سلسلے میں کانگریس یا مسلم لیگ کی مدد کا غیر مستقیم
 کریں گے۔ لیکن ہم اپنے فیمیکر آزادی کو کسی بیرونی جماعت کے ہاتھوں گروی
 نہیں رکھ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم سے کچھ گناہ سرزد ہوتے ہوں لیکن ان لوگوں کی
 نسبت جو اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق کا خود ساختہ ٹھیکہ دار جتلاتے ہیں، ہم
 مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے زیادہ حوصلہ اور جہت رکھتے ہیں۔ یہ
 بات کہنا مضحکہ خیز ہے کہ انہی فیصدی مسلمان تیس فیصدی ہندوؤں سے خوفزدہ ہیں۔
 ہم بچے مسلمان ہیں اور خوف ہمارے دلوں میں ہرگز نہیں۔ ہمارا یہ اقدام ہماری
 بے خوفی کا مظہر ہے۔ آپ لوگوں کو قابض قہتم شیر کشمیر کی خدمات کو زیر نظر رکھنا چاہئے اور
 دشمنوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ بہر حال میں تقریروں اور جوائی
 تقریروں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ سبھی اشارہ کرتے تھے کہ اس تبدیلی کا سب سے بڑا
 محرک، وکیل اور حمایتی بنی ہی تھا اور میں بڑے اعتماد سے حلیفوں اور حریفوں کے

جماعت کا نام تبدیل کرنے کا فیصلہ اس کے سابق اہل اس میں جوتوں میں
 کیا گیا تھا۔ اس کو اس لیے التوا میں رکھا گیا تھا کہ رائے عامہ کو استوار اور تیار
 کیا جائے۔ لیکن ادھر برصغیر میں سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ وفاق
 میں ریاستوں کی شمولیت نے نہایت اہم نوعیت حاصل کر لی۔ دائرے نے
 راجواڑوں کو گانگھے کی کوششیں تیز کر دیں اور ہماری ریاست نے وفاق میں
 شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔ ان حالات میں ایک متحدہ پلیٹ فارم اختیار کرنے کے
 سوال کو زیادہ دیر تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔“

لیکن سیشن کی اہم ترین تقریر دراصل چودھری غلام حاس خان کی تھی۔ چودھری
 صاحب کے دل میں کانٹا لگا ہوا تھا کہ نیشنل کانفرنس پر کانگریس کا غلبہ ہو جائے گا۔
 لیکن میں نے انہیں کہا کہ اگر ہم اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد میں ڈٹے رہیں اور
 اتحاد قائم رکھ سکے تو کانگریس یا مسلم لیگ کو ہم اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔
 وہ میرے استدلال سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نیشنل کانفرنس کے قیام کے
 حق میں ایک انتہائی زوردار تقریر میں کہا:

”اتھ سال پہلے ہم نے ریاستی سیاست کے لیے مسلم کانفرنس کا جو حامی تیار
 کیا تھا وہ اب بوسیدہ ہو کر تار مار ہو چکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی
 تحریک کو ایک شایان شان نئی پوشاک پہنا دیں۔ جو مسلمان مسلم کانفرنس
 کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہونے کی مخالفت کر رہے ہیں وہ دہی ہیں جو مسلم
 کانفرنس کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ حکومت بھی اس نئی تبدیلی سے چراغاں ہو رہی
 ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہ اقدام اٹھایا تو زوردار نظام حکومت
 کے لیے ان کی پیش قدمی کو روکا نہیں جاسکے گا۔ حیرت کی بات یہ نہیں کہ کچھ غیر مسلم

تعلیم و تربیت کے لیے ”مکمل اطفال“ کے نام سے جو مرکز شروع کر رکھا ہے، وہ بیگم صاحبہ کی قوشہ کا خاص مرکز ہے اور اُن کی دن رات کی لگن سے یہاں ان بچوں کی کایا پلٹ گئی ہے۔

▲▲▲

(۲۲)

پیر جاسبھا اور اس کے بعد

میرے ساتھ میرے بہت سے رفقاء کو اندازہ تھا کہ جو اسمبلی اس کا نام پیر جاسبھا رکھا گیا تھا، تشکیل دی جا رہی ہے وہ محض ایک دکھاوا ہے تاکہ کشمیر کے عوام اور اُن سے زیادہ اُن کے بیرونی پھروں کا متنبہ نہ کیا جائے لیکن ریاست اور حکومت کا اہم امور ان کی پہنچ سے باہر ہیں۔ مگر ہم خود حکومت کے جہتا کردہ فورم کو استعمال کر کے دنیا پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس کس طرح ریاستی علوم کی اکثریت کی نمائندہ، حاکمت ہے اور اس کی آواز میں کتنی طاقت ہے۔ ریاست کے اندر اور باہر مفاد خصوصی رکھنے والے عناصر بار بار مسلم کانفرنس کو مخصوص نمائندوں کی فہرست قرار دے رہے تھے۔ اب خود حکومت کے ہاتھوں اس جھوٹ کو تار تار کرنے کا موقع ہمارے سامنے تھا۔ البتہ ہم نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ واقعی انتخابات کو نرا من اور خیر رکھانی کے ماتوں میں منعقد کرنا چاہتی ہے تو سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔ اور دارو گیر کی پالیسی کو ترک کیا جانا چاہیے حکومت نے اول اول تو اس مطالبے کو منظور کرنے کی حامی بھری لیکن جب کانفرنس نامزدگی

داخل کرنے میں صرف ایک یا دو دن رہ گئے اُس نے اپنے وعدے سے منہ پھیر لیا۔ صاف ظاہر تھا کہ حکومت کا اسمبلی قائم کرنے کا اقدام محض ایک فریب تھا اور اب وہ کسی طرح عوام کے اصل نمائندوں کو اس نام نہاد اسمبلی تک پہنچنے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھی۔ لیکن یہ وقت سیدہ کو بی کام نہیں بلکہ عملی اقدام کرنے کا تھا۔ ہم نے مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو تباہوں کے ذریعے تاکید کی کہ وہ نزاکتوں میں جاسے بغیر بے دھوکہ کاغذات نامزدگی داخل کر لیں۔ ہماری توقعات کے خلاف اپنی ہمارے کارکنوں نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور وہ میدان میں ڈٹ گئے۔ آخر سر بیگز میر واعظ یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس نے ہمارے امیدواروں کے خلاف اپنے نمائندے کھڑے کر لیے اور اس طرح تحریک کی پھوٹ کو رسمی شکل میں منکمل کر لیا۔ میں نے خدا کا نام لے کر مسلم کانفرنس کی انتخابی قہم شروع کی اور بہت جلد انتخابی قہم کا پانر مسلم کانفرنس کے حق میں پلٹ گیا۔ میر واعظ کے حامیوں نے یہ صورت دیکھی تو شیر بکرا خانہ کے کی چنگاریاں بھڑکانا شروع کر دیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہم اس سے بڑے مقاصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ان اشتعال انگیز لوگوں کو نظر انداز کر کے اصل مقصد کے حصول پر ہی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ میں نے شہر میں جگہ جگہ جلسے کیے اور عوام کو ذہن نشین کرایا کہ لڑائی کے خطوط اور حدود کیا ہیں۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۷ کو ووٹ ڈالے گئے۔ جب نتائج کا اعلان ہوا تو دوست دشمن سبھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ شہر کی پانچوں نشستوں پر مسلم کانفرنس کے امیدواروں نے میر واعظ صاحب کے نامزدگان کو بڑی طرح پچھاڑ دیا تھا۔ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ میر واعظ صاحب اور اُن کے خاندان کا ایک صدی سے زیادہ عرصے سے سر بیگز میں ڈھکا بختا رہا تھا اور اُن کے ساتھ عوام کے

ایک بھاری طبقے کو مذہبی نوعیت کی عقیدت تھی۔ لیکن تحریک آزادی نے تین چار سال کے ہی عرصے میں عوام کے شعور کو اس قدر بانگ کر دیا تھا کہ وہ میر واعظ صاحب کے بھرم میں نہ آئے اور انہوں نے انہیں قومی معاملات میں مسترد کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھ جیسے نوجوان نے جسے چار سال قبل کوئی جانتا نہیں تھا، اُن کے سباد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اصل میں عوام اصل مسائل سے آگاہ ہو چکے تھے۔ انہیں میری قربانیوں، میرے غلوں اور میری قومی درد مندی کا اعتبار آ گیا تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میر واعظ صاحب تحریک کی صفوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ اس کے بعد میر واعظ صاحب کا دائرہ اثر اُن کی رہائش گاہ واقع لاہوری کدل کے ارد گرد چند محلوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور وہیں اپنی ذہنی بجائے لگے۔ آزاد مسلم کانفرنس کے ایک امیدوار خواجہ سعد الدین مشال تھے۔ جو میرا کدل سے کھڑے ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب تحریک کے اولین قارئین میں سے تھے اور انہوں نے تحریک کی آبیاری کرنے میں پہلے پہل بہت کام کیا تھا۔ وہ ایک رئیس تھے اور اُن کی سماجی حیثیت بھی قابلِ لحاظ تھی۔ وہ کچھ عرصے سے مسلم کانفرنس سے کھینچے رہتے تھے اس میں کسی حد تک اُن کی عافیت کوشی کے احساس کا بھی دخل تھا لیکن دراصل وہ مسلم کانفرنس میں نئی قیادت کے اُتھار سے ذہنی طور پر سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور معمولی رشتوں کا پہاڑ بنا کر جماعت سے دور ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے میر واعظ خاندان سے خوشی کا رشتہ بھی جوڑا اور انہیں آخر کار میر واعظ صاحب کی ہم نشینی میں ہی چارہ کار نظر آیا۔ اگرچہ میں اُن کا کافی احترام کرتا تھا۔ لیکن جب ہماری جماعت کے خلاف غم ٹھونک کر سامنے آ گئے تو مقابلے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ غلام محمد صادق کو جو بہت مالوکے قورہ خاندان کے چشم و

ہڑتال میں پہلی بار اُن کا ساتھ دیا۔ حکومت نے خیر میں شورش سے گھبرا کر قیوناز فہ کردیا۔ اور اسی دوران بخشی غلام محمد وار کونسل کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے تقریر کرنے آئے اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو بہت دنوں تک غلام محمد ڈکٹیٹر کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ اُس وقت تو شاید اس نوجوان نے بہت زیادہ توجہ حاصل نہیں کی۔ لیکن بعد میں اُسے تحریک اور تاریخ کے چند اہم موڑوں پر بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔ تحریک کے شعلوں نے سرسنگھ سے باہر پھیل کر ساری وادی کو اپنی پیٹ میں لیا۔ اسلام آباد میں ایک پُرامن ہجوم پرقافرنکے گئے۔ شوپیان میں ایک پُرامن جلوس پر بے دردی سے ڈنڈے برسائے گئے۔ تو غلام کا پیادہ صبر بریز ہو گیا۔ انہوں نے پولیس تھانہ پر پیرس کے زندان بائٹیل کی طرح ہتھ بول دیا۔ شوئی قسمت سے وہاں ایک پست نڈت کا نٹیل مارا گیا۔ سارے قصبے کو فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی مسلمان گولیوں سے بھون ڈالے گئے اور قلم و بربریت کا ننگا ناچ روار کھا گیا۔

▲▲▲

(۱۳)

نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سایے میں

کشمیر میں ظلم و جبر کی ایسی کالی آمدھی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ظالم و مظلوم کی فیصلہ کن جنگ کا گھنچا بج گیا ہے۔ میرا عظم مولوی محمد توسعت شاہ نے اس استبداد کے خلاف جہاد کا اعلان کر کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ خانیار میں جمع ہو جائیں۔ اور جو بھی ہتھیار انہیں ملیں اُن سے لیں ہو کر آجائیں۔ جذبات پہلے ہی مجروح تھے۔ ہر طرف سے مسلمان کن بروٹس ہو کر خانیار کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سید میرک شاہ کاشانی نے شانہار میں اپنا سجادہ بنایا تھا۔ وہ ایک پارما اور قلند رحمت بزرگ تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ایک سبز دستار باندھے تھے اور ایک چمکتی ہوئی شمشیر فضا میں لہراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ ایک ذرق برق وردی پہنے ہوئے تھے۔ جس پر نہایت شاندار قسم کا عسکری کمربند بندھا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھمسان کے دن میں داؤدِ شجاعت دینے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ اُن کے ہزاروں پیرو بھی اپنی لائیو پرائیک خاص قسم کا پھل دکا کر، جیسے کشمیری میں "نار شو" کہتے ہیں بنگہ "نار شو" گولی کے لیے سے ڈنڈے پر لگا ہوا لوہے کا ایک پنجہ نما نیزہ ہوتا ہے۔ جسے پھرے ڈل میں

چار تھے اور علی گڑھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے تازہ تازہ وارد ہوئے تھے، اُن کے خلاف کھڑا کر لیا۔ تحریک کے تیز دھارے نے شال صاحب کے جے جے پاؤں بھی اکھاڑ دیے اور مسلم کانفرنس کی عوامی مقبولیت کو ڈرامائی انداز سے نمایاں کر دیا۔ مسلم کانفرنس نے نہ صرف حکومت کے بدترین اندیشوں کو درست ثابت کر دکھایا، بلکہ اُس نے داخلی طور پر اشتراک پسندوں اور جھگڑوں کو بھی انحراف کا پورا پورا مزہ چکھا دیا۔

پرجا سمجھا میں اکثریت ہمارا آج کے نامزد کردہ ممبران کی تھی، اور مسلم کانفرنس کے ۱۹ منتخب ممبر اس تعداد کا صرف ۲۸ فی صد تھے۔ لیکن اُن کی نمائندہ حیثیت دو پہر کے سورج کی طرح روشن تھی۔ مسلمان نمائندگان کی صحیح تعداد اگرچہ ۲۱ تھی لیکن میرپور کی نشستوں پر حکومت نے ہمارے امیدواروں کے کاغذات دھاندلی کر کے نامنظور کر دیے تھے۔ مسلم کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے میاں احمد یار خان کو اپنا لیڈر اور مرزا قنواغ افضل بیگ کو اپنا ڈپٹی لیڈر چن لیا۔ پرجا سمجھا کا پہلا اجلاس ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ (اس اجلاس میں ہمارا جاہری سنگھ نے بھی شرکت کی) اور وزیر اعظم کالون نے اسمبلی کے اختیارات سے متعلق شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ مسلم کانفرنس کے ایک بزرگ صورت اور صاحب حیثیت ممبر حاجی احمد اللہ شہزاد نے اسمبلی میں ایک عوامی گیت، جو اُن دنوں کشمیر میں زبان زدِ خلقت تھا، ترتیب سے پڑھا۔

گھینسی کمیشن سے مقصود پایا

یہ برب رنگ لایا میاں شیر کشمیر

یہ ایک عجیب اسمبلی تھی اور بقول غالب اس کی تعمیر میں

متضرر تھی اک صورت خرابی کی

ایک بھاری طبقے کو مذہبی نوعیت کی عقیدت تھی۔ لیکن تحریک آزادی نے تین چار سال کے ہی عرصے میں عوام کے شعور کو اس قدر بانگ کر دیا تھا کہ وہ میر واعظ صاحب کے بھرم میں نہ آئے اور انہوں نے انہیں قومی معاملات میں متروک کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ مجھ جیسے نوجوان نے جیسے چار سال قبل کوئی جانتا نہیں تھا، اُن کے سباد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اصل میں عوام اصل مسائل سے آگاہ ہو چکے تھے، انہیں میری قربانیوں، میرے غلوں اور میری قومی درد مندی کا اعتبار آگیا تھا اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میر واعظ صاحب تحریک کی صفوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ اس کے بعد میر واعظ صاحب کا دائرہ اثر اُن کی رہائش گاہ واقع باجوری کدل کے ارد گرد چند عتقوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا اور وہیں اپنی ذہنی بجائے لگے۔ آزاد مسلم کانفرنس کے ایک امیدوار خواجہ سعد الدین شال تھے۔ جو میرا کدل سے کھڑے ہو گئے تھے خواجہ صاحب تحریک کے اولین قائدین میں سے تھے اور انہوں نے تحریک کی آبپاری کرنے میں پہلے پہل بہت کام کیا تھا۔ وہ ایک رئیس تھے اور اُن کی سماجی حیثیت بھی قابلِ لحاظ تھی۔ وہ کچھ عرصے مسلم کانفرنس سے کھینچے رہتے تھے اس میں کسی حد تک اُن کی عافیت کوشی کے احساس کا بھی دخل تھا لیکن دراصل وہ مسلم کانفرنس میں نئی قیادت کے اُتھار سے ذہنی طور پر سمجھوتہ نہیں کر سکے اور معمولی دشمنوں کا پہاڑ بنا کر جماعت سے دور ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے

میر واعظ خاندان سے خوشی کا رشتہ بھی جوڑا اور انہیں آخر کار میر واعظ صاحب کی ہم نشینی میں ہی چارہ کار نظر آیا۔ اگرچہ میں اُن کا کافی احترام کرتا تھا۔ لیکن جب ہماری جماعت کے خلاف غم ٹھونک کر سامنے آگئے تو مقابلے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ غلام محمد صادق کو جو بہت مالوکے قوہ خاندان کے چشم و

ہمارا جانے اپنی ذات میں قانون سازی کے تمام اختیارات محفوظ رکھے تھے۔ اس کے
اسمبلی کے منظور کردہ ان قوانین کو، جو اس کی پسند کے مطابق نہ آتے تھے، وٹو کرنے
کا حق تھا۔ وہ اسمبلی کے پاس کردہ کسی تجویز کو بھی کالعدم کر سکتا تھا۔ ہمارا جاکے اخراجات
اور خرچے سے متعلق کسی معاملے پر اسمبلی میں بحث نہ ہو سکتی تھی۔ ہمارا پاس بھی وقت کسی
بھی شخص کو کسی بھی غرض کے لیے اسمبلی کا رکن نامزد کر سکتا تھا۔ ان حالات میں یہ اسمبلی
کیا تھی محض ایک سراب تھا اور مسلم کانفرنس کے ارکان نے پہلے ہی اجلاس میں ان
گنجیم مسائل کے تدریجاً شروع کر دیے لیکن جیسا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندازہ
لگایا تھا۔ پھر بھی یہ تجربہ عوامی تحریک کے مقاصد کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ایک
قوابلی کی نمائندہ حیثیت کے بارے میں کسی کو غلط فہمی نہ رہی دوسرے یہ بات بھی
آشکارا ہونے لگی کہ حکومت اسمبلی کو صرف ایک کھلونے کے طور پر عوام کے دل بہلانے
کے لیے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اسے عوامی نمائندوں کی اختیار و اقتدار کے مسائل میں
آواز بلند کرنا ہرگز پسند نہ تھا اور اس آواز پر کان نہ دھرنا تو بہت دود کی بات تھی۔
چنانچہ جن سے منتخب ہونے والے بسکھ ممبروں اور بدھ سنگھ نے قواس کو برملا طور پر
ایک کھلونا اسمبلی قرار دیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کو
چیلنج کرنے کے لیے اس کے افتتاحی اجلاس کا بائیکاٹ بھی کیا تھا۔ یوان کے فرش پر
مسلمان اور ہندو نمائندوں نے جب اپنے اپنے نقطہ نگاہ کو پیش کیا۔ تو ان کے مابین غلط
فہمی اور بدگمانی کی دھند چھٹنے لگی۔ یہ احساس عام ہونے لگا کہ دراصل مقابلہ ہندوؤں
اور مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ قانون اور مظلوموں کے درمیان ہے۔ چنانچہ غیر مسلم
اور مسلم ممبران سب ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور آخر کار ۱۹۳۲ء میں یونیاں دیکھ
کر رنگ دھجی کہ جنوں اور کشمیر کے لگ بھگ تمام منتخب ممبروں نے بیک وقت اور

ایک زبان ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اسمبلی سے واک آؤٹ کیا۔ اس وقت
صرف ایک ممبر پنڈت امر ناتھ کاک ہی ایسے رہے جو اس یک جہتی کے مظاہرے
سے الگ رہے۔

سرو شروع ہوئی تو میں نے میدانوں کا رخ کیا اور لاہور پہنچ گیا۔ اسی دوران
میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوئی۔ جواہر لال حسب و نسب سے ایک
کشمیری تھے ان کے اجداد نے منٹن شاہ فرخ پور کے عہد میں کشمیر کے ناسازگار
حالات سے تنگ آکر ہجرت کی تھی اور شاہجہاں آباد یعنی دلی کے چاندنی چوک کے
نزدیک نہر سعادت علی خان کے کنارے رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ اسی نسبت سے
”نہرو“ پکارے جانے لگے تھے۔ ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو ہندوستان کی
لنگا جمنی تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔ اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے فائدہ
نے ہندوستان میں تحریک آزادی کے لیے کام کرتے ہوئے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔
نہرو کو ہی صدارت میں ۱۹۴۷ء میں دلی کے کنارے کانگریس نے مکمل آزادی
کا نڈیوشن پاس کیا تھا۔ جواہر لال ہندوستان کے حریت پسند طبقے کے محبوب بن
گئے تھے اور علامہ اقبال جو سیاسی طور پر جواہر لال سے اختلاف رکھتے تھے، ان کے
اس رول پر ایک کشمیری کی حیثیت سے فخر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اپنی وفات سے کچھ
ہی عرصہ قبل انہوں نے اپنے سیاسی حلیت محمد علی جناح کو سیاست کار اور جواہر لال
کو محب وطن کہہ کر یاد کیا تھا۔

جواہر لال کے دلی میں نے علامہ اقبال کی ہی طرح کشمیر کے لیے گہری تڑپ
دیکھی۔ وہ اپنی مادری وطن کو ظلم و جہالت سے نجات دلانے کے لیے بے تاب تھے۔
میں ان کے علاوہ بھی بہت سے قوم پرست لیڈروں سے ملا اور مجھے یوں لگا کہ

جب میرے خیالات ان دوستوں کے موافق نہ ہوتے تھے اُس وقت تو ان کی مخالفت قابل فہم ہو سکتی تھی لیکن بظاہر جب حالات کے متعلق میرے خیالات و نظریات اُن کے موافق بھی ہوتے ہیں یہ دوست پھر بھی تصحب کی نینک لگا کر شک، بدگمانی اور بغض و حسد کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ کر نکال ہی لیتے ہیں ہر حال میرے بیان مندرجہ بالا کا پنجاب کے بہت سے عقلمن میں کافی گرم جوشی سے غیر مقدم ہوا اور بہت سے اخبارات، راہنماؤں اور رائے عامہ کے معتبر اداروں نے اسے ریاستی سیاست کی بنیادیں وسیع کرنے اور قوم پرست سیاست کی طرف ایک بڑا قدم قرار دیا۔

لاہور سے واپس لوٹنے پر میں نے اپنے نقطہ نظر کو مسلم کانفرنس کے سامنے رکھا۔ کچھ تردد رکھنے والی آوازیں ضرور بلند ہوئیں لیکن اکثر فریقی میرے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے تھے۔ یہ کسی حسن اتفاق یا عارضی مصلحت کوئی نہ نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے لیے تحریک حریت کی ابتدا سے ہی بنیادیں ڈالی گئی تھیں۔ ہم نے کسی بھی وقت پٹنہیں سوچا تھا کہ ہم اپنے غیر مسلم حمایتیوں کی قیمت پر اپنے حقوق حاصل کریں گے بلکہ ہم ایک نئے کشمیر کا تصور اپنے اقلیتی برادران کی بہبودی کے موافق ہی نہیں سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہم نے بار بار ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ بد قسمتی سے ریاست کے اندر اور باہر مفاد و مصلحتوں کی وجہ سے اس جارحانہ انداز سے مرگرم تھا کہ انہوں نے کچھ دنوں تک غیر مسلم حضرات کو غلط فہمی کی دھند اور بدگمانی کے غبار میں گم کر کے ہم سے دور رکھا۔ لیکن اب صورت حال واضح طور پر بدل رہی تھی خود ہندوؤں اور سکھوں میں ایسے روشن خیال عناصر پیدا ہونے لگے تھے جو تحریک کے امکانات کا بخوبی اندازہ لگا رہے تھے انہیں بھی یقین ہو گیا تھا کہ ریاست کے تمام لوگوں کی نجات مل بیٹھ کر کام کرنے اور ایک جوکر جدو جہد کرنے میں ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو

کشمیریوں کی نجات تنگ دائروں سے نکل کر ایک قومی دھارے میں شہر آڑہ بند ہونے میں ہی متصف ہے۔ میری ملاقات اُن ہی دنوں مشہور قوم پرست مسلمان لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچھلوسے بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے بزرگ بھی کشمیر سے ہی اگر امرتسر میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ بھی اپنے وطن و لاف یعنی کشمیر کے لیے درد مندی کے جذبات رکھتے تھے اور انہوں نے بھی میرے جذبات و خیالات کو تقویت پہنچائی۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہی مکان پر ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کیا جس کو کشمیر کی تحریک آزادی کا ایک اہم موڑ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اور باتوں کے علاوہ کہا،

”کشمیر میں فرقہ وارانہ کھنچاؤ بہت حد تک پنجاب کے فرقہ پرست لیڈروں کے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ ہمارے اندر دینی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کریں۔ میرا آئندہ پروگرام کانگریس کے اصولوں پر کام کرنا ہوگا اور میں مغربی وطن جا کر اس قسم کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہوں جو قوم پرور نظریے کی حامی ہو۔“

میرے اس بیان سے کشمیر کی سیاسی مضامین آتش فشاں چم گئی۔ پنجاب کی کچھ مسلمان جماعتیں تو پہلے ہی اپنے تصورات و تضادات کی وجہ سے میری بری بن چکی تھیں اب اُن کی رونق کچھ اور بڑھ گئی۔ حد تو یہ ہے کہ کشمیر میں ہندوؤں کے ایک گروہ نے اس پر نظر اور برأت مندانہ اور مخلصانہ بیان کو مکرو فریب اور حکمت عملی سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُن دوستوں کی ذہنیت اُس کے بعد بھی بہت کم بدلی۔ انہوں نے مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف نہیں کیا کہ پہلی بار بے زبان کشمیری عوام کی ترجمانی کا حق ادا کرنے میں اپنا فرض ادا کیا۔

بتایا تھا کہ پر جاسپا میں ہندو اور مسلم غلامندوں کے تین حکومت کے رویے نے بھی دونوں کو ایک دوسرے کے دکھ دوسے آشنا کرنے میں اہم حصہ ادا کیا تھا۔ پتلی بات تو یہ ہے کہ ایک متحدہ اور سیکورلیٹ فارم قائم کرنے کا بیج اسی دن بویا گیا تھا جب جولائی ۱۹۳۷ء میں پنڈت پریم ناتھ بزاز سے میری ملاقات چشمہ شاہی کے باغ میں ہوئی تھی۔ بزاز صاحب میرے ہم سن اور ہم عصر ہیں۔ اور میں انہیں اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا۔ گلینسی کمیشن میں ایک ممبر کی حیثیت سے انہوں نے جس تدریس، مطالعہ، فہمی، دوراندیشی اور جرأت مندی کا ثبوت دیا تھا اس نے میرے دل میں ان کے لیے عزت پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کو بتایا تھا کہ مساک کو ہندو اور مسلم کے تنگ غافوں میں بانٹنے سے مشکلات گھٹنے کی بجائے بڑھتی جائیں گی۔ اور انہوں نے اپنے مسلک کے لیے غیر مقبولیت کا عذاب بھی سہا تھا۔ چشمہ شاہی کی ملاقات میں مجھے یوں لگا کہ ان کا دل بھی میرے دل کی طرح ایک ہی تال پر دھڑکتا ہے یہیں ابتدائی گفتگو کے بعد اتفاق رائے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں وقت نہیں ہونی کہ کشمیر کی تحریک کو با معنی، با مقصد اور کامیاب بنانے کے لیے اسے ترقی پسندانہ اور جمہوری بنیادوں پر چلانے کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ ہم اس غرض کے لیے وقتاً فوقتاً تبادلہ خیال کرتے رہیں گے۔ پتا نچو ایسا ہی ہوا ہم نے تحریک کو قومی بنیادوں پر چلانے کے لیے ایک اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اگست ۱۹۳۷ء میں ”اردو ہفتہ وار“ ”بھرد“ کا جسے میں نے بزاز صاحب کے ساتھ مل کر جاری کیا تھا، پہلا شمارہ مشہور قوم پرست رہنما ڈاکٹر سیف الدین کھلوسے حضورِ باغ کے ایک بڑے جلسے میں جاری کیا۔ بزاز صاحب نے جہاں اس کی دفتری اور ادارتی ذمہ داریاں سنبھالیں وہاں میں اخبار

کے لیے مالی وسائل بہم کرنے میں لگا رہا۔ مولانا محمد سعید مسعودی اخبار کے دوسرے مدیر تھے۔ اخبار نے ملک میں قومی نئیات اور ترقی پسندانہ خیالات کے پھیلاؤ میں کافی کام کیا۔ اور عوام میں کافی مقبول بھی ہوا۔ لیکن یہی ایک اور آویزش کا نقطہ آغاز بھی ثابت ہوا۔ پنڈت بزاز کو جو بھی محسوس ہوا کہ اب اخبار خود کفیل ہونا شروع ہو گیا ہے اور وہ اسے میری امداد کے بغیر جاری رکھ سکتے ہیں تو ان کے من میں چور پیدا ہو گیا۔ انہوں نے حیل بہانے کھڑے کر کے مجھے سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ میں بھانپ گیا کہ ان کے من میں مایا موہ نے مزید لاپسہ۔ لیکن میں ہرگز اس بات کا روادار نہ تھا کہ یہ معمولی بات ہمارے باہمی تعلقات میں رخنے کا باعث بن جائے۔ اس لیے میں نے اخبار سے علیحدہ ہونے اور اس کی ملکیت مکمل طور پر بزاز صاحب کے ہاتھ سونپ دینے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر شمعونا آٹھ پشیں ہمارے مشترک دوست تھے۔ انہوں نے اخبار کے اثاثے کا تخمینہ لگا کر مجھے ایک طے شدہ رقم ادا کروائی اور پنڈت بزاز بلا شرکت غیرے اخبار کے مالک بن گئے۔ جس کو وہ بعد میں بڑی دیر تک کامیابی سے چلاتے رہے۔

پنڈت بزاز ایک ہوشیار آدمی ہیں اور دھن کے کپے بھی۔ سیاسیات میں ایک وسیع نظر رکھتے ہیں اور سب استعداد حق و انصاف کے لیے آواز بھی بلند کرتے رہتے ہیں۔ مگر کسی اصول پر استعلا سے قایل رہنا وہ شاید کوئی خوبی تصور نہیں کرتے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری اصول زور ہے جس نے ان کی بہت سی خوبیوں کو گھٹا دیا ہے۔ بقول غالبؔ

فارت مگر ناموس نہ ہوگر ہو پس زر
کیوں شاہد گئی باغ سے بازار میں آئے

اسی کمائی کی روشنی دہلی میں اُن کے دولت کدے کی شکل میں مجسم ہو کر ”گلاش آگر“ بن گئی۔ جب سرحد پار سے سیال چاندی کے سونے ٹنک ہو گئے تو اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر پاکستان کے خلاف ہو گئے۔ اور یہاں یہ تراشا کہ مارشل ایوب خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان میں بھارت ختم ہو گئی ہے۔ بنزاز صاحب کی ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ شناسائی بھی اس پر جاتی مشورہ ”دولت“ سے وفا داری کی بنا پر ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں جب کانگریس نے انگریزوں کی جنگ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو انگریزوں کو اسے جبری ثابت کرنے کے لیے ہندوستانی اخباروں اور ڈھنڈور جیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں ایم۔ این۔ را۔ اور اُن کے ہم خیالوں کا گروہ منہ مانگے داموں مل گیا۔ بنزاز صاحب کی سونگھنے کی جس پیسے کے معاملے میں غضب کی واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ نادر موقع دیکھا تو فوراً اس جنگ زرگری میں ایم۔ این۔ را۔ کے ہتھیار بن گئے۔ حکومت ہند اُن کے اخبار کی ہزاروں کاپیاں خریدتی تھی۔ اور اس طرح ان کو مالا مال کر رہی تھی غرض بنزاز صاحب نے سیاست میں ہمیشہ اشرافیہ کے نشان کو اپنے لیے بال ہٹا خیال کیا اور اس سے نباہ کرتے رہے۔

پنڈت بنزاز نے کشمیر پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کا اپنی رنگین عینک سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کاش وہ اپنی تحریروں میں ایک ناظرِ قرار اور صداقت پسند مؤرخ کا طرز اپناتے! مگر انہوں نے ہمیشہ واقعات و حالات اور شخصیات کو اپنے تعصبات کے آئینے میں دیکھ کر ان کے صحیح عہدِ حال سے روک دیے ہیں۔ میری نسبت بھی انہوں نے جگہ جگہ غلط فہمی کی ہے اور تقریباً ہر جگہ ایسی ہمنوا پسند کے رنگوں میں پیش کرنے میں پابندی دکھائی

جتنانچہ اُن کی یہ کمزوری اتنی شہرت یافتہ ہے کہ اُن کے اپنے فرقے کے لوگوں نے اُن پر یہ الزام لگایا کہ اُن کے گھنسی کشین سے استغنی دینے کی وجہ اُن کی اصول پرستی سے زیادہ مالی نقصان کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ گھنسی کشین کے رکن کی حیثیت سے وہ مشاہدہ وصول کرنے کے حقدار تھے۔ اخبار ”بھدرہ“ سے میری ملازمت کی کثرت پر بھی اُن کا یہی احساس تھا۔ اخبار کا بلا شرکتِ غیرے مالک بننے کے بعد انہوں نے کئی سیاسی میزبے بدلے۔ وہ نیشنل کانفرنس کی مخالفت اور میر واعظ یوسف شاہ کی آزاد مسلم کانفرنس کی حمایت میں اپنا سارا زور قلم صرف کرتے رہے اور وہ بھی اس ڈھٹائی سے جیسے بھدرہ آزاد مسلم کانفرنس کا ترجمان تھا۔ مولوی صاحب کے پیروں کو بنزاز صاحب کی یہ روش بڑی بھائی اور اُن کے حلقے میں اخبار کارانی مقبول ہوا۔ اس طرح سے بنزاز صاحب سکون کی کھنک سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن میرے لیے یہ بات ایک اچھے سے کم دہجی کہ بنزاز صاحب جو روشن خیالی اور سیکرل سیاست کے اس قدر سرگرم وکیل تھے کس طرح راتوں رات میر واعظ کی قدامت پسند جماعت کے ڈھنڈورچی بن گئے۔ بنزاز صاحب نے بعد میں محمد علی جناح کے حق میں لکھنا شروع کیا اور دو قوی نظریے کے خود ساختہ وکیل بن گئے۔ وہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے خلاف خوب خوب نہرا چھلنے رہے بعد میں انہوں نے کسان کانفرنس کے نام سے ایک جماعت کو نیشنل کانفرنس کے خلاف کھڑا کرنے میں کافی سرگرمی دکھائی مگر یہ بیل بھی منڈے نہ چڑھ سکی۔ ۱۹۵۷ء میں جب ہم نے تحریک ”کشمیر چھوڑو“ شروع کی تو پنڈت بنزاز نے اسے ”فٹنڈو کی تحریک“ قرار دینے میں محمد علی جناح صاحب کی جی بھر کے ہمنوائی کی اور رام چندر کاک کے منظم کے عقیدے لکھے۔ بعد میں کشمیر پر پاکستان کے موقف کے حق میں کئی کتابیں اور رسالے شائع کیے۔ اور حکومت پاکستان سے خوب ہاتھ رنگ لیے چنانچہ

ہے لیکن چاڈو وہ جو سرچڑھ کر بولے۔ وہ بار بار اپنے بیانات کی تردید و تکذیب بھی کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے غیر سیاسی موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہاں اپنے قلم کی روانی دکھائی ہے۔ اس لیے میں نے ذاتی اختلافات کو نظر انداز کر کے جوں و کشمیر کچل اکادمی کے صدر کی حیثیت سے انہیں ۱۹۷۹ء میں اکادمی کا اعزازی فیلو بنایا۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات کسی نہ کسی رنگ میں جاری رہے لیکن ۱۹۷۹ء میں ان کا ایک خاندانی کام برکاری قواعد کی حد بندی کے باعث پورا نہ کیا جاسکا اور وہ مجھ سے بگڑتہ ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے ۱۹۷۹ء میں میرے خلاف قایم ہونے والے ”عظیم جتنا محاذ“ میں پھلانگ لگائی۔ انہیں اس وقت یہ قطعی طور پر یاد نہ رہا کہ وہ عمر بھر بے پرکاش نرائن، مراری ڈیسائی، بگبیرن رام، اٹل بھاری واجپائی وغیرہ کے خلاف بولتے اور لکھتے رہے ہیں۔ لیکن اتفاق سے یہ محاذ منہ کی کھا گیا اور اس کے ساتھ ہی پنڈت، راز راقوں رات سرینگر سے غائب ہو کر دہلی کے گلشن آگڑہ میں پھر پناہ گزین ہو گئے اور اب وہ وہیں سے غلط سلسلہ رپورٹوں پر مبنی کتابیں لکھ کر میرے ساتھ اپنی پرائیویٹ کو تازہ کرتے رہتے ہیں یعنی

کچھ نہیں ہے تو صداوت ہی سہی

▲▲▲

(۲۳)

کچھ تاریخ ساز واقعات

ادھر کشمیر میں ہماری تحریک وسیع سے وسیع ترمیم افوں کا احاطہ کر کے بچپن سے جوانی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی ادھر ملکی اور قومی سطح پر کچھ ایسے واقعات جنم لے رہے تھے جن کا ہماری آئندہ تاریخ پر بہت گرا اثر پڑنے والا تھا۔ ہندوستان میں جنرل صاحب ایک عرصے کی خاموشی کے بعد کانگریس کی نائنندہ حیثیت کو چیلنج کر رہے تھے اور مسلمانوں کو قومی دھارے سے الگ کر کے اپنی دوکان چمکا رہے تھے۔ جنرل صاحب کے ساتھ کانگریس میں اچھا سوک نہیں ہوا اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی انا (۱۹۵۵ء) اب کسی طرح بھی اپنا لوہا منوانا چاہتی تھی۔ جنرل صاحب اپنے آپ کو جہات گاندھی سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور سمجھتے تھے۔ اور کسی نہ کسی طرح قومی سطح پر ایک ممتاز مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت کے کانگریسی لیڈروں نے ان کے ارادوں کے استقلال کو نہ پہچانا اور کانگریس کچھ میں تنگ نظری کا جو میلان رہا ہے اس کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے نتائج بعد میں سارے برصغیر کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً سمجھنا پڑے، جو سستے تو کانگریسی کو تاء نظری کے شکار لیکن مایوسی

میں ستر چنانچہ کی خودی کی شان کے ہتھے چڑھ گئے اور اسی تیز دھارے میں اپنا وجود بھربان کر کے اٹھے۔ دوسری طرف کانگریس اور مسلم لیگ ریاستوں کے تئیں اپنا نقطہ نظر واضح کر رہی تھیں۔ اور اس میں کانگریسی نقطہ نظر ریاستوں کے عوام کے حق میں اور مسلم لیگ طریقہ کار ریاستی راجاؤں کے حق میں ٹھیک رہا تھا۔ ہم پر بھی اس کا اثر ہوا اور ہم بے اختیار کانگریس کے دھارے کی طرف کھینچے چلے گئے۔

اُن ہی دنوں برطانوی دارالعوام نے ایک مسودہ قانون پاس کیا جس کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ مشعلہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت ہندوستان کو ایک وفاقی ریاست میں تبدیل کرنا قرار پایا۔ ایکٹ کے نافذ ہونے پر وائسرائے ہند نے ہندوستان کے پانچ سو سے زیادہ وائیاں ریاست کو دعوت دی کہ وہ چاہیں تو برٹش انڈیا کے صوبوں کی طرح اس وفاق میں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے تمام نوابوں، راجوں اور جہازوں کو تو اقتدار کی چاٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس وفاق میں شمولیت سے انکاری ہو گئے۔ جہاز جاہری سنگھ کا رد عمل بھی بعینہ یہی تھا۔ مسلم کانفرنس کا عندیہ اس سلسلے میں یہ تھا کہ اگر ریاست جوں و کشیر کو مجوزہ وفاق میں شامل ہونا پڑے تو اس میں تمام اندگی کا حق عوام کے ہتھے ہوئے نمائندوں کو ہی دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء میں اسی ایکٹ کے تحت کانگریس نے برطانوی ہند کے صوبوں میں پہلی ہندوستانی وزارتیں قائم کیں اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہی ایکٹ کشمیر کے ہند کے ساتھ اس مشروطہ افاق کی بنیاد بنا جس پر جہاز جاہری سنگھ نے دستخط کیے۔

۱۹۴۷ء میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ جس کی بازگشت اب تک ریاست کے معاملات میں سنائی دے رہی ہے اور جس نے بعد میں ایک عالمی اہمیت اختیار

کی ہے۔ یہ برطانوی حکومت اور جہاز جاہ کے درمیان ہنگامت کی ٹکرائی سے متعلق معاہدہ تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان کی سرحد پر واقع کشمیر سے اس لحاظ سے خاص طور پر بہت دلچسپی تھی کہ اس کی سرحدوں سے اُن کے دیرینہ حریف روس کی سرحدیں ملتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے انیسویں صدی سے ہی روس کے خلاف جاسوسی اور دوسری سرگرمیاں ریاست کی سرزمین سے ہی شروع کر رکھی تھیں جہاز جاہر نے سنگھ کے وقت میں تو یہاں روسی زبان سکھانے کا ایک خاص کتبہ کھولا گیا جس کا مقصد ان ہی سرگرمیوں کیلئے تربیت یافتہ جاسوس کو تیار کرنا تھا جب روس میں بالمشیک انقلاب رونما ہو گیا تو برطانیہ کی تفریق کچھ اور بڑھی اور گلگت کے فوجی قہقارے اٹھنے لگے۔ انگریزوں نے اس وقت ہند میں مرکز ہونے لگیں۔ جہاز جاہ کی حکومت کو انگریز راج کی طرف سے پشت پناہی مل رہی تھی۔ اور اس کا سنگھ اس عوامی تحریک کی بھرپور موجودگی سے بچنے کے لئے ہمارا تھا چنانچہ اس کو انگریز کا دست شفقت ہی ڈولنے اور ڈوبنے پکارا تھا۔ ایک شکر گذار جہاز جاہ نے آؤ دیکھنا تماؤ گلگت کے خطے کی ٹکرائی عظیم راجا کو سنب دی۔ اور اپنے سپر سلطنت انگلش بہ کو خطاب کو حق بجانب ثابت کر دکھا یا۔ اس معاہدے سے جہاز جاہ کے حب الوطنی کے دعووں کا پول کھل جاتا ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی گدھی کی حفاظت کے لیے انگریز کے ہاتھ ساری ریاست کو خود خست کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جہاز جاہ کو یقین تھا کہ انگریز ابھی کئی دہائیوں تک ہندوستان کے سیاہ بونیہ کے مختار بنے رہیں گے۔ اُس کے پر دادا گلاب سنگھ نے خطہ ہند میں ہندوستان کی پہلی تحریک آزادی کو پھیلنے کے لیے اپنے حیدر سات ہزار فوجی دہلی کے محاصرے میں انگریزوں کی مدد کے لیے بھیجے تھے۔ اور اب اس کا پڑ پڑتا ہندوستان کے شمالی دروازے کی

دن بڑے ہوش اور جذبے سے منایا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھائیوں نے بھی حکومت کے اختیار و اقتدار میں عوام کو شریک کرنے کی مانگ کی تاہم یہ شخصیت حکومت کے ایوانوں کو کرہ گئے ۱۹۳۲ء میں پونچھ میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس میری صدارت میں منعقد ہوا۔ میں نے اس وقت کے اہم ترین مسئلے یعنی ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کو اپنے خطبہ صدارت کا خاص موضوع بنایا۔ میں نے اپنے خطبے میں کہا:

”ذمہ دار نظام حکومت اور خود مختار نظام حکومت کو ہم آج ہی اپنا نصب العین نہیں بنائے لگے ہیں بلکہ یہ مطالبہ تو تحریکِ تحریت کی ابتداء سے ہی مقصدِ اعلیٰ کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہا ہے۔ خاص طور سے جب ۱۹۳۳ء میں موجودہ آئین ساز اسمبلی کا آئین مرتب ہو رہا تھا، اس وقت ذمہ دار نظام حکومت کا مطالبہ ریاست جموں و کشمیر کے کوٹے کوٹے سے کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے موجودہ آئین کا مطالبہ مسلم اکثریت کے ساتھ متفق نہیں رہا بلکہ اقلیتیں بھی اب بہتر آئین کا مطالبہ کر رہی ہیں۔“

ہماری تحریک کو بعض حضرات ہندوستان کی تحریک کا محض عکس اور غورخہ جیسی قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ دیکھنے کی زحمت برداشت نہیں کرتے کہ ہماری تحریک اپنے مزاج اور ذہن کے لحاظ سے ہر وقت ہندوستانی تحریک سے زیادہ فراخ دل، روادار اور روشن خیال تھی۔ اور ہم نے جو نصب العین اختیار کیے کئی سال کے بعد ہی ہندوستان کی تحریک اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کر لی۔ مثلاً میرے اس خطبہ صدارت کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ اقلیتی فرقہ کی طرف سے جو شبہات ہمارے بارے میں ظاہر کیے جا رہے تھے ان کے

نجیباں انگریزوں کے ہاتھ میں دے کر اپنی نمک حلائی کا ثبوت دے رہا تھا۔ معاہدے کی رو سے ہمارا جاہلگت کے فوجی اور سول انتظامات سے دست بردار ہو گیا اور یہ طلاق ساتھ برس کے لیے برطانوی حکومت کی براہ راست نگرانی میں چلا گیا۔ معاہدے میں کچھ رسمی الفاظ ایسے بھی رکھے گئے جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ہمارا جاہری سنگھ کی سرکاری ہنگت پر بحال ہے لیکن بعد کے سنگین واقعات کے ایک ہی پتھر سے اس خوش فہمی کا ازالہ کر دیا۔ ہنگت کو برطانیہ کی تحویل میں دے کر ہمارا جانے جس کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیا اس کی وجہ سے آج سارے خطے پر اعلیٰ ہنگ کے ہی نہیں بلکہ گرم ہنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر ہمارے سروں کے اوپر ہوئی ہے یہ آخرہ اپنی کوکھ میں کیا کیا ساخت و حادثات لانے والی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس لیے کا مصدق ہمارا جاہری سنگھ ہے۔

۱۹۳۵ء میں مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس سرینگر میں ہوا جس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں پہلی بار غیر مسلم رہنماؤں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا اور اس اجلاس کے منتخب صدر چودہری غلام عباس کا ایک شاندار ردِ یاںی مجلس نکالا گیا۔ جلوس خواجہ غلام نبی بھٹکار اور منشی غلام محمد نے منظم کیا تھا۔ اور اپنی شان و شوکت اور عوامی شرکت کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ میں اس اجلاس میں مسلم کانفرنس کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے منتخب ہوا۔

دوسرے سال جماعت کا کوئی سالانہ جلسہ نہ ہوا لیکن ۱۹۳۶ء کو ہم نے ساری ریاست میں ”ذمہ دار نظام حکومت کا دن“ منانے کی اپیل کی۔ یہ

جواب میں، میں نے گزارش کی :

”ہمارے پڑوسی ملک برطانوی ہندوستان کے بعض صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور چند ایک میں مسلمان بھی اکثریت میں ہیں۔ وہاں انڈین نیشنل کانگریس نے تحفظ حقوق کی نسبت جو قرارداد پاس کی ہے ہمارا اعلان اس کے معیار سے کافی اونچا ہے۔ ہم نے فرمودہ اور رمی علاقہ کی سہارا لے کر علاقہ اقلیتوں کو حقوق عطا کرنے کے گریز نہیں کیا ہے اور نہ اس سلسلے میں منطقیانہ موٹگیفوں کی آڑ لی ہے بلکہ ہم نے ہمیشہ غیر مبہم الفاظ میں اپنی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے ہیں اور انہیں سمجھتے ہیں شمولیت کی دعوت دی ہے۔ اس پر بھی اگر ریاست کی اقلیتوں کا اصرار ہو کہ انہیں ریاست میں وہی کچھ چلے جو برطانوی ہند میں اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے دیا جائے گا تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی مقرر نہیں ہے۔ اب ہمارے ہندو اور سکھ بھائیوں کا فرض ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر غرور دار نظام حکومت کی زندگی دراز کریں جس کی سخت گیر پالیسیوں سے ہم اور وہ سبھی یکساں طور ناخوش اور نالاں ہیں۔“

ریاستوں کے کروڑوں عوام کے حق خود ارادیت کو راجواڑے اور ان کا ممبرتی انگریز سامراج جس طرح نظر انداز کر رہا تھا وہ بھی ہمارے دلوں میں تلاطم مچا رہا تھا اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری تحریک ایک تنگ کنوینشن میں قید ہو کر پسنگ گرد و پیش سے بے بھر نہیں تھی۔ اُسے روئے عصر کا پورا پورا جوفان اور شعور تھا۔ کشمیر کے حق خود ارادیت کے جس نعرے نے آنے والے برسوں میں دنیا بھر کے ایوان ہلا دیے ان کے بیچ میرے قطبہ صدارت کے ان الفاظ میں ہمک رہے تھے۔

”گوورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ شالہ کا دوسرا حقہ جو فیڈریشن کے ساتھ

تعلق رکھتا ہے اس کا اثر ریاست اور اس میں رہنے والے عوام پر براہ راست پڑتا ہے کیوں کہ فیڈرل اسمبلی اور کونسل کے ایوان میں برطانوی ہند کے ارکان کے دوش بروش ریاستوں کے عوام کو بھی جگہ دی گئی ہے مگر برطانوی ممبروں نے آئین کو ترتیب دیتے وقت ہندوستانی ریاستوں کے آٹھ کروڑ باشندوں کے حقوق کو جس بے دردی سے نظر انداز کیا ہے وہ اس آئین کی سیاہ تاریخ میں سیاہ ترین صفحہ شمار ہوگا۔ ریاستوں کے آٹھ کروڑ باشندے خاص حیوان تصور کیے گئے ہیں جن کی رائے اور خواہش کو حکومت برطانیہ نے کوئی وقعت نہیں دی۔ اور ان کے نمائندے نامزد کرنے کے اختیارات معدودے چند افراد کے حوالے کیے گئے ہیں۔ جن کے تازہ یا سلوک سے کروڑوں انسان پہلے ہی سے نالاں ہیں۔ اگر ریاستوں کو فیڈریشن میں شامل کرنے سے حکومت برطانیہ کا مقصد ریاستوں کی حمایت حاصل کرنا ہے تو یہ مقصد آٹھ کروڑ انسانوں کے قلوب کو مٹھی میں لینے سے حاصل ہو سکتا تھا۔ قوانین اور جہازوں کی محدود حمایت اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی ہندوستان کے وہ قومی کارکن جو اس وقت آٹھ کروڑ مظلوم ریاستی باشندوں کی ترجمانی کرنے سے بچا کھاتے ہیں وہ فیڈریشن کے نافذ ہونے پر ان ریاستوں کو اپنے دوش بروش کھڑا کرنے میں کامیابی نہیں گے۔ ان حالات میں زیادہ دؤر امتیاز فوٹ اور جہاز بے دہی ہو سکتے ہیں جو یا تو فیڈریشن میں شمولیت سے منہا رہیں یا پھر نامزد نمائندوں کی بجائے مرکز میں جانے والے نمائندوں کے انتخاب کے اختیار اپنی رعایا کے سپرد کریں۔“

تاریخ کے ”اگر“ ہمیشہ دلچسپ خامہ فرسائی کا موضوع رہے ہیں۔ اگر ریاستوں خاص طور پر حیدرآباد اور کشمیر جیسی ریاستوں کے حکمرانوں میں تدبیر ہوتا وہ ہوا کا رخ

بہان لیتے اور اسی وقت سے اپنے ملک کے اختیارات میں عوام کی نمائندگی کی راہ ہمارا کرنا شروع کر دیتے۔ تو آج برصغیر کا نقشہ کتنا مختلف ہوتا؟ بعد میں ان حکمرانوں نے اپنی دبی دبی ہوئی نادرہ بچانے اور اپنی ریاستوں کی شخصیت، بچانے کے لیے جو عین کیے وہ ان کے کسی کام نہ آتے۔ کیونکہ وقت نکل چکا تھا کسی کاریہ متولہ کتنا صحیح ہے کہ روزانہ ایک لکھ عین ہے جو پیچھے سے گنتی ہے۔ اگر آپ اس کی دھون کو آگے سے ہاتھ میں لے سکے تو یہ آپ کی نوڈی بن جاتی ہے جو لوگ اس کے آگے نکل جانے کے بعد اس کا تعاقب کرتے ہیں ان کے ہاتھ ضررت کے سوا کچھ نہیں آتا۔

اسی سال محمد علی جناح صاحب پہلی بار کشمیر کی سیاحت کو آتے۔ وہ ابھی قائدِ افغان نہیں بنے تھے۔ لیکن ایک معزز ہندوستانی رہنما کی حیثیت سے مسلم کانفرنس نے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ ریاست میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں اور اس لیے ان کا اور ان کے لیڈروں کا فرض بن جاتا ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ قلوب کریں بلکہ انہیں اپنی سیاسی اور اقتصادی گاڑی کا ایک لازم و ملزوم پہرہ سمجھ کر ان کا بھرپور تعاون حاصل کریں۔ نظر رہے کہ وہ ہماری تحریک کی وسعت کے لیے ہمیں ترغیب دے رہے تھے، قومی اتحاد کے لیے جو جذبہ ابھر رہا تھا اور مذہب و ملت کی جو حد بندیاں مٹ رہی تھیں اس سے کچھ لوگوں کے ماتحتوں پر بل ہی نہیں بلکہ پٹیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ وہ اس اتحاد کو شخصی حکومت کے لیے آخری وار تصور کرتے تھے اور شخصی حکومت کے بلطاعتی کردار کو نظر انداز کر کے وہ صرف یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ ایک غیر مسلم کی حکومت ہے اس لیے اس کو قربت پر بھجانا چاہیے۔ اس غرض کے لیے جب کوئی جائز طریقہ اٹھ نہ آیا تو یہ آوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے

کشمیری پنڈتوں کے ایک تنگ نظر لیڈر شوہر ان فویدار نے مسلمانوں کی دکانداری کے لیے ان کے محبوب پیغمبرؐ کی ذات پر ایک سو فیادہ حملہ کر دیا۔ مسلمان کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہ ہو جب اس کے پیغمبرؐ کی ذات پر کسی جانب سے حملہ ہو تو اس کی شریاؤں میں خون کھولتے ہوئے پانی کی طرح آبلے لگتا ہے۔ فویدار صاحب کی تقریر جیسے کچھ نہ کم تھی۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کے لیے اسے ہندو سبھا کے ترجمان "مارنڈ" میں جل مروت سے شائع کیا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وادی کی فضا لرزے لگی۔ مولوی یوسف شاہ جو سیاسی قلابازوں کی وجہ سے بڑے دھارے سے الگ تھلک ہو چکے تھے اس فضا میں سامنے آ گئے۔ انہوں نے جامع مسجد میں توہینِ رسولؐ پر دفعہ کے بعد ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کی۔ پہوری کمرل میں پولیس جلوس پر ٹوٹ پڑی۔ گولی سے ایک فوجوان شہید ہو گیا۔ اور مولوی یوسف شاہ گرفتار کر لیے گئے۔

میں ان دنوں سرنگر سے ۲۵ میل دور بجہراڑہ میں تھا۔ جونہی میں نے اس اندوہناک سانحہ کی خبر سنی تو میں نے ایک بیان میں کہا کہ "مذہب کسی خاص شخص کا اثاثہ نہیں۔ اگر مولوی یوسف شاہ دو پہر کا کھانا میل میں کھائیں گے تو رات کے دسترخوان پر ہم ان کے ہم نوالہ ہوں گے۔" طوفان مویں مارنے لگا تو فویدار کی سستی گم ہو گئی۔ اور گلے بندٹ بجی گڑ گڑا کر معافیا مانگے۔ وہ ہماری پناہ میں آ گئے۔ ہم نے انہیں پشیمان دیکھا تو ہم نے اپنے کارکنوں کے ہمراہ ایک کھلی کار میں انہیں شہر میں گھمایا جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ شخص پشیمان ہو کر اب معافی مانگ رہا ہے۔ لہذا معاملے کو اب قلم کرنا چاہیے اسی سرنگر سبھنے پایا تھا کہ بڑوچہ میں فرقہ وارانہ قسادات نے اپنا چمن لہرایا۔ میں

فوری طور پر سردار بھٹہ سمجھ اور پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ اور جب تک وہاں امن وامان قائم نہ ہوا وہیں رہا۔

۱۹۳۷ء کے آخری دن کے ساتھ پہلی پرچاسوا کی زندگی بھی ختم ہوئی۔ مسلم کانفرنس نے اسمبلی کے انتخابات لڑے اور پہلے ہی طرح شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ بات یاد رکھنا ہوگی کہ اُس وقت ووٹ کا حق محدود تھا اور ووٹر آبادی کا صرف پندرہ فیصد حصہ تھے۔ لیکن پیر ضیاء الدین بڈگام اور چودھری عبدالکرم میر پوری نے آزاد امیدواروں کی حیثیت سے چناؤ جیتے۔ مگر وہ بعد میں مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے۔ اسمبلی کا پہلا سیشن ۱۹ ستمبر ۱۹۳۷ء کو راج گڑھ محل سرنگر میں ہوا۔ مسلم کانفرنس کے ممبروں نے صرف علف اٹھانے کی رسم میں شرکت کی اور پہلے ہی دن اجلاس سے واک آؤٹ کر کے اعلان کیا کہ جب تک حکومت اُن کے جائز مطالبات تسلیم نہیں کرتی وہ اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہیں لیں گے۔

اسی سال مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانان غلطین کے ساتھ یک جہتی اور یک شوقی کا اعلان کیا گیا۔ ہمارا جاگو انقلاب دیا گیا کہ وہ ہموار ہندوستانی وفاق میں شرکت سے گریز کرے۔ اسی اجلاس میں انٹی فیصد والی مسلم اکثریت کی ریاست جموں و کشمیر کے لیے مسلم وزیر اعظم کی تقرری کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

۱۹۳۷ء کے آس پاس ہی میری ملاقات پنڈت جواہر لال نہرو سے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ اُن دنوں میں اور بخشی غلام محمد لاہور میں تھے۔ نہرو پنجاب پرورش کا گھریں کے صدر میاں افتخار الدین کے جہان تھے۔ ہم نے پنڈت جی سے ملاقات کے لیے میاں صاحب کی رہائش گاہ پر فون کیا اور وہاں سے

معلوم ہوا کہ وہ صوبہ سرحد کے دورہ پر جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن چلنے والے ہیں۔ ہمیں مشورہ دیا گیا کہ ہم ملاقات کے لیے آدھری پہنچ جائیں۔ چنانچہ ہم دونوں ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ پنڈت جی اپنی سرخ و سپید رنگت اور چہرے پر شہ سے کشمیری خدو خال کا دلکش پیکر لگ رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اور ریل کے ٹیبلے میں ہی اس طرح جو گفتگو ہو گئے جیسے ہم برسوں کے دوست ہوں ملتے ہیں ٹرین چل دی لیکن گفتگو اس قدر دل چسپ تھی کہ ہمیں اُنٹے کا خیال ہی نہ آیا اور ہم شاہد رہے کہ اُن سے باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہاں بخشی غلام محمد تو اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ مگر پنڈت جی مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں اُن کے ساتھ صوبہ سرحد چلا آؤں۔ اُن کے اصرار میں اتنی اپنائیت تپاک اور گرمی تھی کہ میں یوں ہی چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاکہ پنڈت جی سے تبادلہ خیال کا تفصیلی موقع بھی ملے۔ میں نے صوبہ سرحد میں اُن کے ساتھ کئی روز گزارے اور اُن کی شخصیت کو قریب سے دیکھا بھالا۔ اُن کے انداز میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ جس پر خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔ اسی دورے میں بادشاہ خان اور دیگر سرخ پوش رہنماؤں سے میرا تعارف ہوا اور بادشاہ خان سے تو دماغی دوستی کے اُس رشتے کی بنیاد پڑی جو زمانے کے زریعہ کے باوجود آج تک قائم اور سرسبز ہے۔ پنڈت جی سے گفتگو کے دوران مجھ پر دیا رفت کر کے بڑی حسرت ہوئی کہ انہوں نے ہماری تحریک کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ ہماری تحریک کے ساتھ صرف ایک ممتاز سیاسی قائد کی حیثیت سے دل چسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ایک کشمیری سپوت کی حیثیت سے اپنے وطن مالوت کی تقدیر بدلنے کی کوششوں سے خوب لڑ لگائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں مادر کشمیر کے ایک فرزند کی حیثیت سے

نوداس بات کا بڑا شوق تھا کہ وہ مجھ سے ملیں جو ان کے الفاظ میں 'سوئی' ہوئی کشمیری قوم کو جگایا تھا۔ انہوں نے مجھ سے تحریک کے متعلق بہتر سوالات پوچھے۔ میں نے سلا بھرا انہیں تحریک کے پس منظر سے واقف کرایا۔ اور ان پر واضح کیا کہ یہ تحریک کسی صورت میں فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تحریک اس وقت تک مسلم کانفرنس کے نام سے جاری ہے لیکن اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ باوجود کوشش کے غیر مسلموں نے ہمارے ساتھ اشتراک کرنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پنڈت جی نے مشورہ دیا کہ ہم تنظیم کے دروازے ریاست کے ہر باشندے کے لیے بلا لحاظ مذہب و ملت کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ غیر مسلموں میں بھی اس تحریک کا ساتھ دینے کی توفیق ہو وہ کسی مکاؤٹ کے بغیر ایسا کر سکے۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہو گا کہ ہندو فرقہ پرست پریس اور جماعتوں کو تحریک پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے کے لیے کوئی دلیل نہ مل سکے گی رخصت ہونے سے قبل میں نے ان کو اور بادشاہ خان کو کشمیر آنے کی دعوت دی جسے دونوں رہتاؤں نے خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔

کچھ ہی عرصے بعد ہندوستان میں اسٹیٹس پروپلز کانفرنس پنڈت جواہر لال کی قیادت میں قائم ہوئی جس کا مقصد راجاؤں کی عملداری کے تحت ریاستوں کے عوام کے حقوق کے لیے تحریک چلانا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر مسلم کانفرنس کے زعماء تحریک حریت کشمیر کی ہندوستان کے قوم پرستوں سے حمایت چاہتے ہیں تو انہیں اپنے نظریات میں وسعت پیدا کرنا ہوگی اور جماعت کے نام اور اس کے دستور میں تبدیلی لانا ہوگی جس کا اتفاق سمجھ لیجئے یا مشیت ایزدی کہ کشمیر کے دوسرے عظیم فرزند اور تحریک حریت کشمیر کے دعا گو اور مرقی علامہ

سرمہد اقبال نے سلا میں مجھے کچھ اسی قسم کا مشورہ دیا۔ وہ ان دنوں عسلیں تھے۔ میں نے انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی ان کے کشمیر میں داخلے پر سلا سے پابندی تھی۔ اس پابندی کو واپس لینے کی درخواست کی گئی۔ لیکن ہمارا جا کی حکومت نے اکتوبر تک انہیں کشمیر آنے کا اجازت نامہ نہیں دیا۔ اور جب اجازت نامہ آیا تو سردی کا زمانہ آگیا تھا۔ اور اقبال نے دوسرے سال کے لیے اپنا دورہ کشمیر ملتوی کر دیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ دوسرے سال وہ جنت ارضی کے بدلے جنت فردوس کی سیاحت کے لیے بلا لیے جائیں گے۔ جب میں ان سے رخصت ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کشمیریوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ایک متحدہ تنظیم میں شیرازہ بند ہو جائیں۔ اور مسلم کانفرنس کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھول دیے جائیں۔ صرف یہی صورت کشمیر کے لیے آزادی حاصل کرنے کی ہوگی ورنہ آپسی اختلافات کو غرض مند اور مفاد مخصوص رکھنے والے دوست آچھالنے رہیں گے۔

مسلم کانفرنس میں قومی تنظیم کا بیج پہلے ہی مضر تھا اب اس کا پیر بہن بدل کر بسے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی گھڑی بھی آئی پہنچی تھی اور کسی شاعر کے الفاظ میں ہر طرف یہ احساس عام ہو رہا تھا۔

بقد شوق ہمیں طرف تنگ ناسے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کیلئے

خواب کی تعبیر نیشنل کانفرنس

مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا عمل کتنا تکلیف دہ اور نازک تھا اس کا کچھ حال تو ان مرحلہ دار واقعات سے معلوم ہو جائے گا جو مسلم کانفرنس کی جنگ نائے کونیشنل کانفرنس کے بے کراں دریائے تک پہنچنے میں پیش آئے۔ لیکن اس کا اصلی ماجرا صرف ان لوگوں کے سینوں کی نور پر لکھا ہوا ملے گا، جنہیں ان چڑا شوب دونوں میں اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے دلوں کے خنجر شاداب بنائے اور ضمیروں کے بیاباؤں کو زریز بنانے کے لیے اپنا لہو پانی کی طرح بہا دینا پڑا۔ مجھے ایک طرف تو اپنے ساتھیوں کی ہمدردیوں اور بے لوثیوں سے بار بار مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور دوسری طرف تحریک کے کامیابیاں اور ہوشیار دشمنوں کی، جو کسی نہ کسی طرح تحریک کی اس وسعت پذیری میں روٹے اٹھانا چاہتے تھے، ریشہ دوانیوں سے دودھ دہا کرنا پڑتے تھے۔ ایک طرف اگر مجھے چودھری غلام عباس، اللہ رکھا ساغر اور عبدالجید قرشی کے تابڑ توڑ اعتراضات کا جواب دینا پڑتا تھا تو دوسری طرف مولانا محمد سعید مسعودی، شبثی غلام محمد اور مرزا فضل شاہ

کی وحلہ یقینی اور بعض حالات میں دشواریاں گھات سے بھی نبرہ آزما ہونا پڑتا تھا۔ مولوی عبداللہ وکیل جیسے لوگ کلمہ کھلا اس نظر سے کے دشمن تھے۔

ان ہی دنوں جنوں میں مسلم کانفرنس کا چھٹا سالانہ اجلاس جون کے آخری ہفتے میں منعقد ہوا۔ اس وقت اگرچہ مشورت کا بڑا دھارا واضح طور پر مسلم کانفرنس کی توسیع کے حق میں بہہ رہا تھا لیکن بہت سے دلوں اور عاص کر جموں کے دوستوں میں ایک تذبذب کا سماں طاری تھا۔ میں نے اس صورت حال کو بھانپ کر اپنے خطبہ صدارت میں کہا،

”یہ ضروری ہے کہ جو لوگ موجودہ نظام حکومت میں مبتلائے مصیبت ہیں انہیں ذمہ دار نظام حکومت کے حصول کے لئے ہماری جدوجہد میں شریک کیا جانا چاہیے۔ وہ لوگ کون ہیں؟ وہ صرف مسلمان ہی نہیں، صرف ہندو اور سکھ ہی نہیں، اجموت اور ہمدردی نہیں بلکہ ریاست کے تمام باشندے ہیں۔ بعض مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آٹھ لاکھ کے آٹھ لاکھ غیر مسلم نہایت آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ خیالی خام ہے۔ دراصل ان میں سے صرف پچھتر ایک ہزار ہی ایسے غیر مسلم ہوں گے جو مصائب و آلام سے بچے ہوئے ہیں۔

ہم ذمہ دار نظام حکومت صرف ۸۰ فیصدی مسلمان آبادی کے لیے طلب نہیں کر رہے ہیں یہ تو ریاست کی سو فیصدی آبادی کے لیے مانگا جا رہا ہے۔ اس لیے اس کو حاصل کرنے کے لیے ۲۰ فیصدی ہندو، سکھ، بودھ اور ہر جموں کو بھی شمولیت کی دعوت دینا اور انہیں اپنے ساتھ ملا کر آگے بڑھنا اس قدر ضروری ہے۔“

میں نے دوسری جانب کی غلط فہمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات

بات کا اندیشہ موجود ہے کہ ایسا کرنے سے تحریک کو در پڑ جائے گی اور جماعت کے اندر غیر مسلم خلوص کے ساتھ نہیں بلکہ مفادِ خصوصی کی ترجمانی اور تنگداشت کے لیے مورچہ قائم کر لیں گے اور دوسری طرف مسلم کانفرنس کے دشمن اسلام کے نام پر ہمارے خلاف مفادِ کفر اکر لیں گے حکومت اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر ہماری صفوں کو تیزتر کر دے گی۔ اپنی جگہ یہ حدیثات درست تھے اور میں ان امکانات سے بے خبر نہیں تھا۔ لیکن سیاسی دنیا کے تجربات نے مجھے قائل کیا تھا کہ مفادِ خصوصی رکھنے والوں کا کوئی دین اور دھرم نہیں ہوتا اسی لیے ہیں اپنی صفت آرائی فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں بلکہ ظالم اور مظلوم کے نام پر ترتیب دینی چاہیے۔ بہر حال ورکنگ کمیٹی نے بھاری اکثریت سے یہ قرارداد جنرل کونسل کی توثیق کے لیے منظور کر لی۔

اب مرحلہ یہ تھا کہ ہم مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس بلاکر اس قرارداد کی توثیق کرایں۔ لیکن حکومت نے فیالات کی کروٹ سے بوکھلائی۔ سرگوبالا سوامی آہنگو کرنی کا لون کی شکایت دہشی کے بعد ۳۳ قلم میں ریاست کے نئے وزیر اعظم بن کر آئے تھے۔ اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک روشن خیال مڈر ہیں۔ وہ جنوبی ہند کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن کشمیر اگر وہ ایک ظالمانہ نظام کے آلہ کار بن گئے تھے۔ اس لئے وہ اپنی سی نہ کر سکے اور اپنے میزبان طبقاتی نظام کے رنگ میں رنگ گئے۔ ان ہی دلوں میں پروردگار کے راجہ محمد اکبر خان کو، جو ایک شریعت، مخلص اور درد مند سیاسی رہنما تھے، حکومت کے خلاف تقریر کرنے کی پاداش میں تین سال قید سخت اور ایک سو روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ اس بے رحمانہ تعزیر سے ہم بھی متاثر ہوئے۔ ہم نے ہارگت کو ”ذمہ دار نظام حکومت ڈسے“ منانے کی اپیل کی۔ سارے ملک میں ایک رُوح پرورد

کی صراحت کی غیر مسلموں کو اشتراکِ عمل کی دعوت دینا نہ زمانہ سازی ہے اور نہ ڈپلومیسی ہے بلکہ یہ ہمارے دل سے نکلی ہوئی ایک پُر خلوص آواز ہے۔

اس اجلاس میں ہم نے واضح طور پر مسلم کانفرنس کا دائرہ وسیع کر کے ایک قومی تنظیم بنانے کا جو خیال پیش کیا اس سے جماعت کے اندر اور باہر تبادلہ خیال اور تضاد آرائی جاری رہی۔ معاملات کو ایک واضح سمت دینے کے لیے میں نے ۲۴ جون ۱۹۳۷ء کو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کر لیا اور اس میں اس سوال پر غور بحث ہوئی۔ تقریباً باؤن گھنٹے تک اجلاس کی نشست جی رہی اور مخالفت میں غورِ خوب دلیلیں دی گئیں۔ ایک مرحلے پر بخشی غلام محمد اور مرزا محمد افضل بیگ بھی چودھری غلام عباس، مولوی عبداللہ دکیل خواجہ احمد دین بانہالی وغیرہ کے ساتھ مسلم کانفرنس کو توڑ دینے کے خلاف رائے دینے لگے۔ لیکن ممبروں کی اکثریت تنظیم کا جامہ بدلنے کے حق میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک وسیع تر قومی مفاد قائم کرنے کے حق میں اس قدر مشیت دلائل موجود تھے کہ مخالفین کی ایک نہ چلی۔ اور انہوں نے بھی اس کی حمایت کرنے میں مرگری دکھائی۔ ورکنگ کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے تمام ترقی پسند عناصر ذمہ دار نظام حکومت کے حصول کے لیے ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ اس لیے ورکنگ کمیٹی مجلسِ عاملہ سے سفارش کرتی ہے کہ آئندہ ہونے والے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کے نام اور آئین میں اس قسم کی تبدیلی کی جائے تاکہ تمام ایسے لوگ جو اس سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے کی خواہش رکھتے ہوں۔ بلا تیز مذہب و ملت، رنگ و نسل آسانی کے ساتھ کانفرنس کے رکن بن سکیں۔ چودھری غلام عباس مرحوم اور اُن کے چند ساتھی محسوس کر رہے تھے کہ اس

فرق دارانہ اتحاد کے نظارے دکھائی دیے اور طول و عرض میں یہ دن انتہائی جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ ان جلسوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی۔ اُدھر شریک نے منظم شکل اختیار کی تو حکومت کے انگریز پھر ڈھیلے پڑنے لگے۔ گوپال موہی آئے تو تھے یہ کہتے ہوئے کہ وہ ریاست میں امن و قانون کی عملداری بحال کریں گے لیکن لگے دار و گیر اور پکڑ و حکم کے پڑنے پر بے آزمائے۔ سرنگری میں دفعہ ۱۲۴ نافذ کر دی گئی لیکن ہم نے اس پابندی کی دھجیاں اڑاتے ہوئے حضرت بل میں ایک بھاری جلسہ کیا جس میں میرے علاوہ پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا مسعودی، کیشپ بھندو، پنڈت جیالال بکلم اور خواجہ غلام محمد صادق نے تقریریں کیں ہم نے دوسرے دن سرنگری کے پرتاپ پارک میں جلسہ کرنے کا بھی اعلان کیا لیکن ۲۹ اگست کو مجھے گرفتار کر کے چھ ماہ قید سخت کی سزا سنائی گئی کچھ دوسرے لیڈروں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ شہر میں زندگی پھر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ جلے جلوس ہوئے۔ گولیاں چلیں اور کئی نوجوان پھر پروانہ وار مادر کشمیر کی مانگ میں اپنے لال لال خون سے سیندر ہو جبرے لگے۔ میری گرفتاری کے دن ایک سرخوش کا ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وزیراعظم آئیگر سیکریٹریٹ سے نکل کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ وہ امیر لکھن پور کے اُس جگہ پہنچے جسے آج لال چوک کہتے ہیں تو ایک نوجوان محمد رجب نامی نے وزیراعظم کی کار پر سوار ہونے کے لیے جھلانگ لگائی۔ کار اُسے روندتی ہوئی کوئی پانچ سو فٹ تک چلی گئی جہاں ایک انگریز نے سرک کے بچوں پر اپنی کار کھڑی کر کے وزیراعظم کی کار کو روکوانے میں کامیابی حاصل کر لی اور اس طرح محمد رجب کی زندگی بچ گئی۔ اُس کے جسم پر دوا پانچ گہرا اور ۲۵ پانچ لمبا زخم آیا۔ ایک ہزار سے زیادہ گرفتار شدہ گان میں ہندو جن غیر مسلم بھی پہلی بار قید خانوں میں ہمارے

دوش بروش برقعہ بانوں سے آشنا ہونے لگے۔ کٹھنہ جیل میں میرے لیے وہاں کوئی بہت اچھے نہیں کئے۔ ایک تو کٹھنہ کی آب و ہوا ویسے ہی مجھے ماس نہیں آئی۔ ڈسٹرکٹ جیل میں کوئی آسائش بھی میسر نہ تھی۔ میرا کھانا بنانے کے لیے ایک اعلیٰ قیدی کی دیوثی لگا دی گئی تھی۔ یہ قید تنہائی میں رہنے کا میسرے لیے پہلا موقع تھا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ اپنے ہم نفسوں سے الگ تھلک رہنا انسان کے لیے کتنے بڑے عذاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائیں کافی وقت ہوئی لیکن آہستہ آہستہ میں اس کا عادی ہوتا گیا اور میرا زیادہ تر وقت چرخہ کاتنے اور مطالعہ میں صرف ہونے لگا۔ اس علاقے میں طرح طرح کے پرندے بھی ہوتے ہیں جو تھ میسورے ہی اپنی سُر ملی چوہا ہٹ سے مجھے جگایا کرتے تھے۔ میں نے بھی اُن سے شناسائی پیدا کر لی۔ اور وہ میرے کونے میں بلا دھوک آنے جانے لگے۔ میں اُن کی پیاری حرکتوں سے لطف اندوز ہوتا اور اُن کو دیر تک چشم شوق سے تاکتا رہتا تھا۔ یہاں وقت بھی آیا کہ مجھے اُن کی رفاقت سے تنہائی میں بہت سکون اور اطمینان حاصل ہونے لگا۔ پرندوں سے میرا یہ شوق بعد میں بھی جاری رہا۔

کٹھنہ کی معیاد امیری کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن منگوا کر پڑھ لی۔ اس مفہم قرآن نے اسلام کی اپنی عالی ظرفی کا جو ہر دریافت کر لیا تھا۔ اور اس کے مطالعے سے میرے قوم پرستانہ خیالات اور راجح ہو گئے۔

اس سے قبل ہم نے اپنے غیر مسلم اتحادیوں کے ساتھ قومی مطالبہ نامی ایک

دستاور شاخ کردی تھی۔ جس میں ذمہ دار نظام حکومت کو ملک کی تمام ملتوں کا علاج قرار دیا تھا۔ اس پر میرے علاوہ مولانا سعید، خواجہ غلام محمد صادق، میاں احمد یار، مرزا محمد افضل بیگ، پنڈت کشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز، سردار بڑہ سنگھ، پنڈت جبالا کل، بخشی غلام محمد، پنڈت شام لال مرآت اور ڈاکٹر شبون ناتھ پٹن نے دستخط کیے تھے۔

مجھے اپنی قید کی میعاد پوری کرنے پر ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو جیل سے رہا کیا گیا۔ سربراہ میں میرے استقبال کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا تھا۔ چپہل ویر سے مجھے ایک گجھی میں بٹھا کر لے جایا گیا۔ جس کو نو گھوڑے کیلچ رہے تھے۔ جلوس کے آگے باوردی گھوڑے سواروں اور سائیکل سواروں کے دستے تھے۔ اور پھر عوام کا ٹٹاٹٹا مارتا ہوا سمندر اُن کے پیچھے تھا۔ شاہی مسجد میں جلوس ختم ہوا اور میں نے ایک بڑے طے میں، جس میں ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں شامل تھے عوام کا شکریہ ادا کیا۔ حکومت متحدہ قومیت کی بنا پر ہماری قرارداد سے ہم اٹھی تھی۔ اور جیسا کہ میرے بعض رفیقوں نے فخر و محسوس کیا تھا اس نے ملک میں اس اقدام کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات پھیلا دیے تھے۔ ہماری قوم صدیوں کی غلامی سے غیبت و اعتقاد کے روگ میں گرفتار ہو گئی تھی۔ لہذا اس قسم کے واسطے اس کی نفسیات کو فوراً متاثر کرتے ہیں لیکن اگر انہیں صحیح صورت حال سمجھا دی جائے تو ان کی پاکیزہ فطرت فوراً حقیقت دیکھنے لگتی ہے۔ میں نے اپنی شدید اسیری کے آثار و مصائب کو سہلانے کی فرصت نہیں پائی اور میں نے ملک کا دورہ کر کے ان بدنامیوں اور بدگمانیوں کا تار و پود کچھ کر رکھ دیا، جو دشمنوں نے ہماری اسیری سے فائدہ اٹھا کر ملکی عوام کے ذہنوں میں بٹ ڈالا تھا۔ اس دورے کے بعد ملک کی نفسیات (PSYCHOLOGY) ایک

انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہو گئی۔ ۲۷۔ اپریل کو مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی توثیق کر دی۔ اور اس کے بعد ایک خاص اجلاس طلب کرنا ضروری بن گیا۔

۱۰۔ اور ۱۱ جون ۱۹۳۵ء کو مسلم کانفرنس کا خاص اجلاس شاہی مسجد سربراہ میں بلایا گیا اور اس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی۔ صادق صاحب کے بزرگ تحریک کی ابتداء ہی اس کے ساتھ وابستہ تھے۔ جب وہ علی گڑھ میں ہی زیر تعلیم تھے تو میں نے انہیں اور مرزا محمد افضل بیگ کو مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے تار دے کر بلایا تھا۔ صادق صاحب میں ہر انسان کی طرح بہت سی خامیاں تھیں لیکن غیر مذہبی سیاست پر ان کا اعتقاد غیر متزلزل تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں جاری رہنے والی طویل بحث میں اپنی روشنی خیالی اور استقلال کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ قویان رہنماؤں کی نئی نسل کے نمائندے تھے۔ اس لیے ہم نے انہیں ہی اس تاریخی سیشن کی صدارت کا اعزاز بخشنا مناسب خیال کیا۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں سیشن کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا:

”مسلم کانفرنس کا یہ اجلاس فیصلہ کرے گا کہ آج سے اسے نیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا جائے اور یہ راست کا ہر کوئی باشندہ جو باطن ہو، عورت یا مرد بلا امتیاز مذہب و ملت اس کانفرنس کا رکن بن سکتا ہے جس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ وہ ذمہ دار نظام حکومت کے قیام اور شخصی آزادیوں کے حصول کو تحریری طور پر اپنا سیاسی نصب العین ظاہر کرے۔“

خواجہ غلام محمد صادق نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

بھی اس تجویز کی مخالفت کر رہے ہیں ان کے ارادوں کے بارے میں ان کی کثرت بڑی اچھی گواہ ہے..... ایک بڑی غلط فہمی یہ پھیلانی جا رہی ہے کہ شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں نے تحریک کو بیچ ڈال دیا ہے۔ یا وہ کانگریس کے ہاتھوں بک گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم گاندھی جی کے چیلے چائے بن گئے ہیں۔ لیکن یہ میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نہ کانگریس کے دست نگر ہیں نہ مسلم لیگ گئے۔ ہم گاندھی اور جناح دونوں کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن ہم ان کے ہاتھوں اپنی تقدیر نہیں دے سکتے۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ ریاستی لوگوں کو اپنے حکمرانوں کے آگے ٹھکانا چاہیے۔ ہم کو یہ بات منظور نہیں۔ جناح صاحب کا کہنا ہے کہ جاری ریاست کی اکثریت کو اقلیت کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے۔ اور ہم اس نظریے کو درست سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے مطالبات کے سلسلے میں کانگریس یا مسلم لیگ کی مدد کا غیر مستقیم کریں گے۔ لیکن ہم اپنے فیملی آزادی کو کسی بیرونی جماعت کے ہاتھوں گروی نہیں رکھ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم سے کچھ گناہ سرزد ہوتے ہوں لیکن ان لوگوں کی نسبت جو اپنے آپ کو مسلمانوں کے حقوق کا خود ساختہ ٹھیک دار جتلاتے ہیں، ہم مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے زیادہ حوصلہ اور جہت رکھتے ہیں۔ یہ بات کہنا مفہم خمیر ہے کہ انہی فیصدی مسلمان تیس فیصدی ہندوؤں سے خوفزدہ ہیں۔ ہم بچے مسلمان ہیں اور خوف ہمارے دلوں میں ہرگز نہیں۔ ہمارا یہ اقدام ہماری بے خوفی کا مظہر ہے۔ آپ لوگوں کو قابض قہم شیر کشمیر کی خدمات کو زیر نظر رکھنا چاہئے اور دشمنوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ بہر حال میں تقریروں اور جوائی تقریروں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ سبھی اشارہ کرتے تھے کہ اس تبدیلی کا سب سے بڑا محرک، وکیل اور حمایتی جی ہی تھیں اور میں بڑے احمد سے عینوں اور حیفوں کے

جماعت کا نام تبدیل کرنے کا فیصلہ اس کے سابق اہل اس میں جوتوں میں کیا گیا تھا۔ اس کو اس لیے التوا میں رکھا گیا تھا کہ رائے عامہ کو استوار اور تیار کیا جائے۔ لیکن ادھر برصغیر میں سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ وفاق میں ریاستوں کی شمولیت نے نہایت اہم نوعیت حاصل کر لی۔ دائرے نے راجواڑوں کو گانگھے کی کوششیں تیز کر دیں اور ہماری ریاست نے وفاق میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔ ان حالات میں ایک متحدہ پلیٹ فارم اختیار کرنے کے سوال کو زیادہ دیر تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔“

لیکن سیشن کی اہم ترین تقریر دراصل چودہری غلام حاس خان کی تھی۔ چودہری صاحب کے دل میں کاٹنا لگا ہوا تھا کہ نیشنل کانفرنس پر کانگریس کا غلبہ ہو جائے گا۔ لیکن میں نے انہیں کہا کہ اگر ہم اپنے مقاصد کے لیے جدوجہد میں ڈٹے رہیں اور اتحاد قائم رکھ سکے تو کانگریس یا مسلم لیگ کو ہم اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ وہ میرے استدلال سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نیشنل کانفرنس کے قیام کے حق میں ایک انتہائی زوردار تقریر میں کہا:

”آٹھ سال پہلے ہم نے ریاستی سیاست کے لیے مسلم کانفرنس کا جو حامی تیار کیا تھا وہ اب بوسیدہ ہو کر تار مار ہو چکا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی تحریک کو ایک شایان شان نئی پوشاک پہنا دیں۔ جو مسلمان مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہونے کی مخالفت کر رہے ہیں وہ دہی ہیں جو مسلم کانفرنس کی بھی مخالفت کرتے تھے۔ حکومت بھی اس نئی تبدیلی سے چراغاں ہو رہی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہ اقدام اٹھایا تو زوردار نظام حکومت کے لیے ان کی پیش قدمی کو روکا نہیں جاسکے گا۔ جیت کی بات یہ نہیں کہ کچھ غیر مسلم

ان اشاروں کو اپنا رہا تھا۔ آخر قزاق داد پر ووٹ ڈالے گئے۔ ایک سو پچیس مندوبین میں سے صرف چار مندوبین نے اپنے ووٹ اس کی مخالفت میں ڈالے۔ اور یہ چاروں مولوی عبداللہ وکیل خواجہ غلام احمد گنائی بھدر رواہی، شیخ احمد دین باہالی اور چودھری حمید اللہ خان کانفرنس سے اٹھ کر پل دیے۔ مولانا ذکریا جعفری حمید اللہ خان کشمیر کے ایک سابقہ شیرپال چودھری خوشی محمد ناظر کے صاحبزادے تھے۔ بعد میں چودھری حمید اللہ صاحب نے ایک اخباری بیان کے ذریعے خصوصی اجلاس میں پاس کردہ تجویز کی حمایت کی تھی اگرچہ وہ بعد میں پھر نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے۔ اور ریاستی پر جا سمجھا میں مسلم کانفرنس پارلیمانی پارٹی کے لیڈر بنے چودھری حمید اللہ مرحوم کو ۱۹۴۷ء کے فادات میں بہت حکیمیت اٹھانا پڑی۔ ان کے بچے مارے گئے۔ بیوی زخمی ہوئیں۔ انہوں نے پاکستان ہجرت کی اور اپنے بچوں کے فراق میں جواں مرگ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ سیشن نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ بتوں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بزل کونسل ورکنگ کمیٹی اور عہدیدار نیشنل کانفرنس کے عہدیدار تصور ہوں گے۔ جب تک کہ نئی تنظیم کے انتخابات نہ ہوں نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں مندرجہ ذیل غیر مسلم ممبر شامل کیے گئے۔ سردار بودھ سنگھ۔ پنڈت جیالال کھم، پنڈت گردھاری دگرہ، پنڈت کشپ بندھو، پنڈت پریم ناتھ بزاز اور جموں کے سردار ہندرسنگھ۔ ہم نے تنظیم کے لیے لال زمین پر سفید ہل والے نشان کا جھنڈا بھی منظور کر لیا۔ اس جھنڈے کا بنیادی ڈیزائن ایک جوشیلے کارکن پنڈت پریم ناتھ درسنے پیش کیا تھا۔ جس میں تھوڑی ترمیم کے بعد اسے منظور کر لیا گیا۔ لال زمین کسان اور محنت کش کے لال لال لال کی ترجمانی کرتی تھی اور ہل اس کا مقب اور کار ساز نشان تھا۔ جس کو زمین میں جوت کروہ

گندم کے ستہری خوشے اور دھان کی دھن بایاں اٹھاتا تھا۔ اُس وقت چند ہی لوگوں کو یقین تھا کہ ایک دن یہ پرچم ہمارے کے محل اور ریاست کے ایوان اقتدار پرستانہ ترنگ کے ساتھ لہنے لگے گا۔ مولوی محمد سعید نے بعد میں اس پرچم کا ایک بڑا دیکھن تراز لکھا جس کے ابتدائی بول ہیں۔

لہراے کشمیر کے جھنڈے طفل و جوان و پیر کے جھنڈے
بازنے بے شمیر کے جھنڈے ہل والے دیگر کے جھنڈے

لہراے کشمیر کے جھنڈے

آں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی تمام اکائیوں نے اپنے آپ کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر لیا۔ اور اس میں ہندو اور سکھ بھی شامل کیے گئے۔ غیر مسلم نوجوانوں میں ڈی پی در، جاجی ناتھ ریشی، شام لال مرانت، سری کٹھ رید، شام لال واٹ اور پریم ناتھ در اور بارہولہ کے کچھ سکھ نوجوان شامل ہو گئے۔

راجا اس کے بعد جن لوگوں نے کلم کلا مخالفت کی تھی وہ تو ہم سے الگ ہو گئے تھے لیکن کچھ دوستوں نے زمین دوز طریقے پر نئی تنظیم کے خلاف کانٹے بچانے شروع کر دیے اس سلسلے میں مولوی محمد سعید اور ریشی غلام محمد نے جو "کارنلے" انجیام دیے ان کی تفصیلات کچھ دوسری کتابوں میں آچکی ہیں۔

ابتدائی دور کا ذکر قیام منزل کی تعمیر کے ذکر کے بغیر اچھا نہیں ہے گا۔ یہ ہماری تحریک کا اعلیٰ مرکز بن چکا ہے اور ایک فعال اور سرگرم تنظیم کی زندگی کے لیے میں اس قسم کی قہن عمارت کی تعمیر اہم خیال کرتا تھا۔ ان دنوں ہمارے پاس بہت ذرائع قوت تھے لیکن پھر بھی میں نے کمر ہمت باندھ ہی لی اس کا نقشہ سر جی ریشی کے انجیر کھانڈے محلان صاحب نے تیار کیا تھا۔ میں نے تمام شہر میں گھر گھر جا کر

اس کی ٹیکمیں کے لیے چندہ نقدی اور جس کی صورت میں جمع کیا۔ کشمیر کی بیٹیوں میں قومی جذبہ اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ انہوں نے اپنے کانوں کی بالیاں اور دوسرے سسے اور چاندی کے زیورات اتار کر دیدیے۔ حالانکہ زیور عورت کی بڑی حسین کمزوری ہوتی ہے اور کشمیری عورتوں کو اپنی عزت کی وجہ سے ویسے بھی بہت ہی کم زیورات نصیب ہوتے تھے۔ میں نے ۱۹۳۴ء میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ۱۹۳۶ء میں اس کی تعمیر پوری ہوئی۔ اس جگہ بلن کی منڈی قائم تھی جسے ہم نے سرکار سے حاصل کر لیا تھا۔ یہ جگہ شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اس کے متصل شاہی مسجد کی عمارت واقع ہے اور یہ جہلم کے کنارے پر ہے۔ اس کے بالکل سامنے مشرقی کنارے پر خانقاہ معنی کا دینی اور سیاسی مرکز ہے اور اس لحاظ سے یہ تحریک کا دل بننے کے لیے بالکل موزوں تھا۔ جس وقت کام شروع ہوا اس وقت صرف ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم جاری تھی میں حتیٰ لیکن عوام کے اثار سے ہزاروں روپے کا سرمایہ جمع ہوا۔ اس کام میں خواجہ عبدالرزاق کینگ، حاجی محمدوانی آہنی گذر، خواجہ حبیب اللہ زرگر نے میرا ہاتھ بنایا۔ بعد میں وقتاً فوقتاً اس عمارت کی توسیع ہوتی رہی۔ خاص طور پر ۱۹۴۹ء کے بعد ہم نے یہاں اوقات اسلے میہ کا صدر دفتر بنایا تو اس کے احاطے اور عمارات کی توسیع کی۔ اس عمارت میں ایک مرکزی ہال چھوٹے جلسوں وغیرہ کے لیے بنایا گیا۔ جو ہماری تحریک کا اعزازی منگراخانہ بھی بن گیا ہے اور جہاں اس کے اہم رہنماؤں اور واقعات کی تصاویر جمع ہیں۔ یہاں پر درمیانہ اور دور دراز سے آئے ہوئے کارکنوں اور مہانوں کے خوددو نوشش اور قیام و طعام کا بھی پورا انتظام ہے۔ بعد میں ہم نے ۱۹۴۹ء میں اسی قسم کا ایک مرکزی دفتر "شیر کشمیر جموں" کے نام سے جوں میں بھی تعمیر کیا ہے۔

مجاہد منزل کو بھی ہماری تحریک کے اہم چڑھاؤ کے ساتھ مقبوع اور سامنے کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ سب سے بڑی آزمائش ۱۹۴۹ء میں آئی۔ جب مجھے ایک شب خون کے ذریعے ذرا بابت علی سے الگ کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ کچھ دنوں تک تو اسے بخشی تلام مجھ کی پارٹی اور اُن کے بدنام ماموں زاد بھائی بخشی عبدالرشید اپنی کارستانیوں کی آماجگاہ بناتے رہے لیکن بعد میں یہاں منزل ریزرو پولیس کی چوکی قائم کر لی گئی۔ اسی دوران یہاں سے تحریک عزت کا نہایت ہی قیمتی مواد اور دستاویزات اڑا لی گئیں۔ کچھ ایسی دستاویزات پرورش کا مگر جس کے دفتر واقع ریڈیو منسی روڈ بھی پہنچائی گئی تھیں۔ جہاں بعض اخباری اطلاعات کے مطابق یار لوگوں نے قومی لیڈروں کے خطوط اور دوسری دستاویزات اڑا کر انہیں اڑنے پونے دامن فروخت کر دیا اور اس مالِ نعمت سے اپنی شاموں کا چراغاں کرتے رہے۔ لیکن اس امر کا اعتراف برحق ہو چکا کہ بخشی غلام محمد نے مجموعی حیثیت سے اس عمارت کی حفاظت کی اور بعد میں اسے اوقات کے سپرد کر دیا۔ ہم نے منزل ریزرو پولیس سے بھی بعد میں کرائے کے طور پر ہزاروں روپے کی خطر رقم حاصل کی جسے مجاہد منزل کی عمارت کی حالت بہتر بنانے کے لیے صرف کیا گیا۔ ▲▲▲

اپنے بھی خفا بے گانے بھی ناخوش!

ہماری تحریک اب اپنے منطقی ارتقاء کی طرف بڑھ رہی تھی مسلم کافر نس کو نیشنل کافر نس میں تبدیل کرنا کشمیر کی سیاسیات میں اپنی نوعیت کا انقلاب اُبھار رہا تھا۔ اچھے احساس تھا کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے اس میں قدم قدم پر خطرے موجود ہیں۔ لیکن قدم آگے بڑھے تھے اُن کو پیچھے ہٹنا کبھی میرا مشیوہ نہیں رہا ہے۔ البتہ جن خطرات اور اندیشوں کا ہم نے اندازہ لگایا تھا وہ توقع سے بھی کہیں زیادہ جلدی ہمارا دامن پکڑنے لگے۔

نیشنل کافر نس کے قیام سے مسلمانوں کے ملازم طبقے کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اب اُن کی دکالت کرنے والا کوئی نہیں۔ انہیں مسلم کافر نس کے مقابلے کی تکمیل سے دلچسپی نہیں تھی مگر وہ اس کو ایک دباؤ دانے والا عنصر بنا کے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ چند ملازمتیں حاصل کرنے سے ہماری نہات ممکن نہیں ہوگی۔ بلکہ ہمیں ملک کے سیاسی آئینی اور معاشرتی نظام کی جڑوں میں چھپے ہوئے روگ کا علاج کرنا پائے گا کیونکہ جب تک جڑ کا علاج نہ ہو نہنیاں ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔ لیکن افراد مسائل کو

قوی سطح سے ذاتی پرہیزگارنے کے درپے لگے رہتے ہیں۔ لہذا ہماری بات مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے سے کو کم ہی راس آتی تھی۔ دوسری طرف غیر مسلم تو ہم سے اور بھی بدکنے لگے۔ انہوں نے اپنے سارے مفادات حکمران طبقہ سے وابستہ کر رکھے تھے اور وہ کشمیر کے ہندو حکمران کے ناطے اسے ایک ہندو راشٹر سمجھتے تھے اُن کا پڑھا لکھا اور دولت مند طبقہ انتظامیہ اور سماجی زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ مسلمان تو خیر پس ماندہ ہونے کے ناطے اُن کے استحصال کا شکار تھے ہی۔ غیر مسلم غریب طبقے پر بھی ان کی گرفت مضبوط تھی وہ کسی ایسی تحریک کی حمایت پر تیار نہ تھے جس کا حکمران پر یا اُن کے مفاد خصوصی پر کوئی ناگوار اثر پڑتا۔ بے دے کے کشمیری پنڈتوں کے آجوان طبقے کا ایک حصہ نیشنل کافر نس میں شامل ہو گیا۔ لیکن اُن پر بھی اپنے فرقے کی طرف سے مسلسل دباؤ پڑتا رہتا تھا اور وہ ہمارے ہر قدم کو مشکوک نظر سے دیکھتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے نیشنل کافر نس میں اس مقصد کے لیے شمولیت کی تھی کہ وہ اس کی پالیسیوں کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال سکیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تو گئے راہ فرار دھونڈتے۔ اعتراضات شروع ہوئے کہ ہمارے جلسوں میں نعرہ نکیہ کیوں بلند کیا جاتا ہے یا جلسے کا افتتاح قرآن شریف کی تلاوت سے کیوں کیا جاتا ہے؟ یہ عجیب منطقی تھی۔ سمجھا اس منطقی کو آگے بے جا بے کو کچھ یوں بات بنتی تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے لیے ”بندے ماترم“ کو اپنا قومی ترانہ چننے میں کیا ننگ تھی؟ یہ بنکم چندر چٹرجی کے ناول ”آئندہ مٹھ“ کا ایک حصہ تھا جو سارے کا سارا مسلمانوں کے خلاف تھا۔ خود اس ترانے کے دواخری بند انتہائی مسلم آزار تھے۔ اس لیے انہیں مذمت کر دیا گیا تھا۔ ”سمبارت مانا کی ہے“ کافر نو کانگریس کے جلسوں میں اکثر بلند ہوتا تھا۔ یہ سمبارت کو ”دیوی“ کا روپ دے کر

دوبی پوجا اور بت پرستی کا سنا تصور پیدا کرتا تھا۔ جو اسلام کے نظریے کو حید کے منافی تھا لیکن مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا اور خود ہمارے غیر مسلم محققین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں ان کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ سامعین کی ذہنی سطح اور تہذیبی فضا کو دیکھ کر نعرے اور تقریر کی زبان استعمال کی جاتی ہے کیونکہ وہ ان سے ماٹوس ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے نعرہ تحریک سے ہی ایک خوابیدہ قوم کو جگایا تھا۔ مسلم کانفرنس میں تبدیل کرنے کا مقصد بھی ہرگز یہ نہیں تھا۔ مسلمان اپنی مذہبی روایات سے کنارہ کش ہوں۔ کیونکہ ہمارا غیر مسلموں سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں تھا کہ وہ اپنے مذہب سے کسی طور پر برگشتہ ہوں۔ میرا پورا یقین تھا کہ ایک مسلمان سچا مسلمان ہونے کے باوجود اچھا قوم پرست اور ایک ہندو کھرا ہندو ہونے کے باوجود پرکاش جگت بن سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ تعصب کی عینک کو آنکھوں پر چڑھائے رکھیں تو وہ کبھی حقیقت کو دیکھ نہیں پاتے۔ مجھے یاد ہے کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں عید میلاد النبیؐ کی ایک تقریب تھی۔ میں نے قرآن کریم کی ایک آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ "اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو ایک روشن چراغ سے تشبیہ دی ہے اور جس طرح سورج چڑھتے ہی ستارے نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اسی طرح پیغمبر اسلام کی بعثت کے بعد اب کسی اور پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ دنیا کے بے اللہ تعالیٰ نے ان کی معرفت چولستہ کیسیا اپنی قرآن بھیجا ہے وہ اتنا مکمل ہے کہ اس کے بعد کسی آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں رہی۔" میری اس خاص مذہبی تقریر کا میرے غیر مسلم دوستوں نے بے تنگ نہ بنایا اور ہنگامہ کھرا کیا۔ پندت جیالا لکھ پندت کی شب بدھو اور پندت پریم ناتھ بزار نے اس پر سخت اعتراض کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اس بات پر

اعتقاد رکھتا ہوں اور جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ اعتقاد ان کے قوم پرست ہونے میں حائل نہیں ہوا اسی طرح میری قوم پرستی میں بھی اس سے کوئی دار نہیں پڑتی۔ لیکن بندھو جو اور کل صاحب تو اس بہانے سے استغفلی دینے کی منزل تک پہنچ گئے اور وہ یہ بھول گئے کہ ہمارا گاندھی اپنے آپ کو بار بار ایک سچا اور پاک ہندو سمجھتے تھے۔ ان کی قوم پرستی کی اس بناء پر پشتہ نہیں تھی۔ لیکن انھیں تو ہمارے کشمکش اور وہ استغفلی دے کر ہی رہے۔ بعد میں پندت پریم ناتھ بزار بھی مشکل کانفرنس سے کوپ کر گئے۔ یہ پندت حضرات اس فریاد کو لے کر جو اسراہل اندر ہو سکے یاں ہی گئے لیکن تہذیبی نے اس اعتراض کو اسی حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دیا جس کا یہ مستحق تھا۔

دوسری طرف مسلمان مہراں بھی قوم پرستی کی اختیار کی ہوئی راہ پر پیش آنے والی مشکلات سے گھبرا رہے تھے اور کسی طرح سمجھنے کی جانب گروش دوران کو دوڑنا چاہتے تھے۔ مجلس احرار سے میری اس بے نہیں بن سکی تھی کہ وہ ہم کو اپنے اشاروں پر نچانا چاہتے تھے اور میں فیصلوں کا حق ملک سے باہر نہیں بلکہ ملک کے اندر رکھنے کا روادار تھا۔ دوسرے انھیں ہماری تحریک سے زیادہ اپنی جماعت کو مضبوط بنانے کی فکر دامن گیر تھی۔ اور وہ ہماری قربانیوں اور مظلومیت کو نیلام کر کے اپنا بھلا کرنا چاہتے تھے۔ تیسرے انھوں نے اپنی تحریک کا ٹھکانہ قادیانیت کی مخالفت کو بنایا تھا۔ اور میں فرقہ وارانہ منافقوں سے بیزار تھا۔ کیوں کہ یہی منافقے کشمیری مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر کے انھیں ایک لقمہ تر بنا چکے تھے جس کو کوئی بھی نیکل سکتا اور نیکل لیتا تھا۔ ہماری تحریک میں مجلس کے چند ہمدرد موجود تھے۔ جن میں مسلم کانفرنس اور بعد میں نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری مولانا محمد سعید مسعودی پیش پیش تھے۔ مولانا مذکور کو رات ملاوہ دروازہ منظر آباد کے رہنے والے تھے

بعد میں آپ نے معذرتاً انقل نقل مکان کیا اور زہرا گام میں آباد ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء میں مولوی سعید صاحب ملکہ تعلیم میں ملازم تھے اور تحریک کے چند رعوں میں شمار ہوتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ملازمت ترک کر کے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ لیکن اپنے علمی عبور، چرب زبانی اور فہم و فراست کی وجہ سے جلد ہی تنظیم کی اعلیٰ سطحوں تک پہنچ گئے۔ بد قسمتی سے ان کے مزاج میں ایک صورت خرابی کی ازل سے ہی مضمر ہے۔ انھیں بشیر لڑائے اور گرد و بند میں بڑا گفت آتا ہے کسی جماعت میں بھی شامل ہو جائیں اپنے ارد گرد ضرور ایک گروہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور پھر پردے کے پچھے سے ناکہ کھینچ کر ان کو جماعت میں تفرق پیدا کرنے کی کتب سکھا لیتے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ اس میں خود ان کے مقاصد اور ان کی ذات ہی کیوں تختہ مشق نہ بنے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کے مزاج کی اس حیران کن خاصیت سے کبھی پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکا۔ مسلم کانفرنس میں رہ کر بھی یہ نوجوانوں کو ہمارے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ اب نیشنل کانفرنس میں گئی۔ اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ لیکن پھر بھی یہ نئی تنظیم کی دیواریں منہدم کرنے کے لیے جوڑ توڑ لڑاتے رہے اور ایک مرتبہ تو ان کی اس خصلت سے تنگ آکر پرنٹڈ پریس ناخوش بزاز نے انھیں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں ”مشتعل کثیر کے“ لقب سے بھی نوازا۔

آدھر جموں کے نیشنل کانفرنس کے رہنما بھی ایک عجیب و غریب یقینی کا شکار ہوئے۔ ہم نے نیشنل کانفرنس بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے محرک ہمارے گرد و پیش کے حالات تھے اور یہ فیصلہ کشمیر کے عوام کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ کسی بیرونی جماعت یا رہنما کے اثر کا نتیجہ ہرگز نہ تھا۔ کشمیری زبان اور کچھ کے لحاظ سے ایک مخصوص انفرادیت کے مالک ہیں۔ یہ راج ترگنی کے خاضع

مترجم سر اسٹیشن اور عظیم ہندوستانی مورخ ڈاکٹر تارا چند تو اس حد تک گئے ہیں کہ کشمیر پر ہندو پاک کا جغرافیائی و تاریخی حوالہ دیتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ بیرونی دنیا سے بہت کم رہا ہے اس لیے انھوں نے اپنی تشکلات کے حل کے لیے کبھی کسی کی طرف دست سوال دراز نہیں کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے ان کا مقابلہ اپنے حالات کے مطابق خود ہی کیا ہے۔ ۱۹۱۷ء کے بعد بھی یہی صورت پیش آئی اور اپنی قزبانوں کی وجہ سے ان میں ایک خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اس کے برعکس صوبہ جموں کے باشندے زبان اور کچھ کے لحاظ سے اپنے ہمسایہ پنجاب کے غالب اثر میں رہے ہیں۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں بھی تھیں اور کاروباری تعلقات بھی۔ چونکہ ریل گاڑی جموں تک آتی تھی اس لیے ملنے جھلنے کی سہولیات بھی خاطر خواہ تھیں۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو یہ دوڑ کر جموں سے لاہور جا پہنچتے اور وہاں سے ہدایات کی پوٹلی لے کر وٹھے ادھر لڑنے کو ایچی میسن سے ملازمتوں میں ہندوؤں کو جو فائدہ حاصل ہوا تھا اس کا زیادہ فائدہ بھی جموں اور پنجاب کے ان مسلمانوں نے اٹھا یا تھا جو پنجابی زبان بولتے تھے۔ وہ مسلم کانفرنس کی نیشنل کانفرنس میں تہذیبی سے اپنے آپ کو بڑا کے ایک حسب خاطر ذریعہ سے محروم تصور کرنے لگے تھے۔ ان میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ اور یہ ذہنی طور پر ریاست سے باہر کے سیاسی رجحانات کے غلام بنے ہوئے تھے۔ باہر کے لیڈر بھی ان کو ایک کم تر ترقی یافتہ نوآبادی کے گنگا گنگا کی طرح اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ صورت کم و بیش آج بھی قائم ہے۔ فرق یہ ہے کہ آج سہاں کے غیر مسلم فوراً جالندھر، امرتسر اور دہلی پہنچ کر ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جموں کے ہندو اور مسلمانوں میں کبھی مضبوط قیادت نہ ابھر سکی۔ جموں کی بات چلی ہے تو وہاں مضبوط قیادت کے کال کی کچھ اور وجوہات

جہوں شہر آبادی اور وسعت کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے لیکن اپنے جہوں نے
کے باوجود یہ ریاست کی راجدھانی اور حکمران خاندان کا آبائی شہر تھا۔ کچھ لوگ رشتے
داروں یا دیگر وجوہات کی بنا پر دربار میں رسائی حاصل کر لیتے عوام میں ان کی
قدر ہوتی تھی اور انھیں عزت و وقار حاصل ہو جاتا۔ دربار میں سفارش کس کے اثر و
رسوخ کی بنیاد پر بن گیا اور سفارشیں زیادہ تر ملامتوں اور جہدوں سے متعلق ہوتی
تھیں۔ ان کو عوام کے بنیادی مسائل سے پس واپس رہی دیکھی رہتی تھی۔ اس صورت
حال میں آج بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے اگرچہ پُرانا نظام بدل گیا ہے۔
لیکن ذہنوں کی ساخت اور عاداتوں کا اصول بدلتے بدلتے ہی بدلتا ہے۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ صوبہ جہوں کی آبادی جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل
ہیں، ذیلی برادریوں اور قبیلہ داری میں بٹی ہوئی ہے۔ ہندوؤں میں برہمن، راجپوت
مہاجن، کھتری، جاٹ، پیڑ، اراٹن، ہری جن، جگت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ بعد میں ان کا
اور بھی ہٹا رہا ہے۔ مثلاً راجپوتوں میں سواں، راجپوت، جوال، سٹاکر وغیرہ۔
برہمنوں اور مسلمانوں میں بھی یہی مسئلہ ہے اور یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ صوبہ
جہوں میں کوئی مضبوط قیادت نہیں ابھر سکی۔

وادی کشمیر کی کیفیت اس سے بہت مختلف ہے۔ یہاں کی پہچان نوے فی صدی
آبادی پر آج سے چھ صدی تک سیکڑوں سالوں کے دروازے ہمیشہ بند
رہے ہیں۔ فوج میں ان کو فوجی قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ حکمران طبقے
نے خاص طور پر شہزادے کے بعد کشمیر کو ایک نوآبادی سمجھا اور یہاں کی مسلم آبادی
کو ہمیشہ دبا کر رکھا۔ اس لیے یہاں جو قیادت ابھرئی اس کے سوچنے کی سطح عوامی تھی

اور اس کی عوامی بنیاد وسیع تر تھی۔ مجھے تحریک کشمیر کی اس منفرد شخصیت کا ہمیشہ گہرا
احساس رہا اور میں نے حتی المقدور بیرونی اثرات کے آگے سر جھکانے سے انکار
کیا۔ چاہے وہ مسلم لیگ ہو یا کانگریس۔ سوشلسٹ ہوں یا کمیونسٹ۔ ہم چند
گام تو ان کے ساتھ چلے غور لیکن مرکز کر اپنے مفادات اور اپنی انفرادیت کے
دائرے میں مراجعت کرتے رہے۔ یہ دراصل کشمیر کی شخصیت اور شناخت
(IDENTITY) کی تلاش تھی۔ کشمیر، تواریخی، جغرافیائی اور تہذیبی سطحوں پر
ایک خاص انفرادیت کا مالک رہا ہے۔ لیکن جسے گزشتہ چار صدیوں سے ہمارے
غیر ملکی نوآبادکار تحقیر، مسخ اور ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ جہیں اس جہد
جہد میں غیر کشمیری مسلمانوں اور غیر کشمیری خیر مسلموں سے لڑنا پڑا لیکن ہمارے
عزم میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔ واقعہ یہی ہے کہ کشمیری شناخت کی یہی تلاش ہمارے
بقا پر غیر مروط اقدامات کو اندرونی اور داخلی معنویت اور تسلسل بخشی ہے۔
میں اپنے نظریہ کسی کے پاس گروی رکھنے کے حق میں کبھی نہیں رہا۔ اکثر دیکھنے میں آ رہا
ہے کہ کچھ لوگ بادشاہ سے زیادہ وفادار ہیں کہ تحریک کشمیر کو بیرونی عوامل کا نتیجہ اور
بیرونی تحریکوں کا دم چھڑا کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ تاریخی دیانت کا منہ چڑھانے کے
مترادف ہے۔ کشمیر کی تحریک ہندوستان کی تحریک کا ان معنوں میں تسلسل ہے جن
معنوں میں خود ہندوستان کی بیدار حالی شعور آزادی کی انگوٹھی سے وابستہ ہے۔
لیکن تحریک کشمیر کے اپنے انفرادی خدو خال اتنے نمایاں اور ممتاز ہیں کہ ان سے
آنکھیں بند کرنے والا چشمہ آفتاب سے آنکھیں میچ لیتا ہے۔ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد
کشمیر کا حکمران ٹولدا اور ان کا غیر ریاستی مفاد خصوصی رکھنے والا انصارہ بھانے والا پریس
چلانا مارا یہ تحریک احراری اور قادیانی انگلیٹ کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مہاراجہ بیکاشیر

نے لندن سے واپسی پر ایک بیان میں کشمیر کی تحریک کو پنجاب کے مسلمانوں کی اکساہٹ کا نتیجہ قرار دیا۔ اُس کا جواب اُس وقت ”سینٹین“ لکھتے کہ نمائندے نے یوں دیا جو ۱۸۴۳ء کے شمارے میں چھپا۔

”ہم برطانوی ہند میں یہ متا کرتے تھے کہ کشمیر کے موجودہ تحریک باہر کے اثر یا پرویگندہ کا نتیجہ ہے یا یہ کہ اندرون کشمیر کے چند تعلیم یافتہ لوگ باہر کے لوگوں کے اُکسانے سے بھڑک اُٹھے ہیں۔ لیکن جب میں کشمیر آیا تو معلوم ہوا کہ یہ اندرونی تضادات و عوامل کی پیداوار ہے۔ پر کشمیری میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے حقوق طلب کرتا ہے۔ اُن میں جو بے لاری پیدا ہو گئی ہے اُس کی وجہ یہی ہے کہ مصائب اور مشکلات نے انہیں خواب گراں سے چونکا دیا ہے۔ مہاراجہ بیکانیر جو ابھی ابھی انگلستان سے لوٹے ہیں کشمیر کے واقعات و مسامحت کے ہرگز شاہد و ناظر نہیں ہیں۔ لہذا اُن کا بیان قابل اعتبار نہیں ہے۔ اُن کا یہ کہنا کہ کشمیر کا تعلق بیرونی مداخلت کا نتیجہ ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کشمیر کی ایچی ٹھیس بیرونی امداد کے بل پر نہیں بلکہ خود اپنے اسباب و عوامل کی بنیاد پر جاری ہے۔“

بعد میں کانگریس کے ساتھ ہمارے اصولوں کی ہم آہنگی سامنے آئی۔ اور کانگریس کے چند لیڈروں نے ہماری امداد بھی کی۔ لیکن صرف اسی بنیاد پر تحریک کشمیر کو کانگریس کے بحر بیکران کی ایک جڑ سے کم آب قرار دینا اُسی طرح ہماری تحریک کے امتیازی بشرے کو نفوذ انداز کرنے کی نا انصافی کے برابر ہو گا جو اس طرح تحریک کے ابتدائی دور کو احراریوں اور احمدیوں کا خوش چین قرار دینا۔ اس صورت حال کا سیاسی سطح پر بھی عکس نظر آیا۔ چودھری غلام عباس جوں میں اپنے گرو میں کاد باؤ برداشت کرنے

کی قوت کھو بیٹھے اور جس نیشنل کانفرنس کی دکالت میں انھوں نے فصاحت کے دریا بہائے تھے وہ کوئی وجہ بتائے بغیر اس سے مستعفی ہو گئے۔ اُن کے ساتھ انڈیا راکھا ساغرو وغیرہ بھی مستعفی ہو گئے۔ دو سال تک چودھری صاحب اپنی بے یقینی کے سمندر میں غوطہ کھاتے رہے۔ لیکن آخر کار مسلم کانفرنس کو زندہ کرنے کے سرگرم حمایتی بن کر سر بیچ پر لوٹ آئے۔ اگرچہ اپنی اس دھول عقل یقینی اور سیاسی مذہب کو وہ بعد میں وہ جاذب نظر انداز میں پیش کرتے رہے۔ ع

دکھائیں راویوں نے طبع کی جولانیاں کیا کیا
ہوئی ہے کیا ہے کیا جب انجمن تک بات سنی ہے

میں ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کی تنگ نظریوں کے درمیان پکے کے دو پاؤں میں بڑے ہوئے داغ گندم کی طرح پیسا جا رہا تھا۔ لیکن یہ آزمائش ٹھیکے اور زیادہ قائل کرو تھی حتیٰ کہ ہمارا بنیادی موقف بالکل طور پر درست ہے نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد اگرچہ ہمارے تعلقات کانگریس رہنماؤں سے بڑھتے گئے لیکن اُس میں کانگریسی لیڈروں کے خلق اور اُن کی میلنساری کا بھی بڑا دخل تھا۔ ہم نے نیشنل کانفرنس کو نہ تو کانگریس میں ضم کیا اور نہ اُن کے پاس اپنے ذہن کو گروی رکھا۔ آج چالیس سال بعد جب میں صورت حال پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہی کشمکش نظر آتی ہے۔ آدھ ایک بڑے طوفان کی لہر تھیں اپنے آغوش میں لے کر ہماری انفرادیت اور شناخت کا نام و نشان مٹانے کے لیے چل رہی ہے۔ ادھر ہم اپنی شخصیت کا تحفظ اس چراغ جلا کر اسے بادِ مخالف کے جھوکوں سے بچا رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اُسہی دنوں کانگریس نے دوسری عالم گیر جنگ چھیڑ جانے کے بعد برطانیہ کی جنگی مہم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اگر ہم کانگریس کے ہتھیاری ہوتے تو ہم کو اس فیصلے پر

آمناء و صدقہا کہنا چاہئے تھا۔ لیکن ہم نے اس نظریہ کو نافذ نہ کیا۔ اس وقت ساری
مذہب و دنیا فسطائیت اور آمریت کے بدترین نظام کے خلاف لڑ رہی تھی۔ روس نے
اپنے سیاسی حریفوں امریکہ اور برطانیہ کا ساتھ اس لیے دیا کیونکہ وہ نازیست کو سب
سے بڑی لعنت سمجھتا تھا اور چچی بات بھی یہی تھی۔ یہ لعنت انگریزوں اور دوسرے
تمام سامراجوں کی بدعت سے زیادہ زہر آلود اور خطرناک تھی۔ ہم نے ایک پریس
کانفرنس بلایا کہ نازی برہمنی کو شکست دینے کے لیے اپنی نیک خواہشات اور حقیر خدمات
کو پیش کیا۔ اس بات سے کچھ ماتحتوں پر ضرور بل پڑے۔ لیکن ہم اس سے نہ مرعوب ہوئے
اور نہ پشیمان۔

ہماری مخالفت میں ہمارے ہندو اور مسلم انتہا پسند مہربان عجیب عجیب
پینترے بدلنے لگے۔ ہمارا ماجرا اس شعر کا سا ہو گیا تھا۔ ع
نا بد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

نیشنل کانفرنس کے کچھ غیر مسلم اراکین نے ۱۹۴۷ء میں ۱۳ جولائی کو ہمارے یوم
شہیدان منانے پر اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ شہید جولائی ۱۹۳۲ء میں کام آئے تھے
مسلمانوں کی تحریک کی حمایت میں مرے تھے۔ لہذا ان کا دن منانے سے نیشنل کانفرنس کا سیکرٹری اور
بجروہ جو ہوائے گم میں ان سے کہا کہ یہ مقدمہ اور پاکستان میں قلم کے خلاف اپنی جائیں بچاؤ اور کچھ اقل
اور انھیں فرقہ وارانہ عصبیت کے ماتحتوں سپرد کرنا انتہائی بے انصافی ہوگی۔ میں
نے انھیں یہ بھی کہا کہ قوموں کے احیاء اور آزادی کی تحریکیں خاص عوامل کی بنیاد
پر اقل اقل مذہبی لہادہ پس کر خود مار مارتی ہیں۔ مذہب چونکہ انسانوں کے جذبات
کو فوری طور پر آتش میں لاتا ہے۔ لہذا قومی شعور کی پہلی انگڑائی اس کی کوکھ میں

ہی پھینتی ہے۔ روس کی بعض لاشیائی ریاستوں میں حاجی مراد کی مذہبی تحریک
خلافت عثمانیہ کے تحت عبدالوہاب بھٹکی کی احیاء کی تحریک ہندوستانی مسلمانوں میں
شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کا جہاد، سوامی دیانند رام موہن رائے، تملک
ارہندو اور مہاتما گاندھی کی تحریکوں کی بنیاد مذہب پر ہی قائم تھی۔ مگر ان کی کوکھ سے
ہی قومیت اور آزادی کی عظیم اشکاب پل پل سے جنم لیا۔ یہی عربی ملکوں میں ہوا۔ جہاں بعد
میں اس نے سامراج دشمنی اور عرب قوم پرستی کا روپ دھارنا کر لیا۔ راجہ کریم کوہن
رائے، تنک، گاندھی اور نیگور نے ہندو مت کے عقائد سے وابستگی ظاہر کی اور لالہ لاجپت
رائے نے تو سوامی دیانند سرتو کی سوانح تنک لکھی دوسری طرف وہابی تحریک کے
سید احمد بریلوی اور سید اسماعیل شہید اور دیوبند تحریک کے بانی مولانا قاسم نانوتوی
مولانا عبد اللہ مدنی، مولانا محمود الحسن ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال نے مسلمانوں کی بڑھاپے
لیکن دراصل اس پر دسے میں قومی شعور کی بانیگی کا عمل جاری تھا۔ لیکن میرے دوست
میری اس دلیل کو نہ مانے۔ اس پر میں نے ان کے اعتراضات کو سختی سے مسترد کر دیا اور
۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کچھ ہی دن پوری عقیدت و احترام کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔
مسلم فرقہ پرستوں کی ستم خیزیوں اس سے کچھ کم نہ تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں
رام گدھ سے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بطور مہمان خصوصی شرکت
کرنے کے بعد کشمیر آ رہا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا آزاد مرحوم نے کی تھی۔
اسی دوران لاہور میں مسلم لیگ کا وہ مشہور اجلاس ہو رہا تھا جس میں قرار دیا گیا کہ
منظور کی گئی۔ میں اجلاس کا مشاہدہ کرنے کے لیے گیا۔ اور عام لوگوں میں تقریر سننے
کے لیے بیٹھ گیا۔ بد قسمتی سے میرے قدم کی لمبائی مجھے ہر جگہ نمایاں کر دیتی ہے۔ بیٹھنے سے
موجودہ سرحد کے سردار اورنگ زیب کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ دوڑ کر مجھے بیٹھنے کے

یہ آئے۔ لیکن میں نے انکار کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں سمجھنے سے بے آیا ہوں بولنے کے لیے نہیں۔ جب مجھے احساس ہوا کہ ہماری آکسین کی پالیسیوں میں تضاد نہیں تو شیخ پر بولنے کے لیے بھی آجاؤں گا۔ کچھ ہی دیر بعد مولانا ظفر علی خاں بڑے ٹھاٹھ سے اجلاس میں گئے۔ مسلم لیگ کے رضا کارنگی تنواریں سونت کر ان کے آگے پیچھے درایتیں بائیں پیچھے ہوئے تھے۔ اور انھیں ایک مذہبی مہر کی طرح شیخ کی طرف سے چل رہے تھے۔ اس وقت حیدرآباد کے مشہور رہنما نواب بہادر یار جنگ گرج رہے تھے۔ مرحوم ایک زوردار اور شعلہ باز مقرر تھے۔ رشتہ اردو میں بڑی فصیح و بلیغ تقریر کرتے تھے۔ کشمیریوں کی منظوریت بیان کرتے ہوئے انھوں نے ریاست میں مکمل زوردار نظام حکومت کا مطالبہ کیا۔ لیکن حیدرآباد کے لیے اس مطالبہ کو اس لیے خارج از بحث قرار دیا کہ حیدرآباد کو مسلمانوں نے پر زور کشمیر حاصل کیا ہے اور کشمیر کی طاقت سے ہی اس کو اپنے پاس رکھیں گے۔ یہ دلیل اتنی بھاری تھی کہ نواب صاحب کی اردو سے متعلق بھی اس کے پیچھے پن کو نہ چھپا سکی اور میں دل برداشتہ ہو کر جیسے سے آٹھ کر گیا۔

دوسرے دن دفتر ”انقلاب“ میں میری ملاقات مولانا غلام رسول ہنر اور عبد المجید صاحب سائیک سے ہوئی۔ دونوں میرے کرم فرما تھے۔ میں نے ان سے بہادر یار جنگ کی تقریر کا ذکر چھیڑا اور استفسار کیا کہ جو بات کشمیر کے عوام کے لیے جائز ہو سکتی ہے اسے حیدرآباد کے عوام کے لیے کیوں جائز قرار دیا جاسکتا ہے ریاست حیدرآباد میں مطلق العنان حکومت کے حق میں نواب صاحب نے جو دلیل پیش کی ہے وہی دلیل کشمیر کا بہار اچھا آس کے ہم خیال کیوں نہیں دے سکتے؟ جب دلیل کا جواب استدلال سے نہ دیا جاسکے تو قطعاً کاہلہا لینا پڑتا ہے۔ ہمارے صاحب اپنی تین طبیعت کے باوجود جھلٹے اور بولے کہ ہم حیدرآباد کے لیے لاکھوں کشمیری

کر سکتے ہیں۔ میں ہر صاحب کا احرام کرتا تھا اس لیے بڑی نرمی سے بولا۔ آپ فرد کشمیری عوام کو قربان کر لیں لیکن کیا خود کشمیری عوام بھی اس کے لیے تیار ہوں گے؟ ہر صاحب سے جواب تو نہ بن پڑا لیکن دونوں اصحاب کے چہرے پر ناگواری کے آثار مزور ابھر آئے اور میں نے قطع کلام کرنے کو بھی مناسب ٹھیک لیا۔

اس عجیب و غریب فضا میں مجھے کام کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی ضعیف اذیتوں پر انصاف تو ہوتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم پرستی کی راہ اختیار کی جائے۔ مجھے اکثر علامہ اقبال کا یہ شعر تسلی دیتا تھا۔

گمان آباد رہتی میں یقین مرد شمسماں کا

مہستان کی شب تاریک میں قندیل رہبان

میں آد پر متذکرہ کر چکا ہوں کہ میں نے پندرہ جولائی لال نہرو سے ملاقات میں انھیں اور بادشاہ خاں کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ جس کو انھوں نے بڑی خوشی سے قبول کیا تھا۔ ادھر درمیانی عرصے میں جو امر لال ہمارے مسائل اور مصائب میں گہری دلچسپی لیتے رہے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ بھی کشمیر اور اس کے معاملات سے علما اقبال کی طرح بہت وابستہ رہتے تھے۔ ایک شیخ تھا اور ایک برہمن لیکن کشمیر کے منگ پر اگر یہ اپنی ساری چونکریاں بھول جاتے تھے۔ اور اس کی دردمندی میں تو تیا جہاں کو فراموش کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب پر تو ان کے بہت سے حریفوں نے چھٹی کسی کہ ”مسلم میں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا“ کہتے والا جب کشمیر جیسے چھوٹے قطعہ زمین کی بات کرتا ہے تو بس صرف کشمیر کا ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پندرہ جی پریشیل اور دوسرے زعمائے فترے کہتے تھے کہ یہ کشمیر کو سارے ہندوستان سے زیادہ چاہتا ہے۔ اور ہندوستان کو یہ کشمیر شہر بنانا چاہتا ہے۔ جب یہ عقائد میں آکر کشمیر کے لئے پڑتوں پہنچے تھے اور ان کو ہمارا جی حکومت گرفتار کرنے کی ہوج

رہی تھی تو نہرو نے کہا کہ مجھے ہندوستان کی وزارت اعظمی کے بدلے کشمیر کے لیے قیدی بننا زیادہ پسند ہو گا۔ برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم ارنلڈ ٹوکیٹ نے کشمیر کے ساتھ نہرو کی جذباتی وابستگی میں کسی حسین عورت کے ساتھ اس کے کسی عاشق کے برابر اپنی جہتی کی کیفیت جھلکتی ہے اور کشمیر کا جھگڑا ہرگز اس قدر نہ اچھٹتا مگر نہرو اپنی عقلیت پسندی کو ترک کر کے اس کے گیسوؤں میں اپنا دل دگنوا بیٹھنے۔ مجھے ذاتی طور پر خواہش لال کی کشمیر سے اس شغف کی اور وابستگی نے بہت متاثر کیا اور ہماری گہری دوستی کی بنیاد اسی مشترکہ عشق پر پڑی جس کی کیفیت کے متعلق کسی شاعر کا کہنا ہے :

اگر وابستہ ہیں اس شخص کی یادیں تجھ سے
جس نے اس کو پری خانہ بنا رکھا ہے

دوری ۱۹۳۹ء میں گدھیانہ میں آل انڈیا سینیٹس بیورو کا نفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں مجھے کشمیر کے ایک وفد کی قیادت کرنے کی دعوت دی گئی۔ میں ان دنوں کھلوعہ جیل میں قید کاٹ رہا تھا۔ اس لیے شرکت نہ کر سکا۔ گرمیوں سے بہت سے ساتھی داس پینچ گئے۔ جواہر لال نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا :

”کشمیر میں جو ایچ ایم ایچ شیخ محمد عبداللہ کی راہبری میں شروع ہوئی وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کشمیر کے عیسوی باشندے کیا چاہتے ہیں۔ اور ان کی قربت و افلاس کس طرح دور ہو سکے ہیں۔ اس کا واحد اور صحیح علاج جو انھوں نے تجویز کیا ہے وہ ہے قوم دار نظام حکومت ایسی آواز کو دبانے کے لیے کشمیر کے قائد شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء کو وفد سمہم کی خلافت ورزی کا بہانہ بنا کر گرفتار کیا گیا ہے۔ سٹی جمسٹریٹ نے چھ ماہ قید اور پچیس پچیس روپے جرمانہ کی سزا میں جھگٹنے کا حکم صادر

کیا۔ یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں کہ دنیا میں جو بھی سیاسی لیڈر آزادی حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے اس کا گھر جیل میں ہوا کرتا ہے۔ مگر سلاواچ شاہی کی کھوکھلی اور شاطرانہ چال بازیاں اب زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی ہیں۔ اگر شیخ محمد عبداللہ کو قید و بند میں رکھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان حالات پر پردہ ڈر سکتا ہے جو کشمیر میں پیش آرہے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ انھوں نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کی بناء پر شیخ محمد عبداللہ کے ایام قید میں اضافہ حق بجانب ثابت ہو۔“

یہ دوسری بات ہے کہ چودہ سال بعد خودی الفاظ کہنے والے رہنما کو بھی طاقت کے نشے میں اپنی بات یاد نہ رہی۔ اس نے میرے بارے میں مہاراجہ سے زیادہ جا بڑا اور سامراجی طریقہ عمل اختیار کیا۔

بائے اس زرد پوشیاں کا پتہ چل ہونا

”ریاستی لوگوں کی شکایات اور صاحبِ خالص اقتصادی اور سیاسی ہیں۔ مگر والیان ریاست اور اُن کے کارندے راستہ روکنے کی خاطر جہاں کوشش پر مذہب کا رنگ چڑھاتے ہیں، ہم ہندوستانی عوام سے مالی جانی یا اقتصادی امداد نہیں مانگتے بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ لوگ غلط پروگنڈے پر اعتبار نہ کریں اور ریاستوں میں قومی تحریکوں کو اس قسم کے غلط رنگ میں نہ دیکھیں۔“

بہر حال پنڈت جواہر لال نہرو بادشاہ خان کے ہمراہ کوہاڑ کے راستے سے ۲۰ مئی ۱۹۳۷ء کو کشمیر میں وارد ہو گئے۔ کوہاڑ سے ہی نیشنل کانفرنس کی طرف سے اُن کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ جب وہ سربراہ ہینری توآئین چھتہ مل ویر (VEIR) سے ایک شاعرانہ روایتی جلوس میں امیر اکہل تک پہنچا گیا۔ سینکڑوں کشتیاں آراستہ پر استازین پرندے لگے کھچے چھپے جاری تھیں، دریا میں بھراہیں اور ڈیوڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ اور جہلم کے دونوں کناروں پر ہزاروں مرد و عورتیں اُن کا استقبال کر رہے تھے۔ سٹیٹہ کشوری لال نے نیشنل کانفرنس کی طرف سے میرانی کے فرائض انجام دیے اور وہ انہی کے بیگلہ میں فوگش ہو گئے۔ پنڈت جی کو کوہ چپانی کا بڑا چسکا اور شوقی مقام اس لیے ہم اُن کی پارٹی کو کچھ دنوں کے لیے پہلادگام نے گئے۔ مٹن میں کشمیری پنڈت خواتین اپنے رواجی لباس میں موجود تھیں۔ وہ لیے پیر بن اور سر پر ”ترنگ قصا“ پہنے ہوئے تھیں۔ پنڈت جی اس نظارے سے استغناء فرما کر وہاں سے کوہ فوراً اُن کے پاس چلے گئے۔ شاید اُن کو اپنے آبا کے رہن سہن اور پہتاؤں کی جھلک نظر آگئی تھی۔ پہلادگام سے ہم کوہاڑ بھی گئے۔ یہ راستہ ہم نے کھوڑوں پر طے کیا اور جہاں پر ج کے توبہ شکن شمن سے دل اور نظر کا دامن بھر لیا۔ اس دورے میں مجھے بڑے دنوں کے ملے بڑی اور کچی سمجائی کشتی۔

باتیں ہماریاں

مارچ ۱۹۳۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس تریپورہ میں منعقد ہوا۔ جس میں صدر کانگریس کی دعوت پر میں نے بھی شرکت کی۔ میرے ساتھ بخشی غلام محمد پنڈت پریم ناتھ بزاز، پنڈت کیشپ چندر اور مولانا محمد سعید مسعودی بھی وہاں آئے۔ اجلاس میں ہماری شرکت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس زمرہ کا ارادہ ہو سکے جو ہمارے مخالفین نے یہ کہہ کر بھیلایا تھا کہ کشمیر کی تحریکِ مسلم فوج پرستوں کی تحریک ہے۔ ہمیں جواہر لال کے علاوہ باقی سرکردہ کانگریسی رہنماؤں سے بھی ملنے چلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ہم نے ریاستوں کے فیڈروں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کا راستا اچھا کر دیا کہ ہم نے آپ کے قومی مطالبہ کو بغیر کسی ترمیم کے بھوپالی عوام کا مطالبہ بن کر نواب بھوپال کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کشمیر کا لفظ کوٹھا ہوا تھا وہاں اسے بھوپال کے نفاذ سے تبدیل کر دیا۔ مجھے تریپورہ کانگریس کے اجلاس سے مخاطب ہونے کی بھی دعوت بحیثیت ایک معزز مہمان کے دی گئی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا:

بعد گھوڑ سوار کی اپنا شوق پورا ہوتا دکھائی دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ کسی کھیل میں قنط لیتا رہا ہوں تو وہ ٹنڈہ گھوڑے کی سواری ہے۔ برقی رفتار میں پر یہ دنیا گرس قدرت و بصورت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے میں اپنے ہم سنوں کے ساتھ گھوڑے دوڑانے کا مقابلہ کیا کرتا تھا۔ اس دورے میں مجھے پندرہ جی کی ذات میں ایک اچھا شاہ سوار ملا اور کبھی کبھی ہم تریگ میں اگر گھوڑوں کی ٹٹائیوں میں چھوڑ دیتے تھے۔ بعد میں واقعات نے جو کروٹ لی ان میں میرا یہ شوق بس ایک حسرت بنا کر رہ گیا یعنی بقول اقبالؔ

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق؟

ساتھ میرے رہ گئی ایک میری آرزو

پندرہ جی جہاں جہاں بھی گئے ان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ اور انھوں نے بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ ان کے اس دورے سے نیشنل کانفرنس کا نام سارے ملک بلکہ دنیا بھر تک پہنچ گیا۔ اور کشمیر کی تحریک کے ٹکے بچنے لگے۔ اسی دوران دوسری عالم گیر جنگ کا اعلان ہوا اور پندرہ جی کو جوں کے وسط میں پادی۔ انہیں جلد ہی واپس لوٹنا پڑا۔ لیکن جواہر لال کے دورے کشمیر کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ریاست کے اندر اور باہر غیر مسلموں نے تحریک کے نئے قومی لہجے کی معنویت سمجھ لی۔ لیکن ہندوستان کے قوم پرست مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی مسلم طبقوں میں اس سے غلط فہمی بھی پیدا ہو گئی۔ پنجاب کے مسلم پریس نے تو اس کی مخالفت میں لیے چوڑے مضامین شائع کیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت فتح علی جناح کی مستعد اور چابکدست قیادت کی وجہ سے مسلم لیگ کو ایک نئی زندگی مل رہی تھی۔ اور اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ جہاں

ہندوستان بھر میں صوبہ سرحد کے انتہائی سوا، شمسلمان کانگریس سے دور ہو رہے تھے وہاں کشمیر میں ہمارے معاملے کم ہو رہے تھے۔ ہم یہاں اکثریت میں تھے۔ اس لیے ہمارا نظریہ ایک اکثریت کا پورا اعتماد نظر یہ تھا۔ اس کے برعکس ہندوستان کے مسلمانوں کا نظریہ ایک اقلیت کا تشویش آمیز نظر یہ تھا۔ وہ ہندو اکثریت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے طالب تھے۔ ہم یہاں بہ حیثیت اکثریتی طبقے کے غیر مسلموں کو ان کے جائز حقوق کی حفاظت کا یقین دلارہے تھے۔ جواہر لال نہرو نے جاتے جاتے ایک بڑا اہم بیان دیا۔ یہ بیان کشمیر سے ان کی جذباتی وابستگی کا گواہ بھی ہے اور کشمیر کے اس وقت کے حالات پر ایک صاحبِ نظر کا تبصرہ بھی۔ انھوں نے کہا:

”میں کشمیر ایک سیاحت یا اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں آیا بلکہ اس سرزمین کے بیٹے کی حیثیت سے آیا اور اسی حیثیت سے کشمیر کے مردوں اور خواتین نے میرا پرتیاگ اور محبت بھرا خیر مقدم کیا۔۔۔۔۔ کشمیر مجھے محبوب ہے۔ کیونکہ اس کے پہاڑوں اور وادیوں کا خون میری رگوں میں جوش مار رہا ہے۔ اور جو شخص بھی اس سمحرک زمین سے تعلق رکھتا ہے اس کو حق ہے کہ وہ اس تعلق پر جتنا بھی چاہے فکر کرے۔ یہ چند دن جو میں نے کشمیر میں بسر کیے ان میں میری آنکھوں نے کشمیر کی اس خصوصیت کو دیکھا جس سے انسان کے احساسات میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس ہوا میں سانس لینے سے خون میں جوش اور شباب کے دلوے زندہ ہو جاتے ہیں۔ میں نے شہر کے تعلیم یافتہ دانشوروں سے لے کر گھریلو کے آس پاس پہاڑوں کی چوٹیوں پر روڑ چرانے والے چرواہوں تک ذاتی رسائی پیدا کی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں کے عوام میں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں حکومت میں جمود اور

بے بسی طاری ہے وہاں لوگ جوش اور حرکت میں ہیں..... میں شیخ محمد عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کا نمٹوں ہوں کہ بدو واران قیام مجھے میں کاہان بنے رہنے کا شرف ملا۔ شیخ صاحب میں جمہور کی رہنمائی کرنے اور کامل تدبیر کے ساتھ عوام کے نصیب العین کی طرف جانے کے تمام اوصاف جمع ہیں۔ شیخ صاحب نے عوامی تحریک کو باوجود مخالفت اور دقتوں کے فرقہ وارانہ راستے سے نکال کر قوم پرستی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔ کشمیر کی رہنمائی خوش قسمتی ہے کہ اس کو شیخ محمد عبداللہ جیسا بہادر دور اندیش اور مدبر رہنما نصیب ہوا ہے۔ کشمیری پندتوں سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے تنگ اور محدود دائرہ کا سہارا لینا چھوڑ دیں اور ان بڑی تحریکات میں حصہ لیں جو پرانی دنیا کو تبدیل کرنے کا موجب بن رہی ہیں؟

نیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۹۷۷ء میں ۲۶ ستمبر تک بارہ مولوں ہوا۔ اس کی صدارت سردار مبدع سنگھ نے کی۔ مبدع سنگھ کو بعض لوگ تباہ گورتی اور مہاتما کے القاب سے بھی پکارا کرتے تھے۔ مجھے بھی وہ بڑے صوفی منش، شریف الطبع خدا ترس اور غریب نواز شخص۔ وہ خاصے بڑے کلمے سنے اور ملازمت میں وزیر بر وزارت کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ جو ان دنوں ایک منصب جلیل تصور ہوتا تھا۔ لیکن شخصی حکومت کے جذام سے وہ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ غریب عوام کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا ان کا دل اس سے اچاٹ ہو گیا اور انھوں نے ملازمت کو تباہ دے دیا۔ بعد میں وہ کچھ عرصہ جنگ میں تپ تپا کرتے رہے۔ باہر آئے تو ہماری تحریک شروع ہو چکی تھی۔ سردار مبدع سنگھ کے دل میں فرقہ وارانہ دلی خیر برابری تھی۔ وہ مسلم کانفرنس کے وقت سے ہی ہماری تحریک کی حمایت میں تھریں کرنے لگے تھے۔ میں تو کبھی کبھی خامسا

سردار ہوتا تھا۔ جب وہ عوامی جلسوں میں بر سر عام کہتے تھے کہ ”شیخ عبداللہ کا وجود میری دعاؤں کا ثمر ہے۔ میں نے خدا سے مانگا تھا کہ ظلم کے خاتمے کے لیے کوئی بہادر رہنما ہمارے اندر پیدا ہو۔ خدا نے میری سن لی اور شیخ صاحب کو ہمارے اندر بھیج دیا۔“ سردار مبدع سنگھ نے کئی مرتبہ قید و بند کی آزمائشیں سہیں۔ وہ نائے قد کے آدمی تھے مگر ان کے چہرے پر سفید اور دراز ریش بڑی ثورانی معلوم ہوتی تھی۔ غیر مسلم ان کی بات نیکی سے سن سکتے تھے۔ ملکہ انٹان کو مذاق کا ہفت بناتے۔ ۱۹۷۷ء میں، میں نے انھیں اپنی پہلی وزارت میں شامل کیا۔ میں تو انھیں ریاست کا پہلا صدر ریاست بنانا چاہتا تھا لیکن مرکز اور ریاست کے بہت سے دوستوں کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ بعد میں وہ پارلیمنٹ کے ممبر بنے اور ۱۹۷۷ء میں بہت پیرانہ سالی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ واگوروا انھیں سوگ میں جگہ دے۔

۱۹۷۷ء میں نیشنل کانفرنس کا ایک اور سالانہ اجلاس سرنگر میں منعقد ہوا اور اس کے صدر بھی سردار مبدع سنگھ ہی چنے گئے۔ اس میں خان عبدالغفار خان نے بھی خاص دعوت پر شمولیت کی۔ اس اجلاس میں سیاسی قراردادیں بھی بہت سی پاس ہوئیں۔ لیکن مجھے اس کا وہ منظر خاص طور پر یاد ہے جب ایملاس کے اختتام پر ایک عظیم محل بند شاعر منعقد ہوا۔ اس شاعرے میں برصغیر کے کچھ عظیم اردو شاعروں کا کلام سننے کا موقع ملا۔ شاعرے کی صدارت مشہور سخن شناس جیش سر شیخ عبدالغفار نے کی۔ اسی شاعرے میں ابوالاثر حفیظ جاندھری نے اپنی مشہور نظم

”غیرے محروم ہے مالک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کٹ میر کی تصویر کا“

سنائی۔ حفیظ کی مجھ سے لاہور میں بہت پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ بعد میں کشمیر آئے

رہے اور ان کے ساتھ ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انہیں کثیر لوں کی حالتِ نارسے شاعرانہ
 پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ صرف ایک اچھے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے ایک بڑا پُرکوزر گلابی
 پایا ہے۔ وہ جب نوجوانی کے ایام میں اپنا کلام سناتے تو غفلتِ لوث پڑت ہو جاتی۔ اس
 موقع پر بھی یہی ہوا۔ ایک تو برجستہ کلام تھا۔ کثیر لوں کی صحیح ترجمانی۔ دوسرے ان کا طرز
 ادا۔ ایک سال بند ہو گیا۔ حقیقتاً بعد میں بھی کثیر کرتے رہے۔ "کثیر چھوڑ دو" میں انھوں نے
 "غون کے چراغ" کے نام سے ایک نظم لکھی جو کافی مقبول ہوئی اور جس نے بیرون کثیر
 میں بھی مہاراجا کے مظالم کا پردہ چاک کیا ہے۔

شرحِ مہجوروں سے زمین کثیر کی ہے مشہور
 لالہ کے پھوٹ نکلا ہے شہسیدوں کا جو
 منکر اس خاک پہ گڑے دارو گیسر کا
 لالہ زار اس کو نہ سمجھو کیت ہے شمشیر کا
 حمل آور ہیں مہاراجے کی فوجیں چار شو
 شملہ زن ہیں آگ اور لوہے کی فوجیں چار شو
 فطرتِ انسان کو ہے طوقِ غلامی ناپسند
 نعرے آزادی کے لئے کرتے تھے میں بریل
 سرورِ شوان چراغوں سے ضیاء لیتے ہوئے
 آگے اور آگے بڑھنا م خدا لیتے ہوئے

میں جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان گیا تو اپنے پرانے دوست سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بوڑھے
 تو ہو چکے تھے لیکن ان کا جوش و ہمت جوان تھا۔ کثیر کی انھوں نے اپنے اشعار کے
 ذریعے جو خدمت کی ہے اس کو ہم کبھی نہیں بھٹکا سکے۔ اس مشاعرے میں روشِ صدیقی
 مرحوم نے بھی اپنا پُر اثر کلام سنایا۔

شاعروں کی بات ملی ہے تو مجھے فیض احمد فیض یاد آئے ہیں۔ فیض محمد بن تاثیر
 کے دوست تھے۔ اور جب وہ سری نگر میں امن سنگھ کالج کے پرنسپل بنے تو ان کے پاس
 آتے رہتے تھے۔ ہم سے بھی انہی دنوں ان کی ملاقات ہوئی۔ فیض ایک بہت اچھے
 مشہور شاعر تو ہیں لیکن ایک بڑے دانشور بھی ہیں۔ ان کا مہجور کاؤ اشتراکی نظریات

کی طرف تھا۔ لیکن وہ تحریک کثیر کے جہدروں میں سے تھے۔ ان کی شخصیت میں چاندنی
 کی طرح ایک ملامتِ مگر روشن خاصیت موجود ہے۔ ان کی شادی محمد دین تاثیر صاحب
 کی سالی ایلس (ELIS) جارج سے سرنگرم میں ہوئی۔ اور میں نے ہی ان کا نکاح پڑھا۔
 فیض سے میری ایک عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مضمین کر دوستوں کے ذریعہ
 برابر ملکِ سلیک کا سلسلہ جاری ہے بلکہ انھوں نے کچھ عرصہ قبل ایک نظم کا خوبصورت
 نسخہ "شیخ محمد عبداللہ کے نام" پر بھجوا دیا تھا۔ اور مجھے اس کو دیکھ کر دلی مسرت حاصل
 ہوئی تھی۔

تیسرے زندانِ جوشِ ملیح آبادی بھی میرے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ ان کا چٹا دل
 کا خطہ اور ان کا شاعرانہ جلال انہیں خاصے کی شخصیت بنا دیتا ہے۔ جو ابرارِ لال اور
 مولانا ابوالکلام ان کے قدر دانوں میں سے تھے۔ وہ نئے گلفام کے بڑے رسیا ہیں۔
 چوکوں میں کبھی اس شے کی طرف رغبت پیدا نہیں کر سکا اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے شاگرد
 انداز میں مجھے چھیڑتے بھی رہتے تھے۔ انھوں نے میرے بارے میں نظم لکھی۔ اس نظم
 میں بھی چھیڑ خانی کا یہ انداز موجود ہے۔

رند ہوں رندِ تیرے نہیں سکتی
 شیخ صاحب سے میری رسمِ وراہ
 ان کی محفل میں ہے چراغِ ثواب
 میری محفل میں آفتابِ گناہ
 ان کی لوحِ جبین پہ داغِ سجود
 میرے آئینے میں تجلیِ ماہ
 ہاں مگر ایک شخص ہے ایسا
 جس پہ ٹھہری ہے مدتوں میں نگاہ
 جس کی ہر پر روش ہے حسبِ فراز
 جس کا ہر اصولی ہے دل خواہ
 تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس
 تاج کو روندتی ہے جس کی نگاہ
 ہے جو اس تیرہ دورِ باطل میں
 حق نگاہِ حق شناس، حق آگاہ

علی بی بی انظم ہے جس کا مشہور مصرع ہے مجھ میرے وطن تیرے زخموں کے لالہ زار کی خیر دم شاہ

چارہ گر بننا، غریب نواز شہر کشمیر شہج عبداللہ
صرف اس شہج سے فحبت ہے ورنہ ہر شہج سے خدا کی پناہ
بعد میں جوش صاحب اپنے کچھ دوستوں کی چٹنی چڑی باتوں میں اگر پاکستان
پٹے گئے۔ ان کے جانے سے ان کے دوستوں کو تو صدمہ ہوا ہی لیکن خود جوش بھی مرے
میں نہ رہے۔ اس کو کہتے ہیں۔ ۛ

مرے بھی چین نہ پایا تو کہہ کر جائیں گے؟

شعر آں مولانا حسرت موہانی نے بھی تحریک کے ابتدائی آیام میں ہماری آواز کو سہارا
دیا بلکہ وہ ان اجلاسوں میں شریک ہوئے جولاہور کی کشمیر کمیٹی نے ہماری حمایت میں بنائے
تھے۔ ایک اور حسرت جن کا کشمیر اور ہم سے تعلق رہا چراغ من حسرت المعروف سند
باد جہازی تھے۔ وہ پونچھ کے رہنے والے تھے۔ لیکن بلا کا قلم پایا تھا۔ جب تک جیسے
ہماری تحریک کو اپنے سرچشمے قلم سے سینچتے رہے۔ خواجہ احمد عباس ترقی پسندوں
اور نہرو خاندان کے قریب رہے ہیں۔ وہ نہی بار کشمیر آئے۔ اور کشمیریوں کی جدوجہد
پر ”زمفران کے بھول“ اور دوسرے افسانے لکھے۔ راجندر سنگھ بیدی کو میں
نے شہرے کے بعد جموں کے ریڈیو سٹیشن کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ یہ شریف اور
نہایت ہی لائق ادیب اپنی تحریر سے ہمارے نقطہ نظر کی ترویج میں بہت کامیاب
رہا۔ مگر جن چند کا تعلق تو کشمیر کی سرزمین سے براہ راست تھا۔ انھوں نے بھی
کشمیریوں کی جدوجہد پر کئی افسانے لکھے جب شہرے کے بعد تھلگانہ تحریک کے
سلسلے میں ان کی تلاش ہوئی تو میں نے انھیں گلبرگ میں اپنا مہمان بنا کر بٹھایا جہاں
انھوں نے کشمیر سے تعلق اپنا ناول ”شکست“ لکھا جس کے کچھ باب انھوں نے
مجھے انہی دنوں سنائے اور مجھے کافی پسند آئے۔ علی سردار جعفری بھی ہمارے دوست

تھے۔ ۱۹۵۷ء کے نرسے کے بعد انھوں نے کئی جمعیہ کشمیر میں گزارے اور اپنے دوستوں صادق
صاحب اور ڈی۔ پی۔ صاحب کو ہماری سرکوبی کے طریقے اشعار کے نسخوں میں سمجھاتے
رہے لیکن یہ تو اس راستے کے لازمی پڑاؤ ہیں اس کے برعکس ایک اور اشرا کی ادیب
خندوم جی الدین نے شہرے کے بعد ہمارے خلاف کسی کارروائی میں حصہ نہ لیا حالانکہ
وہ ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ تھے۔ اور تھلگانہ کی تحریک میں انھوں نے بڑا بڑا
کمر حصہ لیا تھا۔ خندوم صاحب ہمارے پڑائے دوست تھے جب کشمیر کرتے ہم نے ضرور
میلے اور ہماری تحریک کے اصولوں اور سرگرمیوں کی بڑی تعریفیں کرتے۔

ادیبوں کی بات چلی ہے تو ان اولین محسنوں کی یاد تازہ کرنا ضروری ہے جن
کے قلم کا احسان کشمیریوں پر ہمیشہ رہے گا۔ علامہ اقبال کا ذکر آ ہی چکا ہے انھوں
نے اس وقت کشمیر اور کشمیریوں کی سر بلندی کے خواب دیکھے جب ہم میں سے اکثر
ابھی ماں کی کوکھ میں لوہا یں سن رہے تھے۔ جب کشمیر پر ظلم کی گٹھائیں چھائی
ہوئی تھیں تو وہ فرما رہے تھے۔ ۛ

انہاں نے فشان قطرہ بر کشمیری

کو خاکسترش آفریند شرارے

یا ۛ

معمور ہوں دل جس کی فغان سحری سے

اس دیں میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

میں ان سے پہلی بار ۱۹۴۷ء میں ملا۔ جب میں لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ ان کا دل کشمیر
کے لیے تڑپتا تھا۔ اور وہ اپنے سپرد مہونے پر ناز کرتے تھے۔ جب وہ کشمیر سے اپنی
نسبت کا ذکر کرتے تھے تو مسرت سے ان کی باچھیں کھل جاتی تھیں اور ان کا چہرہ

علامہ اقبال نے اس تجویز کو نہ صرف پسند کیا بلکہ ٹبری مالکیت سے فرمایا کہ کشمیر یوں کامنوا
اسی میں ہے کہ وہ اپنی تحریک کو غیر فرقہ دارانہ بنیادوں پر چلا لیں۔ مجھے اس امر پر فخر کا
احساس ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کشمیر میں میری عاجزانہ کوششوں کو پسندیدگی کی نظر
سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب کچھ لوگ ان کے پاس میری شکایت کرنے گئے تو علامہ نے

انہیں اپنے خاص اہلکار میں ڈانٹا اور کہا کہ عبداللہ کشمیری کے دل سے ظلم حکومت
کا خوف ختم کر دیا ہے۔ کشمیریوں کو ایسا ہی نڈر شخص آزادی کی منزل تک لے جاسکتا
ہے۔ مجھے ساری عمر قلق رہا کہ علامہ نے میری درخواست پر کشمیر آنا مان لیا تھا۔ لیکن
پہلے تو ڈوگرہ حکومت نے ان کی راہ میں مشکلات پیدا کیں اور بعد میں موت کا بے
رحم ہاتھ ان کی راہ میں ہمیشہ کے لیے حائل ہو گیا۔ ہم نے ان کی یاد میں دو سال قبل
کشمیر یونیورسٹی میں دنیا کی پہلی سندھ اقبال قائم کی ہے۔ جس کے اولین ڈائریکٹر مشہور
اقبال شناس پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہوئے ہیں۔ ہماری دیکھا دکھی اب پاکستان
میں بھی اقبال چیرہ قائم کی گئی ہے۔ جس کے ڈائریکٹر علامہ کے صاحب زادے جواد
اقبال بنائے گئے ہیں۔ ہماری اقبال چیرہ اب اقبال انٹی ٹیوٹ بن گئی ہے۔ کشمیر
یونیورسٹی کی لائبریری کا نام بھی ہم نے اقبال لائبریری رکھا ہے۔ جس میں مشہور شعور
ایم۔ ایف۔ حسین کی بنائی ہوئی اقبال کی ایک نادر تصویر بھی آویزاں ہے۔ نیز ہم نے
سری نگر میں اقبال کے نام سے ایک خوبصورت باغ کا بھی انتساب کیا ہے۔ یہ پہلے
جنوری باغ کہلاتا تھا اور اب اقبال پارک۔

کشمیری تحریک حریت مولانا غلام رسول تہر اور مولانا عبدالحمید ساکت کے
احسان کو بھی کبھی خاموش نہیں کر سکتی۔ ان حضرات نے ۱۹۴۷ء میں لاہور سے روزنامہ
”انقلاب“ نکالا تھا۔ جب ۱۹۴۹ء میں ہماری تحریک شروع ہوئی تو اس انقلاب کے صفحہ

سرخ ہوجا تھا۔ میں نے تصور میں خاک بنایا تھا کہ اتنا بڑا آدمی بڑے محاسن سے رہتا
ہوگا لیکن جب ان سے ملتا تو پتہ چلا کہ وہ واقعی فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے
اس مصرع کی تفسیر ہیں ۛ

میرا شعار امیری نہیں فقیری ہے

وہ چارپائی پر ایک سفید چادر پر بیٹھتے ہوئے ہوتے اور کمرے میں ایک دو اور
کرسیاں لگی ہوتیں۔ ہم آتے تو اپنے خاص خادم علی بخش کو کشمیری نعلین چسائے
لانے کے لیے کہتے۔ ہم کو غریب الوطنی میں اپنی اس مرغوب چائے کی پات پڑ گئی
تھی۔ اور ہم ان کے پاس چائے پینے کے لیے اکثر جایا کرتے تھے۔ ان کا جسم لاہور میں تھا
اور روں کشمیر میں۔ تحریک کے آثار چڑھا دیں کہ جو وقتیں پیش آتی تھیں ان کے سلیسے
میں وہ ہمیں بڑے دلنشینانہ مشورے دیا کرتے تھے۔ سوچا تھا کہ انہیں کشمیر لاکر ان کی
خوب خدمت کریں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور مجھے اس کا ساری عمل ملال رہا
اگر بعد میں میرے گلے سے اقبال کا کلام کشمیریوں کے لیے صورائیں نہیں بن کر گونجا تو
اسے میں ان کی فریاد کی ہی تاثیر سمجھتا ہوں جس کے متعلق وہ خود کہہ چکے تھے۔ ۛ

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی

اب ذرا دل تمام کر فریاد کی تاثیر دیکھ!

میں اسی لیے اپنے حقیر وجود کو ان کی قلندرانہ آہ و گرجا کی کاثر سمجھتا ہوں۔ میری
دانست میں ان کے انسوں کے ختم آہوں کی تھارت سے ہی وہ شرارہ بیچوٹا جو
میری حقیر ذات کی صورت میں تحریک کا علامتی چراغ بن گیا۔ علامہ اقبال سے ان کی
وفات سے چند ہی ماہ قبل میری ملاقات ہوئی۔ ان دنوں فضائیں مسلم کانفرنس کی
مرجہیں وسیع کر کے اس میں دیگر برادران وطن کو لانے کی بات بھی چل رہی تھی۔

کشمیر کے اخبار و کوائف کے لیے وقف رہنے لگے۔ مولانا تہر ایک سنجیدہ عالم تھے اور ان کے ادارے علم و فضل اور متانت کی دلاویز دستاویزیں ہوتے تھے۔ مولانا مالک کو قدرت نے زورِ قلم اور نظرافت کا تحفہ عطا کیا تھا۔ وہ ”افکار و حوادث“ کے مزاحیہ کالم میں ہمارے مخالفین کے نیچے ادھیڑ دیتے تھے۔ ان کے شذرات میں بھی بڑی حینکی کاٹ ہو کرتی تھی۔ جب ”انقلاب“ کی انقلاب آفرینیاں بڑھ گئیں تو سرکار انگلشیہ نے پہلے تو ان سے حکومت کشمیر کی آہ و بکا پر پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی لیکن جب اس سے بھی مہرو سالک کے حوصلے پست نہ ہوئے تو ”انقلاب“ کا داعلہ کشمیر میں بند کر دیا گیا۔ اس پر ادارہ ”انقلاب“ نے ”کشمیری مسلمان“ ”مظلوم کشمیری“ ”مکتوب کشمیر“ اور ”مظلوم“ کے نام سے اخبار نکالے اور حکومت کشمیر ان پر پابندی عائد کرتی گئی۔ لیکن یہ اخبار کسی نہ کسی طرح ہم تک پہنچتے رہے۔ اخبار ”مکتوب کشمیر“ تو ایک پوشری کی شکل کا ہوتا تھا اور ہم آہم چسپاں بھی کر دیتے تھے۔ بعد میں ہمیں اور بھی نشرو اشاعت کے ذرائع ملے لیکن ہم تہر و سالک کی ابتدائی ہمدردی اور امداد کو بھلا نہیں سکتے۔ یہ جُردِ گاہیں ہیں بے حد نفوذ رکھتے تھے اور اسی لیے کسی شاعر نے ان کے متعلق کہا تھا:

تہر و سالک دو پادشہ انقلاب اخبار یک

شاعروں کا یہ ذکر آغا عبدالکریم شورش کشمیری کے بیان کے بغیر نامکمل رہے گا۔ شورش کشمیری کا ہماری سرزمین سے تعلق تھا اور وہ اس کے ساتھ ایک گہرا رگڑا رکھتے تھے۔ ان کا آمیزہ اجتماع شدت میں تھا۔ وہ بیک وقت پاکستان اور ابوالکلام کے عاشق تھے۔ وہ ایک شعلہ بار خلیب بھی تھے اور ”پٹان“ جیسے اخبار کے تیز و ترش مدیر بھی۔ کشمیر کے معاملات میں انھوں نے بار بار رُو و گرہ شاہی کو لاکارا۔ مثلاً ”کوئی کشمیر“

کے وقت ان کی مشہور نظم:

اے ہری سنگھ تو ہائے شر ہارستہ ڈر

شیر کشمیر کے آوازہ پیکار سے ڈر

کا فی مقبول ہوئی۔ وہ کشمیر کے حالات و کوائف کے ساتھ آخر تک دلچسپی لیتے رہے۔ سید حبیب ”سیاست“ کے مدیر تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار میں نہ صرف ہماری تحریک کو صحیح انداز میں پیش کیا بلکہ کشمیر اگر اس تحریک کی صدی خوانی بھی کی اور ہمارے ساتھ جلسوں میں تقاریر بھی کرتے رہے۔ مولوی محمد القین قوچی کا تو میں ذکر کر چکا ہوں۔ وہ بھی کشمیر کے مسائل اور معاملات کو ابھارنے میں پیش پیش رہے۔ اور کشمیر سے مستحق عائد اقبال کے کشمیری نام کی مقبیت سے کام کرتے رہے۔ تحریک کشمیر سے اردو کے بہت سے شاعروں کا گہرا تعلق رہا ان میں اخبار ”زمیندار“ لاہور کے آئین نگار مدیر مولانا ظفر علی خان کھانا بھی شامل ہے۔ مولانا ایک عجیب مردِ گرم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ابتدا میں تو ہمارے بڑے حامی تھے۔ لیکن قادیانی معاملے پر وہ ہم سے برگشتہ ہو گئے۔ راجا ہری کرشن کوٹ نے خجاب میں اکائیوں کی تحریک کو دبانے کے لیے انھیں وہاں کے دوسرے متنفذ زوروں کی طرح اپنا ہتھیار بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب راجہ صاحب کشمیر میں وزیر اعظم ہو گئے تو ظفر علی خان صاحب بھی یہاں آ گئے اور ایک باؤس بوٹ میں سرکاری جہان کے طور پر براجمان رہے۔ جن کا نام کھاتے تھے رگ حیت اُس طرف پھر مٹی بھی چنانچہ وہ خانقاہِ مغلّی میں ہماری تقریر سننے کے لیے گئے تو وہاں ان کے متد سے کوئی غصیدہ قناتاقہ نہ نکل گیا۔ اس پر خواجہ جی الدین قرہ کے جو بیٹے والد حاجی احمد اللہ نے انھیں سخت ٹوکا اور وہ بڑی یزازی کے عالم میں اپنی کین گاہ کو لوٹ آئے۔

پیر زادہ غلام احمد پور سے تحریکِ تحریک کے وسط میں متعارف ہوا جب ان

اوقافِ اسلامیہ

تحریکِ حریت کی ابتداء میں ہی مسلمانوں نے اپنے مشکلات حکومت کے سامنے پیش کرتے ہوئے اس بات کی پر زور مانگ کی تھی کہ وہ تمام مساجد، متعابد، جائیدادیں اور زمینیں ان کو واکفہ کر دی جائیں جن پر اہل اسلام کا حق تھا لیکن جو گذشتہ ستر سال میں ضبط کر لی گئیں ہیں اور جن پر حکومت نے ناجائز قبضہ جمایا ہے۔ اس دلائل و قیام کی استدعا ۱۹۱۱ء میں ہوئی جب مہاراجا رنجیت سنگھ کے کشمیر کے آخری افغان گورنر جبار خان کو شویان کے قریب شکست دے کر کشمیر پر قبضہ جمایا پہلے پہل کو سرنگری جامع مسجد اور خانقاہ معلیٰ پر بھی قبضہ کیا گیا۔ اور ایک وقت تجویز یہ تھی کہ خانقاہ معلیٰ کی عمارت منہدم کر دی جائے۔ ان دو معاہد کے علاوہ متعدد مساجد اور زیارتوں کو مشغول کیا گیا۔ ہمارے زمانے میں پتھر مسجد کو ایک گودام اور مسجد دارہ شکوہ کو شوگر خانے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ پتھر مسجد جس کو جہانگیری کی عیب دہ اور لائقِ ملکہ نور جہاں نے تعمیر کیا تھا۔ یکم عہد میں ایک اصطلح کے طور پر استعمال کی جاتی رہی۔ بعد میں ڈوگروں نے اسے شالی دھان کا گودام

کے قوی ترانے "وہ لوہا باغیاں تو بہاؤں کی شان پیدا کر" میں انھوں نے ہماری تحریک اور کشمیریوں کے ابھرتے ہوئے قومی احساس کی شاندار ترجمانی کی۔ میں نے یہ نظم اکثر اجتماعات میں اپنے ترنم سے پڑھی ہے اور ان پڑھ دیہاتیوں اور مزدوروں کا دل گرمایا ہے۔ یہ شاید کشمیری زبان کی واحد نظم ہے جسے میں نے اس انداز سے گایا اور جو اس قدر مقبول ہو گئی۔ مجبور صاحب تاریخ کشمیر کے بھی کثرت شناس تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں آخری عمر میں ایک تاریخ کشمیر لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ میں انھیں اس تاریخ کا مواد فراہم کرنے کے لیے وہی اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم موٹر کار کے ذریعہ سفر کر رہے تھے۔ جب ہم پانی پت کے قریب پہنچے تو مجبور صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس مشہور میدان کو دیکھنا چاہتے ہیں جہاں ہندوستان کی تقدیر بدلنے والی کئی لڑائیاں لڑی گئیں۔ جن میں شہاب الدین محمود غوری اور پرتھوی راج چوہان، یوں بٹال اور کیر اعظم اور احمد شاہ ابدالی اور پرتھویشواؤں کی کئی لڑائیاں مشہور زمانہ ہیں۔ وہ میدان تو اب کھیتوں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن جب مجبور صاحب نے اس کو دیکھا تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور کچھ وقت کے بعد کہنے لگے کہ شاید ترجمہ کی تقدیر کا ایک حتمی فیصلہ بھی اسی میدان میں لے کیا جائے۔ میں نے مسکراتے ہوئے ختم کر دی۔ بعد میں مجبور صاحب کے لیے میری حکومت نے نا حیات و غنیمت بھی مقرر کر لیا۔ جب ان کے بید ہونے کی خبریں آنے لگیں تو میں نے ڈاکٹر علی محمد جان کو ان کا مصائدہ کرنے کے لیے ان کے آبائی گاؤں بھیجا لیکن وہ جلد ہی اپنے مولائے جا ملے اور ان کی تاریخ دھری کی دھری رہ گئی۔ البتہ ان کا وظیفہ ان کی بیوہ کے نام پر کر دیا گیا۔ مجبور صاحب کو ان کے قوی رول کے لیے سرکاری اعزاز سے وطن کرنے کی بھی میں نے منظوری دے دی۔ ▲▲▲

بنادیا۔ مسجد دارہ شکوہ شاہ جہاں کے حبشیہ دانشور شیخ نے اپنے مرشد ملا آخون شاہ کے لیے تعمیر کی تھی۔ مگر اب یہ بارود خانہ بنادی گئی تھی۔ اسی طرح سرنگر اس کے مصنافات اور جموں میں بھی بہت سے مذہبی مقامات اور جائیدادیں حکومت کے قبضہ تحائفانہ میں تھیں۔ تحریک حریت کی ابتداء میں ہی ان مقامات کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ جب مسلم کانفرنس جی تو فیصلہ ہو کر ان جائیدادوں کے انتظام و انصرام کے لیے ایک اوقات کمیٹی کا وجود عمل میں لایا جاسے۔ چنانچہ اس فیصلہ پر عمل کرتے ہوئے اوقات اسلامیہ کی تشکیل کی گئی۔ مجھے اس کا چیرمین مقرر کیا گیا۔ میں سیاسی تحریک کے جمیلوں کے ساتھ ساتھ اس اہم ملی جاندار کی دیکھ بھال کی کی طرف بھی توجہ دینے لگا۔ گلیکسی کمیشن کے بعد میں مسجد دارہ شکوہ کے ساتھ متعلقات اراضی ملے ان کو ہم نے باغات میں تبدیل کر لیا۔ کچھ اور معاہدہ بھی واگذار کر دیے گئے لوگوں میں اس واگذاری سے رنجا جوش پھیل گیا کہ انھوں نے مندرجہ ذیل گرہ لگا کر اس کا استقبال کیا :

گلیکسی کمیشن سے مقصود پایا

یہ سب رنگ لایا میاں شیر شیر

پتھر مسجد کے ساتھ جو مخلوق زمین تھی اس پر کٹڑی کی ایک ٹال لگا دی گئی تھی۔ ہم نے اسے خانی کرواکے وہاں تباہ منزل کی عمارت کھڑی کر دی۔ ایک لیتھو پرلین بھی خریدی جس پر ہمارے قومی ترجمان "حقیقت" اور "صدقات" "چھپتے رہے۔" حقیقت" ہم نے مسٹر مین جی شروع کیا تھا۔ بعد میں جب یہ اخبار حکومت کے مقابل کی نذر ہو گئے تو مسٹر مین جی نے اخبار "قدرت" جاری کیا جس کے پہلے مدیر مولانا محمد سعید عوی نے ۱۹۵۲ء میں ہم نے اخبار "قدرت" جاری کیا جس کے پہلے مدیر مولانا محمد سعید عوی نے ۱۹۵۲ء کے نعرے میں اس پر بخشنی غلام محمد اور اس کی ٹولی نے قبضہ کر لیا اور اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے لگے۔ لیکن مجلس صواب کے زوال کے بعد اس پر صادق مناسبت

اور ان کے کلرٹوں کا تسلط تھا تو انھوں نے توپ کی مال بخشی صاحب کی طرف کر دی۔ کوئی مجھ سے کہتا تو میں اسے جواب دیتا :

این سنگ یہاں سنگ است کو بر من زدہ بودی

الغرض میں حسب استعداد اوقات کا کام سنہیلے اور بڑھانے میں لگا رہا لیکن سیاسی سرگرمیوں کے تقاضے اور جیل کی دعوئیں اس قدر کثرت سے آئیں کہ میں حسب دلخواہ اوقات کو بڑھا دینا نہیں دے سکا۔ چاہے میں جیل خانے میں رہا ہوں یا اس سے باہر۔ اوقات کے ساتھ میرا معاملہ جیلوں غالب یوں رہا :

گو میں رہا رہن ستم با سے روزگار

لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

لیکن میں پھر بھی اس کی بنیادیں آہستہ آہستہ استوار ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ ہم نے عید گاہ کی طرف بھی اپنی توجہ کی۔ اس میں شہر کے مسلمانوں کے دو تعلیم و اجتماعات عیدین کے موقعوں پر ہوا کرتے ہیں اور یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ چنانچہ سلطان زین العابدین کے بڑے سہائی علی شاہ کی بنائی ہوئی مسجد اب بھی اس کی قدامت کی شہادت دے رہی ہے۔ ہم نے عید گاہ کو اپنی تحویل میں لے کر اس کو صاف ستھرا بنا دیا۔ آثار شریف حضرت بل میں معراج اور میلاد النبی کی تقریبات پر وادی کے مسلمانوں کے دو سب سے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ ان کی عملی ضرورت کا رکن ان سب سے ہم نوا کی حالت بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔ خاص طور سے خرس کے دنوں میں اس کو غرض مند خزانچہ فروش اور دوکاندار غلامت کی آماجگاہ بناتے تھے۔ اس کا تدارک کیا یہ زیارت میر و اعظم اٹال کے حصے میں شام کی جاتی تھی اور صرت وہی وہی پر خاص تقریبات پر وقف خوان کر سکتے تھے۔ مولوی یوسف شاہ کو یہ عیشیت میر و اعظم

یہ زعم ہو گیا تھا کہ دوسری جماعت کو یہاں انتظام کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہمارا مقصد صرف زیارت کے انتظامات کی بہتری تھا۔ اس لیے ہم نے دخل اندازی پر اصرار نہیں کیا۔ جب مولوی یوسف شاہ نے یہ کلام اپنے دوسرا توہم نے میدان ان کے لیے چھوڑ دیا۔ انھوں نے آثار شریف کے شمال کی طرف دوکانوں کی ایک قطار تعمیر کروائی۔ لیکن باقی معاملات جن کے توں چھوڑ دیے۔ زائرین کی جگہ کے نامات ہوئے اور عرس شریف پر برائے امتیاز میوں کی جو شکایت تھی ان کا کوئی مداوانہ ہوا۔ ان حالات میں مجلس اوقاف کو یہ ناخوشگوار فیصلہ کرنا بھی بڑا کراس زیارت کے انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ چاہے اس کا مطلب مولوی صاحب کی بے دخلی ہی کیوں تصور نہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب مولوی صاحب کو وہاں وظف خوانی کے لیے تشریف لانا تھا مسلمانوں کے ایک بڑے مجمع نے انھیں وہاں پہنچنے سے روک دیا۔ میں منبر پر وہ وظف کرتے تھے اس کو بھی زیارت سے باہر لایا گیا۔ اوقاف نے اس طور مستحکم طریقے سے زیارت کے انتظامات کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ تعمیر و تجدید کا دور شروع ہوا جس میں مجھے بھی کافی توجہ مبذول کرنا پڑی۔ میں نے محلہ وار دورے کر کے عوام سے انقد و جنس کے علیے رکھنا شروع کر دیے۔ ہر جمعہ اور کسی بڑی تقریب پر میں درگاہ میں حاضر رہ کر زائرین سے علیات وصول کرتا اور الحمد للہ یہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے عوم نے بڑی عقیدت اور فراخ دلی سے تعاون کیا۔ اور آثار شریف کا دلکش اور دل نواز نقشہ نگاہوں کے سامنے مسہرے لگا۔ زائرین کے لیے نشست و برخاست آہل رمانی وضو اس لیے اور نماز ادا کرنے کی آسائشیں فراہم کی گئیں۔ خود زیارت گاہ کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ نئی زیارت گاہ کا موجودہ پیکر بڑی کاوش کے بعد تیار کیا گیا۔

اس میں بنیادی تعمیرات حکومت ہند کے سربراہ تعمیرات مشرعیب الرحمن کا ہے۔ مشرعیب سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور نسیم باغ کے نزدیک کلینر ماؤنٹ ہاؤس لوٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو باتوں باتوں میں ہی انھوں نے درگاہ کی نئی تعمیر کا خیال پیش کیا۔ اس کو پہلی ریاست کے چیف آرکیٹیک صدیقی صاحب نے جو حیدر آباد کے رہنے والے ہیں کچھ اور آگے بڑھایا۔ آخر میں ڈیزائن کی تشکیل و تنظیم حیدر آباد کے مشہور ماہر تعمیرات فیاض الدین صاحب نے مکمل کی۔ یہ ڈیزائن کشمیر میں کلاسیکی اسلامی فن تیکرانی نوعیت کا پرانا لکھرا اور خالص نمونہ ہے اس سے پہلے کشمیر کی زیارتوں مسجدوں وغیرہ میں جو فن تعمیر برائے لکھرا ہے وہ عربی اور ایرانی فن تعمیر سے ملتا جلتا ہے جس کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں خلیہ دور کے معابد میں ملتی ہیں۔ کشمیر میں اسلامی فن تعمیر کلوی کی فراوانی کے سبب کلوی کے قایوں میں بھی پروان چڑھایا۔ اس کی ہیئت کدائی اور چہرے نقشہ پر پورے اور بعضی اثرات آئے نمایاں ہیں کہ کبھی کبھی ان پر پورے گولڈن (PAGODAS) کا گھٹان ہوتا ہے۔ جہیزین، لاسا، لایچ، نیپال اور بھوٹان میں اب بھی عام ہیں۔ اس کے مقابلے میں درگاہ شریف کا بنیادی اثر تقریباً پورے پورا کلوی سے متعلق ہے۔ صرف آخری کلوی کا نہایت مرتفع اور متنقش کام اس کے اندرونی مجھوں کی آرائش میں لگایا گیا ہے اور اس کے دیبے اور جالیان کشمیر کی صنعت کاری کے جانب نظر یادگار نمونے بن گئے ہیں۔ لیکن باہر سے درگاہ کا ڈیزائن تاج محل اور دہلی کی جامع مسجد سے قریب تر ہے اور اس کی استیازی حقیقت سرنگر کے خطاط (SKY LINE) میں آتی نمایاں ہے کہ یہ جہزین اپنے حسین پیکر کی وجہ سے ہی شہر کا ایک استیازی نشان بن کر رہ گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمارت کے بعد کشمیر میں فن تعمیر کا ایک انقلابی دور شروع ہو گیا ہے اور یہ آئندہ نئے فن تخلیق کی تار ہے گا۔

میں کوئی ایک کمر در در پیہ سے زیادہ رقم اس منصوبے کی تکمیل پر خرچ کرنا نہیں۔

تھے کہیں کو کمری فروش اپنا مال بیچنے کے لیے نعرے لگا رہے تھے کہیں میدان میں گوبر اور غلات کے ڈھیر تھے جن پر مکئی یا بھینٹاری تھیں۔ اوپر کے صحن میں بھی کئی حالت تھیں۔ مسجد کے اندر کھوٹے سے کھوا چھٹا تھا۔ الفرض ہر طرف افراغری تھی۔ لاڈلہ بزرگ و خیرہ کا تو ان دنوں کوئی بندوبست نہ تھا۔ اس لیے امام کا خطبہ قرأت یا تکبیرات بہت کم سنائی دیتی تھیں۔ امام اُن دنوں اس جگہ کہیں اقامت کرتا تھا۔ جہاں آج کل گلشن واقع ہے۔ مہر حال میں دن کی من بات کر رہا ہوں۔ اُس دن بھی قرآن مجید نماز کے لیے صحن باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن تکبیرات چونکہ سنائی نہیں دیتے اس لیے نماز پورے حضور کے ساتھ ادا نہ ہو سکی اور پورے صحن کی صفیں اکامت میں تھیں تو کچھ صحن کی صفیں سجود میں اور اُن سے باہر والے لوگ رکوع میں۔ یہ حالت دیکھ کر درد مندوں سے آہ و مہکا کا شور مچا۔ میں ان دنوں شاید انٹر میں زیر تعلیم تھا۔ مجھے یہ حالت دیکھ کر بے حد رنج ہوا۔ میں افسوس کر رہا تھا کہ وادی میں مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ مرکزیت کی حامل اس جگہ کا انتظام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔ تاکہ اُن کے اسلامی فرائض خوش اسلوبی سے ادا ہو سکیں۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی اور نیم خوانی کی کسی حالت میں میرے دل میں ایک جھوک سی اٹھی کہ کاش! میرے بس میں ہوتا تو زیارت کے اس نقشے کو حقیقت کا لباس پہنا دیتا۔ بات آئی گئی تھے معلوم تھا کہ وہ محمد بھی زمانے کے بس میں پرورش پا رہا ہے جب قدرت میرے ہی کزود ہاتھوں سے اس نقشے کے خاکے میں روپ رنگ بھر دے گی میری گیم کے قریباً غلام محمد الدین صاحب نے جو ایک مرد بزرگ اور مست قلندر تھے، اُن سے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس زیارت کی ایسی شان ابھرے گی کہ مسلمان تیل بل سے ہی ننگ پیر اور موقب ہو کر زیارت کے لیے آکر برس گئے۔ اس لیے جو کچھ بھی یہاں پر ظہور

جس کا بیشتر حصہ میں نے حضرت بل میں زائرین سے اور شہر و دیہات میں عقیدت مندوں سے عطیات اور چندے کی صورت میں وصول کیا۔ نفیس قسم کا سنگ مرمر لکڑی اور جستان سے منگوا یا گیا جہاں کی کانوں سے کبھی تاج محل کا سفید پتھر حاصل کیا گیا تھا۔ سنگ مرمر پر عربی آیات کی خطاطی لکھوا اور دہلی کے چوٹی کے خوشنویسوں نے کی اور یہ مغل دور کی خطاطی کی یاد دلاتے ہیں۔ مرکزی حجرے کے لیے جہاں موئے مبارک محفوظ رکھے گئے ہیں ایک عالی شان فانوس چیکو سکوا کیہ سے منگوا یا گیا، جو کشمیر میں ہی نہیں بلکہ اُس ملک میں اپنی نوع کا بہترین اور سب سے بڑا فانوس ہے۔

زیارت حضرت بل کی تجدید و تعمیر میں جن ساتھیوں نے میرا ہاتھ بٹایا ان میں سے ہر ایک کا نام گنوا تا تو مشکل ہے۔ لیکن چند نام جو مجھے اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ یہ ہیں۔ حاجی احمد خانی آبی گذر، حاجی غلام محمد خانی بچپوا، میر غلام رسول صاحب سابق صیغہ انجینئر، حاجی محمد الدین منٹو وغیرہم۔

انسان اکثر اس رزم میں رہتا ہے کہ کوئی خاص کام صرف اس کی کاوش سے سرانجام پایا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی میں جو تجربے پیش آئے ہیں اُن میں سے قائل ہو گیا ہوں کہ جب تک منشائے اہلی نہ ہو کوئی کام سر نہ کر سکتے ہو سکتا۔ بقول شاعرؔ

بے رضائے تو کیکے برگ نہ چنبد ز درخت

آثارِ شریف کا جو نقشہ اس وقت نمودار ہوا ہے اس کے چھپے بھی مسیت اہلی کام کر رہی تھی میری نوجوانی کا واقعہ ہے۔ مجھے شیک بے سادہ پن کی کمراں کی تقریب جاری تھی یا میلادِ اکبر جملہ کاؤن تھا اور حضرت بل میں سب دستور مسلمانوں کا ایک جم غفیر زیارت کے لیے جمع ہوا تھا۔ میرا غلام مولوی احمد اشرفی و عطا خانی کے بعد مسلمان نماز کے لیے صحنِ قدس گئے۔ زیارت کے لیے صحن میں غواچہ فروشوں اور پکڑے فروشوں کے ڈیرے جے جے

پذیرہود ہا ہے اس کے متعلق یہ سمجھاؤت دست ہوگا کہ یہ منشاء الہی کا کرشمہ ہے۔ اسی کی منشا
تھی کہ یہ کام میرے عاجز ہاتھوں سے سرانجام پائے۔ میں دل کی استعا گہرائیوں سے شان
ایزدی کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے مجھے اس عظیم کارنامے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے چنا۔
بخشی نظام محمد مرحوم نے بڑی کوشش کی تھی کہ اپنے دور اقتدار میں یہاں کی مسجد کو گنبدیائی
ڈال دیں۔ لیکن مشیت کو وہ منظور نہ تھا اس لیے ان کی مژد بھرنہ آئی۔

آثار شریف حضرت بل کا ذکر آیا ہے تو اس کی تاریخ اور مذہبی تقدس کی طرف اشارہ
کرنا بھی لازمی ہے۔ اس جگہ حضرت سرور کائنات، رحمتہ العالمین پیغمبر اسلام کا ایک
موسے مبارک ہے۔ روایت ہے کہ یہ موسے مقدس ایک عرب شیخ کی تحویل میں تھا جو حرم
کعبہ کے کلید بردار ان میں سے تھا۔ یہ شیخ حجاز سے وہاں کی حکومت سے اختلاف کی بنا پر
ہندوستان چلے آئے اور حیدر آباد دکن میں مقیم ہو گئے۔ ان دنوں ایک کشمیری خواجہ
نور الدین عشاوری کا حیدر آباد جانا ہوا۔ جو انھوں نے زمر کشمیر خرقہ کر کے اسس مشاہد
ہے بہا کو حاصل کر لیا۔ وہ اس عظیم قوت کوئے کر کشمیر آ رہے تھے کہ اس کی بولندہ شہادہ
اورنگ زیب عالمگیر کے کانوں میں پڑی۔ انھوں نے فوراً موسے مبارک کی فضیلت کا حکم
دے دیا۔ اور اسے اجیر شریف پہنچا کر درگاہ معین الدین چشتی میں رکھوانے کا فرمان
جاری کیا۔ روایت کے مطابق ابھی اس حکم پر عمل درآمد ہونے ہی والا تھا کہ ایک شب
شہنشاہ کو خواب میں آنحضرت کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی۔ اورنگ زیب نے
حضور کو کشمیر کی جانب مائل سفر کھیا۔ اس نے حضور کی خدمت اقدس میں سلام علیکم عرض
کی۔ جو بارشاد ہو کہ تم مجھے کشمیر جانے سے کیوں روکتے ہو؟ شہنشاہ بیدار ہوا اور اس پر
خواب کا مفہوم آ جا کر ہو گیا۔ اس نے فوراً موسے مقدس کو سرکاری گیلانی میں کشمیر روانہ
کیا۔ جب موسے مقدس لوہے کشمیر میں وارد ہوا تو اپنے وقت کے کشمیری رسوا و امراء

علماء اور علماء اسے اس کا بڑی عقیدت اور احترام سے استقبال کیا۔ پہلے تو اسے خانقاہ متعلیٰ
میں رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن جب نازنین کا انہو بہت بڑھ گیا تو اس کو حضرت بل نے جاناٹ
کر لیا گیا۔ وہاں کشمیر کے متعلیٰ عہدیدار کا ایک وسیع باغ واقع تھا جس کے عجوبے ایک بارہ
دری جی ہوئی تھی۔ یہاں نازنین کی نشست و برخاست کے لیے کشادہ و عظیم موجود تھی۔ اس
لیے تہہ سبیں پر قیام پذیر رکھنا مناسب خیال کر لیا گیا۔ اس وقت سے یہ مقام بڑا وادی
کے مسلمانوں کے لیے مرکز عقیدت و ہدایت ہے اور ان کی مرکزیت اور اجتماعیت کا پتر
شکوہ نژاد بن گیا ہے۔

اس روحانی مرکز کی شان بہت سی رنگا میں ہوں برابر کائنات کی طرح کھٹکتی چلی آئی
ہے۔ چنانچہ اس کو چھو کرنے کے لیے ایک باضابطہ اور منظم مگر ناپاک کوشش ۱۶ دسمبر
۱۹۳۷ء میں ہوئی۔ اس دن ایک پراسرار اور جیت آگیز طریقے سے موسے مبارک اپنے
مقام سے غائب کیا گیا۔ خبر تمام وادی میں آنا فانا جنگ کی آگ کی طرح پھیلی اور مسلمانوں
کے ذہنی حواس پر برق آسانی کی طرح گری۔ اس زمانے میں ہم جوں کے پیش پیش جیل میں
کشمیر سازش کیس کے تحت زیر حراست تھے۔ وادی میں ایک کھڑم چا گیا کشمیر کا کوئٹہ
کو نہر بل اٹھا بلکہ دنیا کے اکثر حصوں میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ حکومت
ہند کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور جو اپلا لال ہندو ریڈیو سے اہلین نشر کرنے لگے۔ کہیں تو
کیا کریں۔ وادی کے تمام مسلمان اپنی جائیں پروانہ و نازدار کرنے کے لیے تیار ہو گئے
تھے۔ جب صورت حال نے خطرناک حواقب کا رخ اختیار کرنا شروع کیا تو اچانک اعلان
ہوا کہ موسے مبارک دستیاب ہو گیا ہے۔ حکومت ہند نے لال بہادر شاستری کو سربراہ
بھیم اور مسلمان نمائندوں سے شناخت کر کے گواہی و لواقی گئی کہ یہی اصلی موسے مبارک
ہے۔ آج تک اس زمانہ سے پردہ نہیں ہٹ سکا ہے کہ موسے مقدس کو اپنی جگہ سے اٹھا

لینے والا کون تھا اور واپس رکھنے والا کون تھا؛ لیکن حالات و واقعات کی گواہی سے
مترشح ہوتا ہے کہ

چرخ کو کب سلیقہ ہے سرخ نگاری میں

کونی مشوق ہے اس پردہ رنگاری میں

یعنی اس کے پیچھے آن ہی لوگوں اور طاقتوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ جنہیں مسلمانوں کا یہ
روحانی مرکز ایک آنکھ نہیں سمجھا تھا اور جو اس اجتماعی مرکز کو ختم کر کے مسلمانوں کا شیرازہ
بکھیر دینا چاہتے تھے۔ سیاسی مرکز پر تو ان کا ہاتھ پڑ ہی چکا تھا اور مجاہد منزل میں منظر
ریز رو پولیس کا کیمپ لگا ہوا تھا۔

ان تمام واقعات کے ذکر سے میرا مقصد اس بات پر زور دینا ہے کہ انسان کو
کبھی اپنی طاقت پر غرور اور زیر پر گھمنہ نہیں کرنا چاہئے۔ انسان کی چالوں سے بہتر
چالیں اللہ کی دانست میں ہیں کہ فرمودہ الہی ہے ”وَمَكَرُوا مَكْرًا وَلِلّٰهِ خِيَالٌ“
کوین! انسان کی شہرچ بازی سے مشیتِ ایزدی نہیں بدل سکتی۔ بخشی غلام محمد
کے اقتدار کو زیر میں ٹوس ہونا تھا اور ٹوسے مبارک کا سانحہ اس کے سیاسی تباہیوں میں
آخری کیل ثابت ہوا۔

اقتدار سے میری علیحدگی کے بعد جب مجھے طویل مدت کے بعد جیل خالوں سے
رہائی نصیب ہوئی تو میں نے اپنی ساری توجہ اوقات کی طرف مرکوز کی۔ میری غیر حاضری
میں اوقات کے انتظام پر بھی بخشی غلام محمد نے قبضہ جبا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے
اپنے خاص طور طریقے سے اوقات کے کام کو نبھایا اور اس میں بڑی دقت بھی پیدا کی۔
لیکن اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے انھوں نے اقدامات نہیں کیے۔ میں نے اوقاف
کی از سر نو تنظیم کی۔ مجاہد منزل میں اس کے لیے ایک نیا دفتر قائم کیا۔ اور اسے ایک ٹرسٹ

کی صورت دی۔ اس کے ڈھانچے کو ذیلی شعبوں مثلاً شعبہ تعمیرات، شعبہ بیت المال، شعبہ امانات،
شعبہ املاک (ESTATES) وغیرہ میں تقسیم کیا۔ مسلمانوں کی بہت سی زمینیں بے
توجہی کی حالت میں پڑی ہوئی تھیں اور احتمال تھا کہ ان پر غرض مند ناجائز قبضہ جہاں
لگے ہیں ان سے رقبہ جات کے ارد گرد غاردار مارا گولے اور انھیں شہر دار باغات
میں تبدیل کر دیا۔ اور اس طرح اوقات کے لیے آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ پیدا
ہو گیا۔

اسی طرح ہم چند اور بڑی زیارتوں کو اوقات کے دائرے میں لے آئے۔ ان میں
چزار شریف میں واقع حضرت شیخ نور الدین دہلوی کی زیارت، زیارت بابا ربیع شکر
زیارت سید حسین منطقی اوتھی پورہ، زیارت حضرت پیر دستگیر خانانہ زیارت
حضرت عالی لہوی پھر پورہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی آمدنی اور خرچ پر بھی نگاہ رکھی گئی ہے اور
ان کی تعمیر و تجدید کے لیے بھی کافی کام کیا گیا۔ ہماری دیکھا دیکھی باقی زیارتوں کے انتظام
کرتے والوں کو بھی وولولہ ہوا اور انھوں نے آمدن و خرچ کی باقاعدگی اور تعمیر و تجدید
کی طرف توجہ کرنا شروع کی۔ اوقات نے ان کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ اس طرح
زیارت حضرت مخدوم حمزہ، زیارت حضرت شاہ جہان، زیارت حضرت نقشبند
مشکلی کشا کی تعمیر و تنظیم کے سلسلے میں خاصا کام ہوا اور یہ تحریک شہر و دیہات میں
معاہد و مساجد کی اصلاح اور توسعت کا باعث بن گئی۔ آج سے آہستہ بہ زیارت گاہیں بھی
مرکزی اوقات سے ملحق ہوئی گئیں۔ (الحاق شدہ مساجد اور زیارت گاہوں کی فہرست
آمدن مرکزی اوقات میں جمع ہوتی ہے۔ جہاں مقامات کے تمام قواعد کی نگرانی میں ان
کی آمد و خرچ کا حساب رکھا جاتا ہے۔ حسب طلب ذیلی اوقات کے اخراجات بھی
پورے کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اوقات اپنے مرکزی خزانے سے بیواؤں، یتیموں

کرنے کی تجویز ہے۔

بدقسمتی سے جموں میں ایسی ہم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہاں کے مسلم رہنماؤں نے اس کام کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد وہاں مسلمانوں کا وجود ہی ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔ لیکن ہم مایوس نہیں ہیں۔ اور برابر جدوجہد کر رہے ہیں۔ جموں میں علامہ استاد میں ایک شاندار مسجد تیار ہو گئی ہے۔ جو اپنی تعمیر کی پاکیزگی اور رعنائی میں اپنی مثال آپ ہے اور جس کی وجہ سے اس علاقے کی شکل بچھرائی ہے۔ تالاب کھٹیکان میں ایک شاندار جامع مسجد بخشی غلام محمد کے عہد میں تعمیر ہو چکی ہے۔ ہم نے ریڈیو دہلی پر ایک جدید ڈھنگ کی شاندار تعمیر کی طرح ڈالی ہے۔ جس میں دوکانیں اور غلیٹ موجود ہیں۔ تختہ منڈی راجوری میں ہم نے شاہدہ شریف کی مشہور زیارت کا انتظام بھی سمجھایا ہے۔ میری توقع یہ ہے کہ ہمارے بعد بھی مسلمان اس ادارے کو صرف زندہ رکھیں گے بلکہ اس کی ترقی میں سرگرمی سے کوشاں رہیں گے۔ اس طرح سے یہ ادارہ قومی اصلاح کی ضرورتوں کی کفالت کر سکے گا اور انھیں حکومت یا دوسروں کی طرف بار بار ہاتھ نہ پھیلا پڑے گا۔

اوقات اسلامیہ سے صرف یہاں کے مسلمان ہی مستفید نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ یہاں کے مسلم عوام کو اس سے فائدہ مل رہا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں میں نے عوامی حکومت کے پہلے سربراہ کی حیثیت سے زمام اقتدار سنبھالی تو حکومت کا خزانہ خالی تھا۔ سرکاری ٹرانسپورٹ کے ٹکے میں جو گاڑیاں تھیں ان میں مہاراجا اپنا مال غنیمت لے کر جموں فرار ہو گیا تھا۔ آدھے عوامی رسد و فیو کی

اور سکیٹوں کی بھی امداد کرتا ہے۔ کئی دینی مدرسے چلائے جا رہے ہیں جن میں مدینۃ العلوم حضرت بل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظائف بھی دیئے جاتے ہیں۔

اوقات کو خود کفیل اور مضبوط بنایا دونوں پر کھڑا کرنے کے اقدامات و تدابیر بھی برابر غور ہوتا رہتا ہے۔ ہم نے صیغہ سے اپنا سفر شروع کیا تھا اور اب اوقات کے پاس ایک کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی کے ذرائع وجود میں آچکے ہیں۔ جمیل ٹول کے کنارے بیوارڈ پر ساٹھ ستر لاکھ کی لاگت سے ایک جدید طرز کا ہوٹل کمپلیکس تعمیر کیا گیا اسی طرح محترم گڈھی کے نزدیک دوکانوں اور عمارت کا ایک بڑا کمپلیکس زیر تعمیر ہے جس پر لاکھوں روپے کی لاگت کا اندازہ ہے۔ رپ رشی جبہ کدل کی تعمیر نو کا کام ہنوز جاری ہے۔ یہاں نئی عمارت، دوکانات، عالی شان مسجد اور حمام کی تعمیر مکمل کے قریب ہے اور اب زیارت گاہ کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اور اس سارے تعمیراتی پروگرام پر لاکھوں کا خرچ ہو گا۔ اسی طرح کرن مگر میں سید کرم شاہ صاحب کی زیارت پر ایک گول مارکیٹ کی تعمیر بھی کی گئی ہے۔ اوقات کی جوئی عمارتیں بن رہی ہیں ان میں نفاست اور سخن کو خاص طور پر مد نظر رکھا جاتا ہے تاکہ کشمیر کے فن تعمیر میں ملال نہ جھلکاں ایک دل کش استراحت ہو اور یہ ملک کے اجتماعی سخن کو بڑھانے کا محسوس ہے کہ ہمارے شہر بامش اور ہم وطن کشمیر کے فن تعمیر کی نوکٹوں کی طرف کم توجہ کر رہے ہیں۔ اور اس طرح سے کشمیر میں اپنا امتیازی کردار کھو رہا ہے۔

اس وقت اوقات کی کوششوں کا محور اپنی املاک کو بڑھانے اور ساتھ ہی ساتھ نارتھ کو زیادہ سے زیادہ سہولیات دینا ہے۔ جب اس کام سے فوائد ہوگی تو آمدنی کا بڑا حصہ تعلیم و تربیت اور دیگر اصلاحی تعمیراتی کاموں میں صرف

معرکہ بیم ورجا

تاریخ کا پہلے انقلاب کا نقیب ہے اس صدی کی پانچویں دہائی شاید (اس صدی کی سب سے انقلاب آفرین، ہنگامہ خیز اور واقعات ساز دہائی تھی، عالمی بیٹا نے پرزنیکی سب سے لرزہ خیز جنگ شروع ہو چکی تھی جس نے ساری دہائی کو آندھی میں گھرے ہوئے ایک رنگین قبا رے کی طرح لرزہ بر اندام کر دیا۔ یہ قبا رہ کبھی فسطائی اور کبھی اتحادی طاقتوں کے آگن میں گھومتا نظر آ رہا تھا۔ ہندوستان میں مسلم لیگ پہلی بار ایک عوامی تنظیم کی شکل اختیار کر کے کانگریس کے غرور کو پاش پاش کر رہی تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ ۱۹۰۷ء کے بعد جس قسم کا سلوک کیا گیا تھا اس نے انہیں نفسیاتی طور پر عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا اور خوفزدہ آدمی ہمیشہ جذبات میں بہہ جاتا ہے کہ شیر پر بھی یہ عالمی اور ملکی واقعات اپنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے۔ بین برٹن الاؤنس سے آنکھیں دہلی چنگاریاں کبھی کبھی کشمیر میں آن گزرتیں اور یہاں کے خرمین امن کو شہر بارگرو تیس کشمیر کی شخصی حکومت اپنے سر پرست اور زندگی کے ضامن برطانوی سامراج کے پٹکے چھل رہی تھی۔ برطانیہ پر پڑنے کی شکل میں جو مصیبت نازل ہو گئی تھی اس

بہر سائی کے لیے سرکاری بار برداری کے ذرائع کی بھی اس حد ضروری تھی۔ چنانچہ ہم نے اوقات کے بیت المال سے پیسہ آوارہ لیا۔ اور درجن ڈیڑھ درجن گاڑیاں خرید کر کھلے ٹرانسپورٹ کی شروعات کی۔ آج اس ٹکے کے پاس ہزاروں گاڑیوں پر مشتمل غلیٹ ہے۔ جس کی آمدنی کمزوروں میں ہے۔

▲▲▲

پرست حکومت سے بدرجہا بہتر ہے چاہے ایسی ڈکٹیٹر شپ ملک کی ترقی میں
حاصل ہی کیوں نہ ہو۔ ۵

حکومت کے ایک اور قدم نے فنی پیدائی اور وہ ریاست میں ذریعہ تعلیم اردو کو
ناگری اور فارسی حروف میں لکھا تھا۔ ہم ناگری اور فارسی حروف دونوں کو لکھا
جائے کے حق میں تھے۔ لیکن حکومت کا منشا کچھ اور ہی تھا۔ وہ اس اثر میں اردو کو جو
اس صدی کی ابتدا سے اور فارسی کو جو کچھ سو سال سے ریاست کی سرکاری اور
رابطے کی زبان رہی تھی، ویش نکالا دینا چاہتے تھے۔ ہم نے وزیراعظم سے اس بارے
میں گفتگو کرنے کے لیے وقت مانگا۔ لیکن اُن کا موقف دلیل کی تاب نہیں لاسکتا
تھا۔ اس لیے وہ ٹال گئے۔ البتہ اردو کو جو دروازے سے ریاست بدر کرنے کی
کوششیں جاری رہیں۔ اردو کو عدالتی اسامیوں اور مکاتبات سے خارج کیا گیا۔ عدالت
کے سمن اور قنونان ناگری حروف میں چھاپے جانے لگے۔ اسمبلی کی کاروائی میں خوبصورت
اور آسان اردو الفاظ چن چن کر لکائے جانے لگے اور اُن کی جگہ سنسکرت کے نامانوس
اور ثقیل الفاظ چھوٹے جانے لگے اور اس طرح سے ایک ایسی زبان کے چلن پر زور دیا
جانے لگا جو عوام سے دور تھی۔ ایک اور دلی وزیر صاحب نے ساری ریاست کے عوام
کے دل بھینچ کر ڈالے۔ ریاستی حکومت کا قازقتینا سے آئے ہوئے مہاجرین کے ساتھ
انسانیت سوز سلوک تھا۔ چین میں ماؤزے تنگ کی سرخ کیونٹ فوج ۱۹۴۷ء سے
ہی زوال آمادہ اور بددیانت کو میں تاہم حکومت کا ایک کے بعد ایک مضبوط لکڑ بھار
کر رہی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں اس انقلاب کی کریشیں چینی ترکستان میں اپنے آب
سکائیگ کا نام دیا گیا ہے۔ میں اس طور محسوس کی گئیں کہ وہاں کے باشندے اور دیوار شکایت
کا بڑا قافلہ ایسا غن نامی سرداری قیادت میں ریاست کی حدود میں داخل ہوا۔ ان کے

ساتھ گھوڑے، بھیڑ بکریاں، باک، پارچہ جات، سونا اور دو سر اذاتی سامان تھا۔ حکومت
نے سپل پروانہ راہ داری دینے کی حامی بھری لیکن پھر اُن پر وہ مظالم ڈھائے گئے کہ
اُن کے ہزاروں ہم سفر اور جانور مویشی وغیرہ تپ تپ کر مر گئے۔ ہم نے
اس بے دروانہ لکڑ بھارہ سلوک کے خلاف آواز بلند کی تو حکومت کے ڈھنڈو ورجی اخبارات
”مطلب“ ”لاہور“ ”مہر“ ”سرنگر“ وغیرہ نے ان بے چاروں پر پٹھان تراشنا شروع

کر دیا۔ قازق تو دراصل ڈاکو ہیں۔ اس لیے کسی مہمدی کے سختی نہیں ہیں۔ لیکن یہ سراسر
جھوٹ تھا۔ اس لیے ہم نے اس کی مدق تردید کی۔ اس پر فرقہ پرست اخبارات اپنے
اصل روپ میں سامنے آ گئے۔ اور کہنے لگے کہ شیخ محمد عبداللہ چونکہ مسلمان ہیں اس لیے
اُن کی جماعت قازق مسلمانوں کے لیے آئسو بہا رہی ہے لیکن ہم نے اس بلیک میل کا
مقابلہ کیا اور آخر کو حکومت ہند اور حکومت کشمیر دونوں کو قازق مہاجرین کی حالت نظر
کا احساس کرنا پڑا اور اُن کو باعزت طور پر پناہ دی گئی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ہندو اور پاکستان
کے آزاد ملک وجود میں آئے تو کشمیر میں مقیم قازقوں نے حکومت ترکی سے درخواست کی کہ چونکہ اُن کے
نسلی اور لسانی تعلقات ترکوں کے ساتھ ہیں اس لیے انھیں ترکی میں آباد کرنے کی اجازت دی جائے۔
جب اُن کی درخواست منظور ہو گئی تو اپنے مواء اعظم کے ساتھ مل گئے۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے آغاز میں جاپان
اتحادیوں کے خلاف جنگ میں کود پڑا دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مشرقی بھارت میں برطانیہ کی
عسکری قوت کو تاخت و تاراج کر دیا اور برما پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان کے
دروازوں پر دستک دینے لگا۔ سمجھاں چندر بوس جاپانیوں کے بل بوتے پر ہندوستانی
پریم ہارے ہوئے دہلی کے لال قلعہ پر نظر سے گاڑ رہے تھے۔ برطانیہ پر ہل ٹاری ہونے
لگا اور اُس نے ہندوستانی عوام کو نفسیاتی طور ناظرہ دار بنانے کے لیے اپنے ایک
شہرت یافتہ مدبر سر شیو رڈکرپس کو ہندوستانی رہنماؤں سے گفت و شنید کے لیے
نئی دہلی روانہ کر دیا۔ کرپس نے جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کی آزادی کی یقین دہانی

کی لیکن اس وقت جبکہ آزادی ہند سے متعلق کچھ اہم مشورے ہو رہے تھے، ہندوستانی ریاستوں میں کافی جڑی کے سامراجیوں کے ظلم ہونے والے عوام کو بدستور مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ جیوں کو غیر پیشکش کا لائن میں اپنے تاریخی شعور اور عوامی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تنازع کے خلاف آواز بلند کی، اور دس ریاستوں کے عوام کی ترجیح کا بیڑا اٹھالیا۔ میں نے پنجاب ریاستی پریس پر جابلہ ریشل، میونسپل کالفرنس، حیدرآباد میونسپل کالفرنس اور دوسرے پرچا منڈلوں سے رابطہ قائم کیا۔ ہم نے اعلان کیا کہ دس ریاستوں میں لینے والے دس کروڑ پانچدسے اُن معاہدوں کے پابند نہیں ہو سکتے جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور والیان ریاست کے درمیان طے پائے ہیں اور ریاستی عوام کی طرف سے بولنے کا حق راجواڑوں کا نہیں عوام کے نمائندوں کو ہے۔ ہماری اس آواز پر آل انڈیا سٹیٹس میونسپل کالفرنس نے ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء کو ریاستوں کا یوم مطالبات منایا۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۷ء کو سرینگر میں ہمارا ایک زبردست جلوس نکلا اور جیلے کے اختتام پر ایک قرارداد پاس کی گئی جس میں بتایا گیا کہ دس ریاستوں کے لوگوں کی جان و مال اور عزت کو جاپان اور جرمنی کی ظالمانہ یلغار سے بچانے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے وہ یہ ہے کہ دس ریاستوں میں ذمہ دار نظام حکومت قائم کیا جائے تاکہ عوام کی مالی، جسمانی اور ذہنی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہو کر ان کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھیں۔

ہم آزمائش کی اس گھڑی میں دنیا کے معاملات سے شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند نہ کئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ممی مشعل میں کشمیر لوگوں کی ناس میں پیشکش کا لائن کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ایک ڈونگے میں ہوا۔ ڈونگہ پانی پر تیرتی ہوئی ایک کشتی کو کھپتے ہیں۔ جس میں رہتے ہیں کی ہویات ہوتی ہیں، ڈونگہ جمیل کی سطح پر ۲۴ گھنٹے تک تیرتا رہا اور ہم نے یہ قرارداد پاس کی۔

ہمارے بیچ عالم کے اس مسئلے پر عوام کو اس بات کا پوری شدت سے احساس کرنا چاہئے کہ ہمارے ملک کو فسطائی طاقتوں سے کتنا بڑا خطرہ درپیش ہے۔ عوام کو اُن کے خواب راحت سے جگایا جانا چاہئے کیونکہ موجودہ جنگ صرف بڑی طاقتوں کا معاملہ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے عوام کا فسطائیت اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف، متحدہ محاذ بن گئی ہے۔ چاہے وہ طاقتیں بیرونی ساخت کی ہوں یا سودیشی باشندے، بین الاقوامی سطح پر فسطائی اور ظلم کی طاقتوں کی شکست گھڑیو محاذ پر بھی اُن کی شکست کا باعث بنے گی۔ لہذا عالمی فسطائیت کی شکست کے لیے کشمیری عوام کو متحدہ اور ایک آواز ہونا چاہئے۔

اُن دنوں ہمارا جاہری سینگو اپنی آزادی پسندی کا بہت ڈھنڈوہ پیٹ رہے تھے۔ اور انھوں نے آزادی ہند کی حمایت میں ایک مہم سابیان بھی دے ڈالا تھا۔ میں اس دورے پن کو برداشت نہ کر سکا اور میں نے اپنے منہ بچھ انداز میں کہا:

”ہزائی نہیں جب ہندوستان کی آزادی کے متعلق بڑے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو وہ اس امر اور جاہرانہ طرز حکومت کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں جس کے خون آشام تجوں میں پھنس کر ان کی اپنی رعایا سوسک سوسک کر زندگی بسر کر رہی ہے۔“

کچھ ہی دنوں کے بعد کرپس صاحب کو اپنے ریشن کی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا۔ کانگریس نے اُن کی تجاویز ٹھکرا دی تھیں، چنانچہ کانگریس نے ”ہندوستان چھوڑو“ کا نعرو بلند کیا۔ کرپس تجاویز کی کانگریس کی طرف سے نامنظوری ایک غیر دانشمندانہ اقدام تھا۔ اور اس نے تقسیم ہند کی راہ ہموار کی کرپس نے جو فوراً لا پیش کیا تھا وہ تقسیم ہند سے مختلف تھا۔ جس کے تحت ہندوستان کی وفاقی حیثیت برقرار رہتی تھی۔ یہ مطالبہ

مسٹر جناح نے منظور کر لیا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے مطالبہ پاکستان کو طاق پر رکھنا مان لیا تھا۔ لیکن حیرانی کی بات ہے کہ کانگریس نے اس کو منظور کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطالبہ پاکستان نے زیادہ زور پکڑ لیا اور ایک وقت آیا کہ کانگریس قیادت کو اس آشوب کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اگر اس وقت کانگریس کی تجاویز مان لی جاتیں تو شاید خون کی وہ ہولی روکی جاسکتی تھی جس نے تقسیم ہند کی وجہ سے لگتا اور ہندوہ کے پانیوں کو سرخ کر دیا۔ بہر حال ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی کے ساتھ کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھلا ایسے موقع پر نیشنل کانفرنس جیسی سامراج مخالف جماعت کیسے چیلنجی رہتی اور خوشامیابی جی رہتی؟ ہماری ورکنگ کمیٹی نے برطانوی داروغہ کو آڑے پاٹھوں لیا۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ رہنماؤں کو ہار کے ہندوستان کی آزادی پر معنی نیر گفتگو کا آغاز کر کے مطالبی مخالفت محاذ کو تقویت بخشنے میں نہ اس مطالبے کی حمایت میں ۱۴ اگست کو عام ہڑتال کرنے کی اپیل کی اور عوام نے میری اپیل پر لبیک کہتے ہوئے آس دن سارا کاروبار بند رکھا۔ کانگریسیشن کی ناکامی کے بعد کانگریس جیل چلے گئے۔ اور برطانیہ نے تحریک "ہندوستان چھوڑ دو" کو کھیل کے رکھ دیا۔ اس حد تک کہ اگر مہاتما گاندھی کچھ عرصے کے بعد آغا خان پریس پونہ میں من رت دست درکشتے تو اس تحریک کے اثرات بھی مدہم ہو چکے ہوتے۔ کانگریسی رہنماؤں کے اس طرح منظرے غائب ہونے کا مسلم لیگ اور ان کے نزدیک لیڈر جناح صاحب نے خوب فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے اعصاب پر پاکستان کے نعرے کا پرچم بھرا لے لگا۔ میں پاکستان کے نعرے کی نفسیات سے ہمہ روی تو رکھتا تھا۔ کیونکہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کا ہندو فرقہ پرستی کے خلاف ایک جارحانہ رد عمل تھا اور صورت ہندوہا سبھا جیسی فرقہ پرست تنظیموں نے یہی نہیں

بلکہ کانگریس کے ایک طاقتور مگر تنگ نظر گروہ نے بھی ان کے تمدنی مذہبی اور اقتصادی احساس تحفظ پر مسلسل دادر کر کے انہیں ایک اعلیٰ تناؤ میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر میرا یہ بھی یقین تھا کہ ایک سبھی ہوئی اقلیت کا جذبہ باقی رد عمل ہے جس سے اس کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچنے کے زیادہ اندیشے ہیں۔ میں پاکستان کو بنیادی طور پر ایک فرد پسندانہ سمجھتا تھا۔ یہی جذبہ باقی اور ذہنی فضا میں نیشنل کانفرنس کا میر لپور میں سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ مجھے پہلی مرتبہ نیشنل کانفرنس کی صدارت سونپی گئی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں برطانوی سامراج کی چالوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی پریشانیوں کو موضوع بحث بنایا۔ میں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان کو اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ وہ اسی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ان کو سندھ کی سرزمین پر اپنا فروقہ قویہ دیکھ کے ہوتے تیرہ سو سال، ہندوستان کے باقی حصوں میں ایک ہزار سال اور کشمیر آئے ہوتے ساڑھے چھ سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ ہمارے کروڑوں آباؤ اجداد کا وجود ہندوستان کی مٹی کا جزو بن چکا ہے اور آج اس سرزمین کے ذرے ذرے میں ہمارے خون کی آمیزش ہے کشمیر سے لے کر اس کماری تک اور درہ خیبر سے لے کر آسام تک اس سرزمین کا کون سا ایسا حصہ ہے جس میں مسلمانوں کی یادگاریں ان کی بستی، ان کے معابد و مساجد، زیارات و مقابر اور علمی و عملی کمالات کے لازوال نمونے بکھرے ہوئے نہیں ہیں۔ سرنگاپٹنم ہو یا بصری، مگر دونوں ہمارے ہیں۔ ان حالات میں ہم ہندوستان کے کسی حصے سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اب ساری سرزمین پر ہمارے حقوق دائمی اور

ایدی حیثیت حاصل کر چکے ہیں، الغرض ہندوستان ہمارا وطن ہے اور یہی
ہمارا وطن رہے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے اس وطن اور گھر کیوں کے تسلط
سے آزاد کرنے اور اس کے مالک بننے کی کوششوں میں سب سے آگے

رہیں۔“

▲▲▲

”نیا کشمیر“

آدھر دنیا کے بیچ پر تاج و تخت لوگ کشمیر پر کھلونوں کی طرح آچل رہے تھے
اور ریاست میں سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال مخدوش ہوتی جا رہی تھی، ریاست
کابلے در دا استقامت کو پہنچ رہی تھی، عیش و عشرت میں مگن تھا اسے عوام کی مشکلات
سے بس زبانی جمع خرچ کی حد تک دلچسپی تھی، جنگ نے ایشیائے جزیریہ کی نقل و
حمل شکل بنادی اور ریاست میں سوکھا پڑا اور کھانے پینے کی اجناس کا کال پڑنے
لگا۔ چاروں طرف ”روٹی روٹی“ کی ہا ہا کار بگنی اور ایک وقت تو نیشنل کانفرنس
کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی عوامی دھوکہ دہ کے مداوا کے لیے متحدر ہو گئیں، جنوں میں
گوئیاں چلائی گئیں اور سرنگرم میں گرفتار ہائی کی گئیں، ہمارا جانے اس نازک سیاسی
صورتِ حال سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے نالک کے سے انداز میں ایک آئینی اصلاحاتی
کمیشن کا طعشق سے اعلان کیا، کمیشن کے دائرہ اختیار میں ”ریاست جنوں کو کشمیر
میں ترقی یافتہ نظام حکومت“ اور اس نوع کی چکنی پیڑی باتیں رکھی گئیں لیکن جب
کمیشن کے ممبروں کا اعلان ہوا تو ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ یہ سوانگ محض اشک ثونی کے

لیے رچایا جا رہا ہے۔ ریاست بھر کے وفاداران اہل، شک خالان سرکار، ولیدار پرنسز اور
اسی قسم کے سرکاری زر خرید کمیشن میں بھرتی کیے گئے تھے جنہیں مسائل کا مشورہ تو کیا ان کی
فریبک نہیں تھی۔ نیشنل کانفرنس کی طرف سے مرزا محمد افضل بیگ اور خواجہ غلام محمد صادق
کمیشن کے لیے نامزد کئے گئے تھے۔ اگرچہ کمیشن کی ہیئت ترکیبی اداس کے انجام سے متعلق ہم
کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھے۔ مگر ہم نے سچر بھی اپنے ممبروں کو اس کی پہلی نشست میں
جانے کی اجازت دے دی۔ تاکہ سوانح کی حقیقت کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا جاسکے
بہت جلد ہمارے ممبروں کو کمیشن کی اصلیت کا سراغ مل گیا اور انہوں نے نیشنل کانفرنس
کی ورکنگ کمیٹی کو رپورٹ پیش کر دی کہ یہ ایک ٹھکوسلہ ہے۔ ہم نے اپنے ممبروں کو
کمیشن سے واپس بلایا اور اس کے ساتھ ہی فیصلہ کر لیا کہ وقت آیا ہے جب خود
نیشنل کانفرنس کو پہل کر کے ایک سیاسی، آئینی و اقتصادی منشور تیار کرنا چاہئے جو ایک
تو ہمارے مقاصد کا نشان بن جائے دوسرے ہماری آرزوں، امنگوں، تضادات کا
مرکزی نقطہ رہی۔ ”نیا کشمیر“ کی ترتیب کا پہلا مزید ثابت ہوا۔ اگرچہ اس نقطہ سے ہی ہماری
سیاسی جدوجہد چند خاص مقاصد کے لیے حصول کی جانب مرکوز تھی لیکن جدوجہد
کے ناہموار راستے پر کبھی کبھی تو یہ خواب تعمیروں کی کثرت سے پریشان ہو جاتا تھا۔
اس لیے ضروری تھا کہ نیشنل کانفرنس اپنے مقاصد کو قلمبند کر کے انہیں عوام کے
سامنے پیش کرے۔ یہ سارے جدوجہدستان میں اس قسم کی پہلی کاوش تھی۔

ہماری تحریک کا دائرہ پہلے تو شمالیوں تک محدود رہا اور اس وقت اس کا
نقطہ اجتماع (RALLYING POINT) اسلام تھا۔ لیکن اب تحریک کے دروازے
سب مذاہب کے لوگوں پر کھول دئے گئے تھے۔ تو ایک مشترکہ نقطہ اجتماع کی ضرورت
محسوس ہوئی۔ یہ نقطہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی نوعیت کا ہی ہو سکتا

متفقہ زندگی اور تحریک کے تجربے نے ہمیں قائل کر دیا تھا کہ عوام کے مختلف طبقات میں
بنیادی نگرانہ مذاہب کا نہیں بلکہ مفادات کا تھا۔ ایک طرف استحصال کرنے والے تھے
اور دوسری طرف وہ جو اس استحصال کا شکار تھے، ہماری لڑائی کا منشا و مقصد مظلوم
کی حایت اور ظالم کی مخالفت تھا۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ ہماری ایک جاہل و فہمکام سے
ٹکڑے کسی شخصیت سے نہیں۔ ہمارا جاگیر داری نظام سے جھگڑا تھا جاگیر دار کی ذات
سے نہیں۔ واقع یہ تھا کہ ہم ہماری سے نفرت کرتے تھے تجارت سے نہیں۔ اس لیے ہمارے
مقاصد کی شناخت اور تشہیح کی ضرورت تھی تاکہ ہماری جدوجہد کا پرکار اسی نقطہ
کے ارد گرد گھومے پھرے۔ اس منشور کے لیے پہلے تو ہم نے ریاست بھر کے تمام علاقوں
کے مسائل کی فہرست مرتب کی اور اجتماعی مسائل پر بھی بھرپور نظر ڈالی۔ اس منشور
کو مرتب کرنے کے لیے ہم نے پنجاب کے ایک مشہور ترقی پسند دوست بی بی ایل بیدی
کی خدمات حاصل کیں۔ محمد دین تاثیر کے اہم اشراف، وائیکل لطیفی اور احسان دانش
جیسے لوگوں نے بھی دستاویز کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ بیدی صاحب کی بیدار
منغز اور سلیقہ مند بیوی تحفیدہ نے مسودہ ٹاپ کیا۔ جب یہ منشور تیار ہوا تو ہم نیشنل
کانفرنس کے متعلقہ اداروں نے اسے منظور کیا۔ دیناچے جب ہمارا جائے مشرق وسطیٰ
کے دورے سے واپس آئے اور شہر کے استقبال کے سلسلے میں مجاہد منڈلی کے سامنے
گذرے تو میں نے اسے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

”نیا کشمیر“ اپنی ترتیب کے وقت صرف راست ہی نہیں بلکہ تنگ بھر کی سطح کی
ایک انقلابی دستاویز تھی اور اس کی انقلاب آفرینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا
ہے کہ آج پچیس سال کا عمر گزرنے کے باوجود اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک جوان
و جاوید دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں زمین کاشت کار کے حوالے کرنے کا

جو تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس پر نور برصغیر میں آزادی کے بعد بھی برس ہا برس تک عمل درآمد نہ ہو سکا۔ "نیا کشمیر" میں عورتوں، مزدوروں اور سماج کے دوسرے کمزور طبقوں کے حقوق باضابطہ تسلیم کر کے تحفظ کا بیان کیا گیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ "نیا کشمیر" پر اشتراکی نظریات کا اثر رہا ہے۔ جہاں تک اشتراکیت کے اس پہلو کا تعلق ہے جو بین الاقوامی سطح پر محنت کشوں اور مظلوموں کی جدوجہد کی طرف داری کرتا ہے۔ نیشنل کانفرنس نے ہمیشہ اس کو سراہا ہے اور وہ نہ صرف انقلاب روس بلکہ انقلاب فرانس کے اصولوں اور روشن خیالی کی کرنوں سے اپنے ذہن و ضمیر کو مالا مال کرتی ہے۔ لیکن ہم اشتراکیت کے آمیز سے میں جمہوری طرز عمل نرم رونی کے انسانیت نواز اور حیات بخش عناصر بھی شامل کرنے کے حق میں تھے۔ جب ہم نے نیا کشمیر کو اپنا تو مسلم لیگ کے نوابوں کے ساتھ ساتھ کانگریس کے رجعت پسندوں نے بھی ہم پر آوازے کئے۔ ایک مسلمان لیڈر نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اس سے ہندو سرمدایہ دار کے ساتھ مسلمان سرمدایہ دار بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس طرح مسلمان گھائے میں رہیں گے۔ اسی طرح ایک ہندو نیتا نے یہ کہہ کر اس کی مذمت کی کہ اگر اس منشور پر عمل درآمد کیا گیا تو ہندو عورتوں کو بھی مسلمان خواتین کی طرح طلاق آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔ اور اس طرح ہندو سوسائٹی خطرے میں پڑ جائے گی۔ انہی دونوں منظر آباد میں ہندو سمجھا کا ایک اجلاس ہوا جس میں اکمل بھارتیہ ہندو مہا سمجھا کے ایک بڑے لیڈر ڈاکٹر موہن اور کشمیر یووک سمجھا کے نیتا شوخرائن فطیدار نے "نیا کشمیر" کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور اپنے پیروؤں سے "نیا کشمیر" کے نظریات کے خلاف کمر بستہ رہنے کی اپیل کی۔ لیکن بعد میں ہندوستان میں جو ہر لال بہرو کی قیادت میں کانگریس (ایچ) بازو کی اس سوچ کی طرف جھکتی گئی جس کا احساس "نیا کشمیر" میں مضمر تھا اور ایچ این نیشنل کانگریس

کا اوادری سیشن کارپریٹویشن، جس میں ملک کا لاکھوں ایک سماج وادی نظام قائم کرنا ٹھہرایا گیا۔ دراصل "نیا کشمیر" کی فکر کی ہی صدائے بازگشت تھا۔ جب ۱۹۶۶ء میں مسٹر اندرا گاندھی نے بنگوں کو قومیانے جیسے انقلابی اقدامات سے کانگریس کے رجعت پسند رہنماؤں کو پسپا کر دیا۔ اس وقت بھی بائیں بازو کی اسی سوچ کا بول بالا ہو رہا تھا۔ "نیا کشمیر" کے مقاصد کو میں نے اس کے دیباچے میں مختصر آویں بیان کیا ہے۔

"ہم اپنے "نیا کشمیر" میں اپنی ریاست کے مرد اور عورت ذات کی جدید تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ جن کا روحانی اور ذہنی قصدہ یوں کے ذہنی رفاہ اور مظالم کے کوہ کر دیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے شاندار انسان پیدا کریں جو ہماری خوبصورت مادر وطن کے شایان شان ہوں۔"

(نیا کشمیر کا دیباچہ ضخیمہ.... میں ملاحظہ ہو)

"نیا کشمیر" کی اشاعت ریاست کے دانشور محققوں کے لیے ایک خیالی انگیزہ تعین ثابت ہوئی۔ اس پر اندرون اور بیرون ریاست زبردست بحث و مباحثہ شروع ہو گیا اور ریاست کی عوامی زندگی میں مدوجز کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ وزیر اعظم خزان کے پتوں کی طرح جھڑپے تھے۔ مہاراجا اپنے زوال آمادہ نظام کے ناسور کا علاج تو نہ کرتے تھے صرف اس نظام کی ناکامیوں کا تحفہ مشق اپنے مملکت و مزارعے اعظم کو بناتے تھے۔ گوپالاسوائی انشیکر کو چلا کر دیا گیا اور بیرون کے ایک سیاسی معصوم سر مہاراج گھج کو لا گیا۔ لیکن چار بیٹے کے اندر اندر ان کا بھی بستر بند ہو گیا۔ کرنل باکسٹرام کے ایک بہن آئے جو مہاراجا کے پرانے دوست تھے اور جن کا کانگریس لیڈروں سے بھی بار بارہ تھا۔ لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہ ٹیک سکے پھر ایک ممتاز ہندوستانی قان دان سر بیگلی نرسنگھیا راؤ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ بی. این راؤ تھے تو شریف آدمی، لیکن جس نظام

کی میربانی کرتے تھے وہ تعصب اور تعسف سے سچے طور پر بچنا چاہتے آتے آتے ہی انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا:

”جموں و کشمیر ایک ہندو ریاست ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کی غیر ہندو آبادی بھی ترقی کرے۔“

بی۔ این۔ راؤ کے اعتدال پسند خیالات کے بارے میں بہت دوستوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ اس لیے اس بیان سے مجھے کافی رنج ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنی دونوں حضرات بل میں ایک تقریر میں راؤ صاحب کو اس تعصب آمیز روش سے بے متنبہ کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے علم نہیں کہ سرسنگھل کے تئیریکوین ایک ہندو ریاست کہا ہے لیکن مجھے اس سے سخت اختلاف ہے۔ ایک ایسی ریاست کو جس کی پچاس فیصدی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے ہندو ریاست کہنا خود اپنی ذہنیت کو بے نقاب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہمارا راجا کا ہندو ہونا ہی ریاست کی ہیئت ترکیبی کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ وزیراعظم نے ہندو ریاست کی اصطلاح استعمال کر کے جس ذہنی کیفیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ریاست کے بہت سے اعلیٰ حکام کی ذہنیت کی آئینہ دار ہے۔ عدلی و انصاف کا تقاضا ہے کہ مختلف فرقوں کے درمیان امتیاز کی دیواریں منہدم کی جائیں۔

▲▲▲

(۳۰)

محمد علی جناح اور ہم

۱۹۴۷ء میں جناب محمد علی جناح سرگرمی و تفریح کے لیے تشریف لائے تو وہ ایک ہندوستان گیر شخصیت کے مالک بن چکے تھے اور ان کے سیاسی امتیاز کے ساتھ ان کی قانون دانی کا لوہا بھی مان نکلتے تھے اُس وقت ان کے ساتھ ان کی ہمیشہ و محترمہ فاطمہ جناح بھی تھیں۔ وہ شیعہ پورہ میں ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ انہی دنوں چیف جسٹس سر برجور دلال کی عدالت میں ایک مقدمہ حلیہ بیگم اور مہر علی تھانیدار کے متنازعہ نکاح سے متعلق زیرِ سماعت تھا۔ مہر علی کشمیر پریس میں ایک تھانیدار تھا اور مقدمہ حلیہ بیگم سے ان کے نکاح ثانی سے متعلق تھا۔ حلیہ بیگم کا ایک اور دعویدار استلو عبدالکبیر پیر تھا۔ مہر علی کے ساتھ ہماری جان پہچان تھی۔ مقدمہ کافی مشکل تھا۔ اور اس نے کافی توجہ مبذول کرنی تھی میں اور مرزا محمد افضل بیگ جناح صاحب سے ان کے ہاؤس بوٹ میں بیٹے جا کر آئیں اس مقدمے کا وکالت نامہ لےنے پر مائل کر سکیں۔ یہ میری جناب صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ جناح صاحب نہایت صاف ستھرے انگریزی سوٹ میں ملبوس تھے۔ مگر چہ وہ دسپے پتے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں ذہانت اور چہرے پر ایک

قدرتی شکست موجود تھی۔ وہ ایک خاص آن بان سے بات کرتے اور بہت کم ٹسکراتے۔ اس لیے اُن کے گھر میں تنجیدگی کا ماحول قائم رہتا۔ بیگ صاحب سے مقدمے کی ذمیت سُن کر انھوں نے ایک ہزار روپیہ فی مہینہ فیض طلب کی۔ ہم اتنی بڑی فیض ادا کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور جناح صاحب کو فیض گھٹانے پر راضی کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ بات میری پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی ہوگی۔ آپ کو ایک ہزار روپے فی مہینہ فیض سے حساب سے فیض دینا ہوگی۔ جب ہی میں وکالت نذر قبول کر سکوں گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں فیضی ادا کماؤں کے لیے چندہ دے سکتا ہوں لیکن پیشہ ورانہ اصولوں کو قربان نہیں کر سکتا۔ معاملے طے کرنے کے بعد اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور وہ پیشہ کے دن سر پر جو ر کی عداوت میں وکالت کے جوہر دکھانے کے لیے آگئے۔ ان کی ناخاندانہ بحث شننے کے لیے کوفہ عداوت لوگوں سے کھینچا ہوا تھا۔ میرا بھی تماشا بیوں میں تھا۔ جناح صاحب کی وکیلانہ موثر گائیڈانہ رنگ لائیں اور ایک برسے ہی بائیک اور طبیعت سے نقش کی تشریح پر مقدمہ بحیثیت گئے۔ کمال یہ ہے کہ یہ تو شنگانی اسلامی کلینڈر سے متعلق ایک منکھٹے سے متعلق تھا۔

اسی زمانے میں عید میلاد النبی کا جلسہ شاہی مسجد میں ہونے والا تھا۔ ہم نے انھیں ایک نشست کی صدارت پیش کی۔ جو انھوں نے قبول فرمائی۔ اور صدارتی تقریر انگریزی زبان میں فرمائی۔ جناح صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ریاست میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیفِ عقول کریں بلکہ ان کو سیاسی گاڑی کا ایک پہیہ سمجھ کر اپنے ساتھ چلائیں۔ اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور جناح مسلمانوں کو برکشت خاؤ کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں برٹش انڈیا ایکٹ

نے تحت جو انتخابات مختلف صوبوں میں ہوئے اس میں بھی مسلم لیگ نے پہلی بار قابلِ لحاظ کامیابی حاصل کی تھی۔ صوبہ بابت مقدمہ اگر وہ اور دھونیں یو پی میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ایک انتخاباتی جھوٹ ہوا تھا جب نتیجہ ظاہر ہوا تو کانگریس نے ایک بڑی اکثریت کے ساتھ انتخابات جیت لیے اس لیے اس کو حکومت بنانے کے لیے دوسری جماعتوں کے ہاتھ بٹانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اپنی کامیابی کے زعم میں اس نے وزارت میں مسلم لیگ کے شامل ہونے پر کوئی شرطیں عائد کیں جن کے ماتھے سے مسلم لیگ نے انکار کیا۔ اور وزارت میں شامل نہ ہوئی۔ اگر کانگریس فراخ دلی اور متذہب سے کام لیتی اور نواب محمد اسماعیل خان اور چودھری خلیق الزمان جیسے مسلم لیگی لیڈروں کو وزارت میں شامل کرتی تو شاید آج ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا لیکن جو ہر لال کی بے جا حسد کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ مسلم لیگی لیڈروں کو کانگریس پر کوئی بھروسہ نہ رہا اور نہ یہ اعتماد کہ کانگریس کی موجودگی میں وہ کبھی بھی عنایا اختیار سنبھال سکیں گے۔ چنانچہ اس احساس سے ہندو مسلم تعلق اور بڑھ گئی۔ برطانوی راج کے ساتھ یہ اشتراک زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ اور کانگریس نے وزارتیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کر دیا۔ مسلم لیگ نے اس خوشی میں ملک گیر پہانے پر ایک یومِ خجائٹ منایا۔ پنجاب میں یونیٹ پارٹی سرسکند حیات کی قیادت میں برسرِ اقتدار لڑائی بنگال، سندھ اور اسلام میں مسلم لیگی وزارتیں قائم ہوئیں۔ ہندوستان میں سیاسی سرگردیاں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ عام مسلمانوں کا رجحان واضح طور پر مسلم لیگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہم کشمیر میں فرقہ وارانہ سیاست کے اس دور کو خیر یاد کہہ چکے تھے۔ اگرچہ جوں کے مسلم تلامذہ طبقہ کے دباؤ کے تحت چودھری غلام عباس نے سیاسی تلامبازی کھائی اور انھوں نے پھر مسلم کانفرنس کی احیاء کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے ساتھ جوں کے کچھ

نوجوان بھی تھے۔ مسیروا عظیم دست شاہ کو بھی جنہیں تاریخ کی رفتار نے طاقتور کیا کی زینت بنا دیا تھا یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور وہ بھی چودھری عباس کے ساتھ ہو گئے غالباً انھوں نے ہی حیدر آباد کے مشہور سیاسی رہنما بہادر یار جنگ کو کشمیر اگر مسلم کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ قناب صاحب آدھو زبان کے ایک انتہائی طاقتور خطیب تھے۔ اور حیدر آباد کی اتحاد المسلمین کے سربراہ وہ کشمیر کو پہنچنے لگے لیکن جب وہ مسلم کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرنے والے تھے تو حکومت نے انھیں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کشمیر بھیج ڈیئے تاکہ وہ انھیں تمیل کرتے ہی جی۔ پی۔ وٹ ہرگز پسندیدہ نہیں تھی اور ہم کسی طرح اس کے روادار نہیں تھے۔ لیکن بہادر یار صاحب کے کانوں میں نہ معلوم کس نے کیا بات ڈال دی کہ انھوں نے اس کاروائی کا سارا اہتمام بخود پر عائد کر دیا۔ حالانکہ انھیں اس معاملے سے دور کاروبار بھی نہیں تھا۔ بہر حال کچھ تو اس واقعے سے اور کچھ ان بیانیات کی وجہ سے جو مسلم لیگ کی سیاست کے خلاف دیتا رہتا تھا مسلم لیگ اور نیشنل کانفرنس کے درمیان غلط فہمیوں کی پھیل جاتی رہی تھی۔ میری ہرگز یہ مرضی نہیں تھی کہ ان دو جماعتوں کے درمیان کوڑھش کا ماحول قائم ہو۔ اور میں نے اسی مقصد سے جناح صاحب کے نام ایک خیر سگالی کا مکتوب بھی روانہ کیا تھا۔ جناح صاحب نے اس کے جواب میں مجھے دہلی آنے اور ان سے ملاقات کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ موقع پا کر میں نے ان سے ملنے کے لیے دہلی گیا۔ اس وقت بخشی غلام محمد بھی میرے ساتھ تھے۔ جناح صاحب نے ہمیں شرفِ ملاقات بخشا اور یہ ملاقات وہ گھنٹے تک جاری رہی ان دنوں وہ اپنی قیام گاہ اورنگ زیب روڈ میں مقیم تھے۔ میں نے جناح صاحب کے سامنے تحریک کشمیر کی تفصیل بیان کی اور جن نفیب و فوارے سے ہم گندے تھے ان کی ساری روئداد ان کے سامنے رکھی میں نے عرض کی کہ

ریاست جوں و کشمیر ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے جس میں پچاس فیصدی مسلمان رہتے ہیں۔ بنا بریں معاملات کے متعلق ان کا نظریہ ایک اکثریت کا ہی ہو سکتا ہے اقلیت کا نہیں اس کے برعکس وہ یعنی جناح صاحب ہندوستان میں ایک اقلیت کی رہنمائی کر رہے ہیں جن کو تحفظات کی ضرورت ہے دوسری بات میں نے یہ بھی کہہ کر چھڑے تھے کہ یہ نہایت کر دیا ہے کہ بنیادی مسئلہ مختلف مذاہب کی ہمارا نہیں ہے بلکہ سماج میں مختلف طبقوں کی اقتصادی نابرابری ہے۔ ایک طرف استحصال کرنے والے ہیں اور دوسری طرف وہ جن کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہماری لڑائی شخصیات سے نہیں بلکہ ایک نظام سے ہے اس میں ہندو اور مسلمان کی تفریق نہ کرنا کوئی اندیشہ ہوگی۔ جن اصلاحات کا ہم کشمیر میں مطالبہ کر رہے ہیں ان سے سب مذاہب کے پیروں مستفید ہوں گے۔ اس لیے یہ مقصد ایک مشترکہ جدوجہد سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ مسلم اقلیت کے ایک عظیم رہنما کی حیثیت سے تمہارا ان کا فرض ہے کہ وہ اقلیت کے حقوق کی پوری نگہداشت کریں وہاں ان کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جو علاج وہ ان کے لیے تجویز کر رہے ہیں کہ جن وہ انہیں کے حق میں سم قائل نہ بن جائے۔ اور مذہب کے نام پر ایک علیحدہ ہوم لینڈ کے لیے جدوجہد بالآخر کہیں ان کے لیے مفید نہ ہونے کی بجائے مضرت ثابت نہ ہو۔ تازہ کا سنجی ہے کہ صرف اکلوتا مذہب ہی بنیاد ر ملکوں کی سنگ بنیاد نہیں بن سکتا اس کے لیے اور غلط فکر اکثر شک لاپدی ہے۔ مثلاً زبان، طرز معاشرت، جغرافیائی محل وقوع کی مناسبت اور GEOGRAPHICAL CONTIGUITY اگر صرف مذہب کی بنیاد پر ہندوستان میں ملکوں کی بنیاد ڈالنا قبول کیا جائے تو ہندوستان کے مذاہب کی اکثریت واقعی ہے کہ ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا میں نے جناح صاحب سے کہا کہ ملکیت کبھی مذہب کے نام پر راستہ قتل حاصل نہیں کر سکتی ہیں

نے پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کی مثالیں دے کر ان کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ اگر مذہب ملکوں کے استقلال کا بنیادی پتھر ہوتا تو دنیا کی سب سے طاقتور صیانتی سلطنتیں آپس میں دنیا کی سب سے خون ریز جنگیں نہ لڑتیں۔ اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو اس کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اور یہ جنگ مذہبی جنگوں کا کھانا بن کر تباہ ہو جائے گا۔ میں نے جناح صاحب کی خدمت میں عرض کی کہ پاکستان کا جو نقشہ آپ نے دہن میں ہے اس کے مطابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حاصل رہے گا۔ اور مذہب کے علاوہ ان میں اور کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ اس لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کا جوڑ زیادہ دیر قائم رہنے کی امید نہیں ہے۔ باقی رہا مغربی پاکستان تو اس میں بھی کئی قومیں بست ہیں، پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ ان میں بھی چیخ و پکار ہوئے کا امکان نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ایک اور خطروہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کم از کم تین حصوں میں بٹ جائے گی۔ اور اس کی آوازی کا تاثر گہرے ہو کر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں دو بڑی قوموں کے درمیان منافرت کی تخلیق وسیع ہوگی جس کا فائدہ ہندوستان کے مشترکہ دشمن جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ جناح صاحب کچھ بے تابی سے میری باتیں سنتے رہے ان کے چہرے کے آثار چہاڑ سے لگتا تھا کہ وہ ان باتوں سے خوش نہیں ہوئے لیکن حق یہ ہے کہ انھوں نے کمالی صبر سے میری ساری گفتگو سنی اور آخر ایک مردِ بزرگ کی طرح فہمائش کے انداز میں کہنے لگے۔

”میں آپ کے باپ کے مانند نہیں اور میں نے سیاست میں اپنے بالی سفید کیے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہندو پر امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کسی آپ کے دوست نہیں بن سکتے۔ میں نے زندگی بھر ان کو اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ وقت آئے گا جب آپ کو

میری بات یاد آئے گی اور آپ افسوس کریں گے۔“

جناح صاحب نے مزید کہا کہ ”آپ ایک ایسی قوم پر کیسے اعتبار کر سکتے ہیں جو آپ کے ہاتھوں سے اپنی دنیا تک پاپ سمیٹ رہی ہے۔ ان کے سامان میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں وہ آپ کو ملے گا سمجھتے ہیں۔“ انھوں نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا کہ ”ایک بار ممبئی میں میں اپنی بیوی کے ساتھ میز پر دو چہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ لوگ ایک مٹلا قاتی کا کارڈ ڈاندر لایا۔ یہ مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی کا تھا۔ میں کھانے کی میز سے اٹھ کر گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ جب وہ میز پر بیٹھ تو میں نے انھیں کھانے میں شمولیت کی دعوت دی۔ مالوی جی نے یہ کہہ کر انکار کیا ”آپ جلتے ہیں کہ میں مذہبی وجوہ کی بنا پر آپ کے ساتھ ایک میز پر کھانا نہیں کھا سکتا۔“ جناح صاحب بولے کہ میں نے جواب دیا کہ آپ ساتھ ہی دوسری میز لگا کر کچھ کھائیے مگر مالوی جی نے کہا یہ بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ نیچے مشترکہ قالین بچھی ہوئی ہے۔ اور اس کے ذریعے چھوٹ آ سکتی ہے۔ جناح صاحب نے کہا کہ اس پر میں نے قالین ہٹوا دیا اور مالوی جی کی خدمت میں بیٹھے اور دو دو چہرے کھائے۔ جناح صاحب نے اس واقعہ کو کافی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا۔ اور مجھ سے سوال کیا کہ جس قوم کے بزرگ زیادہ لیڈروں کا یہ حال ہو وہ آپ کو کیسے جینے دیں گے۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہندو سامان میں چھوٹ چھات کا روگ موجود ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں لیکن پڑھے لکھے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اس طغیانی سے تنگ ہے اور اس کا علاج کرنا چاہتی ہے۔ خود ہمارا تانا بانڈھی ہر جہن سندرھار اور دوسرے اصلاحی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور بڑی جہت اور حوصلے کے ساتھ اس بیماری کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لیے تمام باشعور اور سمجھ دار ہندوستانیوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت اس بیماری کو دور کرنے کی کوشش میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔ انسان کمبختی ہی ٹپک بیتیاری

کا کار کیا کیوں نہ ہو لیکن ڈاکٹر اسے زہر دیتا ہے اور نہ اس کا گھلا گھونٹتا ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ تعلقی توڑ دیتا ہے بلکہ پیار اور محبت کے ساتھ اس کے علاج و معالجے میں ہنک رہتا ہے میں نے ہنسی ہنسی میں جناح صاحب سے یہ بھی کہا کہ اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ آپ ایک بلند پایہ وکیل ہیں۔ لیکن آپ کا کہیں ہے کمزور۔ جناح صاحب خفیت سے تبسم کے بعد خاموش ہو گئے۔

اس کے بعد گنگو کا رخ کشمیر کی طرف مڑا۔ میں نے کہا کہ کشمیر کے لوگوں کو اپنی تحریک مذہبی بنیادوں پر چلائی چاہئے یا قومی بنیادوں پر اس کا فیصلہ تو صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے ۱۹۳۷ء سے اس کی آبیاری کی ہو۔ اور تحریک کے معاملے میں کسی قسم کی تلابالہ کے شکار نہ ہوتے ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ایسے لوگ چاہے مسلم کانفرنس میں ہوں یا نیشنل کانفرنس میں۔ مسلمان ان ہی سے مل کر والدینا چاہئے۔ ایسے رہنماؤں کی فہرست بے شک چودھری غلام عباس وقت مسلم کانفرنس کے ساتھ تھے ائمہ شریک کریں۔ جب یہ فہرست تیار ہو تو آپ دو جناح صاحب، اخوند کشمیر، اگر یہ سوال ایسے رہنماؤں کے سامنے پیش کریں اور ان کی رائے طلب فرمائیں۔ مجھے بھی موقع دیا جائے کہ میں بھی اپنا نقطہ نظر ان صاحبان کے سامنے رکھوں۔ اس کے بعد فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر ان کی اکثریت فیصلہ آپ کے حق میں کرتی ہے تو نیشنل کانفرنس کو توڑ دیا جائے گا۔ اور ہم سب مسلم کانفرنس میں شامل ہو جائیں گے۔ جس کی قیادت بلاشبہ چودھری غلام عباس سنبھالیں۔ لیکن اگر فیصلہ اس کے برعکس ہوا تو چودھری غلام عباس مسلم کانفرنس کو توڑ کر اپنے رفقاء و سمیت نیشنل کانفرنس میں آجائیں جس کی قیادت میں بدستور کرتا رہوں گا۔ جناح صاحب نے سوال کیا کہ اگر فیصلہ مسلم کانفرنس کے حق میں ہوا تو آپ قیادت سے گریز کیوں کریں گے؟ میں نے جواب دیا کہ قیادت وہی کر سکتا ہے جس کا اقتدار اس نظر سے پرچو جس پر جماعت چلائی جا رہی ہے۔ اس لیے میں پر دو تین

لکھا ہوں لیکن قیادت کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ جناح صاحب نے یہ تجویز پسند کی۔ اور کہا کہ اگر جماعت نے میرے ہی نظریے کو قبول کیا تو وہ آسے ملت کا فیصلہ سمجھیں گے۔ اور مسلم کانفرنس کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی جماعت کو توڑ کر آپ کی جماعت میں شامل ہو جائیں۔ یہ بات طے ہو جانے کے بعد ہم نے ان کے کشمیر آنے کی تاریخ طے کی۔ اس ساری گفتگو میں بخشی غلام محمد بھی موجود تھے۔ لیکن وہ چپ چاپ ہمارے مکالمے کو سن رہے تھے۔ انہوں نے گنگو کے دوران اپنی منتظر شاید ایک بار بھی نہیں کھولی۔

مئی ۱۹۴۷ء میں جناح صاحب جنوں کے راستے سرنگر تشریف لائے۔ لیکن ان کی آمد سے پہلے ہی مشرق غنڈھڑی اور دوسرے مسلم لیگی لیڈر کشمیر آکر ان کے دورے کے لیے حالات ہموار کرنے کے لیے سیال پور پہنچ چکے تھے۔ میں نے بخشی غلام محمد کو ان کی آگاہی کے لیے بھیجا تھا۔ جنوں سے ان کے ساتھ چودھری غلام عباس اور کچھ اور ساتھی بھی ہوئے۔ مولوی یوسف شاہ اور ان کے ہمراہیوں نے قاضی گنڈہ جاکر ان کا استقبال کیا۔ اس وقت مولوی یوسف شاہ کی جماعت اور نیشنل کانفرنس میں کافی کچھ موجود تھا۔ اس لیے راستے میں وہ نیشنل کانفرنس کا رکتوں سے شکر رائے۔ جناح صاحب نے دوپہر کا کھانا کھنڈی کے ڈاک بیگلے میں کھایا تو میرے واعظ صاحب وغیرہ وہاں بھی رونائے کر بیٹھے۔ خیر جناح صاحب سرنگر میں وارد ہوئے تو نیشنل کانفرنس نے ان کا شاہانہ استقبال کیا اور اس میں ہندو مسلم بھی شامل تھے۔ پرتاپ پارک میں ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا۔ ایک جے ایمے پنڈل پر ماڈ آویزاں رکھے گئے تھے۔ جن پر قومی نعرے اور اقبال کے اشعار مثلاً ”مذہب نہیں سیکھا تا آپس میں ہیر رکھنا“ جناح صاحب زندہ باد شیر کشمیر زندہ باد وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ جناح صاحب شیخ پریم سے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ میں نے خیر مقدم کے کچھ الفاظ کہے۔ اور اس کے بعد پنڈت جیالال کلم نے انگریزی میں خطبے

استقبالہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں جناح صاحب نے اعتراض کیا کہ ان کا جو استقبال کیا گیا اس پر ایک بادشاہ بھی فخر کر سکتا ہے۔ وہ اپنے مطلب کی بات سے کہاں چوکنے والے تھے۔ تقریریں ہی کیا کہ ان کے خیال میں ان کا استقبال صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس لیے یہ لیگ کے اصولوں کے متین استقبال ہے۔ چنانچہ اس بات پر خفا ہو کر چندتہ جلال کلم اور چند کواہ اندیش سناحتی شیخ سے اٹھ کر چلے گئے۔ سکاروالی کے خانے پر وہ درجن کی طرف چلے جہاں مولوی یوسف شاہ کے کامیوں نے استقبال کی ایک دفعلی منظم کی تھی۔ لیکن وہ استقبال انہی سناحتی۔ اس لیے افراتفری کے درمیان ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جناح صاحب نشاطا کی طرف گئے۔ جہاں مسٹر اسجد علی کے پرائیویٹ مکان میں ان کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ان کے دوران قیام ان سے مختلف خیالات کے لوگ ملتے رہے، میں نے بھی ان سے کئی ملاقاتیں کیں جب میں نے وہلی کی گفتگو کی سلسلہ ختم ہوتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ چودھری غلام عباس کو حسب اقرار رہنماؤں کی فہرست تیار کرنے کے لیے کہیں تو وہ اس اقرار سے پہلو بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ اصل بات یہ تھی کہ چودھری غلام عباس نے فہرست تیار کر لی تھی اور اس میں مولوی یوسف شاہ صاحب کے نام پر قسط لگا کر جناح صاحب سے کہا تھا کہ باقی سب رہنماؤں صاحب کے ساتھ ہیں۔ جناح صاحب نے یہ صورت دیکھی تو وہلی کے قول و قرار سے پہلو بچانے میں ہی عاقبت سمجھی۔ انھوں نے البتہ یہ کہا کہ میں چودھری غلام عباس کے ساتھ مل بیٹھ کر باہمی مشاورت سے مسئلہ کو سمجھانے کی تدبیر کروں۔ میں نے یہ کہا کہ ایسا کرنے سے باز نہ کر دیا کہ ایک تو اس سے اقرار کی خلاف ورزی ہوگی۔ دوسری وجہ میرے انکار کی یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کو رعائے ابتدا سے ہی تحریک کشمیر میں قربانیاں دی ہیں اور تکالیف کا سامنا کیا ہے لہذا کسی اہم فیصلے میں ان کی رائے ضرور پوچھی

جانی چاہیے۔ وہ ورثہ کی نہیں کہ جہاں چاہا ان کا نشان لگا دیا اور ایسا کرنا تو چھوڑی طرز عمل کا منہ چڑھانے کے برابر ہو گا۔ جناح صاحب میری بات کو مثال گئے اور اس طرح بات آئی لگی ہوئی۔ میں نے جناح صاحب سے یہ بھی کہا کہ آپ کو بار کے پار مسلمان ہند کے مسئلہ پڑ رہی ہیں۔ لیکن آپ کو بار کے اس پار مہاراجا کی جھوٹی کرتے رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ فی الحال ہم کو ہمارے حال پر چھوڑیں اور مقامی سیاست سے لاقبلی رہیں۔ جناح صاحب خاموش رہے۔ بعد میں قواب زادہ لیاقت علی خاں کشمیر آئے جو مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری اور جناح صاحب کے خصوصی متحدہ میسرے اطلاع کے مطابق انھوں نے بھی جناح صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مقامی تنازعوں میں مداخلت سے اجتناب کریں لیکن جناح صاحب کی طبیعت کہاں مانتے والی تھی۔ اب آثار و قرائن سے صاف نظر آ رہا تھا کہ جناح صاحب توازن قائم نہیں رکھ سکے ہیں۔ اور وہ واضح طور مسلم کانفرنس کی پشت پناہی کر کے ہم سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں کچھ دنوں میں ان کی یہ روش اور زیادہ نمایاں ہو گئی اور وہ نیشنل کانفرنس کے خلاف میدان تیار کرنے میں اپنی وکیلانہ صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔ مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے لیے اس سے قبل پونچھ کے مقام کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن جناح صاحب کی موجودگی کا فائدہ اٹھانے کے لیے اسے پونچھ کی بجائے جاس مسجد رنگر میں کمانے کا اعلان کیا گیا۔ نیشنل کانفرنس کے بہت سارے کارکنوں نے مجھ سے اجازت چاہی کہ وہ اس اجلاس میں جناح صاحب سے برسر عام کچھ چیتے جوئے سوالات کا جواب طلب کریں گے۔ میں نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اجلاس میں ضرور شمولیت کریں اور صبر و سکون کے ساتھ ان کے خیالات کو سنیں لیکن ہر حال میں شور و شر سے اجتناب کریں۔ کیونکہ جناح صاحب مسلمان ہند کی ایک بلند پایہ شخصیت ہیں اور ان کا ہم پر احترام واجب ہے۔ باقی اگر وہ

کچھ سوالات اٹھاتے ہیں تو میں ان کا جواب دوسرے دن جلسے میں دوں گا۔ پھر یہاں کے عوام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ حسب پروگرام مسلم کانفرنس کا اجتماع جامع مسجد کے صحن میں ہوا۔ میں پچیس ہزار لوگوں نے اس میں شمولیت کی جتنا سمجھا نے اپنی تقریر میں مسلمانان کشمیر کا مسلم کانفرنس کا ساتھ دینے کی دعوت دی۔ انھوں نے نیشنل کانفرنس پر بھی کس کس کے تیرا اندازی کی اور کہا کہ نیشنل کانفرنس یہاں کی ہندو اقلیت کو اسی طرح دھوکا دینا چاہتا ہے جس طرح ہندوستان میں کانگریس مسلم اقلیت کو فریب دینا چاہتی ہے۔ شیخ صاحب کہتے ہیں کہ ہم جن حالات کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کا پچاسی فیصدی فائدہ مسلمانوں کو ملے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دھوکے بے جناح صاحب کی منطق کی کاٹ دو دھاری تھی اور وہ ایک تیرے دوش کا رکھیل رہے تھے۔ مسلمانوں کو بغیرہ برطانوی ہند کے حالات یاد دلا کر ہم سے بدظن کر رہے تھے لیکن دوسری طرف اکثریت اور اقلیت کا نقش کھڑا کر کے وہ غیر مسلموں کو بھی ہم سے بدظن کرنا چاہتے تھے۔

کمال یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے اس مشورے کی دھجیاں بھی اڑا رہے تھے جو انھوں نے ۱۹۲۵ء میں پتھر مسجد کے جلسے میں ہمیں دیا تھا۔ جلسہ بغیر کسی ناخوشگوار واقعے کے ختم ہو گیا۔ دوسرے دن قزاق بازار میں میں نے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے جناح صاحب کی تقریر کا جواب دیا میں نے مسلمانوں کے لیے پاکستان کی افادیت کو دلائل کے ذریعے نقاب کیا۔ شہر میں کافی جوش و خروش پھیل گیا۔ اور اس قسم کے کچھ اور جلسے ہوئے۔ جناح صاحب کو ان جلسوں کی اطلاع ملی تو وہ کچھ گھبرائے مگر وہ ایک مقبول نعرے کی علمبرداری پر مسلم عوام کے قائد تو بن گئے تھے لیکن عوام کی سطح پر افسوس کا م کرنے اور ان کا سامنا کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ لہذا وہ عوامی سمندر میں جوار بجائے سے سہم گئے۔ اور حکومت کے مہمان بن کر لال منڈی کے نزدیک ایک

باؤس بوٹ میں فروکش ہو گئے۔ سر پی۔ این۔ راجو وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے احتیاطی طور پر دفعہ ۱۴۱ نافذ کرانی اور مجھے جلسوں سے غلامی میں لگی۔ چودھری نظام عباس کے چھوٹے بھائی چودھری نر سیر بارہ دھول میں بحیثیت اسسٹنٹ انڈسٹریل نجات تھے۔ عباس صاحب ان کے پاس ٹھہرنے کے لیے گئے تھے۔ اور وہاں انھوں نے خفیہ طور پر یہ پروگرام طے کیا تھا کہ جناح صاحب کو واپس ہندوستان لوٹنے سے پہلے وہاں ایک استقبالیہ دین گئے۔ ڈیڑھ مہینے سرنگم میں گزارنے کے بعد جب وہ راولپنڈی کی طرف روانہ ہوئے تو بارہ بھولہ میں ان کے لیے ایک استقبالیہ جلسے کا پروگرام مسلم کانفرنس نے طے کیا تھا۔ جناح صاحب بارہ بھولہ کے ایک مقامی پارک میں عوام سے خطاب کرنے لگے تو پہلے ایک نوجوان اور جوشیلے کارکن محمد مصدق شیر وانی نے شیر کشمیر زندہ باد اور نیشنل کانفرنس زندہ باد کے نعرے لگائے۔ جناح صاحب یہ صورت حال دیکھ کر گھبرائے۔ پولیس کی حفاظت میں اپنی کار تک چلے آئے اور سیدھے راولپنڈی کا رخ اختیار کیا۔ یہ سب معاملات چودھری صاحب نے ایک ماز کی طرح چھپائے تھے۔ لہذا ہمیں ان کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ہی علم ہوا۔ کشمیر میں جناح صاحب مولوی یوسف شاہ پر بھی برسے تھے۔ چنانچہ اس کا ماجرا چودھری نظام عباس نے اپنی سرگزشت کشمکش میں یوں بیان کیا ہے: ”آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ سیاسیات سے کنارہ کش رہیں۔ آپ کی حیثیت مذہبی ہے اور ہم آپ کی اس طرح عزت کرنے کو تیار ہیں۔ جس طرح انگریز اکثر بری کے بڑے پادری کی کرتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ کسی کی طرح سیاست سے کنارہ کش نہیں۔“ جناح صاحب نے یہ بھی کہا کہ ہمیں کشمیر میں ایک مٹل کی نہیں بلکہ لیڈر کی ضرورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جناح صاحب اپنے سوا کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے۔ اور اسی لیے کہتے تھے کہ میں نے پاکستان ایک نائپ مشین اور ایک سٹیون کی معد سے بنایا ہے۔ شاید

آن کے اس آدم بیزار رویے کا نتیجہ تھا کہ بقول غالبؔ
 بوئے گل، نالہ و دل دوہ چراغِ محفل
 جو تیری بزم سے لنگھ سو پریشان لنگھا

جن دنوں جناح صاحب کشمیر میں موجود تھے۔ صوبہ سرحد کے ایک کانگریس رہنما
 خان عبدالقیوم خان صاحب بھی ان دنوں سرنگر آئے ہوئے تھے۔ تھے تو وہ کشمیری نژاد
 لیکن بڑے عرصے سے صوبہ سرحد میں بس گئے تھے۔ یہی شرط تھی اور وکالت کا پیشہ
 اختیار کیا ہوا تھا۔ خان عبدالغفار خان صاحب کی شریعت پوش تحریک میں شامل تھے۔
 ان دنوں صوبہ سرحد میں سیاسی فضا بہت گرم تھی۔ اس لیے گرفتاری سے بچنے کے لیے
 انھوں نے سرنگر کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضاؤں کا رخ اختیار کیا تھا۔ پٹن میں وہ گام کے
 نزدیک اپنی آبائی زمین پر ایک مکان تعمیر کیا تھا اور سرنگر میں وکالت بھی شروع
 کر دی تھی۔ ہم ان کو ایک قوم پرست رہنما کے طور پر جانتے تھے۔ لیکن جن کا معلوم
 تھا کہ انھوں نے اندرونی طور پر مسلم لیگ سے ساز باز کر رکھی تھی اور وہ ایک مایوسی
 کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالباً وہ آئندہ رہنا ہونے والے واقعات کا اندازہ کر کے پیش
 بینی اور پیش بندی سے کام لینا چاہتے تھے۔ اس لیے اپنے خدمت کشمیر میں جانے کے لیے
 ہاتھ پر مار رہے تھے۔ میں نے کئی بار جناح صاحب کو جن کے پاس وہ اکثر آتے
 جاتے رہتے تھے۔ ان کے ذریعہ یہ پیغام بھیجے کہ میرے دل میں ان کے لیے بے حد عزت
 اور احترام موجود ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی تلخی پیدا
 ہو۔ پاکستان کا مسئلہ ان کے فرمودات کے مطابق برطانوی ہند کا مسئلہ ہے۔ ریاستوں کا
 نہیں۔ انھوں نے خود تسلیم کانفرنس والوں کو چاہیبت کی تھی کہ وہ مہاراجا کو کسی صورت میں
 ندامت نہ کریں۔ بلکہ انھوں نے مسلم کانفرنس کو اپنے مغربی طریق خیال میں بتایا کہ غور و اندیشہ

جس طرح وہ پانچ وقت حمزا پابندی سے ادا کرتے ہیں اسی طرح انھیں مہاراجا زندہ باد کا نعرہ
 لگانے کی عادت بھی ڈالنی چاہیے چنانچہ ان حالات میں ان کے اور ہمارے درمیان ٹکراؤ کا
 سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب پاکستان وجود میں آتا ہے اس وقت ریاست کشمیر کے لیے
 یہ سوال پیدا ہو گا کہ وہ کیا راستہ اختیار کرے۔ جب تک مسلم لیگ کے زعماء کو نیشنل کانفرنس
 کے رہنماؤں کے ساتھ تعلقات بدھلنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی چاہے مسلم لیگ
 کے زعماء ہم سے ہمیشہ بے تعلق رہے۔ اس کے برعکس کانگریسی رہنماؤں نے
 ہمارا ساتھ دیا اور تحریک کی آبیاری کی۔ قیوم صاحب نے ان خیالات کو مختصر
 جناح صاحب تک پہنچایا۔ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا لیکن ان کو پیش بینی اور پیش بندی کے
 جو عقیدات عطا ہوئے تھے ان کے پیش نظر ایسا گناہ ہے کہ وہ ایک خیالی رقیب کو میدان
 میں ڈٹے دیکھنا اپنے مفاد کے منافی تصور کرتے تھے۔ جو در ۱۹۴۷ء میں قیوم خان نے ادا
 کیا اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں کشمیر پر کافی دیر سے لگی ہوئی تھیں۔ ۱۹۴۷ء
 میں میں پاکستان کے دوسرے پر گیا تو اس کی تائید مارشل ایوب صاحب خان نے یہ کہہ کر دی کہ۔
 ”قیوم خان تو کشمیر کا جاگیر دار رہنا چاہتا تھا۔ تھی اس نے قائد اعظم کو غلط راستے پر ڈال دیا۔“
 قیوم خان کے متعلق سرخ پوش رہنما خان عبدالغفار خان بھی کسی غلط فہمی میں نہ تھے۔ وہ ہمیشہ
 انھیں شک کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اگر ان کو کانگریس میں برداشت کیا جاتا تھا
 تو محض خان عبدالغفار خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی وجہ سے۔ پورٹھان خان
 کا خیال تھا کہ قیوم خان خود غرض ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوئی پینتڑا بننے سے
 ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ گا۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے ایسا ہی ثابت کر دیا اور یہ بات
 بھی ظاہر ہو گئی کہ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں جناح صاحب کو ہمارے خلاف کافی پٹی چھائی
 تھی۔ اور یہی چڑی باتوں سے انھیں غلط فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

میساکہ اوہا اشارہ ہو چکا ہے اپنے قیام کشمیر کے دوران مختلف خیالات کے

لوگ جناح صاحب سے ملنے کے لیے جاتے رہے، بعض لوگوں نے جب ان سے مولوی یوسف شاہ کے متعلق رائے پوچھی تو انھوں نے انگریزی زبان میں جواب دیا کہ HE IS A ROTTEN EGG (گندہ انڈہ ہے)۔ بہارے ایک رضا کار علی محمد طارق جو ملے بلانے کے بارے میں بڑے تیز و طراز واقع ہوئے تھے جب ان سے ملے تو انھوں نے جناح صاحب سے پوچھا کہ کیا کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کثیر کے لوگ ہی کریں گے، اس پر جناح صاحب نے انگریزی میں فقرہ "LET THE PEOPLE GO" کہا۔

طارق صاحب بھی کہاں بچلے بیٹھے وہ اپنے تھے انھوں نے اس فقرے کی پانی پی پی کر تشہیر کی جس سے عوام میں جناح صاحب کے متعلق کافی ناراضگی پھیل گئی۔ جناح صاحب کے تعلق سے مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جب میں جناح صاحب سے ملنے کے لیے دہلی گیا تو انہی دنوں سید قاسم رضوی سے جو حیدر آباد میں رضا کار تحریک کے سربراہ تھے، میری مدد بھیج رہا تھا وہاں کے ایک ہوش میں ہوتا۔ وہ ایک متاثر کن شخصیت قرار دیتے تھے لیکن میں نے انھیں بڑی جذباتی طبیعت کا آدمی پایا۔ میں نے انھیں یہ ذہن نشین کرانے کی بڑی کوشش کی کہ انھیں جذبات کی بجائے حقائق کا سامنا کرنا چاہیے کیونکہ ہندوستان ایک نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اور معمولی سی غلطی بھی بڑے خسارے کا باعث بن سکتی ہے لیکن وہ جذباتیت میں اس قدر اُلجھ چکے تھے کہ میرا کہا سننا ان کے اوپر سے برسات کے پانی کی طرح بہہ گیا۔ دراصل ان دنوں ہندوستانی مسلمان ایک اوصافی تشنج کے شکار ہو چکے تھے۔ ان پر فتنہ کرنے کی بجائے ان سے ہمدری کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن واقعات کے تیز سلسلے میں اس کی فرصت کس کو تھی؟ مجھے سٹیٹس پیو پلز کانفرنس کے دوران ایک دفعہ حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مولانا ترمذی سٹیٹس پیو پلز کانفرنس کے ایک سرکردہ میزبان تھے۔ اور میں انہی کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ان دنوں میں وہاں رضا کار

تحریک کا کافی غلغلہ تھا میں نے وہاں کے چند معززین کو آنے والے حالات سے مطلع کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ حیدر آباد کی ہندو اکثریت سے سمجھوتہ کر کے اس وقت مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند شرائط حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو بعد میں آنے والا جمہوریت کا طوفان ان کو تنگیوں کی طرح بہائے جائے گا۔ لیکن وہاں نظام شاہی کے اقتدار کے متعلق انھیں غلط فہمی تھی کہ یہ دراصل ان کا اقتدار ہے اور دائمی ثابت ہوگا۔ اس کا فائدہ انھیں مسئلہ کے بعد میں بری طرح سے ٹھٹھکانا پڑا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور واقعہ میرے پردہ ذہن پر تازہ ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ سٹیٹس پیو پلز کانفرنس کے سلسلے میں میرا جڑو وہ جانے کا اتفاق ہوا۔ سٹیٹس پرچوں ہی پہنچا تو وہاں کے کچھ مسلمانوں نے کالی جھنڈیوں سے منظر پارہ کیا اور مجھے کچھ دیر تک کار میں سوار نہیں مجھے دیا۔ تاکہ جو کچھ ان آپ سناپ وہ میرے خلاف کہنا چاہتے تھے میں اس کو سن سکوں۔ میرے استقبال کے لیے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ وہ یہ ماجرا دیکھ کر سٹپٹا گئے اور خاموشی سے مسلم لگیوں کا یہ تماشا دیکھتے رہے۔ مسلم لگی اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو میں کار میں سوار ہونے لگا۔ انھوں نے سارے کالے جھنڈے میری کار میں پیچیک دینے۔ شام کو چوک میں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں میں نے بڑودہ کے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ وہ جس راستے پر جا رہے ہیں وہ سلامتی اور عافیت کا راستہ نہیں ہے کیونکہ ان کا علاقہ ہندوستان میں ہے اور اگر پاکستان وجود میں بھی آئے جب بھی وہ ہندوستان کا حصہ بنے رہیں گے۔ اگر وہ پاکستان جانا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ دوسرے وہ اپنی املاک، عبادت گاہیں، قبرستان کس طرح کندھے پر ہٹا کر لے جا سکتے ہیں۔ اس لیے انھیں ہندو مہا بیوں کے ساتھ خوشگوار

تعلقات قائم کرنے چاہئیں اور اس زمین کے ساتھ ہم رنگ بننا چاہتے ہیں وہ رہتے ہیں اس پر ایک صاحب جگہ گاہ سے بولے کہ اگر یہاں ہمارے دو مارے جائیں گے تو پاکستان میں ان کے دشمن کا گلا کاٹا جائے گا۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ اس جواب میں جذبات کے سوا کچھ نہیں کیونکہ کوئی ملک اپنے آپ کو دوسرے کی خاطر آگ کی نذر نہیں کرے گا اور نہ آپ کو بچانے کے لیے فوج کشی پر آمے گا۔ جناح صاحب کے متعلق میرے دل میں کوئی ناسانگی نہیں تھی بلکہ میں ان کا پیور بھی احترام کرتا تھا۔ چنانچہ دس کی گواہی میری وہ تقریر دہی ہے جو میں نے قبائلی حملے کے بعد اس وقت کی جب میں نے سو اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ناظم اعلیٰ کا منصب سنبھالا۔ سرکاری افسروں کی پہلی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ پاکستان ہمارا دشمن نہیں ہے اور جناح صاحب کے لیے ہمارے دلوں میں وہی احترام ہے جو پہلے تھا۔ ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر کا جھگڑا بات چیت سے نکلے جو اور اگر اس غرض کے لیے مجھے جناح صاحب سے ملنے کے لیے کراچی بھی جانا پڑے تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ لیکن جناح صاحب اس وقت طاقت کے نشے میں غور تھے۔ انھوں نے ایک بے سلاح و سامان قوم سے بات چیت کرنے کو اپنی شان کے شایان نہیں سمجھا۔ لیکن طاقت کی یہ مساوات جب ان کے خلاف ہو گئی تو وہ جڑ بکھر کر چوٹ اٹھے مگر اس وقت سانپ کی طرح لگا تھا اور صرف نگیر باقی رہ گئی تھی۔ بہر حال بات جناح صاحب کے دورہ کشمیر کی ہو رہی تھی وہ کشمیر سے چلے گئے اور ایک تلخ اور کڑوے انسان کی طرح چلے گئے۔ اس کے بعد جو تقدیر ساز واقعات پیش آنے والے تھے ان میں جناح صاحب کے مزاج کی اس کڑواہٹ کا بڑا اثر بدست چھہ تھا۔ انھوں نے کبھی کسی مٹر کے نہیں دیکھا اور نیشیل کانفرنس اور اس کے زعماء کے خلاف دل میں رجحان برقرار رکھی اس کے جو خطرناک اور ایسا نکاح نتائج برآمد ہوئے ان

کا علم تاریخ کے ہر طالب علم کو ہے۔ جناح صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنی عمر کے آخری دن انھوں نے بڑی کشمکش اور بے نزاری میں گزارے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ذہن میں اس وقت کشمیر ایک کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا اور اس کھٹک کی بنیاد ان کے دلوں و سوتوں نے سڑک کے وسط میں ان کے قیام سرنگر میں ڈال دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے آخری لمحوں میں اس کانٹے کی غلش انھیں ضرور بے قرار کر رہی ہوگی۔ کشمیر کی کشمچی کے بہت سے بچے و خیم جناح صاحب مرحوم کی بے لچک طبیعت اور ان کی غیر جمہوری افتادہ طبع سے جڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ذاتی طور پر وہ ایک بڑی صاف ستھری شخصیت کے مالک تھے اور ان کے کردار کی صلاحیت و دیانت INTEGRITY کو ان کے دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ تاریخ ان کی سیاسی بصیرت کے بارے میں بہر حال آخری منصف ہے۔ خدا نے بزرگ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ج

نے کوہ کنے ماند و نہ مجنوں صفیے

▲▲▲

ہزار دام سے نکلے ہیں...

گو پالاسوامی آئیٹنگ کے چلے جانے کے بعد بی۔ این۔ راؤ آئے تو ضامن عوامی تحریک کا غلطہ تھا۔ ہمارا جاہری سنگٹھ آنے والے طوفان کا اندازہ تو کرتے تھے لیکن وہ ایک ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح تنگ کے سہارے حیرت سے تے نامید نہیں ہوئے تھے۔ عوامی تحریک کی دھار کو کند کرنے کے لیے انھوں نے دو عمل (DIARCHY) کے ہتھیار کو آزمائے کی نشان دہی یعنی انھوں نے اپنی کامیابی میں دو عوامی وزیروں کو شامل کرنے کا اعلان کیا۔ دراصل یہ خیال سرجیٹ بہادر سپرہو کے ذہن کی ایجاد تھا۔ سرجیٹ کشمیری اس اصل تھے اور ان کا سپرہو کی اسی شاخ سے تعلق تھا جس شاخ سے علامہ اقبال نسبت رکھتے تھے۔ سرجیٹ فخرسی اور اردو کے ایک جیتہ عالم تھے۔ اور اردو کو اس کے حقوق دلانے کی جدوجہد میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ آئینی ماہر اور فقہانوں دان تھے اور ان کی قانونی بصیرت کا سارے ملک میں ڈنک بج رہا تھا۔ وہ بہت سے وادیاں ریاست کو آئینی اور قانونی مشورے دیا کرتے تھے کشمیر دربار سے بھی ان کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ اور مہاراجا اکبر ان سے آئینی اور قانونی معاملات سے متعلق

پورا مشورہ لیں گے۔ ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
مجھے غرور ہوئے گھر سے شکر رنجے

رجوع کرنا رہتا تھا چنانچہ وزارت میں عوامی نمائندے شامل کرنے کا مشورہ انھوں نے ہی دیا اور مہاراجا نے ان کی صائب راستے کے وزن و وقار کے آگے سر تسلیم خم کر کے اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ ہمارے دوسرے در نظام حکومت کے مطالبے سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں تھا۔ لیکن ہم نے مہاراجا کی اس پیش کش کو آزمائے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ مہاراجا نے جو اسے وزیر گنگا رام کو اور کثیرتے پیش کش کاغذوں کے نمائندے مرزا محمد افضل بیگ کو کامیابی میں متقرر کیا۔ وزیر گنگا رام کو وزارت داخلہ اور تعلیم اور بیگ صاحب کو محکمہ تعلیمات کا قلمدان تفویض کیا گیا۔ اگرچہ بیگ صاحب پچھلے معنوں میں عوامی نمائندے تھے لیکن ان کے مطالبے میں وزیر گنگا رام جو ان سے کم بڑے تھے اور کم لیاقت کے مالک تھے کو زیادہ اہم قلمدان دیا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس اقدام کے پیچھے غلوں نیت نہیں بلکہ ڈیپٹی میسج کلر کی محنتی حکومت کے وزراء کو اس وقت تک ڈھائی ہزار روپے کا مابانہ مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ لیکن عوامی وزیروں کے لیے صرف سولہ سو روپے مابانہ مقرر کیے گئے۔ اس کے باوجود بیگ صاحب کام کرتے رہے۔ لیکن جب انھوں نے کچھ عوامی بہبود کے کاموں کی طرف توجہ مبذول کرنا تو حکومت نے رقومات کی کمی کا بہانہ کر دیا۔ کامیابی کے باجج میران میں ان کی آواز اُٹھنے لگی۔ بیگ صاحب کی موجودگی بالکل بے معنی بن گئی۔ بیگ صاحب اس صورت حال سے برابر بچھے اور جماعت کو مطلع کرتے رہے اور انھوں نے ایک مرتلے پر کہا۔ چونکہ وہ عوام کی بہبود کے کاموں میں کوئی توفیق امداد نہیں کر سکتے اور وہ جان چکی ہیں کہ عوام کی اقتدار میں شرکت کا یہ تجربہ محض دھوکا سلا ہے اس لیے ان کو استعفیٰ دینے کی اجازت دی جائے۔ جماعت نے اس مطالبے پر غور کیا اور وہ بھی اس نتیجے پر پہنچی کہ بیگ صاحب کو کامیابی سے قطع تعلیق کرنا چاہیے۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد ہی مارچ ۱۹۳۷ء میں بیگ صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ وزیر گنگا رام نام کو ہی عوامی وزیر بنے۔ لیکن وہ

سے مہاراجا کے حلقہ گوش تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کو بھی مستعفی ہونا پڑا۔

اُدھر حکومت ہماری پیٹ پیچھے ایک سازش کے تانے بانے تیار کر رہی تھی میاں احمد یار خان ہماری اسمبلی پارٹی کے لیڈر تھے۔ ان کی کوئی عوامی اساس نہ تھی۔ لیکن ہم نے ان کی تعلیم کے پیش نظر انہیں جڑا رہے دیا تھا۔ میں نے انہیں سرنگری ایک اسمبلی نشست سے منتخب کروایا۔ جبکہ ہمارے پاس مقامی لیڈروں کی ایک بڑی قطار موجود تھی مگر ظاہر تھا کہ ہم فراغ دل کا نظارہ کر کے ایک کشمیری زبان نہ بولنے والے کو اپنے سرنگریوں پر جگہ دے رہے تھے۔ احمد یار صاحب کشمیریوں سے بہت کم ارتباط رکھتے تھے بلکہ پہلے پہل تو وہ دواگرہ سمجھا کے میر تھے اور اپنے آپ کو احمد یار خان دواگرہ کہلاتے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ بیگ صاحب کو ہم نے ان کی قومی خدمات کے علاوہ ان کی ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے بھی کامینہ کے لیے چنا تھا۔ اس کے علاوہ احمد یار خان کے برعکس وہ ایک کشمیری بولنے والے شخص تھے اور کشمیر کی خاندانگی کے اہل اور مختار تھے۔ لیکن احمد یار خان کو یہ فیصلہ ایک آنکھ نہیں سمجھا۔ وہ اندری اندر لیاقت و وزارت سے ہم کنار مہرنے کے لیے کانٹوں کے بستری پر کمر میں پڑے رہے۔ جب ہم نے بیگ صاحب کو واپس بلا لیا۔ احمد یار خان نے آدھ دیکھا۔ تاؤ اس چوڑی ہوئی ہڈی کو تڑپ میں ڈال کر چپانے لگے اور پارٹی کو دغا دے کر وفادت میں شامل ہو گئے۔ احمد یار خان کو کچھ ہنسنے کا یہ مسخرکہ رام چندر لاک نے سرانجام دیا تھا۔ یہ پنڈت صاحب ایک لائبریرین کے مولوی عہدے پر مقرر تھے۔ مگر اچھی زمانہ سازی، نمک حلائی اور چالوسی کی بول بوت پر مہاراجا کے اندرونی اہل انوں میں گھس آئے تھے۔ پہلے یہ ریاست کے حقیقت سکریٹری بنے۔ پھر وزیرِ حضور اور آخر میں وزیرِ اعظم۔ جب وزیرِ اعظم بنے تو ہم نے اس لیے اس پر خوشنودی ظاہر کی کہ ایک کشمیری کو پہلی بار دواگرہ مہاراجوں نے اس منصب

کے لیے چنا ہے۔ لیکن کاک صاحب نے جلد ہی اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ کشمیریوں کو کھینچنے کے لیے بدترین ہتھکنڈوں پر آمرا کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے اور اسی لیے مہاراجا کی نظر انتخاب اُن پر ہی تھی۔ لیکن پھر ہٹنے کے بل تاریخ کے اندھے کنوئیں میں گر گئے اور اُن کا کوئی نام و نشان نہیں ملا۔ احمد یار کی قداری کے خلاف سارے کشمیر میں با اہار مچ گئی اور حکومت کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت ہی کشیدہ ہو گئے۔ بعد میں احمد یار خان کو وزارت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اور وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ جہاں وہ ایک حسرت ناک اور گم نام آدمی کی حیثیت سے رحلت کر گئے۔ ج۔

دیکھو اسے جو دیدہٴ عبیرت نگاہ ہو

اُدھر متقاعد کی ہم آہنگی ہمیں کشاں کشاں انڈین نیشنل کانگریس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ کانگریسی لیڈر جاسے ساتھ بڑی ہمدردی کر رہے تھے۔ اور بدلے میں بظاہر کچھ بھی نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ ہمارے ریاستی ہندو دوستوں میں سے بہتوں کو کانگریسی لیڈروں کا ہمارے ساتھ یہ اختلاف ایک آنکھ نہ سمجھا تھا۔ لیکن ان کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ ہمارے تعلقات جواہر لال نہرو اور دیگر کانگریسی رہنما کے ساتھ مدور روز بڑھتے جا رہے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کی قیادت ریاستوں کے معاملات میں براہِ راست دخل نہیں دینا چاہتی تھی۔ لیکن ریاستوں میں رہنے والے لوگوں کے ساتھ اس کی ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ان کے حالات کو بہتر بنانے کی دل سے خواہشمند تھی۔ جہاں مسلم لیگی لیڈر ذوقی محمد پر والیان ریاست کے نزدیک تھے اور عوامی لیڈروں کے ساتھ دعوت اور دھوکے پین سے پیش آتے تھے وہاں کانگریسی لیڈر حکمت علی کے طور پر ہی اسی یقینِ طور پر دعویٰ رہنماؤں کے زیادہ قریب تھے اور اپنے حسنِ اخلاق اور ملن ساری سے ان کا دل جیتنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے ریاستوں کی کشمیریوں کو سکھانے کے لیے ایک الگ جامعہ ملیش

یوہلز کانفرنس اپنی چھ چھایا میں قائم کی تھی جس کے روح رواں جواہر لال نہرو تھے۔ اگرچہ مسلم لیگ نے بھی دیکھا دیکھی آل انڈیا سٹینس مسلم لیگ قائم کی تھی لیکن نعل راجہ عقل وہ ہمیشہ فائیکوں تک ہی محدود رہی۔ کانگریس نے ریاستوں کے معاملے میں جو رویہ اپنا یا تھا اس سے ریاستی عوام متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی اپنی ریاستوں میں پر جاسٹروں کے نام سے جماعتیں قائم کی تھیں جو کسی نہ کسی رنگ میں عوام کو بیدار کرنے کی کوششوں میں لگی تھیں۔ یہ سب پرچہ پرامن آل انڈیا سٹینس یوہلز کانفرنس کی شاخیں بن گئے۔ نیشنل کانفرنس کو بھی اس جماعت میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ قدیمانہ کانفرنس میں نیشنل کانفرنس کے وفد کی شرکت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ میں چونکہ کھوہ جیل میں تھا۔ اس لیے میری شرکت تو ممکن نہ ہو سکی لیکن اس اجلاس میں بڑے زور و شور سے میری رہائی کا مطالبہ ہوا اور پٹنٹ جی نے یہ حیثیت صدر کانفرنس میرے اور تحریک کثیر کے حق میں ایک زوردار تقریر فرمائی۔ بعد میں آل انڈیا سٹینس یوہلز کانفرنس کے ساتھ ہمارے تعلقات اور بڑھتے گئے اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ اس کا یوہ میرے ہی کا مذہب پر ان پڑا۔ مجھے پہلے اس کانفرنس کا نائب صدر اور پھر صدر منتخب کر لیا گیا۔ جواہر لال نہرو کانگریس کے معاملات میں کافی معروضت رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ریاستوں کے معاملات میں مجھ پر ہی انحصار کرنا شروع کیا۔ میں نے ریاستوں کے کئی کئی دورے کئے اور ریاستوں کی تحریک آزادی کو شہرہ بزرگ بنانے کے لیے مجھے کافی توجہ اور تنگ و دوست کام لینا پڑا۔

اس سے قبل تری پورہ اور رام گٹھوں میں آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے اور میں خاص دعوت پر ہاں بلایا گیا۔ ہم نے ان اجلاسوں میں شرکت کی۔ تری پورہ کے اجلاس میں ہماری ملاقات نیتا جی سبھاش چندر بوس سے ہوئی۔ وہ بھی کثیر

کے معاملات سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور انھوں نے ہماری تحریک کے غیر فرقہ وارانہ رویہ کو کافی سراہا۔ ان اجلاسوں میں ہمارے تعلقات کانگریس اور کانگریسی لیڈروں کے ساتھ خاف اور جماعتی سطح پر اور استوار ہوئے اور ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آتے گئے۔

حکومت کارویہ بھی عجیب تھا۔ ہمارا جاہری سنگھ اپنے آپ کو کانگریسی لیڈروں کے قریب بتاتے تھے۔ لیکن جوں جوں کانگریس کے ساتھ ہمارے تعلقات بڑھتے جا رہے تھے ان کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ہم سیکولر سیاست کو اپنا رہے تھے۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ کانگریس کے ہی مخالفت بن گئے۔ انھیں اپنی گدی کی حفاظت اسی بات میں نظر آتی کہ ہندو اور مسلمان کو آپس میں دست و گریباں رکھا جائے۔ حالات کے متعلق ہماری تشخیص درست ثابت ہو رہی تھی چنانچہ ہمارا جائے انہی لوگوں پر فائدہ کرنے لگا جو مسلم کانفرنس کے قریب تر تھے۔ گوپالا سوامی ایننگر کو جس طرح درخواست کیا گیا اس سے ہمارا جا کہ اس نئی ذہنیت کی غمازی ہوئی۔ ایننگر مدراس کی سول سروس کے ایک اعلیٰ قہدیدار تھے۔ تھے تو وہ ہمارا جا اور ان کے نظام کے ہی وفادار لیکن ان کے خیالات جنوبی ہند کے اکثر مذہبوں کی طرف قوم پرستانہ تھے اور ان نظامیہ کا بھی وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے ان کا قہدیدار کوئی بہت قابل ذکر کیا کار ساز EVENTFUL نہیں رہا۔ میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلے پہلے تو وہ ہم پر خوب گرتے اور برسے لیکن آخر میں وہ سمجھ چکے تھے کہ اگر کوئی جماعت ریاست میں پانصد سیاسی کردار ادا کر سکتی ہے تو وہ نیشنل کانفرنس ہے۔ اس لیے جب بھی وہ مجھ سے ملتے تھے عزت و احترام سے پیش آتے تھے اور ہمارے خاف تعلقات بڑے اچھے تھے۔ جب ہمارا جا نے اچانک ان کو چلنا کر دیا تو انھیں کافی صدمہ ہوا۔ میرے ان کے ساتھ جو تعلقات اس دور میں استوار ہوئے تھے ان کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آزاد ہندوستان میں پٹنٹ

جواہر لال نہرو نے وزارتِ اعلیٰ مستعجالی تو گویا لاسوائی آئین گرنے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں انھیں جواہر لال نہرو سے متعارف کراؤں چنانچہ میں نے انھیں جواہر لال نہرو سے بلایا۔ اور دورانِ ملاقات ان کی قابلیت کا بھی ذکر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں جواہر لال نے انھیں اپنی کاہنہ میں شامل کر لیا اور پھر ایک وقت تو وہ مرکزی وزیرِ داخلہ بھی ہو گئے۔

گوپالاسوائی آئین گرنے کے پلے جانے کے بعد سر پی۔ این۔ راؤ کو وزارتِ اعلیٰ کے لیے چنا گیا۔ وہ میسور کے رہنے والے تھے اور بہت شریف الطبع انسان تھے۔ ان کا شمار اعلیٰ درجے کے ماہرینِ قانون میں ہوتا تھا اور آزادی کے بعد انھوں نے اپنی قابلیت کا سنگین الاقوامی اداروں میں بھی پیشایا۔ ان کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے رہے۔ ان کے ہی وقت میں ریاست کی کاہنہ میں دو عوامی وزیر شامل ہوئے۔ جب تک ریاض صاحب رہے معاملہ ٹھیک ہی چلتا رہا۔ لیکن جب ان کو رخصت کر کے رام چندر کاک کو وزیرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا تو یہ ناہمواریوں میں پھنس گئی اور ایک صاحب کو مستعفی ہونا پڑا رام چندر کاک نے میٹشل کالفرنس دہشتی اور مسلم کالفرنس نازی کا خوب خوب مظاہرہ کیا اور آزادی کے بعد سیدی باپسی مرکز میں رام چندر کاک کی ذہنیت کے حامیوں نے چلائی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے سرکردہ لیڈر جیلوں سے رہا کئے گئے تو انھوں نے اپنی بگڑی ہوئی صحت بنانے کے لیے کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور صہن جمن زاروں کا رخ کیا۔ ہم نے سرنگر میں ان کے استقبال کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ یکم اگست کو جب جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، خان عبدالغفار خان، خان عبدالغفور خان، اچک زئی، میاں افتخار الدین، مسٹر جعفر علی وغیرہ کثیر الشریف لائے تو ہم نے چوتھوں سے امیر کرلی

تک ان کا دریائی جلوس نکالا۔ دریائی جلوس کا یہ طریقہ کشمیر میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور سلطانِ زمین العابدین ہمدشاہ کے وقت سے اس کی روایات ملتی ہیں۔ دریا کو رنگ برنگے جھڑک دار پارے جات سے سمایا جاتا ہے۔ اور کناروں پر واقع مکانات کے درکچوں اور بارہ درویشوں سے لوگ اپنے پیشِ قیمت اور رنگین قالین، نمندے، ریشی کپڑے وغیرہ لٹکاتے ہیں۔ پھر خوبصورت آرائش پر راستہ کشتیوں جنھیں پرندے کہا جاتا ہے کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ انھیں خوبصورت درویش پہنے ہوئے ملاح چلاتے ہیں۔ ان کے ساتھ دوسری کشتیوں میں بینڈ باجے اور بھانڈو وغیرہ ہوتے ہیں۔ دریا کے دونوں کناروں پر مرد و زن اور بچے اپنے رنگ برنگ لباسوں میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ شہر کی ساری آبادی کنارہ آب پر اکٹھی ہے۔ ایک ایسا سماں بن جاتا ہے جس کی دہائی بھر میں شاید کوئی نظیر نہ ہو۔ ہم نے ان رہنماؤں کا دریائی جلوس نکالا اور انھیں دل کی گھڑائیوں سے خوش آمدید کہا۔ جلوس کے استقامت کی گمرانی میٹشل کالفرنس کی رضا کاروں کے سالار بخشی غلام محمد کر رہے تھے۔ راستے میں میر و غلظ کے حامیوں نے زید کدل کے قریب رنگ میں جھنگ ڈالنے کی کوشش کی اور بدعتی کا بھی مظاہرہ کیا لیکن لوگوں کو اس قدر جوش و خروش تھا کہ گڑبڑ کرنے والے اپنی بدعتی کے مظاہرے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ بے شک کاک شاہی ان کی پیچھے ٹھونک رہی تھی اور وہ سنگ باری اور فریاضی جیسے ٹھونک پر اتر آئے تھے لیکن عوام نے ان کا جواب متانت اور وقار سے دیا۔ اس مظاہرے کی پشت پر کون تمنا کا اعزاز حکومت نے اپنی سرکاری رپورٹ میں یوں کیا، ”مسلم کالفرنس کے حامیوں نے عالی کدل اور زید کدل کے درمیان جلوس پر پتھر پھینکے جس کے نتیجے میں بے شمار لوگ زخمی اور ایک شخص ہلاک ہو گیا۔ یہ مظاہرہ اس قدر جہتِ تب سے گرا ہوا تھا کہ مسٹر جناح نے وائسرائے کو ایک خط لکھ کر اس کی تحقیقات کا مطالبہ

کیا اور ہم نے مسئلہ جناح کے اس مسئلے کی حمایت کی، لیکن کچھ ہونا تھا وہاں۔ شام کو حضوری
 باغ میں ایک شاندار استقبال پر جلسہ منعقد ہوا۔ میں نے صدر نیشنل کانفرنس کی حیثیت سے صدر
 انٹرنیشنل کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں ایک سپانسر پیش کیا۔ مولانا
 کے علم و فضل اور ان کی قربانیوں کا ذکر کرنے کے بعد اس جلسے میں، میں نے وقت کے اہم
 مسائل کو اجماعاً اور اس میں سب سے زیادہ زور ہندوستان کی قومیتوں کے حق خود ارادیت
 پر دیا۔ جو لوگ نیشنل کانفرنس پر یہ الزام عائد کرتے رہتے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کانگریس کی
 اندھی تقلید کر رہی ہے۔ ان کے لیے اس خطبے پر نظر ڈالنا نہایت مفید ثابت ہو گا کیونکہ
 ہم نے کانگریس رہنماؤں کی اس کوشش سے جو حضوری باغ کے شیخ پر موجود تھی۔ بڑا غلط
 پر مسلم لیگ کے جائز مطالبات کی طرف توجہ دینے کی اپیل کی۔ خطبے کے چند اقتباس

ملاحظہ ہوں۔

”ہم اس حقیقت کا عرفان رکھتے ہیں کہ متحدہ متفق عوام ہی مطلوب طاقت کو
 غاصب کے ہاتھوں سے چین سکتے ہیں اور ملک کو آزادی دلا سکتے ہیں۔ ہماری
 مراد یہ ہے کہ آزادی کے مشترک سوال پر تمام فرقوں کے درمیان اتحاد جو حضرت
 مولانا صاحب اہم آپ سے تحلیف کا شرف حاصل کرتے وقت اپنا دل کھول
 کر نیشنل کانگریس کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور صریح الفاظ میں عرض کرنا چاہتے
 ہیں کہ اتحاد کے لیے صرف اس زمرہٴ مسلسل جذباتی ایک لابی ادرے بلکہ اس تمام
 سلسلے پر ترقی تدریجوں سے فوری اور در در اس اقدامات وقت کی اولین ضرورت
 ہے۔ آزادی ہند کے سوال کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہم اپنے آپ سے پلچھتے
 ہیں کہ کانگریس کی سرفروشیوں اور قربانیوں، اس کے مسئلہ رہنماؤں کی بے
 نظیر رغبت اور جہدگی اور مسلم عوام کے لیے ناقابل انکار جذبہ آزادی کی موجودگی

میں کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی تجویز طور پر ہی نیشنل کانگریس کے
 دائرے میں شامل ہوتے ہیں؟ ہم اس امر میں یقین رکھتے ہیں کہ حالات کی موجودہ
 صورت تبدیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہ امر جناب والا کے فرائض میں
 شامل ہے کہ مسلم لیگ اور دوسری مسلم تنظیموں کے طریقہ کار کا جائزہ لیں اور
 ”غدا ماضی اور غدا“ ماگڈر کے مطابق ان میں درست اور تصحیفہ باتوں کو قبول
 فرمائیں۔ اچھا کسی بھی مسئلے سے کیوں نہ آئے ہے ترقی و اس کو قبول کرنا اور اور
 تقصیر ہوتی ہے۔ نعلیہ اکثریت کے کچھ عدالت میں جو مسلم عوام کے غلبہ پر تسلط
 ہیں۔ اگر انھیں اصول خود ارادیت سے دور کیا جاسکتا ہے اور اگر اس اصول کو
 مان لینے سے آزادی کے لیے میدان شدہ عوام کی بھاری طاقت کی تائید قوی
 مجاز کو حاصل ہو سکتی ہے تو یہ مسئلہ نیشنل کانگریس کے اہم مسائل میں سرفہرست ہونا
 چاہیے۔ کشمیر میں نیشنل کانفرنس نے جن خود ارادیت کا اصول کشمیر کی سب قومیتوں
 کے لیے عقیدے کے محدود دائرے کے لحاظ سے نہیں بلکہ کلچر اور تہذیب
 کے وسیع مفہوم کے لحاظ سے قبول کر لیا ہے اور اس یقین کو آل جموں و کشمیر
 نیشنل کانفرنس کے اختیار کردہ آئین نیا کشمیر کی تہذیب میں نمایاں مقام دیا گیا ہے۔“

مولانا آزاد کی صحت قطعاً احمد نگر کی اسیری میں غارت ہو چکی تھی۔ انھیں اس دوران
 اپنی رفیقہ حیات زلیخا بیگم کی موت کے صدمے سے بھی دوچار ہونا پڑا تھا اور ظالم انگریزوں
 نے انھیں آخر وقت پر بھی ان سے ملاقات کی اجازت نہیں دی تھی۔ مولانا نے اپنے آسمان
 وقار شمار کی وجہ سے آج تک نہ کی تھی مگر ان کے چہرے بکھرے سے ظاہر تھا کہ ان کی
 جسمانی صحت اس صدمے سے سخت متاثر ہوئی ہے انھوں نے جیل میں اپنی خیمت آدھریں
 کہا کرتے ہیں یہاں اپنی متاعِ حیات گھر گشت یعنی کوئی بھولی صحت کی تلاش میں آیا ہوں اور امید ہے

کہ آپ مجھے اپنے خوبصورت وطن میں چند جتنے تنہائی اور سکون سے بسر کرنے دیں گے
البتہ ایک چھوٹا سا پیغام دیتا ہوں کہ اس میں آپ کو بعیرت کے دفتر ملیں گے اس کے بعد
مولانا نے فرمایا۔

”قدرت نے اس ملک کو شیخ عبداللہ کی شکل میں ایک قابل اور مستند
رہنما دیا ہے۔ شیخ صاحب اور ان کے رفقاء نے آپ کی درست رہنمائی کی
ہے۔ میں آپ سے کہوں گا کہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں پر اعتماد
رکھیں اور ان کا ساتھ دیں۔ اگر آپ ان کی رہنمائی پر استقلال سے کاربند
رہیں گے تو وہ وقت قریب ہے کہ ان کی قیادت میں آزادی حاصل کریں گے،
کامیابی آپ کو تلاش نہیں کرنا پڑے گی بلکہ کامیابی آپ کی تلاش میں ہوگی اور
آپ کے قدم چومے گے۔“

اس جلسے میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا، ”میرا ذکر جہاں کے طور پر ہوا ہے
حالانکہ مجھے کشمیری ہونے کا فخر حاصل ہے کشمیر تبت میرے خون میں میرے رنگ و
ریشے میں اور میرے دل و دماغ میں رچی بسی ہوئی ہے۔“
جلسے میں خان عبدالغفار خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا، ”شیخ محمد عبداللہ
کشمیریوں کے لیے تمدنی تحفہ ہے۔ اگر آپ اس کی پیروی نہ کریں گے تو آپ
خارے میں رہیں گے۔“

نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کچھ ہی دنوں کے بعد سو پور میں منعقد ہوا۔ جس کی
صدارت میں نے کی۔ نندہ ران سو پور نے اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے بھرپور
کوششیں کی تھیں۔ اپنی کاروائی، مباحث اور فیصلوں کے اعتبار سے یہ اجلاس ہماری
تحریک کا ایک انتہائی اہم پڑا ثابت ہوا۔ پہلی بار نیشنل کانفرنس کے کسی اجلاس میں ریاست

بھر کے ڈیلیٹیوں اور نمائندوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت شمولیت کی تھی اور یہ بھی
چوکہ اس میں پہلی بار گھمسن کے اعلیٰ ترین رہنماؤں نے شرکت کی۔ مولانا آزاد کو اپنی خرابی
صحت کی بنا پر گھرگ میں فروکش ہو گئے تھے۔ لیکن جواہر لال، بادشاہ خان، ”میاں افتخار الدین“
عبدالصمد خان، چانڑی، مسز اندرا گاندھی و جان دونوں سیاست سے دور ہی تھے لیکن
جواہر لال کی لاڈلی بیٹی کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہتی تھیں، وغیرہ اہم شخصیات اس
اجلاس کی خصوصی مہمان تھیں۔ اس اجلاس میں حق خودارادیت کی قرارداد پاس کی گئی جو
ہندوستان کی تلم جہاں غنوں کے لیے مشعل راہ تھی اور ہندوستان کے سیاسی تناظر میں
اولیت کا شرف رکھتی تھی۔ اس قرارداد کی تائید میں جواہر لال نہرو نے بھی تقریر کی پنڈت
جی نے اپنی تقریر میں ازراہ کرم یہ بھی کہا کہ ”کشمیری بھائیو! شیخ محمد عبداللہ نے تمہیں نئی
زندگی دی ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسا لیڈر دیا جو تمہارے لیے دنیا کی
کسی بھی طاقت سے نہ کہنے کے لیے تیار ہے ڈوگرہ حکومت نے تمہیں جانوروں کی زندگی بسر
کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن اس کی کوششوں سے تم آج پھر انسانوں کے رُبوب میں
نظر آ رہے ہو۔ میں نے یہاں انگریز وادیوں میں، دیہات میں عرض جہاں کہیں بھی گیا
”شیر کشمیر زندہ باد“ کا نعروں سنا۔ اور جب سیدے سارے دیہاتی ان کا ذکر محبت
سے کرتے ہیں تو اس وقت آپ کے محبوب رہنما، کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے اور
دلوں پر ان کی شخصیات کا اثر ہوتا ہے۔ یہ تمام ریاستی باشندوں اور آپ کی خوش قسمتی ہے
کہ ایسے نازک موقع پر آپ کو ایسا رہنما ملا ہے۔“ جواہر لال نے اپنی تقریر میں کشمیری
پنڈتوں کی کٹھ چینی کا دائرہ کو سو پور اجلاس تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ کچھ دنوں کے بعد
اضعی شیش ناتھ میں پنڈتوں نے بطور مہمان خصوصی بلایا تو انھوں نے وہاں بھی انھیں
جلی ملی شنائی۔ کپ نے شدھ مہندی میں پیش کئے گئے پنڈت جی لال کھم کے سپاس نامے

کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ نعرہ بازی اور دھم اور سبکدوشی کے لیے گڈرے واقعات سے چٹے رہنا کسی قوم کی روشن خیالی کی دلیل نہیں ہے۔ گری ہوئی قوموں کو تہذیب کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کشمیری پنڈت قوم نے اپنی سیاست کو لکڑیوں تک محدود رکھی ہے جو اس قوم کے گرنے کی علامت ہے۔ سنگ خیالی اور سنگ نظری نے اس قوم کو گھیر رکھا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی سیاست بہت فرسودہ اور رجعت پسندانہ ہے آپ کو غلو می دل سے نیشل کانفرنس میں شامل ہونا چاہئے۔

پنڈت جی اس کے بعد میرے ہمراہ کئی پہاڑی مقامات کی سیر کو گئے۔ انہیں کوہ پیما کی کا عجیب شوق تھا اور اس سلسلے میں وہ مشکلات اور تکلیفوں کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔ ادھر رام چند لاک ان کے ہمارے ساتھ اشفاق کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ اپنی دونوں جب ہم جزئی کشمیر کے شہور پہاڑی چٹے کو نسرناگ جانے کے لیے شو پیان سے ہٹ کر گئے تو لاک صاحب نے وہاں اس خیال سے کہ لوگ پنڈت جی کا استقبال نہ کریں۔ دفعہ ۳۴ گلا دی تھی۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو لوگوں کے سٹلٹھے کے سٹلٹھ لگ گئے اور جواہر لال کو جلوس کی شکل میں لے جایا گیا۔ میں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ”حکومت ہمارے مہمانوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کر رہی ہے۔ وہ ایک تہذیب سرکار کے شایان شان نہیں۔ لیکن اس وقت تک، جب تک کہ یہ مہمان ہمارے درمیان ہیں، ہم ان اشتعال انگیز لوگوں کو نظر انداز کرنے کا اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ کون کیسا بل رہتا ہے۔“

▲ ▲ ▲

(۳۲)

افراد اور اقوام

قرین تاریخ میں افراد اور واقعات کے باہمی تعلق پر کافی خاموشی ہوئی ہے اور یہ سیکرہنوز کشمکش اور تضاد آرائی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ افراد دراصل قوموں کی تواریخ بناتے ہیں اور تواریخ ان کے بازیچے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ افراد دراصل تواریخی قوتوں کا مہرہ ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ان کی منشا سے زیادہ تاریخ کے دھارے کے رخ کا دخل رہتا ہے۔ میرے خیال میں سچائی ان دو اجتہادوں کے درمیان کسی جگہ واقع ہے۔ تواریخی قوتوں کی موافق اور سازگار ہوا کے بغیر افراد بڑے کارناموں کا انارو روشن نہیں کر سکتے لیکن افراد کا امتیاز اس میں ہے کہ وہ اپنی خودی اور جوشِ عمل کے زور سے تاریخی قوتوں کی رفتار تیز کرتے ہیں اور ان کی سمت کا بھی قیودین کرتے ہیں۔ یہ بات سکندر اعظم کے لیے بھی صحیح ہے اور لینن کے بارے میں بھی۔ کارل مارکس کا خیال تھا کہ کمیونسٹ انقلاب کے لیے یورپ کے مالکوں سے جرمی میں سب سے زیادہ موافق حالات ہیں اور روس میں سب سے ناموافق لیکن لینن کی عہد ساز ہمتی نے اس خیال کو غلط ثابت کر کے اشتراکیت کا ظہور روس کی

سرمین سے کر دکھایا۔ اقبال نے بھی اس نظریے کو مستحکم کرنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے خاص لب و لہجے میں یوں بیان کیا ہے :

راز ہے راز ہے تقدیر جہاں جنگ قاز
جوشِ کردار سے گھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

ہندوستان کی آزادی کے فرائض میں بھی افراد اور قوم کی یکجہش بڑے دلچسپ مطالعے کا موضوع ہے۔ آزادی کا تصور عروج ہونے کے عین قبل جم جس زمانے کی بات کر رہے ہیں اس وقت مسلم لیگ کے نظریے پاکستان نے اسی اٹھان حاصل کرنی تھی کہ کنگرہ سی زعماء اس کے آگے خوفزدہ ہو کر سپر ایماز ہو رہے تھے ان میں سے کچھ زما اپنی مجروح انا کے بل پر جناح صاحب کو نظر انداز کرتے اور ان کا مقابلہ کرنے کی غلط پالیسی پر گامزن تھے۔ جس کا مظاہرہ پنڈت جواہر لال نہرو نے کینٹ پلان کی غلط تشریح کرتے ہوئے کیا۔ جب انھوں نے کہا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جم وفاق کی ریاستوں کے حق خود ارادیت کے پابند نہیں ہوں گے۔ اس بات سے یک کر جناح صاحب نے کینٹ پلان کے متعلق پانچا سالہ رویہ ہی بدل دیا۔ اور تقسیم ملک کے لیے تہو کی یہ بات آخری بہانہ ثابت ہوئی۔ دس صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں جناح صاحب کانگریس میں اپنے لیے ایک خاص جگہ بنائی تھی اور مسز مودی نے انھیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا تھا لیکن اس کے باوجود انھیں کانگریس کی چوٹی پر پہنچنے نہ دیا گیا۔ دوسری طرف سر دارپنڈی اور راجندر پرشار جیسے لوگ تھے جو کسی دیکھی طرح اپنی الگ ہندو ملکیت حاصل کرنا اور اپنے بڑھاپے کے ایام میں اپنے خوابوں کا ہندوستان بنانا چاہتے تھے۔ تیسری طرف مولانا آزاد جیسے لوگ تھے جو اگرچہ بدستور تقسیم کی مخالفت کر رہے تھے لیکن جن کا ذاتی اثر عوامی مقبولیت کی عدم موجودگی کی وجہ سے محدود بلکہ محو ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف مہاتما گاندھی ایسے رہنما

تھے جنھوں نے دنیا قوی نقطہ نظر رکھوایا اور جدوجہد کا صحیح تناظر وہ مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی سعی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے عمل سے نفرت اور بدی کی فتنوں کے خلاف دیوار بن کر کھڑے رہے۔ وہ نوکلی کا معرکہ کارزار ہو یا سبار کی مہا سیمارت گاندھی جی ہر جگہ جسم و جان کی پروا کیے بغیر اپنے مسووں کی سر بلندی کے لیے اپنی بے ہتھیار مٹائی لڑتے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم فسادات کے فحاشات اور پاکستان کے بچپن کو ڈر روپے کی جبری بندش کے خلاف مزین برت رکھا۔ وہ تقسیم کا خط کھینچنے جانے کے باوجود آخر تک پاکستان کے علاقے کو جسم و جان کا حصہ سمجھتے رہے اور انھوں نے اعلان کیا کہ وہ پاکستان جا کر وہاں سے نفرت کی فتنوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھیں گے۔ لیکن بھلا بدی کا بیجوت پرست اس میں بار آور کر کیسے سالم و ثابت رہنے و سٹاؤ؟ انھوں نے پاکستان میں اپنی ہم خیال ام فاضل اور جم آہنگ نفرت کی فتنوں پر اس مردود روش کی یلغار سے پہلے ہی ان کی زندگی کا چراغ دہلی کی سرمین پر گھل کر دیا۔

گاندھی جی اپنے آخری دنوں میں دو انتہاؤں کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک طرف مسلم لیگ کے نظریے نفرت کے شعلے بھڑکنا کا مانوں کو بھجورہے تھے۔ اس کے لیڈر چانک ایک سلطنت کے ابوان تک پہنچ گئے تھے اور جلد از جلد اپنی آج پوٹی کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے سرمایہ دار اور طبقہ مالیک کے افراد ایک ملکیت کے ذرائع پیداوار و انضامات پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ مسلم لیگ ان کی ہی ترجمان تھی۔ اس لیے آسے مسلمانوں کے دود رس مفادات سے زیادہ اس محدود طبقے کے مفادات پورا کرنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ لوگ اس مردود روش کی آواز پر بھلا کیسے کان دھرتے؟ دوسری طرف مہاتما جی کی اپنی جماعت کانگریس نے ذہنی سطح پر بٹھارے کی اس اخلاقیات سے متصالحات کرنی تھی اور

اس کے بڑے رہنما بھی جلد از جلد تاریخ کے صفحات میں اپنی ٹھکانی کی چند سطریں درج کر دانا چاہتے تھے اور اس طرح ہما تھا کی بات سننے کے موذ میں نہیں تھے۔ دراصل ہندوستانی بورڈ وازی، جلد از جلد انگریزوں کی جگہ پیداوار کے ذرائع اور اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتی تھی اور اسے گاندھی جی کی اصول پرستی اپنے لیے ایک رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بے چارے گاندھی جی ایک زہر خند کے ساتھ ساری کیفیت کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کہتے تو کرس سے جان کی بات سننے والا کوئی نہ رہا تھا۔ غالب کی زبان میں یہی اس زمانے میں اپنے حالات کی یوں ترجمانی کر سکتے تھے۔

بیاد دیدہ گریں جا بود زبان دانے
غریب شہر سخن بائے گفتنی دارو

اگر اس جگہ میری زبان سمجھنے والا کوئی ہے تو اس کو لے آؤ کہ شہر میں رہنے والے انجمنی کو کچھ باتیں کہنا ہیں

جس تنظیم کو انھوں نے اپنے خونِ بگڑے سے بچا تھا اور جس کے تین مردہ میں انھوں نے اپنے ایمانِ سیمائی سے زندگی کی روح چمک دی تھی اس کے رہنماؤں کے لیے اب گاندھی جی ایک وطن دشمن و مقلوب کرنے والے شخص بن گئے تھے۔ وہ قیادت کی جوئی پر پہنچ کر اب تنہا رہ گئے تھے اور اراؤگ اب انھیں دوسرے ہی تاک رہے تھے۔ بلکہ کچھ کا کچھ بھی رہنا تو کھسک رہے تھے کہ وہ بڑے چالاک ہیں سنجھا گئے ہیں کہ یوں گاندھی جی تیغ کی زبان میں کچھ اس کیفیت کو پہنچ گئے تھے۔

تیری نظر کا لگا گیا جو پہ شجر دل کو
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں
اس آرزو کے پیچھے پیچھے وہ کسی ایسے معصوم بچے کی طرح آگے چلتے گئے جو کسی تہل کے حسین پروں پر نہ لپیٹ ہو کر اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھنا چلا جائے۔ ان کے پاس اپنی

جان کی متاع تھی جس پر ان کا بس تھا۔ چنانچہ اپنے ہی سرمایہ کو انھوں نے اپنے خواب کی خاطر قاتل کی گولی کی نذر چڑھا دیا اور اپنا مقدس خون دے کر گرفت کی اس جوالا کو ٹھنڈا کر دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زرو سیم

محمد علی جناح اس ڈرامے کے دوسرے اہم ترین کردار تھے وہ اس صدی کی پہلی چوتھائی صدی میں کانگریس کے روشن ستارے کی حیثیت سے پہلے اُس وقت اُن کو ایک بڑے قوم پرست اور بے خوف رہنما کی حیثیت حاصل تھی وہ ایک چوٹی کے وکیل اور منطق باز تھے اور انھوں نے بڑی بے یوگر سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ کانگریس کے اعلیٰ رہنما اُس وقت اُن کی عزت کرتے تھے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کس طرح سرد مہری اور عدم انتفاع سے کانگریس کے دھارے سے پہلے تو اُلگ ہو گئے اور پھر اس کے سب سے بڑے متعارض بن گئے۔ تازہ کی عجیب ستم طبعی ہے کہ وہ مسلمانوں کے انتہا پسند طبقے کے رہنما بن گئے جو پاکستان کے نام سے اپنا الگ وطن قائم کرنے پر توجہ دیتے تھے۔ جناح صاحب اپنی تربیت اور پس منظر کے لحاظ سے اس طبقے سے کوسوں دور تھے انھیں اسلام کے واجب ارکان کو زندگی میں برتنے سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ ہندوستان میں اسلامی کلچر کی زبانوں یعنی عربی فارسی اور آدو سے بھی بے بہرہ تھے اُن کے متعلق جو کلمات مشہور ہیں کہ عجیب اُنھیں کبھی نماز ادا کرنا پڑتی تھی تو کس طرح مشکل میں پڑ جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نظریہ پاکستان کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے تھے۔ اور میں اس خیال سے متفق ہوں کہ اُن کے عظیم انتہاک اور گرن کے بغیر پاکستان کا حصول ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کے جذبات کے اس ارتکاز اور عمل کی اس وحدت کا ایک سبب تو یہی تھا کہ وہ

مستقل مزاج اور دھن کے بچے شخص تھے۔ اس کے علاوہ کانگریسی رہنماؤں کے تو جین امیر سلوک نے اُن کی ذاتی انا کو اس حد تک جوت پہنچائی تھی کہ اُن کے اندر اپنی شخصیت منوانے کی ایک شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک نفرت جوہت سے زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ اس لیے جناح صاحب کے سر پر بھی کبھی دھن سوار ہو گئی اور اُن کی تخلیق پاکستان نفرت کے اسی ساگر منتھن سے برآمد ہوئی۔ یوں ایک بڑے آدمی کی نفرت کا شعلہ ایک مملکت کے رگ و پے میں منتقل ہو گیا اور پاکستان ابھی تک اپنی تعمیر میں مصروف خرابی سے پوری طرح امن نہیں چھڑا سکا ہے۔ بلکہ اس کے قوی وجود کے اس بڑاوت کے پیچھے جو فتنوں میں واقع ہو اس کی کارفرمائی تھی۔ شاید اقبال نے ایسی ہی صورت حال کے متعلق کہا تھا:

گھر میں پر دیز کے شیریں تو ہوتی جلدو تہا

لے کے آئی ہے مگر تیشہ فرا دی بھی ساتھ

جناح صاحب کی مثال انوکھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر امجد میر کی مثال پر غور کرنے سے بھی ہندوستانی تحریک آزادی کے اس پہلو پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ امجد میر شروع میں گاندھی جی کی بے اعتنائی کی وجہ سے اُن سے تلافی تھے۔ لیکن آزادی کے غلوں کے وقت جو اچیر لال مہروا انھیں کسی طرح اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے ہندوستان کی دستور سازی میں اچھی اہم ترین رول ادا کیا لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب وہ کانگریس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور انھوں نے اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت بدھ مذہب اختیار کیا۔ جناح صاحب کے کردار کو سمجھنے کے لیے اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب اُن کی زخمی انا آسودہ ہو گئی تو وہ دو قوی نظریے سے دستبردار ہو گئے۔ انھوں نے اپنی ایک آئین تقریر میں کہا کہ اہم ترین مسئلہ سے اب کوئی ہندو

یاسلمان نہیں بلکہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ جناح صاحب غیب کے بل ازم کے پروردہ تھے بلکہ لگتا ہے کہ وہ زندہ رہتے تو پاکستان میں سیاسیات کا رخ کچھ اور ہوتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رہنماؤں کی اسی صف میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی مبادیہا کے لحاظ سے اُن سے بہتر مسلمانوں کی رہنمائی کے اوقات کسی اور میں نہیں تھے۔ وہ ایک بڑے برگزیدہ دینی گروئے میں حرم شریف کی دیواروں کے سایہ میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے اس صدی کی اچھا ترین مسلمانوں میں بیداری کا صہور سرائیل چھوٹا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مسلمانوں کی قیادت کے معاملے میں وہ جناح صاحب جیسے مغرب کے رنگ میں رنگے وکیل کے مقابلے میں ہم نہ سکے۔ اس میں اُن کے قوم پرستانہ اعتقادات کا بھی بڑا دخل تھا۔ وہ ایک بلند پایہ عالم دین، ایک صاحبِ طرز ادیب، ایک شعلہ بیان خطیب اور قوم پرست رہنا تھے۔ اُن کو قدرت نے طاقت ور زبان اور علم عطا کیے تھے۔ جن سے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک تازہ مروج چھوٹی۔ ”الہلال“ اور ”الملاح“ مسلمانوں کو بیدار کرنے والے پہلے دو مجرہ تھے۔ اور اُن کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں میں شکست خوردگی کی بجائے امید اور ولولے کی لہر پیدا کی لیکن حق یہ ہے کہ اُن کی طبیعت کی ساخت ایک عوامی رہنمائی نہیں تھی۔ اُن کے عادات و اطوار میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ عوامی مسائل کا میدان کارزار میں سامنا کرنے کی بجائے گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ جہاں جناح صاحب جذباتی لغزے سے کہ مسلم عوام کو اپنی طرف متوجہ لینے میں کامیاب ہو گئے وہاں مولانا اپنی خلوت گاہ سے فبا رکھاروں کو دیکھتے رو گئے یعنی:

گرفتہ چنیاں احرام و کٹی تختہ در بطل!

مولانا کی پوزیشن عجیب ہو گئی۔ فرقہ پرست ہندو اُنھیں مسلمان سمجھ کر اُن پر اعتبار کرتے تھے اور مسلمان اُنھیں ہندوؤں کا بچہ سمجھ کر اپنی شو بو لائے SHOW BOY قرار دیتے تھے۔

جواہر لال اگرچہ ذاتی طور ان کی بہت عزت کرتے تھے لیکن ان کے جذبات و خیالات کی کہان تک پاسداری کرتے تھے اس کی ایک نگلی سی تصویر مولانا کی سوانحی کتاب INDIA WINS FREEDOM کو پڑھ کر سامنے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں مولانا آزاد بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ اور ان سے خال خال ہی کوئی شریف ملاقات حاصل کر سکتا تھا۔ سردار پٹیل اور مولانا آزاد کی کبھی نہیں بنی سردار پٹیل پر ہندو اور اپارٹسٹ REVIVALIST نظریات کی چھاپ تھی۔ وہ ہر مسئلے کو ہندوؤں کے مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے اور کٹر ہندو فرقہ پرست جماعتیں ان پر کافی اعتماد کرتی تھیں۔ وہ سیاسی اور معاشی دونوں نقطہ ہائے نظر سے یکے کی صحبت پسند تھے اور ترقی پسند جماعتوں سے کم ہی علاقہ رکھتے تھے بلکہ ان کو کھینٹا ناپند کرتے تھے۔ سردار مند چوٹ تھے اور اپنے دلی جذبات کو کم چھپاتے تھے جہاں تک ان سے بن پڑتا، اپنے مخالفین پر وار کرتے۔ مسلمانوں پر ان کا اعتقاد بہت کم تھا اور فرقہ وارانہ فسادات میں وہ ہندو فرقہ پرستوں کی بیٹھ ٹھوکنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ ایک بار جب میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ بولے کہ پاکستان کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جنوبی تعداد میں ہونے والے مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان میں دھکیلا جانا چاہیے تاکہ پاکستان ان کے بوجھ تلے ہی دب کر رہ جائے۔ اور مجبور ہو کر ہندوستان کے آگے گھٹنے ٹیک دے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان دنوں دلی اور اس پاس کے علاقوں میں جو ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے ان کے پیچھے سردار پٹیل کی سیاست کا رد تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی زمانے میں مکھنو میں مسلمانوں کے خلاف ایک لہریلی تقریر کی۔ جہاں گاندھی نے اس تقریر کی رپورٹ سنی تو انھیں بڑا دکھ ہوا کہ ایک بار جب میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو سردار پٹیل کی اس تقریر کا باتوں باتوں میں ذکر آگیا گاندھی جی کی آنکھوں میں آنسو گونجا آئے اور کہنے لگے کہ سردار کی زبان میں کانٹے

ہیں۔ بعد میں انھوں نے اس تقریر پر سردار کی سرزنش بھی کی۔

سردار اور جواہر لال کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جواہر لال کا جنم اور تربیت ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا گہوارہ تھا۔ ان کے باپ پنڈت موتی لال فارسی اور اردو کے عالم تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں مسلمانوں کی کثیر تعداد شامل تھی کشمیری ہونے کے ناطے ان میں رواداری اور فرادینی کا اوصاف بھی موجود تھے۔ برعکس اس کے سردار کی تربیت ایک خالص ہندو وارانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ پھر سردار اپنے آپ کو ہندوستان کی وزارت فطری کا اصل حقدار اور ہندوؤں کی امنگوں کا ترجمان سمجھتے تھے۔ جواہر لال سے وہ عمریں بھی بڑے تھے۔ اس لیے جواہر لال کے وزیرِ اعظم بننے کو وہ اپنی حق تلفی خیال کرتے تھے اور دلی ہی دلیاں کڑھتے رہتے تھے۔ لیکن یہ مانا نہ جاسکا کہ جہاں جواہر لال ایک خواب دیکھنے والے تصور پرست تھے وہاں سردار ایک سلجھے ہوئے منظم اور پختہ حقیقت پسند تھے۔ سردار جواہر لال کو ہی نہیں بلکہ ان کے دوستوں اور عقیدہ والوں کو بھی اپنا مخالف خیال کرتے تھے۔ میرے اور جواہر لال دونوں کی رگوں میں کشمیری خون تھا۔ اور نظریات و خیالات کے لحاظ سے بھی ہم ایک دوسرے کے بہت نزدیک تھے۔ اس لیے سردار کو میرا اور جواہر لال کا ربط کبھی پسند نہ آیا اور وہ مجھے اپنے مخالفوں کے زمرے میں شمار کرتے رہے۔ بد قسمتی سے میرا کراؤ کشمیر میں ایک ہندو ہولڈیا اور اس کے توسط سے ہندو مفاد و خصوصی کے ساتھ تھا۔ یہ بھی سردار اور میرے درمیان جھگڑے کی ایک بڑی وجہ تھی۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کمزری محکمہ جاسوسی کے ایک اعلیٰ افسر من والیہ نے جب تسلسل میرے ادنیٰ میری حکومت کے خلاف غلط رپورٹیں بھیجے گا سلسلہ جاری رکھا تو ہم نے اس کو ریاست سے باہر جانے کا حکم دے دیا۔ اور حکم کی تعمیل کے لیے چوبیس لاکھ روپے کی معاوضہ کی۔ سردار مرکزی ہوم منسٹر تھے اور اس حیثیت سے محکمہ جاسوسی

اُن کے پاس تھا۔ سردار کو ہمارا یہ اقدام بہت ناگوار لگتا اور اس طرح سے دلی کے ایوانوں میں ایک زلزلہ سا پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس شخص کو شکمجانے کے لیے جواہر لال نے ہمیں دلی آنے کی دعوت دی۔ میرے ساتھ بخشی اور دیگر صاحب بھی تھے۔ سردار شیل کے گھر میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں جواہر لال، مولانا آزاد اور گوالا سوامی آئیں گئے۔ بھی شرکت کی۔ بات چل نکلی تو ہم نے اس اقدام کی وجوہات بیان کیں اس پر سردار بولے ”میں نے کبھی بار جواہر لال سے کہا ہے کہ ہم نے کشمیر کا جو جو اکیلا تھا اس میں ہم نا کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔“ سردار نے بڑے محکمہ کے ساتھ یہ بھی کہا کہ چند دن پہلے کشمیر کی ہمارا قیام میرے پاس آئیں اور اپنی دکھ بھری داستان کہتے کہتے اس صوفے پر فرش کشا کر گئیں کہیں کہ ہمارا جاہزی نگہ کو سیاست سے باہر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔“

اب تجھ سے رہا نہ گیا اور میں بولا ”آپ کو ہمارا جاہز اور مہداری کے ساتھ اس قدر ہمدردی ہے، کیا آپ کے دل میں آن ہزاروں بے گناہوں کے لیے بھی کوئی جذبہ موجود ہے جن کو ان دونوں نے جوں کے علاقہ میں تہ تیغ کر دیا۔“ سردار بولے ”بہتر یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔“ میں نے جواب دیا کشمیر کے لوگوں نے آپ کے ساتھ آدروں کی ہم آہنگی کی بنا پر ہاتھ ملا یا ہے۔ آپ اب اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہتے ہیں تو آپ کو اختیار ہے لیکن ہم نے آپ کی ذات کے ساتھ ہاتھ نہیں ملایا۔ بلکہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے یہ سوال آئیں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہم بھی اپنا کس اُن کے سامنے رکھیں گے۔ آپ بھی اپنا موقت اُن کے سامنے رکھئے۔ جو ان کا فیصلہ ہوگا ہمیں وہ منظور ہے۔“ سردار اس پر قہقہہ ہو گئے۔ لیکن جواہر لال یہی گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے ایک کوٹہ فی لے گئے۔ وہ بولے کہ فضا میں کچھ تلخی پیدا ہو گئی ہے لہذا اس معاملے کو ہمیں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ ہم رشتہ توڑنا نہیں چاہتے لیکن اگر سردار کو یہ رشتہ پسند نہیں

تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ مسودہ الحاق کی رو سے مرکز کشمیر میں مرکزی اٹلی جنس کے دفتر قائم نہیں کر سکتا۔ یہ محض ہماری خوش اخلاقی تھی کہ ہم نے اٹلیوں کو کام کرنے کی اجازت دی۔ لیکن ہم یہ ہرگز نہ چاہیں گے کہ یہ ادارہ ہمارے اور مرکزی حکومت کے درمیان تلخی پیدا کرنے کا باعث بنے۔ پھر بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ حسن دالیہ کو ہم پھر سے کام کرنے کی اجازت دیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اس کو بھی ہدایت کی جائے کہ وہ غلط قسم کی رپورٹیں مرکز کو بھیجے کی شرکت نہ دہرائے۔“

سردار شیل میرے کس قدر رخصت تھے اس کا اندازہ لی۔ این۔ ملک کی کتب تاب "MY YEARS WITH NEHRU" کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابدی میں مشرول اٹلی میں بیورو کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ اُن کو سردار نے میرے خلاف خوب پتی پڑھائی تھی جس کے نتیجے میں آنھوں نے میرے خلاف غلط مصلحت رپورٹیں مرکز کو بھیجنا شروع کیں اور جواہر لال کے دل میں میرے خلاف زہر بھرنے شروع کیا۔ ہمیں سے دوا حاصل کرنے کی سازش کے ابتدائی بیج بوئے گئے۔ جب سردار شیل اور مرکزی محکمہ داخلہ میں اس کی ذہنیت کے محکمہ نے مجھے بٹانے اور ایک مختصر قیادت وجود میں لانے کی کوششیں شروع کیں۔ انہی دنوں سردار شیل اور اُن کے گروہ نے بخشی غلام محمد کو سیاسی طعنے پر گھوٹے لیا اور اس کی بی بی شہباز شہزادہ شروع کر دی۔ بہر حال ہم تقسیم سے پہلے کی قیادت پر نظر ڈال رہے تھے۔ مسلمانوں میں اُن دنوں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفیظ الرحمن، مولانا حبیب الرحمن، لدھیانوی وغیرہ بزرگ بھی تھے۔ یہ لوگ بڑے شریف الطبع تھے۔ اور دینی امور میں کافی دسترس رکھتے تھے۔ اُن کا تعلق دیوبند سے تھا۔ مجھے ایک مذہبی اور علمی ادارے کے علاوہ قومی معاملات کا ایک بڑا مرکز بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس نے مسلمانوں میں قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات پر دلان چڑھائے اور اسی ادارے نے مولانا محمد حسن

اور مولانا عبدالرشید بھی بڑے بڑے مجاہد۔ یہ اے کے جنھوں نے انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد اور ہندوستانی قوم پرستی کی آبیاری میں ناقابل فراموش خدمات سر انجام دیں۔ لیکن تقسیم سے ذرا قبل مولانا آمدنی جیسے بزرگ بھی عوامی سطح پر الگ تھلگ ہو چکے تھے۔ یہ سیاسیات کی جموں جھیلیوں سے بہت دور تھے اسی لیے عوامی سطح پر مسلم لیگ کے سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکے اور مسلمانوں کی قیادت جمہوری طور پر محمد علی جناح صاحب نے مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں تمام کر لی۔

پنجاب اور صوبہ سرحد میں تقسیم ملک تک مسلم لیگ کو پورا غلبہ حاصل نہ ہو سکا۔ پنجاب میں اس کا ایک سبب فخر جنت خان کی ریوچسٹ پارٹی تھی جو عوام سے زیادہ جاگیر داروں اور بڑے زمینداروں کی جماعت تھی۔ اس لیے اس کی عوامی حیثیت مشکوک رہی۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان مسلم لیگ کا ڈھکے چھپکے رہے بلکہ ۱۹۴۷ء میں مرکزی اسمبلی میں مولانا آزاد صوبہ سرحد سے ہی منتخب ہو کر بھیجے گئے۔ لیکن جب تقسیم وقت صوبہ سرحد کے عوام سے اس بارے میں استصواب رائے ہوا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو پانچ سو سرخ پوشوں کے خلاف پلٹ گیا۔ شرع پوش و بھر مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف جدوجہد کرتے رہے تھے۔ لیکن اب کانگریسی لیڈر انھیں بقیہ متحدہ ارضیں چھوڑ گئے تھے۔ خان عبدالغفار خان اس لیے وفاتی سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے استصواب میں پاکستان اور ہندوستان میں شمولیت کے علاوہ ایک تیسرا راستہ یعنی پنچتوتان کے قیام کا متبادل حوالہ بھی مانا کہ کیونکہ وہ اب ہندوستان کے حق میں اپنے پیڑوں کو دوڑ دینے کے اخلاقی جواز کو تشبیہ سمجھتے تھے لیکن انگریزوں اور مسلم لیگ کے علاوہ بادشاہ خان کے عہد بھر کے دوست کانگریسیوں نے بھی ان کی حمایت نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ استصواب

صرف ہند اور پاکستان کے درمیان شمولیت کے حوالے تک محدود رہ گیا۔ شرع پوشوں نے اس کا بائیکاٹ کیا اور مسلم لیگ مذہبی جذبات کو براہِ انجمن کر کے صوبہ سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن خان عبدالغفار خان نے اس دشواں ملک کے باوجود ہار نہیں مانی۔ وہ دو قومی نظریے کے برابر مخالف رہے اور انھوں نے یہ بات بار بار کہی کہ پاکستان کے قیام اور ملک کے بٹوارے کی ذمہ داری جناح صاحب سے زیادہ کانگریس کی اس وقت کی قیادت کو قبول کرنی چاہئے۔ ان کے مطابق دراصل کانگریسیوں سے ایک ہندو ریاست کے قیام کی آرزو رکھتے تھے اور انھیں اپنے ساتھ مسلمانوں کی بھاری تعداد کو موجودی رنگ میں جھینگ کے مشاورت لگتی تھی چنانچہ انھوں نے جناح صاحب کے مطابق پاکستان کی آڑ لے کر جو دراصل مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے سودا بازی کا ایک روپ BARGAINING COUNTER تھا۔ جناح صاحب کے ساتھ ایک فیہر خر شدہ اور خاموش ذہنی جمہوریت بٹکے کر لیا۔ اور ان کے کام کو آسان بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ قیام پاکستان کی بجائے یہ ذہنیات دوبارہ قائم رہی۔ اور نہ صرف مسلمانوں کی بھاری تعداد کو پاکستان میں دھکیلنے کا سبب بن گئی بلکہ گاندھی جی جیسے مردِ قلندر کی جو تقسیم کی اخلاقیات کو قبول نہ کر پائے تھے، شہادت کی صورت میں سامنے آ گئی۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسلمانوں پر تقسیم ملک کی ذمہ داری عاید کرتے ہوئے کانگریسی لیڈر یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ جہاں ان کی صفوں میں صرف مہاتما گاندھی ایک ایسے مشرِ استثناء (HONOURABLE EXCEPTION) نظر آتے ہیں جو دو قومی نظریے کے آگے سپرہ ڈال سکے وہاں مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، خاں عبدالغفار خان اور میروں اعلیٰ قوم پرست مسلمان لیڈر ایسے بڑے ہیں جنھوں نے اپنی پوری قوت

کے ساتھ ملک کے شہادے کی مخالفت کی۔ جب تک کہ کافر گریسیوں نے انھیں اپنی تعداد کے بل پر رو ٹوند نہ کر دیا۔ وہ قوی نظریے کے خلاف پہلا محاذ جنگ بھی مسلم اکثریت والے علاقے یعنی ریاست کشمیر میں قائم ہوا۔ جہاں اس نظریے کے توسیع پسند مہم بازوں کی پہلی ٹولی کے خلاف مسلمانانہ کشمیر اُس وقت میدان جنگ میں ڈٹ گئے تھے۔ جب ہندوستانی فوج اور بقول مولانا مسعودی اُن کو کشمیر پہنچانے والے "حائرا با بایل" ابھی پالم کے ہوائی اڈے میں پہری تول رہے تھے۔

یہ بات بھی کچھ جرت انگیز نہیں کہ مظلومانہ پاکستان کے لیے سب سے شدید جذبات اُن علاقوں کے مسلمانوں میں پائے جاتے تھے جو ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تقریباً جتنی خود کشی کے راستے پر گامزن ہوئے تھے۔ اجتماعی خود کشی اس لیے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اُن کے علاقے پاکستان کا حصہ نہیں بنیں گے۔ لیکن پھر بھی تنگ آمد بنگلہ آمد کے مصداق وہ ایک عجیب جذباتی تیجان میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یوپی، بہار وغیرہ کے مسلمان اس سلسلے میں سب سے آگے تھے۔ انھوں نے تقسیم کے عواقب پہننے کے باوجود اُن کے مسائل جوں کے توں رہے اور اسی علاقے میں اب بھی سب سے زیادہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جنوبی ہند میں جہاں غیر مسلموں اور مسلمانوں میں تھل اور درواری کا برتاؤ موجود ہے تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد حالات پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑا۔ اور نہ وہاں فرقہ وارانہ فسادات کی وہ فراوانی نظر آتی ہے جو گنگا اور ندیناکے دو آگے کاشٹوگ امتیاز DUBIOUS DISTINCTION بن گئی ہے۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں سرحد اور کشمیر تو پاکستان کے مکمل تھلا تحالیف تھے اور پنجاب میں تقسیم سے چند ماہ پہلے تک مسلم لیگ بربر اقتدار نہ آ سکی تھی۔

جو اہل کال تھرو اس تقدیر ساز قیادت کے ایک اور جاذب نظر ستارے تھے۔ وہ کار کشن بھی تھے اور کار ساز بھی لیکن وہ ایک مقنن بھی تھے۔ اُن کی ذات میں خوبیوں اور خامیوں کے کتنے ہی دھارے اس طرح سے جمع ہو گئے تھے کہ اُن کے بارے میں کوئی دو ٹوک فیصلہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ وہ کشمیری الاصل تھے اور اس لیے جسمانی لحاظ سے بڑے پرکشش تھے۔ اُن کے سرخ رخساروں کو دیکھ کر کشمیر کے مشہور زمانہ سیب کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ رئیسانہ ماحول میں پلے تھے۔ اور پھر انگلستان کے طبقہ شرفاء کے ساتھ اُن کی ذہنی تربیت ہوئی تھی۔ اس لیے ذہنی طور پر بڑے آزاد خیال اور عملی طور پر بڑے آزاد مشرب تھے۔ وہ برطانیہ کی لبرل روایات کا جصد بن گئے تھے اور انگریزی میں ہی سوچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہندوستانی میں تقریر کرتے تو یہ کسی انگریزی متن کا سرسری ترجمہ لگتی۔ جس میں روحانی اور فصاحت مفقود نظر آتی۔ بقول مولانا آزاد وہ خواب بھی انگریزی میں دیکھتے اور پھر انگریزی میں ہی بڑ بڑاتے۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی اُن پر انیسویں صدی کے اواخر کے انگلستان کے سوشلسٹ دانشوروں اور نعتیں سوسائٹی کا اثر بھی تھا۔ وہ مارکس کے بھی شیدائی تھے۔ اس لیے اُن کے لبرل ازم میں ایک نوکدار زاویے کا اضافہ ہو گیا تھا وہ نہ پورے لبرل رہ گئے تھے اور نہ کچھ اشتراکی وہ ٹکسٹ پیئر کے ہمیت کی طرح اُن دو انتہاؤں کے درمیان اس انداز سے دوچار ہو رہے تھے کہ اس شعر کا ماجرہ سامنے آ جاتا تھا۔ ج

چلتا ہوں تنہوڑی دور ہر اک راہر کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہسبر کو میں

جواہر لال کے دل میں ایک بڑا ادیب چھپا ہوا تھا۔ اُن کی شاندار زندگی اور انفرادہ انگریزی نثر اُن کے دور قلم کی شاہد ہے۔ وہ اپنے آپ کو ناسٹک کہتے تھے لیکن وہ ہندوستان کے اُس ماضی کے عاشق نہ رہا کرتے تھے اور قصیدہ خوان بھی جس میں

ہندو احیاء پرستی اور ہندو راج کا افسوس بھی تھا۔ ان کی دریافت ہندو کبھی غیر شعوری طور پر ہی 'کے' اہم منشی اور دیانند سوسنوی جیسے ہندو احیاء پسندوں کے نظریہ تاریخ کے قریب تر جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو اس قدیم سلطنت کو پھر سے قائم و دائم کرنے کا ایک ہتھیار (INSTRUMENT) سمجھتے تھے۔ اور اس لیے ان کی تصور پرستی میں میکاوی کی سیاست کاری اور شعبہ بازی کے عناصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی جیسے اصول پسند عارف کا یہ جیسا بیک وقت قدیم ہند کے مشہور سیاست کار چالیکہ کا بے حد پرستار بھی تھا اور اس کی کتابہ اور خفا مشاعرہ جس میں اس نے ریاست کی قریب کاری کے طریق بیان کئے ہیں۔ جواہر لال کے اپنے اعتراضات کے مطابق ان کے سر ہانے پر رکھی ہوئی ہوتی تھی۔ جواہر لال نے میکاوی طرز کی یہ سیاست کاری کشمیر میں ہمارے ساتھ بھی برتی۔ پاکستان کے ساتھ بھی برتی اور بین الاقوامی سطح پر ہنگری اور دوسرے معاملات میں بھی اس کا مظاہرہ کیا۔ جواہر لال ایک بڑے جذباتی قسم کے شخص بھی تھے اور ان کا شخصی ظلم اور کشمیش ایسی تھی کہ ان کا گردیدہ نہ ہونا محال تھا۔ دراصل ان میں اس دل فریب ہندو کی وضع داری کا اثر نمایاں تھا جو اگر بڑے نفاست، ہندو لطافت اور مستطمان شرافت کے دھاگوں سے بنی تھی۔ ان کی تربیت مغرب اور مشرق کے اسی تہذیبی چمکت پر ہوئی تھی اور وہ اس کے ایک نہایت ہی دل نواز اور آہل نمونے تھے۔ وہ درست نوازی میں مبالغہ کی حد تک بھی جا سکتے تھے۔ مگر صرف اس صورت میں جب انھیں اپنے دانشور اور اپنے ذاتی مفادات پر زور پڑتی نہ معلوم ہوتی تھی۔ جب اس کا اندیشہ ہوتا تو ان کی آنکھیں بدل جاتیں جب میں ان کے لیے کا آمد نہ رہا تو مجھے جیل بھجوا دیا۔ بخشی غلام محمد نے ان کے کہنے پر اپنے تحسین اور اپنی قوم سے

دغا کی۔ لیکن جب ہندو کو ان کی بھی ضرورت نہ رہی تو کسی گلے مرٹے پھل کی طرح انھیں بھی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اسی طرح کرشنا مینن صرف ان کی پالیسی چلاتے تھے۔ لیکن جب ان کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہوا تو پچارے کرشنا مینن کو جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا، بلا کسی جھجک کے قربانی کا بکرا بنا کر اور بے آبرو کر کے کاہنہ سے نکال دیا۔ انھیں بہت جلد قصہ آجما لیکن بہت جلد نرم بھی پڑ جاتے تھے اور پھر ایسی معصومانہ اداس کے ساتھ اس کی تلافی کر دیتے کہ دل میں خواہش ہوتی کہ وہ بار بار قصہ کریں اور بار بار اس کی تلافی کریں۔ غالب نے جو بات محبوب کے دواغ اور وصال کے بارے میں کہی تھی وہ ان کے قصہ کرنے اور من جاسنے پر بھی صادق آتی ہے۔

دواغ و وصل جدا گانہ لذتے دارو

ع ہزار بار پرو، صد ہزار بار ریا

نجاہر لال صنف نازک سے خاصے متاثر ہوتے تھے۔ وہ حسین صورت اور دلکش لٹگو کے لمس سے فوراً پھل جاتے تھے۔ اور ایسی محبتوں میں خوب چپکے تھے۔ بار بار ایسا ہوا کہ ان کا موٹو بگڑا ہوا ہاتھ کر کوئی طرہ دار خاتون آگئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے جواہر لال کے چہرے کی ٹنگر اور ٹنگوں سے شگفتگی اور خوشی کی کرنیں طلوع ہو گئیں۔ جسے بڑے قومی اجتماعات اور اہم مواقع پر ایسا ہوا کہ اہم ترین مباحث کے بیچ ان کی کوئی چھٹی دوست آگئیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے ساتھ خود ناز و نیاز ہو گئے ان کی طبیعت کی اس آفتاد کے متعلق اکبر آبادی کا یہ شعر بہت صحیح ہے۔

روک سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا

شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنگار نہ ہو

چنانچہ کامگر میں کے سر کردہ رہنما ان کی اس آفتاد طبیعت پر اشاروں اشاروں میں

ہی تبصرو کرتے رہتے تھے اُن کی زندگی پر بہت سی عورتوں کا خاصا اثر ہوا اور وہ اُن کے مزاج میں دخیل رہیں۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس قسم کی خواتین ظاہری حسن کے ساتھ ذہنی صلاحیتوں سے بھی آراستہ تھیں۔ اور جواہر لال میں چھپے انشور کی ذہنی طاقت کر سکتی تھیں۔ ان میں سرورِ حق اور پرہیزگاری کا رنگ و ملاسا سماجی یا ایسی لڑی ایڈوانٹ ماؤنٹ بین میں اور بیسوں دوسری خواتین کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔

عورتوں کے علاوہ کشمیر اُن کی بڑی کمزوری تھی انھوں نے ایک بار ماؤنٹ بین سے کہا تھا جب میری کوئن آف سکاٹس سے فرانسیسیوں نے کیلے کی بند لگا دی تھی تو میری نے کہا کہ مرتے وقت میرے دل کو جیرا جائے تو وہاں کیلے کا لفظ بکھا ہوا ملے گا۔ اسی طرح میرے دل میں بھی کشمیر کا لفظ نقش ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ اپنے آخری لمحات میں انھیں جہانگیر کی طرح کشمیر یاد آئی ہوگی۔ اُن کی یہ توجہ کشمیر کی خوش قسمتی بھی ثابت ہوئی اور بدقسمتی بھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ کشمیر کے حسن کو انھوں نے صنفِ نازک کے درمیان پرانے میں ہی دیکھا اور اس میں نسوانی حسن کی ہلکی لگی آغی پائی۔ وہ کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”ایک بے پناہ خوبصورت نازنین کی طرح جس کا حسن غیر شععی اور انسانی تنہا کی رسائی سے بالاتر ہو۔ کشمیر کے نسوانی حسن کا یہ ایک پہلو ہے۔ دریاؤں، فادوں اور طرح در درختوں کا ٹھور نسوانی حسن..... بعض اوقات اس حسن کی اداسہ دہری فوج پر غالب آجاتی اور میں تقریباً بے ہوشی کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ یہ مشرقی چہرہ زیبائی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو آدمی خواب میں تو دیکھتا ہے لیکن جو جاگ اُٹھنے کے فوراً بعد نعروں سے اور جھل جھل جھل اس بات کا ذکر دیکھ کر چپ ہو جاتا ہے کشمیر کے ایک اور فرزند اور عاشق علامہ اقبال نے بھی کشمیر کے حسن کو سراہا۔ لیکن اُن کا یہاں یہ بیان

نہرو سے بالکل مختلف ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنا دشوار بن جاتا ہے کہ دونوں میں سے کونسی تعریف زیادہ خوبصورت ہے۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب

من خدا را دیدم آنجا بے حجاب در قبال

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کشمیر کے ساتھ جواہر لال نہرو کا جو عشق تھا کیا وہ کشمیریوں کے میرے ساتھ لگاؤ کو اپنی نفسیاتی سطح پر قربانت کی صورت میں محسوس نہ کرنے لگے تھے چونکہ وہ کشمیر کا تصور ایک عورت کے استعارے میں کرتے رہتے تھے۔ لہذا اپنے نفسیاتی رقیب کو ہٹانے کا جذبہ کہیں اُن کو میرے خلاف اقدام کرنے کا محرک تو ثابت نہ ہوا ہو؟

جواہر لال نے زندگی تو ایک کیلنڈر سے لڑکے کی سی زندہ دلی کے ساتھ گزاری لیکن اُن کے آخری ایام پر حزن و ملال کی پرچھائیاں منڈلائی رہیں۔ اُن کے اندر کے چالکیہ نے اُن کو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ وہ چین کے معاملے میں صرف سیاسی طوطی پر ہی مجبور نہ ہوئے بلکہ اس کا زخم اپنے سینے میں بھی سہلاتے رہے۔ وہ گاندھی جی کے جانشین کی حیثیت سے دنیا بھر کی اخلاقی قیادت کے درجہ پر تھے لیکن کشمیر کے معاملے نے اُن کی اس اخلاقی رسالت کو مشکوک بنا دیا۔ خود کشمیر کے اندر انھوں نے سچے سچے نرنے کے بعد اپنے مریدوں کو جو کھیل کھیلے کی اجازت دی تھی وہ اُن کی شہید ہوا گٹھنے کا سبب بن گئی تھی۔ وہ اپنے آخری دنوں میں کشمیر کے معاملے میں اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی بڑی تیار تھے۔ اس لیے انھوں نے بعض غلام محمد کو کامران پلان کی گہاڑی کی ایک ضرب سے یہاں کی نئی سیاست سے الگ کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے

سازم میں میری ربانی کے بعد اپنے رنج اور تاسف کا اظہار کیا اور وہ غلوں دل سے اس گفتگی کا حل سمجھانے کے لیے میری مدد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن تاریخ بڑی بے رحم ہے اس نے انہیں تلافی مافات سے پہلے ہی موت کے ہاتھوں میں دے دیا اور ان کی دل ہی دل میں رہ گئی۔

میری یہ عادت نہیں کسی کی خاطر رکھ لوں بیٹے شبانہ

▲▲▲ (واقبال)

(۳۳)

”کشمیر چھوڑ دو“

برصغیر میں عام انتخابات ہوئے اور ان میں مسلم لیگ نے جھبیاں کامیابیاں حاصل کر لیں۔ اسی زمانے میں حکومتِ برطانیہ نے ایک کامیہ مشن ہندوستان روانہ کیا تاکہ وہ یہاں کی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے ساتھ ہندوستان کی گفتی سمجھانے کے لیے بات کر سکے۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی برطانیہ کے عالمی اقتبال اور اقتدار کا سورج بھی آفتابِ لبِ بام ہو گیا۔ اتحادیوں نے دوسری عالم گیر جنگ میں محوری طاقتوں کو شکست تو دی تھی لیکن اس کا سب سے زیادہ غمناک برطانیہ کو ہی اٹھانا پڑا تھا۔ جو ملک اس جنگ سے پہلے دنیا کی پہلی طاقت تصور ہوتا تھا اب بے درپے مغربوں سے اس قدر خستہ اور شکستہ ہو چکا تھا کہ وہ کسی طرح تیسرے درجے پر اپنا بین الاقوامی تہم قائم رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور دشمن چرچل کو برطانیہ کے بیدار مغرعوام نے جنگ جیت جانے کے باوجود انتخابات میں ٹھکرا دیا تھا کیونکہ وہ اس کی جنگ جو کاند اور جارحانہ پالیسیوں کی بجائے امن و مہین سے رہنے کو ترجیح دیتے

تھے کینٹن ایل کی میسر پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تھی۔ جو برطانیہ کے ڈوبتے ہوئے استعمار کو بچانے کے جتن کرنا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ شاہِ برطانیہ کے دست و بازو اس قدر شل ہو چکے ہیں کہ وہ ہزاروں میل دور واقع جذبہ آزادی سے سرشار ہندوستان کو اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتے۔ کینٹنک مشن کی ہندوستان کو روانگی ای احساس کا نتیجہ تھی۔ اس وفد کی قیادت وزیر ہند لارڈ پیٹک لاء فرس کر رہے تھے۔ اور اس کے میروں میں سر سٹیوڈن ڈاکرس اور مسٹر ایگنڈر شامل تھے۔ اس وقت یہ بات چل رہی تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے قیام کے بعد راجے اور مہاراجے فیصلہ کریں گے کہ وہ کس وفاق کے ساتھ شامل ہوں گے۔ خواہر لال نہرو اور کانگریس اس نظریے کی مخالفت لیکن جناح صاحب اور مسلم لیگ اس کی حمایت کر رہے تھے میں دہلی گاندھی جی سے ملنے گیا اور اُن سے کہا کہ ریاستوں میں سرداری کا حق عوام کو ملنا چاہیے اور ہمیں اپنے اس حق کو منوانے کے لیے فوری طور پر ایجنڈا پیش شروع کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ لیکن گاندھی جی نے اُس مرحلہ پر کوئی تحریک شروع نہ کرنے کا مشورہ دیا اور میں واپس لاہور آ گیا۔ اسی اثناء میں کینٹنک مشن ۱۹ اپریل ۱۹۴۷ء کو سرنگر گیا اور ۲۴ اپریل کو واپس آ گیا۔ میں نے لاہور سے مشن کے نام ایک تاریکیجیا جس کا متن درج ذیل ہے۔

”آج کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ مہاراجا کے شخصی نظام سے مکمل آزادی کا حق چاہتے ہیں۔ ایک سو سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کشمیر کا سودا ہوا۔ صرف ۵ لاکھ نامک شاہی روپے کے عوض جو آج برطانوی ریل کے مطابق پانچ لاکھ پاؤنڈ سترلنگ سے بھی کم رقم ہیں،

کشمیر اس کے عوام، اس کے سبز زار اور مزار اور اس قسم کے تمام وسائل یکے سلطنت کے ایک باج گزار راجا کا غلبہ سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیئے گئے۔ اُس وقت کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے اس معاہدے کے سلسلے میں کشمیر کا سودا کرنے کی مزاحمت کی لیکن اُسے برطانوی فوج کی مدد سے مطیع بنا دیا گیا۔ اس طرح سے ۱۹۴۷ء کے اس بکری چرنے جس کو غلطی سے معاہدہ ام تر کہا جاتا ہے، کشمیریوں کی قسمت پر بھراگوئی۔ ہم اس بیع نامے کی اخلاقی اور سیاسی حیثیت کو چیلنج کرتے ہیں۔ جس میں کشمیری عوام کبھی فریق نہیں رہے اور جو مسئلہ سے ان کی غلامی کی دشاؤں زرمنا چلا آیا ہے۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کے باشندگان کا مستقبل طے کیا جا رہا ہے اور برطانوی کینٹنک مشن مستقبل کا اپنی ڈھانچہ تشکیل دے رہا ہے۔

اس لیے راجاؤں کے معاہدات کرنے کا حق اس وقت ریاستوں کے عوام راجاؤں شاہی اور بالادستی رکھنے والی طاقت کے درمیان ایک اہم مسئلے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہم کشمیریوں کے لیے اس مسئلے کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ایک انتہائی اہم معاملہ بن گیا ہے۔ ہمارے موقف کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ بیع نامہ کو، جس کی وجہ سے کشمیر ڈوگرہ مہاراجوں کے زیرِ عتبات آیا۔ ان حقوق کے موافق کوئی حق عطا نہیں کرتا۔ جن کی بنا پر ان ریاستوں کا نظام چلایا جاتا ہے۔ جن پر معاہدات سے پیدا شدہ حقوق کی غلامی ہے۔ اس لحاظ سے کشمیر کا معاملہ ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے اور کشمیر کے عوام کینٹنک مشن کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ برطانوی حکمرانی کے خاتمے کے بعد انھیں آزاد رہنے کا حق حاصل ہے۔

۱۸۳۲ء کا بیٹ نامہ جسے غلطی سے معاہدہ امرتسر کہہ کر میکرا جا تا ہے اس
دعوے کو اظہر من الشمس بنا دیتا ہے۔ کوئی بکری پتر، چاہے اس کے قد میں
کا کتنا ہی ڈھنڈورہ کیوں نہ بیٹا جائے، چالیس لاکھ سے زیادہ عورتوں اور
مردوں کو ایک نانا شاہ کا غلام نہیں بنا رکھ سکتا جب وہ اس کے زیر نگین
درہے پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ ہم کشمیری عوام اپنی تقدیر خود بنانے کی قسم
کھا چکے ہیں۔ اور کینٹ مشن سے آئندہ دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے بوقت کی قوت
اور انصاف کا اقرار کریں۔ کشمیر عظیم برصغیر ہندوستان کے شمال و مغرب
میں واقع ایک جغرافیائی وحدت ہی نہیں ہے۔ جو اپنی خوبصورتی اور تمدنی
دولت کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اس کا کل قیام و قیامت اہم فوجی اور
سیاسی نوعیت کا ہے، یہ ہندوستان، چین اور روس کا مقام اتصال ہے
اور اس لحاظ سے اس کی بین الاقوامی اہمیت ہے۔ ہمارا وطن کشمیری قوم
کا گہوارہ ہے، جو اپنی زبان، کچھ اور روایت کی ہم آہنگی اور اپنی مشیت کہ
ہندو جہد کی تاریخ کے لحاظ سے ہندوستان میں ایک نادر روزگار جگہ
ہے جہاں تمام فرستے اور بھیجے ایک متحدہ قومی مسئلے کی پشت پناہی
کر رہی ہیں۔

کچھ بھی باتوں کے بعد میں کشمیر آگیا اور میں نے یہاں تقریروں کا ایک سلسلہ
شروع کر دیا تاکہ عوام کو کشمیر کی تاریخ کے اس اہم موڑ اور ان کے مستقبل کے
امکانات کے بارے میں خبردار کر سکوں۔ میں نے پہلی تقریر ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء کو مائید
میں دھن بی بھائی اڈے کے احاطے میں کی۔ اور اعلان کیا کہ انگریزوں کے جانے
کے ساتھ ہی وہ تمام راجے اور مہاراجے بھی چلے گئے ہیں جو انگریز سامراج کے چٹوڑوں

کی حیثیت سے اپنی رعایا پر مسلط تھے۔ اور وہ سارے معاہدے بھی کالعدم ہو گئے ہیں۔
جو ناجائز طریقے سے عمل میں لائے گئے تھے۔ اور جن کا منشا عوام کو ان کی مرضی کے
خلاف طوق غلامی پہنا نا تھا۔ میں نے ایک اور تقریر زیندار محلہ میں کی اور کہا کہ ہم
ایک ایک روپیہ اکٹھا کریں گے اور اس طرح سے پچھتر لاکھ روپے کی وہ رقم مہالاجا
کو واپس کریں گے جس کے عوض اس کے پردادا مہاراجا گلاب سنگھ نے آج سے
ٹھیک ایک سو سال پہلے کشمیر کو خرید لیا تھا اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
علامہ اقبال نے کہا تھا

اے بادشاہ گرہہ جینوا گد رگنی

حرفے زما بہ مجلس اقوام بازگوئے

دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند

قوسے فروختند و چہ ارزاں فروختند

میں نے ایک اور تقریر اندرون شہر میں کی۔ میری تقریریں اس قدر خوشنحی تھیں
کہ سارے کشمیر میں عزم اور ولولے کا ایک الاؤ روشن ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ طاہر
اقبال نے اپنے شاعرانہ مکاشفے میں کشمیر کی حالت کے بارے میں جو بشارت دی تھی
وہ حرت بہ حرف پوری ہو گئی ہے۔

باش تابہی کہ بے آواز مہوور

ملنے برخیزد از خاک قبور

چنانچہ کشمیر کے حالات کی جھلک جو بھی جو اہر لال نہرو کے کان میں پڑی انھوں
نے کچھ دہلی آنے اور بات چیت کرنے کا سہارا لیا۔ ۱۹ مئی کو میں نے اپنے رفقاء
کے ساتھ بات چیت کی اور انہی کی سیج کو میں راولپنڈی کی روڑ کے ذریعہ دہلی کی طرف

پہل پڑا جب میں مطلع نظر آباد میں سران اور گھوڑے قریب پہنچا تو میں نے دیکھ کر راستے کے بچوں بیچ ایک بھاری پتھر رکھا گیا ہے اور پولیس کی ایک جیت توجہ ہے۔ میری کار ٹوکالی گئی۔ مجھے ڈیٹینس روڑ کے تحت جاری کیا گیا ایک وارنٹ دکھایا گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ لیکن مجھے اس تاریکی میں گڑھی کے ڈاک جنگل تک پہنچایا گیا جہاں میں نے رات بسر کی۔ دوسرے روز علی الصبح لا کر اسی دن واپس سرپنٹر پہنچایا گیا اور باوادی باغ کے کوارٹر گارڈ میں رکھا گیا۔ مجھے چھتہ بل کے راستے سے شہر نہیں لایا گیا بلکہ مائنیل کے لیے راستے سے لایا گیا تاکہ شہر سے میرا گذر نہ ہو اور کسی کو کالوں کا خبر نہ ہوئے پاسے لیکن میری گرفتاری کی خبر آنا فانا سارے شہر میں پھیل گئی اور خود آبی وسیع پیمانے پر متکھارے، پٹلے اور جلوس شروع ہوئے۔ حکومت نے رات کی تاریکی کے پورے میں شہر میں ہی کیا وادی کے اہم ناگوں پر بھی پولیس اور فوج بھادی تھی۔ بلکہ پونچھ، راجوری، جمعدواہ، کوٹلی، باہنہل وغیرہ مقامات پر بھی فوج روانہ کر دی گئی تھی۔ شہر وہوہات میں جڑال و مظاہرے جاری رہے پولیس نے بے تحاشہ گرفتاریاں شروع کر دیں۔ متکھارہن پر اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں۔ جن سے سرکاری اعداد شمار کے مطابق بیس سے زائد افراد قتلہ اجل بن گئے اور ایسے شہیدوں میں اسلام آباد کی سسٹا فنی بھی تھی۔ اس تحریک میں سردار بدھ سنگھ، پنڈت شیام لال مرادت، پنڈت کیشپ بندھو، سردار سنت سنگھ تیغ، دھکا پرشاد اور جاگی ناتھ کشی بھی گرفتار ہوئے۔ ادھر خواجہ غلام محی الدین قرہ رو پوش ہو کر تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے دلیرانہ کارناموں سے کافی شہرت حاصل کی اور کشمیری لوگ جیتوں کے بہرہ ور بن گئے۔

میری گرفتاری کے ساتھ ہی میٹھل کانفرنس کے تقریباً تمام جوتی کے لیڈروں اور اہم کارکنوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ صرف بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق کچھ بچا کر کشمیر سے نکل جانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ حضرات میری گرفتاری سے قبل ہی لاہور پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے وہاں کشمیر کے حالات سے اخبارات اور کانگریس کے رہنماؤں کو آگاہ کیا۔ کشمیر کے وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک نے ایک پریس کانفرنس میں یہ بات تسلیم کرنی کہ وہ اس دن کے لیے گیارہ بجے سے تیاری کرتے رہے تھے اور انھوں نے اس غرض کے لیے کشمیری فوج کی کچھ ٹیمیں مشرق وسطیٰ سے جہاں وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مقیم تھیں وہاں بکالی تھیں۔

”کشمیر جھوڑ دو“ تحریک نے ریاست کے عوام میں ایک عظیم آہوار پیدا کر دیا تھا لیکن ہندو پریس کا ایک حصہ اس کے خلاف ہی رہا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ صورت کچھ بھی ہو ایک ہندو ہمارا بچے کے ڈانڈا دل سنگھاسن کی ہر قیمت پر رکشا کی جانی چاہیے۔ کانگریس کے اس وقت کے صدر اچار یہ کر پانی بھی ہماری تحریک سے ہزار تھے لیکن سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ مشر محمد علی جناح اور ان کی مسلم لیگ کشمیری عوام کے سینوں کو چھنی کرنے والی گولیوں سے آگئیں موند کر اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ جناح صاحب شاید دل ہی دل میں کشمیر میں اپنے تجربات سے شگ شک رہے تھے۔ انھوں نے آدھ کیا تاؤ اور ہمارا جا اور کاک شاہی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسے قتلوں کی تحریک قرار دیا۔ جناح صاحب نے اس تحریک کو بیرونی انگیت کا نتیجہ بتایا اور ان کا عمامہ اشارہ یہ تھا کہ سوویت روس اس تحریک کی پشت پر ہے۔ البتہ ایک جواہر لال جتو جیٹان کی طرح ڈٹے رہے اور ہماری تحریک کی حمایت کرتے رہے۔ ہمارا جا اور ریاست میں ان کے دوستوں نے کانگریسی اینڈروں

خاص طور پر مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ رام چندر ساک تو خود سردار پٹیل کو ہمنوا بنانے کے لیے بمبئی چلا گیا اور اُن سے ملا۔ دہلی میں سینٹ گھنٹام داس برلانی بھی سردار پٹیل و فیرو کے ذریعے جواہر لال کو کثیر کے معاملات میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جواہر لال بھی کہاں ماننے والے تھے۔ وہ گاندھی جی سے ملے اور انھیں تحریک کشمیر کی حقیقت سے واقف کیا۔ انھیں اس بات پر سخت فتنہ آیا کہ حکومت کشمیر نے مجھے اس وقت گرفتار کر لیا جب میں اُن کے باؤ سے پران سے تبادلہ خیالات کے لیے جا رہا تھا جواہر لال نے مہاراجا کے نام کوئی تار روانہ کیے جن میں اُن سے کہا گیا کہ وہ مجھے رہا کریں۔ اُنھوں نے کشمیر اگر مہاراجا سے اس مسئلے میں بات چیت کی بھی پیش کش کی لیکن مہاراجا نے جوابی تار میں بتایا کہ آپ کا یہاں آنا غیر دانشمندانہ ہوگا۔ اور اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن جواہر لال بھی مجھے دھوکا دیتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے تمام ایک طرف چھوڑ کر کشمیر کا رخ کیا۔ اُس وقت کانگریسی لیڈر کیننٹنشن کے ساتھ آزاد دہلی ہند کے بارے میں اہم گفت و شنید کے نادر ترین دورے گزرتے رہے تھے اور جواہر لال اس بات چیت میں بڑا اہم رول ادا کر رہے تھے۔ اس لیے مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد نے جو اس وقت کانگریس کے صدر منتخب تھے نے انھیں سفر کشمیر اختیار کرنے سے باز رکھنے کی کوششیں کی۔ اور دہلی میں ہی رہنے کی ضرورت کا احساس دلانا چاہا۔ جواہر لال نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”میری جگہ عوام کے درمیان ہے۔ اس لیے مجھے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔“ بہر حال وہ سارے زمانے کو اُل کر راولپنڈی پہنچ ہی گئے۔ یہاں بخشی غلام محمد اور کچھ دوسرے کانگریسی لیڈر اُن سے ملے اور پھر یہ سارا قافلہ کوہاڑ کی طرف روانہ ہوا۔ جو برطانوی پنجاب اور مہاراجا کی ریاست کی حد فاصل تھا۔

مہاراجا کی حکومت نے جس کے سربراہ اُس وقت رام چندر ساک تھے، جواہر لال کے واسطے پر پابندی لگائی۔ جواہر لال اس سے قبل ہی مہاراجا کے مظالم کی مذمت کر چکے تھے اور اُنھوں نے کہا تھا کہ ”سر جگر کو شہر نوشاں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ کشمیر میں ظلم و جبر کی جوہر مل رہی تھی۔ ساک شاہی اُس پر پردہ ڈالنے کے لیے جواہر لال کو کسی طرح روکنا چاہتا تھی اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ جواہر لال کی سرنگرمیں موجودگی تحریک کے شعلوں کو اور تیز کرے گی۔ چنانچہ اس نے گھبراہٹ میں جواہر لال کے کشمیر کے واسطے پر پابندی لگائی اور کوہاڑ میں پر ایک فوجی دستے کو تعینات کیا۔ دوسری طرف جوں اور کشمیر کی ہندو سنسٹھاؤں کو اپنے حاشیہ بردار کوہاڑ پہنچانے کے لیے بھی متحرک کیا گیا۔ اور انھیں سرکاری وسائل کا استعمال کر کے وہاں پہنچایا گیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کشمیری پنڈت، جو اس وقت تک جواہر لال کو اپنا سپوت قرار دیتے ہوئے خوشی اور فخر سے چھوٹے نہ ساتے تھے، اب پنڈت شوخان فطیلدار کی سربراہی میں ہندوستان کے اسی جواہر اور کشمیر کے اسی لال کو کالی جھنڈیا دکھانے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ آدھر ڈوگرہ سبھا کے پرانی ندھی بھی کیل کاسٹے سے لیں ہو کر آئے تھے۔ حدیہ ہے کہ پنڈت ساک نے مولوی یوسف شاہ کو گمانے کر اُن کے چند حامیوں کو بھی کوہاڑ پہنچا دیا تھا۔ اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے کشمیری عوام کی حمایت کرنے کے جرم میں جواہر لال کے خلاف ایک آواز ہو گئے تھے۔ اسی سبب بھنوں نے جواہر لال کے خلاف مظاہرے کیے اور واپس جاؤں کے نعرے لگائے۔ لیکن پنڈت جی جیسے جیلے اور جری شخص کہاں رکنے والے تھے۔ وہ رندانہ قدم بڑھاتے گئے اور اُن کے بڑھتے ہوئے قدموں سے مظاہرین اور فوج میں جھگڑا پڑ گئی۔ لیکن ایک سپاہی نے ہندوئی کی

انی ان کے سینے کی طرف گھمادی۔ چند جی زخمی ہو گئے لیکن واپس نہیں بٹے۔ تانے کے ساتھ آنے والے بہت سے لوگ چلے گئے اس طرف پنجاب میں ٹرک گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حکومت کشمیر ٹھیک گئی ہے اور اب پنڈت جی سرنگر چلے جائیں گے۔ لیکن کچھ منچلوں نے پل پار کر کے حکمران شاہی کی غلام درزی کی۔ گورنر کشمیر مہاراج کرشن دتھ موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے تمام پارٹی کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اور پنڈت جی کو سیٹھ دومیل اور پھر اوڑی کے ڈاک بنگلے میں نظر بند رکھا گیا۔ دوسرے جب پنڈت جی کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں چھپی تو ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ ملک کے اکثر حصوں میں اس عظیم رستا کی گرفتاری کے غلام نظر ہارے ہوئے گولیاں پٹیں اور بہت سے لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔

جواہر لال کے بنگلے کے باہر حکومت نے دو کاریں رکھوا دیں اور ان سے کہلوا یا کہ وہ کسی بھی وقت واپس ہندوستان جانے کے لیے آزاد ہیں۔ لیکن جواہر لال اس سے سن نہ ہونے۔ دوسرے دہلی میں کانگریسی حلقوں میں جواہر لال کی عدم موجودگی سے ایک گہرا م سادھا گیا۔ مہر حال برطانوی حکومت کے ساتھ انتہائی ہم نوعیت کی بات چیت میں وہ مرکزی کردار تھے۔ مہاتما گاندھی کی ایسا پرانا انا نند نے ان سے ملنے توں برسات کی امداد انھیں بتایا کہ دہلی میں ان کی موجودگی کتنی ضروری ہے۔ مولانا نے انھیں یقین دلایا کہ ان کی عزت کانگریس کی عزت ہے۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے وہ کشمیر کے معاملات میں مؤثر متا دلت کریں گے اور پھر جواہر لال چند دنوں کے بعد کشمیر جا سکیں گے۔ آخر کار جواہر لال راضی ہو گئے۔ چنانچہ وائسرائے لاٹو دیو نے اپنا خاص چہانژان کو واپس لانے کے لیے بھیجا اور وہ اوڑی کے ڈاک بنگلے میں دو راتوں کی نظربندی کے بعد ۲۲ جون کی صبح کو ۲ بجے

واپس دہلی پہنچے۔ جواہر لال نے کشمیر کی صورت حال سے متعلق اپنے بیان میں ذمہ داری کے جبر و استبداد سے پرہیز کرنا یا انھوں نے کہا۔

”ہر وہ شخص جو کشمیر کو جانتا ہے لازمی طور اس کی قدر و منزلت سے بھی واقف ہے جو شیخ محمد عبداللہ کو دہاں حاصل ہے۔ وہ کشمیر کی دور دراز وادیوں میں لوگوں کا محبوب اور ان کا شیر کشمیر ہے۔ اس کی شخصیت کے گرد لاتعداد افسانوں اور عوامی گیتوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ ریاستی عوام کی تحریکوں کے سلسلے میں میرے سب سے بڑے اور بیش قیمت ساتھی ہیں اور میں ہر اہم معاملے میں ان کی رائے لیتا ہوں۔

کیا کوئی شخص سمجھتا ہے کہ ہم ان سے یا ان کے ساتھیوں سے خوف اس لیے کیا رہے کشمیر کریں گے کہ حکومت کشمیر کے پاس چند ہندو تھیں ہیں۔ ہم یقیناً اس بھاری استعمار میں کشمیری عوام اور ان کے رہنماؤں کے دوش بدوش کھڑے رہیں گے۔۔۔۔۔ اس وقت خوبصورت اور شاداب وادی میں عوام کا خون بہا جا رہا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ ریاست کی حکومت کسی نہ کسی بہانے عوامی تحریک کو کھل دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

جواہر لال نے واپس لوٹنے سے قبل مہاراجا کو ایک خط لکھا کہ میں بہت جلد واپس کشمیر آؤں گا اور اگر اس وقت آپ نے مجھے پھر روکنے کی کوشش کی تو میں ان اذکامات کی پھر غلام درزی کروں گا۔ جواہر لال کے ساتھ آنے والے کچھ دوستوں کو سرنگر آنے کی اجازت دی گئی۔ ان میں مشہور وکیل دیوان چمن لال بھی تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ دیوان صاحب مجھ سے بنگلے کے لیے بھی آئے۔ مجھے بادامی باغ کے ملٹری ہسپتال میں رکھا گیا تھا۔ جس کو نظربندی کی پیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میرے

خلات حکومت نے دفعہ ۱۳۴۱ء الف (بقاوت) کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ اور سرپرست راتے سیشن جج کو سیشن جج مقرر کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس وزیر سرپرست چند نے ۲۸ مئی ۱۹۳۵ء کو میرے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ میرے ساتھ علی محمد طارق اور پنڈت شیام لال صراف کو بھی اس کیس میں جھوس رکھا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے لاہور کے ایک وکیل مسٹر ستیجی استغاثے کے چیف پراسیکیوٹر بنائے گئے تھے۔ انھیں یومیہ سولہ سو پچاس روپے مختار ادا کیا جاتا تھا۔ مسٹر ستیجی زیادہ دیر تک نہ سکے لیکن پچاس ہزار سے زیادہ کی رقم انٹھ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے بعد پنڈت مدھو سودن کاک نے استغاثے کی کمان سنبھالی۔ پنڈت جیالال کلم اور دیگر کئی شیریں پنڈت ساتھیوں نے میری طرف سے وکالت نامہ پیش کیا۔ پنڈت خواجہ لال نے پٹنہ کے ایک وکیل مسٹر سہائے کو وکیل معنائی بنا کے بھیجا۔ موآصمت سہل اور دیوان جین لال بھی مولائے معنائی میں شامل تھے لیکن حقیقتاً اصل متاعب نے ہی معنائی کا بوجھ سنبھالا۔ انھوں نے ہی شہادت تلخیز کروائی۔ گو انہوں پر جرح کی ادا فریں پر زور بحث کی۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام ایک ہاؤس بوٹ میں کیا گیا تھا۔ پنڈت جیالال کلم اور دوسرے دکلاہ ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے موجود رہتے تھے۔ مسز فدیہ بیدی نے ٹائپ کا کام کرنے میں ان کی بڑی مدد کی اور کافی محنت سے کام لیا۔ آصمت علی صاحب نے آزاد ہند فوج کے مقدمے میں بھولا سہائی ڈیسیائی کے آٹھائے جوئے کیس کی صراحت کرتے ہوئے کہا کہ "غلاموں کو بقاوت کرنے کا پیدائشی حق ہے اور معاہدہ امرتسر کے خلاف بقاوت کا یہی حق کشمیریوں کو حاصل ہے۔" انھوں نے کہا "آج ۱۹۳۵ء میں جب برطانوی کامینڈ نے اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کو آزاد رہنے کا حق ہے، اس دوران میں ساری دنیا میں غلام کی آزادی کے چرچے

ہو رہے ہیں کیا اس وقت بھی یہ کہنا جزم ہے کہ اس ریاست کی حکومت کی بنیاد بھی عوام کی رضامندی ہوئی چاہئے نہ کہ وہ قابل تحقیر ایک صدی پرانا ناکری پتر جس کو دنیا کی بڑی سے بڑی عدالت مسترد کرے گی۔" کچھ عرصہ کے بعد یعنی ۳۴ جولائی کو خواجہ لال دہلی میں تھوڑی سی فراغت پاتے ہی کشمیر کی طرف دوڑ پڑے۔ ہمارا جا ایک طرف ان کی گرفتاری کے اثرات سے گھبرا گیا تھا تو دوسری طرف اُس پر داسرائے اور کانگریس کا بھی زبردست دباؤ تھا۔ لہذا اب کی مرتبہ خواجہ لال کے داسط پر کوئی پابندی نہیں لگادی گئی۔ خواجہ لال نے مجھے بھی ملاقات کی اور میرے گھر جا کر میری اہلیہ سے بھی ملے۔ ایک روز تو وہ میری صفائی میں سیرسری کا گاؤں بہن کعدالت کے کٹہرے میں ان کٹہرے ہوئے اور دکلاہ معنائی میں اپنا نام درج کروایا۔ میرے لیے خواجہ لال کو گاؤں میں دیکھنے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ کشمیر چھوڑ دینے کی تحریک تمام ریاست میں پھیلتی جا رہی تھی۔ خاص طور کشمیر کے مسلمانوں نے اپنے آپ کو دھڑا دھڑا ہندو بننے کی بجائے پیش کیا تھا۔ کافی منظم براہ راست کیے اور کتے ہی جو انھوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ چودھری غلام عباس بہت ہی جذباتی رہتا تھے۔ انھوں نے بھی اپنے آپ کو گورنمنٹ کے لیے پیش کیا۔ اگرچہ ان کے رہنا محمد علی جناح صاحب نے شک کی بلند یوں سے جاری کیے ہوئے بیان میں اسے "بیرونی عناصر کی شر پر" شرمندہ کی گئی فتنوں کی تحریک قرار دیا تھا اور ان کے ساتھ میری وعظ کے پیر و اسس تحریک کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ مقدمہ مکمل تو کئی ہفتے تک جاری رہا۔ جس کے دوران میں نے عدالت کے سامنے ایک بیان پیش کیا یہ بیان اس مقدمے کی مفصل روداد KASHMIR ON TRIAL میں چھپ چکا ہے۔ بیان میں میں نے کہا۔

"یہ ایک معمولی بات ہے کہ مجھے قید کیا جا سکے، مجھ پر مقدمہ چلایا جاتا

ہے یا مجھے سزا دی جاتی ہے۔ لیکن یہ معمولی بات نہیں ہے کہ کشمیر کے عوام غربت، حقیر اور پستی کا شکار بنائے گئے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں کے دوران ان پر کیا کیا قیامتیں ڈھائی گئی ہیں اور ان پر اس وقت کیا غضب بیت رہا ہے۔ انہی واقعات نے ہمارے منہ پر اور کشمیر چھوڑ دو "کے نعرے کی معقولیت اور منطقی گواہ کیا ہے۔ ایسا نظام جو اس قسم کے پتھکنڈوں کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتا، قابلِ مذمت ہے۔ اگر میری اور میرے ساتھیوں کی قید سے وہ مقصد پورا ہوتا ہے جس کے لیے ہم نے اپنے آپ کو وقت کیا ہے تو ہم اس پر بے حد خوش ہیں اور ہم اپنے وطن اور اپنے آباد اجداد کی دھرتی کی خدمت کرنے پر فخر سے سرشار ہو جائیں گے۔"

۱۰۔ اترتہ کو جب بیج نے اپنا فیصلہ سنایا تو عدالت کا مکرمہ تاشائیوں سے کچھا کھینچ بھرا ہوا تھا۔ بلکہ عدالت سے باہر بھی ہزاروں لوگ فیصلہ سننے کے لیے اکٹھا ہو گئے تھے۔ مجھے تین الزامات میں الگ الگ تین تین سال قید کی سزا سنائی گئی۔ جو یوں تو نو سال کے عرصے پر محیط ہوتی تھی مگر چونکہ یہ سزائیک وقت شروع ہوتی تھی اس لیے یہ تین سال قید کے مترادف تھی۔ اس کے علاوہ پانچ سو روپے کا جرمانہ بھی عاید کیا گیا۔ "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کا ایک ہیلو بہت دیرپا ہے۔ جہاں کانگریس نے مجموعی طور پر ہماری حمایت کی وہاں کانگریس پر اس نے جس پر ہندو سرمایہ داروں کا غلبہ تھا ہمارا جاکی حمایت کی۔ اس کے برعکس جہاں جناح صاحب اور مسلم لیگ نے ہماری مخالفت کی وہاں لائبرل کے لیگ اور مسلم پر اس نے ہماری خوب تائید کی۔ مہتر اور سالک کے اخبار "انقلاب" نے تو لیگ اور مسلم کانفرنس پر رجعت پسندی کا الزام لگایا۔ "زمیندار" انسان" وغیرہ نے بھی ہماری حمایت میں لیگ کی پالیسی کے خلاف اٹھ کھڑا ادارے لکھے۔ آغا عبدالکریم خان، المردود شوگر کشمیر نے جو مطالبہ

پاکستان کے حامی تھے تحریک کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ہر جوش انداز میں یوں لکھا رہا ہے ہری سنگھ کو ہائے شیر بارے ڈر وقت اور وقت کی بدلی ہوئی رفتار سے ڈر بجلیاں کو نہ رہی ہیں سرمایہ دار وفا شیر کشمیر کے آواز پر پیکار سے ڈر اپنے غلوں کی دھڑکتی ہوئی بنیاد کو دیکھ اپنے آغاز کے انجام سیاہ کار سے ڈر

میرے غامے کی آڑوں میں ہے کشمیر کا لوچ

ہاں سنبھل دیکھ میرے شعلہ گفتار سے ڈر

ابو لطف فیض جالندھری نے بیج نامہ امرتسر کی اصل حقیقت بے نقاب کرتے ہوئے لکھا۔ لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں ایک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں مرد کا سرمایہ محنت پچھتر لاکھ میں عورتوں کا جوہر عصمت پچھتر لاکھ میں

ملک و ملت قوم، مال و جاں پچھتر لاکھ میں

ہاں پچھتر لاکھ میں ہاں پچھتر لاکھ میں

شیر وادی میں دہاڑا گرج اٹھے کھسار بھگتے بیدار مزدور اور جاگے کاشتکار چار مو آزادانی چھوڑ کر سٹن کر پکار ہو گئی برہمن نے میں تختہ سرمایہ دار

عیش کے کانوں میں پیغام اہل آنے لگا

کاروبار شہر یاری میں خلل آنے لگا

مولانا غفر علی خان نے "زمیندار" میں لکھا۔

ہر طرف ہنگامہ سمجھ برپا ہے دارو گیر کا

ہو رہا ہے پچھتر ہزار خیم کین کشمیر کا

گو ختم ہے پچھتر فضا زخمیر کی جھنکار سے

شور جس میں دُوب رہا ہے نعرہ تکبیر کا

جو اہل لہلہ ہونے بعد میں اس مقدمے کے متعلق اپنے تاثرات تخلیق کرتے ہوئے اپنی پُر زور برجستہ اور صاف و شفاف نثر میں لکھا۔

”عوامی تحریکیں جس کے پیچھے کوئی قوت یا صداقت ہوتی ہے عام طور پر ایسی شخصیتوں کو نمایاں کرتی ہیں جو اس تحریک کی علامت اور نشان بن جاتی ہیں۔ اسی قاعدے کی رو سے شیخ محمد عبداللہ آزادی کے لیے کشمیری عوام کی آنگوں کے سب سے زیادہ اہم اور جیتے جاگتے نشان بن گئے ہیں۔ اس حساب سے شیخ محمد عبداللہ کا مقدمہ بھی ایک فرد واحد کے مقدمے کی سطح سے بہت اوپر اٹھ گیا۔ ایک پوری قوم کو کھڑے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس کو زیادہ صحت کے ساتھ یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ رائے عامہ کی عدلیہ کے سامنے ریاست کے اُن حکام کی پیشی تھی جنہوں نے ریاست کی عظیم عوامی تحریک کے دھارے کا رخ موڑنے کی فضول کوشش کی تھی۔ یہ بات حیرت ناک ہے کہ محکمہ چلانے والے لوگ کس طرح تاریخ کے سبق کو توبیخیں دیتے اور اُن کی عقل و دانش پر اس قدر چھالے پڑ گئے کہ وہ ہم عصر واقعات کی منطق بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ریاست کے عوام نے ریاست کی تسخیر افواج کے خلاف جدوجہد شروع کی ہے وہ اس مقدمے کے ساتھ ختم نہیں ہو سکتی۔ یہ داستان اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک یہ اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔“

”کشمیر آن ٹرائل“ کا بیان



اسیری کے کوائف

مجھے سرائانی گئی اور اُس کے فوراً بعد جموں کے باہر قلعے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ ایک ویران سی جگہ تھی۔ ہر طرف گھاس آگ آئی تھی جو انسان کے قدم کے برابر اونچی تھی۔ پھڑوں کے چھتے ہر طرف موجود تھے اور زنجیروں بھرا جانی سمیٹناہٹ کا منحوس ساز بجاتے رہتے تھے۔ سانپ اور بچھو بھی کچھ کم نہ تھے اور شرار کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ الغرض یہ جگہ انسانی رہائش کے بالکل قابل نہ تھی۔ اس نے اس مکمل زیادتی کے خلاف احتجاج کے طور پر سمبھوک ہڑتال کی۔ حکومت فوراً جک گئی اور مجھے قلعہ باہر سے نکال کر ریاستی سب جیل بھیج دیا گیا۔ اس جیل میں سردار بدھ سنگھ، خواجہ غلام نبی وکیل عارف نبی جی اور ہنڈت کیشپ بندھو پہلے سے ہی موجود تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جیل خانہ بھی انسانی بود و باش کے لائق نہ تھا۔ ریاستی میں بے پناہ گرمی پڑتی ہے۔ چھروں کے ٹنڈی دل انسانی خون کی پیاس میں شب خون مارتے تھے اور سانپ اور بچھو جیل میں سر نہ لگاتے رہتے تھے۔ مگر ہم کرتے بھی کیا۔ چار و ناچار دن گزارتے رہے۔ ریڈیو اور اخبارات سے ہم کو محروم رکھا

گیا تھا۔ لیکن ایک بات بہت اچھی تھی میرے ساتھیوں نے ڈیرہ خوب سہا ہوا تھا۔ جس کو ٹھہری میں بچھڑتا گیا وہ میرے ساتھیوں کا گودام گھر تھا۔ فرسٹس پر مختلف قسم کی ایندیاں رکھی ہوئی تھیں اور دیواروں پر پوڑیاں قطار در قطار لگی ہوئی تھیں۔ مجھے شوق چرایا کہ ذرا دیکھوں ان ہانڈیوں وغیرہ میں کیا رکھا ہوا ہے؟ جب ان کے ڈھکن کھولے تو کیا دیکھا ہوں کہ ان میں انواع و اقسام کی پٹریاں رکھی ہوئی ہیں۔ ان کو کھولا تو کسی میں لوگ اور دوسرے گرم معامے پائے۔ اور بھی بہت سی چیزیں فرش سے لٹک رہی تھیں۔ کچھ اور ہانڈیوں میں کھانڈ، سوہی، گھی وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ الغرض کرو کیا تھا۔ باضابطہ پکڑاری کی ایک دوکان تھی۔ یہاں اپنے ساتھیوں سے پوچھا، یعنی یہ پنہاری کی دوکان کیوں اور کس لیے سجا رکھی ہے؟ سردار بدھو سنگھ مسکراتے ہوئے بولے کہ یہ میرے دو ساتھی جو جیل میں بھرت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ خود کھاتے پیتے تو ہیں نہیں۔ اپنے راشن کے میسوں سے اول ملول چیزیں منگواتے رہتے ہیں اس میں سے تھوڑا سا فروخ کر کے باقی حفاظت سے رکھ دیتے ہیں۔ بعد میں جینے بچنے کے بعد اسے بازار میں بیکنے کے لیے بیچ دیتے ہیں اور اسے نقدی میں تبدیل کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہسپتال سے بے مشینوں کے بنڈل کے بنڈل لاپکے ہیں اور غالباً ان کو بھی بعد میں نقد نارنج کی شکل دیں گے۔ سردار صاحب خاموش ہوئے تو بدھو جی ایک کونے سے بول اٹھے "سردار صاحب ان اپ مشن اپ بول رہے ہیں۔ یہ خود تو روز ملوا اور ڈکيا پھلارے لے لے کر بیٹھ کر جاتے ہیں اور پھر دنیا کو بتاتے ہیں کہ میں تنگیا ہوں اور پیٹ پر پتھر باندھ رہا ہوں" اس پر قہقہے چھوٹے اور خوب مہمی مذاق رہا لیکن میں نے ایک بار کیشپ بدھو سے پوچھ ہی لیا کہ آخر اس طریق کار کا

مقصد کیا ہے۔ اب بدھو جی بڑی سنجیدہ صورت بنا کر فہمائش کے انداز میں کہنے لگے۔ "میں تم مسلمان لوگ مرث پیٹ پوچھا کی فکر میں لگے رہتے ہو۔ جو بھی ہاتھ آیا چنگلیوں میں اڑا دیتے ہو۔ تمہیں کبھی فکر فدا کی توفیق نہیں ہوئی۔ آخر ہم جیل میں آئے ہیں اور کیا معلوم ہیں کب تک یہاں سڑنا پڑے۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ ہم یہاں بھی کچھ پیسہ پونجی جمع کر لیں تاکہ جب جیل سے باہر جائیں تو ٹھن ٹھن گوپال کی طرح خالی ہاتھ نہ جائیں۔ میں اس منظر پر خوب ہنسنا۔ بہر حال بات آئی گئی ہوئی البتہ انھوں نے جو کھانڈ وغیرہ جمع کی تھی اس کا میں ملوا بنانا رہا انھیں بھی کھلانا اور خود بھی کھانا۔ پچاسے کیشپ بدھو چار دوا چار ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے لیکن بقول شاعر ع کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے بیٹھے ہیں

گرمی کا زور بڑھتا گیا اور ہم حکومت پر زور ڈالنے لگے کہ ہمیں کسی ٹھنڈی جگہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ہماری بات کا اثر ہوا۔ اور ہمیں مجدد واہ میں بھیج دیا گیا۔ سردار بدھو سنگھ مجھے رہ گئے۔ لیکن مرزا محمد افضل بیگ ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ مجدد واہ جیل میں مجھے بیگ صاحب، قلام نبی وکیل المعروف نبی جی اور بدھو جی کے ساتھ محبوس رکھا گیا۔ باقی کچھ ساتھی قلعہ رام گئے۔ میں قید رکھے گئے۔ کچھ اور دم پور میں زیر حراست رہے اور کچھ جیلوں میں قید سرنگرموں سڑک پر موت کے قریب ڈھونڈا گزار سپہاڑیوں کی اونچائی پر ایک جگہ ایسی ہے جسے گچہ کہتے ہیں۔ اس کا نام ہی پڑا۔ اتنے زمانے میں کشمیریوں میں لڑنے پیدا کرتا تھا۔ اس زمانے میں یہاں عرق قید کی سزا بھیجنے والے خطراک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہ قلعہ سپہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے اور اس چار دیواری کا نظارہ دوسرے دیکھنے والوں کے لیے بھی ہیبت اور ہول کا عالم پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ

ہماری نظر بندی کے دوران اس مختصر حال زندان خانے کی مرمت کرائی گئی۔ اطلاعات کے مطابق پنڈت رام چند کاک کا ارادہ یہ تھا کہ مجھے وہاں بھیج دیا جائے۔ لیکن اس ارادے کی سبب کسی طرح عوام میں پہنچ گئی۔ چاروں طرف زبردست شور مچا اور کاک صاحب کی دل کی دِل میں ہی رہ گئی۔ مجددِ واہ جیل میں ہمارے شب و روز بسر ہوتے تھے۔ اب ہمیں جیل میں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ اور چاروں طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ انسان انسان کے خون سے ہولی کھیل رہا تھا۔ اور اس طرح آزادی کی صبح خون آشام چہرہ کے رطلوع ہو گئی تھی۔ ہم نے زندان سے ہی لاہور میں مقیم ساتھیوں بخشی صاحب اور صادق صاحب سے خفیہ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ تاکہ ہم تیزی سے بدلے ہونے واقعات کی ٹوہ لگاتے رہیں اور حالات کی رفتار سے مقدمہ بھر واقف رہ سکیں۔ یہ رابطہ قائم کرنے کے لیے بھی ہم نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو الف لیلوی انداز کا تھا۔ ہم تاریکی میں تلے کی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف ایک لمبی رسی پھینک دیتے تھے۔ اُدھر لاہور سے آیا ہوا اچلی تازہ ترین ڈاک رسی کے ایک سرے میں گرہ لگا کر باندھ دیتا تھا۔ ہم رسی کو کھینچ لیتے پھر ڈاک کی یہ پتیلی کسی گنج گراں ملیے کی طرح کھوٹتے تھے۔ اور بعد میں کسی نہ کسی طرح اپنا جواب بھی اپنے قاصد تک پہنچا ہی دیتے تھے۔

جیل کی چار دیواری میں اگرچہ ہمارے جسم قید تھے۔ لیکن ہمارے ذہن باہر کی وسیع دنیا میں برپا جنگوں کے ساتھ گتے ہوتے تھے۔ اور ہمارے اندر ایک شہر جنگا رہے تھے۔ ہمارے سامنے سب سے نازک اور اہم سوال یہ تھا کہ بدی ہوئی سیاسی دنیا میں ریاست جوں و کشمیر کے لیے کونسا راستہ فائدہ مند رہے گا۔

آباد ہند کے ساتھ الحاق کرے پاکستان میں شامل ہو یا دونوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہوئے اپنا وجود برقرار رکھے امیرِ خیال تھا کہ ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں تو پاکستان کبھی اس کو تسلیم نہ کرے گا۔ اور ریاست جنگ کا اکھاڑہ بن جانے کے علاوہ داخلی محاذ پر بھی انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ لیکن میرے دوستوں کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی سیاست کبھی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی ترجمان نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس پر ہمیشہ سامنتی سوچ اور جاگیر دارانہ نظام کا غلبہ رہے گا۔ اس لیے پاکستان میں یہ ترجیح غالب رہیں گے اور وہاں عوامی آئینگوں کے پورا سونے کے امکان بہت نازک ہیں۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کے عوام بھی پاکستان میں رہ کر اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکیں گے۔ جو انھوں نے "نیا کشمیر" کی صورت میں تسلیم کیا ہے۔ اس طرح سے ہم اُسی لعنت کا طوق پھر پہن لیں گے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہم نے اتنی کڑی اور قیمتی قربانیاں پیش کی ہیں۔ ان دوستوں کا استدلال یہ بھی تھا کہ برصغیر کے بٹ جانے کے باوجود ہندوستان میں ایسی جماعتیں اور افراد موجود ہیں جن کی سوچ ہماری سوچ سے اور جن کے اصول ہمارے اصولوں سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے اس بات کا بہت قوی امکان ہے کہ ہم اپنے دلی کی مراد اور خواہوں کی تعبیر اسی مملکت کے ساتھ نافذ کر سکیں۔ اُدھر لاہور سے جو اطلاعات آرہی تھیں وہ بھی ہمارے اُن اندیشوں کی غمازی کر رہی تھیں۔ ہمارے سامنے کشمیر کو آزاد رکھنے کا سوال بھی اُبھرا۔ لیکن ہماری مشترکہ رائے تھی کہ آج کل کی دنیا میں جب فاسطے سمٹ گئے ہیں۔ کشمیر جیسی چھوٹی سی افائی کے لیے جو بڑی طاقتوں کے ممکنہ غرے میں ہوا آزاد رہنا مشکل ہی نہیں محال ثابت ہو گا اور وہ سازشوں اور بد امنیوں کا گہوارہ بنی رہے گی۔ البتہ یہ بات بالکل دوسری ہے کہ خود یہ طاقتیں، ایسا چاہیں اور اس کی ترقی

اور امن وامان کے لیے ضمانت دیدیں تو اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال فرصت کے لمحات میں ہم ان مسائل کی پرتیں کھولتے رہتے تھے۔ اور ان پر کافی دیر مانگ سوزی کرتے رہتے تھے۔

ادھر حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ آگ اور خون کی بھیانک لہریں مشرقی اور مغربی جناب میں اُودھم مچا رہی تھیں۔ وہی لوگ جو آزادی کے لیے دیوانے ہو رہے تھے اب افسوس کہاتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کہیں اس قسم کی آزادی سے انگریزوں کی غلامی ہی تو بہتر نہ تھی؟ ہم کب تک یہ الماعلات پیچتیں تو ہم بھی اپنا کچھ حتم کر رہے جاتے۔ صرف میرے لب پر یہ دعا چلتی رہی کہ ہماری ریاست اس طوفان بدتمیزی سے محفوظ و مامون رہے۔

ہمارے دلوں میں آتش فشاں گرم تھا کہ سجدہ رواہ میں سونچاں کے شدید جھٹکے آنا شروع ہو گئے۔ یہ جھٹکے ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک جاری رہے۔ پچارے سجدہ رواہ تو اسی گہر گئے اور انھوں نے گھروں سے باہر آکر جنگلوں اور کھلے میدانوں میں ڈیرے جمادیے۔ ہم سجدہ رواہ کے قلعے میں قید تھے اس کے تین اطراف میں اونچے اونچے دو منزلہ مکانات واقع ہیں۔ ایک طرف اونچی دیوار کھڑی تھی۔ بیچ میں ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ زونے کا زبردست حیدر آباد تو ہم چاروں ساتھی جھٹ سے اس صحن میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہماری دکانیں قلعے کے کنگروں کی طرف لگی ہوئی تھیں بیگ صاحب زونے سے سخت ڈرتے ہیں۔ وہ دکان گہرا گئے کیشپ بندھو ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چائے کی گرم گرم پیانی تھی۔ ان کی نظر قلعے کی کنگری پر تھی لیکن کبھی کبھی گہرا ہٹ میں چائے کی چمکی بھی لے لیتے اور بیگ صاحب کو تسلی بھی دیتے۔ پیالے سے گرم چائے کے قطرے بیگ صاحب کی گردن پر

ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔ بیگ صاحب نے کنگروں سے تو نظر نہیں اٹھائی لیکن چلا گئے۔ کبھی تم نے تو مجھے جلا دیا۔ کیشپ بندھو جواب دے رہے تھے کہ میری نہیں زونے کی کارستانی ہے۔ ادھر فنگٹن پر جھٹک لگ رہے تھے۔ ہمارا باورچی ایک ہندو تھا۔ ہم اس کو باہر آنے کی ترغیب دیتے رہے لیکن وہ نہ مانا۔ اور بڑے دھانی کا دوسرا دھارن کر کے بولا کہ پرمانا جو کہ تاپے وہی ہوگا۔ اس کے بغیر کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے لیکن جب جھٹکے ذرا سائز ہو گئے اور کنگروں سے اسٹین گرنے لگیں تو پینڈت جی مہاراج کی ساری مشینیں ہوا ہو گئی۔ وہ ڈر کے مارے بید لرزاں کی طرح کانپنے لگے۔ گھٹنوں گھٹنوں چلتے ہوئے اور رام رام پلٹے ہوئے وہ میز صحنوں سے نیچے آ گئے۔ جہاں سے کارنگ فنی ہو چکا تھا۔ سیدھے ہمارے پاس پہنچ کر بیچ میں گھس گئے۔ صورت حال بگڑتی جا رہی تھی اور ہماری جان کے لالے بڑے ہوئے تھے۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ہم نے جیل سے بڑی استدعا کی کہ دروازہ کھول کر ہمیں میدان میں سے جاؤ لیکن اس نے سپرٹنڈنٹ کے حکم کے بغیر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ مرنے لیا نہ کرتا۔ ہم نے دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ لیکن دروازہ بھی ختم ٹھوکر کر کھڑا ہوا۔ آخر جب حالات انتہائی نازک ہو گئے تو دروازہ کسی نہ کسی طرح کھل گیا اور ہم دوسرا میدان میں جا کر قدرت کی اس غلامی ترک کا مظاہرہ کرنے لگے۔ سپرٹنڈنٹ جیل ایک مقامی ڈاکٹر تھا۔ ہمارا اپنا لینے کے لیے ان پہنچا اور ہماری حالت دیکھ کر دوسرے ہی کہنے لگا کہ گہرا نے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک اونچی سطح کے میدان میں کھڑے تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب ہماری طرف آ رہے تھے۔ وہ ہمیں تسلی دیتے ہوئے آ رہے آئے لگے کہ زونے کا ایک جھٹکا آیا۔ پچارے ڈاکٹر صاحب آوندھے ہو کر رہ گئے اور نیچے گر پڑے چلے گئے۔ اب ہماری باری تھی انھیں دلاسا دینے کی گہرا نے مت

سب خیریت ہے۔ بہر حال ہم ایک مہینے تک شامیانوں میں رہے جب زلزلے کے
 جھٹکے ختم ہوئے تو ہم واپس تلے میں داخل ہو گئے۔ اُن دنوں کا ایک اور پُر تلکھت واقعہ
 میرے ذہن کے پردے پر ابھر رہا ہے۔ ہمیں جو راش الاؤس ملتا تھا اس کا حساب
 کتاب ہم نے پندرہ کیش پے بندھو کے سچو کر دیا تھا۔ وہ جیلر کے ذریعہ روزمرہ کی ضروری
 چیزیں منگوا کرتے اور اُن کا حساب رکھتے۔ ایک دن میں نے اپنے کمرے میں بلند
 آواز سے حج و حج کی آواز سنی۔ باہر آکر دیکھا کہ بندھو حجی جیلر کے ساتھ سخت تیز کلامی
 کر رہے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے؟ بندھو حجی بولے کہ میں نے شمس
 جیلر سے سگریٹ کی ڈبیہ لانے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اس نے ان سٹی کردی اور میں حج
 سے سگریٹ کے ایک کس کے لیے ٹوپ رہا ہوں۔ میں نے معاملہ ختم کرنے کی غرض سے
 کہا کہ کوئی بات نہیں ہے میں بیگ صاحب سے ایک سگریٹ لاتا ہوں۔ رات بھر
 گزارہ کیجئے اور پھر حج جیلر سے دو ڈبیہ سگریٹ وصول کیجئے معاملہ رفع دفع ہوا۔
 اور بندھو حجی کو نے میں بندھو حجی میں لگ گئے۔ مجھے کسی چیز کے لیے اُن کے کمرے میں
 جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کمرے میں میری نظر ایک کونے میں لگے ہوئے ایک
 تھیلے پر پڑی۔ میں نے تھیلے کو کھولا تو میری آنکھیں حیرت سے کھل کر کھل رہ گئیں کیونکہ
 اس تھیلے میں سگریٹ کے ایک نہیں، دو نہیں پورے ستر ڈبیہ محفوظ و مامون رکھے
 ہوئے تھے۔ میں آئے پاؤں بیگ صاحب کے کمرے میں گیا اُن کو سارا ماجرا سنایا
 اور سگریٹ کا تھیلہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔ بیگ صاحب کو شراعت سمجھی۔ ہم نے
 سگریٹ تھیلے سے باہر نکال دیے اور ہمارے پاس بیٹھے پچھتے پچھتے اُن کو تھیلے
 میں بند کر کے بندھو حجی کے کمرے میں آسے گا۔ نکال دیا جس جگہ یہ رکھا ہوا تھا۔ دوسرے
 دن فیصلے کے مطابق جیلر بندھو حجی کے لیے سگریٹ کے دو ڈبیہ لے آیا۔ بندھو حجی فرماں

خرا ماں ایک ڈبیہ کو تھیلے میں رکھنے کے لیے چلے۔ ہم چپکے چپکے اُن کو تاک رہے تھے۔
 جب اُنہوں نے وہ تھیلہ کھولا تو اُن پر نیم فشتی سن طاری ہو گئی۔ لیکن ہم سے کچھ کہتے
 نہیں بنی۔ چند دن گزر گئے تو ہمارے پاس آکر بیٹھے گئے اور مسکرائے گئے۔ ہم نے پوچھا
 کہ شکرانہ کس خوشی میں ہے۔ تو بولے کہ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود چپ
 سادے بیٹھے ہو؟ ہم نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہیں تو کچھ بھی نہیں
 معلوم۔ بہر کیفیت بڑی منت ساجت کی تو ہمارا دل بیسج گیا اور ہم نے آنکھیں مگرٹ
 واپس کر دیں۔ لیکن آنکھیں مگرٹ لوٹاتے ہوئے میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیا
 آپ کا ارادہ سگریٹ کی دوکان بلائے گا ہے؟ بندھو حجی نے ریاستی تیل والا جواب
 دیا اور کہا کہ اُن تمام مسلمانوں نے تو کبھی فکر فروا کی ہی نہیں ہے۔ آخر ہم تیل میں
 ہیں اور کھانا کا کوئی وسیلہ نہیں۔ اگر چہ راستے میں سگریٹ بیچ بیچ کے لاکھوں روپے
 بنائے تو میں بھی کچھ نہ سہی مگر باکر سگریٹ کی دوکان ہی کروں گا۔ میں میں میرا
 ایک اور مشغلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بھدر وہاں میں سرٹ رنگ کی مینا جن میرے کمرے
 کے اوپر منڈلا رہی ہوتیں تو میں دانہ اُنکا بکھیر دیتا اور وہ آہستہ آہستہ یہ دانہ
 چنے لگتیں۔ پہلے تو وہ مجھ سے ڈرتی تھیں۔ اور میری آہٹ پا کر پھرتے آڑھیاں لیکن
 آہستہ آہستہ مجھ سے مانوس ہوتی گئیں۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ میں اُن کو ہاتھ
 میں لے کر اُن کے کانوں میں آؤنر سے پتلیا کرتا اور وہ بڑی آداسی یہ آؤنر سے
 بلانے لگتیں میں دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ ملازمہ اقبال کی یہ آرزو ہم نے جیتے
 جی پوری کر دی لی۔ ج۔

نئے سرنگر کا ایک پان سگریٹ بیچنے والا دوکاندار جو بھاری دولت اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوا۔

ماٹوئس اسقدر موصورت سے میری بلیک

نہتے سے اس کے دل میں گستاخانہ کچھ میرا ہو

میری امیری کے دوران کئی کانگریسی لیڈر اور رہنما کشمیر آئے جن میں سے دو کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تھے مہاتما گاندھی اور دوسرے کانگریس کے اس وقت کے صدر اپار۔ یہ جی کر پلائی کر پلائی جی آئے تو تھے کشمیر کے حالات کا مطالعہ کرتے لیکن ان کی اصل غرض و نیت کا پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن یہ بات ضرور ہوئی کہ انھوں نے اپنے دور سے کے بعد کشمیری عوام میں کچھ اچھے اثرات جنیں پھیلے۔ یہ بات بھی سننے میں آئی تھی کہ وہ سردار پٹیل کی طرف سے مہاراجا کے نام پیغام لے کر آئے تھے۔ مہاراجا نے انھیں سے پیاس ہزار روپیہ کا ایک چمک بھی پراسرار مقاصد کی تکمیل کی خاطر منبھ لے گئے۔ گر پلائی جی کو مہاراجا نے یہ خطیر رقم کم غرض کے لیے دی تھی کہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں مل سکا ہے۔ حال ہی میں اس پر کافی سے دے بھی ہوئی۔ مگر گر پلائی جی انہیں جھانکے گئے لیکن حساب فہمی کی بات پتی گئے۔

جہاں تک مہاتما گاندھی کے کشمیر آنے کا تعلق تھا یہ ان کے لیے کشمیر دیکھنے کا پہلا اور آخری موقع تھا۔ مہاراجا پر تپ سنگھ نے ۱۹۴۷ء میں کچھ میلے میں ان کو کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر نہیں آ سکے تھے۔ پھر میں نے انھیں کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے دعوت اس دعوت کو قبول کیا تھا کہ وہ کشمیر کے لیے روانہ ہوئے اور ایمٹ آباد تک پہنچ گئے۔ انھوں نے مہاراجا کی دعوت پر سرکاری مہمان بننا قبول کر لیا تھا۔ جب یہ بات میں نے سنی تو میں نے اس پر ان سے استعجاب کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ مہاراجا کا مہمان

بن کر وہ کشمیری عوام کو کرب میں مبتلا کریں گے۔ ان کو تو کشمیری عوام کا جہان بن کر رہا چاہیے۔ گاندھی جی مہاراجا سے قول بار چکے تھے لیکن میرے استاد لال کا بھی ان سے پاس جواب نہ تھا۔ لہذا انھوں نے وہ سب سے روز اپنی من پسند گہری کے ساتھ چلی کارخ اختیار کیا۔ اور کشمیر یاترا کا پروگرام منسوخ کر دیا۔

ان کے کشمیر آنے سے پہلے دہلی میں ایک احتجاجا مارا ڈرا کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جواہر لال نہرو نے کشمیر کے حالات سن کر کچھ سرنگڑ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن حکومت کشمیر ان کے آنے سے منعوار بنی تھی۔ اس نے اپنی یہ مقبوضہ وافر اسے لارڈ مائونٹ بیٹن تک پہنچا دی۔ جنھوں نے مہاتما گاندھی سے درخواست کی کہ وہ اس مرے پر پبندت جواہر لال کو کشمیر جانے سے روک دیں۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ جواہر لال اس معاملے میں خاصے بند باقی ہیں۔ یہ ضرورت دیکھ کر مہاتما گاندھی نے جواہر لال کی بجائے خود کشمیر جانے کی پیش کش کی۔ مائونٹ بیٹن نے کشمیر بدلے مشورہ کر کے گاندھی جی کو لکھا کہ آپ کشمیر چلے جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ محمد علی جناح بھی وہاں جانے کا فیصلہ کریں۔ اور اس طرح کشمیر میں کشش اور تناؤ کے شعلے اور بھڑک اٹھے۔ اسی اثنا میں رام چند کاک دہلی گئے۔ کاک نے سردار پٹیل سے ملاقات کی اور سردار پٹیل نے گاندھی جی سے کہا کہ وہ جواہر لال کے کشمیر جانے کے سخت خلاف ہیں۔ پبندت جی کے قانون میں اس کی بھنگ پڑی تو انھوں نے گاندھی جی کو لکھا۔

”میں نے وائسرائے کی چٹی دیکھی ہے۔ میں اس بات کے تذکرے سے تنگ آ گیا ہوں کہ پبندت کاک کیا سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہتہ بہتہ لاکھ اس کے شورش کے برعکس عمل کیا جائے۔ کئی مہینوں سے

آپ کے یا میرے کشمیر جانے کا معاملہ چل رہا ہے اور اب میں اس سے عاجز ہو گیا ہوں۔ میرا طریقہ اس طرح کام کرنے کا نہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ زندگی میں اس معاملے سے زیادہ کسی چیز نے میرے صبر کا امتحان لیا ہو۔ اگر ایک طرف ہندوستان کی وزارت اعلیٰ ہو اور دوسری طرف کشمیری عوام کو میری موجودگی کی ضرورت تو میں بالکسی جھجک کے اپنے عوام کے پاس جانا پسند کروں گا۔

بہر حال گاندھی جی نے سر دارملیل کے مشورے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کشمیر جانے کا فیصلہ کر لیا اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو سرنگم کی طرف چل پڑے۔ ان کے سرنگم روانہ ہونے سے قبل برادرس میں جہاں گاندھی جی تھے ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں مائوٹ بیٹن، جواہر لال اور سر دارملیل نے بھی شرکت کی۔ کشمیر اگر وہ یقیناً مجھ سے ملنے اور انھوں نے اس کا اظہار یہاں اپنے بہت سے ملنے والوں سے بھی کیا تھا۔ لیکن ایک دور دراز پہاڑی علاقے میں محبوس تھا۔ اس لیے ان کا مجھ سے ملنا ممکن نہ ہو سکا۔ وہ راولپنڈی کے راستے سے آئے اور پہلی اگست کو سرنگم پہنچے۔ اُس دن شام کو سرنگم میں حکومت نے اس خوشی میں چراغاں کیا تھا کہ گلگت پر برطانیہ کی عمل داری ختم ہو گئی تھی اور وہ کشمیر و بار کو بہال کر دیا گیا تھا۔ ان سے سرنگم پہنچنے کے چند گھنٹے بعد ہی مہارانی تارا دیوی جنھوں نے اپنے شوہر کو قحطی میں بند کر رکھا تھا۔ گاندھی جی کی قیام گاہ پر آئیں۔ وہ کار سے اتر کر ننگے پاؤں گاندھی جی کے پاس چلی گئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک طلائی طشتی میں رکھا ہوا جھاگ سے بھرا دودھ کا پیالہ تھا۔ انھوں نے کورٹیل بھالاکر طشتی گاندھی جی کی طرف بڑھا دی۔ گاندھی جی نے کہا یہ کیا ہے تو مہارانی بڑی

کہ ہمارا دستور یہ کہ جب کوئی مہاراجہ یہاں آئے تو ہم اسے دودھ پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے ایک گلاس میں لے لیا کہ ہاں میں براؤن ہو۔ گاندھی جی کا دودھ نہیں پیتا۔ سرنگم میں ان کا قیام باغات پر رہا۔ وہاں سینکڑوں کشوری لال کے مکان پر رہا۔ جہاں وہ اپنی روزانہ پراختیاس جیٹتے اور عقید کرتے اور عوام کے بھائی اجتماعات سے ملنے۔ گاندھی جی شہر اور وادی میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے انھوں نے وزیر اعظم کاگ سے ملاقات کی اور یہاں لایا جانے والے انھیں شاہی محل میں دعوت پر بلایا۔ جہاں مہاراجا نے ان کا گرم خوشی سے استقبال کیا۔ مہارانی نے ان کی آمد کی آمادگی اُٹاری اور ان کے چہرے بھی چھوئے۔ لیکن اس موقع پر گاندھی جی نے یہ شان تھی کہ اُس نے مہاراجا سے اس کے منہ پر کہا کہ تمھاری رعایا تم سے ناراض ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ گاندھی جی نے مہاراجا اور مہارانی کے پرزور حصار کے باوجود شاہی محل میں کچھ کھانے پینے سے انکار کر دیا اور مہاراجا اپنا سامنے لے کر رہ گئے۔ مہاراجا شہر کے گنجان تعلقوں سے گذرتے ہوئے ہمارے گھر مورہ بھی تشریف لے گئے۔ جہاں بیکر صاحب نے ان کا سواگت کیا اور مقدور کے مطابق ان کی خاطر تواضع بھی کی۔ گاندھی جی نے یہ پادشہانیت کے ساتھ ان کی کھاراس بندھائی اور انھیں عقیدہ نقصان سے بھی نوازا۔ گاندھی جی نے انھیں بزرگانہ سزائیں انداز میں تکلف سے بھی مگر بڑے مشورہ و پاکیزگی سے گاندھی جی کی دماغیہ مجلسوں میں صرف شرکت کی بلکہ وہاں تلاوت کلام پاک بھی کی۔ مہاراجا گاندھی کشمیر میں چھ کر گشت فرمائے۔ انھوں نے راستے واپس چلے گئے۔ ان میں انھوں نے شام کے وقت ایک پراختیاس جی اور دماغی لوگوں کے ایک وفد سے کہا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے۔ واپسی پر انھوں نے پریس کو کشمیر

کے بارے میں ایک بیان بھی دیا، انھوں نے کہا: "میں نے دیکھا کہ کشمیریوں کے دل میں شیخ عبداللہ راج کرتے ہیں کشمیر کے مہاراجا نے اپنی رعایا کو دشواریاں کھو رہا ہے۔ وہ شیخ عبداللہ کی عزت کرتے ہیں۔ ان کی سیواؤں اور قربانیوں کے سبب شیخ صاحب کو ہار کرنے سے ہی کشمیر کے عوام خوش ہوں گے۔ وہی پرجواہر لال کو اپنے دورے کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے گاندھی جی نے لکھا:۔

"میں نے وہاں پر اعتدال سمجھا میں تو کیں لیکن تقریر نہیں کی۔ جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کوئی پابندی مائد تھی۔ بلکہ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں وہاں سیاسی تقریر نہیں کروں گا۔ میں نے ریاست کے وزیراعظم کو بتایا کہ وہ عوام میں کتنا خیر مقبول ہے۔ اُس نے ہمارا جا کو کو دیکھ دیا ہے کہ اُس کے اشارے پر وہ وزیراعظم مستعفی ہو جاتے گا۔ جب میں ہمارا جاسے ملا تو مہارانی کے ساتھ اُن کا بونے والا یا نشین بھی بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی ایک ٹانگ پر پلٹر لگا ہوا تھا۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ برطانیہ کے اقتدار پر اصلی کے خاتمے کے ساتھ کشمیری عوام کے اقتدار پر اصلی کا دور شروع ہو جائے گا۔"

لگاتار جی کشمیر سے واپس جا کر معاہدہ امرتسر کو ایک دیگر ریاست پر قرار دیا اور کہا کہ اس کی مہاد ختم ہونے پر اب کشمیر کی سرورای اُس کے اصل حقداروں یعنی وہاں کے عوام کو منتقل ہونی چاہیے۔

اسی اثنا میں پاکستان اور ہندوستان کی دو ملکیتیں وجود میں آگئی تھیں۔ اور اُن کے درمیان روزِ اول سے ہی کشیدگی تیز تر ہو چکی تھی۔ فرقہ پرستی کی آگ نے مشرقی پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جہاں مسلمانوں کو کافی جاتی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اور ہندو جی آئے گئیں کہ پاکستان کے قبائلی کشمیر پر چڑھائی

کے لیے پرتول رہے ہیں۔ کشمیر میں مہاراجا حالات کے نئے رخ سے پہلے ہی پریٹان تھا۔ اس نے اپنے وزیراعظم رام چند کاک کو اُس کی ناکام پالیسیوں کی سزا کے طور پر نہایت دشمنی کے ساتھ درخواست کر دیا اور ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مہاراجا کے شتر نے پتھرے ماموں جنرل جنک سنگھ نے قائم مقام وزیراعظم کی حیثیت سے جات منجھالا اُدھر قبائلیوں کی نفس و حرکت کی خبریں براہِ آرہی تھیں۔ ان خبروں سے مہاراجا اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں کے طوطے ڈو گئے تھے۔ ہندو مہاراجا ہراساں ہو کر اپنی نجات میری رہائی میں ہی سمجھنے لگا۔ اُس کو اب نوشتہ کو پورا نذر آ رہا تھا کہ میں ہی آنے والے سیلاب کے آگے بندھنا کلام کر سکتا ہوں۔ مہاراجا پر اندرونی دباؤ بڑھتا گیا اور باہر سے بھی کانگریس کی کوششوں میں تیزی اور شدت آتی گئی۔ مہاتا گاندھی نے بھی مہاراجا کو یہی مشورہ دیا تھا کہ شیخ محمد عبداللہ ہی ریاست کو بچا سکتا ہے۔ بالآخر مہاراجا نے مجھے ربا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے بھدرہا سے بادامی باغ ہسپتال منتقل کروا گیا۔ وہاں مہاراجا کا برادر نہتی کو نہ نچت چند مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ کئی ملاقاتوں کے بعد ملے جو کہ مہاراجا کی اور میری ملاقات ہو۔ مجھے شاہی محل پہنچا دیا گیا۔ وہاں جانے سے پہلے مجھے مشورہ دیا گیا کہ ملاقات کے وقت مسین خیر گالی کے طور پر کچھ اشرافیاں مہاراجا کی خدمت میں پیش کروں۔ میں نے جب یہ کہا کہ اشرافیاں تو میرے پاس نہیں ہیں تو پندت شام سنگھ لال ورنے اپنی جیب سے کچھ اشرافیاں نکال کر میرے حواسے کیں۔ میں جب مہاراجا کے پاس پہنچا تو وہاں مہاراجا، اُس کی رانی اور جوئے والے وزیراعظم ہر چند مہاجن بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اشرافیاں مہاراجا کو پیش کیں۔ میں نے مہاراجا سے کہا کہ آپ کو جو غرض مسند لوگ اُن شبہات میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست کے مسلمان آپ کے یا آپ کے

خاندان کے دشمن ہیں وہ غلط فہمی اور بدگمانی پیدا کرنا چاہتے ہیں کوئی آپ کی نگہی جھیننا نہیں چاہتا۔ البتہ ہم ریاست کا نظام حکومت ایک آئین اور جمہوری طریقے سے چلاتا چاہتے ہیں۔ میں نے مہاراجا سے کہا کہ تازہ حالات واقعی بہت گھمبیر ہیں۔ ان کا مقابلہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ریاست کے مسائل پر عبور رکھتا ہو اور جسے اپنے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ میں نے مہرچند مہاجن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت اچھے اور لائق رنج تو ہو سکتے ہیں لیکن انہیں کثیر کے حالات کی پیدگی کا کوئی اعانہ نہیں ہے اور نہ ہی لوگ انہیں مانتے پہچانتے ہیں۔ اس لیے ان کو وزیراعظم مقرر کرنا آپ کے لیے سودمند ہوگا اور نہ ہی اس ملک کے لیے فائدہ مند۔ اس لیے میرا مشورہ بھی ہوگا کہ آپ ان کی تقرری سے گریز کریں۔ یہ بات یاد رہے کہ مہاراجا اس مرحلے پر مہرچند مہاجن کو وزیراعظم مقرر کرنے ہی وائے تھے۔ مہاجن صاحب سرور پیشیل کی ایسا پرکشش آئے ہوئے تھے اور اس وقت مہاراجا کے ساتھ اپنی ملازمت کی شرائط طے کر رہے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہرچند مہاجن کی بیوی ریاست کی تعلیم میرپور کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد لالہ بندا راج ریاست میں تھیلدار تھے اور ان کے بھائی اسکودو کے وزیر وزارت۔ اس کے علاوہ انھوں نے کانگریس کی طرف سے اس باؤڈری کمیشن میں کام کیا تھا جس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی حد مقرر کی تھی۔ بہر حال ملاقات ختم ہو گئی۔ میں واپس بادامی باغ آ گیا اور ۱۹۲۹ء ستمبر ۱۹ کو مجھے راج کر دیا گیا۔ تین سال کی قید کے بدلے مجھے صرف ایک سال چار ماہ اور گیارہ دن کے بعد ہی آزاد کر دیا گیا تھا۔ بعد میں جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں کہا کہ حالات نے مہاراجا کو ان کی مرضی کے خلاف شیخ محمد عبداللہ کو راج کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سرنگرنہ کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے میرا پر جوش

استقبال کیا۔ چوتھ بل ویر سے مجھے ایک شاندار وادی جلیوس میں لے جایا گیا۔ میں ایک آلی کرند سے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس کو وادی پوش ملتان کھینچ رہے تھے۔ اس کے آگے پیچھے سینکڑوں کشتیاں جاری تھیں دریا کے دونوں کناروں پر مردوں اور عورتوں کے بچوں کے ٹھکانے کے ٹھکانے جوئے تھے۔ جن کے خوش آمدید کے بولوں اور نعروں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ سو اکتوبر کو حضور ی باغ میں ایک بہت بڑا عوامی اجتماع ہوا جس میں خواجہ سعد الدین شال نے سرنگرنہ کے شہریوں کی طرف سے ایک خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ میں نے اپنی جوابی تقریر میں کہا: ”مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کہوں گے مہاراجا کیا کیا تھا اور کیوں راج کیا گیا۔ میں ایک سال سے زیادہ عرصے تک اپنے عوام سے دور رہا ہوں اور تقریبی سے بدے ہوئے حالات سے الگ تھلک۔ میں وقت میں جیل گیا اس وقت پر مغیر ایک وعدت تھا۔ آج یہ دو گزروں میں بٹ چکا ہے۔ بکثیری عوام کو دیکھنا ہے کہ انھوں نے جس خواب کے لیے قربانیاں دی ہیں، وہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ ہم وہی راستہ اختیار کریں گے جو کشمیریوں کی آزادی، خوش حالی، نجات اور ترقی کی منزل کی طرف جاتے گا۔ غلامی کی صورت میں کوئی فیصلہ کرنا لیکن نہیں ہے۔ البتہ ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت فراہم کی جانی چاہیے جو اس نازک سوال پر ریاستی عوام کے حقوق و مفادات کی نگہبانی کے لیے جتنا مناسب راہ عمل اختیار کرے۔ ہم اجماعی کا فیصلہ اندرونی آزادی حاصل کیے بغیر نہیں کر سکتے۔ اس لیے مہاراجا اگر یہ ہے کہ ان حالات سے پہلے آزادی۔ ایک اور پبلک پلس میں ابھی دنوں میں اس سلسلہ میں اپنے فیالات یوں ظاہر کیے۔“

”اس وقت ریاست جموں و کشمیر کے سامنے یہ سوال ہے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ اجماعی کریں یا پاکستان کے ساتھ یا الگ تھلک رہ کر آزاد رہیں۔“

یہ حقیقت ہے کہ میں آل انڈیا اسٹیشن بیلوڈز کانفرنس کا صدر مہمان چریکی پالیسی بالکل واضح ہے۔ چنندت جو اہل لال میرے بہت قریبی دوست ہیں اور گاندھی جی کی میرا عزت کرتا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے ہندو تحریک کی بڑی مدد کی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اہل لال کے سنی کے سب سے بڑی کسوٹی یہاں کے عوام کے مفادات ہوں گے اور میں اس میں حائل نہ ہوں گا۔ ہمارا سب سے پہلا فریضہ اس وقت دوسرے نقطہ سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگر یہاں کے لوگ پاکستان سے اہل لال کرنے کا فیصلہ کریں تو میں سب سے پہلا آدمی ہوں گا جو اس کو تسلیم کرے گا۔

جن میں نے ساتھ ہی اپنے بیادوی قضا کا اعادہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر ہم نے پاکستان کے ساتھ اہل لال کا فیصلہ کر بھی لیا تو اس دو قومی نظریے پر ہم کبھی بھی ایمان نہ لائیں گے جو آج سارے ملک میں اس درجہ زہر پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔“



طوفان سے پہلے

میری رہائی کے ساتھ ہی نیشنل کانفرنس کے دوسرے لیڈروں اور کارکنوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے جو ساتھی ریاست سے باہر گئے ہوئے تھے وہ آہستہ آہستہ واپس لوٹنے لگے۔ خواجہ محی الدین قزوینی روپوشی ترک کر کے منظر عام پر آگئے۔ میں نے دھیرے دھیرے جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر سے اکٹھا کرنا شروع کیا اور جماعت کو دوبارہ منظم کیا۔ مجاہد منزل تو ہمارا صدر دفتر تھا لیکن ہم نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر شہر کے دماغ امیر اکدل کے بڑے چوک میں جو بعد میں لال چوک کہلایا، واقعہ پلڈیم سینما میں اپنا کارگزار دفتر قائم کیا۔ چونکہ ریاست کے انتظامیہ کی باگیں ڈھیلی پڑ رہی تھیں اور آنے والے دنوں کے چر آشوب امکانات نے ہمیں اندیشہ ہائے دُور دراز میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے ہم نے اندرونی امن و امان اور شہریوں کی عزت و عصمت اور جان و مال کی حفاظت کے لیے ایک رضا کار تنظیم بنانے کی کارروائی بھی شروع کر دی۔ میں نے اس تنظیم کی فرض و غایت خاتما معلق کے اس پہلے میں بیان کی جو میری رہائی

کی تہنیت میں ملایا گیا تھا۔ دستار بندی کے بعد میں نے اس تنظیم میں عوام کو بلا خاندانندہیب وملت شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد یوں بیان کئے۔

۱۔ سلامتی فوج کے سامنے ملک کثیر کی آزادی اور اس کے ناموس کی حفاظت مقدم ہوگی۔

۲۔ سلامتی فوج کے رضا کاروں پر ملک کے لوگوں کی عزت و عصمت کی حفاظت کا فرض لازم ہوگا۔

۳۔ رضا کاروں کو مسلم اکثریت پر یہ امر واضح کرنا ہوگا کہ غیر مسلم اقلیت کی حفاظت دصورت فرض اولین ہے بلکہ اسلام کے صحیح اصولوں کا حقیقی تقاضا بھی ہے۔

۴۔ رضا کاروں کو مستعد رہنا ہوگا کہ فترتہ وارانہ منافرت کا کوئی موقع پیدا نہ ہونے پائے اور باہمی چپقلش اور غلغلہ کے رجحانات سر نہ اٹھانے پائیں۔

اُدھر سرحد پار سے قتل و شکارِ اِسلامات آرہی تھیں۔ مغربی اور شرقی پنجاب میں خون کی بولی کھیلی جا رہی تھی۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں صرف ہماری ریاست

دارالامان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے ہندو مسلم، سکھ پناہ گزین ریاست کی سرحدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ مہاراجا کی حکومت نے ہند اور پاکستان سے موجودہ حالات کو قائم رکھنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیش کش کی تھی۔ حکومت ہند نے اس کا کوئی

جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اُس وقت ہند کے ساتھ کشمیر کا کوئی براہِ راست رابطہ نہ تھا۔ لیکن پاکستان کے ساتھ ڈاک خانوں وغیرہ کے واسطے میں سمجھوتہ ہو گیا تھا۔

اور ڈاک و تار کا سارا انتظام پاکستان کے محکمہ ڈاک و تار نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن جب ہم اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام پر سرسنگر کے ڈاک خانہ پر پاکستان

کا سربراہی جنرل اٹھرایا گیا تو قائم مقام وزیراعظم جنرل ملک سنگھ کو یہ بات ناگوار گذری اور انھوں نے یہ جھنڈا نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ پاکستان کی طرف سے

ایک خاص ایچی مہاراجا کو پاکستان سے اہاق پر آمادہ کرنے کے لیے سرسنگر آیا لیکن اس کی گفتگو نڈرھے نہیں چڑھی۔ حالانکہ اس سے قبل رام چند کاگ نے اپنی وفات

انفصالی کے زمانے میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے ساتھ پاکستان کے ساتھ

اہاق کے بارے میں بلیں چرمائی تھیں۔ مہاراجا کو مہاراجا کی روش چند نہیں آئی اور اُس نے ریاست کی وراثت نہ من میں ملک، پٹنوں اور نڈالی جناس

شامل تھیں، راولپنڈی میں روک لیں۔ کشمیر میں امپیریل بینک کی شراکت کو کرنسی نوٹوں اور سرکاری کی سہم رسانی بھی شراکت لگی۔ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ

جو راستے ملا تھے وہ سب پاکستان سے ہو کر جاتے تھے۔ اس لیے صورت حال کشمیر بڑی تھی۔ مہاراجا کی حکومت نے پاکستان کی اس روش پر احتجاج کیا لیکن

حالات بگڑتے ہی گئے۔ اُدھر پاکستان کے ارباب اقتدار نے دو نمائندے ہم سے بات چیت کے لیے سرسنگر روانہ کیے۔ ڈاکٹر محمد وین آفیر اور شیخ صادق حسن یہ دونوں حضرات

کشمیری نژاد تھے۔ ڈاکٹر آفیر لاہور کے ایک امیر کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے لیے ایس پی کالج سرسنگر کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ ان دونوں ہائی

ان سے کافی راہ و رسم بھی پیدا ہو گئی تھی۔ مؤرخہ الذکر امرتسر کے ایک ممتاز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور تاملین بنانے کے ایک بڑے کارخانے کے مالک

تھے۔ تقسیم کے بعد یہ لاہور میں مقیم ہو گئے اور پنجاب مسلم لیگ کے صوبائی صدر بنادیتے گئے میں ان دونوں اصحاب سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلکہ شیخ صادق حسن

نے تحریک کی ابتدا میں کشمیر اگر ہماری بہت بھی بندھائی تھی۔ چنانچہ میرے مگر مورہ میں ان کی میری اور خواجہ غلام احمد عثمانی کے ساتھ ایک مستقل مساکات ہوئی اور آخری آدمی کی باتوں سے فراغت پانے کے بعد میں نے شیخ ماسوق حسن سے پوچھا کہ یہ حیثیت ایک کشمیری کے آن کا کیا مشورہ ہے کہ ہم کس طرٹ اپنے مستقبل کا تعین کریں؟ شیخ صاحب نے بڑی صامت گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ یہ حیثیت کشمیری کے دو سہی پسند کریں گے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ رشتہ جوڑیں اور نہ پاکستان کے ساتھ بلکہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہیں۔ کیونکہ دونوں جانب کے حالات انتہائی خراب ہیں۔ لیکن یہ حیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ کے وہ چاہیں گے کہ کشمیر کا رشتہ پاکستان کے ساتھ ہی قائم ہو۔ میں نے جواب میں کہا کہ ہم ابھی ایک شخصی نظام کے نظام میں اور قدامتوں کا فیصلہ مناسب نہیں چاہیں پہلے اپنی ریاست میں آزادی ملنی چاہئے اس کے بعد ہی ہم اس امر کا تعین فیصلے کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہو سکتے ہیں۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ ہماری تحریک کے متعلق ماضی میں مسلم لیگ کا جو بھی رویہ رہا وہ ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہ ہوگا۔ اسی طرح پرنٹ حواہر لال سے دوستی اور کانگریس کی وہ امداد جو آئسٹن نے ہماری تحریک کو دی ہے، ہمارے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اگر ہم یہ محسوس کریں کہ چالیس لاکھ کشمیریوں کا مستقبل پاکستان کے ساتھ اطمینان کرنے سے ہی روشن ہو سکتا ہے۔ تو ہم اس سے گریز نہ کریں گے۔ لیکن ہم کسی بھی صورت میں یہ پسند نہیں کریں گے کہ ہم پر کوئی قبضہ نافذ کیا جائے۔

ڈاکٹر تاثیر نے اپنی گفتگو میں پاکستان سے اطمینان کرنے پر سخت زور دیا اور اس مسئلے میں ہمیں علحدہ قدم چھانے کی ترغیب دی۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ وقت

اس اہم سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے مؤثر نہیں ہے۔ ہم ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل میں ہندوستان اور پاکستان میں کس قسم کے نظام کا نقشہ ابھرے گا اور دونوں ملک میں حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟ اس وقت آپ کے مسئلے ان دونوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ آگ بجھائے میں یہ وہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں، ایسے حالات میں ہم سے توقع رکھنا کہ ہم فوراً اپنے مستقبل کا تعین کریں، قرین انصاف نہیں ہے۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک آگ بجھ نہیں جاتی۔ کیونکہ ہم امن و سکون کے ماحول میں ہی اس سوال کو مناسب طریقے سے حل کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ صرف ہماری موجودہ نسل پر ہی اثر انداز ہوگا بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ دانشمندی کا امتیاز یہ ہے کہ ہم کو ابھی ہمارا جاکی شخصی حکومت کے چنگل سے آزاد ہونے کا موقع فراہم کیا جائے تاکہ بعد میں یہاں کے ہندو، مسلمان، سکھ مل بیٹھ کر فیصلہ کر سکیں کہ وہ ہند سے رشتہ جوڑیں یا پاکستان سے اطمینان کریں یا آزاد رہیں۔ اس لیے اس وقت اس سوال کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم پر دباؤ ڈالنا زیادتی ہے۔ وقت آنے پر یہاں کے لوگ اس سوال کا فیصلہ کریں گے اور دونوں مملکتوں کو یہاں کے عوام کی خواہشات کا احترام کرنا ہوگا۔ اس پر ڈاکٹر تاثیر بولے کہ ہم تو اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ ریاست کشمیر پاکستان کا ایک حصہ بن کر رہے گی میں نے جواب دیا کہ کشمیری عوام نے تو حق آپ کو نہیں سونپا۔ مسئلہ میں جب ہم نے تحریک کشمیر شروع کی تو ہم نے کسی بھی طاقت کو، چاہے وہ مسلم لیگ کی ہو یا ہندو اکثریت کی، یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ ہمارے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ ہم اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے کسی دوسرے کے ہاتھوں میں یہ امانت سپرد نہ کریں گے۔



”میرے شعر میں بجلی کے جوتھر“ مشہور کارٹونسٹ آراء کے کشمن کی نظر میں۔
 ریشتر، ٹائمس آف انڈیا



مراد بی ڈیسائی کے ساتھ۔



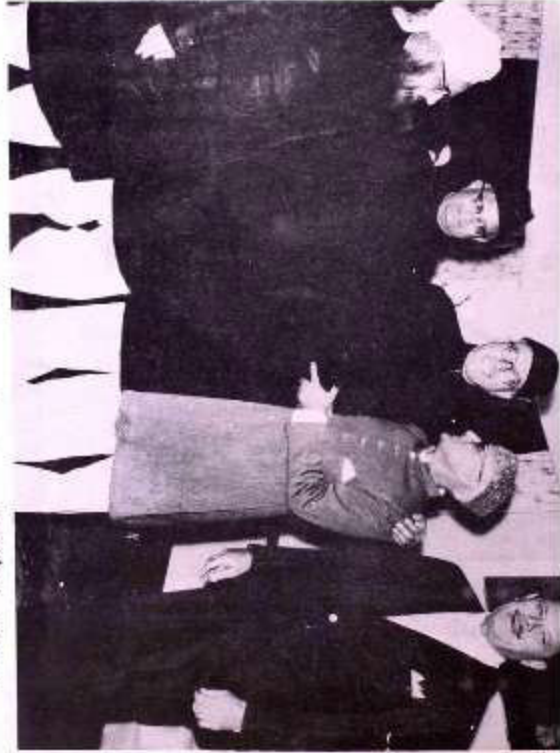
وزیر خارجہ اٹلی (سارڈ) اجناسائی کے ساتھ۔



صدر مسلم لیگ قیامی کے ساتھ



بیٹوں آمو کے ساتھ



اسلام آباد ۱۹۶۲ء: صدر ایوب خان، چودھری غلام عباس اور وزیر اعلیٰ وفاق شہدائے



۱۹۶۴ء: وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق جیل سے رہائی پر استقبال کر رہے ہیں۔

اس پر ڈاکٹر تاثیر لے کر آپ اس صورت میں جس تحریری طور پر یقین دلائیں کہ آپ وقت آنے پر ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کرنے پر رضامند ہوں گے میں نے جواب دیا کہ یہ تو حالات پر منحصر ہوگا اور یہاں کے رہنے والے باشندوں کی آزادانہ رائے اور رضا پر۔ میں ان سے یہ حق پہلے سے ہی جھیننے کا ہقدار ہوں نہ روادار۔ تاثیر صاحب اس پر حیلماہٹ کاٹ کر لکھ بول گئے اور انھوں نے تھکانہ لہجے میں جس میں طاقت کا غور و جھلک رہا تھا کہا کہ اگر میں ان کا ہنا مانتا ہوں تو وہ پھر دوسرے ذرائع استعمال کریں گے مجھے بھی اس پر غصہ آگیا اور میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا کہ آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن اگر آپ نے زور زبردستی کا راستہ اختیار کیا تو پھر آپ ہماری لاشوں پر ہی تشریف حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال شیخ صادق حسن اور عثمان صاحب نے مذاہلت کی اور ہمیں مذاق میں یہ بات ٹھوکر دوہر کرنے کی کوشش کی۔ معاملہ وہیں پر ختم ہو گیا۔ البتہ دونوں نے مجھے لاہور آنے اور وہاں جناح صاحب سے ملنے اور زور برداشتہ کرنے کی دعوت دی۔ میں نے دعوت کو قبول کر لی لیکن مجھے لاہور جانے سے پہلے دہلی کا رخ اختیار کرنا پڑا میری اسیری کے زمانے میں جیسے آل انڈیا اسٹیشن پیو پلڈ کانفرنس کا صدر تین لیا گیا تھا۔ چونکہ یہ کاروائی میری عدم موجودگی میں آئی تھی اس لیے اپنی نجی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے وہاں میرا جانا ضروری تھا۔ ابھر دیباستوں کو درپیش اہم ترین معاملات پر غور کرنے کے لیے میں نے کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس بھی بلایا تھا۔ مبادی پاکستان کے رہنماؤں کو میرے دہلی جانے سے کوئی غلط فہمی ہو میں نے اپنے اس قصد سفر کی اطلاع پاکستان کے وزیراعظم کو دیدی اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ دہلی سے واپسی پر میں بذات خود اُن سے ملنے کے

لیے آؤں گا اور اپنا نقطہ نظر اُن کے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے علاوہ دہلی روانہ ہوتے ہوئے میں نے اپنے ایک مستعد ساتھی خواجہ غلام محمد صادق کو پاکستان کے رہنماؤں کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لیے لاہور بھیج دیا۔ میں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی پہنچا۔ جواہر لال کے ساتھ جیل کے باہر یہ میری پہلی ملاقات تھی وہ اب وزیراعظم بن گئے تھے۔ لیکن وہ دوستوں کے دوست بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسوم و آداب کی تمام قیود نظر انداز کر کے بذات خود دہلی کے ہوائی اڈے پر میرا استقبال کیا اور مجھے گاڑو آت آت کی سلامی بھی پیش کی گئی۔ مجھے دہلی میں وزیراعظم کے خاص مہمان کی حیثیت سے اُن کی ہی رہائش گاہ پر ٹھہرایا گیا اور وہاں میں نے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا۔

”کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اور امن و سکون کی فضا میں کرنا چاہیے ہیں۔ اگر کسی طرف سے ہم پر کوئی زبردستی کا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو ہم بغاوت کریں گے۔ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے ہمارا جاگو نہیں عوام کو کرنا ہے اور جب تک اُن کو اندرونی طور آزادی نہیں ملتی وہ کوئی فیصلہ کرنے سے تیار نہیں“

ایک طرف تو ہندوستانی رہنماؤں کا یہ رویہ تھا۔ جس میں ممکن ہے اُن کی دوراندیشی کی حسیلیتیں بھی شامل رہی ہوں دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کو عجیب پریشانی نے گھیر رکھا تھا۔ جناح صاحب اور مسلم لیگ نے کشمیر کی تحریک کے تئیں جو معاندانہ اور محفلانہ رویہ اختیار کر رکھی تھی اُس نے اُن میں ایک احساس جرم پیدا کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں عموماً کہتے تھے کہ اگر کشمیر یوں سے آزادی کے ساتھ الحاق کے معاملے پر مانے حاصل کر لی گئی تو صوبہ سرحد کے برعکس

کثیر میں فیصلہ اُن کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ وہ تیشل کانفرنس کی مقبولیت اور عوامی قوت کا خوب اندازہ کر چکے تھے۔ اسی لیے وہ مہاراجا کو بھی گانچ کر کشمیر کو چھپ کر لینا چاہتے تھے۔ اور کشمیری عوام اور اُن کے نمائندوں سے بات چیت کرنے میں، یعنی سمجھتے تھے۔ اُدھر مہاراجا جاتے تذبذب دکھانا شروع کیا اور اس کے دل میں اپنی اگلی سلطنت قائم کرنے کا خیال رچ بس گیا۔ چنانچہ جب جون مشنریز میں ماؤنٹ بیٹن کشمیر آیا تو اس نے مہاراجا کو صلاح دی کہ اُس کی ریاست کی آبادی کی ترکیب یوں تو پاکستان کے ساتھ اُملاق کا تقاضا کرتی ہے۔ لہذا وہ اگر راضی ہے تو پاکستان سے اُملاق کا اعلان کر دے لیکن مہاراجا نے چپکاپاٹ دکھائی۔ اسی پراؤنڈ میٹنگ نے کہا کہ پھر ہندوستان کے ساتھ اُملاق کر لو یہاں وہ فوج کا ایک ڈویژن فوراً برہاں بھجوا دوں گا تاکہ کسی کو شرارت کی نہ سوجھے لیکن مہاراجا پھر بھی چپ رہا اُس کا دماغ اس قدر ماؤنٹ بیٹن کو جس وقت ماؤنٹ بیٹن دہلی واپس جانے کے لیے مہاراجا سے ملنے کے لیے آیا تو مہاراجا جانے کہو ابھیجا کہ میرا پیٹ خراب ہے اور ڈاکٹر نے مجھے کہی ہے کہ اس سے ملنے سے منع کر دے۔ مہاراجا جو دراصل اس سیاسی جہادی کی آڑ میں کوئی دو ٹوک جواب "نہیں" دے رہا تھا۔ پاکستان کے حکمرانوں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو انھوں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو معاملہ مستعربا رستے پر آجائے جس میں پاکستان کی جیت کا امکان نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیریوں کو اس حق سے محروم کرنے کے لیے دروازہ دستی کاراستہ اختیار کرنے کی مہم کی۔ صوبہ سرحد کے مستعربا سے متعلق یہ کہنا ہے محض یہ ہو گا کہ وہاں الیک نے اُس لیے جیت حاصل کر لی کہ خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار جماعت نے مستعربا میں حصہ نہیں لیا۔ اُن کے حصے نہ لینے کی وجہ تو یہ بھی تھی کہ وہ ہوا کارش دیکھ رہے

تھے اور کچھ یہ بھی کہ انھیں کانگریسی قیادت کے روئے سے مایوس، محسوس اور بیزاری کا احساس ہو گیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ مگر کانگریس کا ساتھ دینے کے بعد کانگریسیوں نے انھیں اپنی گدڑی سنبھالے ہی مگر کچھ کے آگے پھینک دیا ہے۔ اسی لیے وہ مستعربا میں پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان سے اُملاق کی تجویز پیش کرنے پر خود بھی آمادہ اور مطمئن نہیں تھے پاکستانی حکمرانوں کے اندازہ نگاری ترجہان کرتے ہوئے پاکستانی حکومت کے ترجہان "ڈان" کو اس نے انہی دنوں یہ دھکی آمیزا داری لکھا۔ "وقت آیا ہے کہ مہاراجا کشمیر کو بتایا جائے کہ وہ پاکستان میں شامل ہو جائے۔ اگر اس نے لیت و مل سے کام لیا تو اُس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہونا ناگزیر ہوں گے۔"

اسی دوران پاکستان کے صوبہ سرحد اور فوجی علاقوں سے جیسے قدیم زمانے میں گاندھارا کے نام سے مہلکارا جاتا تھا، قبائلیوں کے پرے کے پرے کشمیر کی طرف بڑھنے لگے اور مظفر آباد تک پہنچ گئے۔ سرنگر میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مہاراجا کے پاس تحلیل فوج تھی۔ جو اس نے مختلف علاقوں میں بھیلادی اور فوجی استقامت کرنے لگا۔ اُدھر پونچھ اور میر پور وغیرہ میں بٹے متفق ہوئے جن میں جمادین منظور موہن، ان تھادویر کے ذریعے مہاراجا سے استدعا کی کہ وہ ریاست کا اُملاق پاکستان سے کرے۔ پونچھ میں جب حالات نے بدل گیا تو مہاراجا کو مشورہ دیا گیا کہ وہ خود پونچھ کا دورہ کرے۔ چنانچہ مہاراجا اپنی فوج کے انگریز جیت آن دی سٹاٹ جنرل اسکاٹ کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ پونچھ پندری وغیرہ کے اکثر لوگ فوجی ملازمت میں تھے کچھ ریاستی اور کچھ ہندوستانی فوج میں۔ کیونکہ پونچھ فوجی سہری کا بڑا ذخیرہ میدان تھا۔ وہاں کے سابق اور موجودہ فوجیوں نے اپنی

وردی میں ملبوس ہو کر امدان پر اپنے میٹل اور تختے چکاتے ہوئے فوجی طریقے پر مہاراجا کا پڑجوس استقبال کیا۔ لیکن یہ قسمی سے مہاراجا کی سطح میں رنگا ہیں جہ تک نہ جا سکیں اور اس نے رسمی استقبال کا بالکل غلط مفہوم افاد کیا اس نے ان کی مثبتیت کا جواب غرور اور نخوت سے دیا۔ پاکستان سے الحاق کرنے کا جو مطالبہ انھوں نے کیا تھا مہاراجا نے اس کو گستاخی پر محمول کیا اور انھیں مزہ کھانے کے لیے اپنی فوج بھیج کر ان پر شدید مظالم توڑے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ گھوڑوں کو آگ لگوا دی گئی اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کشمیر فوج میں وہاں کے لوگ متلاطم تھے ان میں ان واقعات سے بڑی تشویش پھیل گئی۔ ان واقعات کی سداے باز گشت ہمارے کانوں تک بھی پہنچی۔ ہم نے بھی وہاں حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے اپنے کچھ نمائندے بھیجے۔ یہ نمائندے واپس آئے تو انھوں نے دردناک واقعات کی بڑی ونگڈانز رپورٹ پیش کی۔ چنانچہ ہم نے بھی ان مظالم کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو دروازہ دستیاں بند کرنے کی صلاح دی۔ میں نے دلی میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب قباکی حملہ آور منظر آد کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پونچھ کے سوال پر ایک اخباری کارفرنس میں کہا۔

”پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مہاراجا کے مظالم کا براہ راست نتیجہ ہے وہاں کے لوگوں کو ان مظالم کے خلاف احتجاج کا پیدائشی حق حاصل ہے اور ان کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے۔ اور مہاراجا جانے ان پر فوجی بیٹا کر کے وہاں حالات کو تباہی کے دہانے پر لایا ہے۔“

میں نے مسلمانان کشمیر کی نفسیاتی کیفیت کی تصویر پیش کرتے ہوئے کہا۔

”پنجاب کی مسلم اکثریت والی ریاست کپور تھلہ میں اب ایک مسلمان اکثر نہیں آتا۔ یہی حال اورا بھرتیور وغیرہ ریاستوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہوا ہے اس لیے کشمیر میں اگر کچھ لوگ ان اندیشوں میں گرفتاریں کہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا تو اس کو ہمدردی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

آدھ مہر حید بہا جن اور ان کے نائب رام لال بترہ نے جو ایک پنجابی اور کفر آریہ سماجی تھا کشمیری پنڈت رہنماؤں کو بل کر انھیں ہندو تین اور دوسرے مسلمہ جات کی پیش کش کی تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ مجد اکا ٹھکرے کے کشمیری پنڈت رہنما مہر چند جی کے اس جھگڑے میں نہیں آئے۔ انھوں نے اپنے نادان مہربانوں کو جواب دیا کہ ان کی حفاظت کے لیے ہتھیاروں سے زیادہ اکثریت کی خوشنودی کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ ہتھیاروں کے اس تحفے کو اپنے ہی پاس رہنے دیں۔

حکومت برطانیہ نے ریاستوں کے سربراہوں کو یہ اختیار دیا تھا کہ اگر کسی وجہ سے وہ یوم آزادی یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ نہ کر پائیں انھیں دونوں ملکوں کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے جوں کا توں معاہدہ (STAND STILL AGREEMENT) کر لینا چاہئے تاکہ رسل و رسائل اور ڈاک و تار کا وسیلہ برقرار رکھا جائے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مہاراجا نے پاکستان کے ساتھ تو معاہدہ کر لیا لیکن ہندوستان نے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے یہ شرط لگائی کہ پہلے مہاراجا کو سیاسی قیدیوں کو رہا کرنا چاہئے۔ مہاراجا اس پر راضی نہ ہوا اس لیے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ نہ ہو سکا۔ پاکستان کو اس معاہدہ کی رو سے ڈاک و تار کے شعبے پر بالادستی حاصل ہوگئی۔ چنانچہ سرہنگر کے ڈاک خانے اور تانگہ رو پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا گیا اور ملازموں سے

پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں جانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اکثر مسلمان ملازمین نے جب پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتے دیکھا تو وہ کچھ کے الحاق کا فیصلہ ہو چکا ہے اور انھوں نے اپنی رضا پاکستان کے حق میں ظاہر کی۔ لیکن معاہدے کی رو سے وہ چھ مہینے کے اندر اندر اپنے اس چناؤ OPTION کو بدل بھی سکتے تھے۔ ستم ظریفی ملا حظہ ہو کہ جب پاکستان ہندوستان نے ان ملازمین کی رائے جاننے کی پرواہ ہی نہیں کی۔ لہذا ان بے چاروں کو ملازمت سے ہی نکال باہر کر دیا۔ یہ بات بھی شروع میں ہی میرے اور ہندوستان کے درمیان کئی کی ایک وجہ بن گئی۔



(۳۶)

دروں خانہ ہنگامے تھے کیا کیا

پنڈت رام چند کاک کار ریاست کی وزارت اعلیٰ تک پہنچ جانا کمال کی بات تھی۔ انھوں نے حکمہ آثار قدیمہ میں ایک معمولی عہدہ سے ملازمت شروع کی تھی بعد میں ریاست کے چیت سکریٹری، وزیر حضور اور وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ سر لی۔ این۔ راؤ کے علاوہ جو بھی وزیر اعظم کشمیر آیا وہ زیادہ دیر تک یہاں تک نہ سکا۔ سر مہاراج سنگھ آئے اور چند ہی مہینوں میں بسترہ گول کر کے چلے گئے۔ سبھی حال کر لی ہاکس کا بھی ہوا۔ ان کے بعد رام چند کاک وزیر اعظم بنائے گئے۔ یہ کشمیری بونے والے پہلے شخص تھے جو ڈوگرہ شاہی میں وزارت اعلیٰ کے مرتبے تک پہنچ جانے میں کامیاب ہوئے۔ تھے تو وہ کشمیری پنڈت لیکن اپنے نمونہ طبقہ کی نہ تو ان میں طبعی تھی نہ نرمی اور نہ انکسار۔ یہ بڑے شہد خواہ اور اکڑوٹوں کمرے والے سبن تھے انہی کے زمانہ اقتدار میں بیگ مقاصد کو مہاراجے کی محکومت سے استعفیٰ دینے کے سوائے کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آیا تھا۔ اور انہی نے میاں احمد یار خاں کو ساز باز سے اپنے شیشے میں آثار لیا تھا۔ اور پارٹی کے

قبیلے کے خلاف ایک صاحب کی جگہ سنبھالنے پر تیار کر لیا تھا۔ رام چندر کاک کے تعلقات ہمارا جا کے ساتھ کس قسم اور نوعیت کے تھے۔ وہ تو میں بتا نہیں سکتا لیکن یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے خاصے تھے۔ غالباً اپنی فہم و فراست اور دیکھ بھال کے سبب وہ بھانپ گئے تھے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ یہ پاکستان کے ساتھ آخر کار الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے وہ اپنا راستہ ہموار کرنے کی فکر و دو میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے جناح صاحب اور طاقت علی خاں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ ہمارا جا اگرچہ رنگین طبیعت کے مالک تھے لیکن جہاں ان کے ذاتی اور خاندانی مفاد کا سوال آتا تھا، وہ بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ کاک صاحب کے یہ تصور دیکھ کر غالباً انھوں نے کاک کو مذاہمتہ اعلیٰ سے چلنا کر دیا۔ اراکستہ یعنی پاکستان کے قیام کے صرف چار دن پہلے وہ شیر گدھی میں اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارا جا کا ایک اے، ڈی، سی ایک شکار گاہ سے جہاں ہمارا جا شکار کھیلنے کے لیے گیا تھا ایک بھڑکند ایفاد لایا۔ کاک نے لفافہ کھول کر غلط پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس میں ان کو فوری طور پر خواست کرنے کے احکامات درج تھے۔ جب رام چندر کاک کو نوٹ بیٹو وار نظر آیا تو اس نے ہوائی جہاز کے ذریعے ریاست سے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ لیکن ہمارا جا نے اسے ہوائی اڈے پر ہی گرفتار کر دیا۔ اور اس کی جگہ جنرل جنک سنگھ کو وزیراعظم بنایا۔ پنڈت رام چندر کو سرنگر سنٹرل جیل میں بند کر دیا گیا اور ان کے خلاف کچھ مقدمے بھی دائر کر دیئے گئے۔ جنک سنگھ نے اس کے خلاف بعض الزامات کی تحقیقات کے لیے ایک

انکوائری بھی بٹھادی۔ خود ہمارا جا کشمیر کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ اول اول تو ہمارا جا کو بہت اعتدال پسند، لیبرل اور مذہبی تعصب سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کا میل جول بھی زیادہ تر مسلمان صحابیوں اور دہاروں کے ساتھ رہتا تھا۔ جن میں نواب خسرو جنگ، عبدالرحمن آفندی اور صاحب زادہ نور محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جب ہندوستان میں شجری اور تبلیغ کی تحریکوں کا زور ہوا اور خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار "مناوی" میں یہ خبر چھاپ دی کہ ایک بڑی ریاست کا ہندو ہمارا جا مذہب اسلام قبول کرنے ہی والا ہے تو ہندوؤں کے ایک بڑے طبقے میں یہ تشویش پھیل کر ہوئی کہ ہمارا جا کشمیر ہی ہوگا۔ چنانچہ ہمارا جا کے گرد انھوں نے زبردست گیر آؤالا ان کے تعلقات آریہ سماج کے ساتھ بڑھتے چلے گئے۔ آریہ سماج کے چالاک ایجنٹوں نے ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کیے اور آخر کار انھیں مسلمان دشمن بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان حالات میں جب نئے وزیراعظم کی تلاش شروع ہوئی تو ان کی نگاہیں آریہ سماج کی صفوں کو تانے لگیں۔ اس پس منظر میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سردار شیل نے مہر چند مہتا میں اور رام لال بٹو کو کشمیر میں اقتدار کے سنگھاس پر بٹھوایا۔ الحاق کے بارے میں ہمارا جا کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی ریاست کو دونوں نوزائیدہ ملکوں سے الگ رکھ کر آزاد رکھے۔ چنانچہ اس نے سوڈہ الحاق پر دھنکڑ کرنے سے پہلے لاہور مذاہمتہ میں کو جو غلط لکھا اس میں اس بات کا برملا اظہار کیا کہ کشمیر کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی آبادی کی حیثیت ترکیبی کے پیش نظر اس کی اپنی خواہش آزاد رہنے کی تھی۔ بعد میں پاکستان نے اپنی کوتاہ اندیشی میں حاکم کے ہمارا جا کے اس خواب کو سمار کر دیا اور خود اس کے الفاظ میں

اُن کے بیٹے اس بات کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اِحقاق کر کے اُس سے فوجی معاونت مانگے۔ لیکن اِس طرح واقعات کے باوجود فرقہ پرست ہندو پر اس آج تک برابر چلا آ یا ہے کہ میں کشمیر کا سلطان بننے کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے ریاست کی اُپن سازا سبلی کے اِقتضائی اجلاس میں اِحقاق کے مسئلے پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اِظہار کیا ہے لیکن سادوں کے اندسے کو ہر اِنی ہر اِنظر آتا ہے۔ اِسی طرح فرقہ پرستی کے یہ رِتان میں شبہا لوگوں کو ہر چیز جلی گئی ہے اِصغین حقائق سے تو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ گوئیبل کے اِسی فلسفے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ ”بعوث کہتے جاؤ نہ کہتے چلو“ کچھ نہ کچھ تو چپک جائے گا اور بالآخر لوگ اِسی کو سچ ماننے لگیں گے۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں دہلی سے واپس سرنگر لوٹ آیا۔ صادق صاحب قبائلی جیلے میں ۲۲ اکتوبر سے صرف ایک دن پچھلا سوڑ سے سرنگر پہنچ چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان سے وہ بڑی مشکل سے نکل پائے تھے کیونکہ وہ اُنھیں پر خاں بنا کر وہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب پاکستانی حکمران اپنے وطن کی سرزمین پر میرے نمائندے کے ساتھ میرے دُورہ کراچی کی تفصیلات کے کر رہے تھے، اُن کے بھیجے ہوئے حملہ آور کشمیر کی دھرتی کو روندنے اور کشمیریوں کے حقوق کو پامال کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہے تھے۔ لاہور میں اُن کی ملاقات پاکستان کے وزیراعظم کے ساتھ نہ ہو سکی۔ اور اُنھیں صرف نواب افتخار حسین مدوٹ بھیجے دوسری صفت کے لیڈر سے یہ مسئلہ پُر اکتفا کرنا پڑا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا۔ وہ ہر قیمت پر یقین دہانی اور اعلان چاہتے تھے کہ کشمیر کا اِحقاق صرف پاکستان کے ساتھ ہی ہوگا۔ جو ہماری بے شدہ پالیسی کے مطابق ممکن نہیں تھا۔ اس سے قبل بخشی غلام محمد بھی

نواب محمد رُٹ، ممتاز دولتانہ وغیرہ سے میل آئے تھے۔ اور اُنھوں نے بھی یہی رِٹ لگائی تھی۔ صادق صاحب کے ذریعے پاکستانی رُخمان نے مجھے وہاں آنے کا بُرا دُعا بھیجا وہ چاہتے تھے کہ میں کراچی جا کر محمد علی جناح سے ملوں اور خود اُن کے ساتھ گفتگو کروں۔ آمدورفت کا انتظام پاکستانی حکام نے اپنے خرچے سے لیا تھا۔ ایک صحافی جی کے۔ ریڈی نے جو سری نگر سے ”کشمیر ہاف“ نامی اخبار نکالتا رہا تھا وہ پاکستان کی زبردست وکالت کر رہا تھا اور پاکستان بننے کے بعد وہاں کے تعلقات عامر بن گیا تھا۔ بعد میں اُنکشت کیا کہ میرے پاکستان ہلانے میں اُن کی نیت صاف نہ تھی۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح کراچی لانا چاہتے تھے۔ اور وہاں مجھے قید میں ڈال کر میرے نام پر پاکستان کے حق میں اہامیان کشمیر کے لیے بیانات شائع کرنا چاہتے تھے۔ ریڈی نے اُن کے منصوبوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

”اُن کی اسکیم یہ تھی کہ جب شیخ صاحب کراچی پہنچیں گے تو اُن کا شاندار استقبال کیا جائے۔ اگر وہ گلی لیڈروں کے فریب میں آجائیں تو میکینک دوسری صورت میں کراچی میں جناح کے ساتھ اُن کی ملاقات کے دو دن بعد کشمیر پر حملہ کرنے کی تیاری کی گئی تھی۔ چال یہ سوچی گئی تھی کہ اگر شیخ صاحب اپنی بات پُر اُٹے رہے اور قائد اعظم کی ترفیف و تحریں میں نہ آئے تو اُنھیں پھینکے سے گرفتار کر کے کسی غیر معروف مقام پر لے جایا جائے اور جب وہ کسی جلی میں پڑے زندگی کے دن گُزار رہے ہوں تو اُن کی صدارت میں عارضی حکومت کا اعلان کر کے اُن کے نام پر بیانات و اعلانات جاری کیے جائیں۔ اِس طرح سے جب قبائلیوں کے غول کے قول کشمیر میں لوٹ مار کر رہے ہوں گے تو کشمیری یہی خیال کریں گے اُنھیں

شیخ صاحب نے شیریں بھابہ: پرنسپل منڈی لاکھ پڑا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔
پاکستانیوں کی یہ بیل منڈی نہ چڑھ سکی۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اُدھر فوجی مآذ پر ریاست کے لیے فطرت بڑھتی ہی جا رہے تھے۔ ہمارا جا کا
چیف آف اسٹاف ایک انگریز تھا۔ اُس نے ہمارا جا کی ۳ ہزار فوج کو مختلف اطراف
میں بھونک دیا تھا۔ ایک مگڑی مظفر آباد کے متصل سرحد پر تعینات کی گئی
تھی۔ یہ مگڑی غلطو سمعی اس میں ہندو ڈوگرے بھی تھے۔ اور پونچھ ویر پور
میں جھونک دیا تھا۔ ایک مگڑی مظفر آباد کے متصل ڈوگرے بھی تھے۔ اور پونچھ ویر پور
کے سندن قبیلے کے مسلمان بھی۔ پونچھ ویر پور کے لوگ پہلے سے ہی جٹ پیٹھے تھے۔ وہ
مظفر آباد کی پہاڑی چوٹیوں سے اپنے گھروں سے شیلے اُتھتے دیکھ رہے تھے اور جو
مظالم ڈوگرہ ہندو فوج نے وہاں توڑے تھے اس کی خبریں بھی ان کو مل جاتی تھیں۔
اس لیے اُن کی وفاداری کے نیچے اُٹھ چکے تھے۔ چنانچہ جب قبائلی اس راستے سے سرحد
کے اندر گئے آئے تو انھوں نے بغاوت کردی اور قبائلیوں سے جاملے حملہ آوروں
کی جس مگڑی نے ایبٹ آباد مانسہرہ سرحد سے مظفر آباد پر حملہ کیا۔ وہ وہاں ہزار نفوس
پر مشتمل تھی۔ ان میں محمود، حمزہ، وزیر، آفریدی اور دوسرے قبیلوں کے لوگ
شامل تھے اور کچھ تو افغانستان کے یاغی علاقے سے بھی آگئے تھے۔ اُن کی یلقت پر
رسل درساہل کی فوجی تنظیم تھی اور وہ جب شیخ کاذب کے دُشمندہ میں کچھ پایادہ
اور کچھ بیسوں یا ٹروپوں میں مظفر آباد میں داخل ہوئے تو انھوں نے اسلام زندہ باد
کے نعرے بلند کر کے مقامی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہمارا جے
کی چوٹی جے ایندے کے شاہین یہاں ایک ڈوگرہ لیفٹیننٹ کرنل فرانسس سنگھ کی کان میں
تعینات تھی۔ فوج شیخ قبائلیوں کے مقابلے میں چند گھنٹوں سے زیادہ ویرنک ڈنگ
سکی۔ اور اُن کی آن میں اس کا صفایا ہو گیا۔ مقامی ڈوگری کیشتر ہستہ مارا گیا اور اُس کی
بجود کرشنا کوئی ایک سال تک مقبوضہ شیریں کے پناہ گزین کہیں میں رہی۔ بعد میں

ہم نے اسے ہندوستان پہنچا دیا اور جواہر لال نے گھر میں اُس کی خوب رسائی ہو گئی۔
قبائلی تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ ۲۰ اکتوبر کو مظفر آباد گر گیا اور ۲۲ کو چناری ہمارا جا
نے بگڑ گیا۔ راجندر سنگھ کی کمان میں، جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی جنرل سکاش سے
چیت آف اسٹاف کا چارج حاصل کر لیا تھا، کچھ تنگ مظفر آباد کی طرف روانہ کی۔
اُن کی مندرجہ قبائلیوں کے ساتھ بوتیار کے ویلن مندر کے پاس ہوئی۔ راجندر سنگھ
خود بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے کام آئے۔ لیکن اُس کی فوج کو شکست فاش
ہوئی۔ اُن میں سے کچھ تو مارے گئے اور کچھ وہاں کے بھاگے بھاگے گئے۔ ۲۴ اکتوبر کو
قبائلیوں نے اوڑی پر قبضہ کر کے اُسے ٹوٹ لیا۔ اب سرینگر کارا ست بلاکس مزاحمت
کے کھلا تھا اور حملہ آور چاہتے تو چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ کر دم لیتے۔ لیکن انھیں
لوٹ مار کی حرص نے اندھا بنا دیا اور سرینگر سبزو در راستہ چھو کر رہ گیا۔ اُن دنوں
ایک امریکی اخبار نویس مارگریٹ بروک واٹ اُن کے ساتھ آئی تھی۔ اُس نے اپنی
کتاب "HALF WAY TO FREEDOM" میں قبائلیوں کی لوٹ کا ناجوابان
کیا ہے۔ اُس کے مطابق:-

وہ اُن کی بیس اور گرہیں مالی غنیمت سے لدی چھندی کی ایک یا دو دن میں
واپس آجاتی تھیں تاکہ اور پٹھانوں کو لے کر کچھ شیریں لوشیں اور اپنے مسلمان
کشمیری بھائیوں کو آزاد کرانے کے اسی عمل کا اعادہ کرتے ہوئے بلا تفریق
مذہب و ملت ہندو، سکھ اور مسلمان دہقانوں کو لوٹیں۔ قبائلیوں کی
پیش قدمی سے ڈوگرہ فوج کا کیا حال ہوا اس کا اندازہ اس بات سے
لگایا جاسکتا ہے کہ باوامی باغ چھادی میں تعینات ساڑھے اٹھارہ سو
فوجی افسروں اور آدمیوں نے روپوش ہو جانے میں خیریت بھی اور بعد

میں جب ہندوستانی افواج کی آمد پر انھیں چھپے ہوئے پایا گیا تو
ہندوستانی فوج کے افسر بڑی کے اس منظر پر بے چارہ گشت بہ دندان رہ
گئے اور انھیں جہل کھوت سنگھ نے جنوں لے جانے کا حکم دے دیا۔
۴۰۹ اکتوبر کو قبائلیوں نے مہورہ کے اس بجلی گھر کو تباہ کر دیا جو سرینگر کو برقی
روشنی مہیا کرتا تھا اور اس طرح راجدھانی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ کہا جاتا ہے
کہ جب روم مل رہا تھا تو ہاں کا ظالم بادشاہ نیز پالسی ہمارا تھا۔ لیکن مس دن
مہاراجا ہری سنگھ نے یہ کہا تو سچ ثابت کر دکھائی وہ دربار گدھ سرینگر کے
جگ جگ ملک کرنے والے ہاں میں اس وقت اپنے متعصبوں اور حاشیہ
نشینوں سے دھبرے کے جتن پر اثر نہیں کیا فخر حاصل کر رہا تھا۔ اچانک ساری
روشنیاں چلی گئیں اور اس کے ساتھ ہی ہمارا جاکی سلطنت کا ستارہ بھی غروب ہو گیا
قبائلی حملہ آوروں نے بارہمولہ کا رخ اختیار کیا جو پہاڑوں کے طین میں دریائے
جہلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور اس علاقے کی سب سے بڑی تجارتی منڈی
رہی ہے۔ بارہمولہ سے سرینگر کا فاصلہ ایک گھنٹہ سے زیادہ کا نہ تھا اور اس وقت
بھی یہ راستہ برصغیر کے متحد ترین راستوں میں سے ایک تھا۔ یہاں کی آبادی مولہ
ہزار کے قریب تھی۔ قبائلی چاہتے تو اسی دن سرینگر پہنچ سکتے تھے۔ لیکن بارہمولہ کے
گھروں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور انھوں نے تین دن تک بارہمولہ
میں زحاکاری، قلم چری اور لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا کہ انھیں سرینگر کی یاد ہی
نہ آئی۔ انہیں تین دن میں ساری صورت حال کا پانسہ بٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی
قبائلیوں کی شمشیر بھی جیشہ ہمیشہ کے لیے مسخ اور غارت ہو کر رہ گئی۔ بارہمولہ کے
شہری ان تمام دیہات اور چھوٹے قصبوں سے زیادہ خوش حال اور دولت مند

تھے۔ جنھیں قبائلیوں نے تاراج کیا تھا۔ اس لیے ان کی رفتار مرکب گئی۔ یہ قتل و
غارت، عصمت دری اور لوٹ مار میں مگن ہو گئے۔ دو دن تک یہ بازار گرم بہاؤ
اس میں قبائلیوں نے مذہب کی تمیز روا نہ رکھی۔ ان کی غرستی اس حد تک بڑھ گئی
کہ انھوں نے یہاں کے میسائی ریشن ہسپتال میں چودہ دستان کلیسا یعنی یورپی راہبوں
تک کو اپنی دراز دستی کا نشانہ بنایا۔ سیٹھ جوزف دشن ہسپتال کی مدد پر برجولیم
کی ایک راہبہ سسٹمری ڈائریکٹر تھیں کے علاوہ تین نرسوں اور ایک انگریز چورسے
کو تہ تیغ کر دیا۔ کئی انڈور بیمار موت کے گھاٹ اتارے اور ہسپتالوں کی دواؤں
تک پر ہاتھ صاف کیا۔ بلکہ دوست تو خاص طور ان کا نشانہ بنے۔ چنانچہ انگریزوں کی تاب
دلا کر کچھ سیکھوں نے خودکشی کر لی۔ اور بہت سی سیکھ بہنوں نے یا تو دریا میں چھلانگ
لگا کر اپنی جان دے دی یا ان کے سر قونڈوں نے انھیں قتلواروں میں بٹا کر ان کے
سروں کو تن سے جدا کر دیا۔ ایک عجیب کسمپرسی اور ہائے و ہوا کا عالم تھا۔ یہ کشمیر کے
مسلمانوں کا ”سلطنت خدا داد“ پاکستان سے پہلا سابقہ تھا۔ مسلمانوں کے سکالوں کو
اگ لگا دی گئی۔ اور ان کے مال و اسباب کو لوٹا گیا۔ ایک مسلمان بولا ہے غنی جو کی
چادر چھین لی گئی۔ جب اس نے پوچھا کہ کیا یہی مسلمانوں کا شیوہ ہے تو اس کو گولی
مار دی گئی۔ بارہولہ میں ایک چھوٹا سا سینا گھر بھی تھا اس کو ایک قصبہ خانے میں تبدیل
کر لیا گیا۔ اور یہاں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کو بھی ہوس کا نشانہ بنایا
گیا۔ ایک متعصب مسلمان رسول جود دزی نے دؤٹو قبائلیوں کو پے گھر میں دعوت
پر بلایا۔ وہ کھانے پینے کو انھوں نے عورتیں طلب کیں۔ تجوش قسمتی سے عورتیں پہلے ہی
گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ کشمیری پٹنڈت عورتیں کانوں میں ”ڈیجھرو“ نام کا ایک
زیر بپتی ہیں جو سونے کا ہوتا ہے قبائلی درندے چھینا جھپٹی میں اس طرح سے یہ

زیر کینچ لیتے تھے کہ عورتوں کے کان بھی کاٹ جاتے تھے۔ قبائلیوں نے کشمیری عورتوں کے قیمتی پھرٹن تک نہ چھوڑے وہ انھیں پہنے ہوئے بارہولہ میں گھومتے پھرتے اور قہقہے لگاتے دیکھے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ قبائلیوں کی یہ لوٹ مار کوئی اتفاقیہ واقعہ نہیں تھا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہی وہاں کے حکمرانوں کو خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ قانون دشمن لگ خود پشاور اور پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں میں لوٹ کا بازار گرم نہ کریں۔ یہ لوگ قبائلی علاقوں سے برطانوی فوج کے چلے آنے کے بعد اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو گئے تھے اور پاکستان کے شہروں کی طرف حریصانہ نظریں اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے انھیں کشمیر کا راستہ دکھا یا اور انھیں بتا گیا کہ وہاں انھیں نقد و جنس اور عورتوں کی ضرورت میں جو کچھ ملے گا وہ ان کا مالی غنیمت تصور ہو گا۔ اس کا مقصد ایک تو خود اس آفت سے فائدہ کارا حاصل کرنا اور دوسرا کشمیری عوام کو غلام بنانا تھا۔ چنانچہ جب بارہولہ سے قبائلی آگے جانے کا نام ہی نہ لینے لگے تو بعدالقیوم خان نے قبائلیوں کے ایک بڑے پیر مائی کو بارہولہ بھیجا جس نے انھیں آگے بڑھنے کی ترقیب دی۔ لیکن قبائلی اپنے لوٹ مار کے مال اور عورتوں کو کسی کی تحویل میں دینے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے اپنا انعام لے کر واپس اپنے بٹیکانوں کی طرف جانے لگے۔

آدھر یہ یہ حالات رونما ہو رہے تھے آدھر ہمارا جانے بوریاستہ باندہ کر اپنے جواہرات اور دیگر قیمتی اثاثہ کو صندوقوں میں بند کر کے ایک سو سے زیادہ گاڑیوں میں لا دیا اور خود اس بلنگڑے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے وہ آکٹوبر کو جنوں کی طرف کوچ کر گیا۔ اس کے ساتھ اس کے نزدیک رشتہ دار و متعلقہ اصحاب

جنگ کشمیری پٹنا دا۔

و غیرہ کے علاوہ اس کے خاندانی مندر گدا و حشر کی گلائی مورتی بھی تھی۔ جب یہ قافلہ آدھ پور پہنچا تو مہارانی تارا دلوی نے اپنے بال بچہ کر اس مورتی کو اپنی گود میں لیے لیا۔ جب مقامی ہندو آبادی ایک گلی کار میں مہارانی کو مورتی لیے ہوئے وکیہ رہی تھی تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جذبات کا پارہ کہاں پہنچا ہو گا۔ ان کا خون اُبال کر مہارانی وہاں مسلمانوں کے خون کی جونی کیلنے کا جو نالک کیلنا چاہتی تھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مہاراجا کی اس جزو لاندہ حرکت سے کشمیری عوام کو بڑا ڈکھ ہوا۔ کیونکہ ان پر ایک سو برس راج کرنے کے بعد اور ان کے خون پسینے کی کمائی سے عالی شان مملکت تعمیر کرنے کے بعد اپنے خاندان کے خزانے کی حیثیت سے اس نے آزمائش کی گھڑی میں اٹھیں یکدہ تنہا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بڑ دلانہ فرار مہاراجا کی اس شہیدہ گورنرہ رنیزہ کرنے کا باعث بن گیا جو اس نے بڑی محنت اور لاگت سے بنائی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مہاراجا کا گلاب سنگھ کا بہادر پانشین کہتا تھا۔ اور اس کو ٹیٹسٹ جنرل راجیشور مہاراجا و اسیج کمار بھاری پھر کمر خطاب بھی ملا ہوا تھا۔ اب اس کی اصلیت ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ کشمیریوں سے صرف استحقاق کا رشتہ رکھتا تھا۔ چنانچہ کشمیریوں کے ساتھ اس کی اس جذباتی عدم وابستگی کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب اس نے وصیت کی کمرے کے بعد اس کی راکھ صرف جنوں شہر کی دفناؤں میں بکیر دی جاسے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت کی قیمت کے مطابق فرار ہوتے وقت اس نے کروڑوں کی مالیت کے تیرے جواہرات موتی اڈ نیلم اپنے ساتھ لے لیے تھے۔ عوامی حکومت نے اگرچہ بعد میں سونے چاندی کے ٹکڑے اور کچھ نوادرات ان کے یہاں سے واپس لا کر گوشہ خانہ میں محفوظ کرادیے لیکن بہت سامان و متاع ان کے پاس ہی رہا۔ ان سے وہ تحفہ بھی حاصل کر لیا گیا

جس پر سونے کا بڑا زبردست جزا و کام ہے۔ لیکن بعد میں میر تقی میر نے اپنے دور میں اس تخت کو امر محل جنوں میں نکالتے ہوئے رکھنے کے بجائے کرن سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بہر حال اس نازک گھڑی پر دوئے پھینکے یا یاد رکھیے تاکہ اس وقت سب سے اہم کام لوگوں کے خوشحالی و عافیت کا تھا۔ MORALE قائم رکھنا تھا۔ مہاراجا کی اس حرکت کے بعد حکومت کے وہ بھی چھوٹے بڑے اہلکار جو جنوں کے رہنے والے تھے، اس کے پیچھے پیچھے جنوں کی طرف بھاگ گئے۔ انتظام و انصرام پر غافل ہو گیا۔ اب نیشنل کانفرنس کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے رعا کاروں کی مدد سے انتظامیہ کو سنبھالے۔ ہم نے اس انتہائی نازک موقع پر یہ ذمہ داری قبول کر لی اور کشمیر کے اقتدار کو جسے مہاراجا شہر کے چوک میں چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا، اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ آدھر پاکستان کے کچھ ایجنٹ سرنگم میں معروف کار تھے۔ اگرچہ قبائلیوں نے انھیں وقت پر نہ پہنچ کر مایوس کر دیا تھا لیکن انھوں نے ایک مفید میٹنگ میں ملے کیا کہ وہ شہر کے تمام میلوں خاص طور پر مہادی آؤں جانے والے میلوں کو تباہ کر ڈالیں تاکہ ہندوستانی افواج کی آمد کی صورت میں ان کی نفس و حرکت مفلوج ہو کر رہ جائے۔ یہیں اس بات کی اطلاع مل گئی اور ہم نے نیشنل کانفرنس کے رعا کاروں کو میلوں اور دوسری مصیبات کے بہرے پر مشغول کر دیا۔ آدھر قبائلیوں کی بوٹ مار کی خبروں نے بھی ساری وادی میں اشتعال کی لہر پیدا کر دی تھی اور بھی ہندو دشمنان نیشنل کانفرنس کی قیادت میں قومی عزت کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے پاس جس نوع کے بھی ٹوٹے چھوٹے ہتھیار تھے ان سے اپیل کی گئی کہ وہ انھیں نیشنل کانفرنس کے حوالے کریں۔ جن لوگوں کے پاس موٹر کار یا کسی اور قسم کی سواریاں تھیں ان سے بھی یہی استدعا کی گئی۔ رعا کاروں کو ہتھیار استعمال

کرنے کی تربیت دینے کے لیے رات دن مختصر سی فرینٹنگ دی گئی اور اس طرح سے کشمیر ملیشیا کی بنیاد پڑی۔ مغللوں، پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگرہوں نے صدیوں سے کشمیر لوگوں کو غیر مسلح کر کے انھیں عسکری تربیت سے دور رکھا تھا۔ لیکن اب آزمائش کی اس گھڑی میں ان کا جذبہ شب و دن ان کی بہادری کے لیے ہوتے ہتھیاروں کو بال بال ہاتھ دھا کاروں میں ہندو مسلم، سکھ نوجوانوں کے علاوہ لڑکیاں بھی شامل ہوئیں اور ان سب نے گولوں، بینکوں اور دیگر اہم و فخر پر سپر دیا عجیب جذبہ تھا۔ ان میں بھی۔ وہ دن رات اسی دھن میں گے رہتے کھانسلے یا نہیں، پاؤں میں جوتے ہوں یا نہیں، لیکن وطن کی محبت سے اتنے سرشار تھے کہ ذاتی آرام و آسائش کا بالکل خیال ہی نہیں رہا تھا۔ شاید شارع نے ان ہی مجاہدوں کے متعلق کہا تھا تھا

خیریت جاں راحت تن صحبت دامان
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

رعا کاروں کو ہدایت تھی کہ وہ غیر مسلم بھائیوں کے گھروں پر کڑی پہرہ دیں اور ان کو یقین دلائیں کہ جب تک وہ ان کے دروازوں کی نگہبانی کر رہے ہیں کوئی قبائلی ان کی لاشوں پر سے ہی دہلیز کو پار کر کے گھر میں گھس سکتا ہے ان دونوں نہ ریڈیو اسٹیشن تھا اور نہ نشر و اشاعت کے دوسرے وسائل، ہر روز شام پرتاپ پارک میں لوگ جمع ہو جاتے تھے میں ان کو دن بھر کے تازہ حالات سے آگاہ کرتا اور دوسرے دن کے لیے ہدایت دیتا تھا۔ ان کو حوصلہ دینے کے لیے میں ان کی وطن پرستی کے جذبے کو بھی ہمیز کرتا تھا۔ اور یہی بات ہے کہ لوگ ان دنوں ایک جان ہو کر مرے مارنے پر تیار تھے۔

اس بدلی ہوئی صورت حال میں اب کچھ اہم سیاسی اقدامات گزیر رہے تھے۔

ظاہر تھا کہ پاکستان اب ہمارے ضمیر کا جبرائ اور ہمارے ذہن کی روشنی چھانا چاہتا تھا۔ تاکہ خوف اور وحشت کی تاریکی میں وہ ہماری متابع آزادی اور ہمارے حق خود ارادیت پر شب خون مارے۔ اولیت اس بات کو تھی کہ ہم اپنا قومی وجود اس مفار سے بچانے کی کوشش کریں۔ اس لیے ہم اب امداد کے لیے ہندوستان کی طرف دیکھیں آٹھارے تھے۔ اس جانب بہت سے ٹکس دوستوں نے ہمارا ہاتھ بھی بٹایا۔ جن میں مرحوم بیگ لالہ کلو بھی تھے۔ وہ اُن دنوں سرنگرن تھے۔ وہ حالات کی نزاکت سمجھ کر آئے پانچ دن چلے گئے اور وہاں کانگریسی رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ کشمیر کو بچانے کے لیے کوشش کریں۔ لیکن ہندوستان کی حکومت کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہمارا راجا نے رسمی طور پر ہندوستان سے اِلحاق نہیں کیا تھا۔ اور ہندوستان کے گورنر جنرل ڈرومانڈٹ نیشن اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ جب تک ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا کوئی قانونی رشتہ قائم نہیں ہوتا، ہندوستان کی فوجوں کو کشمیر بھیجنا ایک قانونی جرم ہوگا۔ اُن کا نظریہ تھا کہ اُس صورت میں پاکستان بھی ایسا کر سکتا ہے اور چونکہ ابھی ہندوستان اور پاکستان کی فوجوں کی سربراہی انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اس لیے اُن کا آپس میں ملنا ملنا نہ ہوگا اگر اگر انھیں لانے کی صلاح دی گئی تو وہ دونوں طرف سے کمان چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس لیے فوجی امداد بھیجی کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارا جاکشیر مسودہ اِلحاق پر دستخط کریں۔ ہمارا جابہرے کی گھٹنے اس معاملے پر تنگدست ہو گیا تھا۔ جن کے وسط میں ماؤنٹ بیٹن نے سرنگرن آکر انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اِلحاق کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں اور عوام کی رائے جاننے کے بعد دو مہینے ایک مملکت کے ساتھ اِلحاق کر لیں۔ سردار پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کی معرفت کہنا بھیجا تھا کہ اگر ہمارا جاک ۱۵ اگست سے پہلے پاکستان

میں ہی جانے کا فیصلہ کرے تو ہندوستان اس بات پر غور و ستادہ قدم تصور کرے گا۔ ایک اور مگر کاؤٹ مہاتما گاندھی کی ذات تھی، اس بات پر دور این تھیں کہ کیا گاندھی جی فوج بھیجے کی اجازت دیں گے یا نہیں؟ چونکہ میں ہندوستانی رہنماؤں سے امداد و طلب کرنے کے لیے دینی آیا ہوا تھا اس لیے میں نے اس معاملے پر گاندھی جی سے بات چیت کی۔ میں نے گاندھی جی سے کہا کہ کشمیر کی لڑائی زمین کے لیے نہیں بلکہ انہیں آدرشوں کو بچانے کے لیے ہے جن کی علمبرداری اور ترجمانی وہ کرتے ہیں۔ جن کا پرچار خود انھوں نے عمیق کر لیا ہے اور جن کے لیے وہ اس وقت بھی چٹان بن کر بادِ مخالفت کے تیرتھوں کوں کے آگے ڈٹ گئے ہیں۔ لہذا ہندوستان کو اس وقت کشمیری عوام کی امداد سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیے۔ جبکہ کشمیری عوام حمد آوروں کے ظلم و جبر کے خلاف بے ملگری سے لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ہندوستان نے امداد و دہی تو ایسا کرنا کشمیر کے لوگوں سے زیادہ اُن آدرشوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی جو ہمیں مشترکہ طور پر عزیز ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے اِزرا و شفقت اس استدعا کو منظور کر لیا۔ اور فوج کشمیر روانہ کرنے کی اجازت بخشی۔ دوسرے ہمارا جاکوں پہنچ گیا تھا۔ مگر اُس کے کیپ میں کیسی جگہ اور سرسائی چھنی ہوئی تھی اُس کا اندازہ اس کے وزیر اعظم مہندہ مہا جن کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

”ہمارا بے کے مشورے سے طے پایا کہ کسی بھائی جہاز کا انتظام ہو سکے تو دہلی جا کر فوری طور پر امداد لانے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ پاکستان جا کر ہتھیار ڈال دیے جائیں۔“

(مہا جن، کشمیر کا ہند ۱۵ اِلحاق صفحہ ۱۶)

ہمارا جاک حالت ایسی غیر تھی کہ اُس نے ۲۶ اکتوبر کو جنوں پہنچنے پر اپنے خاص معاونین

کو بدایت دی تھی کہ اُس کو اُس کے خوابِ استراحت سے صرت اُسی صورت میں جگایا جائے جب وہ اپنی مینٹن واپس آئے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ ہند نے الحاق منظور کیا ہے۔ دوسری صورت میں اُس کو نیند ہی کی حالت میں اپنے ہیبتول سے کٹتی میں گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ حکومتِ ہند نے اس مرحلے پر ریاستوں کے تحفے کے سیکرٹری وی۔ پی سٹین کو روانہ کیا۔ اُن کی جیب میں دستاویز الحاق کا مسودہ تھا۔ وہ ۲۶ اکتوبر کو ہی اس پر مہاراجا کے دستخط کروا کے واپس دہلی پہنچ گئے۔ اُن کا استقبال کرنے کو خود سردار شیل بھائی اڈے پر گئے تھے۔ ادا خاں اپنے ساتھ جواہر لال کی کوٹھی پر لے آئے۔ میں بھی وہیں رُک گیا۔ اُن دنوں پنڈت جواہر لال پارک روڈ کی کوٹھی عوامی رائلٹی بڈریختے اور میں اُن کے مہمان کی حیثیت سے وہیں مقیم تھا۔ وی۔ پی سٹین اور مہر چند متا جین جس وقت اُن کے پاس پہنچے میں کوٹھی میں ہی موجود تھا۔ مہر چند مہاجن پنڈت جی کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے اندر کے کمرے میں چلے گئے۔ اُن کے اپنے الفاظ میں انھوں نے پنڈت جی سے کہا۔

”فوج دیکھو۔ الحاق کیجیے اور جو بھی اختیارات چاہیے عوامی پارٹی نیشنل کانفرنس کو دیکھیں۔ لیکن آج ہی ہوائی جہاز سے فوج سرنگر بھیج دیجیے۔ ورنہ میں جناح صاحب کے پاس جا کر مصالحت کروں گا۔“

جواہر لال ایسی باتوں کی تاب لانے والے کہاں تھے۔ یہ شے ہی آگِ بگولہ ہو گئے۔ جواہر لال کو جب فتنہ آتا تھا تو غضب ہو جاتا تھا۔ انھوں نے مہاجن صاحب سے نہایت قدرت لے لی تھی کہ اُن کو پاکستان سے سمجھوتے کا شوق ہے تو فوراً یہاں سے چلے جائے۔ پنڈت جی غصے میں ہی کھوپڑی اُڑاتے ہوئے شعلہ جوالہ میں گر باہر کستے ہیں۔ پنڈت جی کو اس حال میں دیکھا تو اُن سے وجہ دریافت کی۔ پھر بڑی دھواں سے

میں نے اُن کے قہقہے کو ٹھنڈا کیا اور اُن سے کہا کہ یہ وقت فضا ہو جانے کا نہیں ہے بلکہ حلد از حلد اقدام کرنے کا ہے۔ اگر کٹھڑی میں سی تاخیر ہو گئی تو پھر نہ رہے گا بانس اور نہ بچے گی بانسری۔ سانپ نکل جائے گا اور دم لکیر بیٹھے رہ جائیں گے۔ میں نے پنڈت جی کو یہ اطلاع بھی دی کہ نیشنل کانفرنس کی تائید اس فیصلے کے ساتھ ہے۔ اس سے انھیں ایک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ وہ اندر گئے اور مہاجن صاحب سے کہا کہ آپ جو کہتے ہیں وہی شیخ عبداللہ کا بھی خیال ہے اور اس طرح دستاویز الحاق پر دستخط کر دیے گئے۔ مہاجن نے اس واقعے کے متعلق بعد میں لکھا۔

”ایسے اڈے مومنے پر شیخ عبداللہ کی مدد کا ہمیشہ متوئن رہوں گا کیونکہ انھوں نے بروقت پیغام بھیج کر کشمیر کو پاکستان کے ساتھ جانے سے بچا لیا۔“

دستاویز الحاق میں مہاراجا نے فارسی معاملات، رسل و رسا کی اور دفاعی امور میں الحاق کیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گورنر جنرل ہند کی حیثیت سے الحاق منظور کرتے ہوئے یہ مشہور زمانہ شرط لگا دی۔ جس سے بعد میں کشمیر کے سوال کو بین الاقوامی سطح تک پہنچایا۔ انھوں نے مہاراجا کو لکھا۔

”جس مخصوص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے اُن کے پیش نظر میری حکومت ہندوستانی ڈومینین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو اس اصول کے تحت قبول کرتی ہے کہ جس ریاست میں الحاق کا مسئلہ مابہ نزاع ہو وہاں الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہونا چاہئے۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جو ہی امن و امان بحال ہو اور علاقہ داروں سے ریاست کو نجات ملے تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے سے طے کیا جائے۔“

لیکن یہ بات یہاں پر دلچسپی کا باعث ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت فوج کشی میں بھیجے کی مخالفت کر کے کچھ مین انگلی پیپید گیوں کے اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ ہندوستانی کا مین کی دفاعی سب کدنی کے صدر تھے اور ان کی مخالفت سے ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی۔ لیکن جب مہاتما گاندھی نے کشمیر میں فوج بھیجنے کے حق میں رائے دی تو ماؤنٹ بیٹن کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

جواہر لال نہرو نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میرے نام اپنے خط میں لکھا۔

”ہم نے ایک مشکل کام کا بیڑا اٹھا لیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم پار آتے جائیں گے۔ کل جیب سے فیصلہ لیا گیا ہے اور جب سے میں نے آج سنا ہے کہ ہماری فوج سرنگر میں آ کر گئی ہے، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اب یہ ہمارے مستقبل کا امتحان ہو گا۔“



آگ خون اور روشنی

ہندوستان کی تقسیم کا پرکار مرنے والی ملاقاتی وحدت کے جگر میں شریکات کرنے کے لیے نہیں گھوما تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ اسلاک افواج، اثاثوں اور ٹکڑوں کی تقسیم بھی تھی تھی۔ اس وقت ہندوستانی فوجوں کے کچھ ٹکڑے پاکستان میں اور پاکستانی فوجوں کے کچھ دستے ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے۔ گویا ایک افروغی کا عالم تھا۔ شرا نسپوٹ کا انتظام تھا ہی نہیں، لیکن ہندوستانی حکمہ دفاع نے سرنگر فوج پہنچانے کے لیے بے حد مستعدی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ راجی انڈین ایئر فورس کے علاوہ تقریباً تمام شہری ہوا ز بھی طلب کر لیے گئے۔ اور کوئی ایک سو جہازوں نے کشمیر فوج پہنچانے کا تار بخنی مگر شروع کر لیا۔ ۲۷ اکتوبر صبح بڑے پہلی سکور فٹس کے ساڑھے تین سو سپاہیوں کا پہلا دستہ سرنگر پہنچ دیا گیا۔ اس دستے کی کمان لینڈسٹ کری دیوان رحیمت رائے کے ہاتھ میں تھی اور یہ صبح کے ساڑھے نو بجے کے قریب سرنگر کے ہوائی اڈے پر اترا۔ کلام اتنی چابک دستی سے کیا گیا کہ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ”۲۷ اکتوبر کے فوجی آپریشن کی برقی رفتار سے دوسری

عالمگیر جنگ کی جنوب مشرقی ایشیا کان کی، جس کا میں لیڈر تھا اس وقت شیخ مازہر علی نے چنانچہ اس دستے نے ہوائی اڈے کے قریب پہنچے ہوئے قبائلیوں کا صفایا کر دیا۔ ہندوستانی رضا علی کی اس برق رفتاری نے پاکستانی حملہ آوروں کی قسمت مہر بند کی جبکہ وہ اپنی غفلت سے جاگ کر کسی طور پر ہوائی اڈے کو تحس تحس کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے تھے۔ ذرا کچھ اور گھنٹوں کی دیر ہو جاتی تو ہوائی اڈہ دشمن کے قبضے میں آگیا ہوتا اور پھر ہندوستان جہازوں کا اترنا محال ہو جاتا۔ ہندوستانی فوج کا ایک اور دستہ سیدھا بارہ پور چلا گیا۔ جہاں اس کے کمانڈر کرنل رائے کام آئے اس فوجی دستہ کو چن کی طرف پسپا ہو جانا پڑا۔ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ اور ہماری فوجوں کی بہت تعلیم تھی۔ قبائلی کرنل خورشید انور کی کمان میں آگے بڑھ گئے اور سرنگر سے چار پانچ میل دور شال ٹینگ میں مورچہ جما کے شہر کے دروازے کھٹکھٹانے لگے۔ ادھر سے جہ گام کی طرف وہ ہوائی اڈے پر دھاوا بولنے کے لیے پہنچ گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہندو اڈہ، شہل اور گاندھل کے علاقے میں پھیل گئے۔ ہم تو برصغیر پر سرنگر کو بچانے کے حلق کر رہے تھے اگر شہر کا امن و امان گڑ جاتا تو ساری لڑائی کا نقشہ ہی بدلت جاتا۔ اس مرحلہ پر ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ سرنگر اور کشمیر کو بچانے میں صرف ہندوستانی افواج کا ہی حصہ نہیں بلکہ دوسرے عوامل کا بھی اگر زیادہ نہیں تو برابر کا حصہ ضرور ہے۔ راولپنڈی سے سرنگر تک سو فیصد چھ گھنٹے سے زیادہ کی مسافت نہیں ہے لیکن قبائلی حملہ آوروں نے غفلت و اراستہ مسافت پر سرنگر تک پہنچنے میں چھ دن لگا دیے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بڑی وجہ یہ بھی کشمیری عوام نے حملہ آوروں کو بے روک ٹوک آگے بڑھنے نہیں دیا بلکہ قدم قدم پر ان کا مقابلہ کر کے ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

گویا قبائلیوں سے کشمیر کو بچانے کا فریضہ ہندوستانی فوج کی آمد سے پہلے ہی کشمیریوں نے اپنے نازک کندھوں پر اٹھالیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ قبائلیوں نے مقامی آبادی کو زیر کرنے کے بعد ہر قریبے اور قریبے میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس لیے یہ خیال بالکل بجایا ہے کہ اگر قبائلی لوٹ مار میں اپنا وقت صرفت نہ کرتے تو ہندوستانی فوجوں کے سرنگر میں اترنے سے بہت پہلے وہ سرنگر پر اپنا جھنڈا گاڑ چکے ہوتے لیکن ان کا خیال بھی ان کے رہنما جناح صاحب کی طرح یہی تھا کہ "کشمیر ایک چمک ہے جو میری جیب میں پڑا ہے۔ جسے میں جب چاہوں سمجھتا سکوں جوں۔" قبائلی اپنی طاقت کی دھن میں کشمیریوں کے منہمک ارادے اور دوسرے عوامل سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ وہ تو کشمیری گھروں میں پڑے ہوئے دس سا دواڑوں اور آفتابوں کے دستوں کو جو ہتھیل کے بنے ہوئے ہوتے ہیں، زر خالص سمجھ کر دھڑا دھڑا سرحد پار بھجوا کر سمجھ رہے تھے کہ کشمیر میں حاصل کئے گئے مال غنیمت سے وہ اپنی صدیوں کی محرمیاں دور کر پائیں گے اور تو اور انھوں نے وہاں کے چروے کے کاسی کے ٹکڑے تک نہیں چھوڑے۔

بہر حال دہلی سے متواتر جنگ آرہی تھی۔ پشاور کی فوج کا ایک دستہ بھی ہوائی جہازوں میں سرنگر پہنچا۔ انھوں نے اپنا کیپ رام باغ میں قائم کر لیا۔ لیکن تقسیم نے جو ناسور پیدا کئے تھے اب اس کا ایک بھیاں ک شکوہ ڈھکھا۔ پشاور ٹانگرس نے نیشنل کانفرنس سے کچھ گاڑ مانگے۔ جو راستوں کی نشاندہی کر سکیں۔ یہ کمیپ کئی روز تک رام باغ میں لگا رہا۔ جب اس کو محاذ پر چڑھنے کا حکم ملا اور اس نے کمیپ خالی کیا تو خندقوں سے نیشنل کانفرنسی کارکنوں کی تین چار لاشیں ملیں۔ اس پر زبردست سسٹن پھیل گئی۔ شہر میں ڈکائیں بند کر دی گئیں اور لاشوں کو جلوس کی

صورت میں بازاروں میں چھٹائے لگے۔ ہندوستانی سیکورٹیز کا یہ پہلا نقشہ تھا جو یہاں کے عوام کے دلوں پر پڑا۔ چنانچہ عوام میں بڑی پھیلی گئی اور انھوں نے ہماری بھی نگہ مبصری شروع کر دی۔ حالات انتہائی نازک تھے اگر ہمارے قدم ذرا بھی ڈگدگا جاتے تو صورت حال کا پٹا کھانا یقین تھا۔ میں نے فوراً کارکنوں کی ایک میٹنگ بلائی اس وقت ہم نے اپنا دفتر لوگر اوڈر کے متصل ریجنیا ہوٹل میں منتقل کر دیا۔ اس میٹنگ میں ہندوستانی فوجوں کے بڑے کمانڈر ایفٹنٹ جنرل کونٹ سنگھ بھی موجود تھے۔ میں نے کارکنوں کو سمجھایا کہ پٹیل رائیگرس کی یہ حرکت اگرچہ بہت افسوسناک ہے لیکن انسانی طور پر متوقع نہیں، یہ لوگ پاکستان کے علاقے سے تازہ دم آئے ہوئے ہیں۔ وہاں ان کے ہم مذہبوں اور عزیزو اقارب پر جو قیامت گذری ہے اسے انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ اس وقت جو لڑائی ہو رہی ہے وہ مسکھوں اور مسلمانوں کی مذہبی لڑائی ہے۔ اس لیے ہر سکھ کا فرض ہے کہ جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آئے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے کیونکہ مغربی پنجاب میں بھی مسلمان ہر سکھ کو قتل و املا دیتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ اس چھوٹے سے خطے میں ہم ہندو، مسلمان یا سکھ کی لڑائی نہیں لڑ رہے ہیں۔ اس لیے اس قسم کے واقعات سے شاید ہم کو کوئی بار دو چار ہونا پڑے۔ لیکن ہمارے عزم و ارادے میں کوئی کمزوری نہ آنی چاہیے۔ ہمیں تہیہ کرنا ہو گا کہ ہم انسان کی زندگی کو اپنے اموال اور عمل سے شکست دے کر اس کے اندر چھپی ہوئی شرافت کو ابھاریں گے۔ فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت کے بھگوت کو ہم کشمیر کی سرزمین پر ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وفادار ہیں۔ چاہے وہ ہندو فرقہ پرستی ہو یا سکھ فرقہ پرستی۔ البتہ ہمیں ہندوستانی بھگواؤں سے درخواست کرنی ہے

کہ آدرشوں کی جنگ لڑنے کے لیے وہ احتیاط سے اپنی فوج کشیر بھیجیں۔ اور یہاں بھیجے سے پہلے ان کو کشمیر میں ہو رہی لڑائی کے مقاصد پر خوبی فہم نشین کرانے جانے چاہئیں تاکہ وہ ان جرائم سے پاک ہو سکیں جو انھیں ہندو اور پاکستان میں چاروں طرف سے آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ فوجی افسران کو بھی دل لگا کے کوششیں کرنی چاہئیں۔ جنرل کلونٹ سنگھ نے میرے ساتھ اتفاق کیا اور پلنٹ جی نے اس بات کی ہدایات جاری کیں کہ فوج کو کشمیر روانہ کرنے سے پہلے ان مقاصد کے بارے میں پوری طرح سمجھایا جانا چاہئے جن کے لیے کشمیر میں جنگ ہو رہی ہے۔ اس نکتے سے تو کچھ فرق پڑا لیکن اس میں شک نہیں کہ ابتدائی دور میں پونچھ اور راجموری کے غریب مسلمانوں نے ہندوستانی فوجوں کے ہاتھوں کہیں کہیں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ آہستہ آہستہ فوج اور شہریوں کے تعلقات سنبھلنے لگے۔ اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ جب ایک سال کے بعد یہی پٹیل پلٹن ہندو وارہ سے کہیں اور تبدیل ہوئی تو وہاں کے عوام کی طرف سے مجھے سیکورٹی مارموصول ہوئے جن میں درخواست کی گئی تھی کہ اس کو ہندو وارہ میں ہی رہنے دیا جائے۔ اس طرح سے ابتدا میں ہی ہم نے کشمیر کے میلان جنگ پر فوجی محاذ کے ساتھ ساتھ فطریاتی محاذ پر بھی کامیابیاں حاصل کیں۔

میں نے زندگی میں بھی بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں مجھے اپنوں کے تیر ملاکت اور ناک و ٹوٹ نام سہنا پڑے ہیں۔ لیکن میں کبھی انسان کی بنیادی انسانیت سے ناامید نہیں ہوا۔ انسان میں وحشی اور درندگی بھی ہے۔ اور نیکی اور شرافت کے جوہر بھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم انسان کے غمیر میں رہتے ہوئے ان دو پہلوؤں میں سے کبھی کو ابھارنے اور سوار کرتے ہیں۔

شال ٹینگ میں قباہیوں کے ساتھ ہندوستانی فوج کی پہلی زبردست اور بڑی خون ریز جہز پ ہوئی۔ اس وقت ہندوستانی فوج کے پاس کافی ملک آگنی تھی اور کچھ بیمار جہاز بھی۔ قباہیوں کے پاس بباروں کے خلاف کوئی بکاؤ نہ تھا۔ اس لیے وہ پیچھے ہٹ جاتے پر مجبور ہو گئے۔ حالانکہ پاکستان فوج کے سپر گریڈ خان جتوئی نے جنرل طارق کا مقصد اختیار کیا تھا تو اس لڑائی کی نگرانی کرنے کے لیے شال ٹینگ پہنچ گئے تھے۔ ہوائی جہازوں سے قباہیوں پر دہشت خاری ہوئی اور وہ انہیں "شیطان کا بچہ" کہہ کر پکارتے گئے۔ ہندوستان کی یکسر بند گائیوں نے بھی لڑائی کا پانسہ پٹنے میں اہم حصہ ادا کیا۔ تباہی پٹی کی طرف متوجہ اور وہاں ایک اور مقدمہ بھی ہو گئی۔ جین کے قبیلے کو کافی نقصان پہنچا آخر وہاں بھی کافی لاشیں چھوڑ کر تباہی بارہولہ کے راستے اوڑسی پھر منظر آؤدک پہنچ گئے اور اپنے ساتھ لوٹ مار کی جائداد اور افواہ کی بونی بدتممت عورتیں لے گئے۔ بارہولہ پر ہمارے دوبارہ قبیلے کے قوراء بعد میں بخشی غلام محمد اور سردار بدو سنگھ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا بارہولہ عیسائیوں پر قبضہ نشان پڑا تھا اور شہر قومشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لیکن جوں ہی ہماری آمد کی خبر سچیلی لوگ جنگلوں سے جہاں وہ پناہ لینے کے لیے گئے تھے۔ آتر آئے اور ستانہ وار نقص کرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ان کے ہند مت قابو میں نہیں ہوں گے۔ لیکن ہماری موجودگی نے کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہونے دیا۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں اپنے ہیڈ کوارٹر رہتا ہوں میں سو رہا ہوا تھا کہ ایک بجے کے قریب آری ہیڈ کوارٹر بادامی بان سے اطلاع آئی کہ اس رات قبائلی سرنگر میں داخل ہونے والے ہیں۔ اور ان کا رخ سیدھے میرے ہیڈ کوارٹر کی طرف ہو گا۔ اس لیے مجھے کسی اور جگہ چلے جانا چاہیے۔ مجھے علی الصبح دہلی جانا تھا۔ میرے ساتھ وی۔ پی سین میں جاتے والے تھے۔ جو ہار یا چاکو سرنگر چھوڑ

کا مشورہ دینے آئے تھے۔ میں رات کو اپنے ہیڈ کوارٹر سے نکلا۔ ہوائی اڈے کے راستے میں اسے کے۔ داخل کامکان تھا۔ ہم نے اس کے پھوٹے میں پناہ لی۔ کچھ دیر نزدیک سے بھی ایک خوفناک دھماکے کی آواز آئی۔ ہم سمجھے کہ بس اب پکڑے گئے اور ناشدنی کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن ہمارے انتظار کے باوجود کوئی میں پکڑنے کے لیے نہیں آیا۔ شاید کسی گاڑی کا انٹر سیٹ گیا تھا اور ہم کچھ اور ہی سمجھے تھے۔ دوسری شبح کو میں ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی روانہ ہو گیا۔

قبائلی جب بارہولہ میں تھے ہمارے ایک پرجوش اور نوجوان ساتھی محمد مقبول شیروانی ان کے پیچھے چھو گئے۔ شیروانی کے ہاتھ ہمیں سے ایک موٹر سائیکل آگنی تھی۔ وہ ہمیں اپنے ملائے کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے سرنگر آئے تھے جہاں وہ مجھے ملے۔ وہ پھر واپس جانے کو پرتل رہے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ حالات بہت خراب ہیں اس طرح تو تین تہا واپس مت لو۔ مگر وہ کہاں مانتے والے تھے۔ جب وطن کے جذبات اس وقت لوگوں کا خون اس طرح اچھال رہے تھے کہ انہیں اپنی عافیت کی کوئی پرواہ نہ تھی لیکن جس خطرے کا میں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا وہی ہوا۔ وہ سنگھارہ کے نزدیک قباہیوں کے رخسے میں آگئے اور مقبول بارہولہ پہنچا دیا گیا جہاں قباہیوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ میرے خلاف فخرہ دیں اور پاکستان زندہ باد نہ کریں لیکن انھوں نے انکار کیا اور شیر کشمیر کا کیا ارشاد۔ ہندو مسلم سنگھارہ کا فخرہ بلند کیا۔ بس پھر کیا تھا ان کو کیوٹا سیم کے سے انداز میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور ان کی ہتھیلیوں اور ہینڈوں میں کیلیں پیوست کر دی گئیں۔ لیکن ان کی بہادری اور اپنے مقصد کے ساتھ گمن غمناظ ہو کہ جب ان کے ہمر کو کیلیوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا وہ شیر کشمیر زندہ باد کے نعرے براہر بلند کرتے جا رہے تھے اس کے بعد انھیں چودہ گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اور یہ بہادر کشمیری نوجوان اپنے وطن کی آن بھاتا جو شہید ہو گیا۔

بعد میں جب بارہولہ آزاد ہوا تو حوالہ لایا اپنی پہلی بات میں ان کی تقریر حاضر ہوئے اور وہاں خراج عقیدت ادا کیا۔ مہاتما گاندھی نے جو خود بھی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کچھ ہی مہینوں میں اپنی جان نچا کر کرنے والے تھے، ۱۹ نومبر کی پراختیا سجا میں انھیں خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک ایسی شاندار شہادت تھی کہ جس پر کوئی بھی ہندو مسلمان بھکے یا عیسائی ناز کر سکتا ہے۔“

بعینہ ایسا ہی واقعہ منظر آباد میں بھی پیش آیا۔ جہاں منشی کافور کے ایک معزز کاکن ماسٹر عبدالعزیز راکر تھے۔ جب قبا کی مظفر آباد پر چھائے تو ماسٹر صاحب نے اپنے گھر میں ہندو اور سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والی کچھ بڑی عورتوں کو پناہ دی۔ جب قبائلی ان کو پکڑنے کے لیے آئے تو اس نے ان سے کہا ”تم مجھے تو مار سکتے ہو لیکن ان بے گناہ اور معصوم عورتوں اور بچوں کو مارنے کا تمھارے پاس کیا جواز ہے۔ تم تو اپنے آپ کو اسلامی ملک کا ظہار رکھتے ہو۔ اسلام میں اس بات کی کہاں اجازت ہے کہ بے گناہ عورتوں، بچوں اور بچوں پر تلوار اٹھائی جائے۔ اس راست گفتاری پر قبائلیوں کو بڑا تاؤ آگیا وہ ماسٹر کی ادھر کچھ دوسرے ہندو اور سکھوں کو دریا کے کنارے لے گئے اور گولیوں سے ان کے جسم کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ یہ شب وطن اہل صندھ ایشاور قرانی کے کچھ انہوں نے تھے۔ ان کی جست اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ اس وقت پیش آئے جب چاروں طرف شرافت اور معیت کے چراغ گل ہو چکے تھے جب تک دنیا میں انسانیت موجود ہے تب تک یہ بے لوث مثالیں نفسی انسانی کو فیضان اور حوصلہ بخشیں رہیں گی۔ ان قربانیوں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ہماری تحریک میں کتنی اندرونی شغف اور قوت موجود تھی۔ یہ بھابھا پنا کام کر گئے اور ہماری قوم ان

کا نام لیتے ہوئے ہمیشہ غورنازے گردن بلند کرتی رہے گی۔

بارہولہ اور ادوی میں ہندوستانی افواج کی رہنمائی بریگیڈیئر سین کر رہے تھے۔ وادی میں حکومت کا نظم و نسق ملائیش کافور کے ہاتھ میں تھا۔ اسی کے رضا کار و فوجیوں کیوں اور دیگر اہم ناگوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے ٹکڑو ٹکڑو میں کسی کو ڈیڑھ لاکھ کی رقم لے جاتے ہوئے پکڑ لیا۔ اس کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ پوچھا تاجر سے معلوم ہوا کہ وہ یہ روپیہ کسی میں بیع کرانے کے لیے جا رہا تھا۔ ہم نے روپیہ ضبط کر لیا۔ بعد میں مختلف ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ رقم بہت کام آئی۔

بہت جلد قبائلیوں کا تقاضا کرتے ہوئے ہماری فوج اڈی تک پہنچ گئی۔ اور اس طرح پاکستان کے کشمیر پر بے زور شمشیر قلعہ کرنے کے خواب دھڑکے دھڑکے گئے۔ چنانچہ صاحب کے لیے یہ خاص طور پر بہت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ واقعہ کا حلقوں کے مطابق انھیں پاکستانی حکام نے ایبٹ آباد بھیجا دیا تھا کہ سرنگر پر پاکستانی پریم کشانی کی خبر سننے کے بعد وہ عید کے روز ۵ اکتوبر یعنی قبائلیوں کے ریاست کے داخلے کے بعد جو تھے روز پڑتی تھی، ایک فائرنگ پولس کی صورت میں وہاں داخل ہوں۔ جب پانسہ پلٹ گیا تو جناح صاحب بلال میں آگئے۔ انھوں نے اپنی افواج کے کمانڈر ان چیف جنرل کریم کو حکم دیا کہ وہ کشمیر پر پوری طاقت سے دھاوا بول دیں۔ لیکن جنرل کریم ہندو اور پاکستان کی فوجوں کے سپریم کمانڈر سر کلاؤ اٹھلیک کی فوج میں یہ معاملہ لائے۔ سر کلاؤ نے جناح صاحب سے کہا کہ دونوں ملکوں کی افواج انگریز افسروں کے ماتحت کام کر رہی ہیں اگر پاکستانی فوج کشمیر پر چڑھ آتی ہے تو یہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہوگا۔ اور اس صورت میں انگریز

افسر اپنے عہدوں سے الگ ہو جائیں گے۔ پاکستانی فوج کا سارا انحصار برطانوی افیسروں پر تھا۔ اس لیے جناح صاحب معاملے کی نزاکت سمجھ کر اپنے احکامات پٹ گئے۔ لیکن پاکستان کی فوجی مشین پروٹے کے پیچھے جنگ میں لگی رہی۔ اور پاکستانی فوج کے ایک افسر میجر جنرل اکبر خان جنرل طارق کا سوپ دھار کر حملہ آوروں کی رہنمائی کرتے رہے۔ دسمبر آتے آتے کشمیر کی سرزمین پر موجود حملہ آوروں کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔

▲▲▲

(۳۸)

آندھی میں چراغ

مہر چند مہاجن مہارا جا کے ساتھ ہی کشمیر چھوڑ کر جوں میں اُس کے محل میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ لیکن اپنی کمین گاہ میں خود آرام سے بیٹھ کر اپنے نائب رام لال بترہ کے ذریعے ہمارے کام میں بے جا مداخلت کر رہے تھے۔ یہ دو علی حکومت کے فالجِ نذہ نظام میں اور رکاؤ میں پیدا کر رہی تھی۔ چنانچہ میں نے جواہر لال سے کہا کہ ان حالات میں ہماری جماعت امن و قانون کی فرہم داری نہیں لے سکتی یا تو مہر چند مہاجن کو رخصت کیا جائے یا ہم میدان چھوڑ دیں گے۔ پندرہ بجی حالات کی نزاکت سے واقف تھے۔ اور وہ کشمیر کے نظم و نسق کی نئی تنظیم کے حق میں تھے۔ لیکن سردار پٹیل ایسا نہیں چاہتے تھے۔ وہ مہر چند مہاجن کو سیاسی شیج پر جمائے رکھنا چاہتے تھے گو وہ خوب جانتے تھے کہ نیشنل کالفرنس کے بقاؤن کے بغیر مہاجن صاحب ایک پل کے لیے ٹپک نہیں سکتے۔ اُس وقت تہرہ کیا سوچتے تھے اُس کا اندازہ اُس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو مہارا جا مہاری سنگھ کے نام لکھا۔

”کشمیر میں اگر کوئی ذمہ داری نبھاسکتا ہے تو وہ شیج عبداللہ ہے اُن کی

شخصی دیانت اور دماغی توازن کے بارے میں میری رائے بہت ہی عمدہ ہے۔ کشمیر میں اُن کے بغیر کسی مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل دریافت نہیں کیا جاسکتا۔

ان حالات میں ایک افواہی صورت اختیار کی گئی۔ مہر محمد صاحب جن دستور وزیر اعظم ہے لیکن ہمارا راجہ جے جے انتظامیہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کر دیا اور میں نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جوں میں اپنے عہدے کا حلف لیا۔ مسئلہ کے بعد ریاست میں ۲۸ وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ مگر میں پہلا کشمیری مسلمان تھا جو اس عہدے پر فائز ہوا تھا۔ میں نے یہ منصب سنبھالتے ہی سرگرمیکریٹ میں حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے خطاب کیا۔ میں نے انھیں اس نوجوانی کیفیت میں بہت وحوصلہ قائم رکھنے اور اپنے فرائض مستعدی سے انجام دینے کی تلقین کی۔ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہیں پاکستان سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ لیکن ہمارا موقف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق کشمیر کے لوگوں کو ہے۔ اسی لیے ہندوستان سے الحاق کی نوعیت عارضی ہے اور یہ نتائج رائے شہاری ہے اور ہم بھی رائے شہاری کے ذریعے اس کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں جناح صاحب کو اگر ابھی یہ جہوری طریقہ منظور ہو تو میں اُن سے بات کرنے کے لیے کراچی بھی جاسکتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ریاست کے درہم برہم انتظامیہ کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے اپنے قریبی ساتھیوں کو مختلف فرائض سونپے۔ بخشی غلام محمد مرکز میں میرے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بیگ صاحب انتانت ناگ کے، مصوفی محمد اکبر بھولہ کے یہ مشہور گیلانی اوڈی کے اور محمد امین وکیل ڈوڈہ کے ایڑہ بنی ایدہ بنی شہر مقرر کئے گئے۔ محمد الدین قزو صاحب کو بھی بعض ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ صادق صاحب ملیشا کے انچارج رہے اور وہ پورل

شیبے کی تنظیم میں بھی سرگرم رہے۔ اسی شے نے کچھ گلیوں کو، جن میں عوامی مزارع کی ترجمانی کی گئی تھی۔ سنگیت سے سنوار کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ کچھ چھوٹے چھوٹے ڈرامے چھپ وٹن کے موضوعات پر تیار کیے اور اس سے پاکستانی درندگی کے خلاف ایک فضا تیار کرنے میں ہمیں بڑی مدد ملی۔ مجبور کشمیری کی نظموں نے ان سرگرمیوں میں اور جان ڈال دی۔ اُن کا قومی نغمہ ”وہ لوہا غزا نو ذہانک شان پیدا کر“ مقبول عام ہو گیا۔ میں اس نغمے کو خود بھی بڑے محبوں میں ترنم سے پیش کر کے عوام کے وطنی جذبات اکبار تار ہوا تھا۔ بد قسمتی سے پھول شیبے کی اس تنظیم پر کسیوں نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ اور یہ اُن کی سازشوں کے سچے چڑھ گئی۔ چنانچہ وطن پرستی کا راستہ ترک کر کے یہ بعد میں کیوں سٹوں کے اغراض کی ڈھنڈو چینی بن کر رہ گئی۔

ملیشیا کی تنظیم میں بھی اسی قسم کے کرجائیت نے سر اٹھانا شروع کیا تو میں نے کرنل عدالت خان کو اس کا کمانڈنٹ مقرر کیا۔ اور اس کا نظم و نسق اُس کے ہاتھ میں سونپ دیا۔ چنانچہ ملیشا کے نوجوانوں نے ضلع ڈوڈہ کو فرقہ پرستی کی آگ سے بچانے میں کافی اہم خدمات انجام دیں اور کچھ نوجوانوں نے تو اپنی قیمتی جانیں بھی نچھاور کر دیں۔ ان میں غلام خان، سومنا تھہرہ، پیٹنگر ناڈوا اور کچھ دوسرے مجاہد شامل تھے جن کی کشمیر ملیشا کی تنظیم کو بہت اہمیت دینا تھا۔ کشمیریوں کو عدولوں کے بعد پہلی بار ہتھیار واپس ملے تھے۔ یہاں بادشاہ قزم نے تاریخ کی ابتدا سے ہی اپنی عسکری صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا۔ راجہ لٹاوتیہ کی فوجوں نے ایک طرف وندھیا پل اور دوسری طرف منگولیا کی حدوں تک کشمیر کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور خود لٹاوتیہ منگولیا کے ہی کسی صحرا میں پران تیاگ آیا تھا۔ مسلمان مسلمانین کے وقت میں سلطان شہاب الدین نے پنجاب اور سندھ کو فتح کیا تھا۔ اُس کی فتوحات اتنی شاندار تھیں کہ علامہ اقبال

اس کے توسط سے کشمیر کی عسکری روایات کا ذکر اس فن پر لکھ میں کرتے ہیں۔

در زمانے صف شکن ہم بودہ است

چہرہ و جانیا ز پیر دم بودہ است

عمر با غل رخت بر بست و کشاد

خاک ماویگر شہاب الدین نژاد

محمود غزنوی نے جب شمالی ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر کشمیر کا رخ اختیار کیا تو ہینول ٹورس میدان کے اس طرف محاصرہ کرنے کے باوجود اس کی کچھ پیش نہ ملی اور آسے کشمیر سے ہزیمت کھا کر لوٹنا پڑا۔ متعلقوں نے کشمیر پر پے در پے حملے کئے لیکن مہکوان داس جیسے جہاں دیدہ جرنیل یہاں سے پسپا ہو کر چلے گئے اور پھر اکبر بادشاہ کو کشمیر کی بجائے ملکت علی سے کشمیر پر سبقت حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو جانا پڑا۔ کشمیر کے اس بارے میں کشمیر زبان کو متعلق بنانے کے لیے متعلقوں نے ان پر فوجی تربیت کے دروازے بند کر دیے اور بعد میں ملکت علی، افغانوں، سیکنوں اور دیگروں نے بھی برقی۔ لیکن اب کشمیری ہتھیار حاصل کر کے اپنی شاندار فوجی روایات کے احیا کے لیے جیجے ہو رہے تھے۔

ادھر ہم کشمیر میں قبائلیوں کو بھیجے وکیلے میں سرگرم عمل تھے۔ ادھر جوں میں ہمارا جاہری سنگھ فرقہ ہر سنی کی آگ کو بھونکانے کے لیے خوب ہاتھ پر مار رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرنگار سے بھاگ کر جوں ہی وہ رام بن پہنچے تھے تو انھوں نے پہلا خانہ داغ بندوقوں کو مسلمانوں کے غلات کو اٹکانے کی مہم شروع کی تھی۔ وہ جب سفر کی تھکان دور کرنے کے لیے رام بن کے ریٹ ہاؤس میں پہنچے تو انھوں نے چائے طلب کی تو بیٹے تھکے سے چائے لانے والا بھرا ایک مسلمان تھا۔ اداس کے سر پر دھڑی ٹوپی تھی اس کو دیکھتے ہی ہمارا جاکے تھکا کر مڑ گزرا اور اس نے چائے پیئے سے انکار کر دیا۔

جوں پہنچ کر ہمارا جاہ اور مہارانی تیار دیوی نے کھسائی کی بی طرح کھپا نوچنا شروع کیا۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے انھوں نے جوں کو اتنا پسند نہندوں اور لاشیروں سیوک سنگھ کے تربیت یافتگان میں ٹھیک ہتھیار تقسیم کئے اور انھیں مسلمانوں کا صفایا کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ایسی ہی ایک ٹوٹی کی سربراہی پر و فیصلہ راج مدھوک کر رہے تھے۔ انھوں نے اوجھور اور دیرپا سی مسلمانوں کے خون ناحق سے خوب ہاتھ رنگے ہندو اکثریت کے دوسرے علاقوں میں بھی ایسی ہی وارداتیں پیش کیں۔ انہی دنوں ایک سال میں ہمارے کال کے ساتھ ایک چھوٹے ٹیکٹ ہوائی جہاز میں جوں آیا۔ جوں کے مسلمانوں کا وفد شیخ عبد الحمید کی قیادت میں جواہر لال سے مللا۔ اور ان کو اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ جواہر لال نے انھیں دلاسا دیا اور ہمارا جاک بھی پرائیویٹ طور سرزنش کی کہ جو ہتھکنڈے وہ استعمال کر رہا ہے وہ مذہب اور تھلک ہیں۔ جوں کے مسلمان ملا اپنے اپنے مکانات میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک دن ان کو جکھ دیا گیا کہ انھیں سوچیت گڑھ کے راستے پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ انھیں اپنی جان کے لائے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس جھانے میں آگئے اور بسوں میں سوار ہو گئے۔ انھیں سانہ کی طرف لے جایا گیا۔ اور وہاں بسوں سے اتار کر گاڑیوں کی طرح کاٹ کے رکھ دیا گیا۔ ان میں معتز اور ادھر معتز شہر بھی شامل تھے۔ اور بدھ متی عورتیں بھی۔ ان دنوں اگر کوئی گوجر وغیرہ بے جبری میں شہر کی طرف اٹھتا تو سنگھ کے حواریاں کی طرح ناک کر اس کو قتل کر دیتے تھے۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اس متقی عام کے بچے ہمارا جاک اس کی مقصد ہمارا دانی اور مہر چند مہا جان کا ہاتھ کار فرما تھا۔ کشمیر میں اپنا سب کچھ نروائی میں بھونک کر بے بسی بیکار تھے۔ اور فرقہ پرستی کے بھوکے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن جوں میں میں بیٹے ہوئے جنھوں کی ان ریشہ و دانیوں سے چاروں طرف

زیر پھیل رہا تھا۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ مہاراجا اور مہارانی کے ذہنوں سے اُٹھنے والی اس
منہوس آگ کے شعلے ڈوڈھ کو پیٹ میں لیے کے لیے چلنے لگے۔ وہاں مسلمانوں کی بڑی
تعداد رہتی تھی۔ اس لیے ہیں اُن کو بچانے کی ٹیکہ دلائی ہو گئی۔ کرنل عدالت خان نے ہاں
پیشیا کی ایک ٹکڑی روانہ کی۔ جس نے بڑی بہادری اور بڑی دانشمندی سے آگ کے
شعلے بجھا دیے۔ مہاراجا نے جنوں میں اپنے ایک قزاق دار کزل بدو سنگھ چٹانیر کے چچین
ایئرمنسی آفیسر اور پیر پتیم سنگھ کو جنوں کا گورنمنٹ کر دیا تھا۔ یہ لوگ اقلیتوں کے جان و
مال کی حفاظت کرنے کی بجائے منافقات ہیں اُن کے کمپوں پر ہونے والے حملوں کی
حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور انھوں نے بمال کے کام کے ساتھ پینڈت پریم ناتھ ڈوڈھ
کو بھی وابستہ کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کی ساری مسلم آبادی راشٹریہ سیم سنگھ کے
رحم و کرم پر تھی۔ اور کبھی کبھی تو اُن کی نگرانی میں کمپوں سے مسلمان عورتوں کو فوج بھی
کیا گیا۔ صورت حال ایسی سنگین ہو گئی کہ جواہر لال نہرو کے ایک ذاتی جان سپہان کے
آفیسر جی۔ سی۔ بان، جو جواہر لال کے حکمرے جنوں میں محکمہ جاسوسی کے ڈیوٹی انسپکٹر جنرل
کے طور پر کام کر رہے تھے نے جواہر لال کو ایک خاص مکتوب میں اُن واقعات کی طرف
متوجہ کیا اور لکھا کہ:-

”ڈوڈھ اور راجپوت سپاہی جنوں میں مصیبتوں اور تیش و قنارت کے لیے
ایسی طرح ذمہ دار ہیں جس طرح پاکستان سے آئے ہوئے قبائلی حملہ آور یہ
تشیروں کی طرح گاؤں کو جلاتے ہیں، عورتوں کو اغوا کرتے ہیں اور اُن کی
جزیت لیتے ہیں۔ ان غیر متہذبانہ افعال میں اُنھیں مہاراجا اور سپہان کے
حکمران طبقوں کی خاموشی سے اور بھی شرمیلی ہے۔“

اُن دنوں جنوں میں جو کچھ ہوا اُس میں مہارانی تارا دیوی کا بڑا ہاتھ تھا۔ تارا دیوی ایک

پراسرار کردار راج گرو کے زیر اثر تھی۔ راج گرو کا اصل نام سواری سنت دیو تھا۔ اور وہ
ایک غیر ریاستی شخص تھا۔ وہ کافی خوبصورت تھا۔ رشیم کے کپڑے پہنتا اور قیمتی عطر میں
بسا رہتا۔ مہاراجا نے اچھل کی بارہ دری میں اُس کو رہنے کی اجازت دی تھی اور بعد
میں چشمہ شاہی کے ایک جنگل میں بھی رہتا تھا۔ جہاں محل کی رانیاں اُس کے درشن کو اتیں
سنت دیو کے غلات ایک انگریز خاتون مسز برک نے جو چشمہ شاہی میں رہتی تھی، حکومت
سے رشکات کی کہ وہ اُس کی جوان دوستیوں سے بے گین بڑھا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے

لیے اُسے ریاست سے باہر جانے کو کہا گیا۔ لیکن لوگ اُسے کشمیر کا راسپوتین RASPUTIN
کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ وہ کدھ قسم کا جنونی فرقہ پرست تھا اور مہارانی کو اُس نے
اپنی منہمی میں کر لیا تھا۔ پہلے پہلے تو مہارانی کی ہر سی سنگھ کے ساتھ نہیں بنتی تھی۔ لیکن
۱۹۳۵ء کے اُس پاس مہارانی کا محل کے معاملات میں عمل دخل بڑھنے لگا۔ ایسا لگ رہا
تھا کہ نتیجہ عروسی کے بعد مہاراجا اپنی جوان خوبصورت اور اپنی عمر سے بیس سال کم
تو عمر دیوی کے زیر اثر آ جا رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کا ولی عہد بادشاہ جوان ہوتا
جا رہا تھا۔ اور اُس کی وجہ سے اُس کی ماں کا منصب بڑھ رہا تھا۔ بہر کیف، مہارانی
نے سنت دیو کے ہی مشورے پر پنجاب سول سروس کے ایک ریٹائرڈ آفیسر رام لال تھو
کو جو نہایت ہی معتصب شخص تھا، مہاراجا کا دربار حضور دی اور بعد میں نائب وزیراعظم
مقرر کر دیا۔ جنوں میں مہارانی، راج گرو اور رام لال تھو کا یہی کیون اب شد و مد
سے کام کر کے غضب ڈھا رہا تھا۔ مہا جن صاحب تو کٹر آریہ سماجی اور تنگ نظر تھے
ہی، وہ رہی سہی کسر تو ہی کرتے رہے۔ دوسری طرف منظر آباؤ سے بارہو لنگ ایک
اور آفت مچی تھی۔ قبائلیوں نے خاص طور پر سکھوں کو چن کر اپنا نشانہ بنایا تھا۔
اُن میںا جتنے لوگ بھی جان بچا سکے وہ سرنگرنہ پہنچ گئے۔ اُن کی حالت بہت بری تھی، اکثر

اُن کے غرض و اقارب قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور اُن کا اثاثہ لوٹ لیا گیا تھا۔ بہت سے خود بھی گھائل ہو کر آئے تھے۔ ہم نے اُن کی دھارس بندھانے کی حتی الامکان کوشش کی اور اُن کی مدد بھی کی۔ لیکن وہ اتنے پیسے ہوئے تھے کہ جلد از جلد ہاسپتال پارک کے بتیں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے پاس انیسویں کا انتظام نہیں تھا۔ بتی گاڑیاں تھیں وہ مہاراجا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور کچھ گاڑیاں پاکستان میں ہی روک لی گئی تھیں۔ میں نے انت نامگ کے بیس بائیس تاکہ بانوں کو آمادہ کیا کہ وہ ان مصیبت زدگان کو تروپا پہنچائیں اور ہم سے منہ مانگے دام لے لیں۔ انھوں نے پہچانک بٹ کا اظہار کیا تو میں نے اُن سے انسانی ہمدردی کے نام پر اپیل کی کہ آخر کار وہ آمادہ ہو گئے اور ان مصیبت زدگان کو حفاظت کے ساتھ جوں پہنچایا۔ لیکن اُن کی ٹپن اُن کے لیے وبال جان بن گئی جب وہ واپس لوٹ رہے تھے تو گروڈ کے قریب ایک سنگھی ٹوپی نے ان پر گھات ماری۔ من کے تانگے چھین لیے اور اُن کی ساری پونچھی تھیالی اور پھر انھیں نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ ایک تانگہ بان کسی زبانی طرح بچ نکلا اور اُس نے یہ خبر انت نامگ پہنچا دی۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک گھمراہ ہو گیا۔ انت نامگ میں کشمیری پندرتوں کی خاصی آبادی تھی۔ دوسرے فوجی علاقوں سے کشمیری پندرت بہت کر انت نامگ میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں گروڈ کی واردات کا خلیازہ اُن کشمیری پندرتوں کو نہ آٹھا پاڑے۔ بیگ صاحب اور دوسرے کارکنوں نے بڑی سخت کی۔ لوگوں کو سمجھایا کہ انت نامگ کی بات ہے تو اُن لوگوں سے لیا جانا چاہئے جو اس فعل کے مرتکب ہوئے نہ کہ اُن سے گناہوں سے جو ہمارے گھروں میں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ یہ بلا اس طرح ٹل گئی۔ لیکن جوں سے بہت تیشوریٹ نامک اطلاعات آتی رہیں۔

کشمیر میں ایک گورنر امینان ملا تو میں نے جوں کا توں کیا۔ جموں جاکر ہم نے وہاں جو حالات سنے اُن سے ہمارے رو گئے کھڑے ہو گئے۔ ہم نومبر ۱۹۴۷ کو سر دار پشیل نے ہندوستان کے ڈیفنس منسٹر سردار بکتر سنگھ اور مہاراجا چٹالہ کے ساتھ جوں کا وعدہ کیا اور وہاں مہاراجا پر کسی سنگھ سے گفتگو کی۔ ۵ نومبر کو شہر میں دھتورہ پڑایا گیا کہ مسلمان اپنے آپ کو پولیس لائنز میں پیش کریں۔ تاکہ انھیں پاکستان بھیجا جاسکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ انھیں کوئی چالیس ٹرکوں میں سوار کیا گیا اور ہر ٹرک میں ساتھ افراد کے قریب سوار کئے گئے۔ انھیں سانبہ کے قریب ایک پہاڑی کے نزدیک اتارا گیا جہاں مشین گنیں نصب کی گئی تھیں۔ چن چن جوان عورتوں کو الگ کر کے باقی تمام جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کو اُن کی آن میں گولی سے اتارا دیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق شیر خوار بچوں کو اُن کی ماؤں کی گود میں نیزوں کی اتنی سے ہلاک کیا گیا۔ اس گروپ میں جو مردی غلام عباس کی صاحبزادی بھی تھیں جنھیں اخوا کر لیا گیا اور جنھیں میں نے بعد میں ذاتی کوششوں سے برآمد کر کے اُن کے نامور والد کے پاس پاکستان بھجوا دیا۔ میں نے جب یہ حالت زار سنی تو انسانوں کی دردنگی پر میں خوب خوب آٹھا کشمیر میں قبائلیوں نے جو خوفناک بدتمیزی برپا کیا تھا اُس کے گھاؤ میری روح میں تازہ تھے جنوں کے ان کچھوں سے میرے زخموں کے دانگے پھر سے کھل گئے۔ لیکن یہ روئے دھونے کا وقت نہیں تھا۔ ایک طرف میں نے جوں میں مصدقہ حال کو بہتر بنانے کے لیے کارروائی شروع کی اور دوسری طرف ہر نومبر کو پاکستان جانے کے خواہشمند مسلمانوں کو ایک کانوائے کے ذریعہ روانہ کیا۔ جس کو باقاعدہ فوجی گاڑی کے تحت بھیجا گیا تاکہ ۵ نومبر کو قتل عام کا پھر اعادہ نہ ہو۔

میری بیگم میرے ساتھ جوں آئی تھیں۔ وہ ان حالات سے بے حد متاثر ہوئیں۔ انھوں نے اُن کے کس اور مظلوم عورتوں کی امداد کے لیے کیپ تاحم کیے جو انھوں نے داولا کی کہیں گاہوں سے لڑائی گئی تھیں۔ وہ اب ناموس کے تقاضوں کے تحت پاکستان جانے پر مائل نہ تھیں۔ اس لیے بیگم صاحبہ نے بہت سے مسلم نوجوانوں کے ساتھ اُن کی شادی کے انتظامات کئے اور اُن کا گھر لیانے میں دن رات دلچسپی لیتی رہیں۔

جنوں کے حوام نے میرا ترپوش استقبال کیا۔ میں نے ایک بڑے حوامی چلے سے خطاب کیا اور انھیں کشمیر کے حالات سے روشناس کروا دیا۔ جنوں کے بعض حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی تھیں اُن پر میں نے وہاں کی اکثریت کو آڑے ہاتھوں لیا اور حوام کو سمجھایا کہ یہ راستہ انھیں تباہی کی طرف لے جائے گا۔ میں نے دُورِ ماہِ چوتوں کو لٹکارتے ہوئے کہا کہ انھوں نے نائیوں اور دھوبیوں کے ساتھ اُن بے گناہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو بھی مار ڈالا ہے جو لیگ پاکستان کے الفاظ سے نا آشنا تھے۔ وہاں بعض ایسے غیر مسلم دوستوں کا بھی پتہ چلا جنھوں نے مسلمان عورتوں بچوں اور مردوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی تھی۔ میں نے اُن کی سراہنا کی اور اُس فائت گری کے عالم میں مجھے امید کی کہ جنت ہی کن دکھائی دی۔ جنوں کے نزدیک ڈیگیاں کیپ میں بہت سے مسلمانوں کو ایک کٹلے میدان میں رکھا گیا تھا۔ اُن کے پاؤں کے نیچے میں زمین کا فرش اور سر پر نیلے آسمان کی چھت تھی۔ اُن کی حالت بڑی اتر تھی

میں وہاں گیا۔ اُن کو ٹوہا دی اور انھیں جنوں کے اسلامی اسکول میں جواب دہی سنگھ ہائی اسکول کہلاتا ہے منتقل کرادیا۔ اسی طرح سے گرد و نواح سے جو انھوں کی ہوئی مسلمان لڑکیاں برآمد ہوئیں انھیں بھی اُستاد کٹلے کے کیپ میں رکھا۔ جہاں ایک انگریز خاتون..... اُن کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ میں نے سرکاری مہمان خانے

میں ہر چند مہاجن کو بھی ملاقات کے لیے بلایا اور اُسے خوب جلی کٹی سنائی کہ وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں کس حد تک ناکام رہا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ جڑوئوں کی طرح سرنگر سے رو فیکر جو کے اب مہاراج کی شرن میں چھپے ہوئے بیٹھا ہے جس نے اُس کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ اُس کی نظروں کے سامنے جنوں کے گورنر جیت رام جوتوہ کے حکم سے جنوں کے شہریوں کو لاریوں میں بٹھا کر سامنے پہنچایا گیا اور وہاں انھیں گولیوں سے آڑا دیا گیا۔ اسی طرح آڑیاں، ایس کی ٹولیوں میں سرکاری اسلحہ خانے سے ہتھیارے کو تقسیم کیے گئے اور شہر و دیہات میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ اُن کی مال و جائداد کو لوٹ لیا گیا اور اُن کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا میں نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ اس طرح آپ نے وزیرِ اعظم کے منصب کو زموکھ کر دیا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک طرف ہم کشمیر میں مسلم فرقہ پرستی کے خلاف محاذوں پر لڑتے ہوئے ہیں اور اندرونی محاذ پر غیر مسلموں کی جانیں بچانے کے لیے جتن کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ ہمارا کام آسان کرنے کی بجائے کٹھن بندوں مسلمانوں کے قتل عام کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ میں نے اُن کی توجہ اُن کے اُس بیان کی طرف بھی دلا دی جو آگنوں نے مقامی ہندوؤں کے ایک وفد کے سامنے دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ جنوں کٹوں میں مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کا منصوبہ کامیابی سے پورا کر لیا گیا ہے میں نے مہاجن صاحب کو چیتا دی دی کہ اگر قتل و غارت کا بازار بند نہیں کیا گیا تو میں اُن کو گر قتل کر کے جل خانے میں محسوس دوں گا۔ مہاجن صاحب شرم کے ماسے لالی بھجھو کا پوگے اور کچھ دیکھ سکے۔ شاید جو کچھ مہاجن صاحب نے منشا اور اُس کی ہدایت کے مطابق ہو رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی روحِ غیبت (EVIL GENIUS) میں گئی تھیں اور دن دن مانیان کر رہی تھیں۔ مہاجن صاحب میرے پیچھے سے گھر لگتے اور

انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ فدا کو ٹھیک کرنے میں میری مدد کریں گے میں نے
مہاراجا جی سنگھ سے بھی ملاقات کی اور ان کو حالات سے واقف کیا۔ جنوں کے
خطے میں مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی تھیں ان کی طرف انھیں متوجہ کیا اور
ان سے جو بڑے نتائج پیدا ہو سکتے تھے ان سے انھیں خبردار کیا۔ مہاراجا کی حالت
خیر ہو رہی تھی۔ ان میں وہ پہلے کا سانپ نثار نہ رہا تھا۔ بلکہ سب سے لگ رہے تھے۔
انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز کیا۔ شائد ان کا بھرم فیئر انھیں
کوس رہا تھا۔ عجیب صورت تھی۔ اپنے اقتدار کے عروج میں وہ حکومت کے گھنٹہ
میں مجھ سے آنکھیں چا کر کرنے سے کتراتے تھے۔ اب وہ اپنی شکست خوردگی اور ناکارہ
کاری کے احساس سے انھیں چر رہے تھے۔ وہ صرف ہوں پاں کر کے رہ گئے۔ میں نے
بخشی قلام محمد کو جوں میں ہی چھوڑنا تاکہ وہ ہماری طرف سے وہاں حالات پر نظر رکھیں
اور جنوں کی کڑی کو بنانے میں ہاتھ بٹا سکیں۔

مجھے دنوں کی بات ہے کہ میرا دل بی جا ہوا۔ وہاں گرو نانک دیو جی مہاراج کے
جنم دن کے سلسلے میں سکھ حضرات ایک تقریب کا اہتمام کر رہے تھے۔ میرے پاس چند
سکھ دوست آئے اور انھوں نے مجھے اس تقریب میں تقریر کرنے کی دعوت دی۔
ان دنوں صورت حال بڑی گھمبیر تھی۔ دہلی میں تقریباً سارے کے سارے وہ کچھ موجود
تھے جو مغربی پنجاب کے فرقہ وارانہ فسادات دیکھ کر آئے تھے۔ اور جن کے دل میں انتقام
کی جوا آتش فشاں کی طرح پھیل رہی تھی۔ لیکن میں نے دعوت منظور کر لی۔ یہ لوگ
مہاراجا گاندھی کے پاس بھی گئے اور ان سے بھی ملے میں ان کی درخواست کی۔ مہاراجا
گاندھی ان دنوں اپنی پرارتھنا سبھاؤں میں ہندو اور سکھوں کو کھڑی کھڑی سناتے
رہتے تھے۔ جن میں ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ نفرت کے کھیل میں ذریعہ بننے سے گریز کریں۔

ان سے خاص طور پر جذباتی قسم کے ہندو کو بڑے خفا تھے۔ اس لیے گاندھی جی کچھ دیر
کے لیے تاثر کرتے رہے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بھی جیلے میں آ رہا ہوں تو انھوں
نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ خود بھی وہاں پہنچنے پر آمادگی ظاہر کی۔ لوگوں کا ایک
مٹاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو جذبات سے بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی تقریر شروع
کی تو پہلے کچھ آوازیں بلند ہوئیں لیکن جوں جوں میری تقریر آگے بڑھتی گئی مجمع خاموش
ہوتا گیا۔ بعد میں تو سکھوں نے سٹیج سے مجھے اس بات کے لیے مبارکباد دی کہ جب
سارا ہندوستان نفرت کی آگ میں جھٹک رہا ہے تو میری قیادت میں کشمیر میں ہندو
مسلمان اور سکھ کاندے کے کاندہ مالکر ٹوڑ رہے ہیں۔ اس پر مجھے میں شیر کشمیر زندہ باد
کے نعرے بھی لگے۔ گاندھی جی کی تقریر لوگوں نے انتہائی تعظیم کے ساتھ سنی اور اس
جیلے سے راجدھانی قضا میں بڑا سدھار پیدا ہو گیا۔

گاندھی جی اپنی زندگی کے ان آخری دنوں میں فرقہ پرستی کے جانے ہوئے دکھش
کو سٹلانے کے لیے ایک مہم کا طرح جنگ کر رہے تھے وہ ایک نفرتی فکرو کی طرح
اس آ سیب پر حملہ آور ہو رہے تھے اور جسم و جان کی ساری عافیتوں کو بھول گئے تھے۔
میں اسے کشمیر اور کشمیریوں کی خوش بھی سمجھتا ہوں کہ جب اس مرد باعضا کو اپنے اور پرلے
ما یوس کر رہے تھے۔ اس وقت اسے کشمیر اپنے آدرشوں کا سب سے بڑا اور آخری قلم
نظر آ رہا تھا وہ اس قلم سے چین چین کر گئے والی انسانیت اور شرافت کی کڑیوں کو دیکھ
کر باغ بان ہو رہے تھے۔ ان کا بس چلنا تو وہ ان کڑیوں کو اپنی پاد کے پتوں میں باندھ
کر چاروں طرف پھانت دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی عظیم شہادت سے پہلے وہ بار بار کشمیر
اور اس کے عوام کی بہادری اور جدوجہد کا ذکر کرتے رہے۔ ان دنوں اپنی پرارتھنا
سبھاؤں میں انھوں نے کیا کہا اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

” کشمیر کی سرزمین پر اس وقت اسلام اور ہندو مت کا امتحان ہو رہا ہے
 اگر دونوں نے اپنا اپنا حصہ صبح طوع پر ادا کیا تو اس ڈرامے کے بڑے
 اداکاروں کو ابدی شان حاصل ہو جائے گی۔ کشمیر تو روشنی کا منبع بن چکا ہے۔
 اب میری یہی امید اور یہی دعا ہے کہ کشمیر اس گھپ اندھیرے میں گم برصغیر
 کے لیے بھی روشنی کا مینار ثابت ہو۔“

” اگر کشمیر میں لڑنے والی ہندوستانی فوج کشمیر کو بچاتے ہوئے اُسی طرح کام
 آجائے جس طرح سپارٹاکس ریتے والے تھرمپلے میں کٹ گئے تھے تو میں ایک
 آسٹریجی سپاہیوں گا۔ میں اس بات پر بھی غرور نہ ہوں گا اگر شیخ عبداللہ ان
 کے ہندو مسلم اور سکھ رفیق اپنے فتن کو نبھاتے ہوئے جان قربان کر دیں۔
 وہ باقی ہندوستان کے لیے ایک روشن مثال ہوگی۔ اس سے ہندوستانی حوام
 پر یہ حقیقت از سر نو آشکار ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں۔“
 ” کشمیر نوشہرو کا ایک ایسا گہوارہ بن گیا ہے جس کی ہبک سے ہندوستان
 ہی نہیں دنیا ہبک رہی ہے۔“

” حکومت ہند نے کشمیر میں ہوائی جہازوں سے اپنی فوج اتارتے وقت
 ہمارا جاسوس کہہ رکھا ہے کہ ریاست کا افاق غیر جانبدارہ راستے شماری کے
 ساتھ مشروط ہے۔ اور اس راستے شماری میں حصہ لینے کا حق بلا امتیاز مذہب
 ملت ریاست کشمیر کے ہر باشندے کو حاصل ہوگا۔“

” لیکن کشمیر میں تو شیخ عبداللہ ہے۔ وہ بڑی بہادری سے لڑ رہے ہیں۔ بہادری
 کی میں نے ہمیشہ تعریف کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنا کرتے ہیں۔ لیکن
 اس میں بھی تو بہادری ہے۔ اور اس کی تعریف میں بھی کر دوں گا۔“

” شیخ عبداللہ وہاں کا سچا مہاراجا ہے۔ ہزاروں مسلمان ان پر فدا ہیں۔ ان کو
 شیر کشمیر کہتے ہیں۔ وہ کتا ہے، ایسا کتا اچھا نہیں لگتا۔ وہ کتا ہے کہ میں مسلمان
 ہوں۔ لیکن وہ کیسا مسلمان ہے۔ ہندو مسلمان، سکھ سب کو ساتھ لے کر
 بیٹھتا ہے۔“

” شیخ عبداللہ نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ کشمیر میں انھوں نے ہندو مسلمان اور
 سکھ کو ایک ساتھ رکھا اور ایک ساتھ مزاحمت سکھایا۔ یہ بڑی بات ہے۔“

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ ایک طرف میں کشمیر کی سرزمین پر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر
 گاندھی اور ان کے ہندوستان کے اصولوں کے لیے لڑائی لڑ رہا تھا اور بعین اُسی
 وقت دہلی میں میرے خلاف غرض مندوں نے سازشوں کے بیج بونے شروع کر دیے
 تھے۔ گاندھی جی کے پاس بھی یہ لوگ میرے خلاف ان پاشناپ کہنے کے لیے پہنچ جاتے
 تھے۔ اور ایک مرتبہ گاندھی جی کو کھلم کھلا پرستنا سبھاؤں میں کہنا پڑا کہ ایک طرف
 شیخ عبداللہ اتنے بڑے اور اتنے مشکل کام میں مبتلا ہوا ہے دوسری طرف اس کے خلاف
 کھسکھس رہ رہی ہے۔ ایسا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ گاندھی جی کے پرائیوٹ سیکریٹری بیانے
 لال نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ان دنوں ہندوستانی کامینہ کے کچھ ارکان
 میری شخصیت اور ارادوں کے متعلق شکوک میں مبتلا تھے۔ چنانچہ گاندھی جی نے
 ہمارا جاسوس گھڑی سے دستبردار ہو جانے کا خیال پیش کیا تو یہ لوگ چیٹھ ان کے پاس
 پہنچے اور ان سے کہتے گئے کہ شیخ صاحب سے زیادہ ہمارا جاسوس پر اعتماد کیا جانا چاہئے۔ اس
 بات سے مرکزی کامینہ میں بھی کافی تناہی رہی۔ لیکن گاندھی جی نے انھیں یہ کہہ کر خاموش
 کر دیا کہ اصول کے معاملے پر سمجھوتہ کرنے سے کہیں زیادہ اصول کی خاطر خطرہ مول لینا
 بہتر ہے۔ گاندھی جی کے ان خیالات سے میرے مخالفین بے حد متحیر ہو رہے تھے ہر پارٹی

ہر سنگ و فیر کا خیال تھا کہ میں مہاتما گاندھی کو جوں کے واقعات کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ یہ اذھوری حقیقت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب میں گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو وہ مجھ سے بولے کہ تقسیم کے بعد ہمارا جاکے فوجوں نے جوں میں جو کچھ کیا ہے کیا اس کے متعلق اطلاعات صحیح ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ بد قسمتی سے جو اطلاعات آپ تک پہنچی ہیں وہ ٹھیک ہی ہیں اس پر سکون کے اس سمندر میں جیسے جوار بھانسا آگیا۔ گاندھی جی نے اپنی آواز اونچی کی اور بولنے لگے کہ کچھ کہیے آپ ہمارا جاکے فوجیوں کو کم کرنے کے بارے میں چپ سادے ہوئے ہیں۔ آپ ایسا کریں گے تو اپنی جہاز سے دشواریاں گھٹا کر دیں گے۔

مہاتما گاندھی کو علاقے سے زیادہ اصول کا معاملہ مانتے تھے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ ہندوستان کو کشمیر میں کچھ اصولوں کے لیے شمع روشن کرنی ہے اور اگر اصولوں کے بارے میں ہندو کو سمجھوتہ کرنا پڑے تو کشمیر ہی کیا ساری ریاستوں کو بلا غلی دی جانی چاہئے۔ وہ اعلیٰ تئوں کے ساتھ مکمل انصاف اور فکرم کرنے والوں کو ان کے جرائم کے مطابق کیڑ کر دینا ایک پہنچانے کے حق میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہندوستان رنجے میں چھوڑا جائے تو اس کی روح پاکیزہ و بوقریہ انصاف اور عدم تشدد کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ یہاں کے بہادر لوگ فکرم و مہم سے بھری دنیا کی اخلاقی قیادت کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف فوجی طاقت کے استعمال سے تو وسیع شدہ ہندوستان مغرب کی فکری ریاستوں کا تیسرے درجے کا چرب ہوگا جو اخلاقی اور آئینے محروم رہے گا۔ وہ کشمیر کو اس لحاظ سے بھی بہت اہم مانتے تھے کیونکہ یہ ہندوستان میں مسلم اکثریت رکھنے والی واحد ریاست تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق ہندوستان کے سیکولر ازم کی صداقت کا اصل معیار کشمیر ہوگا اور اگر ہندوستان کشمیر کے تمام کو راجی دیکھ سکا تو ساری دنیا میں اس کی شہرہ سبز ہو کر رہ

جائے گی۔ کیونکہ مسلمان ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان کی دو قومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم کے بعد کشمیر میں ہو رہے جو کہے پر ان کی رنگا بنی مرکز میں کشمیر ہندوستان کے مستقبل کا عنوان بھی ہوگا اور ایمان بھی۔

گاندھی جی کشمیر کے مسائل کو نہایت نازک سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسی خشک گھاس کے انبار میں ایک دھکے ہوئے انگارے کی۔ خدا بھی ناموافق ہوا جلی تو سارے کا سارا برصغیر میں کی آگ کے شعلوں میں لپٹ جائے گا۔ اسی لیے وہ ہمارا جاکے جرائم کا زبردست احساس رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ کشمیر کے لوگوں کو کسی فوج پر تکیہ کرنے کی بجائے عدم تشدد پر یقین رکھنے والے ایک لشکر میں منتظم کر کے اپنے آپ کو اپنی سرزمین کی عزت کے لیے قربان کرنا چاہئے تاکہ ان کے دل میں نہ خوف نہ رہے اور نہ فتنہ۔ اس طرح سے کشمیر ایک ایسی مقدس سرزمین میں تبدیل ہوگا جہاں کی ہلک سے ساری دنیا متعطر ہوگی اور جس کی بہادری انسانیت کا ایک نیا باب رقم کرے گی۔

گاندھی جی کی موجودگی اور دوسری مجبوروں کا خیال کر کے اس وقت قومی دہلی کے لوگوں میں میرے یہ مخالفت خاموش رہے لیکن مسئلہ کے لیے اسی دن سے گھٹات لگی رہی اور ظاہر ہے کہ اس گروہ کی سربراہی حکومت ہند کے ممتاز وزیر داخلہ اور ہندوستان کے مرد آہن سردار و بھائی پیلے نے نفس نہیں کر رہے تھے۔ مجھے اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ سابرمتی کا یہ سنت زندہ رہتا تو نہ مسئلہ کا زخم میں آسکا اور نہ کشمیر یوں کو اس نرے کے خوفناک عواقب کا نشانہ بنایا جاسکتا۔ اس وقت کے گھاناٹوب اندھیاسے میں مہاتما گاندھی اپنے کردار اور گفتار سے علامہ امتیاز کے اس شری قلم تصویر کئے۔ جو اپنے گوشہ نشین لیکن چرخا پنا جلال ہے وہ مرد و دیش میں کوئی نہ دے ہیں انداز نظر۔

لرزیشیں اور لغزشیں

قبائلیوں نے کشمیر میں جو حرکتیں کیں، ان کی وجہ سے یہاں پاکستان کے خلاف بڑی بد نظمی پھیل گئی تھی۔ اس حد تک کہ پاکستان کے حق میں کھلے ہندوں بولنا جان چوکنا کا کام بن گیا تھا۔ ان دنوں بارہ بولہ کے ڈپٹی کمشنر چودھری فیض اللہ خان تھے۔ جو کشمیر کے ایک سابق شیر مال جو دھری قحوی محمد ناظر کے بیٹے تھے۔ جب قبائلیوں نے بارہ بولہ پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے اپنی جانب سے جو دھری صاحب کو بھی بارہ بولہ کا ڈپٹی کمشنر مقرر کیا اور وہ پاکستان کی طرف سے کام چلانے لگے۔ لیکن جب بارہ بولہ پھر ہمارے ہاتھوں میں آیا تو کمشنر کا نفرس کے رہنما چودھری صاحب کو گرفتار کر کے لائے اور سرنگر کے لال چوک میں انھیں عوام کے سامنے پیش کیا گیا۔ عوام نے ان کی کافی تذلیل کی اور بعد میں انھیں حفاظتی اقدام کے طور پر جیل بھجوا دینا پڑا۔ ایسا ہی ماہرا خواجہ سلام شاہ نقشبندی کے لڑکے حسام الدین کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ہندو دارہ میں وہاں کے مسلمانوں نے اسے ایک مہم مذہب خیر و کاروان اہرام میں کہ اس نے قبائلیوں کے ساتھ اشتراک کیا تھا۔ اپنی اجتماعی عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا اور اسے اس لیے

موت کی سزا سنائی کہ اس نے وہاں کی اقلیت پر ظلم ڈھائے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ پاکستانی حملے کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کہنا غلطی واقعہ ہو گا کہ کشمیر میں پاکستان کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ کو حملے سے پہلے ہی پاکستانی اپنے ملک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کو لینے کے لیے پاکستان کے کچھ معتد سرنگر آئے تھے۔ وہ سرنگر کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور رات کے اندھیرے میں میر واعظ صاحب کو وہیں بلوا لیا۔ انھوں نے میر واعظ کو یہ اطلاع دی کہ پاکستان کشمیر پر چڑھائی کرنے ہی والا ہے اور پاکستان کے ارباب اقتدار کی خواہش ہے کہ میر واعظ اس حملے کی رہنمائی کریں۔ اور پھر پاکستان کی طرف سے یہاں کے حاکم اعلیٰ مقرر ہوں۔ مولانا موصوف کوئی سیانے سیاست دان تو تھے نہیں بلکہ بہت محبوبے بھائے تھے۔ جاہ پسندی ان کو ورثے میں ملی تھی۔ وہ اس جہانے میں آگئے۔ اور علی الصبح ان انجیلوں کی ہر ای میں پاکستان روانہ ہو گئے۔ لیکن بعد میں حملے نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ پاکستانیوں کے منصوبے دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔ اور مولوی صاحب پاکستان میں ہی اٹک گئے۔ ان کی جماعت کا دائرہ سرنگر کے چند قحقوں تک محدود تھا۔ اور ان کے پیروں کی تعداد میں بائیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ یہ لوگ اپنے میر واعظ کے بغیر بے سہارا رہ گئے۔ قبائلیوں کی کرکوتے کے باعث اور عوام کے جذبہ نفرت کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنا غم وقفہ فی لینا پڑا اور دم بخود ہو کر رہ گئے۔ میر واعظ صاحب کی بیگم صاحبہ اور ان کے دوسرے افراد کنبہ میں پر رہ گئے تھے۔ جب ہم نے انتظام و انصرام سمجھا لیا تو ان کی بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم نے انھیں حفاظت کے ساتھ سوچیت گڈو کے راستے پاکستان بھجوا دیا اور ان کے ساتھ کچھ نامزد افراد بھی پاکستان چلے گئے۔

سرکار سے وابستہ کچھ مسلمان سرکاری ملازم پاکستان کے حق میں عوام کو ابھارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں باہلی ناخواستہ انھیں ان حرکات سے باز رکھنے کے لیے جیل میں قائل دینا پڑا۔ کمال یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے مسلمان ان خیسروں کو جیل میں جانے کا کہنا دیا۔ کمال یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے مسلمان ان خیسروں کو جیل میں جانے کا کہنا دیا۔ لیکن اُس وقت پاکستان کے حق میں والے یہ انھیں اپنی جان کے خوف سے چلے بہانے تراشتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ کرنل عدالت خان کے سوا اس سلسلے میں کسی نے سامنے آنے کی جرأت نہیں دکھائی۔ کچھ دوستوں نے پاکستان جانے کی راہداری طلب کی۔ چنانچہ ہم نے انھیں سوچیت گڈھ کے راستے پاکستان جانے کی اجازت دیدی جو دوست جیل میں پڑے ہوئے تھے، ان میں چودھری غلام عباس خاں، مولوی عبدالغنی، آن کے بھائی بشیر احمد، جناح صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری خورشید حسن قابل ذکر ہیں۔ میں جیل میں اُن سے ملنے کے لیے گیا اور انھیں یہ مشورہ دیا کہ جب تک راستہ شکاری کا وقت نہیں آتا وہ خاموشی اختیار کر لیں۔ مناسب وقت پر جس طرف بھی راستے دینا چاہیں آزادی سے دے سکتے ہیں۔ لیکن جب تک ہم ایک ملک کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں اور میدان جنگ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں کوئی بھی حکومت اُس ملک کے حق میں کھلم کھلا سامنے عام منتظم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ ہم کسی کے غیر کو خریدنا نہیں چاہتے۔ لیکن ملک میں امن و سلامتی کی بضاد دوبارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ شرائط کے تحت یہاں رہنا چاہیں تو انھیں خوشی سے اُس کی اجازت ہوگی اور اُن کے ساتھ کسی قسم کی سختی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سب دوست پاکستان جانے کے ڈر سے اگر دُور مند تھے جو ان کے خوابوں کا دیں بن گیا تھا۔ چنانچہ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم

نے انھیں سوچیت گڈھ کے راستے پاکستان روانہ کر دیا۔

چودھری غلام عباس صاحب "کشمیر چھڑو" میں اپنی گرفتاری کے وقت سے ہی جیل میں پڑے ہوئے تھے۔ میں اور میری ٹیم دونوں اُن سے ملنے کے لیے جیل میں گئے۔ وہاں ایک بڑا جذباتی منظر تھا۔ اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ کافی شفقت اور محبت سے ملے۔ میں نے انھیں تمام کوائف سے آگاہ کیا اور درپیش تھران کو دُور کرنے کے لیے اُن کی راستے طلب کی۔ ہم لمبی گفتگو کے بعد اُن میں نتیجے پر پہنچے کہ ریاست میں راستہ شکاری ممکن نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے مزید خونِ خرابہ ہونے کا امکان ہے۔ البتہ اگر ریاست کو دونوں ممالک، ہند اور پاکستان آزاد رکھنے کی ضمانت دیں تو شاید اس سے معاملہ سلجھ سکتا ہے۔ میں نے چودھری صاحب کو جیل میں ہی قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن اُن کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے۔ بہر حال میں نے انھیں صلاح دی کہ وہ پاکستان جا کر جناح صاحب کو وہ راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں جس پر ہمارا اتفاقِ رائے ہو گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ چودھری صاحب نے اس تجویز کو جناح صاحب کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ لیکن جناح صاحب نے اُسے ٹھکرایا تھا۔ بلکہ اُن نے چودھری صاحب کے خلاف اُن کے رفیقین اور حریفوں کو طرِ حجر کے افسانے تراشے کا موقع ہاتھ آگیا۔ جیل میں جو کچھ کچھ مسلمان رہ گئے تھے وہ سب سبھا لکھتے جانا چاہتے تھے۔ ہم نے انھیں باز رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ اور انھیں پھر سے آزاد ہونے اور کاروبار کرنے کے لیے بہرنگان امداد پیش کی۔ لیکن اُن کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا۔ اُس سے وہ اس قدر ہم گئے تھے کہ انھیں ایسا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انھیں سب سبھا لکھتے بیٹھے میں اپنی غفلت نظر آتی تھی۔ شاید اُن کے دل میں یہ بات بھی تھی کہ وہاں اُن کی آبِ کلا کیلئے حالات زیادہ سازگار نہیں گئے۔ بہر حال ہم نے اُن کی شدید خواہش کا احترام

ریکی اور لاریوں میں بٹھا کر انھیں سوچیت گندھ سے پار پہنچا دیا۔ جوں میں مسلمانوں کے چند ہی گھر ایسے بچ گئے جو اپنی جگہ سے نہیں اٹھ سکے۔

تحریک حریت کشمیر میں مولوی عبداللہ وکیل اور اُن کے خاندان نے بھی اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ خود مولوی عبداللہ احمدیوں کے لاہوری مکتب کے پیر تھے۔ اور مسلمانوں سے پہلے ہی انھوں نے اپنے مکان واقعہ کاجری مسجد میں درس دینا شروع کیا تھا۔ وہ دفترازدن کی شکل لے کر آتے اور اس میں سنتے والوں خاص طور پر نوجوانوں کے لیے نگر و مل کا کافی مواد بھرا کرتا تھا۔ اسی تربیت گاہ سے نکلنے والے نوجوانوں نے بعد میں تحریک کے پہلے درجے کے طور پر کام کیا۔ چنانچہ کشمیر کی سب سے پہلی گرفتاری محمد اسماعیل کی تھی، جو مولوی صاحب کا درس سننا رہتا تھا۔ محمد اسماعیل، مولوی عبداللہ کی طرح علاقہ شویمان کا رہنے والا تھا۔ اور درزی کا کام کرتا تھا۔

مولوی عبداللہ میں علم کا جوہر تو تھا لیکن جو تحریک میں نے شروع کی تھی اس میں عزم و استقامت کی ضرورت تھی۔ اُن میں یہ غیثے موجود نہ تھے۔ اس لیے اِدِ مخالف کے ہلکے سے جھڑکنے سے اُن کا مزاج بدلتا رہتا تھا۔ مگر مجھے جو تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ہر خوبی رکھنے والے انسان کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں اُن کے اوصاف کو اجاگر کرتا اور اُن کی کمزوریوں کو امریکان کی حد تک برداشت کرتا رہتا تھا۔ اور اُن کے وجود سے تحریک کو جس قدر بھی فائدہ مل سکتا تھا وہ مل سکتا تھا۔ وہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اُن کے بیٹے مولوی عبدالرحیم میرے اولین ساتھیوں میں سے تھے اور مولوی عبداللہ انھیں تحریک کے ایک صیغہ اول کے قاعدہ کی حیثیت سے آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ مولوی عبدالرحیم شریعت تھے اور درویش بھی۔ پرجا سماں کا بھڑائی کے بل پر ہمارے اسمبلی ممبران نے مستغنی ہونے کا فیصلہ کیا۔ سر پرچو ڈال اسمبلی کے صدر تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہم اہل اہتمام آئیں۔ لیکن ہم قائل نہ ہو سکے۔ بالآخر انھوں نے مولوی عبداللہ کی

جو ہماری پارلیمانی پارٹی کے ممبر تھے، اپنے پیشے میں اتار دیا اور انھوں نے ہمارا فیصلہ سامنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اُن کے خلاف تنظیم کی ضبط شکنی کے سلسلے میں کاروائی کرنا پڑی۔ اُدھر اُن کی تحریک سے عدم وفاداری کے بدلے میں اُن کے فرزند عبدالرحیم کو متصفی مل گئی۔ انھیں متصفی کی ملازمت مل گئی تو اُن کے پاؤں ڈھونڈ گئے۔ وہ مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے آئے اور ہم مشایخار باغ چلے گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اُن کا ذاتی فیصلہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ متصفی میں انھیں نگر و معاش سے تو خلاصی مل جائے گی لیکن وہ تحریک میں حصہ لینے کی سرسختی اور سادست سے محروم رہیں گے۔ عبدالرحیم نے روفی صورت بنا کر کہا کہ اُن کا گڈارا چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ سوچیں کہ متصفی بن کر وہ کچھ کچھ کھاتے رہیں گے اور قافو قافیر مالی امداد کرتے رہیں گے۔ تاکہ میں تحریک کا کام اطمینان سے چلانے کے قابل رہوں اور احتیاج کا شکار نہ ہو جاؤں۔ مجھے تو اس وعدہ پر اعتبار نہیں آیا۔ لیکن میں نے کہا کہ آپ کے وعدے کی صداقت وقت ہی ثابت کرے گا۔ لیکن بنیادی طور پر آپ کو اس مسئلے کا خود فیصلہ کرنا ہے کہ آپ قوم کو متحدہ کار میں مجھو در کر سکا رہی کرسی پر بیٹھ کر ترجیح دیتے ہیں یا نہیں۔ میری اجازت دینے یا نہ دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال انھیں متصفی مل گئی اور اس طرح تحریک کا ایک ابتدائی ساتھی مجھ سے جدا ہو گیا۔ وہ میری مدد کے دعوے کو بھی بھول گئے۔ لیکن ایک دن میں اُن کے گھر بڑھ گیا۔ مجھے سخت تنگ دستی کا سامنا تھا اور میرے گھر میں فاقہ کشی کی فوبت آگئی تھی۔ میں نے انھیں مشایخار والی بات یاد دلاتے ہوئے کچھ رقم قرضے کے طور پر مانگی۔ مولوی صاحب کا جواب سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ انھوں نے ایک بڑا کھانا کھاتے ہوئے اپنی رام کھانا سناٹا شروع کر کے کچنوں کی بڑھائی پر کھانا فرچہ آتا ہے اور گھر کے دوسرے اخراجات نکلتے ہیں۔ غرض انھوں نے بڑی چالاک

سے خسارے کا بھٹ میرے سامنے پیش کیا۔ وہ بھی اس لب و لہجہ میں کہ میری جیسے میں کوئی تو ہوتی تو میں
 اُن کے ہی پیروں کو دیتا۔ جواب تو غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن جس طریقے سے اُنھوں نے
 میرا تقاضا نال دیا اُس پر مجھے ضرور مایوسی ہوئی اور پھر میں نے انتہائی سخت آیام میں
 بھی انہیں آزمائے کی زحمت نہیں دی۔ عبدالرحیم کے بھائی بشیر احمد تحصیلداری کی قیمت پر
 پکے گئے۔ اُن کے ایک اور بھائی محمد ایوب صاحب نے اخبار ”البرق“ نکالا اور اس کے ذریعے
 سے طرح طرح کے جن کر کے اپنی معاش کی سبیل کرتے رہے۔ لیکن جب احمدیوں
 کو پیشکش کا نفرنس سے الگ کر دیا گیا تو اُن سب نے تحریک کے تئیں محال فیانہ اور
 معاندانہ روش اختیار کی۔ پیشکش کا نفرنس سے احمدیوں کے اخراج کی تفصیل و تاریخ
 پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم نے محسوس کیا کہ قادیانیوں نے
 ہمارے قومی مقاصد کے بدلے اپنے مذہبی مقاصد کی ترویج کے لیے ہمارا پلیٹ غلام
 استعمال کرنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں اُن سے بادل ناخواستہ الگ ہو جانا پڑا حالانکہ
 یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے کہ تحریک کے ابتدائی برسوں میں اُنھوں
 نے ہماری بڑی محفلاً نہ ادا کی۔

مولوی عبدالرشید میری آخری ملاقات شیر گڑھی میں ہوئی۔ جہاں سید میں
 ریاستی حکومت کا سیکریٹری تھے۔ واقعہ اُن کے صاحب زادے مولوی بشیر کو بخشی غلام قمر
 کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ حکومت کے خلاف محاذ آرائی کی حوصلہ
 افزائی میں مصروف تھے۔ مولوی عبدالرشید صاحب پر بلا نہ شفقت سے مجبور ہو کر انھیں
 رہا کرنے کی سفارش لے کر میرے پاس آئے۔ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے
 تو نہایت فتنے کے عالم میں تھے اور اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بھلا کسی کی کیا
 سکتے؟ ہمارے متعلق بہت تیز لکڑی کرتے رہے۔ اُنھوں نے ہمیں بددعا بھی دی۔

لیکن زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اپنے سین اور شعور کو نظر انداز کر کے گالی گولیاں
 بھی اُترائے۔ میں نے انھیں بھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ سرکاری دفتر ہے ملازم
 چاروں طرف گھوم بھوم رہے ہیں۔ اُن کو ایک بزرگ ہونے کے ناطے اس قسم کا طریقہ
 اختیار نہ کرنا چاہئے اگر وہ اپنے فرزند کی رہائی چاہتے ہیں تو انھیں اپنے صاحب زادے
 کو نصیحت کرنی چاہئے کہ وہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنے فرائض خوش اسلوبی
 سے انجام دے اور حکومت کے خلاف عوام کو بھڑکانے کی روش ترک کر دے۔ لیکن
 مولوی صاحب ایسے غیض و غضب میں تھے کہ اُن پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ
 وہ اور بھی زیادہ مشتعل ہونے لگے۔ جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو میں نے مجبور ہو کر اپنے
 چہرے سے کہا کہ وہ انھیں کمرے سے باہر لے جائیے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد ہی
 وہ دنیا سے فانی سے چلے گئے اور برزخ میں اپنے فرزند عبدالرحیم صاحب کے بچے
 کے باہر اُن کی قبر بنادی گئی۔ کیونکہ وہ سبہائی مذہب کے عقیدت مند کی حیثیت سے
 انتقال کر گئے تھے اور شاید کشمیر میں دفن ہونے والے پہلے سبہائی تھے۔ ▲▲▲

میدان جنگ کی گھن گرج

جوں، ریاسی اور آودھپور میں راشٹریہ سویم سنگھ کی ٹولیوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ جو شہرستان مدوہوہ میں یا پچھے کسی نہ کسی طرح پنج نکلے تھے ان کو گھیبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں اپنی بیگم کے ساتھ ان گھیبوں میں گیا اور ان سب کو ہتھوں لے آیا۔ کچھ دیر بعد انھیں ان کی خواہش کے مطابق یا تو پاکستان بھیج دیا گیا یا انھیں خیرہ داروں کے حوالے کر دیا گیا۔

جب ہم قبائلیوں کو پیچھے دھکیلتے ہیں کامیاب ہو گئے تو چندتہا جواہر لال سرنگر کے دورے پر آئے۔ ان کے اعزاز میں لال چوک میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا جہاں انھوں نے میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اعلان کیا کہ یہ ہندوستان اور کشمیر کا ملاپ ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی طرف سے یقین دہانی کی کہ کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو توڑا گیا جاسے گا اور ان کے باقی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔ میں نے بھی اپنی تقریر میں کہا کہ یہ ملاپ اصولوں اور قدرتوں کا ملاپ ہے۔ جب تک ہندوستان اصولوں اور قدرتوں پر قائم رہے گا۔ ہمارے رشتے پر اصرار ختم نہ ہوگا۔ یہ شہر ملوک

من تو شدم، تو من شدمی، من تن شدم تو جان شدمی

ناکس نہ گوید بعد ازین من و گیرم تو و گیرم

میں جواہر لال کے ساتھ بارہمولہ بھی گیا۔ جگہ جگہ لڑائی میں کام آنے والے قبائلیوں کی لاشیں پکڑی پکڑی تھیں۔ جواہر لال نے وہاں بھی عوام سے عید گاہ میں خطاب کیا۔ اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔ اپنی دونوں سرداروں کو لہجہ بھائی پٹیل بھی کشمیر تشریف لاتے۔ اُس وقت قبائلی سرینگر پر برابر دباؤ ڈال رہے تھے۔ چنانچہ سردار شہر میں داخل نہیں ہوئے۔ ہوائی آڈے کے فوج میں ہی ایک مکان واقع تھا، سردار وہیں ٹرکے اور وہاں ہمارے مسائل اور ضروریات پر تبادلہ خیال کیا۔ یہ اُن کا پہلا اور آخری دورہ کشمیر تھا۔ وہ اُسی دن واپس دہلی چلے گئے اور اُن کے دورے کے نتیجے میں فوجی ملک پہنچنے میں یقینی طور پر تیزی آگئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری فوجیں دشمن کو پیچھے دھکیلتی چلی گئیں۔ ہماری کامیابی کی وجہ فیض آباد ہمارے ہوائی بیڑے کا مشکل کنٹرول تھا۔ پاکستان اپنا ہوائی بیڑہ مقابلے میں لانے کے لئے بیچ و تاب کھار تھا۔ لیکن برطانیہ کے وزیر اعظم کینٹن اٹلی نے پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کو تنبیہ کر دی تھی کہ اگر پاکستان کے ہوائی جہاز ہندوستان کی فوجی جہازوں کے مقابلے میں آگئے تو وہ پاکستانی فوج سے اپنے افسروں کو واپس بلالیں گے۔ پاکستان کے پاس اپنے ہوا باز تو تھے نہیں لہذا وہ سہم گئے اور بے بسی سے اپنی شکست کا نشانہ دیکھنے لگے۔ گلگت کے علاقے پر انگریز پہلے ہی حریم صاف نظریں ڈال رہے تھے اور وہ اس علاقے کو اپنی براہ راست نگرانی میں رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ روس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جاسکے۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے ۱۹۴۵ء میں مہاراجا کشمیر سے گلگت کا علاقہ

ننانفیس سال کے بچے (IEEF) پر حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے وہاں گھٹ ساؤش کی ایک نیم عسکری تنظیم کھڑی کر لی تھی۔ جو علاقے کے امن و قانون کی نگہداشت کرتی تھی۔ اس عسکری تنظیم کا مکاتھر بھی ایک انگریزی تھا۔ لیکن آزادی کے بعد انگریزوں کو یہ علاقہ مہاراجا کو واپس کرنا پڑا مہاراجا نے وہاں کا انتظام اپنے ایک قریبی فوجی آفیسر گھنسا رائے کو وہاں کا گورنر بنا کر سونپ دیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد گھٹ ساؤش نے بغاوت کر دی۔ چترال ہونمزہ، گھروہلی، پونیال، یاسین، اشکولان اور کوہ خضر وغیرہ کے راجاؤں نے جو مہاراجا کے باجگذار تھے، ان کا ساتھ دیا اور علاقہ کا پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ بریگیڈ تیر گھنسا رائے کا مزاحمت کرتے رہے۔ لیکن جب ان کی فوج بالائی توان کو گرفتار کر کے پاکستان روانہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد جوں و کشمیر میں جنگ بندی کا اعلان کیا گیا تو ہم قیدیوں کے تبادلے میں انھیں پاکستان سے بچھڑا لائے۔ گھٹ ساؤش کو فتح کرنے کے بعد یہاں سے ملہ اور اسکروا کر لیں اور بھوجی تک پہنچ گئے۔ وہ وترہ و جیلا اور گرنہ وادی پر بھی چھا گئے تھے۔ لیکن لداخ پر ابھی قبضہ کرنا باقی تھا۔ ہندوستانی فوج نے جنرل ستھیا کی کمان میں اس علاقہ کی طرف برصا شروع کیا۔ تارک میں پہلی بار کیتھ بند گاڑیاں اور ہلکے ٹینک ساڑھے گیارہ ہزار فٹ اوچے کوٹھار گھنسا رائے کو جیلا وڑے سے پار کرتے گئے۔ سڑک نہایت خراب تھی اور برت سے ڈھکی ہوئی۔ لیکن فوج نے بڑی جواہری سے بھاری آٹھر و جیلا سے آگے پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لی، ان ہتھیاروں کے میدان جنگ میں پہنچ جانے سے لڑائی کا پانسہ پٹ گیا۔ قبائلی خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتے تھے کہ یہ بھاری ہتھیاریں وہاں تک پہنچ جائیں گی، ان کے پاس اس قسم کے جدید سامان حرب کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے وہ دم و باک پیچھے ہٹ گئے۔ اور ہندوستانی فوج کرگل میں داخل ہو گئی۔ خواجہ غلام محمد

کو اس علاقہ کا ایڈمنسٹریٹر کر دیا گیا۔ ان کی قیادت میں فوج نے ایک ملبوس کی صورت میں کرگل کے بازاروں کا گشت لگایا۔ اور امن و امان بحال کیا۔

جوں کی جانب سے زیادہ دباؤ پونچھ اور جھنگل میں پڑا یہاں بھی ہندوستانی فوج نے قبائلیوں کو پس پا کر دیا۔ جھنگل نو شہر و ملک کا علاقہ قبائلیوں سے صحت کر دیا گیا۔ اب مقابلے میں قبائلی نہ رہے تھے۔ بلکہ باضابطہ پاکستانی فوج ٹرہڑی تھی۔ اگرچہ بین الاقوامی مصلحتوں کی بنا پر پاکستانی حکومت اس کے وجود سے برابر انکار کر رہی تھی۔ جھنگل کے محاذ پر یہیں اس وقت ایک بڑا صمد، اٹھانا پڑا سب بریگیڈ تیر عثمان دشمن کے قوط کے گوشے سے جان بچھو گئے جب وہ اپنی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کی لاش جیسی حالت میں بھی باقی رہی تھی۔ عوامی رائے دہی میں ممتاز رستمناؤں کی صف میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ بہر و خاک کی گئی۔ بریگیڈ تیر عثمان ایک لائن فوجی آفیسر تھے اور انھوں نے اپنی جنگی مہارت سے دشمن کے دانت کٹ کر دیے تھے۔ ویسے تو ویسے سارے فوجی آفیسروں کے ساتھ بڑے خوش گوار تعلقات تھے۔ لیکن بریگیڈ تیر عثمان کو میں بڑے بڑے قریب سے جانا اور ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ بڑے شریف اور مفسر انسان تھے۔ ان کا مستقبل بڑا شاندار نظر آ رہا تھا۔ لیکن تقدیر کے آگے کسی کی پیش رفتی ہے۔ ان کی موت کا یہ پہلو بہر حال تائبانگ تھا کہ کشمیر کے محاذ پر پاکستان اور ہندوستان کی جنگ ہندو اور مسلمان کی نہیں بلکہ رواداری اور تلنگ نظری کی جنگ تھی۔ پونچھ شہر کو قبائلیوں نے چاروں طرف گھیر لیا تھا اور گرد کی پہاڑی چوٹیوں سے ان کی توپوں کے گوشے برابر شہر کے اندر گرتے رہتے تھے۔ بیشتر رستمناؤں نے پاکستان کے علاقے کی طرف پناہ لے رکھی تھی۔ ہندو اور سکھوں کا گھبراہٹ سے بڑھا تھا اور وہ کسی نہ کسی طرح جوں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن راستہ خطرناک تھا۔ اور گرد کے علاقوں میں لڑائی پوری

تھی۔ اس لئے جوں پہنچنا کارے دار و والا معاملہ میں گیا تھا۔ میں اُن کا حوصلہ بڑھانے کے لئے فوجی ہوائی جہاز میں پونچھ جا پہنچا۔ ہوائی اڈے کے استقبال ہی ایک مقام پر لوگ جمع ہو گئے۔ اُنھوں نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اپنے جواب میں میں نے انھیں دلاسا دیا۔ اُس کے بعد میں نے جہازوں کے ذریعے اُن کو جوں پہنچانے کا حسبِ استعداد انتظام کرایا۔

پاکستان نے اُن دنوں میرے سر کی ایک بڑی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ اس لئے فوج کو میری حفاظت کے سلسلے میں کافی تشویش رہتی تھی۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ مجھے اکثر محاذوں پر جانا ہی پڑتا تھا۔ فوجی جواؤں کو حوصلہ دینے کے لئے، شہری آبادی کی تخلیقات کو دور کرنے کے لئے، پناہ گزینوں کے کھانے پینے اور دیگر سہولیات کا جائزہ لینے کے لئے۔ یہ سب ایسے امور تھے کہ میں کو نبھاتے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بہر حال ہماری فوجی سرگرمیوں کی لہر اونچی جا رہی تھی اور دشمن کی صفوں میں جھگڑا بچھ رہی تھی۔ اور وہ ریاست کے بڑے حصے سے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ قریب تھا کہ ریاست ان کے قدموں سے بالکل نکل جاتی کہ یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو اچانک جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ اس میں نہ فوج سے صلاح لی گئی تھی اور نہ ہم سے مشورہ۔ اس پر طرہ یہ کہ جب جنگ بندی کی گئی تھی تو بہت آتی تو ہماری فوج کو بعض ایسے علاقوں کو خالی کرنا پڑا جن پر انھوں نے بڑی مشکل سے قبضہ حاصل کیا تھا۔ ایسے علاقوں میں کوٹلی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن جنوں میں مہاراجا ادراس کے حوالے مولائی اب بھی فرقہ وارانہ منافرت کے شعلوں کو ہوا دے رہے تھے۔ جب ۳۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی کو شہید کر دیا گیا تو مہاراجا نے اُس ایسا کی حکم کھلا طرفداری کر کے کشمیل کا نفرین کی طرف سے نکالے جانے والے سماجی جلیوس کو تیز پیر کر دیا۔ اس کے برعکس جنوں کے بازاروں میں آدھیں، ایس کی طرف سے مہاتما

کے قتل کی خوشی میں مڑھٹا ہیاں اور لڑوٹے بن گئے۔ اور معنی مشاہدین کے مطابق ایسے بہت سے قتال راج محل سے آتے تھے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے صدر مقام ناگپور کے علاوہ جوں سارے ضلع میں ایسا دوسرا شہر تھا جہاں اِس قسم کی کینہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوا۔ جب گاندھی جی کی شہادت کے بعد سارے کوگر نثار کر لیا گیا تو اُس دن جوں میں احتجاج کے طور پر ہڑتال کوئی گئی اور محکمہ جاسوسی کی اطلاع کے مطابق اِس ہڑتال کے پیچھے مہاراجا کا ہاتھ بھی کام کر رہا تھا۔

کسی بہت کدے میں بیاں کروں تو کچھ صدم ہی ہری ہری

پہلی عوامی کابینہ

سیاسی محاذ پر ہم شہری انتظامیہ کو بحال کرنے اور مضبوط بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ قبائلی حملے کے وقت انتظامیہ کے بڑے بڑے آفیسر جو صوبہ جوں سے تعلق رکھتے تھے کام چھوڑ کر اپنے گھروں میں چلے گئے۔ ہم انھیں واپس لے آئے نیشنل کانفرنس سے موزوں آدمیوں کو چن کر انھیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ جماعت کے سبھی لوگ پناہ گزینوں کے لئے آرام و آسائش اور دوسرے انتظامات میں دن رات ایک کر رہے تھے۔ جوں و کشیم ملیشیا اور پھر نیشنل کانفرنس کے شعبہ دارما کو مضبوط بنیادوں پر کھرا کر ناجی ایکسپریس کام تھا۔ اور دونوں اداروں نے کچھ خدمات انجام دیں۔ لیکن حکومت میں دو عملی کی وجہ سے قدم قدم پر وقتوں کا احساس ہو رہا تھا۔ بطور ناظم اعلیٰ کے میرا ہر سیدھا جن کے ساتھ جو وزیر اعظم تھے کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ ہم ریاست کے کونے کونے میں حالات کا مقابلہ اپنی ہمدردی کے مطابق کر رہے تھے اور مہاجن صاحب مہاراجا کے محل میں آرام کی فینڈ سوسے تھے۔ بالآخر میں نے سرکاری سرکار کو بتایا کہ یہ دو عملی نہیں چلے گی۔ مہاجن صاحب کے ہاتھ خون سے کچھ بھی کم نہیں لگتے تھے۔ میں نے قبائلی حملے کے بعد کشمیر میں ایک دو ہفتہ گزارا اور انھیں

آتشگیر اسلحہ کے استعمال میں تربیت دینے کی ضمانت لی۔ جو ہر لڑاکا نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اور سری نگر میں ہندوستانی فوج کے کمانڈر کے ہاتھ کچھ سوہراٹھیں اس کو رکھنے لگیں۔ مہاجن کو پتہ چلا تو اس نے انھیں روک دیا۔ بلکہ یہ اطلاع بھی ملی کہ اس نے یہ رائفلیں انھیں اسلحہ کے مامیوں کو فراہم کر دیں چنانچہ میں نے جو ہر لڑاکا کی توجہ بھی اس طرف دلائی جنہوں نے مہاراجا اور مہاجن دونوں کو ڈانٹ پلائی۔

جوں کے اس قتل عام کی بھنگ مہاتما گاندھی کے کاتوں میں بھی پڑ گئی تھی چنانچہ انھوں نے اپنی روایتی بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں اپنی پراپر تھنایاں سجا دیں کہا،

”مہاراجا کو جوں میں بے شمار مسلمانوں کے قتل اور مسلمان عورتوں کے اغوا کے اطلاعات ملی تھیں۔ اُسے اس کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ ڈوگرہ فوج اس کے براہ راست کنٹرول میں تھی۔ لہذا اس کو ان وار داتوں کے لئے ذمہ دار ٹھہرا دیا جانا چاہیے۔ شیخ محمد عبداللہ جوں آئے اور انھوں نے جذبات میں ٹھہرنا پیدا کرنے کی کوشش کی جوں میں جو کچھ ہوا اس کے پیش نظر مہاراجا کو الگ ہو کے شیخ صاحب اور کشمیر کے لوگوں کو پورا موقع دینا چاہیے کہ وہ حالات کو ٹھیک کریں۔“

مہاتما گاندھی کو میں نے بھی حالات سے باخبر کر رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مہاراجا کے ساتھ مہاجن کو بھی آٹے باٹنوں لیا اس کا مہاجن کو ساری عمر تعلق رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ مہاراجا اور مہاجن نے ان دنوں جو انسانیت سوز جرائم کئے ان پر ان کے خلاف کسی قیام کا مقدمہ چلا یا جاسکتا تھا جسے دوسری عالمی جنگ کے بعد کچھ نازی ججی مجرموں کے خلاف جو بدگورگ کے مقام پر چلا گیا تھا ہم نے اس مسئلہ میں کچھ حقائق ترتیب دینا شروع کئے تھے کہ

مرکزی وزارت داخلہ کو اس کا پتہ چل گیا اور پھر بری منشا کے باوجود مختلف قومی اور بین الاقوامی وجوہات کی بنا پر ہمارا اجا اور مہاجن اصفات کے کھڑے میں پیش نہ کئے جاسکے۔

سرور اقبال کشمیر میں سرور طرزی کی ایک عبوری حکومت قائم کرنا چاہتے تھے جس میں مہاجن صاحب کو اقتدار کی بالا دستی حاصل ہوتی لیکن میں نے حکومت ہند کو بتایا کہ یہ تجربہ کامیاب نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جو اسر لال نے ہمارا تجربہ کو ایک خط میں لکھا۔

”اگر ریاست میں رائے شماری ہوتی تو میں اس صورت میں ریاست کی آبادی کی اکثریت جس کا مطلب وہاں کے مسلمان ہیں، کی خوشنودی حاصل کرنا ہوگی۔ جوں میں حال یہی میں جو پالیسی روار کھی گئی اس سے مسلمان ناراض ہیں۔ اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بڑی پھیل گئی ہے اگر کوئی شخص اس صورت حال کو مدھارے میں موثر و دل ادا کر سکتا ہے تو وہ شیخ عبداللہ ہیں۔“

لیکن ہمارا اجا اور اقبال اس کے باوجود وفید رہے۔ اس پر جو اسر لال نے براہ راست سرور کو لکھا۔

”میں اس اصول کو نہیں سمجھ پا رہا ہوں جو غالباً ریاستوں کی وزارت کی ماہنامی کردہا ہے۔ یہ وزارت یا کوئی اور وزارت بحث و نظر سے بالاتر نہیں ہے۔ اور نہ اسے اس طرح کام کرنا چاہیے کہ یہ اپنی خود شماری کی سختی سے حیفاقت کرتی رہے اور باقی وزارتوں سے الگ تھلگ کام کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو حکومت ایک یوسرے وابستہ لکائی نہیں ہوتی۔ جو ایک مقصد کے لئے جو عمل ہو اور وزیر اعظم کا تو سمجھ کوئی کام ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ موجودہ مسئلے کا تعلق کشمیر سے ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سے متعلقہ سوال اٹھتے ہیں بین الاقوامی فوجی اور دوسرے جو ریاستوں کی وزارت کے دائرے سے باہر ہیں۔ اسی لئے اس کا جائزہ کاہنہ کو مجموعی طور پر متعدد داریاں پڑتا ہے۔ دوسری وزارتوں کو بھی اجتماعی یا انفرادی

طور اس پر غور کرنا پڑتا ہے، میری اس میں ذاتی دلچسپی لینے کی وجہ بھی یہی ہے تاکہ وزیر اعظم کی حیثیت سے میں بہت سی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کر سکوں۔“

جو اسر لال کی اس جھٹی کا سرور پر زبردست اثر ہوا اور انھوں نے دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخری ایام میں استعفیٰ پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے میں انھوں نے استعفیٰ کا خط بھی لکھا لیکن بات ہمارا کا گندھی تک پہنچ گئی۔ گاندھی جی نے نہ صرف سرور کو تدبیراً و عقلی کھلنے کا مشورہ دیا بلکہ ایک ملاقات میں مجھ سے بھی کہا کہ میں سرور سے مل کر انھیں اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں سرور سے ملا اور انھیں کشمیر کے انتظامیہ کی دوہلی اور اس کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا۔ سرور نے اس کے دلائل کا جواب نہ دیا چنانچہ وہ مہاجن کو مصحت کرنے پر راضی ہو گئے۔ ہمارا آج کے اُن کو پانچ سال کے لئے مقرر کیا تھا۔ چنانچہ انھیں باقی ماندہ عرصے کی تنخواہ کی رقم نقد ادا کر دی گئی۔ جوں دنوں ایک خط رقم کی حیثیت رکھتی تھی۔

مہاجن صاحب کے نائب رام لال تیرہ کو پہلے ہی رخصت کر دیا گیا تھا۔ اب چنانچہ مہاجن بھی گئے۔ تو ہمارا جانے وزیر اعظم کی حیثیت سے میری تقرری کا ذراں بار کی کیا پس ڈوڑھ شامی ایک ایک سال کے بعد ریاست کا پہلا مسلمان اور حوامی وزیر اعظم بن گیا تھا۔ میں نے اپنی کاہنہ میں بخشی غلام محمد، مرزا محمد افضل بیگ، غلام محمد صادق، سرور بدو سنگھ پٹت شیا م لال صرات، پٹت گردو حادی لال ڈوگر و کرنل پیر محمد خان کو شامل کیا۔ کرنل بلیر سنگھ چٹانید وزیر حضور رکھے گئے۔

پہلی حوامی کاہنہ میں بخشی غلام محمد کو نائب وزیر اعظم کی حیثیت سے شامل کیا گیا یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنے تمام ساتھیوں میں سے بخشی صاحب کو ہمایوں اپنی نیابت کے لئے چنا؟ اس سوال کا جواب ڈوھوٹے کے لئے اُن حالات پر

مقرر کیا۔ اونچے دوسرے کارکنوں کو مختلف عہدے سپرد کر دیے۔ یہ بات پہلے پہل انھیں ناگوار تو لگتی مگر اس سے کافی فائدہ حاصل ہوا۔ اور ایڈمنسٹریشن میں ایک نئی جان آگئی۔ خواجہ محمد امین قرہ خواجہ غلام محمد صادق کے چیمپے مہجائی اور برادر بنیسی تھے۔ ان کا تحریک میں ضرور حصہ رہا تھا۔ اور وزیر بننے کے بڑے شوقین تھے۔ لیکن میرے لئے ایک ہی خاندان سے دو افراد کو کاہنہ میں لینا ممکن نہ تھا۔ صادق صاحب قرہ صاحب سے عمریں بڑے تھے۔ اور رشتہ بھی بڑی قربت کا رکھتے تھے۔ اس لئے میری نظر ان کتاب پہلے اُن پر ہی پڑی۔ محمد امین صاحب روٹھ کر نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے اور ایک نئی جماعت پولیٹیکل کانفرنس قائم کر بیٹھے۔ بعد میں انھوں نے پاکستان سے خضیر رابطہ قائم کر لیا۔ اور سرحد پار سے مالی امداد کے نام پر کافی پونجی بٹوری۔ کچھ نوجوانوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ حمزہ اساجیہ اُن میں بھی بانٹا کرتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے کھلم کھلا پاکستان زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا لیکن کوئی خاص اثر پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ کشمیر چھوڑ دو“ تحریک میں جو نام پیدا کیا تھا اس پر بھی اوس پڑ گئی۔

(۴۲)

ایک طالع آزما کے کرتب

پاکستان کے اربابِ اقتدار کے ذہن میں کشمیر کو پاکستان میں ملائے کے لئے کئی متبادل تجاویز تھیں۔ ریاست کے ہندوستان سے الحاق کرنے سے بہت پہلے انھوں نے کشمیر کو اپنا منقہ بنانے کے لئے داؤ آزما تھے۔ لیکن وہ ان چالوں کے بے اثر ہونے کے اہرکان سے غافل نہ تھے۔ اُس صورت میں انھوں نے کشمیر کو بے زور بازو اپنے ساتھ ملائے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ دیکھیں جو ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اُس وقت دی جب وہ انٹربرسٹنگ کے اوائل میں شیخ صادق حسن کے ہمراہ مجھ سے ملنے کے لئے سر پٹنگ آئے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ نہیں کرتے تو وہ دوسرے ذرائع اختیار کریں گے۔ بعد کے واقعات نے ظاہر کیا کہ یہ ذرائع کشمیر میں قبائلیوں کے بیج دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھے۔ پاکستان کے اربابِ اقتدار نے قبائلیوں کو کشمیر کی طرف کیوں دھکیل دیا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ جب پاکستان بنا تو اس کا ہمسایہ ملک افغانستان اُس پر غور و خوض نہ کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ انگریزوں نے اُس کے بہت سارے علاقے کو چین کر جہاں ہندوستان میں ملا دیا تھا اور ڈیورنڈ لائن فصاحت پر

یعنی نہ دیکھی اس لیے جب انگریزوں نے ہندوستان سے رختِ سفر باندھا تو افغانستان نے اپنے چھینے ہوئے علاقے کی بحالی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ افغانستان کا خیال تھا کہ اس طرح اس کا قشک محاصرہ ختم ہو جائے گا اور وہ سمندر کے ساحل تک پہنچ سکے گا۔ افغانستان کے جذبات اس معاملے میں اس قدر شدید تھے کہ وہ اقوام متحدہ میں واحد ممبر تھا جس نے پاکستان کے عالمی انجمن کو ٹکڑا کر بنائے جانے کی مخالفت کی تھی۔ اگرچہ پاکستان ایک پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے یہ خیال ہے کہ پاکستان کو افغانستان کی قبائلیوں کو اس کا سرگرم کارخ پاکستان کی طرف نہ بھجورے اور پاکستان کے غیر ملکی حالات کا فائدہ اٹھا کر اپنے عزائم کی تکمیل نہ کرے۔ اس لیے اگر قبائلیوں کو کشمیر کی جانب جھوک جائے تو ایک ہتھ سے دو شکار ہوجائیں گے۔ پاکستان بھی قبائلی خطرے سے بچ جائے گا اور کشمیر کے مسلمانوں کی مظلومیت کا شور مچائے گا۔ قبائلیوں کو کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا۔ اس منصوبے کے پیچھے عبدالقیوم خان کا دماغ کھڑا تھا۔ جو اس وقت صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ یہ ایک کشمیری النسل برسرِ ٹہن اور ان کا خاندان بھی کافی زمانے سے پشاور میں مقیم ہے۔ یہ پشاور میں وکالت کے زمانے میں خان عبدالغفار خان کی خدمتی خدمت گار جماعت میں شامل ہوئے۔ اور اس طرح کانگریس کے ساتھ ان کا تعلق ہو گیا۔ چنانچہ یہ مرکزی لیجو سائیو اسمبلی میں کانگریس پارلیمان پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کے منصب تک پہنچ گئے۔ ان کے تعلقات خان بادشاہ کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان کے ساتھ تو بہت اچھے تھے۔ لیکن خود عبدالغفار خان ان پر بالکل اعتبار نہ کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کو موقعد پرست ہی سمجھتے رہے۔ قیوم صاحب ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی تحریک کے دوران گرفتاری سے بچنے کے لیے سرگند آ گئے۔ یہی برقیام کے دوران ان کے دل میں کشمیر پر حکومت کرنے کی ہوس جاگ اُٹھی۔ بنا بریں پاکستان میں ان کو کشمیری معاملات کا دلچسپ

جانتا تھا۔ اور کشمیر کے معاملات پر ان کی بات تو جیسے سُنی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جناب صاحب سے جب پہلے پہل قبائلی اور پاکستانی فوج کشمیر میں بھیجنے کی اجازت مانگی گئی تو انھوں نے ایسا کرنے سے منہ کیا۔ کیونکہ وہ ایک قانون دان کی حیثیت سے اس کے نتائج و عواقب سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن قیوم خان اور پنجاب کے کچھ سربراہ کشمیر پر اپنی قوت بازو کو آزمانے کے لیے چل رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیر کو زیر کرنا ان کے لیے کوئی مشکل بات ثابت نہ ہوگی چنانچہ انھوں نے قبائلیوں کو ٹرانسپورٹ ہتھیار، رسد، پٹرول اور دیگر ضروریات دینا کر کے کشمیر پر دھاوا بولنے کے لیے روانہ کیا اور کچھ دن پہلے ایلہ بھی ان کے ساتھ ہوئے۔ قبائلی اپنی دھم میں مست سیاسی شطرنج کی اس چابکدازی سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ اس ”جہاد“ میں اپنی سن کی ترنگ پورا کرتے رہے۔ یعنی لوٹ مار، غارتوں اور لڑکیوں کے ساتھ زور زبردستی وغیرہ۔ آئے تو تھے تو کشمیر فتح کرنے لیکن ایک گئے بدکاریوں میں۔ سری نگر موزوں وقت پر نہ پہنچ سکے۔ اور یہ موقعد ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جناب صاحب ایبٹ آباد ہی میں خوش خبری اور سکھلاؤ کا انتظار کرتے رہے اور قبائلی لوٹ کا کچھ مال اور عورتیں لے کر واپس لوٹنے پہنچ گئے۔ وہ خون کا مزہ چکچکے تھے۔ بھلا را دلپنڈی میں اپنی سی کرنے سے کب باز رہتے؟ مسلمانوں کے گھر دن میں گھس گھس چیر پر ہاتھ ڈالا آئے اٹھا کر لے گئے۔ پاکستانی اس فساد میں مقتول کو بھول چکے تھے کہ ہرچہ برخورد پسندی بردگراں پسند۔ اب اپنی باری آئی تو لاہور کے اخبارات میں زبردست دواویلا چلا گیا۔ مطالبہ ہونے لگا کہ ان ”مجاہدانِ نفس“ کو جلد از جلد اپنے جھگڑاؤں میں واپس کر دیا جائے۔ پاکستانی حکمران کہتے رہتے ہیں کہ انھوں نے قبائلیوں کو کشمیر میں بھیجا تھا کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بچا سکیں۔ وادی کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب اٹھارہ فی صد ہے۔ ظاہر ہے کہ نو فیصد مقامی غیر مسلموں سے انھیں

کوئی خطرہ درپیش نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر پاکستان کے مکران سوچیت گندھ کے علاقے سے قباہلیوں کو ریاست کی ہندو اکثریت والے حصے میں بھیج دیتے تو اس دعوے میں وزن پیدا ہو سکتا تھا۔ غرض فوجی نقطہ نگاہ سے بھی ایسا کرنا ان کے لئے زیادہ فائدہ مند رہتا کیونکہ اگر وہ سرنگر جوں روڈ کو کاٹ کے رکھ دیتے تو کشمیر ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے علیحدہ ہو کر رہ جاتا اور صرف ہوائی راستہ اس کے اہمائی کا ضامن نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ تو وادی کشمیر کی خوبصورتی سے جسے اٹھانے اور ہمارے ساتھ انتہائی کارروائی کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ انھیں کشمیر کے لوگوں سے زیادہ اس خوبصورت سرزمین کو فتح کرنے کی فکر تھی۔ وہ یہاں کے جنگلوں، مرغزاروں اور پہاڑوں کو اپنی خوشحالی میں سولیتا چاہتے تھے۔ اور یہاں دواؤں پیش دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ بعض پاکستانی حاکموں نے یہاں تعلقات اور مکانات بھی اپنے لئے پسند کر لئے تھے۔ کشمیری عوام باتیں بھانڈیں، ان کی کیوں فکر کی جائے؟

جب مئی ۱۹۴۷ء میں پاکستان گیا تو راولپنڈی میں میں نے، ام کے واقعات ذکر صدر ایوب خان کے ساتھ کیا۔ فیڈل مارشل نے ان واقعات پر ایک داپہیں نگاہ ڈالتے ہوئے ایک آدھ گھنٹی اور کہا کہ "ہاں، یوم خان کشمیر کا راجہ بننا چاہتا تھا اور اس لئے آؤ دیکھتے تھا نہ تو اور اپنی من مانی کرتا پہلا چارہ تھا۔"

ہندوستان اگرچہ آزاد ہو چکا تھا لیکن ابھی انگریز زندگی کے اہم شعبوں میں چھاتے بچتے تھے۔ لاڈلہ ڈاؤنٹ میں ہندوستان کے آخری وائسرائے رہنے کے بعد اب آزاد ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کی افواج کے سربراہ دونوں انگریز تھے۔ اور ان کے سپریم کمانڈر سر ملکا ڈاؤنٹ تھے۔ اس پس منظر میں جب ہندوستان کی فوجیں ام کے دواخ میں قباہلیوں کو ہلاکتی ہوئی پاکستانی سرحدوں تک بھیج گئیں تو لاڈلہ ڈاؤنٹ میں جن کو شکر لاحق ہوئی کہ کہیں ہندو پاکستان کے درمیان کھٹے ہندوں اعلان جنگ

نہ ہو جائے پہلے تو جنرل صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا۔ لیکن دونوں ملک اپنے وقت پر اسے سہے پاکستان چاہتا تھا کہ اسے شامی سے پہلے ہندوستان کی فوجیں کشمیر سے نکل جائیں اور ہندوستان زور دیتا تھا کہ کوئی تصفیہ کرنے سے پہلے پاکستان تمام قباہلیوں کو واپس بلا لے۔ اس پر لاڈلہ ڈاؤنٹ میں نے پڈت تہرو کے مشورے سے وزیر اعظم برطانوی کابینہ میں اٹلی کو کہا کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ تصفیہ فرائض صالمت سے لے کرانے کے لئے فوری طور پر ہندوستان کی طرف پرواز کریں۔ لیکن برطانوی وزیر اعظم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس تجویز کا بیج چھینک دیا کہ اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ لاڈلہ ڈاؤنٹ میں نے وزیر اعظم کی رائے سے متفق تھے۔ لیکن گاندھی جی اور سردار پٹیل اس کے حق میں نہیں تھے۔ گاندھی جی جتنے جتن کر کہیں اپنے معاملے کو اختیار کے سامنے پیش کرنا چاہتے اور اگر چہ لاڈلہ ڈاؤنٹ میں پاکستان کے درمیان تصفیہ نہیں ہوتا تو وہ کسی ایشیائی ملک کو معاملت کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ سردار پٹیل کا خیال تھا کہ اقوام متحدہ صرف محض کارائی کا بیج ہے اور وہاں کسی بات کا فیصلہ ہوتا ہی نہیں۔ بالآخر لاڈلہ ڈاؤنٹ میں جن کی رائے غالب آئی اور معاملہ سلامتی کونسل میں پیش ہوا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پر پاکستانی حملے کا معاملہ اقوام متحدہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے حکومت ہند نے عالمی ادارے کے نام لکھا،

"اس محکمہ غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لیے کہیں کہیں حکومت ہند ریاست جوں و کشمیر کی وقتی مصیبت کو اپنے سیاسی فائدے کے لئے استعمال تو نہیں کرتی، حکومت ہند نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ جو ریاست جوں و کشمیر کی سرزمین حملہ آوروں کو نکال کر خالی کر لی جائے گی اور امن و امان کے عام حالات اور امن و امان کو بحال کرنے میں جوں و کشمیر کے عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہوں گے اور وہ فیصلہ جمہوریت کے سلسلہ طریقہ کے راستے شمار یا استصواب PLEBISITE OR REFREM. کے ذریعے عمل میں لائے گا۔"

جس کی غیر جانبداری کو یقینی بنانے کے لئے یہ اقدام بین الاقوامی نگرانی میں کیا جاتے گا۔
 چنانچہ ہندوستان کی طرف سے مقدمہ پیش کرنے کے لئے پہلا وفد گوپال سوامی ہینگل
 کی قیادت میں روانہ ہوا۔ پاکستانی وفد کی قیادت وزیر خارجہ چودھری سرفراز خان کر رہے
 تھے۔ مجھے بھی ہندوستان کے وفد میں شامل کیا گیا، میرے لئے سمندر پار جانے کا پہلا
 موقع تھا۔ سرفراز خان ایک ہوشیار پیر مشر تھے۔ انھوں نے بڑی ذہانت اور چالاک
 کامنڈا ہر کر کے ہماری محدود شکایت کو ایک وسیع مسئلہ کا روپ دے دیا اور ہندوستان و
 پاکستان کی تقسیم کے سارے پر آشوب پس منظر کو اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ ہندوستان پر لازم
 تھا کہ وہ اپنی شکایت کا دائرہ کشمیر تک ہی محدود رکھتا۔ لیکن وہ سرفراز خان کے پھیلنے ہونے
 جال میں پھنس کر رہ گیا اور اس طرح یہ معاملہ ٹوٹ پڑ گیا۔ ہنشا جی کا سلسلہ ایسا شروع ہوا
 کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ ہمارے کان پک گئے اور ہمارا قافیہ تنگ ہونے لگا۔ ہم
 چلے تو تھے مستنیت بن کر لیکن ایک ملزیم کی حیثیت میں کٹھڑے میں کھڑے کر دیے گئے۔
 گوپال سوامی آئیگر بہت قابل اور جہاں دیدہ و منتظم تھے لیکن وکیلوں کی چالاکوں سے بے بہرہ
 تھے۔ مجھے بھی سلامتی کونسل کے صدر نے اپنا غنہ یہ بیان کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے
 یہ دعوت اچانک پیش کی۔ اور میں اس کے لئے تیار ہی نہ تھا۔ میں اس دن بخار میں مبتلا تھا۔
 لیکن بخوری تھی۔ جو کچھ میں بھی نہ بانی کہہ سکتا تھا۔ کہا بعد میں پتہ چلا کہ وہ افسر سرفراز خان
 کی شطرنج بازی کا نتیجہ تھا کیونکہ وہ اچانک مجھے تقریر کروا کر میری پوزیشن سلامتی کونسل
 کے محروم میں گرا دینا چاہتے تھے۔ بہر حال میں نے تقریر کی۔ جو گھنٹہ بھر سے زیادہ دیر
 تک جاری رہی۔ تقریر کے دوران سرفراز خان اور برطانوی نمائندے سرفراز خان کوئل ہیکر
 نے صداقت کی کوششیں کیں اور میری آن سے خوب لوگ جھوٹ کر رہی۔ ظفر اللہ خان
 نے فقرہ کسا کہ میں جواہر لال کے انھوں میں کٹھن پٹی ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے

جواہر لال کی دوستی پر فخر ہے اور آپ کو یہ بات نہ بھولی جائے کہ جواہر لال کے ساتھ میری فون
 کا رشتہ ہے اور خون خون ہے اور پانی پانی۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود اگر کبھی کشمیر کے
 لوگوں کے مفاد اور جواہر لال کی دوستی میں ایک چیز کا انتخاب کرنے کی نوبت آگئی تو میں
 کشمیری عوام کے مفاد کو جواہر لال کے ساتھ دوستی پر قربان نہیں کروں گا۔ بہر کیف ہمیں
 بہت جلد ملزیم ہو گیا کہ سیکورٹی کونسل نے ہمیں فوجی معاملات میں اٹھایا۔ یہاں کشمیر
 کے معاملے کی بجائے ہند پاکستان کا وسیع تر سوال اٹھایا گیا اور ایجنڈے میں بھی اس کا یہی
 نام رکھا گیا۔ برطانیہ کی اس وجوہی میں ایک پُرکاری کی ادا مضرت تھی۔ وہ اگر پاکستان کا
 اس قدر محتاج بن گیا تھا تو اس کی ایک غافل تجارتی دیر تھی۔ نپولین بوناپارٹ نے انگریزوں
 کو دو کاہناروں کی قوم قرار دیا تھا۔ اور یہاں پر وہ پھر اپنی انسانی جبلت کا مظاہرہ کر رہے
 تھے۔ مشرق وسطیٰ میں عرب ممالک کا ایک پورا ملک امیر ہوا تھا۔ جن کے پاس تیل کی وافر
 دولت تھی۔ برطانیہ کا وزیر خارجہ ارل اسٹون پاکستان کو ایک مسلم ملک کی حیثیت سے
 عرب ممالکوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کے لئے ایک پل کے طور پر استعمال کرنا چاہتا
 تھا۔ اور اسی لئے برطانیہ کا اقوام متحدہ میں نمائندہ ہندوستان و ششمین میں پیش تھا۔
 ہم ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو نیو یارک میں ہی تھے کہ مہاتما گاندھی کی شہادت کی خبر
 آئی۔ ہم پر گویا بجلی سی گرجی۔ میں نیو یارک روانہ ہونے سے قبل گاندھی جی سے مل آیا تھا۔
 انھوں نے جنوری ۲۸ء کے مہینے میں اپنی شہادت سے کچھ ہی دن قبل ذرہ دار اندازہ لگایا
 و فضا قائم کرنے کے لئے قرآن رت رکھا تھا۔ میں بخشی غلام محمد کے ساتھ واپس گیا اور میں
 نے گاندھی جی پر زور دیا کہ وہ اپنا برت توڑ دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کشمیر میں آپ کے
 اور غول کی لڑائی لڑی جا رہی ہے اور آپ کے آدمیوں اور کشمیر و دوں کو آپ کی زندگی کی
 ضرورت ہے۔ میں نے گاندھی جی سے یہ بھی کہا تھا کہ میں اس وقت تک کشمیر نہ لوں گا جب

ملک آپ پناہ برت نہیں توڑتے۔ مہاتمانے کہ میرے برت کا ایک مقصد کثیر کے معاملے میں بھی سپہانی اور صداقت پر دنیا کی نظریں مرکوز کرنا و ناپا ہے۔ گاندھی جی کثیر کو ذرہ وار نہایتی کی تجربہ گاہ سمجھتے تھے۔ لیکن انہیں ڈکھ ہوتا تھا کہ پاکستان تو پاکستان خود ہندوستان میں بعض تنگ نظر لوگ کثیر کے متعلق شرارت آمیز پروپیگنڈا میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس براہ باؤس میں کچھ لوگ آتے تھے۔ جنھوں نے کثیر کے کسی شہر میں عورتوں کے ایک جلوس کی تصویریں اُن کو پیش کر کے ہمارے خلاف کارروائی کی پیل کی تھی۔ یہ تصویریں قطعی طور پر فرضی اور جعلی تھیں اور گاندھی جی نے اس بات کو فوراً مہیا نہ لیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ شکایت کرنے والوں کو انہی انتہات ہی نہیں سمجھا۔ بہر کیف جواہر لال اور مولانا آزاد کی کوششوں سے وہی پس منظر حال سدھر گئی۔ پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپے کی رقم ادا کی گئی۔ اور گاندھی جی نے پانچ دن کے بعد ہمارے سامنے برت توڑ دیا۔ اُس وقت کے اندازہ تھا کہ یہ عظیم درویش اور پاکباز قلمندرجے اقبال نے وہ مرد پختہ کار تھی اندیش و با صفا کہہ کر یاد کیا ہے۔ ایک محظوظ الحواس فرد پرست کی گوی کا نشانہ بن جاتے گا۔ مہاتما گاندھی لے کر چھٹا مہری بڑائی بارودی تھی لیس کہ اپنی روح میں انھوں نے ہمارے سامنے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے ایک ولریا یا شان استغاثہ کے کلا ہی کے ساتھ اپنے صوفوں اور اپنے صبر کی آزادی کی قربان گاہ میں جان کا پڑھا دیا پیش کر کے دنیا کو اس شعر کا مفہوم بھادیا۔

۴۸

جمعہ کے کوئی مستقل مل گیا وہ شان سلامت تھی۔ یہ جان تو آتی جاتی ہے اس جاں کا کوئی پاکستانی گاندھی جی کی شہادت کی خبر سے تمام دنیا میں گہرام پگ پگ ابریک میں بھی مصداق مآتم بگھ گئی۔ سلامتی کونسل کا خاص اجلاس بلایا گیا جس میں دنیا بھر کے مالک کے مندوبین نے انھیں شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے جھنڈے تلپڑائیوں

کروئے گئے۔ عالمی انجمن کی تاریخ میں یہ پہلی بار تھی کہ ایک ایسے شخص کی موت پر اس قسم کا ماتم مٹا جا رہا تھا جس کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ یہ سچے معنوں میں اس مرد قلمندرجے کی شخصیت کا اعجاز تھا۔

کثیر کا تنازعہ برس با برس ملک سلامتی کونسل میں موضوع بحث بنا رہا ہندوستان کی کچھ اعلیٰ مرتبت شخصیات نے وقتاً فوقتاً ہندوستان کی فوج کی سربراہی کی۔ جن میں گوبالا سنی آنگلو، سی۔ ایل ستیلوا، بی این راتو، وی۔ کشمی پنڈت، وی۔ کے کرشنا مینن کے نام قابل ذکر ہیں۔ مقررہ لکڑے کے سلامتی کونسل میں مسلسل اور متواتر ہونے کے تمام ریکارڈ توڑ کر رکھ دینے سلامتی کونسل کی طرف سے کثیر کے حالات کا جائزہ لینے اور حل کرنے کی سفارشات پیش کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً بہت سے وفد اور خاص نمائندے کثیر بھیجے جاتے رہے۔ لیکن معاملہ سمجھنے کے بجائے سمجھا ہی رہا اور اس کی وجوہات کے لئے مسئلہ کثیر کی نزاکتوں کے ساتھ عالمی سیاست کی پیچیدگیوں پر بھی ایک نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

▲▲▲

اقوام متحدہ۔ بڑی طاقتوں کی شطرنج

جس وقت کی بات ہو رہی ہے اس وقت اقوام متحدہ پر اس کے پانچ میں سے تین مستقل ممبر ملاتے بے درماں کی طرح چماتے ہوئے تھے۔ امریکہ، چین اور برطانیہ۔ چین جیسے دیوہیکل ملک کی نمائندگی تائیوان کا ایک چھوٹا سا جزیرہ کر رہا تھا جس کے سپاہ و سنیڈ کا ایک جہلی ازمو چیا گ کا قیام تھا۔ باقی سارا چین کیونرٹوں کے جھنڈے تلے آگیا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کا شٹر مرغ اس حقیقت کو دیکھنے سے برابر انکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ اس لئے تائیوان کا نام نہ چین کی نمائندگی کا دم تو بھرتا تھا لیکن حقیقی معنوں میں امریکہ کے اشاروں پر ناچتا رہتا تھا۔ فزائن آئن وڈن اندرونی انتشار میں ابھرا ہوا تھا۔ لہذا خارجی معاملات سے اس کو بس واہمی دلچسپی تھی۔ برطانیہ عام طور پر بڑے بھائی امریکہ کی پیروی کرتا تھا اور کثیر کے معاملے میں تو بالخصوص امریکہ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ البتہ، امریکہ برطانیہ کی رائے کی بہت قدر کرتا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ ڈیڑھ دو دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کر چکا ہے۔ اور اس لئے ہندوستان کے حالات و کوآف بر اس کی نظر گہری ہے۔ کثیر کے معاملے پر روس ایک عجیب قسم کی ناغذا

کاروتیا بناتے ہوئے تھا۔ امریکہ کی پالیسی بھی کچھ نیچے دروں اور نیچے نوعیت کی تھی۔ برطانیہ کی ذہنی کیفیت ہم سے پوشیدہ نہ تھی۔ سلطنت ہند تو اس کے ہاتھ سے نیل گئی تھی لیکن رسی کا نیل اس خاکستری میں ابھی باقی تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کو قتل میں میری تقریر کے دوران برطانوی نمائندے نلپ فول بیکر نے اپنی اس ذہنیت کو آشکار کرتے ہوئے کچھ پر اُٹے سیدھے سوالات داغ دیئے ہیں۔ بھارتی برٹش کی برٹش کی جواب دینے سے گریز نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ برطانیہ ہندوستان کی تقسیم اس سے پیدا شدہ حالات اور کثیر کے تنازعے کے ذمہ دار ہے۔ میں نے بھی کہا کہ جہاں کہیں برطانیہ کو لپکا ہو جانا پڑا ہے وہاں اس نے جاتے جاتے بٹوارے کا سہارا لیا ہے اور دائمی فتنے کے بیج بو دیئے ہیں۔ چاہے فلسطین کا معاملہ ہو یا عرب دنیا کا۔ وہ اسی ڈگر پر چلتا رہا ہے اور ہندوستان میں بھی اس نے اسی فتنہ گری کا مظاہرہ کیا ہے۔ میرا یہ جوابی حملہ کچھ غیر راجائی قسم کا تھا۔ اس غیر سفارتی JNDIPLOMATIC وار سے فول بیکر صاحب تیور کر رہ گئے۔ اُن سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ اُن کے چہرے سے نفرت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ہفتوں تک ہندوستان پر الزام تراشی کی جو بارش کی گئی تھی اُس نے ہمارے وفد کے سبھی اراکان کا دل دکھایا تھا ہر رکن کی یہی خواہش تھی کہ ہماری طرف سے بھی کوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی جرأت پیدا کرے۔ لیکن گولڈاسمائی جیسے شریف الطبع اور نرم گفتار انسان سے یہ کب ممکن ہو سکتا تھا؟ میں نے تقریر کی تو میرے ساتھیوں کے چہرے بھول کی طرح کھل اُٹھے جیسے میں نے اُن ہی کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ میری تقریر کے بعد مسلمانوں کو قتل کا جھگڑا ملتوی ہوا تو سب سے پہلے روس کے نمائندے سر یعقوب ملک نے میرا تہ مضبوطی سے پکڑا اور مصفا فخر کہتے ہوئے مجھے ٹھیکہ مارا۔ ہمارے وفد میں کئی کے ساتھی بھی بچوٹے نہ مہاتے اور کئی دن تک میری تقریر کو شکوہ موضوع بنی رہی۔ سر فول بیکر نے گولڈاسمائی کی تقریر

کے سامنے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ مجھ سے کہا گیا کہ میں برطانوی نمائندے سے ملنے کے لئے جاؤں۔ میں ڈل بیکر صاحب کے ہوٹل میں گیا۔ وہ اندر موجود تھے۔ لیکن انھوں نے مجھے باہر رکھ کر کافی دیر تک انتظار کروا دیا۔ اس طرح شاید وہ سلاطین کونسل میں اپنی شخصیت کا بدلہ چکا رہے تھے۔ میرا پارہ بھی چڑھنے لگا۔ میں واپس جانے والا ہی تھا کہ دروازہ کھلا۔ ڈل بیکر صاحب باہر آگئے اور ہماری گفتگوات شروع ہو گئی۔ دو دنوں طرف سے خوب گرم گرمی رہی۔ انھوں نے بڑی رعایت کے ساتھ مجھ کو ٹوکا تو میں نے جواب میں خوب کھری کھری سنائی۔ وہ بڑے اعتدال کے ساتھ پاکستان کے اس موقف کی تائید کرتے رہے کہ پاکستان کی فوجیں کشمیر کے علاقے میں داخل نہیں ہوتی ہیں۔ اور نہ تباہیوں کو کشمیر بھیجنے میں پاکستان کا کوئی ہاتھ تھا۔ میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ہزاروں میل دور اپنی بے مشرت گاہ میں بیٹھ کر وہ حالات کا صحیح اندازہ کیسے کر سکتے ہیں اور اس شخص کے میان کو کس بنا پر نظر انداز کر رہے ہیں جو خود میدان جنگ سے آیا ہوا ہے ؟ ڈل بیکر آہستہ آہستہ باتیں مٹاتے کرتے رہے اور ہماری گفتگو بڑے ناخوشگوار ماحول میں ختم ہو گئی۔ میں نے یہ سارا سامرا بس و عن گوپالا سوامی آئیٹنر کو بتا دیا۔ اور اُن سے کہا کہ اب برطانوی کے عزائم کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ آئیٹنر صاحب نے سفارتی ذرائع سے اس واقعہ پر برطانیہ سے احتجاج بھی کیا۔ بعد میں جواہر لال یہ معاملہ اٹلی اور کربس کی ٹوش میں لائے اور انھوں نے یقین دلایا کہ آئندہ برطانوی نمائندہ اس قسم کا ذریعہ اختیار نہ کرے گا۔

میں نے جب ہندوستانی وفد میں شمولیت کے لئے حامی بھر لی تھی تو میری ایک امید یہ بھی تھی کہ نوید یادگ میں شاید پاکستانی وفد سے بھی نئی طور پر گفت و شنید کا موقع پائے سکوں۔ مگر خیال تھا کہ اس طرح بدگمانیاں دور ہو سکیں گی اور کوئی ایسا بھوتہ کرنے کی

راہ نکل آئے گی جسے فریقین باعزت خیال کریں۔ ہندوستان پاکستان سے لڑائی نہیں چاہتا تھا۔ ہم کشمیری عوام بھی ہرگز یہ نہ چاہتے تھے کہ ہماری چھوٹی سی ریاست ہمارے دو بڑے ہمسایوں کے درمیان قوت آزمائی کا میدان بن جائے۔ لیکن پاکستانی وفد کے ارکان کو کچھ کمزیری امیدوں پر بانی پھیل گیا۔ وہ میرے ساتھ ملنا کیا، بات کرنا کیا، آنکھیں ملانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان حالات میں اُن سے افہام و تفہیم کی توقع رکھنا بالکل بے معنی تھا۔ ابھی میں وہیں تھا کہ ہندوستان سے ہوا تھا گاندھی کی شہادت کی خبر ملی۔ ایک سیکسوں چند روز قیام کرنے کے بعد ہم ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ گاندھی جی کی شہادت ایک جانکادہ صدمہ تھی۔ اُن کی شہادت سے پیدا ہونے والے حالات سے وقار حاصل کرنے کے لئے بھی ہندوستان لوٹ ناخروسی تھا۔ اپنے مختصر قیام میں میں نے اقوام متحدہ کے طریقہ عمل کا پہلا تجربہ حاصل کیا تھا۔ میں یہ تاثر لے کر لوٹ رہا تھا کہ اُس بین الاقوامی ادارے سے انصاف حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہاں پر مفادات کے تقاضوں کا بول بالا ہوتا ہے۔ سچائی اور انصاف کا نہیں۔ چنانچہ اس کا میرا خلاصہ اس سوویت روس کے نمائندے یعقوب ملک نے ایک استقبالیہ میں کیا۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ ناظرہ فداری کا ترجمان کیوں اختیار کرتے ہوئے ہیں اور کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کے حق میں اپنا دوش کیوں نہیں دیتے ؟ تو انھوں نے جوابی سوال داغ دیا ”ہندوستان کو یہاں کے معاملے میں روس کا ساتھ کیوں نہیں دیتا ؟“ گوپالا سوامی ساتھ ہی کھڑے سن رہے تھے۔ انھوں نے جواباً کہا کہ ہر معاملے کو ہم حق و انصاف کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور اس کے بعد ہی اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ یعقوب ملک نے ایک تملیظانہ شکر اہٹ کے ساتھ کہا کہ ابھی آپ کا ملک بین الاقوامی سیاست میں تازہ وارد ہے اور اسی لئے انصاف و دفعہ کی باتیں کرتا ہے۔ خود ہم بھی شروع میں یہی کرتے رہے لیکن جلد

ہی ہیں اپنے مجرموں سے اندازہ ہو گیا کہ بین الاقوامی سیاست میں معاملات کو حق و انصاف کی ترازو پر نہیں تول جاتا بلکہ مفادات کی میزان میں اٹن کا وزن کیا جاتا ہے۔ یہاں تو ایک ہی معیار چلتا ہے۔

تم ہمارا ساتھ دو۔ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ تم ہمارے مفادات کی رکھوالی کرو ہم تمہارے مفادات کی حفاظت کریں گے!

نیویارک سے واپسی پر میں اقوام متحدہ کے بارے میں جو تاثرات لے کر آیا تھا شاید اسی نوعیت کے تاثرات کو پلاسوامی آئینگر کے دل میں بھی اُبھرے تھے جب ہمنویارک سے ہند کے لئے ہوائی جہاز پر سفر کر رہے تھے آئینگر صاحب نے جو میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے ایک کاغذ میرے حوالے کیا اور کہا کہ اسے پڑھ لو۔ اس میں انھوں نے کشمیر کے مستقبل کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کشمیر کو آزاد رکھنا ہی اس گتھی کا بہترین حل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ریاست کی سرحدیں اتنی لمبی چوڑی ہیں اور کتنے ہی بڑے ملکوں سے ملتی ہیں۔ اس لئے ان سرحدوں کی حفاظت کا درد سر اور بوجھ ہندوستان برداشت نہیں کر سکتا۔

کچھ مدت کے بعد میں پھر سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک گیا۔ وہاں خالی حویلی بٹمنوں میں بڑا وقت ضائع ہوا۔ لیکن معاملہ طویل ہی پکڑا گیا۔ اب کی بار میری ملاقات پاکستان کے چودھری محمد علی اور ڈاکٹر محمد یحیٰ تاثیر سے نیویارک کے ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اس ملاقات کی شان نزول یہ ہے کہ اس وقت سلامتی کونسل کے چیرمین کنیڈا کے میکسیکن تھے۔ انھوں نے ہندو اور پاکستان کے وفود کو کسی مسئلے پر صلاح مشورے کے لئے اپنے دفتر میں بلوایا تھا۔ دوران گفتگو میری چودھری ظفر اللہ سے کسی جگہ پر شدید ٹکراؤ ہوا۔ معاملہ یوں تھا کہ جب ظفر اللہ خاں بول رہے تھے تو میں

دیکھ رہا تھا کہ وہ واقعات کو توڑ مڑ کر بیان کر رہے ہیں۔ مجھ سے رہبانگیا اور میں نے انھیں ٹوک دیا۔ اس پر ظفر اللہ خاں نے زبردست وکیلانہ چالاکیاں سے مجھے اور گوبالا سوامی کو یہ کہہ کر ٹوڑا دینا چاہا کہ مجھے اپنے وفد کے سربراہ کی گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے میں نے جواب میں کہا کہ یہ ہمارے وفد کا اسی معاملہ ہے۔ آپ کو اس میں ٹانگہ اڑانے کی رحمت نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ناصح بننے کی کوشش۔ جنرل میکسن کی مداخلت سے معاملہ حل گیا۔ جب گفتگو کے بعد ہم کمرے سے باہر آئے تو ایک شخص نے علیک سلیک کے بعد مجھ سے تصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا میں نے اخلاقی علیک سلیک کا جواب دیا اور تصافحہ بھی کیا۔ لیکن میرے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ میں فوریہ دو کو نہیں پہچان پایا تھا۔ اس نے بڑی ہلنڈاری سے کہا کہ خراب ہے مجھے نہیں پہچانتے میں چو دھری محمد علی ہوں۔ اور اسلام آباد کالج لاہور میں دو دنوں نے اکٹھے پڑھا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے پردہ مٹ گیا اور میں نے اپنے بچپن کے ساتھی کو پہچان لیا۔ ہم محبت کے ساتھ گلے گلے۔ چو دھری صاحب اس وقت پاکستانی وزارت خارجہ کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہمیں الگ سے ملاقات کرنی چاہیے۔ تاکہ پرانی یادیں تازہ کرنے کے ساتھ ساتھ موجودہ مسائل پر بھی تبادلہ خیال کا موقع مل سکے۔ آتے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم ایک ہوٹل میں ملے اور چار گھنٹے تک اکٹھے رہے۔ ڈاکٹر محمد یحیٰ تاثیر بھی اس موقع پر تشریف فرما تھے۔ میں نے دونوں صاحبان کو تفصیل کے ساتھ کشمیر کے واقعات سنائے اور اپنے نقطہ نگاہ سے باخبر کیا۔ میں نے انھیں کسی گلی پیٹی کے نیچے بتایا کہ ان تمام واقعات کی ذمہ داری پاکستان کے ارباب اقتدار پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ کشمیر کے معاملے میں من مانی نہ کرے تو شاید اس کی نوعیت کچھ اور ہی ہوتی۔ دونوں حضرات پاکستان کی غلطیوں سے بیزار تھے اور پہچان بھی انھوں

نے کہا کہ جو کچھ ہو چکا، سو ہو چکا۔ اب اصلاح احوال کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس معاملہ کے حل کے لئے باہر کے ملکوں پر تکیہ کرنا اور انشعبدی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ملک آپس میں برسہا برس کا رشتہ اور ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ غالباً بڑی طاقتوں کی یہ بھی خواہش ہے کہ ہندو اور پاکستان کے درمیان کثیر کی بڑی بڑی رہے اور یہ آپس میں اس کے لئے لڑتے رہیں اور بڑی طاقتوں کے دست گیر رہیں۔ اس لئے اگر آپ یہ اسیر رکھتے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ تحفے کے طور پر کثیر بشری میں رکھ کر آپ کے سامنے پیش کریں گے تو یہ کبھی نہیں ہوگا کیونکہ طاقتیں ایسا ہونے ہی نہ دیں گی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب امریکہ اور برطانیہ بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان جیسے بڑے ملک کے ساتھ اپنے چلتی مفاد کو رکھتے ہیں ڈالنا پسند نہ کریں گے۔ ایک نہ ایک دن وہ ہندوستان کے ساتھ بگڑی کو بنانے کے لئے سرگرم ہوں گے اور آپ کو اپنی حالت زار پر HIGH & DRY پے در مددگار چھوڑ دیں گے۔ آپ نے ہندوستان سے تیج آزمائی کر کے بھی دیکھ لیا اس تجربے سے آپ کو یہ سبق مل گیا ہوگا کہ طاقت کے بل بوتے پر کثیر کو ہندوستان سے الگ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان حالات میں صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ ہندوستان سے مخالفت کا۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اس راہ مستقیم کو اختیار کریں اور ہم سب آپس میں مل کر ایک ایسے حل کا سراغ لگائیں جو ہندوستان پاکستان اور کشمیر کے عوام کے لئے قابل قبول ہو اور ان کی عزت کا ضامن بھی۔ ظاہر ہے کہ مخالفت کا راستہ اختیار کرنا ہے تو کچھ نوا اور کچھ دو کا اصول اختیار کیا جانا چاہیے۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران مختلف امکانی حل زیر بحث لاتے اور کہا کہ ریاست کو دو ملکوں کے درمیان ایک آزاد (BUFFER) ریاست کی حیثیت سے رکھنا بھی اس مسئلے کا ایک مقبول

حل ہو سکتا ہے۔ لیکن آزاد ریاست کے قیام کی ضمانت دونوں ممالک کے علاوہ اقوام متحدہ اور چین کو بھی دینا ہوگی۔ مد علی نے سوال کیا کہ سردار پٹیل کو یہ حل منظور ہوگا؟ میں نے جواباً کہا کہ آپ اس کی فکر مت کیجئے۔ اور یہ ذمہ داری میرے سپرد کیجئے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اب حالات کا رُخ دیکھ کر بڑے نرم پڑ گئے تھے۔ وہ کسی شخص کے بغیر لو لے کر مجھے اس تجویز میں کافی وزن نظر آتا ہے۔ لیکن جو دھری محمد علی کچھ سوچ کر غیر مبہم ایسے بول اٹھے کہ پاکستان اس حل کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ ہندوستان ایک دولت مند ملک ہے وہ کشمیر میں بے تحاشا دولت خرچ کر کے ہمارے لئے مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وقت آئے گا جب آپ چاہیں گے کہ اگر صرف وادی کو ہی آزاد کر لیا جائے تو بڑی بات ہو لیکن اُس وقت تک جہلم میں آسا یا نہی بہ چکا ہوگا کہ کوئی آپ کی بات پر کان دھرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا۔ نیو یارک کے قیام کے دوران پاکستانی وفد نے اپنی بے اصول تقلد بازیوں کے خوب کرتب دکھائے۔ وہ سردار محمد ابراہیم کو میرے مقابلے میں کشمیر کا اصل نمائندہ ثابت کرنا چاہتے تھے اس لئے اُس کے نام کو خوب اچھال رہے تھے۔ لیکن یا تو اُنھیں سردار صاحب کی لیاقت پر شک تھا یا اُن کی وفاداری پر کم اعتبار چنانچہ اُنھوں نے وہاں کے ایک مشہور اخبار میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی تصویر سچاپی اور اُس کے نیچے سردار ابراہیم کا نام لکھ دیا۔ تاثیر صاحب کو جی سردار ابراہیم ثابت کر کے ادھر ادھر دکھایا اور ٹھکرایا جاتا رہا۔ سردار ابراہیم نے یہ حال دیکھا تو فوراً دوسرے دن وہاں سے وطن کی طرف لوٹ چکے بعد میں پاکستان کا یہ جھوٹ پکڑا لیا اور اُن کی خوب جگ ہنسائی ہوئی۔ نیو یارک میں قیام کے دوران سعودی عرب کے وفد نے مجھے دعوت پر بلایا۔ وہاں سعودی عرب کے نمائندوں سے کشمیر کے معاملے پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ میں نے اُن کے

سامنے بھی اپنا نقطہ نظر رکھا۔ وہ میرے استدلال کے قائل ہو گئے اور انھوں نے چاہا کہ میں اس مسئلے میں سرختر اللہ خان سے ملاقات کروں۔ میں نے انھیں مطلع کیا کہ اگرچہ دھری صاحب اس معاملے پر مجھے تبادلہ خیال چاہتے ہوں تو انھیں مجھے باقاعدہ ملاقات کی دعوت بھیجی جاتی ہے۔ لیکن نہ تو چودھری صاحب نے کوئی دعوت دی اور نہ میں نے کوئی سلسلہ جنہائی کی۔ معاملہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ میں نے گفت و شنید کے اس آئندہ چرچا سے اپنے معاونین و رکارڈر شاد اور جانکی ناتھ زلنشی کو بھی آگاہ رکھا۔

پاکستان کے ارباب اقتدار نے کشمیر کے معاملہ میں کتنی غلو کریں کہا میں اور انھوں نے کس طرح نہایت معمولی باتوں کے لئے تقریباً یقینی تصدیق کو تار پٹہ کر دیا۔ اس پر غور کرنے سے تاقت اور حیرت کے جذبات بیک وقت ابھر تے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان کی عقل و خرد میں موقع پر جبکہ تصدیق تقریباً ان کی گرفت میں ہو جاتا تھا، گلاس جرنے کے لئے جھلی جاتی تھی۔ اس میں ان کی فہم کا تصور تھا یا ان کی سیاست گری کے تقاضاں کا۔ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ مثلاً ایک دفعہ مغاہمت کے راستے میں یہ جھجھوٹا اختلاف رکلا دینا کیا کہ اسے شہری کے وقت کشمیر میں ہندوستانی فوج کی کتنی تعداد رہنی چاہیے؟ ہندوستان ستائیس ہزار کی تعداد پر اصرار کرتا تھا لیکن پاکستان کسی صورت میں بائیس ہزار سے زیادہ ہندوستانی فوجیوں کی موجودگی پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ کھٹے سے کہہ کر تصدیق کے شرائط کے مطابق یہ فوجیں بھی امتیاط کے طور پر بارکوں کے اندر رکھی جانی تھیں۔ محض حفظہ ماقدم اور حفاظتی اقدامات کے لئے۔ اسی طرح جب آسٹریلیا کی مجریم کورٹ کے جج سر اوڈن وکس اقامت ختہ کے نمائندے کی حیثیت سے کشمیر آئے تو انھوں نے ساری ریاست کا دورہ کرنے اور مسئلے کے ہر پہلو کی جانچ پڑتال کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ راستے شہری صرف دواوی اور اس

کے محفوظ علاقوں میں کی جانی چاہیے۔ تجویز کے مطابق جنوب کی طرف کے ہندو اکثریت والے علاقے ہندوستان میں ضم کئے جانے تھے اور شمال کی طرف کے علاقوں (جمن کو آزاد کشمیر کا نام دیا جاتا ہے) کو پاکستان کا حصہ رہنا تھا۔ کیونکہ سر اوڈن کے مطابق ان علاقوں کے لوگوں نے پہلے ہی پاکستان میں شامل ہو کر اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔ ان کی رائے میں ہندو بہر حال ہندوستان کے حق میں ووٹ دیتے۔ اس لئے ہندو اکثریت کے علاقوں میں راستے شہری کرنا بے معنی تھا۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ پہاڑی علاقوں میں راستے شہری کو مستحکم کرنے میں کافی وقتیں پیش آئیں گی اور دواوی کی انتھل پھٹل بھی بھاری پیانے پر ہوگی۔ اس لئے ان کے خیال میں صرف انہی کی تجویزات قابل قبول اور قابل عمل تھی۔ لیکن لیاقت علی خاں نے یہ شرط رکھی کہ وہ اس تجویز پر جب ہی غور کریں گے جب پہلے مجھے وزارت سے الگ کر دیا جائے۔ ان کو خدا شہ تھا کہ میرے ہوتے ہوئے پانڈیٹینی طور پر ہندوستان کے حق میں پلٹ جائے گا۔ اور ان کو ایک نسخہ کیسیہ پاتھا یا تھا کہ مجھے اختیار ہٹا دیا جائے۔ اس بات پر وہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ زور دیتے رہے کہ مغاہمت کا یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ حکومت ہند نے پاکستان کو اگرچہ یقین دلایا تھا کہ میری حکومت ہر لحاظ سے نافذ رہے گی۔ لیکن اس نے میرے ہٹانے جانے کے خلاف یہ دلیل پیش کی کہ اس طرح تو راستے شہری سے پہلے ہی پاکستان کی فوج کا اعلان ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے لشکروں کو کشمیر کے ختہ سے زیادہ کشمیر کے جھگڑے سے دلچسپی تھی اور وہ اسے زندہ رکھ کر اپنے ملک میں اپنی ایتا کا سامان کر رہے تھے۔ جواہر لال نے میرے نام ایک خط میں کیا خوب لکھا تھا کہ۔

”پاکستانی ملکر ان آدمی کی طرح ہیں جو ایک ملتیتی ہوتی یا بیسکلی پر سوار ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو بھی حالات معمول پر آجائیں گے، بیسکلی

ٹھہر جائے گا اور وہ نیچے گر پڑیں گے،

(خط ۳۵، اگست ۱۹۵۲ء)

لیکن ہندوستان بھی اُس وقت کثیر کو صرف ایک قطعہ زمین نہیں بلکہ ایک
مجموعہ ادرش سمجھتا تھا، اور اس کو اپنے ساتھ شامل کرنے کو اپنے اصولوں اور پالیسی
کا ہم ستون خیال کرتا تھا۔ چنانچہ بواہر لال نے کرشنا سین کے نام ۲۴ فروری
۱۹۵۱ء کو لکھا۔

”اگر پاکستان کی فرقدارانہ پالیسی اور اپدوج کثیر میں حاوی ہو گئے تو یہ
صرف کثیر ہی کا امیہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے ہندوستان میں ہی کیا پاکستان میں بھی تمام
صورت حال کا توازن درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ ہم ایک دوسرے کا صفایا کرنے
کے مرحلے میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ ایسے خوفناک خیالات ہیں کہ میں ان سے لرزہ برتاؤ
ہو جاتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے لوگ ہرے سمندر پر لگی رخ کی اس
پتلی سی تہہ پر موج اڑا رہے ہیں اور ہم بدھٹ دھرمی کا الزام عائد کرتے
ہیں۔“

تقریر مختصر کہ سلامتی کونسل کی طرف سے تصفیہ کنندگان اور دھوڑ آتے رہے۔
کثیر کے سرسپاٹے سے نطف اٹھاتے رہے اور پھر پور میں پیش کرتے رہے۔ کبھی
ڈاکس آتے تو کبھی گرا، ہم کبھی ایڈمرل نٹر کو امتصواب کا ٹکران بنانے کا چرچا ہوا اور
کبھی سویڈن کے گنارڈنگ آتے۔ لیکن معاملہ وہیں کا وہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ اقوام
متحدہ کے دفتر میں کئی بڑے کمرے کثیر کے تنازعے سے تعلق رکھنے والی دستاویز
اور کاغذات سے سمبرے پڑے ہوں گے۔ معاملہ طول پکڑتا گیا۔ لیکن زندگی ساکت نہیں
بلکہ متحرک ہے۔ کثیر کے معاملے میں بھی اقوام متحدہ وقت اور تبدیلی کے تیز کام پہنچتے

کور دک نہیں سکی۔ ہم کثیر میں حالات کو اپنے اصول اور نظریات کے مطابق تشکیل دینے
میں مصروف رہے اور اقوام متحدہ فردوسی کے اس شعر پر عمل پیرا رہی۔
پتے مشورت مجلس آراستہ
نشتند و غشتند و برخواستند

▲▲▲

انقلاب آفریں اقدامات

جوں ہی محاذِ جنگ پر توپوں کی گھن گرج دھیمی پڑنے لگی، ہمیں اپنے خوابوں کے نقوش ابھارنے کی اُسنگ نے اُن لیا۔ ریاستی حوام کی منگولوی کا سب سے بڑا نشان ہمارا دھقان تھا۔ اُس کے دستِ دولت آفرین دن رات فراد کی طرح جوئے شیر کاٹتے رہے۔ لیکن جب اُس کے خوشوں کا گنڈن اُس کے گھیتوں میں پھیلانے لگتا تو جاگیہ دار اور چکدار اس کو سال بھر کی محنت سے خروم کر کے فائدہ کرنے کے لئے جھوڑتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے دیہات کے اکثر کسان جاڑوں میں اپنا بیٹ پالتے تھے جہاڑوں اور میداؤں کا نرخ اُچھا کرتے اور وہاں خونِ بیہیدہ ایک کر کے چند لقمے حاصل کرتے۔ چنانچہ ہم نے اس ناصور کی جڑ کاٹنے کے لئے زمینی اصلاحات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ہم نے "نیا کشمیر" کے آئین اور اقتصادی منصوبے میں کاشتکار کو زمین کا مالک بنانے کے حلقے جوفا کرپش کیا تھا اب اُسی میں رنگ بھرنے لگے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک سوبائی کنال پاسو باتیس ایکڑ سے زیادہ اراضی کوئی شخص اپنی ملکیت میں نہیں رکھ سکتا، باقی زمینیں اُسے اپنے کاشتکاروں کے نام بلامعاوضہ منتقل کرنا ہوں گی۔ اس طرح سے ۳۹۶ بڑی جاگیہیں تحلیل کر دی گئیں۔ نو ہزار سے کچھ زیادہ مالکان کی ساڑھے چار لاکھ ایکڑ زمین کی ملکیت

رائس کر دی گئی۔ جس سے کوئی دُعاوائی لاکھ کاشتکاروں کو زمین کے مالک اور حقوق حاصل ہو گئے۔ البتہ باغات اس حکم سے مستثنیٰ رکھے گئے۔ ان اصلاحات کی انقلاب آفرین نوعیت کو سمجھنے کے لئے کشمیر میں ہمارا جاکے خاص حقوق پر نظر ڈالنا ضروری ہوگی۔ جب ۱۸۳۶ء میں نادر ام تسر کے ذریعہ انگریزوں نے کشمیر کو ہمارا جگ لب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو اُس وقت ریاست کی ساری زرعی اراضی بھی ہمارا جاک کی ملکیت قرار دیدی گئی۔ چنانچہ اُس بنا پر اُس وقت سے وادی کی ساری زرعی زمین فرماؤ دلتے وقت کی ملکیت قرار دی جاتی رہی۔ یعنی جو ہمارا جگ تحت نشین ہوتا تھا وہ اُس کا مالک بن بیٹھتا تھا۔ بعد میں ہمارا جوں نے اپنے جابرانہ نظام حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے رشتہ داروں، معاصروں، افسانہ نویسوں، منظورانِ نظر اور ذلیل و خواروں کو بڑی بڑی جاگیہیں اور چک عطا کئے۔ جن کا مال یہ دغیرہ تو کاشتکار کو بھرا پاؤں تھا۔ لیکن اُسے کمائی کا صرف بھوتائی حصہ ملتا تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کی سفاکی کو ابھارنے اور عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے میں تحریک کے دوران اکثر جلسوں میں اقبال کا یہ شعر گنگناتا رہتا تھا۔ ۵

جس کھیت سے دہقان کو مستی نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

بعد میں ۱۹۳۱ء کی تحریک کے نتیجے میں جب گنیشی کشن قائم ہوا تو ہم نے اس کے سامنے مطالبہ رکھا کہ زمین کو کسان کی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کمیشن کی سفارشات پر کسانوں کو کچھ سہولیات ملیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے صورت حال علامہ اقبال کے

اس فرمودہ کو دہرا رہی تھی۔ ۵

از جہانے وہ خدا کی کشتی دھقانِ خراب، ۵: انقلاب، انقلاب، انقلاب اسے انقلاب

کثیر ایک زرعی ملک ہے جہاں نوے فیصدی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہاں کی زمینوں کو ٹھکانا بنانے کے لئے اکثر جاگیر میں بانٹ رکھا تھا۔ بعض جاگیردار صاحبان کو ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی زمینیں کہاں واقع ہیں اور کس طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کا کام تو یہ تھا کہ جب اناج کا شتکار کے خون سے سیراب ہو کر پک جاتے تو وہ اپنے کاردار کو اس کے سر پر بیم راج کی طرح بھجودیں۔ اور پیداوار کے بیشتر حصے کو کوٹھلہ (گودام) میں ڈال کر اس پر اپنا فضل چڑھا دیں۔ صورت حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کاشتکار کے کسی چھوٹے بچے کا دل چل جاتا اور وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مٹی کا ایک جھڑکھیت سے نکالتا اور کاردار کی نظر اس پر پڑتی تو غضب ٹوٹ پڑتا۔ کاردار نہ صرف اسے مار مار کر ادھ توڑا کرتا تھا بلکہ اس کے منہ سے مٹی کے چبانے ہوتے دانت بھی باہر آگوار کئے ہی دم لیتا تھا۔ کاشتکار کو مشکل سے تین چار مہینے کی روٹی ملتی باقی کے لئے وہ جاگیردار کے دروازے پر دم بٹا رہتا یا پنجاب کی خاک چھانتا اور بعض اوقات اس صحراوردی میں فاقہ مستی کی موت مچاتا۔ ایسے بہت سے کم فیصلوں کی زندگی کی شام لاہور، امرتسر یا راولپنڈی کے کسی گھر کی کوچے میں ہو جاتی۔ جب میں لاہور میں تربتیم تھا کبھی کبھی یہ کٹیری جیک مانگنے کے لئے میرے ہوسٹل میں بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ایک ایسے ہی کٹیری سے پوچھا کہ تم جو بدھ چرمت مزدوری کرتے اور کیتے ہو پھر شام کو کیوں جیک مانگتے ہو؟۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے دن بھر کی محنت کے بعد دوسرے تین روپے تک ملتے ہیں۔ وہ میں پیٹ کے ساتھ باندھ کے رکھتا ہوں تاکہ وطن واپسی پر مالیدہ اور کرسکوں اور ہوسٹل کو کچھ کپڑے لئے اپنی بیوی بچوں کے لئے لے جاؤں۔ ان بیچاروں کی حالت زاد پر رحم کھانے کی بجائے پنجاب کے لوگ انھیں حقارت کے ساتھ "ہاتو" کہہ کر پکارتے۔ وہ انھیں بار برداری کے حیوان سے زیادہ

جائیت نہ دیتے تھے۔ بہت کم لوگ تھے جو ان کی پیتا سے متاثر ہوتے تھے۔ علامہ اقبال نے شاید اسی حالت زار سے متاثر ہو کر فرمایا تھا: ج
بد ریشم تھا خواجہ از محنت او
نصیب تنش یاد نہ تار تارے
یاد الہاثر حقیقہ جانند ہری بکار آٹے تھے ج
شر سے محروم ہے ایک ہے جوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کثیر کی تصویر کا

جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے اہل اسے ختم کرنا ان سے کسی معاوضے کے بغیر زمین چھین لینا اور پھر اسے ان بد نصیب لوگوں کے حوالے کرنا ایک دلیرانہ ہی نہیں بلکہ جان جوگوں کا کام تھا۔ ہندوستان میں سالہا سال بعد تک بھی اس قسم کا اقدام اٹھایا نہیں جاسکا۔ ہم پر کئی اطراف سے سخت نکتہ چینی کی گئی مسکن ہم حق بجانب تھے۔ اس لئے ہم نے ڈر سے اور نہ دے۔ ہم نے معاوضے کا مطالبہ کرنے والوں سے کہا کہ زمینوں کے اصل مالکوں سے زمین زور زبردستی چھین لی گئی۔ اور جاگیرداروں اور پکوں میں بانٹ دی گئی تھی۔ لہذا ان سے معاوضے کا مطالبہ کرنا نہ صرف فائدہ مند ہے اور نہ معقول۔ جن لوگوں نے یہ زمین ہمارے ہی جی حضور کی کر کے حاصل کی تھی اور کاشتکاروں کی محنت سے اپنے مالیشان محلات کا اینٹ گارا اٹھا یا تھا ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے اصل مالکوں سے ان کا معاوضہ مانگیں۔ معاوضے کا اگر کوئی حقدار ہے تو وہ کاشتکار ہے جس کو ایک صدی سے وہ دو ہاتھوں سے لٹا گیا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہم اتنے روپے لائیں کہاں سے جن سے ہم جاگیرداروں اور زمینداروں کی لالباں بھری ہوتی جو بیویوں میں اور اضافہ کرویں؟ ہم نے "نیا کثیر" کا منشور پیش کر کے

اپنا عندیہ بخوبی واضح کر دیا تھا کہ اگر کبھی نیشنل کانفرنس اقتدار میں آگئی تو ہم کانشنل کونسل کو بلا دے، ضرر زمین واپس لوٹا دیں گے۔ اور یا اگر واری وچکداری کا فائدہ کر چھوڑ دیں گے۔ اس لئے ہم نے پہلے ہی عوام اور اتحادی طبقات کو ان اصلاحات کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ لیکن ہندوستان میں ابھی اس قسم کی کوئی سوچ نہیں ابھری تھی۔

اس ریاست کے استحصائی جیسے اور مرکز میں ان کی پیچھے ٹھوکنے والوں نے ہماری ان اصلاحات کو پسند نہیں کیا۔ سردار پٹیل نے تو خاص طور پر اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کا ایک بڑا کارکن تھا کہ ریاست کے ہندو جاگیرداروں نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ہم سب کچھ مذہبی تعصب کی بنا پر کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان اصلاحات کی زبردیاہ تر غیر مسلم جاگیرداروں پر پڑتی ہے۔ میں نے سردار کو اعدا و شمار کئے دیکر یہ اطمینان دلانے کی کوششیں کیں کہ ہندو اور مسلمان کا کوئی سوال اس معاملے میں نہیں آتا۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہندو جاگیرداروں کے دوش بدوش مسلمان جاگیردار بھی ان کی زد میں آتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پاسے جاتے ہیں۔ لیکن سردار کی ضد راج برٹ کے مانند تھی اور وہ برابر ان اصلاحات کی مخالفت کرتے رہے البتہ جو اہل آل اور مولانا ابوالکلام اور اصلاحات کو پسند کرتے تھے اور ان کے حق میں تھے۔ مقام مشکرنہ کہ ہم ابھی ہندوستان کے آئین کے بنی بنی اصول اور توشکافیوں میں ایسے نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے ہم مرکز کی رضامندی کے پاس نہ نہیں تھے۔ میں نے اہل چوک کے ایک بڑے اجتماع میں اس فیصلے کا اعلان کیا اور زرعی اصلاحات نافذ ہو گئیں۔ ان کے نفاذ سے کھوکھو مظلوم اور بے سہارا کاشتکاروں کی غلامی کی طرحیں ان واحد میں کٹ کر رہ گئیں۔ رات کو جو کاشتکار ایک قلمام کی حیثیت سے سویا تھا، صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو زمین کے مالک کی شکل

میں پایا۔ بہت سے کاشتکاروں پر ایسی ذہنی کیفیت طاری رہی کہ انھیں کئی دن تک باور نہ آیا کہ ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی یہ اپنی نوعیت کا بڑا ہی عہدِ آفریں تجربہ تھا۔ ان اصلاحات پر عمل درآمد کرنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ مری کاٹین کے چند ساتھیوں نے اس سلسلے میں لیت و عمل اور مثال مثول کی پالیسی اپنانی چاہی تھی۔ لیکن میں نے ان کو عملی جامہ پہنانے کا بظاہر ارادہ کر لیا تھا۔ اس لئے میں مضبوطی سے قدم اٹھانا گیا اور حق یہ ہے کہ شیر مال کی حیثیت سے زخمِ فصل یلگ نے بھی اس سلسلے میں قابلِ تعریف کام کیا۔ کشمیر میں سود خواروں، وڈ واروں، اور مہاجروں کے علاوہ حکومت نے بھی ایسے قرضوں میں دیہاتیوں کو بال بال جکڑ رکھا تھا۔ جو ہر سال ادائیگی کے بعد سودِ مرکب کے تفصیل پر پھر اپنی اصل حد تک آجاتے تھے۔ کئی صورتوں میں قرضہ لینے والوں نے اصل رقم سے کئی گنا زیادہ رقم ادائی تھی مگر پھر بھی ان کے سر پر قرضے کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر قرضوں نے اصل رقم سے ڈیڑھ گنا زیادہ بطور اتساق نقدی وضعی اداکر دیا ہو تو باقی قرضہ کا عدم تصدق کیا جائے گا۔ ان اصلاحات کو عدالتوں کے دائرے سے باہر رکھا گیا اور ڈپٹی ریکونسلیشن بورڈ DEBT RECONCILIATION BOARD متقرر کر کے اُن کا فیصلہ اُس کے دائرہ اختیار میں رکھا گیا۔ ان بورڈوں میں وکیل پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی تاکہ قانونی گورکھ دھندوں میں انصاف کو ابھار کر فیصلے کو طالت کی نذر نہ ہونے دیا جائے۔ جس حوصلے اور حوصلے کے ساتھ میں نے ان اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے میں تبصیل کی اُس کو دیکھتے ہوئے یہ بات فطری تھی کہ بعض اتساقی عناصر میرے دشمن بن جائیں۔ لیکن ایسا جو نامیرے لئے کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔ ان عناصر کا جال سرنیگر اور جوں سے ہوتا ہوا بدی ہی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ لوگ دہلی میں بیٹھے ہوئے اربابِ اقتدار کے کاڈن

میں میرے خلاف زہر گھول دینے میں اور بھی زیادہ مرگم ہو گئے۔ اور مجھے ایک فرقہ پرست کے روپ میں پیش کرنے کے لئے نئے نئے سواگ رچا لئے رہے۔ سردار پٹیل کی کوٹھی ایسے عناصر کی آماجگاہ بن گئی اور مجھ پر ان کی تیر اندازی کی کیس کا۔

بیگار ریاست میں ایک ایسی بدعت تھی جس نے شہر و دیہات میں وحشت کا عالم طاری کر دیا تھا۔ اس ظالمانہ رواج کی نذر ہزاروں کشمیری اسکروں اور بھونگی اور لدراغ کے دشوار گزار علاقوں میں ہو گئے تھے۔ اور اس سے نجات حاصل کرنا انھیں ناممکن نظر آتا تھا۔ میری حکومت نے بیگار کا صرت خاتمہ کر دیا بلکہ اسے غیر قانونی بھی قرار دیا۔

میری ایک اور بد قسمتی یہ تھی کہ کشمیر سب سے پہلی ریاست تھی جہاں میں نے سوڈنی نگران کے خلاف ۱۹۳۱ء میں تحریک شروع کی تھی۔ اتفاق سے یہاں کاراجہ ہندو تھا۔ اس لئے کشمیر کو نہ معلوم کس پیانے سے ہندو ریاست سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہاں پچاس فیصد سے زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی۔ کوئی تحریک جو صبح معنوں میں عوامی تحریک ہوتی مسلمانوں کی شمولیت کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔ لہذا مہا اجداس کے حواریوں اور بھائی بندوں نے ہماری تحریک کو فرقہ پرستی کا نام دے کر بدنام کرنا چاہا جو کہ کشمیر میں سوڈیڑھ سوسال غیر مسلم نگران برسرِ اقتدار رہے تھے لہذا مسلمانوں کی حالت ایک محکوم معذور اور مظلوم طبقے کی سی تھی۔ ان کو جملہ حقوق کے محروم کر لیا گیا تھا۔ حکومت کے ظلم و ستم میں ان کا تناسب صفر کے برابر تھا۔ تعلیم میں وہ سب سے زیادہ پسماندہ تھے۔ اور رنجارت میں بھی وہ پچھلے رہتے تھے۔ الغرض ان کی حالت گونگے اور بے زبان بولشیوں سے بہتر نہ تھی اور مرابین میری نے ان کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بوجہ ورت مست تھا۔

اس لئے جب مسلک آزاد ہوا اور ہم نے حکومت سماجی تو مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں کی حالت کو بہتر بنانا نہیں انصاف و مساوات کا منطقی اور منصفانہ تقاضہ معلوم ہوا لیکن ہندو طبقے

کے لوگ جو حکومت بد چھانٹے ہوئے تھے اس تبدیلی کو اپنی اجادہ داری پر حملہ تصور کرنے لگے۔ انھیں اپنے موقع کی کمزوری کا احساس تھا۔ اسی لئے ذہنوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے انھوں نے بے تحاشہ شور مچانا شروع کیا تاکہ اس گڑا گڑا ہٹ میں اصل مسئلے کے ضد و غالب چھپ جائیں۔ انھوں نے بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ اس تبدیلی کے اخراجات اور حقائق کو پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ سردار پٹیل نے نئی بارش بارے میں ہم سے استفسار کیا۔ جب ہم نے ریاست کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے مسلمانوں کے اعداد و شمار اور وزن میں مختلف فرقوں کے لوگوں کا تناسب الگ الگ کر کے انھیں دکھایا تو وہ سستائے میں آ گئے۔ وہ بولنے لگے کہ شکایت تو مسلمانوں کو ہونی چاہیے مگر یہاں سر پداسمان اٹھاتے ہیں ہندو لوگ۔ میں نے جواب میں کہا کہ شاید ہندو اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ مرکز صرف ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کے دل اور دروازے دلوں بند ہیں۔ سردار یہ سن کر صرت مسکرا کر رہ گئے۔

جہاں تک تلمارتوں کے شعبے کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کا تناسب آج بھی ان کی آبادی کے توازن سے بہت کم ہے۔ یہ عدم مساوات ان محکموں میں بہت ہی نمایاں ہے جو براہِ راست مرکز کے ماتحت ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی سیکورٹیشن کے لحاظ سے انھیں سیکولرزم کا چہرہ کو درشن SHOW WINDOW ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حالات میں کسی بہتری کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ہم بار بار مرکزی حکومت کی توجہ اس طریقہ کار سے کراتے رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ریاست کے مسلمانوں کے لئے یہ بات منطقی بن جاتی ہے کہ وہ ہندوستان کے سیکولرزم کے دعووں پر اعتماد کر لیں۔ وہ جب دعویٰ اور عمل میں زمین و آسمان کی تفاوت دیکھتے ہیں تو ان کی انصافیت میں کچھ ایسی گڑبگڑ جاتی ہے جو قومی احساس کے لئے ہرگز مقید اور متعاون نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دعوے اور عمل کا

یہ فرق ہندوستانی راہنماؤں کا سب سے بڑا اہم رہا ہے اور انھوں نے کئی بار خود بھی اس کے تھکک عواقب کا اعتراف کیا ہے۔

ایک اور انقلاب آفرین اقدام جس نے ہماری تحریک کے مقاصد کو مقرر کر دیا، لیکن میرے دشمنوں کی صفوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا کشمیر کے موروثی راجاؤں کے کاغذات تھا۔ ہم نے ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد اس خاندان کے چنگل سے کشمیر کو پھیر لیا تھا جس کی نیا دہائیوں نے کشمیریوں کو غلاموں سے بدتر حالات سے دوچار کر دیا تھا۔ لیکن اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

یہ زمانہ اگرچہ بڑی آزمائش اور آشوب کا تھا لیکن کشمیریوں میں کوئی چار صدیوں کے بعد پہلی بار آزادی کی کرنیں دلوں کی ترجمانی ہوتی کو پہلوں کو پھیرنے کی شگفتہ گرد ہی تھیں۔ پہلی مرتبہ ایک وزیر اعظم دور دراز مہمات کا دورہ پیدل یا گھوڑے کی پشت پر کرتا دیکھا جلتا تھا۔ وہ ان سے گلے مل جاتا۔ ان کی زبان میں ان سے باتیں کرتا اور ان کو ملنے بیٹنی پر ابھارتا۔ دہلی سے رقومات ملنا ان دنوں بہت آسان نہ تھا۔ ایک تو خود کو تقسیم کے زخموں کو چاٹ رہی تھی دوسرے وہاں کی یورورڈی کو کشمیر کے مستقبل کے متعلق اندیشہ ہاتے دور دراز لائن تھے۔ لہذا وہ لالہ جی کی کاروباری ہوسشیداری کے ساتھ روپے پیسے کے معاملے میں جھجک جھجک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ اور ہم بھی کشمیر کو اس حد تک زیر بار احسان نہیں کرنا چاہتے تھے کہ پھر سیاسی اور بین الاقوامی مسائل پر ہماری آزادی گفتار اور کھلائی بر کوئی آئے۔ ہم کشمیریوں میں خود کفالت، قربانی اور محنت کی عادت ڈالنا چاہتے تھے۔ جس سے انھیں عارضی طور پر ضرورت نہ ہو جاتی لیکن ان کا کردار بھی سانچے میں ڈھل جاتا اور آخری نتیجے کے طور پر یہی ان کی رہائی اور اور دیر پا بھارت اور خوش حالی کا ضامن بنتا۔ ہم یقینی طور پر کسی حد تک ناموفق رہے

اختیار کر رہے تھے۔ اور پاکیزگی و دیانت کو بے ایمانی اور بددیانتی پر ترجیح دے رہے تھے لیکن حب وطن اور کشمیر کی تقدیر سے کبھی اور بڑی وفاداری کا تقاضا بھی تھا۔ یہ صرف میری سن ترانی نہیں تھی۔ علامہ اقبال نے "جادید نامہ" میں شاہ بھدان کی زبان بہادری سے بھی مجرب شمع کشمیریوں کے لئے جوڑ لیا تھا۔

بندہ کو خوشنیتیں دار و خیر

آفریندہ منفعت را از ضرر

بزم باد و است آدم را بابل

رزق باد و است آدم را بابل

گوشتہ ۱۹۵۲ء کے بعد ذاتی اغراض کے متواووں نے گھلی ڈھیل چھوڑ کر اپنے لئے سستی مشیولیت کا کھل جاسم شرم دریافت کر لیا۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ان کی سستی مقبولیت فریب سے زیادہ ثابت نہ ہوئی اور وہ بعد میں عوام کے غم و غصے کی لہروں میں تنکوں کی طرح بگڑ گئے۔ اسی طرح انھوں نے جلد بازی اور کوہنے کاٹنے SHORT CUTS کے جو حل پیش کئے تھے انھوں نے بھی ریاست کی پائیدار خوش حالی کا راستہ ہموار نہیں کیا بلکہ کردار کی تباہی کے ساتھ ریاست کے لئے ایسے مصائب اور مسائل کا انبار چھوڑ گئے جس کے کاٹنے قوم کو اب برسوں سے ذک مزگاں سے نکالنے پڑ رہے ہیں۔

شکستہ ۱۹۵۲ء کے اس دور کی کچھ اہم کامیابیوں کا ایک مختصر سا خاکہ یہ ہے:-
(۱) موروثی حکمرانی کا خاتمہ کیا گیا۔ ریاست کے آئینی سربراہ کی تقرری چننا کے ذریعہ کوئی طے پائی۔ چنانچہ ماہرین نے کشمیر کو بھلاؤ پر وفاق کے اندر وفاق۔
REPUBLIC WITHIN A REPUBLIC سے موسوم کیا ہے۔ یہی سنگھ کشمیر کو

جھوڑ کر ایسے چلے گئے کہ پھر انھیں یہاں کا رخ کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

ب۔ ریاست کے جاگیرداروں کی باگیاہی ضبط کر کے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی اور جاگیرداروں وغیرہ کو کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ سالہا سال کے قرضے معاف کر دیئے گئے۔

ج۔ کثیر میں پہلی برقی روٹھی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سرکاری بجٹ کا ۳۵ فیصد حصہ تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کر دیا گیا۔

د۔ کثیر میں چار صدیوں کے بعد کثیر یوں پر پرنسٹن فوج نیشنل ملیشیا کا قیام عمل میں لایا گیا اور انھیں اسلحوں رکھنے اور استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔

اس ریاستی انتظامیہ میں پہلی بار ریاستی باشندوں کو کیدی عہدوں اور گزٹڈ مسامیوں میں بڑا حصہ ملا جن میں مسلمانوں کی ایک اچھی تعداد بھی شامل تھی۔ انھیں فٹنس و میڈی کٹھی میں سکھ شاہی کے آغاز سے خال خال ہی کسی اہم اسامی پر تعینات کیا جاتا تھا۔

مشق) کثیر ی زبان کے لئے اس کے مخصوص لپیٹ اور ضروریات کے مطابق ایک ایسا ہم الخط اختراع کیا گیا جو تپ میں آسکتا تھا اور سکولوں میں کثیر ی اور ڈوگری زبان میں تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ ۱۹۵۷ء کے بعد یہ اقدام بھی نئی حکومت کی کوتاہ بینی کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اور جو لاکھوں نصابی کتابیں ہم نے چھاپ دی تھیں انھیں رتوی کے مول بیچ دیا گیا۔

ص) جو تارکین وطن ۱۹۴۷ء میں مان کے لائے پڑنے پر سرحد پار کر کے بھاگ گئے تھے انھیں واپس لا کر ان کی بحالی کا کام شروع کیا گیا انھیں تقاضی قرضے دیئے گئے اور ان کی آباد کاری کے لئے خاص عہدہ بنایا گیا۔

ن) کثیر اپنے ہنز مندوں کی محنت اور عرق ریزی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور رہا ہے یہاں کے کاری گروں کی انگلیوں میں ٹمن اور خوبصورتی کے چین زار آراستہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ ان کے بنائے ہوئے خال دو خالے۔ تالین۔ چوب کاری۔ پیپر مینق۔ مسونے اور چاندی کے بڑے بڑے ہوتے ظروف وغیرہ ساری دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ لیکن خود یہ کاری گر کارخانہ داروں اور درمیانہ داروں کے استحصال کا نشانہ بن کر عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں ہم نے انھیں اقتصادیل کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے گورنمنٹ آفیس الیوریم کا قیام عمل میں لایا۔ اور اس کا دفتر اس عالی شان عمارت میں رکھا جہاں کبھی برطانوی حکومت کا ریڈیو کٹر رہا کرتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کثیر کو ہندوستان کے آئینی ڈھانچے میں دفعہ ۳۷۷ کے تحت حریت و آجرو کا مقام دلانے میں کامیابی حاصل کر لی گئی جس کے تحت ہمیں ہندوستان کی مجموعی سرکاری کے چمکے ہیں اپنا ذیلی آئین اپنا ذیلی پرچم اور اپنی ذیلی آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا حق حاصل ہوا۔ ان میں اکثر کامیابیوں کا مغز ۱۹۵۷ء کے بعد نکال کر دیئے گئے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کی گئی۔ اور کثیر ی عوام کو پہلانے کے لئے صرف ان کاغذی ہی خول باقی رہنے دیا گیا۔ ہم نے اس وقت خود کفالت کے بارے میں یقینی ذہن پرست کوششیں کیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہم نے ریاست میں زیادہ سے زیادہ اناج چھپا کر نئے پر زور دیا تاکہ ہم کسی پرلوچ نہ بننے پائیں۔ ان دنوں میں خود ایک وقت مٹی کا رایتہ اچھے کثیر ی میں ”سکایہ دالٹھ“ کہتے ہیں کھایا کرتا تھا۔ تاکہ عوام کو بھی اپنی خودا کی میں توجہ پیدا کرنے کی عادت پڑ جائے

اور وہ صدیوں کی روایتی خوراک کے قیدی بن کر نہ رہ جاتیں۔ میں نے لوگوں کو یہ مشورہ دینے سے بھی گریز نہیں کیا کہ اپنی گردن اور نچی رکھنے کے لئے اگر انھیں آلو، جو غذائی لحاظ سے کسی دوسری غذا سے پیچھے نہیں ہیں کھانا پڑیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں یار لوگوں نے اس کا افسانہ بنادیا۔ بخشی صاحب نے رعایتی نرخوں پر چاول تہہا کرنے کی بدعت شروع کر دی اور وہ لوگوں کو برسرِ عام تلپین کرتے گئے کہ اگر وہ آدھ سر چاول کھانے کے عادی ہیں تو اب سے ڈیڑھ سیر کھانا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کشمیریوں کی فاقہ مستی کا حکم کھلا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔ اور ان کی حقیقت کو سنا کر ان کی شک پرستی کو آج بھارا جا رہا تھا۔ جیلا ایسے قومی شعور سے عاری لوگ اگر محمد پر چھپٹے اڑاتے رہے تو میں اقبال کا یہ شعر قہر آنے کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

پرداز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

بعد میں خوراک کی اس امداد (سب سڈی) نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ یہ ہمارے خزانے کا ایک بھاری حصہ ٹرپ کر قی رہی اور دوسری طرف سائے ٹنگ میں کشمیریوں کو چاول کی خیرات لینے کے غنہ دیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ خوراک اور دوسرے میداؤں میں خود کفالت حاصل کرنے کا سارا خواب درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انڈے سے لے کر بیگن، بلکہ چائے تک ہر ایک چیز کے لئے ہمیں بیرون ریاست کی مٹریوں کی طرف ہاتھ پھیلانے پڑے۔

اس کے علاوہ میں نے اپنی دلوں عوام کو اپنا کتبہ مدد و درگتھ کے ذریعہ اختیار کرنے کی ترغیب بھی دی تاکہ انھیں عیال کشی کی جلت اور ٹنگ کو آبادی کے دھماکے

کی مصیبت کا شکار نہ ہونا پڑے۔

لیکن میری گرفتاری کے بعد اس نظریے کو میری تعریف اور تحسین کا ذریعہ بنایا گیا۔ حالانکہ بعد میں خود مرنے اس کی اہمیت کا احساس کر کے اسے ترجیحی پروگراموں میں شامل کر لیا۔ ع۔

کبھی جزوِ فطرت ہے اہلِ ستم کی

کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا

سازشوں کے سائے

ہندوستان کی خفا کو میری ذات کے خلاف مسموم بنانے کے لئے جو مہم چلائی جا رہی تھی اس کی پشت پر جو بات تھیں اُن پر ایک نظر ڈالنا کثیر کی سیاست کی پیچیدگیوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے لازمی ہے۔ سب سے پہلی بات جو میرے متحلفین کو کھلتی تھی یہ تھی کہ میں کشمیر کی تحریکِ حریت کا بانی ہوں اور صدیوں کے بعد میں نے یہاں کی سب خواب آبادی کو ایک نئی زندگی سے جگایا کیا ہے۔ اتفاق سے جاگنے والوں کی اکثریت مسلمان تھی اور مسلمان طبقہ ہندو تھا۔ اُس لئے بہت سے ہندو پہلے دن سے اس صورت حال کو پسند نہ کرتے تھے اُنھوں نے نہ صرف میرا ساتھ نہ دیا بلکہ مجھے اپنا دشمن تصور کر لیا۔ اس بات کا ثبوت پنجاب اور دہلی کے ہندو اخبارات کے صفحات پیش کرتے ہیں جو ۱۹۴۷ء سے آج تک کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی منہ پر میرے خلاف زہر اُگلنے رہے ہیں۔ بعض اوقات میرے اقدامات سے میرے مسلمان بھائی بھی خوش نہ ہو سکے لیکن ان اخبارات پر تعجب کی ایسی حد تک چڑھی ہوئی ہے کہ وہ بھی اسے میری چالاکائی سمجھتے رہے۔ یہ ان اخبارات کا قصور نہیں بلکہ اس ذہنیت کا کرشمہ ہے جس کی یہ توہماتی

کرتے ہیں۔ ایک اور امر جس نے ہندو فرقہ پرستوں کو مجھ سے بدگمان کر دیا تھا یہ تھا کہ میں نے آزادی کے بعد کچھ ایسی اصلاحات کو نافذ کر دیا جن سے سورہ اتفاق سے مسلمان طبقہ کے استعمال عناصر پر زور پڑی اور اُن کا زیادہ تر فائدہ بعض اتفاق سے اکثریتی طبقہ کو ملا۔ یہ اور بات ہے کہ اُن سے مستفید ہونے والوں میں لاکھوں ہری جن اور اور دوسرے غیر مسلم بھی تھے۔ چونکہ وہ لوگ پہلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور خاموش تھے اس لئے ہندو فرقہ پرستوں کی نگاہ اُن کی طرف نہیں گئی۔ ایک اور بات یہ بھی کہ غیر متقسم ہندوستان کی ریاستوں کو عام طور پر اُن کی آبادی کی ترکیب کی بجائے اُن کے حکمرانوں کے مذہب کی بنا پر بانٹ دیا گیا تھا اور اسی حوالے سے اُنھیں ہندو مسلمان یا سکھ ریاستوں کی ذیل میں شمار کیا جاتا تھا۔ حیدر آباد کے عوام کی جھادی اکثریت اگرچہ ہندوؤں کی تھی لیکن مسلمان اُسے ایک مسلم ریاست ہی تصور کرتے تھے۔ اس کے برعکس ریاست جموں و کشمیر کی پچاسی فیصدی سے زیادہ آبادی اگرچہ مسلمان تھی لیکن ہندو اسے ایک ہندو ریاست ہی مانتے تھے۔ باقی ریاستوں کا حال بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ ریاست کشمیر میں مطلق العنانیت کے خلاف جو جنگ میں نے شروع کی تھی وہ راجہ کی ذات کے خلاف نہ تھی بلکہ ایک نظام کے خلاف تھی لیکن اس کو کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ یہ صورت ہندوؤں تک محدود نہیں تھی بلکہ مسلمان بھی اس کا شکار تھے۔ اور میں اس سلسلے میں مولانا قلام رسول تہر کا وہ واقعہ بیان کر چکا ہوں جب اُنھوں نے کشمیر کی بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہاں سے ہندو جہاد جاکر اقتدار ختم ہونا چاہیے۔ لیکن میرے ٹوٹنے پر کہ پھر ایسا ہی معاملہ حیدر آباد میں بھی پیش آنا چاہیے وہ بول اُٹھے تھے کہ حیدر آباد کی بات دوسری ہے۔ ہم اس کے لئے کئی کشمیر قربان کر سکتے ہیں بلکہ معتز لوگ ضرور اس سے مستثنیٰ تھے۔ مثلاً گاندھی جی اور جواہر لال، لیکن گاندھی تو دوسری

انہما کو گئے تھے۔ اور انہوں نے ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا چونکہ کثیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لہذا اسے پاکستان میں جانا چاہیے۔ میں نے چونکہ ایک ہندو حکمران کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت دکھانی تھی اس لئے ہندو فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے لکھنا ہوا غار بن کر رہ گیا۔ جو سچی وجہ تھی کہ ہندوستان کے ہندو فرقہ پرستوں اور مسلمانوں میں باہمی بد اعتمادی کی فضا اس قدر بنی ہوئی تھی کہ ہر مسلمان کو ہندوستان میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ میری بساط کیا ہے۔ مولانا آزاد جی عظیم اہمیت ہستی کو بھی اس الزام سے مجبور انہیں رکھا گیا۔ اسی کارن میرے ہر اقدام کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مہاراجا بھری سنگھ کی خاندانی حکومت کا فائدہ اس نظام کی چھاؤں میں پلنے والے ایک بڑے طبقے کے مفادات پر چوٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہلا وہ مجھے اس اقدام کے لئے کیوں نہ جانتے۔ لہذا انہوں نے ریاست میں میرے خلاف فضا بنانے کے لئے اپنی جھوٹوں کے سکہ کھول دیئے۔ اپنی عناصر نے ہندوستان کے فرقہ پرستوں سے گٹھ جوڑ کر کے جوں میں برہما پرستید کی تحریک کو اگسا یا وہ ایک ودھان ایک نشان اور ایک پردھان کے خوبے کو اپنا تبلیغی جنگ بنالیا۔ وہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ مہاراجا کے خاندان کو راجہ سنگھاسن پھر سے سوچ دینا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کا پتھر گھر کثیر کے مسلمانوں کو بھی مغلوب رکھا جاسکتا ہے۔ میں اُن کے اس منصوبے کی راہ میں چٹان بن کر خالی تھا اور اس لئے وہ مجھے اسی میدان سے ہٹانے کے لئے ہر جائز اور ناجائز حربہ استعمال کر رہے تھے۔ میرے ناخین کی تمام کوششیں اس نقطے پر مرکوز ہو گئیں کہ مجھے کسی نہ کسی طرح اقتدار کے کمرے میں لایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس آزمودہ کار کتنے کو استعمال کرنا شروع کر دیا گیا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے انہوں نے اخلاقیات کے اصولوں کو فراموش

کر کے چٹان کی بنی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے میرے قریبی ساتھیوں پر ڈورے ڈالنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ بخشی غلام میرے سب سے قابل اہم ساتھی اور نائب تھے۔ اور میرے بعد ان کا دوسرا درجہ تھا۔ انہوں نے بخشی کی فطرت کی کمزوریوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ مراد پٹیل نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیرنا اور اُن کی پیٹھ پر تھپکی دینا شروع کر لیا۔ اُن کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں روپے پیسے سے مالا مال کر دیا گیا۔ ان کے بھائی ہندو کو فوج میں بھاری مالیت کے ٹھیکے الاٹ کئے گئے۔ ایسا فیضیاتی ماحول تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی جس میں بخشی صاحب کو یہ باور ہو جائے کہ کثیر کی حکومت کے روبرو وہی ہیں اور اُن کی ہی بدولت یہاں کا کاروبار مملکت چلتا ہے۔ خوشامد کا درگزر ہتھیار بھی استعمال کیا گیا بخشی صاحب کو ترو آہن کا خطاب دے کر ان کا دماغ خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اُدھر میں بخشی غلام محمد کی کچھ خوبوں کا قاتل اور قدردان تھا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اُن سے محبت بھی کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اُن کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کی شرار تراشی کر کے اُن کے مثبت پہلوؤں کو اُبھارنے میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا میں کبھی کبھی مرزا نرسن اور کبھی دوستانہ مشورے کی صورت میں انہیں ان کمزوریوں کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ بخشی صاحب تھے بڑے زمانہ ساز آدمی۔ وہ کبھی مجھ سے نہیں اُٹھتے تھے اور ہمیشہ مرزا محمد کا میری باتوں کا پیسہ سنتے جیسے واقعی انہیں اپنے کے پر فرس ہو رہا ہو اور وہ اب آئندہ کے لئے احتیاط کرنے کا پیمانہ باندھ رہے ہوں۔ اُن کی یہ اچھی اچھی سمجھ کہ کئی بار اُن کی غلطیوں پر کارکنوں اور عوام نے میرے سامنے شکایت بلکہ احتجاج کیا۔ لیکن میں اُن سے درگزر کرتا رہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اُن کی عادات بدلنے میں کامیابی کا جو خواب دیکھ رہا تھا وہ میری سادگی اور حسن ظن

سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ اٹالیہ ہوا کہ ان کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کا پٹارہ وزبروز زیادہ بھاری ہوتا گیا اور ان کو شائبہ پاش کینے والے نہیں اور زیادہ بگڑاتے رہے۔ جواہر لال کے ساتھ اگرچہ میرے مراسم بہت محکمہ انداز اور دوستانہ تھے اور وہ میرے بعد عزت کرتے تھے لیکن کچھ ایسی ہوا چلی کہ وہ بھی بخشی صاحب کی پیچھے ٹھوکنے لگے۔ چنانچہ ایک بار ایک اہم معاملے کے متعلق جواہر لال نے مجھے خط لکھا اور خط کے آخر میں یہ منی فیز جملہ لکھ دیا کہ میں اس خط کی ایک نقل بخشی غلام محمد کو بھی بھیج رہا ہوں۔ میں اس پر بہت حیران ہوا۔ میں نے جواہر لال سے احتجاج کیا اور انھیں لکھا کہ یہ طریق کار نہ درست ہے اور نہ ہی حق بجانب۔ اگر ان کو کچھ پر اعتماد نہیں رہا ہے تو انھیں واڈ کیلئے کی ضرورت نہیں۔ میں اقتدار سے خود تہر دار ہوتا ہوں۔ وہ بخشی غلام محمد کی ایسے شخص کو جس پر وہ پورا اعتماد کرتے ہوں ریاستی حکومت کا سربراہ بنا سکتے ہیں۔ جواہر لال پر میرے اس خط کا مناظر خواہ اثر ہوا۔ انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے جواب لکھا کہ وہ شیر میں صرف شیخ محمد عبد اللہ کو جانتے ہیں اور یہ کہ میرے اندیشے درست نہیں ہیں۔ لیکن حالات کچھ اور ہی کر وٹ لے رہے تھے۔ اس قسم کی آواز میں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں کہ بہت جلد کچھ ہونے والا ہے چنانچہ ایک مرتبہ صادق صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ بخشی صاحب اور چند ساتھیوں کی ایک خفیہ میٹنگ میں اس بات پر غور کیا گیا ہے کہ مجھے گرفتار کیا جائے اور اس طرح وزرائی انقلاب بپا کر دیا جائے۔ میں نے بخشی غلام محمد کو خبر غلام محمد صادق امر نواز محمد افضل بیگ اور مولانا محمد عبد سعیدی کو اپنے گھر بلایا۔ اور اس راز کا انشاء کیا اس پر بخشی صاحب نے ہوجا کہ آپ کو یہ اطلاع کس نے دی ہے؟ میں نے صادق صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن بد قسمتی سے صادق صاحب کو اعتراض حق کی جرات نہ ہو سکی۔ اور وہ اپنے کپے ہونے سے ٹکر گئے۔ اس بد میں نے

اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چاہے اسی میٹنگ ہوتی ہو یا نہ، لیکن میں یہ بات کافی دیر سے سنتا آیا ہوں کہ آپ لوگ مجھے وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ بخشی صاحب اپنے مخصوص انداز میں بولے کہ کون ہے وہ جو ایسا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے ملاقات مگر مضبوطی سے جواب دیا کہ ”آپ، بخشی صاحب اس پر بڑے پٹیلے آن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے لگے اور ذرا میری قسمیں کھا کر کہنے لگے کہ یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ان کی قسموں میں اس قدر شدت تھی کہ میں چپ ہو گیا۔ بلکہ ان سے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو جانے دیجئے لیکن آئندہ اگر ایسا خیال آجائے تو گرفتاری کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے مجھ سے بر ملا کہہ دیجئے۔ میں خود ہی کسی دوسرے کے لئے جگہ خالی کر دوں گا لیکن جس کسی کو بھی آپ نامزد کریں اس کے ہاتھ پر سب کو مطلق و فاداری لینا چاہیے۔ میں نے پیش کش کی کہ اس قسم کا مطلق سب سے پہلے میں اٹھاؤں گا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہا کہ اگر آپ کی خواہش یہ ہو کہ میں سیاسی میدان سے بالکل ہی علیحدگی اختیار کروں تو میں ایسا کرنے کے لئے بھی تیار ہوں تاکہ جماعت میں انتشار پیدا نہ ہو۔ میں نے یہ بھی کہا کہ نا اتفاقی اور انتشار قوم کی موت کے مترادف ہوگی اور میں اس سے کھر گزردا وار نہیں۔

مجھے نیا دھک لگنے اور میرے مخالفوں کو جہیز کرنے کے لئے جواہر لال کے پراپیٹوٹ سیکرٹری پنڈت دوار کا ناتھ کاچر و پیش پیش تھے۔ وہ کشمیر میں ایک قبائلی لیڈر شپ کے بھادر اور اس کے لئے رضا جوار کرنے کے لئے دن رات ایک کر رہے تھے۔ ایک اور کشمیری پنڈت کاشی ناتھ بام جی اس ناکہ کے ایک اور اداکار تھے۔ ان کو میری سفارش پر مرگزمین انعامیش سروس کے ایک بڑے عہدے پر تعینات کیا گیا تھا۔ لیکن وہ اب میرے پیری بن گئے تھے۔ ایک اور شخص جو نہ وکٹے میں میرے خلاف زہر افشانی کرتا رہتا

تھا بریگیڈ ترقی ایم کول تھا۔ کول ایک پرانا کٹھیری پنڈت تھا اور نہرو خانوادے میں اُس کی رہائی تھی۔ ستمبر میں آدھوہور میں ایک بریگیڈ ترقی حیثیت سے تعینات تھا۔ اُس کے تحت سپاہیوں نے چند گورنر عورتوں کو اغوا کیا۔ محمد نیک معاملہ پہنچا۔ میں نے کول کو ریاست سے باہر بلانے کا مطالبہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو میں اُس کو جیل بھیج دوں گا۔ اگرچہ چند فوجی آفیسروں نے میری کافی منت سماجت کی لیکن میں نے ماننا۔ انھیں کول کو واپس بلانے ہی بنی اور اس طور پر وہ میرے درپے آزاد ہو گیا۔ اس صورت حال کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ میرے مخالفین کو معلوم تھا کہ میرے خلاف فرقہ پرستوں کی چالیں اس وقت تک کامیاب نہیں رہ سکتیں جب جواہر لال نہرو اور میرے درمیان ذہنی اور جذباتی فاصلے مائل نہیں ہو جاتے۔ اس لئے میرے مخالفوں کا تمام زور پنڈت جی کو میرے خلاف بدظن کرنے پر مرکوز ہو گیا۔ ملنے کا منصوبہ بڑی زبردستی اور ہوشیاری سے ترتیب دیا گیا۔ پنڈت جی پر براہ راست اثر ڈالنے میں کچھ موموم اندیشے اور خطرات درپیش تھے۔ اس لئے انھیں گھیرے میں لانے کا راستہ اختیار کیا گیا۔ کوشش یہی کی گئی کہ اُن کے گرد جو مصاحب اور قابل اعتماد لوگ تھے اور جو اُن کے مزاج میں دخل رکھتے تھے اُن کو کسی نہ کسی طرح قابو میں لایا جائے اور پھر اُن کے ذریعہ پنڈت جی کو رام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کھیل میں پنڈت جی کے خاندان کے افراد بلکہ اُن کے نوکروں کا کردار اور خدمت گاروں کو بھی بڑی ہوشیاری سے استعمال کیا گیا۔ پنڈت جی کے قربت داروں کے کانوں میں اچھے پیچھے لگی کہی بہانے میرے خلاف کوئی بات ڈال دی جاتی تھی اور کٹھیری کی کہادت کے مطابق "بات بات سے پہاڑ ٹک بیل جاتے ہیں" پنڈت جی تو غیر ہنر تھے۔ سردار پٹیل تو جانتے تھے کہ مجھے خیرید انہیں جاسکتا انھیں اس کا بھی علم تھا کہ میرے اور جواہر لال کے تعلقات کس قدر قریبی ہیں۔ انھیں ہماری یہ حریت ایک آنکھ

نہیں بھاتی تھی کیونکہ اُن کی جواہر لال سے چٹک ہی نہیں بلکہ باقاعدہ رقابت موجود تھی۔ سردار پٹیل اپنی جگہ یہ سمجھتے تھے کہ مراد لاگر میں سے واسطی کے لحاظ سے ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم بننا اُن کا حق تھا۔ لیکن گاندھی جی نے جواہر لال کو اپنا نائب اور جانشین قرار دے کر انھیں اس جائز حق سے محروم کر دیا تھا۔ گاندھی جی سے وہ تقسیم ہند سے پہلے بہت قریب تھے۔ اور اپنے آپ کو گاندھی جی کا آدمی سمجھتے تھے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد اُن کے گاندھی جی سے اختلافات ہونے لگے۔ خاص طور پر فرقہ وارانہ معاملے میں گاندھی جی اُن کے رویے سے بیزار ہو کر جواہر لال کے زیادہ قریب آ گئے۔ اس حد تک کہ اپنے آپ کو گاندھی جی کا آدمی قرار دینے والے پٹیل اب گاندھی کو جواہر لال کا آدمی قرار دینے لگے۔ نظریاتی طور پر بھی اُن دو بڑے رہنماؤں کے درمیان بڑی فیصلج موجود تھی۔ پنڈت جی کے سیاسی نظریات سردار سے بہت مختلف تھے۔ اس لئے سردار اُن لوگوں کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے جو جواہر لال کی قربت میں رہتے تھے۔ بلکہ وہ اپنی تمام تر طاقت صرف کر کے اُن کو تشکیلات و مصائب میں پھنسانے کی ٹوہ میں لگے رہتے اور تب تک بس نہ کرتے جب تک کہ اُن کا تختہ مشق اُن کے سامنے گھٹنے ٹیک نہ دیتا۔ سردار کے فیض و غضب کے شرکار جواہر لال کے بہت سے چاہنے والے ہو گئے جن میں جو وہ پور ریاست کے ایک بڑے سیاسی لیڈر اور ہمارے قریبی دوست بے خرافت و یاس بھی شامل تھے۔ چنانچہ خود بے خرافت سے جب میں نے بے پیمار اُنھوں نے جواہر لال کا ساتھ کیوں چھوڑا تو اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کہ ہوم منسٹر کی حیثیت سے سردار نے انھیں کئی جھوٹے مقدمات میں الجھا رکھا تھا۔ میں اُن کی درودھی کہانی سن کر بڑا متاثر ہوا۔ لیکن جب میں نے جواہر لال سے فریادی تو انھوں نے کوئی مددوا انہیں کیلے ایسا لگتا ہے کہ خود جواہر لال سردار پٹیل کے منہ لگنے سے گھبراتے تھے اور اُن کے دل میں چاہے کچھ بھی

جذبات کیوں نہ رہتے ہوں وہ تصادم اور ٹکراؤ کے مواقع کو ٹلنے کے ہی آرزو مند رہتے تھے مجھے ہی سردار کی طبیعت کے اس دھماکے سے واقفیت ہو چلی تھی اس لئے میرے لئے ایک ہی چارہ کار تھا کہ یا تو میں سردار کے سامنے سپر ڈال کر نجات حاصل کروں یا مختلف سازشوں کے چکر میں گرفتار ہو کر جیل خانے کی راہ دیکھوں۔

میرے ساتھ سردار نے اتنی دور جانے کی جرأت تو نہیں کی لیکن انھوں نے میرے براہِ راستی کرنل غلام قادر کو میری نایب و کو اپنے خطاب کے لئے چن لیا۔ غلام قادر ہمارا آجہ بھو لکڑے دربار میں وزیر تھے اور کافی عرصے سے ریاست اندور کے مہاراجا کی ملازمت سے وابستہ تھے۔ وہ ہمارا آجہ کے بہت قریب تھے اور ان کا امور سلطنت میں خاصا دخل رہتا تھا۔ سردار ٹپیل کی ہمارے پرانے پر یہ پٹھان تلاش کیا کہ وہ ہمارا آجہ کے ہمراہ اتار اور زیورات پہننے کے لئے امریکہ جانے والا تھا۔ غلام قادر کو بہت پریشان و مراسیمہ کیا گیا۔ سردار نے اپنے سکریٹری دی۔ پی مین کو اندور بھیجا کہ وہ اس معاملے کی تحقیق و تفتیش کرے۔ فرض اس بات میں کوئی دقیقہ نہ گذاشت نہ کیا گیا کہ وہ کسی نہ کسی الزام میں ماضی ہو جائے پس یہ وہ سرکار کا یہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ اس طرح مجھے برباد ڈالنے اور مجھے پریشان کرنے کا کوئی ذریعہ اس کے ہاتھ لگے۔ لیکن بڑی خوشحالی کے باوجود کوئی بات ہاتھ نہ آ سکی۔ البتہ میرے براہِ راستی کا تاقیر اس قدر تنگ کر دیا گیا کہ وہ اندور کو خیر باد کہنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ میں ان دنوں اقوام متحدہ کے لئے ہندوستانی ڈپٹی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے نیویارک جانے والا تھا۔ میں نے سردار کی اس روش پر پینڈت جی اور گوالا سموا می سے زبردست احتجاج کیا۔ میں نے انھیں یہ بتا دیا کہ وہ کسی اور گوالا سموا می سے کام نہ لیا گیا تو میں ڈپٹی کمیشن سے کنارہ کشی اختیار کروں گا۔ شاید اس وجہ سے

سردار کے بڑھے ہوئے ہاتھ ٹک گئے۔ اگر میرا دباؤ نہ پڑتا اور سردار کو معلوم نہ ہوتا کہ ہندوستان کے لئے میری شمولیت کتنی اہم ہے تو وہ غلام قادر کو بڑے گھر کا مہمان بنا کر ہی دم لیتے۔

پینڈت جی کے اعصاب کو نرم بنانے اور ان کو میری "خطرناکی" کا قائل کرنے کے لئے عجیب و غریب حربوں سے کام لیا گیا۔ ہوم منسٹر کی حیثیت سے سردار ٹپیل جاسوسی کی مختلف ایجنسیوں کو کنٹرول کرتے تھے ان دنوں مرکزی انٹلی جنس کا ایک دفتر بننے میں کام کر رہا تھا۔ جس کا سربراہ محکمہ جاسوسی کا ایک افسر کرنل حسن ذالیمہ تھا۔ بخشی صاحب ریاست کے ہوم منسٹر تھے۔ ان کے ذریعے یہ اہلکار علی کسن والیہ ہمارے خلاف مرکز کو غلط سلطہ رپورٹیں بھیجتا رہتا تھا۔ بخشی صاحب نے ہی تجویز کیا کہ اس کو ریاست بدر کیا جانا چاہیے۔ میں نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور حسن ذالیمہ کو جوبھ گئے کہ اندر اندور فرزند کرنے اور دہلی چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس واقعہ سے دہلی کے ایوانوں میں سنسنی پھیل گئی۔ لیکن آئینی لحاظ سے ہم پر اس بات کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ ہم منسٹر انٹلی جنس کو ریاست میں کام کرنے دیں۔ اس لئے سردار ہاتھ ملتے رہ گئے۔ انھیں عرصہ تو بہت آیا لیکن علاوہ کچھ کر نہ سکتے تھے۔ البتہ انھوں نے جوابدہی کے اس معاملے پر زبردست احتجاج کیا۔ معاملہ اتنا سنگین بن گیا کہ جواہر لال نے سردار کے گھر بھی پر اس سوال پر غور کرنے کے لئے ایک میٹنگ بلوائی۔ ریاست کی طرف سے اس میٹنگ میں میرے علاوہ بخشی غلام محمد اور بیگ صاحب شریک ہوئے مرکز کی طرف سے جواہر لال کے ساتھ سردار ٹپیل کو بلا دیا اور گوالا سموا می آئیئر کم موجود تھے، سردار کی طبیعت اس روز خراب تھی۔ اس لئے وہ صوفے پر ٹیک لگاتے بیٹھ رہے۔ حسن ذالیمہ کا معاملہ چھڑ گیا تو میں نے اس کو ریاست بدر

کرنے کے حکم کا سارا پس منظر بیان کیا۔ اور کہا کہ الحاق کی دستاویز کی رو سے مری
 انٹی جنس ریاست میں کام کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ محض اپنی وضع داری اور رواداری
 (COEXISTENCE) کی بنیاد پر ہم نے اس دفتر کو دہلا کام کرنے کی اجازت بخشی تھی۔ لیکن
 جب ہمیں محسوس ہونے لگا کہ یہ مرکز اور ہمارے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے
 کی بجائے تقبیہ کرنے پر توجہ دے رہا ہے تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کاربیاست میں وجود
 فائدہ مند ہونے کی بجائے مضرت رسا ثابت ہوگا۔ سرکار بڑے ممالک کے ساتھ بولے
 کریں جسے جو اہر لال سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم نے کشمیر میں ایک جواہر لال جس میں
 ہمیں مات ہو گئی ہے۔ اس لئے ہمیں کثیر کو چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن جواہر لال ہیں کہ کسی
 کی شہتہ ہی نہیں۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے ہندوستان کے عوام کے
 ساتھ رشتہ جوڑا ہے۔ چند افراد کے ساتھ نہیں۔ اور اس رشتے کی بنیاد بھی خیالات
 اور آدرش کی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے۔ کوئی مالی یا مادی فائدہ نہیں ہے۔ اگر آپ
 کو کشمیر کے ساتھ الحاق کرنا پسند نہیں اور آپ اپنے بیان سے پھر جانا چاہتے ہیں تو آپ
 کو سارے واقعات ہندوستان کے عوام کے سامنے رکھنے چاہئیں ہم بھی اپنا کیس
 اُن کے سامنے پیش کریں گے اُس کے بعد اگر وہ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دینا پسند نہیں
 کریں گے تو ہم اپنا راستہ لیں گے اور آپ اپنا میرے اس طرز کلام سے محفل میں
 سنا سنا چلایا اور سبھی کے اعصاب تن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہا اگیاہری سنگھ کشمیر
 سے رخصت ہو کر ممبئی میں گھوڑ دوڑ سے دل بہلا رہے تھے اور اپنے راجا جگدگرن سنگھ
 کو اپنا ریکٹ بنانے تھے۔ ہمارا فی تا رادیو می سرکار کے پاس دہائی دینے کے لئے
 آئی تھیں۔ سرکار نے اس واقعہ کا ذکر کیسا اور کہا کہ ”ہمارا فی جب میرے پاس
 آئی تھی تو اس صوفے پر بیٹھی تھی جس پر آپ بیٹھے ہیں۔ وہ اس قدر اسی ہوئی اور

پریشان خاطر تھی کہ ہمیں پریش کھا کر گئی۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو مجھ سے کہا کہ
 ہم نے کون سے ایسے پاپ کئے تھے کہ ہمیں بن باس دیا گیا۔ میں تو اس کی حالت دیکھ کر
 بڑا افسردہ ہو گیا۔ میں نے سرکار کی بات کاٹے ہوئے کہا کہ ”آپ کو آٹن ہزار رو
 پے گناہ مسلمانوں کا بھی خیال کیا ہے جن کو اپنی بھولی بھالی ہمارا فی صاحبہ نے
 جوں کے علاقہ میں تہ تیغ کر دیا۔“ سرکار کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ لیکن وہ
 خشم آلود نظروں سے مجھے ٹکڑی کی باندھ کر دیکھنے لگے۔ فضا بہت تنی ہوئی تھی اور سبھی
 حاضرین گم گم میٹھے تھے۔ جواہر لال صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کر کے مجھے الگ
 لئے گئے اور کمرے کے ایک کونے میں میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ انھوں نے
 بڑے اصرار کے ساتھ مجھ سے کہا کہ ”خند چھوڑ دو۔ اس معمولی بات پر معاملات کو بگڑنے
 نہ دو۔“ چندتہی کے پہلے میں اس قدر اپنائیت تھی کہ میں نرم ہو گیا۔ میں نے اُن سے
 کہا کہ میں آپ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں کیونکہ ہمارے درمیان باہمی اعتماد کا رشتہ
 موجود ہے۔ لیکن سرکار کے ہاتھ میں اگر انٹیلی جنس کا یہ ہتھیار دیا گیا تو وہ ہمیں ایک
 نہ رہنے دیں گے۔ یہ حال جواہر لال کی معاملہ فہمی اور شگفتہ مزاجی سے معاملہ درخ و فغ
 ہو گیا اور میٹنگ پر غماخت ہو گئی۔

سرکار بٹیل کے ساتھ ایک اور معاملے پر ہماری خاصی آؤزش رہی اور میں تو
 سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں ہمیں اتنا ہی زور لگانا پڑا جتنا ہم نے کشمیر میں فائدہ چکداری
 اور مذہبی اصلاحات کے لیے لگا یا تھا۔ جس وقت کشمیر پر حملہ ہوا اُس وقت ہماری ریاست
 پنجاب یونیورسٹی کے تعلیمی مدارج تھی اور اُس یونیورسٹی کو یہاں کے تعلیمی امور اور محتات
 پر گہرائی کا حق حاصل تھا۔ اس یونیورسٹی کا صدر مقام لاہور تھا۔ لہذا ہند سے ہمارے
 تعلقات کے بعد اس یونیورسٹی سے ہمارا تعلق کٹ گیا۔ اس مرتبے پر جہاں ہم اپنی الگ

یونیورسٹی قائم کرنے کے حق میں تھے وہاں سردار پٹیل اور اُن کے طرز فکر کے متکلفوں کی ضد تھی کہ ہم مشرقی پنجاب یونیورسٹی کے دائرہ کار کو ہی تسلیم کریں۔ تعلیم کو بینا دی اہمیت دیتا ہوں اور مجھے اندیشہ تھا کہ اگر ہم نے کسی اور یونیورسٹی کا دائرہ اختیار تسلیم کیا تو ہماری سرکاری زبان اردو پر زور پڑے گی۔ نصاب کی کتابوں میں گھٹیا اور جانبدارانہ مضامین کو لینا ہو گا۔ اور ہماری ثقافتی شخصیت کے خدوخال اُبھر نہیں پائیں گے۔ چنانچہ ہم نے الگ یونیورسٹی بنانے کا مقصد ابرادہ کر لیا۔ مرکز اپنی ہی الپا چاہتا رہا۔ لیکن ہماری گردن میں ابھی آئین کی گرانڈیواری کی زنجیریں نہیں لگی تھیں۔ چنانچہ ہم نے ایک الگ یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کر ہی ڈالا۔ اور تحریک حریت کے ایک اولین مجاہد اور تعلیم شناس خواجہ غلام احمد عثمانی اس کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یہی یونیورسٹی اب باغ ہو کر جوں اور سرنگر کی دو اقامتی یونیورسٹیوں کی شکل میں پنپ رہی ہے۔

میں اُن معاہدات پر دیانت داری سے عمل کرنے کے حق میں تھا جو ہمارے اور مرکز کے درمیان طے پائے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ جہاں ہم اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کا خیال رکھیں گے وہاں ہم مرکز کے اختیارات کا بھی احترام کرتے رہیں گے اور اسی طرح مرکز بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے ہمارے حقوق کی پاسداری کرے گا۔ اس طرح سے ہمارے درمیان اعتماد بڑھتا جس سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا اُگرا خود بخود چھٹ سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے راہنما کی ذہنی تحفظات کا شکار بن گئے تھے اور ہمیں اپنے ساتھیوں کا سارا اعتماد دینے کی بجائے ماکوں کی سی خوربت رہے تھے اسی ذہنیت کے نتیجے میں وہ ہمارے ہر معاملے میں جائز یا ناجائز طور پر مداخلت کا موقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ میں قدرتی طور پر اس بے اعتدالی کے آگے سر جھکا نہ پا پند نہیں کرتا تھا اور بڑھتی ہوئی مداخلت کی مزاحمت کرتا تھا۔ ایک دفعہ گوالا سوامی اینیٹر

نے جو اُس وقت مرکز کے وزیر داخلہ تھے، مجھ سے یہ سوال کیا کہ اُن کی وزارت سے مشورہ کئے بغیر ہی میں نے کیوں اور کیسے پینڈت پرکاش ناتھ دو گرو گرانٹھار کے قید میں بھیجا؟ مجھے یہ سوال اور اُن کا انداز ہرگز نہیں بھایا۔ اور میں نے جھٹ پٹ جوابی سوال پوچھا کہ آپ نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہزاروں کیلوسٹوں کو پابرجا کر دیا ہے تو آپ نے ہم سے کیوں مشورہ نہیں کیا؟ اس وقار و نریاست کے اختیارات کی ذیل میں آتے ہیں اس میں ہمیں مرکز سے بچنے کی ضرورت کیسی؟ گوالا سوامی اینیٹر رو علی کے غور پر مجھے کھینچتی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ شاید انھیں اس قسم کے طرزِ کلام سے کہیں اور سابقہ نہیں پڑا تھا۔ انھیں میرے اور مرکز کے درمیان اس قسم کے ٹکراؤ اور اور تصادم اکثر وقوع پذیر ہوتے تھے اور ہر ٹکڑے کے نتیجے میں وہ مجھ سے اور زیادہ بدک جاتے۔ اس لئے بھی میں وہی کی بری کتابوں میں سرِ فہرست رہنے لگا۔ مرکز میں کشمیر اور خاص طور پر میرے متعلق سردار پٹیل کے ٹکڑے بڑھ رہے تھے۔ اُن دنوں وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کی طرف سے مختلف لوگ کبھی راز دارانہ اور کبھی اعلیٰ درجے کے جاسوس تھے۔ جو کشمیر اور میرے متعلق انھیں مستند اطلاعات بہم کوں۔ ستم خیزی یہ تھی کہ جہاں جواہر لال کے بھیجے ہوئے لوگ میرے متعلق اچھی رپورٹیں پیش کرتے وہاں پٹیل کے بھیجے ہوئے لوگ میرے بارے میں بالکل متضاد بیانات پیش کرتے۔ جی۔ اے۔ ایم ملک مرکزی اعلیٰ جنیس کا ایک اعلیٰ آفیسر تھا۔ اُس کو مسٹر آء کے وسط میں کشمیر بھیجا گیا تاکہ وہ صحیح صورت حال کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرے۔ ملک نے مجھ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ہم نے بڑی تفصیل کے ساتھ کشمیر اور دوسرے متعلقہ معاملات پر تبادلہ خیال کیا۔ ملک بخشی غلام محمد، صادق صاحب، لکھنؤ کی دو مولانا سعید اور جنرل تھمالیہ سے بھی ملا۔ واپس جا کر اُس نے اپنی رپورٹ اپنے آفیسر اعلیٰ کو پیش کر دی جس میں

میرے متعلق اس نے بہت عمدہ خیالات ظاہر کئے تھے۔ یہ رپورٹ جب وزارت داخلہ کے سکریٹری ایچ اے آر آئینگر کو ملی تو اس نے اسے جھٹ وزیر اعظم کے پاس بھیج دیا۔ جواہر لال رپورٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ کشمیر اور میرے متعلق ان کے اپنے خیالات کی تصدیق بھی کرتا تھا اور آئینہ داری بھی۔ انھوں نے اس رپورٹ کی نقلیں بنا کر ایسے بیرونی ملکوں میں اپنے سفارت خانوں کو بھیج دیا تا کہ ہند کے سفر کشمیر کے متعلق صحیح صورت حال سے واقف رہ سکیں۔ سردار پٹیل کے پاس بھی رپورٹ بھیج دی گئی تھی۔ لیکن جب انھیں پتہ چلا کہ رپورٹ ان کے دیکھے بغیر جواہر لال کے پاس چلی گئی ہے اور جواہر لال نے اس کی خوب تشبیہ کر دی ہے تو انھیں سخت عیش آیا۔ سردار پٹیل نے پرسش کے لئے ملک کو طلب کر لیا۔ اور بڑے جیسے سے دریافت کیا کہ رپورٹ کو ان کے پاس بھیجنے کی بجائے براہ راست وزیر اعظم کے پاس کیوں بھیج دیا گیا ہے۔ ملک پر کچھ طاری ہو گئی۔ اور وہ صفائی میں بولا کہ اس نے رپورٹ اپنے انیسرے علی کو بھیج دی تھی نہ کہ وزیر اعظم کو۔ اس ہداس کی جان بخشی ہو گئی، سردار نے ملک کے سامنے میرے خلاف جو فقرہ بھاری دہی اس کا ذکر ملک نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ سردار پٹیل نے ملک سے صاف گفتگوں میں کہا کہ وہ میری نسبت جواہر لال کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے اور مجھے بڑا خطرناک اور ہمدرد دشمن سمجھتے ہیں۔ سردار نے ملک کے سامنے مجھے اس لئے بھی آڑے ہاتھوں لیا کیونکہ میں جواہر لال کی مخالفت کر رہا تھا۔ سردار بات تو آدھی نہیں تھے۔ اور خوب جانتے تھے کہ کہاں اور کس وقت کیا کہا جانا چاہیے۔ اگر وہ ملک کے سامنے یوں گویا ہو گئے تھے تو اس کے صاف معنی یہی تھے کہ ملک اشارہ بھیجے اور جب بھی آئندہ میرے متعلق کوئی رپورٹ بھیجے تو اس میں ان کے خیالات کا لحاظ رکھے۔ ملک خود رقم طراز ہے کہ اس ملاقات کے ستوڑی ہی دیر بعد سردار نے تیس سینئر افسروں کو بلا کر

کر کے اسے انٹلی جنس بیورو کا سربراہ مقرر کیا۔ اسی قسم کے طور طریقوں سے سردار نے منزل انٹلی جنس کے علاوہ آرمی انٹلی جنس اور دوسرے ذرائع کا استعمال کر کے جواہر لال کو جھٹ سے بدظن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بخشی غلام محمد کرن سنگھ اور ڈی پی درد نہ صرف خود جاسوسی کرتے تھے بلکہ وہ اس کام میں سردار پٹیل کا ہر طرح سے ہاتھ بٹا رہے تھے۔ بخشی صاحب نے دو بار کا ناٹھ کا چروہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک موٹر کار مفت پیش کی۔ اور اس کی دوسری ضروریات پوری کرتے رہے۔ بخشی صاحب ان کاموں میں بڑے طاق اور مشتاق تھے۔ انھوں نے ہاتھ بٹا کر کبھی اسی قسم کے سلوک کے گناہے لیا۔ جواہر لال کے خاص نوکر ہرتی کو بھی اس کی قیمت ادا کر کے ہموار کر لیا گیا۔ اس کے علاوہ میسز اندرا گاندھی، فریڈ گاندھی، میسز جے لکشمی پنت، جواہر لال کے پرنسپل اسسٹنٹ ایم۔ اومتھانی وغیرہ کو بھی مختلف طریقوں سے اپنے شیشے میں اتار اگیا۔ ان کاموں میں ڈی پی درد، بخشی صاحب کے خاص ہمراز اور دمساز کی حیثیت سے داور راقیت دیتے رہے۔ اور کرن سنگھ بھی کسی ایسے شخص نہ رہے۔

بات اس سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ ہم کا بینڈ میں مختلف امور پر بحث و مباحثہ کر کے جب کوئی فیصلہ لیتے تو ہمیشہ اتفاق رائے سے لیتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ ہمارا کوئی فیصلہ جواہر لال نہرو کو پسند نہیں آیا۔ لیکن میرے ساتھیوں میں اتنی اخلاقی حرارت کہاں تھی کہ وہ اس فیصلے کی اجتماعی ذمہ داری قبول کرتے۔ اگلے وہ ایسے مواقع پر میرے خلاف زہر افشانی کرتے۔ وہ جواہر لال کے پاس جا کر کھسکے پھر کے انداز میں کہتے کہ یہ شیخ صاحب کا فیصلہ ہے اور ان کے سامنے ہماری کچھ نہیں ملتی۔ اس طرح جواہر لال کے دل میں یہ بات بھادی گئی کہ مجھے اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کرنے کی بدواہ نہیں اور میں ایک آمر متعلق کی طرح کام کر رہا ہوں۔ ان طور طریقوں کا

آخری نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ اور اس کا فوجی نرغہ پیش آیا۔ میرے ساتھی میرے سامنے تو دفن داری کی قسین کھاتے تھے لیکن میری پیٹھ پیچھے غبروں کو تیز کرتے رہے۔ شاید نظر علی خان نے اس شعر میں میری حالت کا ہی نقشہ کھینچا ہے۔

میں اگر سوختہ سامان ہوں تو یہ روز سیاہ

خود ہی دکھلایا ہے میرے چڑخانے نے تجھے

▲▲▲

(۴۶)

دفعہ ۳۷۰ کا طلوع

خاتمہ جاگیر داری کے سلسلے میں راجہ گوجر اور راجہ جہنپی کی جاگیریں بھی گئیں۔ یہ دونوں جاگیر دار مہاراجہ کے قربت دار تھے۔ لیکن تمہارا جاتان سے درپردہ بغض رکھتا تھا۔ اس لئے ان کی جاگیریں جلی جانے پر اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔ جہنپی ایک چھوٹی سی جاگیر تھی جس کا ملازمہ کد اور آؤ وچھو کے درمیان واقع تھا۔ وہاں کے راجہ نے جہنپی کے مظلوم عوام کا قافیہ تنگ کر دیا تھا۔ اُس نے بڑے بڑے رقبہ جات کو اپنے نام پر منتقل کر دیا تھا اور ان کو عوام سے کشت کروا کے انھیں بس اشک شوقی کے لئے فصل کی تھوڑی سی مقدار دے دیتا تھا۔ وہ ان کے علاوہ ان کے اہل و عیال سے بھی پیگہ لیتا تھا۔ اور اُس نے ان کی حالت بڑی غیر بنادی تھی۔ ان مظلوم کا جبر چاہم تک پہنچا تو ہم نے راجہ کے خلاف ایک منظم تحریک شروع کی۔ جو سردار مبدھ سنگھ کی قیادت میں کافی عرصے تک جاری رہی۔ اس تحریک میں نصرت وہاں کے باشندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ جنوں تک سے دردمند اور روشن خیال لوگ ابھی ٹیشن کے لئے جہنپی پہنچے۔ اور جوہن کے علاقے میں ایک صمیم عوامی تحریک شروع

میکاکولی :- اصل نام نکولو میکاکولی۔ ۲ مئی ۱۹۲۹ء اطالیہ کے شہر فلورنس میں پیدا ہوا۔ اور ۲۳ جون ۱۹۵۲ء کو جیل بسا۔ اُس کی کتاب THE PRINCE سیاسی قیادی کے گزسکھانے کا شاہکار مانی جاتی ہے۔ فرانسس بکن نے اس کے متعلق لکھا "میکاکولی ہمارے شکر یہ کا مستحق ہے کہ اُس نے بتایا کہ حکمران کیا کرتے ہیں نہ یہ کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے میکاکولی کے متعلق لکھا۔

آل فلارنساری باطل پرست

فطرت اوسوئے ظلمت بڑھ رشت

باطل از تعلیم او بالیدہ است

چانگلیہ۔ چند گیت موریہ کا وزیر کوغلیہ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ارتھ

شاستر کا مصنف میکاکولی کا مشرقی نیم البدل ارتھ شاستر سیاسی جیدگری کا درس دیتا ہے۔

(د۔ م۔ ی۔ ٹ)

کہ اس سلسلے میں عوام نے بہت سی قربانیاں بھی دیں۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ہم آزادی سے بہکنا نہیں چاہتے تھے۔ خاندانِ جاگیر داری کے قانون کے منظور ہوتے ہی راجہ صاحب کا پتہ کٹ گیا اور اُس کی اکثر فوج بھی جاتی رہی۔ وہاں کے عوام صدیوں کے بعد جاگیر دارانہ استعمار سے نجات پاتے۔ پونچھ کا راجہ بھی ایک نیم غورخوار یعنی حیثیت سے علاقہ پونچھ کا خداوند بن گیا تھا۔ ایک وقت تو اُس نے ایک چھوٹے رجسٹری کے لئے الگ ڈاک ٹیکٹ جاری کرنے کا بیضک خیر اقدام بھی کیا تھا۔ وہاں کے عوام کی حالت بھی خراب تھی۔ پونچھ کے لوگ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہیں۔ وہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں کچھ اعلیٰ پایے کے دانشور اور صاحبِ فہم لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے اندازے ہی اپنے آپ کو تحریکِ کثیر کے ساتھ پوری طرح وابستہ رکھا تھا۔ پہلے مسلم کانفرنس اور پھر نیشنل کانفرنس کے زمانے میں وہ ہمارے شانہ بشانہ تحریک میں شامل رہے۔ ہم نے اپنی تنظیم کے کئی سالانہ اجلاس پونچھ میں منعقد کئے اور وہاں خونِ کاہلیاں بھی دیا گیا۔

ہندوستان میں آئین ساز اسمبلی تک کے آئین کو ترتیب دینے کے کام میں مشغول تھی اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی تھی مگر مرکز کو کثیر کے خاندانوں کی شمولیت کا خیال آیا۔ اُس وقت ہم ہمارے ایک نافرمان آئین میں ضروری اور مناسب ترمیم و تبدل کر کے کسی طرح سے کام چلا رہے تھے۔ لیکن اس بات کو طے کرنا ضروری بنتا جا رہا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد کی صورت حال میں ملک کے آئین میں ہماری ریاست کی پوزیشن کیسا رہے گی؟ چنانچہ اِس معاملے پر دہلی میں ہمارے اور مرکزی رہنماؤں کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔ ہماری طرف سے پیشی صاحب بیک صاحب، میر قاسم اور ڈی بی نے درنہ مذاکرات میں حصہ لیا اور کچھ عرصے کے بعد

میں بھی اُن میں شامل ہوا۔ ہم آپس میں اِس فیصلے پر پہنچے تھے کہ دستاویز الحاق کی دوسرے مرکز کو جن امور کی ذمہ داری سونپی گئی تھی ہم اُن سے تجاوز نہیں کریں گے۔ لیکن مرکزی لیڈروں کی خواہش یہ تھی کہ ہم ہندوستان کی باقی ریاستوں کی طرح اپنی انفرادی شخصیت کو قربان کر کے اپنے آپ کو یونین کے بڑے دریا میں مدغم کریں۔ لیکن ہمارے خاص حالات اور ہماری تحریک کے مقاصد ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہمارے موافق کی وجوہات صحت تھیں۔ اول تو کثیر ہندوستانی یونین میں شامل ہونے والی واحد ایسی ریاست تھی جہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ہماری ریاست تین اطراف سے پاکستان کے علاقے سے گھری ہوئی تھی۔ پاکستان اِس پر اپنا دعووی جتا رہا تھا۔ ہندوستان نے اسے شہادتی کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ جس کے ذریعے ریاست کے مستقبل کا حتمی فیصلہ کرنا مقصود تھا یہ سارا معاملہ اقوام متحدہ کے فورم میں زیر دست بحث و مباحثے اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز اور محور بن کر رہ گیا تھا۔ جہاں بار بار ہندوستانی خاندانہ بلند آواز سے یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہندوستان کو کثیر کی سرزمین پر قابض رہنے کی نہ کبھی خواہش تھی اور نہ اب ہے۔ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ ریاست میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی رائے شماری کرائی جائے اور یہاں کے لوگوں کو حق دیا جائے کہ وہ یہ فیصلہ کریں آیا وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں؟ آیا وہ اپنی ریاست کو آزاد اور خود مختار رکھنے کے حق میں ہیں؟ ان حالات میں ریاست کا ہندو یونین میں محلی انضمام ضابطہ بحث تھا۔ اِس لئے ان تمام باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آئین ہند کی دفعہ ۳۰ کی تشکیل دی گئی۔ اگرچہ ہمیں اس کی بعض تفصیلات و اصطلاحات سے اختلاف تھا لیکن جب گولڈاسمی آئیئر نے اِس کو آئین ساز اسمبلی کے سامنے رکھا تو ریاست کے

نمائندوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یاد رہے کہ اس وقت ریاست کی طرف سے مندرجہ ذیل نمائندے آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو چکے تھے کیونکہ مرکز ان کی جلد از جلد شمولیت پر مصر تھا۔

راقم الحروف، مرزا محمد افضل بیگ، مولانا محمد سعید مسعودی، پنڈت گودھا لال ڈوگرہ، پنڈت متوکی رام میگڑہ۔

جب میں ایک ممبر کی حیثیت سے پہلی بار آئین ساز اسمبلی میں داخل ہوا تو ایوان میں چاروں طرف مجھ پر غور و خوض تھا۔ میرا استقبال کیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نے بذات خود ایوان کے اندر میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اپنی نشست کے بائیں ساتھ بیٹھا دیا۔ ہم نے اسی دن پورے آداب و رسوم کے ساتھ اپنی رنگینیت کا حلقہ بھی لیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے دفعہ ۴۷ کی تشکیل کے وقت مرکز کے راہنماؤں کے ساتھ ہمارے جو متحدہ کراٹ ہوئے ان میں، میں نے اور بیگ صاحب نے جو ایک ماہر قانون کی حیثیت سے میرے نزدیک مشہور تھے، یہ تاثر قائم کیا کہ مرکز کے ساتھ ہماری دل سیدھی طرح گلے والی نہیں۔ مرکزی راہنماؤں کے دلوں میں گرہیں اور ان کے دماغوں میں تعقبات موجود ہیں۔ وہ چاہتے زبان سے کچھ ہی کیوں نہ کہیں دل سے وہ یہی جانتے ہیں کہ کثیر کو باقی ریاستوں کی سطح پر لے آئیں۔ اور اسے اپنی کے پیانے سے تھیں۔ ان راہنماؤں کا فطری میلان یہی ہے کہ ریاست کی انفرامین کو ختم کر دیا جائے۔ یہ صورت ہمارے اندیشے نہیں تھے بلکہ گوپالا سوامی کی آئین گروہ دفعہ ۳۷ سے متعلق تجویز پیش کرتے ہوئے اس بارے میں ہندوستان کے ارادوں کی غمازی بھی کی۔ گوپالا سوامی نے کہا تھا کہ:

”یہ دفعہ جو خصوصی درجہ کثیر کے لئے تجویز کرتی ہے وہ کثیر کے مخصوص حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ ریاست، ابھی (ہندوستان میں) ضم ہونے کی صورت میں نہیں ہے۔ ہر شخص کی یہ توقع ہے کہ اگلے چل کر ریاست جوں و کثیر بھی اس قابل ہو جائے گی کہ وہ یونین میں اسی طرح ضم ہو جائے جس طرح باقی ریاستیں ہوتی ہیں۔“

غیر منقسم ہندوستان کی ریاستوں کے حکمرانوں نے آزادی سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ کے راہنماؤں کے ساتھ سلیجی جوڑی گفت و شنید کے بعد ایک محبتہ کیا تھا۔ جس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ وفاق میں ان کی شمولیت کی صورت میں انہیں کیا حیثیت دی جائے گی۔ وہ بنیادیں بھی طے پا گئی تھیں جن کی بنا پر حکمران ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتے تھے۔ طے پایا تھا کہ ریاستیں صرف رسل و رسائل امور خارجہ اور دفاع کے امور مرکز کے سپرد کر دیں گی۔ اور باقی امور میں اپنی خود مختاری برقرار رکھ سکیں گی۔ سر دار ٹیل نے اس وقت یہ یقین بھی دلایا تھا کہ وفاق کے خرابے کا بوجھ ریاستوں پر نہیں ڈالا جائے گا۔ لیکن اقتدار ایک عجیب شے ہوتی ہے جب کانگریسی لیڈر رو نے اس کا مزہ چکھا تو ان کی ہمتیں بدل گئیں۔ انہوں نے ہند کے ساتھ الحاق کرنے والی تمام ریاستوں کو یونین میں مدغم کرنے کی پالیسی پر پوری سے عمل کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلا اقدام اس سمت میں یہ اٹھایا گیا کہ ان ریاستوں کو اپنی الگ الگ آئین ساز اسمبلیاں قائم کرنے کی بجائے مرکزی آئین ساز اسمبلی کے فیصلے کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ ریاستیں اپنے الگ آئین ترتیب نہ دیں اور مرکزی آئین کو ہی اپنی ریاستوں میں لاگو کریں۔ اس طریقے سے ان کی اختیارات یونین میں ضم ہو گئی۔ اس غرض کے لئے پہلے مختلف ریاستوں کی الگ الگ گروپ بندی کی گئی اور ہر گروپ کے لئے ایک راج پر مشتمل اور ایک آپ راج پر مشتمل کیا گیا۔ اس

طرح راجے مہاراجوں کی کثیر تعداد حقیقی اعتبار سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ دوسرے مرحلے میں راج پرمکھوں اور آپ راج پرمکھوں کو انتظامی سربراہی سے الگ کر کے آئینی سربراہ بنائے رہ دیا گیا۔ اُن کی حیثیت ریاستوں کی گورنروں کی ہوتی تھی۔ تیسرا اقدام یہ کیا گیا کہ راجوں مہاراجوں کو حکومت کی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر دستبردار ہونے پر راضی کر لیا گیا۔ اس رضامندی کی قیمت جیب خاص (PRIVY PURSE) دے کر چُکائی گئی۔ اُنھیں بتایا گیا کہ اس طرح سے وہ آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ مہاراجوں کی حیثیت سے اُنھیں جو آئینی قسم کی سہولیات ملتی تھیں وہ بھی برقرار رکھی گئیں۔ ان اقدامات پر کمزوری حکومت کی نہ پہنک لگتی تھی اور نہ پھٹکری۔ لیکن راجوں کی فربہ آنا کارنگ جو کھا ہو جاتا تھا۔ ان میں توپوں کی سلامی، علیحدہ جھنڈے، سرکاری پہرہ اور سفر وغیرہ کی مراعات شامل تھیں۔ راجا تو عزت نفس اور کردار کی صلاحیتوں سے پہلے ہی بے بہرہ ہو چکے تھے۔ وہ جہان سے اُگے اور اپنے وجود کو ختم کرنے پر راضی ہو گئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مندوستانی راہنماؤں کے تہور دیکھ کر سمجھ گئے جو کہ لٹگوں پر اُڑتے ہوئے کسی غنیمت سمجھا ہو۔ بعد میں سزائے راجا جی کی وزارت نے اُن غنیمت خوردوں کو پریوی پرس اور دوسری بھی تجوی مراعات سے بھی محروم کر دیا۔ راجاؤں کے کردار و عمل کے لئے کوئی احترام نہ رکھتے ہوئے بھی میں اس طریقہ کار کو ایک غیر اخلاقی اقدام سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جس سکیم کے تحت پریوی پرس کی اختراع کی گئی تھی اس کی رو سے ہر گزرنے والے سال کے ساتھ ساتھ راجا کو ملنے والی رقم بھی کمی ہوتی جا رہی تھی۔ چند سال میں قومی خزانے پر اس کا بوجھ خود بخود ختم ہو جاتا اور حکومت ہندوستان اس غیر اخلاقی فعل کے ارتکاب کے الزام سے بچ جاتی۔

کشمیر کی صورت حال بالکل الگ تھی۔ اس کے مستقبل کا سوال بین الاقوامی انجمن میں زیر بحث تھا۔ اس لئے یہاں اس طرز کی تبدیلیاں کرنا مرکز کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود مرکز کی راہنما جین مشورہ دیتے رہے کہ ہم یہاں کے مہاراجا کے ساتھ بھی یہی طریقہ عمل اختیار کریں۔ ہم نے اس مشورے کو یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ ہماری ریاست اتنی خلیفہ رقم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ مرکز کو اتنی ہی فکر ہے تو اپنے خزانے سے ادا کرے۔ چنانچہ مرکز نے مہاراجہ کے لئے دس لاکھ روپے سالانہ وظیفے کی رقم منظور کی جو یوراج کرن سنگھ بڑی مدت تک بطور تے رہے۔ اُدھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کی ہوس (اقتدار) ابھرنے لگی۔ حالات کے دباؤ کے تحت جمہوری کی حالت میں وہ عوامی حکومت کا قیام تو عمل میں لائے تھے مگر اندہی انداز حالات کی اس کردٹ پر کڑھ بھی رہے تھے۔ اُنھوں نے اطمینان کی سانس لینا شروع کی تو ہمارے کام میں غلط ڈانٹا شروع کیا۔ میری کابینہ کے وزیر حضور کر تل پٹھانیا نے انہی کے نامزد کردہ تھے۔ وہ مہاراجا کے ساتھ ہمارا رابطہ تھے۔ لیکن وہ بھی کوئی تعمیری ردول ادا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مہاراجہ کے ساتھ ہمارے تعلقات روز بروز بگڑتے ہی گئے۔ بالآخر ننگ آئندہ جنگ آمد۔ میں نے مرکز سے کہا کہ حالات کو ٹھیک ڈگر پر لانے کی ایک ہی سبیل ہے کہ مہاراجہ کو ان کی گدزی سے الگ کر دیا جائے۔ سر واپٹیل مہاراجہ کے زبردست مددگار اور پشت پناہ تھے۔ لیکن مرکز کے لئے ہم سے ٹکر لینا بھی ممکن تھا۔ اس لئے ہری سنگھ کو رخصت کے لئے بھیجا جان پڑا۔ لیکن گوالا سوامی نے سر واپٹیل کی رضامندی کے لئے ایک انوکھا طریقہ نکالا۔ یعنی اُنھوں نے ہری سنگھ کے ذریعے اُن کے بیٹے کرن سنگھ کو ریاست کا آئینی سربراہ مقرر کر دیا جو اپنے والد کے کہنے پر ہم پر تسلط برآمد ہو گئے۔ اس وقت بھی مہاراجہ نے سر واپٹیل کو لکھا کہ ”میں زیادہ سے زیادہ

تین چار ماہ تک ریاست سے باہر جانے کو تیار ہوں۔ لیکن اس اقدام کو تخت سے دستبردار کی کا پیش خیمہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ لیکن مہاراجہ کی ہوس اقتدار پھر پوری نہیں ہو سکی۔ اور پھر وہ کبھی اپنے طلاقِ تخت پر پیشگی سے مسترت حاصل نہ کر سکے۔

زندگی کی منطق ایسی ہوتی ہے کہ اس کے متعلق پہلے سے ہی پیش گوئی کرنا بے حد مشکل ہے۔ مہاراجا جاپلے گئے تو ہمارے یہاں کچھ نئے مسائل نے سر اٹھایا۔ میرے ساتھی ایک دوسرے کے خلاف چھوٹی چھوٹی سازشوں میں لگ گئے۔ ایک وقت بخشی غلام محمد اور مولانا سعید کا اتحاد بنا اور ان کے خلاف غلام محمد صاحب، مرزا محمد افضل بیگ اور گردھاری لال ڈوگرہ صفت آرائے۔ پی۔ ڈی۔ ایک رنگ بدلتے دانی نوٹری کی طرح کبھی اس گرد و پ اور کبھی اس گرد و پ کے ساتھ تختی میلانے رہے۔ اس بات پر کٹر جینی شروع ہو گئی کہ کابینہ میں وزیروں کی تعداد بہت زیادہ ہے لہذا اس میں کمی کی جانی چاہیے۔ میں نے سب وزیروں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ ان کی نظر میں کابینہ میں وزیروں کی کتنی تعداد ہونی چاہیے۔ اس وقت کابینہ میں نو وزیر تھے۔ اب پانچ کی تعداد پر اتفاق ہوا۔ میں نے ہر وزیر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور ان سے کہا کہ وہ اپنے اپنے طور پر پانچ پانچ نام تجویز کریں۔ یہ پانچ نام کاغذ کے جس پرزے پر لکھ دیں اور پھر اپنے دستخط کر لیں۔ یہ سب کارروائی رازدارانہ طریقے پر کرانی گئی۔ بعد میں جب ان پر جیوں کو کھول کر دھکے لگائے گئے تو حسب ذیل ناموں پر اجماع **CONSENSUS** ہو گیا۔ راقم الحروف، بخشی غلام محمد، مرزا محمد افضل بیگ، گردھاری لال ڈوگرہ اور شیا لال مراف۔

کرتل پر محمد مراد بدھ سنگھ، کرتل بھائی اور غلام محمد صاحب سے استعفیٰ طلب کیا گیا۔ صادق صاحب نے استعفیٰ دینے میں کافی تاخیر سے کام لیا۔ وہ بخشی غلام محمد

اور مرزا محمد افضل بیگ کی سفارش بھی لے آئے۔ لیکن میں نے انھیں یہ کہہ کر مٹھون کرنے سے انکار کر دیا کہ پہلے آپ خود مسائل کھڑے کر دیتے ہیں لیکن جب فیصلہ آپ کی منشاء کے متعلق نہیں ہوتا تو پھر آپ دھرت اپنے کئے پر نشان ہو جاتے ہیں بلکہ اسلامی تدابیر کو بھی ملیا میٹ کرنے کا بیڑا اٹھالیتے ہیں۔ یہ طریقہ کار کسی لحاظ سے بھی حق بجانب اور درست نہیں۔

صادق صاحب کے لئے اب وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے سوا چلارہ نہ تھا۔ لیکن اس پر دس دس وہ میرے اور میری حکومت کے خلاف ایک ہتھ چلنے میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے اپنے چچرے بھائی خواجہ محمد امین قرہ سے ہاتھ ملایا۔ حالانکہ سیاسی طور پر ان دو کے درمیان میری عداوت کے علاوہ کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ انھوں نے کبھی میں کا کھن کا سوا لگ رچایا اور کبھی بد و ستاریوں کی نمائندگی کا ڈھونگ۔ لیکن ان کی ساری اچھل کو اکارت گئی۔ کیونکہ انھیں عوامی تائید کی تعمیق متاع حاصل نہیں تھی۔ صادق صاحب بیٹا ایک شریف آدمی تھے لیکن وہ نہایت کم کوش آزار مالک اور غیر فعال شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی سیاست کا دائرہ زیادہ تر دیوان خانے کی محفوظ فضاؤں تک محدود رہتا۔ جہاں وہ نرم اور مسلا کم بچھوٹوں پر بیٹھ کر سیاسیات اور عوامی تحریک پر فتویٰ صادر کرتے رہتے۔ اور ایک بانی مباحث میں مشغول رہتے۔ محنت کرنے کی عادت سے کوسوں دور تھے۔ اور عوامی زندگی کی ناہمواریوں اور تھکلیفات سے گھبراتے تھے۔ وہ ایک کھاتے پینے گھرانے کے ذوق تھے۔ جس کو کبھی اکام روزگار کی کشاکش نے بے قرار نہ رکھا تھا۔ اور جس کی زندگی حیل و آرام میں گذرتی تھی۔ چونکہ تحریک کی ابتدا میں میں پڑے گئے تھے مسلمان توجہ ان کی ضرورت تھی لہذا میں مرزا محمد افضل بیگ کی طرح انھیں بھی کالی سے اٹھا کر سیاست میں لے آیا تھا۔ خیالات کے لحاظ سے وہ اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔

لیکن ایک قسم کی ذہنی عیاشی سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں تھی کیونکہ خودمان کی اپنی زندگی ان کے دعووں کی نفی کرتی تھی۔ وہ پہلے پہلے عوام سے ملنے کو ایک سزا سمجھتے تھے اور ان کا کبھی عوام کے ساتھ رابطہ ہی قائم نہیں ہو سکا۔ ان کی اشتراکیت کا ایک ثبوت البتہ نمایاں تھا۔ یعنی وہ حسب ضرورت سپاہی سے کمزور ٹوٹے میں زرکوئی جھک محسوس کرتے تھے اور نہ عار۔ محی الدین قرہ کی یاد آئیں لیلہائے وزارت کے روٹھ جانے کے بعد ہی آئی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے ہمارے فلات، بخشی غلام محمد سے صرف ہاتھ ہی نہ ملایا بلکہ انھیں ان میں ایسے نئے نظر آنے لگے کہ وہ اپنی محفلوں میں انھیں مارشل سٹالین کی صفات کا آدمی قرار دینے لگے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ بخشی صاحب کے فلات طوطے کی طرح رٹ لگاتے رہے تھے اور انھیں کتبہ پروری اور بدعتوانی کا نشان سمجھتے تھے۔ سلسلہ ۴ میں میری غیر قانونی گرفتاری کے بعد صادق صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے اس فوجی نرے کی حمایت کرتے ہوئے اسے "برہمن" اور برہمن کارروائی" قرار دیا۔ حالانکہ میں نے انھیں آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کرایا تھا۔ اور اس محترم اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے انھیں ایک بڑے قارئین جانب داری اور انصاف پسندی کی روش زیادہ زیب و جی۔ بعد میں وہ سرنگر سے لے کر بمبئی تک میرے فلات گلا چھاڑ پھاڑ کر یہ پروپیگنڈا کرتے رہے کہ میں امریکی سامراج کا چٹو بن گیا ہوں اور کشمیر کو دوسرا گریانا بنا چاہتا ہوں معاف کیا نے اس سلسلے میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ اس سازش کے سلسلے میں ان کے پاس ناقابل تردید تحریری ثبوت موجود ہے جس کو بہت جلد شائع کر دیا جائے گا۔ لیکن اپنی موت کے لمحے تک وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ کرتے بھی جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ البتہ ان کے جاہ پسند اور غور و خرد و دماغ کی اختراع ضرور تھی۔ جس کی حقیقت کی پہلی ہی کرن نے دھندلا دیا۔ اپنے آخری برسوں میں وہ پیشانی پر ہر جگہ پھرتے تھے کہ سلسلہ ۴

ہیں سیاسی مائیوٹیا ہو گیا تھا اور ہیں ہر جگہ ٹی کے دیکھے سارے امیجٹ ٹیپے نظر آتے تھے۔ سلسلہ ۵ کے نرے کے وقت وہ بخشی غلام محمد کو اپنا ملجا و مائیں تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کے نام کا کلمہ رٹتے تھے۔ لیکن جب بخشی صاحب کے ساتھ ہندوں کی بندر باٹ پر جھگڑا ہوا صادق صاحب نے ایک اور قلابازی کھائی۔ بخشی صاحب سے الگ ہو گئے اور ان پر ایسی گتہ اچھائی کہ الامان و انعطاف۔ انھوں نے بخشی غلام محمد پر ایسے الزامات کی ذرہ بزم لگا دی کہ ایسا لگتا ہوتا تھا کہ آئندہ بخشی صاحب سے اتحاد کا سوال تو درگبار وہ ان کا منہ تک دیکھنے کے روا دار نہ ہوں گے۔ اس دور میں میں گد جیل میں قید تھا۔ صادق صاحب کو اپنی کسپیسی میں میری یاد آئی۔ اور انھوں نے کشمیر کو گوریا بنانے والے شخص سے درخواست کی کہ وہ ریاست کو "بخشی غندڑوں کے راج" سے بچانے کے لئے جمہوری تحریک کی قیادت سنبھالے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے باقاعدہ خط لکھا۔ حالانکہ جب میں نے انھیں صدر آئین ساز اسمبلی کی ان کی حیثیت میں اسی جیل سے خطوط لکھ کر بخشی دود کی سیاہ کاریوں کے فلات ان کی توجہ مبذول کرائی تھی تو اس وقت انھوں نے ایکسپس چہرہ وکیل کی طرح بخشی صاحب کی ان تمام جہرہ و تیلوں کی وکالت ہی نہیں کی تھی بلکہ ان کا جواز بھی پیش کیا تھا۔ اور پھر اپنے قلم کی بے حیا جنبش سے انھیں بری کر دیا تھا۔ انھیں نے قدرتی طور پر ان کے متحدہ محاذ کی پیش کش کو ایسی عقارت سے ٹھکرا دیا جس کی وہ مستحق تھی۔ کیونکہ میرے اختلافات بخشی غلام محمد کے علاوہ ان کے دہلی کے آقاؤں سے بھی تھے۔ جن کی نوعیت بنیادی قسم کی تھی۔ بخشی اور مخلوق کو تو میں ان کے آقاؤں کے ہاتھ میں کچھ نہیں تصور کرتا تھا۔ جن کی حرکات و سکنات کا دار و مدار دہلی کے آقاؤں کی ترنگ پر تھا۔ جس امانت سے وہاں سے ڈور پائی نوعیت کا ناچہ ناچتے رہتے۔ بہر کیف غلام محمد صادق جب مجھ سے مایوس ہو گئے اور جب انھیں

اندازہ ہو گیا کہ بخشی غلام محمد اُن سے بڑا مدارسی ہے اور اُسے ہر اتان کے بس کی بات نہیں تو صادق صاحب بخشی صاحب کے آستانے پر بچہ کو رش بجالانے کے لئے حاضر ہو گئے۔ نئی دہلی کی ہدایت ہی پر بخشی صاحب نے ایک فاتح کی طرح اُن کو وزارت میں بچہ شامل کر لیا۔ اور اُن کی نظر میں بخشی غلام محمد پھر راست سے سب سے بلند قامت و تاد بن گئے۔ انھوں نے کسی اصول سے وفاداری نہیں دکھائی۔ ہمیشہ موقع پرستی اور اقتدار پسندی کو اپنا نصب العین بنایا اور اسی کیفیت میں عالم بپتا کو سہارا گئے۔ اُن کے زمانہ اقتدار میں کشمیر کی اندرونی خود مختاری کو جس قدر رک پہنچی وہ ہماری تاریخ کا ایک افسوسناک باب ہے مگر وہ کرتے بھی کیا۔ انھوں نے کشمیر کی عزت کی نیلای میں بخشی صاحب سے بھی بڑی بولی دی تھی اور اب دہلی کے آتوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی قوم اور اپنے وطن کو رہن رکھ کر اپنے اقتدار کی گھڑیاں دراز کر رہے تھے۔

جب ۱۹۴۷ء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے تو اُس وقت صادق صاحب سیاسی صحراؤں دی کے آبلوں سے بے مال ہو رہے تھے۔ بخشی غلام محمد صادق صاحب سے بیزار تھے۔ انھوں نے تجویز کیا کہ حلقہ امیر اکدل سے ایک بے وقعت شخص غلام قادر خان عرت نانہ کو نیشنل کانفرنس کی طرف سے کھڑا کیا جائے۔ لیکن میں نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ صادق صاحب نے کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ کی ہوں وہ بہر حال ہمارے ایک ساتھی رہے ہیں۔ اور اُن کے مقابلے میں ایک غیر معروف شخص کو کھڑا کر کے نہ ہم اپنے ساتھ انصاف کریں گے اور نہ صادق صاحب کے ساتھ۔ میری ایما پر صادق صاحب کو پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا۔ اور میری ہی تجویز پر وہ آئین ساز اسمبلی کے صدر چن لئے گئے۔

صدارت کے لئے اُن کے نام کو تجویز کرتے وقت میں نے اُن کے حق میں بڑی اچھی تقریر کی۔ مجھے اُس وقت کیا علم تھا کہ میری شرافت اور احباب قوازی کا مجھے بہت جلد وصلہ پہننے والا ہے اور صادق صاحب اپنی کرسی پر بیٹھ کر میرے غلوں کا صاحب چکلتا کر دیں گے۔ جب صادق صاحب سسٹم میں چندی گڑھ کے ہسپتال میں آخری گھڑیاں گن رہے تھے تو انھوں نے مجھ سے ملاقات کی تمنا ظاہر کی تھی مگر اُس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ج۔

دلچسپا جائے ہے اُس سے۔ نہ بولا جائے ہے مجھ سے۔

آئین ساز اسمبلی

میں بتا چکا ہوں کہ سلامتی کونسل کی کارروائی میں کئی بار شریک ہونے کے بعد میں بادل ناخواستہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ کثیر کے تنازعے کا مستحق حل اس میں الاقوامی ادارے کے ممبروں کا ہونا نہیں۔ کیونکہ یہ اہم امور کی بجائے مفادات کی بازی کا ہونا کے رہ گیا ہے۔ اس لئے میں نے ریاست کی ایک آئین ساز اسمبلی بلانے کے لئے خطا جہوار بنانا شروع کر دی۔ دہلی میں اس خیال کی کافی مزاحمت ہوئی۔ جوہر لال بھی اس معاملے میں شش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ بھی کہتے رہے کہ اگر آئین ساز اسمبلی بنائی گئی تو پاکستان کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ میں بھی شمولیت ملے گی۔ اس مزاحمت کی وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی کے ایوان ہائے اقتدار میں رہتے والے چند حاکم اس اندیشے کا شکار بھی تھے۔ کہ ریاست کی آئین ساز اسمبلی قائم ہو گئی تو ریاست کی اندرونی خود مختاری پر ان کے حملے کا اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن نیشنل کانفرنس نے اس سلسلے میں کسی دباؤ کے آگے نہ بڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے اس سلسلے میں اکتوبر ۱۹۵۰ء میں اپنی قرارداد میں اعلان کیا۔

”اس وقت تک سلامتی کونسل نے جس تذبذب اور غیر حقیقت پسندانہ روش کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ریاست کے لوگ ایک دھمکنائی کی زندگی کا عذاب سہہ رہے ہیں۔ جو نیشنل کانفرنس کو اس بات پر تشویش ہے اور وہ تکنیک سرانجامی اور اضطراب کے ان حالات کو جاری رکھنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ جنرل کونسل کی رائے میں وقت آ گیا ہے جب عوام کو پھر سے پہل کرنی چاہیے اور انھیں اس بے یقینی اور بے کسی کی صورت حال کو ختم کرنے کے لئے قدم اٹھالینا چاہیے۔ جنرل کونسل اقتدار حاصلی کے ملک عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ حق راستے دہندگی باغلی کے اصول پر ایک آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کے لئے سرگرم ہوں۔ جس میں ریاست کے باشندوں کے ہر طبقے اور ہر مکتب خیال اور ریاست کی ہر اکائی کے نمائندے منتخب ہو کے آجائیں۔ جو ریاست کے آئندہ رشتوں اور ان کی نوعیت کا فیصلہ کریں۔“

بالآخر ہمارے اصرار کو دیکھ کر دہلی نے آئین ساز اسمبلی بنانے پر رضامندی دکھائی۔ چنانچہ کرن سنگھ نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے ہر اپریل ۱۹۵۰ء کو حق لئے چند کی قیاد پر ایک آئین ساز اسمبلی بلانے کا فرمان جاری کر دیا۔ فرمان کا جاری ہونا تھا کہ اقوام متحدہ میں آسمان سر پر اٹھایا گیا۔ اینگلو امریکن ہلاک نے سلامتی کونسل میں ایک قرارداد کا مشورہ پیش کیا۔ جس میں آئین ساز اسمبلی بلانے پر سخت اعتراض کیا گیا تھا۔ میں نے اس مسودہ قرارداد پر سخت الفاظ میں مکتبہ چینی کی اور اسے کثیری عوام کی سرداری کے حق پر حملہ قرار دیا۔ میں نے اپنے بیان میں کہا:

”اس قرارداد کی پشت پناہی کی کوشش پر معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک قوم کی جمہوری نشوونما پر روک لگا دی جو اپنی حکومت کے دھماکے کی تشکیل ایک جمہوری طریقے سے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عوام کی راستے کی ترجمانی

کاسب سے بڑا ادارہ ہوگا اور ہم مزید ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہ کر اپنی
تقدیر کے فیصلے متعلق نہیں رکھ سکتے۔

بہر حال ہم انتخابات کی تیاریوں میں لگ گئے۔ بخشی غلام محمد انتخابی ہم کے صدر
بنادیتے گئے۔ اسمبلی کے محل ایک سولہ جات بنائے گئے۔ جن میں یکمیں نشستیں ان علاقوں
کے عوام کے لئے مخصوص رکھی گئیں جو پاکستان کے قبضے میں تھے۔ باقی پچھتر حلقوں کے
لئے علیحدہ انتخاب کی نشاندہی کی گئی۔ اور راستے درمیان کی غیر متین تیار کرائی
گئیں۔ وادی کشمیر میں پاکستان کے طرنداروں کو میدان میں آنے کی ترغیب نہ ہو سکی۔
حالانکہ میری ولی خواہش تھی کہ وہ مقابلے میں آئیں۔ اس طرح سے دونوں فریق
عوام کے سامنے جاتے اور دیکھتے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ مگر قبائلیوں نے وادی میں
جو طوفان بے تیزی بپا کیا تھا اس سے پاکستان کی تصور کشمیر کے مسلمانوں کی بجائے
میں بے انتہا مسح ہو چکی تھی۔ پاکستان کے طرنداروں کو عوام کے ان جذبات کا بخوبی
اعلانہ تھا۔ اس لئے وہ میدان میں آکر اپنی رسوائی کی تشریح نہیں کرنا چاہتے تھے۔
انھوں نے کیا رسے پر رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ جنوں کے ہندو اکثریت والے علاقوں
میں پر جاہریشہ کا اثر تھا۔ انھوں نے اپنے امید دار مختلف حلقوں کے کھڑے کرنے۔
لیکن انھیں بھی اپنی کاسیائی کے بہت کم آثار نظر آتے تھے۔ کیونکہ نیشنل کانفرنس نے
جس پینت اور شجاعت کے ساتھ ریاست کو قبائلیوں کے چنگل سے بچایا اور جس
پامردی کے ساتھ اقلیتوں کی حفاظت کا فریضہ نبھایا تھا اس کی وجہ سے اس کا وقار
عوام کی نگاہوں میں بہت بڑھ گیا تھا۔ ان حالات میں پر جاہریشہ کسی بہانے کی تاک
میں تھی تاکہ اسے مقابلے سے بھانگے نہ بھانجے۔ شہر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے اور
پر جاہریشہ کو بھی جس جیلے کی تلاشی تھی وہ اس کو مل گیا۔ ریڈ رنگ آنیسروں نے تشنگی

وجوہات کی بناء پر ان کے چند امیدواروں کے کاغذات نامزدگی ناممکن پائے اور انھیں
مسترد کر دیا۔ پر جاہریشہ اسی بہانے میدان سے ہٹ گئی۔ بہر حال ستمبر ۱۹۵۱ء میں انتخابات
ہوئے۔ اور نیشنل کانفرنس کو سو فیصدی کاسیائی مل گئی۔ پر جاہریشہ نے کافی شور مچایا
اور آئین ساز اسمبلی کو غیر نمائندہ اور ڈھونگ قرار دیا۔ بخشی غلام محمد نیشنل کانفرنس
کی انتخابی ہم کے انچارج تھے اور جنوں تو اس نے اپنی کارکردہ کار تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں
کچھ انتخابی کے ضابطگیوں وقوع پذیر ہوئی ہوں۔ کیونکہ بخشی غلام محمد جس وقت اطلاع کے
مالک تھے اس کو دیکھتے ہوئے یہ باتیں خارج از امکان نہیں تھیں۔ لیکن اگر واقعی ایسی
باتیں سرزد ہوئی ہوتی تھیں تو آئین میں اس کا انسداد کرنے کے لئے مناسب تدابیر موجود
تھیں۔ اور پر جاہریشہ ان کی پناہ لے سکتی تھی۔ لیکن انتخابی میدان سے روفو کھیر ہوتا
اور میدان اپنے حریت کے لئے چھوڑ دینا صحیح سیاسی رویہ ہرگز نہیں تھا۔ بعد میں بھی
آئین ساز اسمبلی کے تعین پر جاہریشہ کا رویہ گول مول سا ہی رہا۔ جب کوئی ایسا فیصلہ
ہو جاتا جو پر جاہریشہ کو موافق معلوم ہوتا تو وہ آئین ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت کی
تقسیم کھانے لگتی۔ لیکن جب کوئی فیصلہ اس جماعت کے مزاج کے خلاف ہوتا تو وہ
پھر شور شراب کرنا شروع کر دیتی جو حقیقتی پہلائی کہ آئین ساز اسمبلی کو گولی نہ اندھ نہیں
ہے۔ چنانچہ جب آئین ساز اسمبلی میں شخصی راج اور جاگیر داری کو ختم کرنے کے فیصلے
ہوئے تو پر جاہریشہ نے لگا بھڑا کھڑا شور مچانا شروع کیا۔ اس مسئلہ اور بے خود
پر جاہریشہ کو تحسیر کا موضوع بنا کر رکھ دیا۔ بہر کیف۔ آئین ساز اسمبلی وجود میں
آگئی اور اس نے اپنا کام سر شروع کیا۔ انکو برطانوی گواہ آئین ساز اسمبلی کا پہلا
اعلانہ ہوا۔ اس دن عوام کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کی
غلامی کے بند ٹوٹ گئے ہیں اور دلوں کے دلولے اور ارمان رنگ برنگے پوشاک زیب تن
کر کے رنکوں پر آمد آتے ہیں۔ مجھے اپنی رہائش گاہ سے ایک بھاری جلوس کی صورت

میں دربار گڑھ ہال پہنچا گیا۔ جہاں مولانا محمد مسعود مسعودی نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ میں جب ہال میں داخل ہوا تو ایک عجیب وار فنگلی کے ساتھ تالیں بجا بجا کر میرا استقبال کیا گیا۔ سب سے پہلے ایوان کے مستقل صدر کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ میں نے صادق صاحب کا نام تجویز کیا جسے اتفاق راستے سے منظور کیا گیا۔ میں اور مولانا مسعودی صادق صاحب کو اپنے حلقوں کے کرکٹیں صدارت تک لے گئے۔ اور انھیں صدر نشین بنا کر لوٹ آئے۔

اسمبلی کے سامنے اُس وقت چار اہم امور تھے۔ جن پر اُسے فیصلہ لینا تھا۔

۱۔ ریاست کے عوام کو ان کی اسگوں اور آمدوروں کے ہم شکل ایک آئین دینا۔

۲۔ جاگیر داری، چکداری اور بڑی زمینداروں کے خاتجے کے لئے جو اقدامات لئے گئے تھے، ان کی توثیق کرنا۔

۳۔ ریاست جموں و کشمیر سے شخصی حکومت کا خاتمہ کرنا۔

۴۔ ریاست کے اہماق پر فیصلہ لینا۔ میں نے اپنی کلیدی تقریر میں ان امور کی نشاندہی کی۔ اہماق کے بارے میں میں نے مختصر تذکرہ ان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی۔ ریاست کے اہماق کے سلسلے میں ان کے سامنے تین راستے موجود ہیں۔ یہ راستے اسی فرمان کے تحت متعین ہوئے تھے۔ جو تاج برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرتے وقت جاری کیا گیا تھا۔ اس فرمان کی رو سے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اور ریاستوں کے سربراہوں کو ان تین راستوں سے ایک راستہ چن لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔

(۱) ہندوستان کے ساتھ اہماق (ب) پاکستان کے ساتھ اہماق۔

(۳) ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہنا۔

میں نے اپنی کلیدی تقریر میں ان متبادلوں راستوں کے حُسن و قبح پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور پھر اپنی راستہ ظاہر کرتے ہوئے ایوان کو مشورہ دیا کہ ریاست کے لئے بہترین راستہ یہی ہو گا کہ وہ دستاویز اہماق کی بنا پر ہندوستان کے ساتھ اہماق کرے۔ آج اس تقریر پر کوئی تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس مدت میں مجھے اور ریاستی عوام کو کئی چڑاؤ شوب آزمائشوں اور زبردست مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ ہمیں آگ اور غورن کے کتنے ہی دریا پار کرنا پڑے۔ لیکن میں وہیں پرکھرا ہوں جہاں اُس وقت تھا۔ اور میرے خیال میں وہی نسخہ ہمارے سامنے کا بہترین حل ہے۔ جو اُس وقت میں نے پیش کیا تھا۔

اسمبلی نے آئین کے مسودے کی ترتیب کے لئے مختلف کمیٹیوں کی تشکیل کی۔ جن میں صیادی اور راہنما اصولوں سے متعلق کمیٹی بے حد اہم تھی۔ اس کے چیرمین بگ صاحب مقرر ہوئے اور میرا قائم، ذہنی پناہ و راہنمائی کا آزاد اُس کے ارکان چنے گئے۔ اسمبلی نے تقریباً پناہ پہلا فیصلہ شخصی صفا کرنے کی صورت میں لیا۔ سربراہ مملکت کے سلسلے میں ہم نے گورنر کی تعیناتی پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ ہماری خاص پوزیشن کے منافی ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اس عہدے کا نام صدر ریاست یہ کہہ کر تجویز کیا کہ گورنر اور اس کا مہتمم ایک ہے۔ ملے پایا کہ صدر ریاست کا انتخاب ریاست کی اسمبلی کیا کرے گا۔ اور اس کی مدیا و چندیداری پانچ سال ہوگی۔ بعد میں صدر جمہوریہ کامیاب امیدوار کی تقریری کا باضابطہ اعلان کیا کریں گے۔ چنانچہ میری تجویز پر اسمبلی نے کرن سنگھ کو پہلا صدر ریاست منتخب کیا۔ مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ کرن سنگھ کو زندگی بھر کے لئے صدر ریاست بنایا جائے۔ انھوں نے یہ تجویز کن عوامل کے پیش نظر

رکھی۔ اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن میں اصولی طور پر اسے غیر جمہوری سمجھتا تھا اور اس لئے میں نے اسے قبول کر لینے سے انکار کر دیا۔ بہر کیف کرن سنگھ نے مارچ ۱۹۵۲ء کو پہلے صدر ریاست کی حیثیت سے حلف لیا۔ بعد میں انھوں نے ۱۹۵۳ء کے فوجی نرغے میں اس حلف کی مثالی پلیدی کی۔ جس آئین کی رکھوالی انھوں نے حلف لیا تھا اسے بے جہی کے ساتھ پاؤں کے نیچے روند ڈالا۔ اس نرغے نے ان کا اپنا راستہ بھی حلف کر دیا۔ اور لگ بھگ بیس سال تک اس عہدے پر براہِ جہان رہ کر وہ زیادہ تر اپنے خاندانی مفادات کی نگہبانی کرتے رہے۔ وہ اپنی جگہ اس بات پر خوشی سے جھجھکتے نہ سکتے تھے کہ انھوں نے اس تحریک کے بانی کو سیاسی اقتدار سے الگ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جس تحریک نے ان کے خاندان کا ایک سو سالہ راج ختم کر کے ان کے باپ گدگی سے اتار دیا تھا۔

آئین ساز اسمبلی کے سامنے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مرنے بجئے ہوئے دل کے ساتھ اس کے قیام کی منظوری تو دیدی تھی لیکن اس کا رد یہ ہمارے معاملے میں ایسی ہی بے اعتمادی کا تھا جیسا کہ ایک مثالی مزاج خاوند اپنی خوبصورت اور روشن خوشگ بیوی کے سلسلے میں اختیار کرتا ہے۔ ہندوستانی زعماء ہمارے گاندھی کی آڑے کر کھٹکیوں سے آئین ساز اسمبلی کی کارروائی پر نظر رکھتے رہے۔ ہم نے مرنے کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ آئین کو صرف مسودہ الحاق کی بنیاد پر مرتب کرنا ہی کافی نہیں ہے کیونکہ ان کے نقطہ نظر کے مطابق دستاویز الحاق بہت سے امور میں نقشہ اندازنا ممکن تھی۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں "اس کے کچھ لوازمات ہیں جن کو پہلے صاف چونا چاہیے۔ سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار ریاست پر لاگو ہو گا یا نہیں؟ ریاست کشمیر کو لین کے مالی ادغام کے دائرہ کار کا حقدار ہے گی یا نہیں؟ ہر ریاست میں یونین کے پرچم کی کیا حیثیت

رہے گی۔ ریاست میں مرکزی الیکشن کمیشن کا اختیار کیا ہو گا۔ وغیرہ۔ ان نازک امور پر گفتگو میں بڑے مشکل مقامات آتے۔ بعض امور پر خود کرنے کے لئے ہم نے ہمت مانگی تاکہ ہم انھیں اپنے ضمیر و ذہن میں گھما سھر کے کسی صحیح نتیجے پر پہنچ سکیں۔ قومی پرچم کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اس کی تعلیم پورے آداب کے ساتھ کی جانی رہے گی اور اسے رسمی مواقع پر لہرایا جاتا رہے گا۔ لیکن ریاست کا پرچم عام موقعوں پر لہرائے گا۔ اور رسمی موقعوں پر ہمیں اسے قومی پرچم کے شانہ بشانہ لہرانے کا حق حاصل ہو گا۔

ریاست کا پرچم تحریک آزادی کے بل والے سرخ پرچم پر تین عمودی سفید دھاریاں ڈال کر بنایا گیا۔ یہ دھاریاں ریاست کے قد و اقامت اتحاد کے ساتھ ریاست کی تین تہیجی اور جغرافیائی اکائیوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اور یہ پرچم تحریک آزادی کی مثلاًذات روایات کے ساتھ ہمارے رشتے کا نشان ہے۔ یہ ہماری ریاست کی انفرادی شخصیت کی بھی علامت ہے۔ چنانچہ ہمارے سیکریٹریٹ میں قومی پرچم اور ریاستی پرچم آج بان کے ساتھ ایک دوسرے کے دوش بدوش لہرا رہے ہیں۔ ریاست کو سپریم کورٹ کے دائرے میں لانے کے بارے میں ہم نے یہ موقف اختیار کیا کہ ریاست میں ہمارا ایک نظام عدلیہ موجود ہے۔ اور باقی کورٹ سے اوپر جو ڈیشل ایڈوائزری بورڈ بھی قائم ہے اس بورڈ میں ہندوستان کے لائق ترین جج بیٹھے اور کام کرتے ہیں۔ اس لئے ہم سپریم کورٹ کے عدالتی نظام کے ساتھ منسلک ہونا لازمی نہیں سمجھتے۔ ہمارا استدلال یہ بھی تھا کہ ہماری ریاست کے عوام غریب ہیں اور دہلی سے بہت دور علاقوں میں رہتے ہیں۔ اس لئے سپریم کورٹ تک پہنچنا ان کے بس کی بات نہیں ہو گی۔ اور دولت مند استعمالیوں کا لہجہ تھا کہ سپریم کورٹ کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال میں لائے گا۔ سپریم کورٹ کو بوسے بوسے رکھنے کے سلسلے میں ہمارا یہ خیال بھی

کار فرما تھا کہ ہم نے فاتحہ جاگیر داری وغیرہ جو ترقی پسند اور عوام دوست اقدام اٹھائے ہیں۔ ان کی تاب بند وستان کا مثبتا قدامت پسند آئین نہ لائے گا اور یہ ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ ہم کو اپنی اہم پیش قدمی نہ کر سکیں گے اور ہمیں صرف پریم کورٹ کی غلام گردنوں میں صفائی دینے کے لئے وقت اور سرمایہ ضائع کرنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شہرہ تک ہم پریم کورٹ سے دور نہ ہوتے تو ہم عوامی بہبود کے وہ سبب قدم نہیں اٹھا سکتے جنہوں نے صرف ریاست کے عوام کی ہی تقدیر نہ بدل ڈالی بلکہ دیر سے جی بھی اسارے تنگ سے داد حاصل کی۔

جواہر لال ہماری اس دلیل کے ساتھ متفق ہو گئے لیکن گوالا سوامی اور دوسرے لوگوں کے کہنے پر معاملہ مزید غور و خوض کے لئے اتوار میں رکھا گیا۔ یہی صورت مانی آدھام کے سلسلے میں بھی اختیار کی گئی۔ ہم نے مرکز کو بتایا کہ یہ ایک اچھا ہوا تکنیکی مسئلہ ہے اور اس کی تمام باریکیوں پر غور کرنے کے لئے ہمیں فرصت ملنی چاہیے۔ البتہ ہم نے سزا سے موت کو معاف کرنے کے سلسلے میں صدر جہوریہ کے حق کو تسلیم کیا۔

ان مذاکرات کا جو نتیجہ نکلا وہ معاہدہ دہلی DEHLI AGREEMENT کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ یونین کے ساتھ ہمارے آئینی تعلقات میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس نے ہم بھی اس کو ضمیمے کے طور سے کتاب کے آخر میں منسلک کر رکھا ہے۔ دہلی معاہدے کو آخری شکل دینے کے لئے مرکزی طرف سے جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، گوالا سوامی، آئینگر اور مرگراشا سنگر کا جاپانی بات چیت میں حصہ لے رہے تھے۔ اور ریاست کی طرف سے راجم، لٹون، بخشی، غلام محمد، نریندر، آفٹل، یگ، حصہ لے رہے تھے۔ مجھے یاد ہے جب معاہدے کی کسی شرط پر نہروں کی بحث پوری تھی تو جواہر لال نے میرے کان میں ایک اندازہ لگاتی کہ ساتھ کہا "شیخ صاحب اگر آپ ہمارے ساتھ

بٹل گر ہوئے میں داخل کریں گے تو ہم آپ کے گھنے میں سونے کی زنجیریں پہنا دیں گے" میں جواہر لال کو ایک لمحے کے لئے دیکھتا رہ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے میں نہ سکوٹتے ہوئے کہا "اگلا ایسا کبھی نہ کیجئے گا کیونکہ اس طرح آپ کثیر سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے" جواہر لال کی اس ذہنی کیفیت پر میرے ذہن کے مطلع پر اقبال کا یہ شعر روشن ہو گیا تھا۔
 جادو سے نمود کی تاثیر سے چشم ایز
 دیکھتی ہے حلقہ گردن میں ساز و بری

لیکن جواہر لال ہماری ذہنی کیفیت کے بارے میں صاف طور پر غلط اندازہ لگا رہے تھے۔

معاہدے کے طے پایا جانے کے بعد جواہر لال نے پارلیمنٹ کو اس کے موٹے موٹے خدو خال سے آگاہ کیا۔ لیکن انھوں نے اس کی بعض شقیں کو دانستہ طور پر مبہم رکھا۔ میں نے بھی معاہدہ دہلی کی دستاویز کو اپنے نقطہ نظر کے ساتھ یا سنی آئین ساز اسمبلی کے سامنے پیش کیا تاکہ مستقبل میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ دہلی سے جب میں معاہدہ کے بعد لوٹا تو میں نے لال بچک کے ایک بھاری جیسے عوام کو اس بارے میں اعتماد میں لیا۔

قانون ساز اسمبلی میں اس معاہدے کو پیش کرتے ہوئے میں نے کہا۔
 "مرکز اور ریاست دونوں نے ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو کافی حد تک قبول کیا ہے۔ دونوں کی اس آرزو نے رہنمائی کی ہے کہ وہ موجودہ رشتے کو مضبوط بنائیں اور اس سلسلے میں تمام ایہام اور کڑکوں کو دور کریں ہم پہلے کی طرح آج بھی اس بات کے قابل ہیں کہ ہمیں ہندوستان کے عوام اور حکومت کی اس بات کی حمایت حاصل ہے کہ ہم اپنے جمہوری اور شہریوں کو

بلور کریں اور اپنے نصب العین کو جانیں۔

آئین ساز اسمبلی کے انعقاد کے بارے میں جب ہم نے پہلی کی تو پاکستان بہت پریم ہوا۔ اس نے سلامتی کونسل میں شکایت کی کہ ہندوستان جو دروازے سے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح اس قرارداد کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے جو سلامتی کونسل نے ریاست میں اسے شامی کرنے کے بارے میں منظور کی ہے اور جسے ہند اور پاکستان دونوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کی قیادت سرنی۔ این راو کر رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دوبار سلامتی کونسل کے اجلاس میں مداخلت کرتے ہوئے کونسل کو یقین دلایا کہ ہندوستان ایسا کرنے کا کوئی بھی ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ اس فیصلے پر قائم رہے گا جو کونسل نے ریاست میں عوام کی اسے معلوم کرنے کے لئے کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کا آئین وفاق میں شامل ہر ایک ریاست کو آئین ساز اسمبلی بلانے کا حق دیتا ہے اس لئے ہم اہلایان کشمیر کو آئین ساز اسمبلی طلب کرنے سے روک نہیں سکتے۔ آئین ساز اسمبلی الحاق کے بارے میں بحث تو کر سکتی ہے لیکن ہند اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں ہو گا۔ ہند کے دوسرے نمائندے راجیشوہ دیال نے سلامتی کونسل کو یقین دلایا کہ میں اس بات کو دہراتا ہوں کہ جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے کشمیر کی آئین ساز اسمبلی بلانے کا مقصد ہرگز نہیں ہے کہ کشمیر کا جو حال سلامتی کونسل کے سامنے ہے اس کو ٹھیک کرنے کی کوششوں میں کوئی رخنہ ڈال دیا جائے یا اس سلسلے میں کونسل کا راستہ روکا جائے۔ ادھر گراہا اسامی کی خواہش تھی کہ ہم آئین ساز اسمبلی میں ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے بارے میں ایک قرارداد پاس کریں۔ لیکن جب میں نے ہندوستان کی اس "معتوق ماہ شیوہ ہرکس براماست" والی "معتوق ماہ شیوہ ہرکس براماست" ہلا شراب خوروہ ہرکس براماست

پالیسی کو دیکھا تو میں نے الحاق کے معاملے کو آئین ساز اسمبلی میں زیر بحث لانا بے کار اور بے فائدہ تصور کیا۔ کیونکہ جس تنگ کے ساتھ ہم الحاق کرنے کے فیصلے کی تصدیق کرنا چاہتے تھے اس نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے معذوری کا اظہار بین الاقوامی سطح پر کیا تھا۔ ہم یک طرفہ اصرار کرتے رہتے تو مان زمان میں تیرا جہان والی کیفیت تازہ ہو جاتی۔ اس کے بعد دو اسمبلی کا افتتاحی اجلاس سرنگم میں شروع ہوا تو گولانگامی کے مرض کی ایک ہی ٹانگ تھی کہ الحاق کے متعلق تجویز پاس کی جائے۔ جس وقت آئین ساز صاحب نے یہ تجویز پیش کی اس وقت ہم نئی دہلی میں وزیر اعظم کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ساتھ بخشی غلام تھو بھی سینگل میں موجود تھے۔ آئینگر کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ پنڈت جی پلپتے مشہور زمانہ غصے کا دورہ پڑا۔ وہ فریغ فضا سے لال پیٹے ہوئے اور کہنے لگے کہ ایسا کرنے کی میں ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ اس طرح ہندوستان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ہم نے بار بار بین الاقوامی سطح پر ہندوستان اور خود کشمیری عوام کے سامنے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ایک آزادانہ اور غیر جانبدارانہ راستے شکاری کے ذریعے کیا جائے گا۔ حالانکہ میں ہم کیسے اپنے عہد و بیمان سے روگردانی کر سکتے ہیں۔ اور دنیا کے کھن و تیشن کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

پنڈت جی اخلاقی سطح پر بالکل درست کہہ رہے تھے اور ان کی بات اصولوں کی کسوٹی پر ٹھیک اترتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت میرے دل میں ان کے لئے احترام کے جذبات کئی گنا بڑھ گئے اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ گاندھی جی نے صحیح آدمی کو اپنا جانشین بنالیا ہے اور یہی ان کی اخلاقی عظمت کو برقرار رکھنے کا دل گروہ رکھتا ہے۔ مجھے گاندھی جی کا وہ قول بھی یاد آیا کہ جب انھوں نے کہا تھا کہ میں

وقت جبکہ میں زندہ ہوں، جو اہر لال مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے لیکن میں نہ رہوں گا تو جو اہر لال میرا شعلہ اپناتے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مہاتما گاندھی جیسے بے ریا اور باصفا قائد ایک ہی بار پیدا ہوتے ہیں اور ہر چمکنے والی چیز بزرگ خاصہ کا لگان نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال ہم پنڈت جی کی اس پڑ بھلائی لٹکارسے غماش ہو گئے اور گولیاں کھائی تو ہونٹ سی کر بیٹھ گئے۔ ہم نے اُن کے ارشاد کی روشنی میں الحاق کے مسئلہ کو آئین ساز اسمبلی میں موضوع بحث بنانے سے گریز کیا۔ میں نے کشمیر کے مستقبل کا مل ڈھونڈنے کے لئے جو راستہ چنا تھا وہ بالکل پر ہی پڑا ہوا۔ لیکن کمالیہ تنظیم یعنی ملاحظہ ہو کہ ۱۶ مئی ۱۹۵۲ء کو جب پنڈت جواہر لال نہرو ہفتہ بھر کے لئے سرینگر کے آؤ آؤں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلا کر ہندوستان کے ساتھ الحاق کی توثیق کرادوں۔ اُس وقت مجھے اُن کی پہلی بات یاد آئی۔ میں اُن کے دلاؤ پر کشمیری چہرے کے آثار چڑھاؤ کو دیکھتا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اُن کی اخلاقی عظمت کا جو ہر اس چہرے کی تاریخ ساز تحریروں کے کس خوبصورت گرداب میں کھو گیا ہے؟ جو اہر لال نے پھر اپنی بات دہرائی تو میں نے اُن کی خواہش کی تشکیل کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اب یہ میری باری تھی۔ جو اہر لال کا حافظ تازہ کرانے کی اور انھیں یہ یاد دلانے کی کہ کشمیر میں رہتے شہری کرانے کے سلسلے میں ہم ساری دُنیا اور کشمیر کے سامنے قول بار کچے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں اس قدر پابند (CONMIT) ہو چکے ہیں کہ اب ہم اپنی رسوائی کی قیمت پر ہی اپنے وعدے سے منکرت ہیں۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ کر لیں تو دُنیا کو کیا سند دکھائی گئے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ کہا کہ وہ بین الاقوامی شہرت کے راہنما ہیں۔ اور اُن کے دم سے ہندوستان کی اخلاقی برتری کا بھرم قائم ہے۔ اگر ہم اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو اُن کی شہرت

بروجہ اور اُن کی عزت پر بڑگ جاتے گا۔ اس کے علاوہ عالمی سطح پر ہندوستان کی شبیہ مجروح اور اس کی اخلاقی حیثیت مشکوک ہو جائے گی۔ اگر ایسا کرنے سے کوئی مثبت اور مفید نتیجہ نکلتا تو بات بھی تھی۔ لیکن آپ نے بہت پہلے سلامتی کونسل کے فورم میں اسمبلی کے فیصلے کو اپنے لئے بے وزن اور بے وقعت قرار دیا ہے۔ اس لئے سلامتی کونسل بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گی۔ پاکستان کے ماننے کی بات تو بہت دور رہی۔ دُنیا کی راتے عام پاکستان کی ہم فوٹی کرے گی۔ خود کشمیری عوام کا آپ پر اعتماد منزل ہو جائے گا اور جس تنازعے کو ختم کرنے کے لئے ہم یہ سب کچھ کریں گے وہ ایک شہر پرہیزگار کی طرح ہمارے سروں پر بدستور ٹٹنا رہے گا۔ میں نے پنڈت جی کو گولیاں کھائی کی تجویز کے جواب میں ان کا ردِ عمل بھی یاد دلایا اور کہا کہ جب ہم نے آئین ساز اسمبلی میں الحاق کے معاملے کی توثیق کے لئے پہلی کی تھی اُس وقت تو آپ آگ بگولہ ہو گئے تھے۔ اب رات ہی دور سفر کرنے کے بعد کونسی ایسی بات ہو گئی ہے کہ آپ ہمیں وہی کچھ کرکڈرے کی ترغیب دیتے ہیں جسے آپ خود اتنی طاقت سے ٹھکرا چکے ہیں؟ میں نے دوران گفتگو جو اہر لال سے یہ بھی کہا کہ کشمیر کے معاملے کو اگر ہم اپنے ڈھنگ اور اپنی ڈگر پر مل کر ناچا ہے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم کشمیری عوام کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کریں۔ ایسا کرنے کی دوتد پر ہی ہو سکتی ہیں۔ اقل یہ ہے کہ ہم ایک ایسا دیا تدار اور دور مندر انتظامیہ اُن کو دیں جو اُن کے دکھوں کا مداوا کرنے کی اہلیت رکھ سکتا ہو اور اُن کی نزار و توجوں حالت کو ششیا پانی اور خوش حالی کی منزل کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو۔ دو رقم یہ کہ ہم ریاست کی بے مثال قربت کو مٹانے کے لئے جو محمل ہوں۔ تاکہ صدیوں سے دیے گئے اور سنبھلے ہوئے عوام کی حالت کچھ تو سنبھل پائے اور وہ جہاں کی دی ہوئی زندگی کو عتاب و عذاب

کی صورت میں نہ سمجھتے رہیں۔ جو اہر لال گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ جیسے بڑبڑاکے جاگے اور کہنے لگے اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ میں نے جواب میں کہا کہ میرے لئے سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ اشتیاق میں میرے اہم اور قریبی ساتھی رشوت ستانی اور بدعنوانی کی وجہ سے شکار بن چکے ہیں۔ میرے اس انکشاف سے جو اہر لال کے ماتھے پر بل بڑھ گئے اور وہ بہت گھبرائے ہوئے رہے۔ میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں نے بڑا زور لگایا کہ ان سے یہ غلط عادات چھوٹ جائیں لیکن حالات سدھرنے کی بجائے بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے عوام میں ہماری مقبولیت کا گراؤ بھی زوال کی طرف آ رہا ہے۔ اگر یہی صورت رہی تو ہم لوگوں کے اعتماد سے ہی محروم رہ جائیں گے۔ جو اہر لال نے جڑ بڑھو کہہ کر ایسے ساتھیوں کا نام لیتے۔ میں نے بخشی غلام محمد اور دو ایک ساتھیوں کا ذکر کیا۔ میں نے جو اہر لال سے کہا کہ میں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ ان ساتھیوں کو کاہنہ سے الگ کر دوں۔ لیکن میں پہلے آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ جو اہر لال نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فی الحال اپنا ہاتھ روکوں۔ جب تک کہ وہ دولت مشترکہ کی کانفرنس سے چونچو بھی دونوں کے بعد لندن میں ہونے والی تھی، واپس نہ آجائیں۔ فضا میں بڑا کچھا و مومو دھتا۔

جو اہر لال کے تورو بدلے بدلے سے نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں پہلی جیسی پائنت نہیں چھلکتی تھی۔ بلکہ ایک عجیب قسم کا اجنبی پن تھا۔ میں بھی اپنے گرد پیش کے واقعات اور ساتھیوں کی حرکات و سکنات سے دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ مجھے بیاکاری کا فن نہیں آتا اور نہ مجھے اپنے چہرے پر نقلی چہرے سمجھنے کا فن۔ معلوم ہے۔ میں اپنے دل کی کیفیات کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتا رہا۔ جب جو اہر لال پہلے بھی تشریف لاتے تھے تو میں ان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن اب کے زیر دل ایسا کرنے پر راضی نہ

ہوا۔ اور ہم الگ الگ گاڑیوں میں کچشمہ شہی کی طسرت روانہ ہو گئے۔ جو اہر لال کی ہر اداس ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں پھرنے بیٹھے ہیں اور مجھے پھر ان کے اعتماد کی اینٹ ہل چکی ہے۔ اس لئے میں اپنے آپ کو ان پر ٹھونسا اور انھیں انشورہ خاطر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو اہر لال نے پچھلے برسوں میں ہمیشہ میرے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھا تھا۔ اور میرے ساتھ بڑی اپنائیت اور شگفتگی سے راز و نیاز کا تبادلہ کیا تھا۔ لیکن اب کے یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ مجھے سے الگ بخشی غلام محمد اور اپنے کچھ اور معتقدوں کے ساتھ کا کاچھوسی کر رہے ہیں۔ مجھے ان کی شائستگی سے یہ طور طریقے اختیار کرنے کی امید نہ تھی۔ لیکن آثار و قرائن پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ کچھ کچھ بڑی پاک رہی ہے۔ فقہ مختصر ان دنوں جو اہر لال کا رویہ ابراہیم آبادی کی بیان کردہ کیفیت سے بہت قریب تھا۔

ادھر ہم سے بھی باتیں آپ کرتے ہیں لگاؤ کی

ادھر غریبوں سے بھی کچھ عہد و بیان ہوتے تھے

بہر حال جو اہر لال شیر سے واپس گئے تو ان کے طرز عمل نے مسائل کی تسخیر اور زیادہ ابھادی تھی۔ بے اعتمادی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور میں اور میرے کچھ ساتھی ایک دوسرے سے اور زیادہ کچھ کچھ رہنے لگے تھے۔ وہلی سے انھوں نے مجھے ایک نوٹ بھیجا۔ جس میں انھوں نے شیر کے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس نوٹ کو اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھوں اور شیر کے مستقبل کے لئے جو ہماری تہذیب و دل انھیں ان کی لندن روانگی سے پہلے پہلے ان کے پاس بھجوا دوں۔ میں نے نیشنل کانفرنس کی ورلڈ کپٹی کا اجلاس بلایا اور اس کے سامنے جو اہر لال کا نوٹ پیش کر کے اس پر بحث کی۔ مالگ کی۔ اجلاس میرے بنی دفتر میں ہوا اور جلد ہی ہم کثیر

اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں سرگرم گفتگو ہو گئے۔ پھر ایم گورٹ کے کشمیر پر حائرہ اختیار کی توسیع کا ذکر چلا تو بڑی گرم گرم بحث شروع ہو گئی۔ ایک گروپ کی رائے اس کے حق میں اور دوسرے کی اس کے خلاف تھی۔ مولوی محمد سعید پہلے گروپ کے نفس ناظر بن گئے تھے تو بیگ صاحب دوسرے مکتبہ خیال کے وکیل اور ترحمان۔ جب دلائل کی تلواروں سے چنگاریاں اُٹرنے کے باوجود کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا تو اس نے تجویز کی کہ بیگ صاحب اپنے موقع کی تائید میں جو دلائل رکھتے ہیں ان کو ترتیب دیں۔ دوسرے مکتبہ فکر کی جانب سے ڈراما پر تشدد اور اپنے دلائل تقلید کریں۔ میں ان دونوں دستاویزات کو کسی ماہر قانون کے پاس بھیج کر اس کی رائے اس بارے میں طلب کروں گا کہ ریاستی عوام کے حق میں اور ریاست کے مفاد میں کس رائے کی پیروی بہتر ہے؟ درکنگ کمیٹی نے کشمیر کے مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لینے اور اس کے حل کے لئے مناسب تجویزیں تلاش کرنے کے لئے آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا۔ جس کے ارکان یوں تیار ہوئے۔

- ۱۔ راقم الحروف (۲۱) بخشی غلام محمد (۳۱) مولانا محمد سعید مسعودی (۴۱) امرتا محمد فضل بیگ
- ۵۱) خواجہ غلام محمد صادق (۶۱) سردار بدھ سنگھ (۷۱) پنڈت گروہاری لال ڈوگرہ،
- ۸۱) پنڈت شتیام لال صراف۔

ظاہر ہے کہ اس ورکنگ گروپ میں جو ارکان بنائے گئے تھے وہ مشتمل کانفرنس کی صفت اقل کے رہنا تھے بلکہ جوئی کے تمام لیڈر اس میں اکٹھا کئے گئے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ کشمیر کے تنازعے کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے جو بھی تجاویز وہ سوچ سکیں ان کو ورکنگ گروپ میں پیش کیا جانا چاہیے تاکہ ہم ان پر بھی بحث کر سکیں۔ اور پھر باہمی مشاورت اور مصالحت سے کوئی ایسا حل نکال سکیں جس پر سب کا اتفاق ہو۔ پھر

ان تجاویز کو جنرل کونسل کے سامنے پیش کر کے اس کی منظوری حاصل کریں۔ چنانچہ ہمیں بھارت چیت اور بحث ہوتی رہی۔ ہر ممبر نے اپنی طرف سے تجاویز پیش کیں۔ جن کی تعداد میں بائیس سے آدھ پہنچ گئی۔ ہم نے ہر تجویز پر غور کیا۔ اور بالآخر ہر پر اتفاق رائے ہو گیا۔ جو ترجمیم کے اعتبار سے یوں ہیں۔

- ۱۔ چار جون ۱۹۴۷ء کو کی مینٹنگ میں طے شدہ شرائط کے مطابق استعصوب رائے عام۔
- ب۔ ساری ریاست کی خود مختاری۔

ج۔ ساری ریاست کی خود مختاری لیکن امور خارجہ اور دفاع پر (ہند اور پاکستان کا مشترکہ کنٹرول)۔

د۔ وکسن پلان۔ استعصوب رائے عام والے علاقے کی خود مختاری کے ساتھ۔

بخشی غلام محمد نے وکسن پلان کی حمایت کرتے ہوئے وادی کو آزاد رکھنے کی تجویز کو سب سے زیادہ پسند کیا۔ بلکہ وہ اس تجویز کے اس قدر رویدہ بن گئے کہ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ صرف اسی تجویز کو ورکنگ گروپ کی طرف سے سفارش کے طور پر جنرل کونسل میں پیش کیا جانا چاہیے۔ بخشی صاحب نے اسے حادہ فائدہ مند اور آہر و نکلہ حل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اسے سرفہرست رکھا جائے۔ مولانا سعید کی رائے یہ تھی کہ ان تجاویز کی ترتیب اسی طرح رہنی چاہئے۔ غلام محمد صادق کی رائے حسب ذیل تھی۔

”اگر ہندوستان، پاکستان، افغانستان، سوویت یونین اور جمہوریہ چین پانچ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک اجنسی رائے شماری کی گہرائی اور انتظام کے لئے پیدا کی جائے تو اس صورت میں میری تجویز یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ریاست کے لوگوں کی رائے شماری کا مطالبہ کریں اور اگر ان پانچ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل اجنسی کا مطالبہ پرانہ ہو سکے تو اس صورت میں ہم کو مطالبہ کرنا چاہیے کہ اسے شماری کی گہرائی کے لئے ایک ایسا اجنسی

مقرر کیا جانا چاہتے جو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے تمام ممبروں پر مشتمل ہونا گریہات کشمیر میں آزاد اور متصفقانہ راستے شامری یقینی بنائی جائے۔“

ورکنگ گروپ نے اگرچہ چار چار تبادلوں پر پورا اتفاق کیا لیکن اتفاق کرنے والوں میں کچھ دوست کئی چہرے جیب میں پتے بھرتے تھے۔ وہ ہیں مغولیت اور ارضانہ پند کا تاخرد سے رہے تھے۔ لیکن اندر اندر سے کسی اور ہی نالک کی ریہرسل میں مصروف تھے۔ لیکن مجھے اُن کے رویے سے زیادہ جواہر لال کے بدلتے ہوئے تیوروں پر رنج تھا۔ انھوں نے زرعی اصلاحات کے معاملے پر میرے ساتھ خیالات کی ہم آہنگی کے باوجود اس بارے میں کھلم کھلا اپنے شکوک ظاہر کئے تھے جتنا چہ میں نے اس پر احتجاج کیا۔ میرے ذہن میں کون سے خیالات موجزن تھے۔ اُس کا اندازہ اُس خط کے اقتباس سے ہو گا جو میں نے اُنھیں جولائی ۱۹۵۹ء میں لکھا:

”یہ بات طے ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے طاقتور اخراجات کا فرما ہیں جو ہندوستان کو سیکلر مملکت بنانے کے آپ کے آدرش اور آپ کی کشمیر پالیسی سے اتفاق نہیں رکھتے۔ اُن کی مستقل کوشش ہے کہ آپ کو کوزر کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ اُن سبھی لوگوں کو نیچے گرا دینا چاہتے ہیں جو آپ کے ساتھ وابستہ اور آپ کے وفادار ہیں۔ جہاں میرا احساس ہے کہ میں ہنسی خوشی آپ کے لئے قربان ہونے کو تیار ہوں وہاں مجھے اندیشہ ہے کہ چالیس لاکھ کشمیریوں کی تعداد کے محافظ کی حیثیت سے میں اُن کی محبوب آستنگوں اور حقوق کا سودا نہیں کر سکتا۔ میں نے بار بار بیان کیا ہے کہ ہم نے اس لئے ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا ہے کہ یہاں گاندھی جی اور آپ جیسے امیدوار اُمٹ کے روشن ستارے

موجود تھے۔ اس لئے پاکستان کے ساتھ بہت سی محامنتوں کے باوجود ہم نے اُس کے ساتھ الحاق نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہمارے پروگرام اُن کی پالیسیوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ اگر ہمیں اس نتیجے پر پہنچا دیا جائے کہ اپنی ریاست کو اپنے مقررہ خطوط اور اپنی خاص اہمیت کی مناسبت سے تعمیر نہیں کر سکتے تو میں نہ تو اپنی قوم کو کوئی جواب دے سکتا ہوں اور نہ اُنھیں اپنا منہ دکھا سکتا ہوں۔“



سبھی اپنے تھے جن کے ہاتھ پر دھبے اُہو کے تھے

معادہ دہلی کو ہندوستان کے فرقہ پرستوں نے پسند نہیں کیا۔ ہندوستانی اذیتاں لے بھی اس کی نکتہ چینی شروع کر دی۔ بعض اخبارات نے طنزاً یہاں تک لکھا کہ کشمیر کا احمق ہندوستان کے ساتھ نہیں بلکہ ہندوستان کا کشمیر کے ساتھ ہوا ہے۔ میری ذات خاص طور پر تنقید اور تخریب کے تیروں کا نشانہ بنادی گئی اور مجھ پر نکتہ چینی کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ پارلیمنٹ میں تقریباً دو دن سوالات اٹھائے جاتے رہے۔ اور جواہر لال کو بھی خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ پر جا پریشد نے جوں میں ایک زبردست تحریک چلائی۔ اس تحریک کے جن میں روغن ڈالنے کے لئے خاص طور پر جہا راجہ جی سنگھ اور وہ تمام عناصر فیاضی سے دولت لٹاتے رہے جن کے متنازعہ خصوصی ہر ہمارے اقتدار سے زور پڑ گئی تھی یہ جماعت تمام ہدایت اور سرپرستی راختر یہ سویم سینگھ اور جن سنگھ سے حاصل کرتی رہی۔ ایک دفعہ جواہر لال بہرہ واس تحریک کے بارے میں بات کرتے ہوئے بے ساختہ طور پر اپنے دلی خیالات کی غمازی کر گئے۔ انھوں نے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ تحریک بے موقع شروع کی گئی ہے جس سے فائدہ کم بجائے

نقصان کا احتمال ہے البتہ جن مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ تحریک چلائی جا رہی ہے ان سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کے زیادہ قریب آجائے۔ لیکن پر جا پریشد اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو وسیعہ اختیار کر رہی ہے وہ دانش مندی پر مبنی نہیں ہے۔ اس طرح کی راتے مولانا آزاد نے بھی ظاہر کی تھی۔ میں نے اس طرز فکر پر راتے ذنی کرتے ہوئے کہا کہ جواہر لال اور مولانا آزاد جو کہتے ہیں اس میں اور جن سنگھ کے رویے میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں کا منہا ہے مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ ان کے امین طریق کار کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کسی لگی لپٹی کے بغیر اپنا مافی الضمیر ظاہر کرتا ہے، دوسرا زمانہ سازی کی نقاب اوڑھ کر مناسب موقع و محل کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے اس کا صحت مطلب یہ ہے کہ کشمیر اور مرکز کے درمیان جو قول و قرار عہد و پیمان اور سمجھوتے ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی رہنماؤں کے نزدیک ان کا کوئی تقدس نہیں اور وہ اپنے سن کی ایک ترنگ سے انھیں روئی کی ٹوکری میں جھینکنے سے عار نہیں کریں گے۔ مرکزی رہنماؤں کا یہ رویہ ان کے اس انداز فکر کی پیداوار ہے کہ کشمیر کے ساتھ معاہدے دائمی نہیں بلکہ عارضی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ یہ رویہ مرکز اور ریاست کو ایک دوسرے کو قریب لانے کی بجائے ان میں شک و شبہ اور بدگمانی کی تبلیغ پیدا کرے گا۔ میری یہ حق گوئی ان تجروں کو بہت گراں گذری اور انھوں نے کئی بار اس کا مشکوہ بھی کیا۔ بعد میں جواہر لال کے متعدد اور محکمہ جاسوسی کے سربراہ بی۔ این ملک نے بھی اپنی کتاب میں اس بات کی تصدیق کی کہ جواہر لال نے ان سے کہا تھا کہ انھیں جن سنگھ اور پر جا پریشد کی تحریک کے مقاصد سے پوری ہمدردی ہے وہ کشمیر کو ہندوستان میں ضم کرنے کے لئے اقدامات کر لیں لیکن اس سے سلامتی کو نسل میں شور مچ جائے گا۔

ہندوستان میں اس وقت جو فضا بن رہی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جے پور کا شہر نرائن اور اچاریہ کے پڑائی جیسے لیڈر بھی پر جا پریشد کی تحریک کی حمایت کرتے تھے۔ اور جہاں لال کو ان سے اپیل کرنا پڑی تھی کہ وہ اس مسئلے میں ٹانگ اڑا کر حالات کو اور زیادہ پیچیدہ نہ بنائیں۔

مرکزی محکمہ دفاع نے کشمیر میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے پریٹ سسٹم کا رواج جاری کیا۔ ہر کوئی شخص کشمیر میں آتے وقت یا یہاں سے باہر جاتے وقت یہ پریٹ حاصل کرنے کا پابند تھا۔ خود مجھے بھی یہ پریٹ حاصل کرنا پڑا تھا۔ یہ طریقہ کار ہمارے مفادات کے لحاظ سے بہت اچھا نہیں تھا۔ اور اس کی وجہ سے ہماری سیاست کی صنعت پر جو کشمیر کی سب سے بڑی اور قدرتی صنعت ہے، کافی خراب اثر پڑا۔ ہم نے کئی بار چاہا کہ یہ سسٹم منسوخ کیا جائے اور اس سلسلے میں مرکزی طرف بھی رجوع کیا جائے لیکن محکمہ دفاع کی ہٹ دھرمی کے سامنے ہماری ایک نہ چلی۔ جن سنگھ کے بانی راہنہ ڈاکٹر شیا پر شاہ مرکزی جو ہندوستان میں بھی پر جا پریشد کی ہمارے خلاف جاری کی ہوئی تحریک کی پشت پناہی کے لئے جہم ملتا رہے تھے۔ اب پریٹ سسٹم کی آڑ لے کر ہماری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔ انھوں نے اس کی تبلیغ کا مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر ٹھوڑی ایک بنگالی تھے اور بڑے لائق خالق شخص۔ وہ انگریزی کے بڑے اعلیٰ پایے کے مقرر تھے اور پارلیمنٹ میں ان کی تقریر بڑی خوب سے سنی جاتی تھی۔ وہ کچھ تو بہرہ ور حکومت میں سول سپلانز کے وزیر بھی رہے۔ ان کی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے میرے دل میں ان کی بڑی حریت تھی۔ وہ مسئلہ کشمیر اور یہاں کے حالات پر زیادہ خیال کرنے کے لئے مجھ سے ملے۔ انھیں کشمیر سے قریب صاحبی ہی دلچسپی تھی۔ لیکن جنوں کے مستقبل پر وہ آتش زیر پا تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم اقلیت کے بارے میں اپنی آئین ساز اسمبلی میں تھی اور

تفصیلی فیصلہ لین اور بین الاقوامی بندھنوں سے آزاد ہو جائیں۔ میں نے انھیں مسئلہ کشمیر کے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اس بات کا انحصار مرکز پر ہے اور مرکز کو ہی فیصلہ کرنا ہے کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے کسی فیصلے کو تھی تصور کرے گا یا نہیں۔ اور جو وعدے اس نے بین الاقوامی سطح پر کئے ہیں، آیا وہ ان سے انحراف کے لئے آمادہ ہے؟ میں نے ڈاکٹر ٹھوڑی کو یاد دلایا کہ جب ہم نے آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا اقدام کیا تھا تو گویا لاسو آبی انگلیگر نے نہرو کا مشورہ دیا تھا کہ حکومت ہند ایک خاص اعلان جاری کرے کہ ہمارے صدر ریاست کے جاری کردہ فرمان کو خلاف قانون قرار دے۔ میں نے انھیں یہ بھی یاد دلایا کہ آئین ساز اسمبلی کا سوال جب سلامتی کو نسل کے سامنے آیا تھا تو ہندوستانی نائنٹس نے بی۔ این۔ راؤ نے بہانہ دہل اعلان کیا تھا کہ آئین ساز اسمبلی زیادہ سے زیادہ اپنی راستے کا انحصار کرے گی اور ہندوستان اس کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ اس لئے آپ کو اس سوال کا جواب ہم سے پوچھنے کی بجائے مرکز سے دریافت کرنا چاہیے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے آئین ساز اسمبلی کو خاص طور پر اس سوال کو حل کرنے کے ایک معقول طریقے کی حیثیت سے طلب کیا تھا۔ لیکن تالی حرفت، ایک باتھ سے تو بچنے سے رہی ہے تو وہ طریقہ عمل کی طالب ہے۔ انھوں نے کچھ اور معاملات بھی اٹھائے اور میں نے انھیں بے تکلفی کے ساتھ اپنی حکومت کے رویے سے آگاہ کیا۔

جیسا کہ ظاہر ہے پریٹ سسٹم کو ختم کرنا ریاستی حکومت کے حد اختیار میں نہ تھا لیکن اس کے خلاف تحریک چلانے والوں نے جان بوجھ کر ریاستی حکومت کو اپنا دھن بنایا۔ بالآخر جب محکمہ دفاع نے اسے ترک کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو شیا پر شاہ مرکزی نے اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر میں داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ہجوم منبر کی حیثیت سے امن و قانون کا قلعہ نام بخشی غلام محمد کی تھیں یہ تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ ہمیں کیا روئے اختیار کرنا چاہیے حالات و کوائف سے یہ بات مجھ پر ابھی طرح آشکارا ہو گئی تھی کہ مرکز اور خاص طور پر جواہر لال ابھی سے زیادہ بخشی غلام محمد پر اعتماد کرتے ہیں اس معاملے کا تعلق ہندوستان کے ایک لائق تعظیم رہنما کے ساتھ تھا اس لئے میں نے بخشی صاحب کو ہدایت دی کہ وہ جواہر لال سے رابطہ قائم کر کے اس بارے میں ہمیں انہی کے مشورہ پر عمل کریں اور جو چیز شامیاد جی لکھن پور پیٹنچے، جہاں سے کشمیر کی حدود شروع ہو جاتی ہیں تو حیرت انگیز منظر دیکھنے میں لگاؤ گیاب پولیس کے آفیسر ڈاکٹر کرجی کے راست میں رکاوٹ پیدا کرنے کی بجائے انھیں خراماں خراماں کشمیر کی سرحد پار کرنے میں مدد کر رہے ہیں اور اس مرحلے کو آسان بنانے کے لئے اس طرح کے جتن کر رہے ہیں جیسے وہ پولیس کے آفیسر نہ ہوں بلکہ جگہ کے رضا کار ہوں۔ بات صاف تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بری حکومت کو ہندوستان میں بدنام کرنا چاہتے تھے۔ اور اس غرض کے لئے ان میں مقیم ہندوستانی اہل جنس کے سرگرمی و ڈی۔ ڈیو ہر وہ سہ دایات حاصل کر رہے تھے بلکہ راج مدھو کے تو بعد میں اپنی کتاب میں ابھام لکھا کہ یہ پولیس آفیسر اس لیے شام پرشاد شکر جی کے داخلہ کشمیر کے حق میں تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہاں جا کر پورٹ ٹھٹ سے ان کی رہائی کے سلسلے میں کوئی ہدایت نامہ حاصل نہیں کیا جاسکے گا کیونکہ اس وقت کشمیر پر برصغیرم گورٹ کا دائرہ اختیار جاری نہیں تھا۔ بہر حال اگر یہ بات بھی ان کے ذہن میں رہی ہو تو اس کا مقصد بھی کشمیر کی حکومت اور اس کے اصولی موقف کے قلعہ بندی بخفی پیدا کرنا تھا۔ یہ اتنی قریاں سازش تھی کہ جواہر لال نہرو نے اسی دن جن دن کو جی گرفتار ہوئے یعنی ۲۷ مئی ۱۹۴۷ کو اپنے وزیر داخلہ ڈاکٹر کرجی کو ساتھ لے کر ایک سخت خط لکھا جس میں اس طریق کار پر احتجاج کیا۔ انھوں نے ۲۶ مئی ۱۹۴۷ کو سرکاری

پنجاب کے وزیر اعلیٰ پی ایم جی کو خط لکھ کر اس طریق کار پر رنج کا اظہار کیا۔ بہر حال جو بھی شکیاں پورے شامیاد کو کرجی ماہو پور کے پل کو عبور کر کے کشمیر کی سرحد میں گھس آئے تو بخشی صاحب نے ان کو قانون توڑنے کی پاداش میں گرفتار کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم انھوں نے جواہر لال سے رابطہ قائم کیا تھا یا نہیں، لیکن ان کے طریق عمل سے یہ بات بعید نہ تھی کہ وہ معاملات کو چلا کر اپنے لئے مواقع پیدا کرنے کی سوچ رہے تھے۔ وہ دوسری چالیں مٹنے ہی آ رہی تھیں۔ اور یہ ان کے ہاتھ کی صفائی دیکھنے کا تہری موقع تھا۔ ڈاکٹر کرجی کو سرنگر لایا گیا۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو میں نے بخشی صاحب سے صریح رشتہ ہاں کہ ڈاکٹر صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پاتے۔ اور ان کے مرتبے کے لحاظ سے انھیں راحت و آرام پہنچانے کے لئے تمام سہولیات بہم ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو نشاط بارگ کے پاس ایک خوبصورت بنگلے میں رکھا گیا۔ ان کی دلچسپیاں اور آرام و آسائش کی ذمہ داری جیل خانہ جات کے منسٹر شام لال صراٹ کے سپرد کی گئی اور وزیر داخلہ کی حیثیت سے بخشی صاحب سے بھی کہا گیا کہ وہ سارے انتظامات کی دیکھ ریکھ کرتے رہیں۔ میں نے کئی بار ڈاکٹر صاحب کی صحت کے متعلق استفسارات کئے اور ہر مرتبہ مجھے یہی جواب ملا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ ایک دفعہ پارلیمنٹ کے اسپیکر وائٹم منگ ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے کشمیر آئے۔ ملاقات کے بعد مجھ سے ملے تو شکیات کرنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب کو جیل قدمی اور سیر کے لئے بنگلے سے باہر کے کی اجازت نہیں ہے اور وہ اجازت ملنے کے خواہش مند ہیں۔ میں نے متعلقہ وزیر کو بتا کر اسے سرزنش کی کہ اس کا طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب جہاں سے متحرک رہاں ہیں اور ان کی شخصیت ایسی ہے کہ ہم ان کے فرائض ہونے کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کی جیل قدمی پر کوئی روک نہیں لگائی جانی چاہئے۔ البتہ ان کی حفاظت کے مناسب

اور موزون منتظامات کئے جانے چاہئیں۔

جین دولن ڈاکٹر شیاما پر کشمکش میں نظر بند تھے، اُس دوران پنڈت جواہر لال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد دیگرے تشریف لائے۔ وہ یہاں کئی روز فراموش رہے اور جیٹو شاہی کے جس مہمان خانہ میں وہ ٹھہرے تھے وہاں سے ڈاکٹر منکر جی کی نظر بندی کا مقام میل بھرے دور نہ تھا۔ لیکن انھوں نے ڈاکٹر منکر جی سے لینے کی کسی خواہش کا اظہار نہیں فرمایا۔ ان کا رویہ دیکھ کر میں نے بھی ڈاکٹر منکر جی سے ملنے سے گریز کیا۔ مبادا اُس وقت کے حالات میں یہ ایرہ قدم بھی کئی نئی غلط فہمی کا باعث نہ بنے۔ البتہ تیسرے کافوں میں جب یہ بھنگ پڑی کہ ڈاکٹر صاحب تنہائی سے نزار ہو چکے ہیں تو میں نے ہدایت کی کہ پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ کو حضیں پر جا بزریشہ کی ایجی ٹیشن کے سلسلے میں جوں میں حراست لیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب کے پاس لا کر اُن کے ساتھی کی حیثیت سے رکھا جائے۔

ایک دن جبکہ میں گھر میں تھا، صبح تلوے جیل خانہ جات کے وزیر پنڈت پیام لال صراف نے مجھے یہ الناک خبر سنائی کہ ڈاکٹر شیاما پر کشمکش کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب میں نے تفصیل پوچھنا چاہی تو انھوں نے صرحت یہ اطلاع دی کہ اُن کا حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے اس خبر سے زبردست کوفت ہوئی کیونکہ مجھے بار بار یہی بتایا گیا تھا کہ وہ چاق و چوبند ہیں۔ اور اُن کی صحت ٹھیک ہے۔ وزیر متعلقہ نے اس سلسلہ میں کس قدر غفلت کا مظاہرہ کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر منکر جی رات کو ہی دم توڑ گئے تھے لیکن مجھے صبح تک اس سے خبر نہ لگا گیا۔ یہ محض تلافی تھی یا کسی خطرناک عزم کو چھپانے کے لئے تجاہل عارفانہ میں اُن میں کچھ کہ نہیں سکتا لیکن بعد میں اس بات کی خبریں ملنے لگیں

کہ ڈاکٹر صاحب اپنے آخری دنوں میں ایجی ٹیشن واپس لینے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس بات کی تصدیق جواہر لال نہرو کے مستند سوانح نگار سر واپکی گوپال نے بھی کی ہے۔ اگر یہ صیغہ ہے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جوں کی ایجی ٹیشن کے شطہ بیڑ کاٹے رکھنے میں جن عناصر کا مفاد تھا انھیں ڈاکٹر منکر جی کے اس ارادے سے کس قدر تشویش ہوتی ہوگی اور اُن کے سیاہ عزائم نے کیا رنج و اختیار ہوگا۔

ڈاکٹر منکر جی کا انتقال ۲۶ جون ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ یہ خبر پہلی کی سی سرعت کے ساتھ سارے ملک میں پھیل گئی اور جن سنگھ اور پرچا پریشنے نے اسے بہت غلات خوب استعمال کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے انھیں موند لینے کے ساتھ ہی اُن کی جھوٹے کی کوششیں بھی مریجی تھیں۔ اور اب کون اُن کے غزوہ اور مشعل عقیدہ قندوں کو سمجھا سکتا تھا؟ میں نے مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی سی رائے کو جو ڈاکٹر منکر جی کے خاندانی طبیب رہ چکے تھے، ہدیہ تاراسا سامنے کی اطلاع دی اور اُن سے استدعا کی کہ وہ ایک ممتاز معالج کی حیثیت سے ہندوؤں سر پرگشت تشریف لائیں اور اس الٹے کی حقیقتات کریں۔ لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ بعد میں مجھ پر کچھ حاشیہ نشینوں نے الزام لگا با کہ ملاحظہ ہو ملک کی کتاب صفحہ ۱۳۸ میں اس سلسلے میں بی سی رائے کے تذکرہ کا جواب تک دینے کی زحمت دی۔ یہ بالکل غلط الزام ہے۔ چنانچہ میں نے سہ جولائی ۱۹۵۷ء کو جواہر لال کے نام اپنے خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "میں نے ڈاکٹر بی سی رائے کو تاروے کے کشیدہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ مجھے مغربی بنگال سرکار کا ایک پیغام بھی ملا ہے اور اُس کا جواب بھیج دیا گیا ہے" ہم نے ڈاکٹر منکر جی کی کنسٹی کو پورے احترام کے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی روانہ کیا۔ میں خود ہوائی اڈے پر گیا اور دست پر اپنے ذاتی احترام کی نشانی کے طور پر ایک عمدہ سفید شیری شال چڑھائی۔ بخشی خدام عمدہ اور

پنڈت پدیم ناتھ ڈوگرہ لاش کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ خواجہ سلال ان دنوں دولت مشترکہ کے وزیر اعلیٰ کا نفرین میں شرکت کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے۔ انھیں وہیں اس افسوسناک خبر کی اطلاع دی گئی۔ فرقہ پرست جن سنگھی پریس نے اس ہفتہ ہوکر میرے خلاف نبردِ دستِ زہر افشانی کی۔ اور سر کے بدلے سر کا مقابلہ کیا جانے لگا۔ چنانچہ انہی دنوں ڈوگرہ پرتھوی داس دہلی سے واپس آئے اور انھوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اس معاملہ کے متعلق ایک بیان اخبارات کو دوں جس میں اس بات کی وضاحت کروں کہ ڈاکٹر نگر جی کی حفاظت کی ساری ذمہ داری وزارت داخلہ اور جیل خانہ جات کی وزارت کی تھی۔ میرا اس کے ساتھ کوئی واسطہ نہ تھا لیکن اس کے باوجود واقعات سے چشم پوشی کر کے سارا الزام میرے سر ڈالاجا رہا ہے۔ میں نے ڈی پی صاحب کا یہ مشورہ نہیں مانا کہ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے اگر یہ واقعاتی طور پر اس معاملے میں میری براہِ راست ذمہ داری نہیں ہے لیکن میں اخلاقی طور پر اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ ہم نے مقامی ڈاکٹر سے بھی، جو ڈاکٹر نگر جی کے علاج و معالجے کے ذمہ دار تھے، یا باضابطہ طور پر پوچھ لگھ کی۔ اور ان کے بیانات سے کوئی ایسی بات سامنے نہ آئی جس سے یہ اخذ ہو سکتا کہ ان کے علاج میں کوئی کوتاہی کی گئی تھی۔ پنڈت پدیم ناتھ ڈوگرہ تو یہ حال ڈاکٹر نگر جی کے ہم قوال و ہم پارہ تھے۔ انھوں نے بھی کسی کی یا کوتاہی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ یوں گستاخے کہ ڈاکٹر صاحب کی صحت پہلے ہی سے کچھ اچھی نہیں تھی۔ شاید نگر جی سلسلہ سندر سے اور چھائی اور یہاں کی مرطوب ہوا ان کو اس نہیں آئی اور ان کے پیچھے سے مت تر ہو گئے۔

یہاں یہ بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ میں ذاتی طور پر ڈاکٹر شام پراشاد نگر جی کی گرفتاری کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے یہاں تک بھی جا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو گرفتار

کرنے کی بجائے ریاست سے باہر بھیجا جاتے۔ لیکن معاملہ بحیثیت ہوم منسٹر کے براہِ راست نجفی غلام محمد کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی اپنی مصالحتیں اور اپنے مقاصد تھے۔ انھوں نے دہلی سے بھی اس سلسلے میں سلسلہ جہانی کی تھی۔ اس لئے میں نے اس میں دخل دینا موزوں خیال نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی موت ایک بے حد افسوسناک سانحہ تھی اور ملک میں اس معاملے کی تحقیقات کرانے کے لئے آوازیں مٹنے لگیں۔ میں اس مطالبے کی صحت کا قائل تھا اور میں نے مرکز سے استدعا کی کہ ایک دو ممتاز افراد پر مشتمل کمیٹی مقرر کر کے سارے معاملے کی چھان بین کرائی جائے۔ لیکن مرکز نے استدعا کو ایک شان بے نیازی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ جن سنگھ اور پرجاپریشد صرف اس بات پر زور ڈالتی رہیں کہ مجھے وزارت سے الگ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ انھیں ڈاکٹر صاحب کی وفات سے زیادہ اس وفات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی فکر تھی۔ انھیں کشمیر میں میرے سیاسی عزائم سے خطر تھی۔ اور وہ ڈاکٹر نگر جی کی موت کی لاشی سے مجھے ہانپنا چاہتے تھے۔ ان کا دیرینہ خواب یہ تھا کہ مجھے کسی نہ کسی طرح میدان سیاست سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن میں طرحتِ جان ثابت ہوا اور ہر قسم کی ریشہ و دانیوں کے باوجود میدان میں چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا۔ انھیں یہ دیکھ کر اور بھی ناواقفانہ اور وہ اب آخری بازی لگا کر مجھے ختم کر ڈالنے کے درپے تھے۔

آج ساہا سال کے بعد اس واقعہ پر ایک واپس نگاہ ڈالنے تو منسلک کی نوعیت یوں بنتی ہے۔ چلنے فرض کر لیا کہ میری ہی ذات تحقیقات میں مانع تھی۔ لیکن اس کے بعد تو میں نے ساہا سال قید خانے میں گزرا اس وقت میرے خلاف ہر قسم کے قرضی اور خیالی الزام لگا کر شہ مات چلائے گئے۔ لیکن ان میں ڈاکٹر نگر جی کی موت کا الزام

نہیں تھا۔ آخر اس وقت اس سانحے کی تحقیقات کرانے میں کون سا ممانع تھا؟
 پنڈت جواہر لال بھی فرقہ پرستوں کے بغض و غضب کا نشانہ بن گئے ان کی زندگی
 کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں بھی انھیں موصول ہونے لگیں۔ اس مسموم فضا کو درست
 کرنے کے لئے جواہر لال کے تیر خواہوں نے ادھر ادھر ہاتھ بڑھانا شروع کر دیے۔
 رفیع احمد قدوائی اس معاملے میں سب سے آگے تھے۔ پنجاب میں جن سنگھ پر جابرینہ
 کی تحریک کے حق میں اور میرے خلاف بڑی کڑی کیسی قسم کی اہم جہادی رکھے ہوئے
 تھے۔ رفیع صاحب نے اس اہم کار خیز پھر دینے کے لئے پنجاب جن سنگھ کے صدر پنڈت
 مولی چند شرماسے رابطہ قائم کر لیا۔ مولی چند شرماسا کساد اندر اس بات پر تھا کہ مجھے
 کشمیر میں حکومت سے الگ کر دیا جائے۔

یہاں پر سلسلہ کلام کو توڑتے ہوئے اس بات کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ اس
 وقت میری عجیب حالت ہو گئی تھی۔ بالکل علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق
 - یہ اتفاق مبارک ہو تو موتوں کے لیے
 کہ ہم نہ رہاں ہیں فقیہان شہ میرے خلاف

ایک طرف تو حکومت ہند کا بہت ہی باسرخ طبقہ اور ہندوستان کے فرقہ پرست
 مجھ سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف پاکستان اور اس کے امریکی و برطانوی
 پشت پناہ مجھے ہٹانے پر ادھر ادھر کھاتے بیٹھے تھے۔ اس سے کچھ ہی عرصہ قبل
 اقوام متحدہ کے ایک نمائندے ڈاکٹر فریڈرک گراہم نے تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر سے
 تین چوتھائی ہندوستانی خارج نکالی جائے لیکن وہاں شیخ صاحب کو بھی حکومت سے
 الگ کر کے اقوام متحدہ کے افسروں کی حکومت قائم کی جائے۔ حکومت ہندوستان
 اس وقت یہ ضمانت دینے کے لئے تیار تھی کہ راتے شادی کے لئے پرجا کرنے کے دوران

کسی بھی شخص کو اسن و قانون کے مفاد میں بھی گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اور آزاد کشمیر و
 پاکستان میں متعین کشمیری لیڈروں کو کشمیر اگر اپنے حق میں راستے عام ہوا رہنے کی
 اجازت ہوگی۔ ہندوستان مجھ کو اس مرحلے پر ہٹانے کے لئے اس لئے تیار نہ تھا کیونکہ
 بقول جواہر لال اس سے کشمیری عوام اور دنیا کو یہ تاثر ملے گا کہ پاکستان نے راتے شادی
 سے پہلے ہی نصف فتح حاصل کر لی ہے اور ہندوستان کے خلاف نفسیاتی جنگ میں
 پاکستان کو واضح تقویت حاصل ہو جائے گی۔ بہر کیف پاکستانی فکروں کو میرے وجود سے
 اس قدر بغض تھا کہ انھوں نے اس قدر آسان و موزوں شرائط کو صرف اس لئے چھوڑ
 دیا کہ مجھے ہٹانے کی ہندوستان نے حامی نہیں بھری تھی۔

امد بربر مطلب۔ رفیع صاحب جواہر لال کے ٹپے قریبی متعقد تھے۔ انھوں نے
 سردار فیل اور پرشوتم داس ٹنڈن کے ساتھ چچیش میں جواہر لال کی کافی مدد کی تھی وہ
 عوامی رابطے اور سیاسی جوڑ توڑ کے فن میں بھی مہارت تھے اور اس معاملے میں انھیں غلام محمد
 اور ان میں کچھ فاصلات ملتے جلتے تھے۔ وہ جواہر لال کے ابتدائی برصوں یو پائی کی
 سیاست میں ان کے ہم راہ رہ چکے تھے اور انھیں تہذیبی طبیعت میں کافی عمل و دخل
 حاصل ہو گیا تھا۔ وہ ان معدودے چند اشخاص میں تھے جنھیں جواہر لال لکھنؤ اور
 رسانی حاصل تھی اور جو کسی بھی وقت ان کے پاس جا سکتے تھے۔ ہندوستان میں جواہر لال
 کے خلاف جو تحریک جن سنگھ نے چلائی اس وقت کے مرکزی وزیر داخلہ ڈاکٹر کاجو
 اس سے پیٹنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر کاجو اور صحت کی اہم منزل میں تھے
 کہ وہ سنگین مسائل سے عہدہ برآ ہوئے کا ذہن اور دل گردہ تر کر چکے تھے۔ ان
 کی ضعیف العمری سے فائدہ اٹھا کر رفیع صاحب نے ان کے دائرے میں بھی ناگ
 اثر انداز شروع کیا بلکہ تھوڑے ڈاکٹر کاجو کی نااہلیت کا احساس دلانے ہوئے ۱۳ مارچ ۱۹۵۴ء

کو لکھا کہ ”آپ نے اپنے آپ کو ان لوگوں سے گھیر رکھا ہے جنہیں تمام مطلقوں نے ٹھکر دیا ہے۔“ ہندو اُس وقت جس بے جا رنگ کی حالت میں تھے اُس کا فائدہ اٹھا کر قدوائی اور بھی شہر ہو گئے۔ رفیع صاحب روس کی لابی کے بھی بہت قریب تھے۔ اُن دنوں ٹرسٹ کے کیونسٹ جن میں تریہ اے اے کے ایم اے آرٹس، رامانورتھی، ہری کرشن، راجت وغیرہ شامل تھے۔ قدوائی کے گرد ہار بناتے ہوئے تھے۔ یہ کیونسٹ کشمیر میں اپنے منظوران نظر جن میں صادق صاحب خاص طور پر شامل تھے، کو اپنے لانا چاہتے تھے اور اس لئے مجھے منظر سے ہٹانے میں رفیع صاحب کی خوب مدد کر رہے تھے۔ بخشی صاحب کو یہ اُس خطے کی توپ کی خود کا بنانا چاہتے تھے جو میری گرفتاری سے پیدا ہو سکتا تھا۔ تاکہ جہاں اُن کے لاٹھے خوب جہم کو حکومت کر سکیں۔ صادق صاحب کے ساتھ ڈوگرہ، ڈکھیائی درویشتم وغیرہ بھی درویشیاں پہنے ہوئے تھے۔ قدوائی نے کشمیر کے معائنے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا اور سر ننگر آنے کی خواہش ظاہر کی۔

میں ہندوستانی رہنمائی کی دُہری شخصیت اور اُن کی منفرد و فداواروں سے بے حد دلی پروا شہر ہو گیا تھا۔ میں نے رفیع صاحب کو جوانی پیغام بھیجا کہ حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ اُن کو سہارا دینا اُن کے بس کا روگ نہیں۔ واقعہ ہے کہ اُس سے قبل انھوں نے کشمیر کے مسئلے میں کوئی براہ راست مصلحت نہیں لیا تھا۔ ہندوستانی رہنماؤں میں کشمیر کے تنازعہ مسئلے کے ساتھ پینڈت جی، مولانا آزاد، سردار پٹیل اور گوالا سمیت اُن کے نظریاتی واسطہ رہا تھا۔ میں نے غلوں نیت سے رفیع صاحب کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اُس کے باوجود وہ کشمیر تشریف لانا چاہے ہیں تو ہم اُن کا حق مقدم کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر آنے کی ایک تاریخ بھی مقرر کی تھی لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ وجوہات کی بنا پر وہ تشریف نہ لائے۔ اُن کے نہ آنے کی وجہ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ

دہلی میں اُس سارنش کے پیش کار اور ہدایت کار بن چکے تھے جس کا مقصد مجھے راستے سے ہٹانا تھا۔ ایک طرف تو وہ جن سنگھ کے لیڈروں سے سنگین بڑھا رہے تھے اور دوسری امریکی گرفتاری کی شاخ زیتون دکھا کر اُن کا دل بٹھا رہے تھے دوسری طرف وہ بخشی، صادق اور گاپرتا اور میرے دوسرے مائل بہ قریب ساتھیوں سے میرے خلاف انٹلی سیدھی شتم بٹھم اطلاعات جمع کر کے اُنہیں آخری معرکے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ بی۔ این۔ ملک نے اس سلسلے میں اُن کی کارروائی کی ابھی خاصی تفصیل پیش کی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب وہ مجھے زنجیر کا نغمہ سنانے کے لئے تیار کیا کر رہے تھے تو وہ مجھے صلح صفائی کی بات کرنے کے لئے کیسے فرصت نکال سکتے تھے ہاں اگر وہ جن سنگھ اور پر جاہر دیشی میری گرفتاری کی قیمت وصول کرنے پر جواہر لال کے خلاف اپنی معاندانہ روش تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لئے پینڈت جی بھی مجھے نئی امرتلی کا قربانی کا بکرا بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ اپنی حیثیت اور مرتبے کو بچانے کے لئے جواہر لال دو معقول کو قربان کرنے میں کافی قیاض واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ کرشنا مینن اور اُن کے طریقہ کار کو میں ہمیشہ ناپسند کرتا رہا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں وہ بھی جواہر لال کی ڈیوٹی پر جواہر لال کی پالیسیوں پر عمل پیرا رہنے کے لیے قربانی کا بکرا بنادیتے تھے۔ بہرہ کیف جواہر لال دہلی میں ہمارا آخری قلعہ تھے لیکن اُس پر بھی سارنش کا پھر براہ راست دیا گیا تو پھر جانے امان کہاں تھی؟ فوجی نرنے کا ناکارہ دہلی میں بڑی عرق ریزی سے تیار کیا گیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کسی غنیمت کو زبردستی کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ رفیع احمد قدوائی کی سفارش پر اجیت پرشاد مینن کو اُس نرنے کے سیاسی پہلو کی گرفتاری کے لئے سر ننگر مامور کیا۔ فوجی پہلو کی گمان ہنرو نے اپنے ایک سہمد برگڈیز بی۔ ایم۔ گول کے چوکو دی۔ گول کو اس انتہائی خطرناک پلغار کا اس لئے نگران بنایا گیا کہ ایک تو اُن کی رگوں میں جواہر لال ہندو جی کی طرح کشمیری پینڈوں کا خون دھڑہا

تھا اور سرے دکھائے ملیشیا کے ایمپائر رہ چکے تھے۔ بی۔ این ملک کو تھر وٹے بتایا کہ ملیشیا میں کچھ ناقابل اعتبار عناصر موجود ہیں۔ میں کوئی کو اس لئے بھیج رہا ہوں کہ وہ ان عناصر کی کسی شب خون سے پہلے ہی کانٹ چھانٹ کر سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ جواہر لال کشمیر ملیشیا جس کو میں نے قبائلی حمے کے دوران تسلیم کیا تھا اور جس کے فوجیوں نے پاکستانی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیے تھے، کے مسلم عناصر سے خائف تھے کہ کہیں آٹھ پر ہاتھ ڈالنے کے نتیجے میں وہ براہِ وقت نہ ہو جائیں۔ اور اس لئے چاہتے تھے کہ انہیں ان کی شاندار خدمات اور قربانیوں کا اعلا کا بغیر راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ۱۹۵۳ء کو میرے خلاف اقدام کرنے سے پہلے ملیشیا کے مسلمان سپاہیوں کو یا تو برخواست کر دیا گیا تھا یا حراست میں لیا گیا تھا۔ ان دو دونوں دلیسالیوں نے سرنگرم میں ”آپریشن وراگت“ کے لئے راستہ ہموار کرنے میں اپنے آقاؤں کی توقعات سے زیادہ وسفاکی اور چالاکی اور سازشیوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۱۹ اگست ۱۹۵۳ء کے واقعات پنڈت جواہر لال نہرو کی ”کشمیر واڈ“ کے بغیر پیش آتے تھے، انہیں اس سلسلے میں بی۔ این ملک کے بیان پر نظر مانی چاہیے۔ اس کا کہنا ہے کہ جواہر لال نہرو کشمیر میں ایک چابکدست اور اپنی انداز کے پولیس آفیسر کو موجود رکھنا چاہتے تھے جو وقت پڑنے پر کشمیریوں سے مناسب سلوک کر سکے۔ ملک نے ڈی، ڈی، جہرہ کی سفارش کر دی۔ کیونکہ اس نے صوبہ سرحد میں قبائلیوں کو کچلنے میں نام پایا تھا۔ اس کے بعد وہ رقم طراز ہے:

”۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء کو میں اور بہتر وزیراعظم سے اُن کی کوٹھی پر بیٹے۔ انہوں نے ہم سے دو گھنٹے تک گفتگو کی۔ انہوں نے کشمیر کے معاملے کا پس منظر جان کر تھمتے

کہا کہ اس بات کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے کہ شیخ عبداللہ کو ہٹا کر اس کی جگہ بخشی غلام محمد کو تعینات کیا جائے۔ وزیراعظم نے امید ظاہر کی کہ یہ تبدیلی جڑا من ہوگی لیکن انہوں نے اس میں متنبہ کیا کہ میں بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ شیخ صاحب بلا شک وشبہ کشمیر میں بے حد مقبول ہیں۔ اور اس معاملے میں شیخ نواز عناصر کا ساتھ پاکستان نواز عناصر بھی دیں گے۔ بہرہ کو جنوں کشمیر پولیس فورس کی سربراہی سنبھالنے کے لئے اور ضرورت پڑنے پر ناظم اعلیٰ CHIEF EXECUTIVE کا منصب سنبھالنے کے لئے بھی کمر بستہ رہنا چاہیے۔ اس صورت میں وہ صدر ریاست کے تحت کام کرے گا۔ ہم دو دونوں نے نہرو کو اتنے فضا تک موٹوں میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسے تناور درخت کو اکھاڑ بیٹھنے کے لئے اُٹھا رکھا ہے جیسے میں جس کو انہوں نے خود سنبھا تھا۔ انہوں نے بہرہ کو فرصت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے حالات سے مطلع کرتے رہو اور اگر رات کو کبھی ضرورت پڑے تو شبیلی فون کرنے سے گریز نہ کرنا۔ اس کے ساتھ ہی سرنگرم میں فوج کے کور کمانڈر بیٹھنٹ جنرل مل کو نہایت غصہ طور پر بیان بھیجا کہ وہ فوج کو مداخلت کے لئے جو کتا (HART) رکھے اور ملیشیا کے ناقابل اعتبار عناصر کو کوڑی لگائی میں رکھے۔“

میں نے آٹھ نفری اعلیٰ سطحی کمیٹی کے فیصلوں سے مرکز کو آگاہ کرنے کے لئے بخشی غلام مرزا محمد افضل بیگ اور ڈی پی رو کو بھی بھیجا تھا۔ بیگ صاحب تو دوسرے صوبے سے روز واپس لوٹ آئے لیکن بخشی اور ڈی پی بڑا سردار طور پر وہیں رک گئے۔ اُن کے دورے کی اس توہین کا بھانڈا بعد میں جن سنگھ اور ہندو ماسیما کے لیڈروں مول چند شرمہ، این اسی شرجی اور پریم ناتھ ڈوگر نے جو دراپہ پر پھوڑ دیا، ان لیڈروں نے اپنے بلیک میاںات میں عزت کیا کہ تین دن تک بخشی اور ڈی پی نہ صرف ان تین لیڈروں کے ساتھ

میری حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بات چیت کر رہے تھے بلکہ رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر کالج کے ساتھ بھی یہ لوگ تقریباً تین روز تک مسلسل سازش کی کھیل کھاتے رہے۔ مولیٰ چند شرما نے جو اُس وقت ہمارے مین سنگھ کے صدر تھے، کہا کہ انھوں نے ہر جا پر لہندہ کی جوں کی بے قدوائی کے کہنے پر ہی واپس لی تھی۔ اور اُسی وقت اُن کو میری گرفتاری کا پیشگی سند یہ سنایا گیا تھا۔ جنوں سے ہر جا پر لہندہ کے جنرل مگر ٹری ادم پر کاروائی کرنے کے ایک پوسٹر میں جس کو دیوان پریس جوں میں چھاپا گیا تھا یہ اعلان کیا کہ پٹنڈت پر ہم ناٹھ ڈوگرہ نے دہلی میں بخشی غلام محمد، ڈی پی درہ ڈاکٹر کالج اور رفیع احمد قدوائی کے علاوہ جملہ آل انڈیا کے ساتھ چار سلا قاضی کی جتیں جیں جیں اُن کو آنے والے واقعات کا اشارہ دیا گیا تھا۔ اور اُن کے ساتھ میری برطرفی اور نظر بندی کے مسئلے میں بھی عہد ویدوان کیا گیا تھا۔

۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو مکھنویں خود پر ہم ناٹھ ڈوگرہ نے کہا کہ اُنھیں بخشی غلام محمد نے کہا ہے کہ ہم اپر جا پر لہندہ والے وغیرہ اسے کام میں کشمیر میں بہت جلد ایسے اقدامات کئے جائیں گے جن سے ہمارا جی خوش ہو جائے گا۔ اور اُنکو بریو انریک ساری رکاوٹوں کو دور کیا جائے گا۔ مگر انھوں نے اس نشانے سے بھی زیادہ جلدی کر دکھائی۔ بعد میں ہر اگست کو میری گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد نے جوں میں اپنی پہلی تقریر میں اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ دو سال سے پٹنڈت پر ہم ناٹھ ڈوگرہ جوڑائی جوں میں لڑتے رہے ہیں وہی میں کشمیر میں لڑتا رہا ہوں اور ہمارے مقاصد مشترک ہیں۔ اپنی دونوں بخشی صاحب کے بہرہ وپ کا عجیب نمونہ سامنے آیا۔ جب وہ دہلی سے اپنی جیاناٹک اور بھونڈی ریشہ دوانیوں کے بعد گھر لوٹے تو مجھ سے ملنے اور مجھ تک نئی دہلی کا راج محل پہنچانے کے بدلے انھوں نے کشمیر کے خلیفہ جملہ میں دیرپہ غارتگری کا نظم کرنا شروع کیا اور وہاں تقریریں کرنا شروع کیں۔ انھوں نے بہشت نفری کیٹی کی اُن سفارشات پر گتہ چینی

شرع کی جن کی وہ خود تائید کر چکے تھے۔ یاد رہے کہ یہ نتائج ایک ماہ تک مسلسل ہونے والی نشستوں میں اخذ کئے گئے تھے۔ ان نشستوں کی روداد باقاعدہ لکھی جاتی تھی اور دوسرے روز اس روداد کی تصدیق کی جاتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے بخشی صاحب کو ٹیلا یا۔ اس موقع پر بہشت نفری کیٹی کے تقریباً سارے ہی میر موجود تھے۔ میں نے بخشی صاحب کو مشیل کانفرنس کے سرکاری ترجمان "خدمت" میں چھپنے والی ان کی تقاریر کی رپورٹ دکھائی اور کہا کہ یہ کہاں کی دیانت ہے کہ وہ ہمارے سامنے ایک بات کہیں اور ہماری پیٹ پر بالکل دوسری بخشی صاحب اپنے خاص انداز اور اسلوب میں حاشا و کھا کہتے ہوئے ان تقریروں کے متن سے ہی لکر گئے بلکہ ٹری ڈھٹائی سے کہا کہ وہ کشمیر میں رائے شماری کے اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم ہیں۔

▲▲▲

ہاں جرمِ وفادیکھے کس کس پہ ہونبات

ہم نے ریاست میں ۱۳۱۷ء سے جو مرکزہ الہ آباد، تحریک چلائی تھی وہ عروج و ارتقاء کے کتنے ہی مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔ یہ اولاً مسلم کانفرنس کے زیر سایہ چلی، پٹی اور جوان ہوئی۔ لیکن کشمیر کی ساری فیضانگوں کی طبیعت اور مزاج اور ان کا طرزِ قود باش اور جذباتی آمیزہ باہمی محبت، اشتیاق، اس پسندی، انسان دوستی اور رواداری کے عناصر سے معمور اور سرشار تھا۔ کشمیریوں کے اس شمعِ حق قومی مزاج اور امن پسندانہ مسلک کے لیے سپنہ نوکسین دستور کے سراپا رحم اور پاکباز درویش گو ختمِ بدھ سا کہی تھی کہ مذہب نے ضمیروں میں جلا دی تھی۔ بدھ مذہب کشمیر میں کوئی ایک چار سال تک شریف اور صالح انسانی قدروں کی آبیاری کرتا رہا جب اس کی کوئیلیں دلوں کی سرزمین سے نکل کر کھل گئیں تو ہمارے بڑے بڑے ریشیوں اور بزرگوں جیسے لکھنؤ، شجاع نور الدین نورانی اور دیگر سیکڑوں مصوفیوں، استوں کی تعلیمات نے انھیں اپنی دلتواور لوریں سے جوان کیا۔ اسلام یہاں درویشیوں اور مصوفیوں نے بھیلایا اور اس نے یہاں کے شریکِ تہذیبی ڈھانچے

میں ایک نئی روح چھونک دی۔ اسلام کشمیریوں کی روحانی نجات کی تلاش کا تسلسل تھا۔ اگر اس نے فکری سطح پر شیخ نور الدین نورانی جیسے باصفا علندر کو پیدا کیا جس نے کشمیریوں کو غیر عام کی پرانی اور دینی قدروں کا آمیزہ ریشی مسلک کی صورت میں پیش کیا تو دوسری طرف سیاسی سطح پر اس نے سلطان زین العابدین کو منظرِ عام پر لایا۔ جو رواداری اور انسان دوستی کے تصور کو فروغ دینے کے سلسلے میں شیر شاہ سوری اور اکبر اعظم جیسے ستہنشاہوں کا پیش رو ثابت ہوا۔ ہماری تحریک کی رنگ میں صالح روایات کا خون موج زن تھا۔ اس لیے اپنے جنم لینے کے چند ہی سال بعد یہ تحریک ایک آبر و محبت کی طرح ساری قوم کو اپنی آغوش میں لیے لگی۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے اسے مستحکم طور پر بخشی اور ۱۹۴۷ء میں مسلم کانفرنس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت ریاست کے تمام طبقوں اور فرقوں کے لیے ماں کی آغوش کی طرح کھل گئے۔ ہمارے تحریک کے لہجے میں جو اصول اور آدرش سیپ کے موتی کی طرح تھمتھتے آئیں ہم نے سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت کے نام دے دیے اور یہی اس تحریک کے بنیادی ستون قرار پائے۔ ہندوستان نے کانگریس کے پرچم کے نیچے آزادی کے لیے جو بڑی اور کڑی تحریک چلائی اس کے بنیادی اصول بھی ہماری تحریک کے اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ اس لیے مقاصد کی یہ ہم آہنگی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ ہم آزاد ہوئے تو یہی سمجھے کہ نجات دیدہ و دل کی گھڑی اب آئی کہ اب آئی۔ ہمیں اب امید تھی کہ ان مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ اور دعویٰ دین کے درمیان جو خوفناک تلخ جاکل تھی وہ غلطی اور نیک۔ نتیجے سے پات دی جائے گی۔ لیکن بد قسمتی سے ہندوستان کے بٹوارے کے بعد دو قوتوں کے درمیان تقیق و عناد اور بدگمانی و بد اعتمادی کی جو مسموم فیضان پیدا

ہو گئی اس نے عام لوگوں کے ہی کیا بڑے بڑے اولوالعزم لیڈروں کے پاؤں بھی لگا دیئے۔
 البتہ صرف نیشنل کانفرنس ہی ایسی رہی جو اپنی پروایات اور اپنی تاریخ کا روضہ جلا کر
 روشنی بکھیرتی رہی۔ میں نے اس تنظیم کے قائد کی حیثیت سے جان جو کھوں میں ڈال کر
 نفرت کے جھگڑوں کے آگے اپنا سینہ تان دیا۔ میری جماعت نے اپنی مادروہوں کی
 اس قیمتی میراث کی حفاظت اور شرح روشنی کے لیے بڑی بڑی قربانیاں پیش کیں اور
 انسان دوستی کے اس جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ روشنی کی یہ عجیب خاصیت ہے
 کہ اس کی نفی مولو پر چاہے ساری دنیا کا اندھیرا کیوں حملہ آور نہ ہو لیکن وہ روشنی
 کی اس مقدس کھیر کو مٹا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے فرقہ پرستی اور نفرت کی اس
 پڑھتی ہوئی آندھی کا شمس اس چھوٹی سی وادی میں موزا دیا۔ جو اس وقت تک برصغیر
 میں بڑے بڑے ننگروں کو سار کر رہی تھی۔ اس وقت نیشنل کانفرنس کی قیادت بھی
 کتنی مضبوط، ہر رنگ پہلو دار اور ہمہ گیر تھی۔ بخشی صاحب، بیگ صاحب، مسعودی صاحب
 صادق صاحب وغیرہ سب میں اپنی اپنی خصوصیات موجود تھیں اور اپنی رنگ برنگی
 خوبیوں سے ہماری قیادت کا گلہ نہ سمجھا تھا۔ لیکن کشمیر کی سرحدی کے بیروں کو یہ
 مضبوط قیادت ایک آنکھ نہ سمجھا۔ انھوں نے خوشامد لالچ اور انتشار کے ہتھیاروں
 سے آسے ودم ہمہ برم کر دیا اور اسے نہ جانے کس کی نظر کھائی۔ ایک باخان اور مالی
 کی حیثیت سے میرے لیے تسبیح کے آن دانوں کا بھرا کتنا کتاب ناگ جو سکتا ہے۔
 اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ شائد ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا تھا۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے حساس نریاں جاتا رہا

تاریخ کی منہ کشی لا زوال اور حقیقت کی بنا رگواہی کے بل ہمہ برم کہ کشمیر میں

دوقومی نظریے پر پہلی کاری ضرب پڑی۔ اس کے بعد یہ جائز نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہ کچھ
 دیر تک نفع حال ہو کر روکھڑا رہا لیکن آخر کار اس نے دم توڑ دیا اور اس کی روشنی
 تلخ بنگال کے پانیوں میں سے دوبارہ طلوع ہوئی خود ہندوستان میں سیکولرازم کی
 مشعل جلانے رکھنے کے لیے کشمیر کی اس پہاڑانہ روش نے زبردست حصہ ادا کیا چنانچہ
 اس سلسلے میں، میں نے آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اشارہ کیا تھا۔

”پچھلے چار برس کے تجربے کے بعد یہ میری چھٹی بار ہے کہ کشمیر کی ہندوستان
 میں موجودگی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہتر تعلقات قائم
 ہونے کی سب سے بڑی وجہ بنی ہے۔ گاندھی جی نے اپنی موت سے پہلے یہ
 الفاظ بالکل بجا اور برحق کہے کہ میں پہاڑوں، کشمیر، کی جانب کھلی ہانڈھے
 بوسے دیکھ رہا ہوں جہاں سے مجھے اخلاقی اور روحانی تک حاصل ہو
 رہا ہے۔“

اسی طرح یہ بات بھی محتاج ثبوت نہیں کہ کشمیر کی ہندوستان میں موجودگی نے
 اس کے آئین کے سیکولرنگ کو اور جو کھا کر دیا۔ کشمیری عوام سیکولرازم پر تنکبہ اور
 ان کے رضا کارانہ اشارے آئین بنانے والے بزرگوں کو ایک ایسے فوسے بھرو دیا
 جس نے آئین ہند کو بھی منکوت اور مضطر کر دیا۔ ہمیں توقع تھی کہ ہندوستان کے رہنما
 بھی عملاً یہی طریقہ کار اختیار کریں گے۔ مہاتما گاندھی نے اپنی جان کی جو عظیم قربانی
 دی تھی۔ وہ فرقہ وارانہ آشتی حاصل کرنے کے لیے ہی تھی۔ اور اس سے ہیں اپنے فیصلے
 پر ناز ہونے لگا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ ہندوستانی حکومت چلائے والے لیڈر ہم اس
 اقدام سے گریز کریں گے جس سے فرقہ واریت کی بواقی ہو لیکن فیض میں زہر اس قدر
 سرائیت کر گیا تھا کہ حکومت کے بیشتر اعلیٰ پندوں پر اس زہر کی چھوٹی آگ آتی

تھی۔ اور ان کے ہر قدم میں فرقہ پرستی کی نفوس جھٹکار سٹانی دیتی تھی۔ کشمیری اکثریت مسلمان تھی لیکن ان کا مکان ایک غیر مسلم تھا، اس وجہ سے اکثریتی فرقہ اپنے جائز انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں چاہے وہ قومی ہوں یا غیر قومی، مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ بیکار اور جاگیر داری نظام کے دوسرے مظالم نے انھیں کل کے رکھ دیا تھا۔ ان کے 'انفلاس' بے جا رگی اور بے بسی کی تصویر ہے اس شخص نے کبھی جو کشمیر آیا اور جس کے دل میں انسانی درد موجود تھا۔ چنانچہ تدریجاً اور مسلمانوں کی کتاب میں اس قسم کے دردناک محنتوں سے بھر پور ہیں۔ صدیوں تک ظلم و ستم پہنے کے بعد مظلوم کشمیری توقع رکھتے تھے کہ حالات کے بدلنے کے ساتھ ان کی تقدیر بھی کروٹ لے گی۔ اور صدیوں تک جو حقوق ان کے لیے شہرِ منموہ بنا دیے گئے تھے ان سے وہ نئے حالات میں مستفید ہو جائیں گے۔ جن کشمیریوں کی بہادری کے افسانے کبھی دنیا بھر میں مشہور تھے۔ جن کے لشکروں نے کبھی لٹاؤ تیر کے پرچم سے نیچے دکن سے لے کر مصر کے کوئی تک اپنی بہادری کے نقشِ مجاہدیت تھے اور کبھی سلطان شہاب الدین کی قیادت میں سندھ تک اپنی کشمیریوں سے آجلا کر دیا تھا۔ ان کی دستار پسند منگروں نے غیر قومی اور غیر عسکری قرار دیا تھا۔ اور ان پر فوج کے دروازے کسی جیل کی تجویز کی طرح بند کر دیئے گئے تھے۔ اس لیے ہمارے مطالبات میں سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ فوج کی طبقاتی تشکیل نئے ڈھنگ سے کی جائے تاکہ سیاست کے تمام طبقوں اور خاص طور پر کشمیریوں کو اس میں جائز نمائندگی حاصل ہو۔ دستاویز احمق کی دوسرے دفاع مرکز کے اختیارات کی ذیل میں آتا تھا۔ جب دفاع کو مرکز کے ہاتھوں میں سوئیپ دیا گیا تھا تو اس وقت ہمارا اس کے ساتھ بیان تھا کہ وہ ان بے جا پابندیوں کو ہٹا کر کشمیریوں کو فوج میں مناسب نمائندگی دے گا۔

اب ہماری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ جب ہمیں مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جاری شدہ ایک ففیہ سرکر کا علیکم ہوا، جس میں ہم بھرتی کرنے والے آفیسروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو فوج میں بھرتی نہ کریں۔ یہ خبر کسی طرح پھیل گئی۔ مسلمان نوجوانوں کا ایک احتجاجی جلوس غزوہ قسٹ کا انظبار کرتا ہوا مجاہد منزل پہنچا اور اس سرگرمی ہم سے ہی وضاحت طلب کرنے لگا۔ بخشی غلام محمد اور مولانا سمیع نے جوش توں کر کے معاملے کو ٹال دیا۔ لیکن جب مرکزی ہوم منسٹر گوپالا سوامی آئینگر جموں کشمیر لائے تو میں نے یہ معاملہ ان کی نوٹس میں لایا۔ وہ پہلے تو بڑھ چڑھ کر بولنے لگا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب بخشی صاحب اور مولانا سمیع نے میری تائید کر کے انھیں تفصیلات بتائیں تو ان کی کٹ مٹی گم چھو گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسے سرکار کا اجراء آئین ہند کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ انھوں نے خاصی شرمندگی کا انظبار کیا اور وعدہ کیا کہ وہ دہلی جا کر اس معاملے کی تحقیقات کرائیں گے۔ اگر یہ واقعی درست ثابت ہوا تو وہ اس کو بلا کسی تاخیر کے مسترح کرائیں گے۔ میں نے جب آئینگر صاحب سے دریافت کیا کہ راجسٹی فوج کو مرکزی تحویل میں دینے کے بعد بھرتی کے دوران مسلمانوں کا کیا تناسب رہا ہے تو ان سے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جب ملیشیا کی تنظیم جدید کا کام شروع ہوا تو اگرچہ اس کا انتظام ہمارے ہاتھ میں تھا لیکن اس کا OPERATIONAL عملی اور تنظیمی اختیار مرکز کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت جنرل کری آپا فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ میں نے ان سے شکایت کی کہ ضلع لدرخ کی ملیشیا میں کرگھ کے مسلمانوں کو کیوں بھرتی نہیں کیا جاتا۔ جنرل بولے کہ ہندوستان سے ان کی وفاداری مشکوک ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ اگر حکومت حال واقعی ایسی ہے تو ہندوستان کو کیا اشتقاق حاصل ہے کہ وہ کرگھ پر اپنا قبضہ جمائے رکھے یا کہ اپنا

بولے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن میری صاف گوئی پر مجھے ہلکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ یاد رہے کہ اُس وقت لداخ اور کرگل ایک ہی متعلق تھا۔ آبادی کے تناسب میں کرگل کے علاقے کو تھوڑی سی فوقیت بھی حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود ملیشیا میں اُس کی نمائندگی برائے نام ہی تھی۔

مکمل دفاع تک ہی کیا محدود۔ آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہتھام کڑی حکم جات تو اس چھوٹ چھات کی آماجگاہ بن گئے۔ پولس سروس کا ماجراجی بہتر نہ تھا کہ اس سروس میں تو مسلمان پہلے ہی سے معتقد تھے۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ اس عدم توازن کو دور کر دیا جائے اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کے سامنے ہندوستانی سیکورٹزم کی ایک دل نبھانے والی تصویر اُبھاری جاتی۔ لیکن نکلے کے ان فیسروں نے اس کے بالکل برعکس روئیہ اپنایا۔ انھوں نے منظور شدہ امیدواروں کی ایک فہرست تیار کی۔ جس میں سے مسلمان نام کی ہر ایک چیز کی ایسے کٹ چھانٹ کر دی گئی جیسے یہ کسی نامزد بیماری کا نام ہو۔ مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے بڑے رنج کے ساتھ متعلقہ نکلے سے اس بات کے لیے احتجاج کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اُن دونوں کشمیر آئے ہوئے تھے۔ اُن کی توجہ میں بھی یہ بات آئی۔ میں نے اُن سے عرض کی کہ کمزری نکلے سیکورٹزم کے مثالی نمونے ہوتے جائیں۔ لیکن ان حکاموں کی بھرتی کے سلسلے میں اگر موجودہ طریقہ کار بدستور برتاجا رہا تو مسلمانوں کے دلوں سے ہندوستان کی سیکور شیزم پر کے سلسلے میں رہا سہا اعتماد بھی اٹھ جائے گا۔ غلطی یہ کہ اُس سے کشمیر میں ہمارا کام اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ سرحد پار سے ہماری مخالفت نشتر گاہیں مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنے کے لیے ہر قسم کی مبالغہ آرائیاں کر رہی ہیں اور ریاست میں بھی اُن کے ہمدرد بھجانت بھجانت کے

نفیاتی حربے استعمال کر رہے ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میرے اس نقشے کی داد دی جاتی کہ میں کوئی بیویوں کی نشاندہی کر کے اُن کے انسداد و علالت کی راہ ہموار بنا رہا ہوں لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یعنی میری راست گوئی فرقہ پرستی برتے والے حاکموں اور اُن کے سرپرستوں کو کھٹکے لگی۔ آنکھیں پچھائی کے ساتھ ساتھ ہی بولنے والے کے ساتھ بھی عدالت ہونے لگی۔ میرے خلاف اُن کا رویہ سخت ہونے لگا۔ اور دو تھپے بہت ہی بھیا ایک رنگوں میں پیش کرتے لگے۔ اگرچہ اب وہی میں سرور نہ رہے تھے مگر سرور ارس و نبیت کی علامت تھے وہ ذہنیت بدستور پھول پھول رہی تھی۔ اس ذہنیت کے علمبرداروں نے گویا میرے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ میں نے پہلے پہل زبانی احتجاجات سے اصلاح احوال کرنا چاہی لیکن جب یہ حد اتنی بہرے کاٹوں پر پڑنے لگیں تو میں نے تحریر کے لطیف تر پیرائے میں اپنی فریاد جاری رکھی۔ مگر وہاں تو میری بات کو آٹے معنی پہناتے کا جن مرفوب و مقبول گیا تھا۔ میں خیالات کو دلی میں رکھنے کا قافی نہیں کیونکہ اس طرح سے دلوں میں ملال اور سازش کے پھوٹے پکٹے لگتے ہیں۔ کوئی جائز شکایت ہو تو اسے میں بیان کر کے اپنا ہی ہلکا کر لیتا ہوں۔ بقول شاعر ع۔

ہر کہ در دل گذرد و وقت زباں دارد شمع

سوقن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

چنانچہ میں نے اس ضمن میں ۱۱ اپریل ۱۹۹۰ء کو زیر سسگو پورہ میں ایک جلسہ عام میں تقریر کی۔ جس میں میں نے کچھ ناخوشگوار واقعات کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا کہ ہم نے ہندو امزدوروں کی طرح ہندو کے اہل حق نہیں کیا ہے کہ ہمیں ہر اہم قسم حکم نامے پر انگوٹھا لگانے کا حکم دیا جائے۔ ہم ہندوستان سے اصولوں کی ہم آہنگی کی بنا پر ملتحق ہوئے ہیں اور اُن اصولوں کا ہندوستان کو احترام کرنا چاہئے۔ میں

لے یہ بھی کہا کہ ہم کشمیر میں ہندوستان کے آئین کو اس وقت کلیتاً نافذ کرنے کے لیے تیار ہوں گے جب ہم اس بات کے قائل ہو جائیں کہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کی قبر حقیقی طور پر کھودی گئی ہے۔ ابھی ہم اس پر باور کرنے کے لیے تیار نہیں واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی طرح اس وقت ہندوستان میں بھی فرقہ وارانہ ذہنیت کا خاتمہ نہیں ہوا ہے اور ان کو پسے سیکور ازم کا سبق ہم کشمیری قوم پر سقوں سے حاصل کرنا ہے۔ تقریر ہندوستان کے خلاف ہرگز نہیں تھی۔ لیکن اس میں "فوگر محمد" نے تھوڑا سا گلا "فرد کیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی اور یگانگت کا قی بننا چاہیے مگر نفرت اور دشمنی کا آتش فشاں۔ بارلوگ تو ناگ میں بیٹھ ہی تھے۔ مرکزی انشلی جنس کے جاسوسوں اور پریس کے رنگے ستاروں نے اس تقریر کو خوب مریخ لگا کر پیش کیا۔ ایک طرف تو ہندوستانی حکمران چٹھ سے بھرے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف انتہا پرست بھی میری حق گوئی کو مرتانی اور کیشی سمجھ کر آپ سے باہر ہو رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے زمین سٹگہ پورہ کی تقریر کو خوب اچھالا۔ اور فیضان اور بھی زہر ناک اور تلی پیدا کر دی۔ چنانچہ اس مستحکم اور دانت کر دار گشی کی ہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ جواہر لال نہرو جیسے دوست جو میرے ماضی اور میرے رول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا تے رہے تھے اسے اپنی ایک چٹھی میں میرے سیکور لفظ پر وکر وار پر یوں چھینٹے اڑائے۔

"میری حکومت اسی طرح سیکور لفظ پر ہیبت کے لیے کام کرتی رہی ہے جس طرح آپ خود اس مقدس کام میں جیتے رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس موضوع پر اب آپ کے احساسات کیا ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کشمیر میں اب ترجمان اس کی مخالفت مست میں ہے۔ بد قسمتی سے اس کا

ہندوستان پر اسی طرح برا اثر پڑے گا جس طرح ہندوستان کے حالات کے کشمیر میں برے عواقب ہوتے ہیں۔"

دراfterم کے نام مکتوب ۲۸ جون ۱۹۴۷ء

میرے استے قری اور اتنے اچھے دوست کی طرف سے مجھ پر یہ الزام تراشی بہت افسوسناک ہی نہیں تکلیف دہ بھی تھی۔ جواہر لال نے ہماری تحریک اور میرے لیے جو کچھ کیا اس کے ہم شکر گزار رہے ہیں۔ لیکن انھیں یہ بھی خوب معلوم تھا کہ جہاں تک سیکور لفظیات سے وفاداری کا تعلق ہے ہم نے "وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے" کی عملی تفسیر پیش کی تھی۔ میں نے ذاتی طور پر اس نظریے سے وابستگی کے لیے بار بار فیاد سے جوٹے تھے وہ تاریخ کے حافطے پر درتم ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جواہر لال اب کشمیر میں اپنے نئے دوستوں کو بچانے کے لیے اور ان کے کرد و قدسے کی پیروی کرنے کے لیے دروغ مصلحت آئین سے کام لے کر معاملات کو گنڈ مٹ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنے سہ جولائی ۱۹۴۷ء والے خط میں ان سے شکوہ کرتے ہوئے لکھا۔

"آخر پر میں آپ کے ان ارشادات کی طرف آتا ہوں جو آپ نے میری ذات کی نسبت ظاہر فرمائے ہیں۔ آپ کو شاید یہ تاثر ہے کہ میں اپنے موقف سے ہٹا جا رہا ہوں۔ آپ نے اس شک کا اظہار بھی کیا ہے کہ آیا میں سیکور لفظ پر اب پر اب بھی یقین رکھتا ہوں یا نہیں بھٹے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ ایک نہایت ہی نادر الزام ہے۔ جب وہ ظاہر قسم کے مشکوک و شبہات سے بھری ہوئی ہو اس وقت ایک شخص کے لیے اپنا دفاع کرنا بے حد نازک اور تکلیف دہ امر بنتا ہے۔ ہندوستانی اخباروں میں میرے خلاف

ہر قسم کے الزامات اور انتہامات عائد کئے گئے ہیں۔ وقت ہی دکھائے گا کہ میں اُن اصولوں پر کس مضبوطی سے قائم ہوں جن کی خاطر میں نے لڑائی لڑی اور تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ لیکن بلاشبہ مجھے اس وقت سخت کوفت اور کرب سے گذرنا پڑتا ہے جب آپ جیسے دوست مجھ پر شک کرتے اور مجھے غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن اصولوں کی میں نے ہمیشہ علمبرداری کی ہے اُن پر میرا عقائد اُس وقت بھی مدلل مل نہ ہو سکا جب میں بڑے مصائب کا سامنا کر رہا تھا۔ آپ کا حافظہ تازہ کرنے کے لیے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تو یہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ مسئلہ میں جب ہمیں ظاہری طور پر ایک مسئلہ مقرر کا سامنا تھا اُس وقت بھی میں نے ان اصولوں سے سخت موڑنے کی بجائے اُن کے لیے جان کی بازی لگادی۔

البتہ یہ مزید ہے کہ سیکرٹری جنرل ریت کے لیے میرا نظریہ نہ تو نیک نظری پر مبنی ہے اور نہ یک طرفہ وفاداری پر مبنی عوام کے تمام طبقوں اور ملکوں کے لیے انصاف کا امتلاشی ہوں اور میرا رویہ حقائق کی کوکھ سے جنم لیتا ہے نہ کہ آرٹو منڈانہ سوچ و چارہ (WISHFUL THINKING) سے۔

دینی میں ایک بار مرکزی رہنماؤں کی ایک میٹنگ میں جواہر لال کے علاوہ سردار اور مولانا آنا بھی تھے۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ یوں تو دنیا میں کسی بھی قوم کو خالص زور اور جبری بنیاد پر طبع یا دوست بنایا نہیں جاسکتا۔ لیکن کشمیریوں کے بارے میں یہ بات اور بھی صحیح ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ہندو کشمیر کی شراکت داری کا حوالہ دیتے ہوئے اُس مقام کا حوالہ دیا جہاں وہ کہتا ہے کہ کشمیر کو روحانی طاقت

کے بن بوتے پر فتح تو کیا جاسکتا ہے لیکن سامان جنگ کی قوت سے نہیں میں نے اُن سے کہا کہ جہاں گاندھی کے اخلاقی اصولوں نے ہمیں اپنی طرف کھینچا ہے۔ اور یہی اصول میں ہندوستان کے ساتھ وابستہ رکھ سکتے ہیں۔ جہاں جواہر لال میرے کہنے پر ہنسا کر رہ گئے۔ وہاں سردار کے چہرے پر ایک ناگوار کیفیت نمودار ہو گئی۔ بہر حال جب دلوں پر تلے پڑ جاتے ہیں تو دلیل اور ایسی دعائیں بن جاتے ہیں جو کبھی مستعجاب نہیں ہوتیں۔ ہندوستان میں میرے خلاف سازش کا جتنا ناپائیدار ہو گیا تھا اُس کی دوسری سرنگ میں میرے ساتھی بھی بندھے ہوئے تھے۔ البتہ اب جیلے جہاں تلاش کر کے مجھے راستے سے ہٹانے کی راہ تلاش کی جا رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب گھٹن اور غیر دوستانہ نظر عمل کے سایے بے مور ہے تھے۔ اور میرے گرد حلقہ تنگ سے تنگ کر دیا جا رہا تھا۔ اس وقت دہلی والے فوج سے اصول اور دلیل کی نہیں بلکہ تعمیل اور تسلیم کی توقع رکھتے تھے۔ میں بھی اپنے اصول سے وفاداری برتتے ہوئے حالات کے بہاؤ پر جا رہا تھا۔ مجھے دہلی آنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ گھنٹو کے دروازے بند کئے جا چکے ہیں اور اب صرف سرخ کپڑے پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ اس لیے میں غالب کے اس شعر کی رسم ظریفانہ منطق سے دل بہلا رہا تھا۔

حریت طلب مشکل نہیں فسون نیاز

تو قبال ہو یا بام کہ غم خضر دواز

میں صرف اس بات پر گڑھ رہا تھا کہ مجھ پر فوج پرستی اور اصولوں سے گشتگی کا الزام لگائے والے کس طرح اپنے خیال و عمل کی ترجمانی کر رہے ہیں اس سلسلے میں کون کتنے

پانی میں تھا۔ اُس کا ایک اندازہ کرنے کے لیے ایک کشمیری پلٹ ممبر پارلیمنٹ کے اُن تاثرات کا ذکر کیے بغیر ممکن نہ ہو گا جو انہوں نے لوک سبھا کے اجلاس میں اُس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کئے۔

”مسٹر جناب، جن کے ساتھ کشمیری مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں بے رُفی کی تھی، اپنی زندگی میں کشمیر کے مسئلے میں دو باتوں کے ارد گرد منہ دے رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کشمیر کو ہندوستان سے دور رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ عبداللہ کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ جناب کی جو ارد گرد اُن کی زندگی پوری نہ ہو سکی تھی۔ مسلم لیگ اور پاکستان کو پاکستان کے بعد بھی جو کچھ نصیب نہ ہو سکا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اس اہوان میں جمہوریت کا نام نہ کرنا ہندوستان کا نام لے کر پاکستان کو وہ سب کچھ دیا جا رہا ہے۔ اور اس طرح سے مسٹر جناب کی محترم روح کو پُر غلوں مدح سرائی کا تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ شاید شاعر نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا۔“

دل کے پھسپھوسے جل آٹھے سینے کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھسہ کے چراغ سے“

▲▲▲

دغا بازی کے خنجر

مرکز کے ساتھ ہماری یہ آویزش ریاست کے اندرونی حالات پر بہت ہی حراب اثر ڈال رہی تھی۔ حکومت کا نظم و نسق میرے کچھ ساتھیوں کی کثرت کی وجہ سے ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ بخشی غلام محمد ”دہلی کے“ ”مہریانوں“ کی پشت پناہی کے نقشے میں اپنی من مانی کا سلسلہ دراز کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اپنے بھائی بندوق کو خیموں اور دوسری مراعات سے مالا مال اور مستفید کر رہے تھے اور بے تحاشا جائیداد بنانے میں مصروف تھے۔ خاص طور پر فوج میں اُن کا طوطی بول رہا تھا اور فوجی تحریکات کی سونے کی گنگا اُن کے خاندان کو سیراب کر رہی تھی۔ اس کا اثر سرکاری انتظامیہ کی تندرستی کو روگ لگا رہا تھا۔ اُن کے عزیز و اقارب کی ملاقات سرکاری محکموں میں یا معمول اور بخشی صاحب کے خمدان وزارت میں شامل محکموں میں یا مخصوص بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ نالاں تھے۔ اور مطالبہ کر رہے تھے کہ اس صورت حال کا تدارک کیا جائے۔ میں جانتا تھا کہ بخشی صاحب کے اُن بڑے ہتھے ہوئے حوصلوں اور اُن کی بے راہ روی کا اصل سبب دہلی میں اُن کے آقاؤں

کی غفیر سرسختی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ بخشش صاحب کے خلاف کوئی اقدام کرنا دہلی کے اربابِ اقتدار کو لٹکارنے کے برابر ہو گا۔ اور اس صورت میں ہمیں وہی کسرا باب اقتدار سے براہِ راست ٹکرائنا پڑے گی۔ میں ریاستی حوام کے وسیع تر مفادات میں اس تعاقب سے سختی الامکان واسن بچانا چاہتا تھا۔ لیکن تقدیر کچھ اور ہی کھیل کھیلنے کی خواہش مند تھی۔

قبائلی حملے کے بعد جب ہم نے دوبارہ اُن علاقوں پر قبضہ کر لیا، جہاں قبائلی وقتی طور پر چھا جانے میں کامیاب ہو گئے تھے تو ہم نے دیکھا کہ گھرگ میں ہولٹوں اور دیگر سرکاری مکانات کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا گیا تھا۔ اس مال میں کسٹری، بکرا کر، قیمتی قالین اور دوسرا آرائشی سامان شامل تھا۔ یہ لوٹ قبائلیوں نے نہیں کی تھی بلکہ اوڑی اور بارہولہ کے اس پاس کے لوگ قبائلیوں کے بھیس میں یہاں آئے تھے اور ہر چیز پر ہاتھ صاف کر گئے تھے چونکہ ان لوگوں نے گھرگ کے ہولٹوں اور دیگر مکانات میں چوبیس اوروں یا بیروں کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اس لیے انھیں سامان کے حملے وقوع اور اس کی قیمت کا پورا علم تھا۔ ہم نے پولیس کے ذریعے اُن علاقوں میں تلاشی کروائی اور بہت سا سامان و اسباب وصول کر کے بارہمولہ تھانے میں جمع کیا۔ وقت گزرتا گیا اور فیچے ایک دن یہ اطلاع ملی کہ یہ سامان مالکوں کو واپس کرنے کی بجائے کچھ آفیسروں نے آپس میں بانٹ کھا یا ہے۔ میں نے انسپکٹر جنرل پولیس پر غصی وعدن سنگھ کی زیر سرکردگی ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تاکہ وہ اس معاملہ کی چھان بین کرے۔ لیکن غاصبی مذمت گڈرے کے باوجود کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔ میں نے ایک دفعہ آئی، جی، اپنی کواپنے دفتر میں بٹکایا اور اس سے اس تاخیر کے لیے جواب طلب کیا۔ پرتھوی وعدن سنگھ نے ایک خندہ خور جواب کے ساتھ

جواب دیا کہ ”آپ محکمہ داخلہ اپنی تحریف میں سے میں تو میں اصلی حالات سے آپ کو آگاہ کروں گا۔ ورنہ میں مجبور ہوں کیونکہ اس معاملے میں بڑے بڑے لوگ مانوڑ ہیں۔“ ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ بخشنی غلام محمد کی طرف تھا۔

میری وزارت کے دوسرے ساتھی نڈت شام لال مراد صفت صحت اور سول سپلائر کے وزیر تھے۔ اُن کے خلاف بدانتہیوں کی مسلسل اور سنگین شکایات موصول ہو رہی تھیں۔ خاص طور رشیم کی خرید و فروخت میں لاکھوں کے ہیر پھیر کی اطلاع ملی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے جب دفاتر اچھی جوتوں سے سرنگار منتقل نہ ہوئے تھے تو مراد صاحب کے نائب وزیر غلام محمد بنی الدین ہمدانی کے دفتر کے کمرے سے ایک بڑی گھڑی غائب ہو گئی۔ ہمدانی صاحب قس غانے میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے نکلے تو اپنی میز سے گھڑی غائب پائی۔ انھوں نے جمدار کو بتا کر اس سے پوچھنا چہ کی۔ لیکن جس نے لا علمی کا اظہار کیا۔ مگر ہمدانی صاحب نے اس کا یقین نہیں کیا اور کہا کہ میرے کمرے میں کوئی اور نہیں آیا۔ اس لیے گھڑی جمدار نے ہی چرائی ہوگی۔ انھوں نے جمدار کو بتایا کہ گھڑی واپس کرو ورنہ تمھیں نوکری سے علیحدہ کیا جائے گا۔ اور جیل بھی بھیجا دیا جائے گا۔ جمدار بے چارہ ڈر کے مارے آٹو سہانے لگا۔ اسی اثنا میں ہمدانی صاحب نے اسے سگریٹ لانے کے لیے کہا۔ چلے طبقے میں موجود چہرے انھوں نے جب جمدار کو روکے بسور تے دیکھا تو اس سے پرسش احوال کی۔ اس نے سارا ماجرا سنایا تو کسی کو یاد آگیا کہ اسی ابھی منیٹر صاحب یعنی پت نڈت شام لال مراد کے سامنے میاں کوئی چیز ہاتھ میں رہے ہوئے نیچے آئے تھے اور اسے مراد صاحب کی گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ جمدار دوڑ دوڑا گاڑی میں دیکھنے کے لیے گیا۔ لیکن اسے کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔ وہ اور اس کے ساتھی آٹے پاؤں لوٹنے

ہی والے تھے کہ قسمت سے گھڑی کا الارم اچانک بج اٹھا۔ وہ سب چونک کر دوڑے اور انھوں نے گھڑی کو گھاڑی کی سیٹ کے نیچے شور مچاتے ہوئے پایا۔ اندسے کو کیا چاہئے دو آنکلیں۔ جعدار خوشی سے لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا ہمدانی صاحب کے کپے میں آیا اور گھڑی اُن کی میز پر رکھ دی۔ ہمدانی صاحب نے روندا سنی تو معاصی کی اطلاع اپنے بڑے وزیر مرآت صاحب کو دی۔ مرآت صاحب نے ہمدانی صاحب اور اپنے سیکریٹری میاں غلام فتح پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ پیش کی تو مرآت صاحب نے اس پر کوئی کارروائی کرنے کی بجائے اُسے فہرست رکھا۔ البتہ اپنے لاڈلے سائے کو تبدیل کر کے حکمہ میں بھی بھیج دیا۔ جو اُن کی ہی قلمرو کا حصہ تھا۔ اور جہاں ہاتھ مارنے کے زیادہ تیزی مواقع موجود تھے۔ اس معاملے سے قطعاً بے خبر رکھا گیا۔ لیکن جب کچھ صورتحال گزر جانے کے بعد رپورٹ پر گرد کی کئی جہیں جم گئیں تو ہمدانی صاحب اسے میری نوٹس میں لائے۔ میں نے مرآت صاحب کو اپنے پاس بلایا اور اُن کے اس طریق کار پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ میں نے مرآت صاحب کو بتایا کہ یہ ٹھیک ہے کہ چوری کرنے والا اُن کا بٹلر قریبی رشتہ دار ہے، لیکن اس کے خلاف تو میں سے پہلے بھی دفاتروں سے پردے اور دیگر تعمیر کا سامان چرانے کی شکایات موجود ہیں۔ اگر آپ اسے پولیس کے حوالے دیجی کرتے تو بات سمجھ میں آسکتی تھی لیکن اُسے کم از کم تلازم سے تو اٹاک کرنا ضروری تھا۔ تاکہ ہم سب عوام کے سامنے منہ دکھانے کے قابل رہتے۔ لیکن آپ نے جو طریق کار اپنایا ہے وہ نہ صرف آپ کو بلکہ تمام کابینہ کو بے ڈوبے گا۔ مرآت صاحب اُن باتیں شنائی کرتے رہے لیکن کچھ شخص نے نہ کر سکے۔ انھیں آرام میں ایک اور واقعہ ہی نوٹس میں آیا۔ پہلے گام کے ایک بکروال کی ایک سیڑ پر دوڑتے چڑک کر پہلے گام کلب کے

احاطے میں چلی گئی تھی۔ چونکہ دار اس کو کچھ دیکر پھاٹک کی طرف لے جانے لگا۔ راستے میں پہلے گام کے ایگزیکٹو آفیسر صاحب نے بھیڑ کو موقع پر ہی ایک ہوٹل والے کے ہاتھ بیچ کر پکاس روپے اپنی جیب میں ڈال دیے۔ شاید اُس نے چند سیکے چونکہ دار کو بھی دے دیے ہوں گے۔ ہوٹل والا بھیڑ کو لے کر آیا اور اُسے اپنے ہوٹل کے برآمدے میں بانڈر فیا۔ اسے میں کبر وال گمشدہ بھیڑ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس طرف آنکھ تو اُس نے اپنی بھیڑ کو پہچان لیا۔ میں پھر کیا تھا۔ اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ باٹلر ایگزیکٹو آفیسر تک پہنچی تو وہ گھبرا گیا۔ اُس نے روپیہ ہوٹل والے کو واپس کر کے بھیڑ لیا اور اُسے بکروال کے حوالے کر دیا۔ بکروال کو چپ کرانے کے لیے اس کی منت سماجت بھی کی۔ لیکن بات پھیل گئی تھی۔ میرے پاس پہلے گام سے بہت سے تار آئے ہیں یہاں اس معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تحقیقات کمیٹی مقرر ہوئی اور ابتدائی جانچ سے ہی سراغ ملا کہ ایگزیکٹو آفیسر صاحب کے خلاف یہ پہلی شکایت نہیں ہے بلکہ وہ اُس معاملے میں غاصے مشاق ہیں اور لوگوں کو اُن سے بہت سی شکایات ہیں۔ مرآت صاحب معاملے کو پھر دہانے لگے تو میں نے اس معاملے پر کابینہ میں باز پرس کی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ ایگزیکٹو آفیسر کو کم از کم متعلق کرنے میں کوئی چیز مانع تھی؟ مرآت صاحب نے جواب دیا کہ اس معاملے میں بخشی صاحب نے داخلگی کی کہ یہ ایک شخص صاحب کی خواہش تھی کہ آفیسر متعلقہ تو پہلے گام میں ہی رکھا جانا چاہئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس آفیسر کے ذریعے سے بخشی صاحب نے پہلے گام میں بڑی بھاری جائداد گھڑی کر لی تھی۔ اور جنگل سے غارتی لکڑی ہٹا کر اسے میں آفیسر مذکور سے بخشی صاحب کے لیے اتنا کام کیا تھا کہ وہ اُس کی مشکنداری کا بیٹلر بنانے کے لیے ڈھال بن کر اُس کو بچاتے رہے تھے۔

نیسرا واقعہ مرآت صاحب سے متعلق میری توجہ میں لایا گیا۔ جو اور بھی زیادہ سنگین

نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ہمارے قریبی پسند اقدامات نے کیونکہ ہم کی طرف سے
جراثیم ختم کر دیئے تھے۔ ہماری انقلاب آفرینی اصلاحات اور قرضہ جات کی ممانی
سے متعلق اقدامات سے کشمیر میں کیونٹوں کے بیرون تلے سے زمین لگی تھی۔ اُن
کے پاس غریب عوام کو اگسا نے اور اس طرح اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے کے لیے کوئی
ہتھیار نہیں رہ گیا تھا۔ صاف صاف صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ ہماری زرعی اصلاحات
کو اصلاحات مانتے ہی نہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن اصلاحات کے پیچھے انقلابی تصور
خود کار فرما ہے لیکن جو انقلاب خون خرابے کے سیلاب کے ساتھ متوجہ نہ ہو وہ
انقلاب ہی کیا؟ میرا وجود کیونٹوں کو اس نہیں آتا تھا۔ وہ ایسے آدمی کو برا سمجھتا
دیکھنا چاہتے تھے جو اُن کی پاری سے وابستہ ہو اور جس کی ذور کھینچ کر وہ اپنے مقاصد
کو حاصل کر سکیں۔ اُن کا اُس وقت مقصد یہ تھا کہ کشمیر کی فضا پر چھ کر وہ ہندوستان
کی طرف پرواز شروع کر دیں۔ چنانچہ میری گرفتاری میں کیونٹوں نے بہت اہم حصہ
ادا کیا۔ یہی گرفتاری سے پہلے جن کیونٹوں کا کشمیر میں داخل ہند تھا وہ سب اچانک
سرنگری پہنچ گئے۔ ڈاکٹر اشرف قوچیلے سے ہی یہاں پر جان تھے۔ اُن کو میرے ہمراہیہ
ہندوستان جی نے انگلستان سے واپس بلوایا تھا۔ وہ وہاں سے تیار ہو کر آئے تھے۔ اس
لئے میں نے انھیں کشمیر آکر اپنی محنت بحال کرنے کی دعوت دی۔ لیکن کیونٹوں نے اپنی
ایک پہچان پر بھی بنائی ہے کہ وہ کسی مروت اور کسی محنت کی پروا نہ کریں۔ اس کے
علاوہ انہیں اسے احمد پوری کرشمہ شریعت، راماناموری اور علی سردار جعفری اپنی ”نئی
شرعیت“ کہتے ہیں جس پر وہ ہندوستان کے لوگوں کو منکس کے پھٹے بھی اُٹا رہے ہیں
بیانات شائع ہوتے تھے۔ اُن کی ترقیب کامیابیوں کے اس طبقے کے ہاتھ میں تھی۔ بلکہ
خود کہہ سکتے ہیں کہ یہی کارسما ہے جو اُن کی مروت منہ تھپ۔ صاف صاف

اور ڈی۔ پی۔ ور اُن کے خاص رازداروں میں سے تھے۔

چین دونوں سرگرمیوں میں متوجہ تھے۔ اُن دونوں عام جلسوں میں دو قوی نظریہ کو اُڑے
باتوں لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اشرف صاحب ”مانگے پر میرے ہمسفر تھے۔ اشرف صاحب
اچانک میرے ساتھ چپک کر بولے ”میرا بس چلے تو تم کو سبیں پر ختم کر دوں“ میں نے
سبب پوچھا تو اشرف صاحب نے کہا کہ ”تم دو قوی نظریے کے دشمن ہو اور اس لیے
ترقی پسند تحریک کے بھی دشمن“ میں حیرت سے اُن کا منہ کھلنے لگا اور سوچنے لگا کہ چین
لوگوں کا لغو ”دنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ“ ہے وہ کس بنا پر دو قوی نظریے کے پان ہار
بن گئے ہیں۔ لیکن اُن دونوں کیونٹوں کا کئی فی علم انھیں اس انکشاف پر اگسا ہاتھ
ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت غریب ہے اور وہ پروکھار ہیں۔ اس لیے اُن کی
حیات کر کے وہ کیونٹوں نظریے کے لیے کروڑوں سپاہی جنگی بجائے میں جیت
میں گئے۔ چنانچہ اُن دونوں حق خود ارادیت کی خوش آغوش انقلاب کی آڑ میں کینڈہ پاکستان
کے حق میں فضا ہوا کر کے لگے۔ لیکن جب پاکستان بنا تو سماج دھندہ صاحب بس اپنی
ملکوتی بچا کر ہندوستان واپس آ گئے۔ اور جو اہر لال نہرو نے اپنی پُر لعل طعنہ زہر
منکراہٹ کے ساتھ انھیں طعنہ دیا ”کیوں بنے تھائی۔ آگے انقلاب بیا کر کے!“
ہر گزٹ ۱۹۵۷ء کو میری گرفتاری سے ایک آدھ بیٹے پہلے ڈاکٹر زینا احمد،
راماناموری اور کوئی اور صاحب جن کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا ہے، مجھ سے ملنے کے لیے
آئے۔ میں نے اپنی مشکلات کا اُن سے ذکر کیا اور پوچھا کہ جن حالات میں ”میں
ایک سہایت ہی بنیادی قسم کی آدھ داری“ ڈاکٹر زینا ہوں، وہ جیتنے کی مجھ سے
کیسے توقع رکھی جاسکتی ہے؟ اگر درپیش مسائل کو حل دیکھا جائے۔ اس کے علاوہ نظریاتی

جنگ کے جس کو دشمنیت میں مجھے لڑنا ہے اس میں اگر مجھے مناسب ہتھیار فراہم نہ کیے جائیں تو میں اس مہاجرات کا پانسہ کیسے ہندوستان کے حق میں پٹ سکتا ہوں؟ میں نے اس سلسلے میں مسائل کی نشاندہی کے لیے کچھ کتابچے اُن کو دیے۔ جن میں ڈاکٹر شام پرشاد سنگری کے ساتھ خط و کتابت کی ایک قسط بھی شامل تھی۔ نیز اتر مہاراج نے کچھ وقت کے بعد وہ چیزیں پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ میرے فریاد کیا اور میری مشکوک کاغذات کیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ مشکوکات کا کچھ ہلکا کرنے کے لیے ذائقہ یا عامی طور پر میرا ہاتھ بٹانے کے لیے آگے آئے وہ آلت سازش کے خاکے میں رنگ بھر رہے تھے۔ یہ بڑی طاقتوں کی آویزش کا بڑا پتہ آشوب دور تھا۔ اور جوزف آسٹائن کی "تخلیص نیم روزہ" اپنے عروج پر تھی۔

اُس وقت گاندھی جی کو سرکاری عہدہ پر روس میں سامراج کے چھوکی حیثیت سے یاد کیا جاتا تھا۔ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ نیشنل کانفرنس کا منشور "نیا کشمیر" کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں چھپ چکا تھا۔ اس کے سرورق پر نیشنل کانفرنس کے سربراہ ہاں والے جھنڈے کی تصویر تھی۔ ایک دفعہ جب میں جواہر لال کے ساتھ میٹھا ہوا تھا تو وہ بے لکشی پینٹ سے جواں دنوں امریکہ میں چند کی سفیر تھیں، مجھ سے پوچھا کہ کیا اس سرخ رنگ کے جھنڈے کا کوئی تعلق کمیونسٹوں سے ہے؟ کیونکہ اس بارے میں امریکہ میں شبہات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس طرح اگر مجھ سے امریکی سفیر یا سفارت خانہ کا کوئی افسر متاثرات کرتا تو فوراً شبہات پیدا کیے جاسکتے کہ جو نہ جو روس کے خلاف کوئی کپڑی پک رہی ہے۔

اس طرح سے ہم دو عالمی طاقتوں کے درمیان جتنے کے دو پاؤں کی طرح پس رہے تھے۔

▲▲▲

دُر آباؤ کشمیر پر یاد

میری گرفتاری کی خبر کشمیر ہی کیا دنیا بھر میں جنگ کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس کے خلاف کشمیر میں ایسا زبردست عوامی ہرجان پیدا ہو گیا کہ مسٹر کے انتظامی انتظام کی یاد تازہ ہو گئی۔ مرد اور عورتیں، سپرد و جوان، اکابر اور اسکولوں کے لڑکیاں اور بچے کے وہاں وارنٹوں کو براگئے۔ اور عجیبی غلام قہقہے کے خلاف احتجاجی مظاہروں کا ایک سلسلہ بننا شروع کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وادی کے کوہ و کمرے انسانوں کا جوم سیلاب کے پانیوں کی طرح نیچے اتر آیا ہے اور شہر و قصبوں میں موجیں مار رہا ہے۔ لیکن بے چارے بے دست و پا تھے۔ ان کے احمقوں میں لاکھ تک نہ تھی۔ ان کا گمراہ ایک انگریز ہوئی اور تازہ دم طاقت کے ساتھ ہوا تھا جس نے اس تحریک کو دبانے کے لیے کئی مہینوں سے منظم اور مسلح گروپوں کی خوب مشق کی تھی۔ کشمیری اپنے لوگوں کا لادا آتش فشاں کی طرح کھیر رہے تھے۔ لیکن وہ ایک بے رحم اور اندھی طاقت کی مضبوط چٹان سے اپنا سر چھوڑ رہے تھے۔ دوسرے تین ہزار کے درمیان بے گناہ کشمیری گروہوں سے بھجوں ڈالے گئے۔ اور اُن کی بے گروہ و کلن لاشوں کا کوئی نام و نشان نہ رہا۔ اور وہ موت اپنے سرخ ہوا

کی بدولت کا کفن بین کرے نام قبروں میں گلاڑیوں کے لئے۔ شاید ایسے ہی عاشقان پاکباز کے لیے غالب نے کہا تھا:

اس خوں چکا کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیسرے شہیدوں پر حور کی

ہزاروں کی تعداد میں گرفتار یا عمل میں لائی گئیں۔ وادی کشمیر ایک تیز انقلابی ریلے کی زمیں ہو گئی۔ لوگ تین ہفتوں تک کاروبار سے منہ موڑ بیٹھے اور وادی میں زندگی ٹھنک ہو کر رہ گئی۔ اسی دوران عید گئی۔ یہ شاید مدتوں کے بعد ایسی خونی عید تھی جب سرنگر کے عید گاہ میں منار یا جماعت ادا نہیں کی گئی۔ اور جب چاروں طرف شاہیانوں کی بجائے ماتم کا سماں نظر آتا تھا۔ ہندوستانی حکمرانوں کو تو اندازہ تھا کہ میری گرفتاری سے کشمیر کے خرمین اس میں چٹکڑی پڑ جائے گی۔ لیکن اس کے شیعے اس قدر متدین اور غلبہ پس ہوں گے اس کا انھیں لگن نہ تھا۔ سازشیوں نے انھیں جھوٹی قسمیں دکھا کر یقین دلایا تھا کہ کشمیری عوام مجھے سبوں گے ہیں۔ لیکن جب کشمیر بالکل برعکس ثابت ہوا تو اب ہندو کے ساتھ ملانی زنجیر کی جھنجھٹ کا ساز بج اٹھا۔ جتنی قلام کشمیری رہائش گاہ میں ایک جراثیمی کیمپ کھڑا کیا گیا۔ جہاں آئین ساز اسمبلی کے تقریباً تمام ممبروں کو جھپٹ کر رکھا گیا۔ انھیں پہلے تو طرح طرح کے لالچ سے پیشے میں آکر لے کر کوشش کی گئی۔ جو لوگ اس جنگ زرگری میں یا مال نہ ہو سکے انھیں سیدھی جالوں میں ڈال دیا گیا۔ اور بہت سے ممبروں کو مراعات و رعایات کی زنجیروں میں بکڑ کر ذہن و ضمیر کے تقاضوں سے بے خبر بنادیا گیا۔ بعد میں ان ممبروں سے اسمبلی ہال میں شہیدوں کے سامنے میں جمہوریت اخلاقی اور آئین کے اس نقل کی منظر کشی سے لگی جن لوگوں نے سرکاری کی حرکت کی انھیں منظر سے ہی ہٹا دیا گیا۔

اس خونیں ڈرامے میں دلی کے خاص ایجنٹ اور معتبر ڈی۔ ٹی۔ درہنئے عوام کے سینوں پر گولیاں چلانے والی فوج کی رہنمائی کر رہے تھے اور دلی جگہ تو ملیشیا کے سربراہ ریکارڈر بشمور آنے گولیاں چلانے والے اسکائیڈ کو خود فائر کرنے کے حکم دیے۔

ہندوستان میں بھی اس واقعے سے سسنی چھل گئی۔ جس شخص کو کل تک لوگوں کے سامنے ایک ہیرو اور ہندوستان کے ایک شہوت کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔ جس کی تعریف کرتے کرتے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان کبھی سٹپلے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اور جس کے رول کی مہاشا گاندھی نے بھی سراہا کی تھی۔ آرت وہ بیک آن ٹنک کا قد آور وطن کا دشمن کیسے بن گیا؟ اپنی اس کاروائی کے حوازیں پر یوں کی کہانیوں اور جھوٹوں کے قصوں جیسے افسانے گھڑیے گئے یہاں تک کہا گیا کہ میں گھڑنگ پاکستانی آفیسروں کے ساتھ نفیہ ساز باز کرتے کے لیے گیا ہوا تھا۔ جو پاکستان کی سرحد کو پار کر کے گھڑنگ آنے والے تھے۔ اس لیے بروقت اقدام کے اس سازش کو ناکام بنادیا گیا۔ لیکن دروغ کو راقا حفظ نباشد۔ وہ یہ بات سمجھ ہی گئے کہ اس سفر میں میرے ساتھ جو آفیسر تھے وہ سب کے سب ہندو تھے۔

ایک اور افسانہ یہ گھڑ گیا کہ میں نے امریکہ کے ساتھ کشمیر کو آزاد رکھنے کی سازش کی تھی۔ اور میں کشمیر کو ایک دوسرا گوریا بنانا چاہتا تھا۔ ”سلاپ“ اور اس تماش کے دوسرے فرقہ پرست اخباروں نے تو یہ بے پرکائی کو اڑائی کہ صدر آئزن ہاور نے مجھے ایک خط بھیجا تھا، میں عید کے روز کشمیر کی آزاد مملکت کا اعلان کرنے والا تھا۔ اور امریکہ کی جھانٹ بردار قومیں بھوائی بھانڈوں کے ذریعے کشمیر میں آنے والی تھیں۔ اور اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے مجھے عین وقت پر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان قصے کہانیوں کو عام کرنے میں ہندوستانی کیونرسٹ پارٹی نے بڑے چرچہ کر بھڑکایا اور

اس مرض کے لیے سٹیڈی سرکل تک قائم کیے۔ صادق صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے میری گرفتاری کو بُرو وقت اور بر عمل قرار دیا۔ مولوی سعید میرے جنرل سیکرٹری تھے۔ کشمیر کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ اور میں نے انہیں تازہ ترین حالات سے باخبر رکھا تھا۔ لیکن انہیں ان واقعات کو پارلیمنٹ کے سامنے لانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ اگر چاہتے تو اس تمام طومار کا پل کھول کر رکھ سکتے تھے۔ لیکن وہ خود سازش میں متوث تھے۔ پھر ان قسم کی روش کیوں اپناتے؟ انہوں نے ابو اہول کی سی چپ سادھلی اور ان خطوط کو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی توفیق نہ پاسکے جو میں نے گرفتاری سے پہلے ان کے نام لکھے تھے۔ وہ میرے حق میں لب کشائی کیسے کرتے؟ انہوں نے ہمارے دو اور ممبران پارلیمنٹ مولوی محمد اکبر اور خواجہ غلام قادر بٹ کو کشمیر آنے سے روک دیا۔ تاکہ ان کے آنے سے بعضی مخالفت تحرک کو تقویت حاصل نہ ہو سکے۔ انہوں نے بعضی عصبانیت سے ٹیل فون پر رابطہ قائم کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ گرفتاریوں میں شہدے زیادہ کوئی (QUALITY) پر زور رکھا جائے۔ تاکہ عوام میں ناراضگی عام نہ ہو مگر تحریک کی روح اسیر ہو کر رہ جائے۔ مولوی سعید نے بعضی صاحب کو وزارت سازی کے شغف بھی مشورے دیے اور یہ بھی بتایا کہ کس شخص کو شامل کیا جائے۔ اور کس کو باہر رکھا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ مولوی صاحب سازش کی دلدل میں گھسوں گھسوں نکلتے۔ بعد میں بخشتی نے میرا قائم اور صادق کو بھی کامیاب میں شامل کر لیا۔

پہلیت جو اہل لاہنہ روئے اس دانتے کے شغف پارلیمنٹ کے سامنے ایک جذباتی تقریر کی اور ان واقعات پر رنج و غم کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی یہ مقصد بھی لگا دیا کہ اس کاروائی کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا تھا۔ البتہ ان کی تقریر سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ گو وہ اس واقعہ کی حیثیت سے ذمہ داری سے رہے ہیں۔ لیکن ان کے

۶ جنرل کا آخری شعر۔

باہد ان کی مرضی کے خلاف اہدہ دیئے گئے تھے۔

میں وزیر اعظم ہونے کے علاوہ جوں و کشمیر تھنشل کانفرنس کا صدر بھی تھا۔ مجھے جنرل خانہ بھیجنے کے بعد بخشی صاحب نے اس کی صدارت پر بھی ایک طرف قبضہ کر لیا تھا۔ مولوی سعید ابھی جنرل سیکرٹری ہی تھے۔ ان تبدیلیوں پر آئینی جواز کا غارہ چڑھانے کے لیے بخشی صاحب نے جنرل کو سسل کا اجلاس طلب کر لیا اور مولانا سعید کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ دہلی سے تو عطر اقی کے ساتھ چلے لیکن حکومت نے انہیں رام بن سے آگے آنے نہیں دیا۔ انہیں اس طرح بے حال کرنے میں نائب وزیر داخلہ شری ڈی۔ پی۔ ورکا شاہراہ باہد کام کر رہا تھا۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مولوی سعید کو تھنشل کانفرنس سے دور رکھا جائے تاکہ اس جماعت پر کمیونسٹ کا بیڑہ بگڑے۔ لوگ حاوی ہو سکیں۔ مولوی سعید طبیعت کے مولوی ہی تھے۔ اور کمیونسٹوں کے سخت مخالفت۔ اس لیے کمیونسٹوں کی آنکھوں میں ان کا وجود کائنات کی طرح گھٹکا تھا۔ وزارت سازی کے وقت بھی مولوی سعید نے کوشش کی تھی کہ کچھ کمیونسٹ مخالفت عناصر کا مینہ بن آجائیں لیکن کمیونسٹوں نے ان کا ایک نہ چلنے دیا۔ اس کے علاوہ وہ مولانا صاحب کی فتنہ پرور طبیعت سے واقف تھے۔ اور انہیں خدشہ تھا کہ وہ بخشی غلام محمد کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے کمیونسٹوں کو لالہ جھنڈی دے دیں گے۔ میرا کہنا تھا۔ مولوی سعید کو خطرہ ہو گیا کہ اس طرح برسرِ رابے ان کو روک دیا گیا تو دوسرا قدم ان کی گرفتاری کا ہوگا۔ اس لیے وہ قوم دبا کر واپس دہلی چلے آئے۔ مولوی صاحب دہلی میں میرے خلاف خاموشی کی سازش میں بدستور شامل رہے اور کسی نہ کسی طرح ارباب اقتدار کا قُرب حاصل کرنے کے لیے واؤں کیلئے رہے مگر ان کی کوئی آرزو ان کے حریفوں کی وجہ سے بر نہ آئی۔ جب کوئی مولوی صاحب سے آن کی خاموشی کا جواز پوچھتا

تو وہ یہ معنی فیز جواب دیتے کہ میری خاموشی دراصل شیخ صاحب کے حق میں میری جدوجہد ہے۔

کیونستوں نے اب نہایت چالاکی سے بخشی غلام محمد کے گرد گھیر ڈال دیا وہ بخشی غلام محمد کو ڈھال بنا کر درپردہ اپنے حزام پر لگا کر ناپا جیتے تھے۔ انھیں لگا تھا کہ ان کے راستے میں شیخ محمد عبد اللہ ایک بڑے پہاڑ کی طرح حائل ہے۔ لہذا اس کو ہٹانے میں انھوں نے اپنا سارا زور صرف کر دیا لیکن اس کا ایذا وہ ہرگز اپنے سر پر لینا نہیں چاہتے تھے۔ اور وہ یہ سارا دوش بخشی غلام محمد کے کاندھوں پر ڈال کر ڈرنے سے پہلے ہی ان کا رنگ زرد کر دینا چاہتے تھے۔ کیونستوں کو معلوم تھا کہ بخشی غلام محمد کی خامیاں اور کوتاہیاں اتنی زیادہ ہیں کہ مناسب وقت پر انھیں راستے سے ہٹا کر صادق صاحب کے لیے راستہ ہموار کیا جاسکتا ہے۔

لیکن بخشی غلام محمد کی چالاکی کو انھوں نے بہت کم سمجھا تھا۔ بخشی صاحب کچھ عرصہ تک بے مین کے عالم میں یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے قدم جانے شروع کر دیے۔ اور کیونستوں کو چھین کا دودھ یاد دلایا۔ انھوں نے حکومت پر پوری گرفت حاصل کر لی اور نیشنل کانفرنس کی تنظیم پر اپنے ماموں زاد بھائی بخشی عبدالرشید کو بلائے۔ یہ درمان کی طرح مسلط کر دیا۔

میری گرفتاری اور کشمیریوں پر غلط توڑنے کے سارے گناہوں نے ڈرامے میں پنڈت ڈگلا پر مشاد دوسرے بڑی ای ففرت اگیزہ رول ادا کیا۔ وہ ہندوستان کے فکرمند جاسوسی کے ایک ایجنٹ کی طرح کام کرتے رہے اور ان کا سارا کام میرے تلاوت تقریر کرنا اور ان پے شناپ پور میں سمیٹنا رہ گیا تھا۔ ہندوستان کی تحریک کشمیریوں کے ساتھ ان کے روابط کتنے گہرے تھے اس کا ذکر لی۔ این۔ بلک نے بھی کیا ہے۔

میں نے ڈی۔ پی کو وزارت میں بطور ڈپٹی ہوم منسٹر شامل کیا تھا۔ ایک دفعہ بخشی صاحب ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور میرے پاس آکر واپس لکھ کر کہ ان کو وزارت سے علیحدہ کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ ایک ساتھی کے ساتھ ایسا سلوک کرنا اچھا نہ رہے گا۔ اگر آپ اس کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے تو میں اپنے قلمدان میں سے اسے منصوبہ بندی کا شعبہ سپرد کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ دونوں میں کونجی کو تختہ مشق بنائیں گے۔ میرے اور کزن کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے میں ڈی۔ پی کا بڑا ہاتھ تھا۔ ڈی۔ پی کشمیر کے مشہور در خاندان کے چشم و چراپا تھے۔ اور ان کی طبیعت میں انفاست کا بڑا دخل تھا۔ بڑی دل کش شکل و صورت، قد و قامت اور طرزِ کلام کے مالک تھے خاصہ ذہین اور طرک تھے لیکن یہ سب کچھ سلیج کے اوپر اوپر ہی تھا۔ ان میں شخصیت کا سوز اور فکر کی گہرائی نہیں تھی اس کے علاوہ بہت سی اخلاقی کمزوریوں سے بھی ان کو گھیر رکھا تھا۔ لیکن تھے بڑے زمانہ ساز اور شاعر۔ ۱۹۳۷ء میں کشمیری مسلمانوں پر جو اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں اس ڈرامے کے اصل پروڈیوسر ڈیزائنر ڈی۔ پی۔ ہی تھے۔ اور وہ بذات خود فائرنگ کرنے والے پیش کی ہدایت کاری اور رہنمائی کرتے بھی دیکھے گئے۔ بعد میں انھوں نے اسی قسم کے کمالات کا مظاہرہ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں بھی کیا۔ جب بڑے مالو اور وادی کے کچھ دوسرے دیہات کو آگ لگا کر جڑوں سے بے گناہ بنا دیا گیا۔

کشمیری مسلمانوں کے غم و غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہندوستان نے اپنے خزانوں کے تخت کھول دیے۔ ہوائی جہازوں کے ذریعے کرنسی نوٹوں کے انبار لاکر بخشی غلام محمد کے سامنے بچاؤ کر دیے گئے۔ بخشی صاحب یہ عالم دیکھ کر بھڑکتے نہیں

ساتھ تھے۔ انھوں نے بھی بے دھڑک عوام کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع کر دیا۔ لوگوں کو قریباً ممت چاول دیتے جاتے گئے۔ اُن کے گھٹیا منڈبات کو ابھارنے کے لیے یہ بتایا گیا کہ شیخ محمد عبداللہ اُن کو ہندوستان کی طرف ہاتھ پھیلائے کی بجائے عزت سے آلو کھانے کی ملتیں کر رہے تھے۔ بڑے صاحب کو فخر و تشفی کے ساتھ روزانہ دو دو گھنٹہ کا صحبتوں کے نام سے پکارنے لگے۔ جب وہ مال کے درجے تھے تو چاول اتنے سستے داموں نہیں کیے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگ سمجھنے لگے کہ ہندوستان اور عثمانی قلم محمد سستے چاولوں کے عوض اُن کے ضمیر کا نیلام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن لوگوں نے کچھ عرصے تک راضی لینے سے بھی انکار کر دیا۔ لیکن تابہ کے ہود بھی مجبوراً بیٹے دریا سے اچھوڑ دھونے کے لیے آگئے۔ ہندوستان ہنسی خوشی سے ملنا خسارہ اپنے خزانے سے پورا کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ خدا سے کی یہ رقم نہیں کروڑ ملانہ تک پہنچ گئی۔ اور ایک عفریت کی طرح ریاست کی خوش حالی اور خود کفالت کو نگلنے کے لیے تڑکھوٹنے لگی۔ سستے چاولوں سے عوام کو خریدنے کی اسکیم بھی دبی۔ پی صاحب کے دماغ کی افواہ جی۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کشمیر کے لوگ سیاست بہت کم جانتے ہیں۔ انھیں تو بس پیسہ بھر کر خوراک چاہئے۔ اس لیے ہمیں بھی شلک کے رستے سے ہیں ہاتھ کر انھیں اپنی طرف مائل کرنا چاہئے۔ چین میں بھی یہ تجربہ اس وقت ہو چکا تھا جب وہاں بیرونی طاقتوں کی حکمرانی تھی۔ اگر بیرونوں نے افیم کی پیٹنگ میں ہڑے ہوئے چینوں کو ممت چاول دے کر اپنا جانا چاہا تھا۔ اگرچہ یہ تجربہ ناکام رہا تھا۔ لیکن وہی قدر نے اسی تجربے کو کشمیریوں پر آزمائے کا مشورہ دیا۔

کشمیر میں اس سامراجی ہنگامہ کے ایک تاریخی نظریہ بھی موجود تھی جب قبیلے انوار نے کشمیر کی آزادی کو ختم کر کے یہاں کے خود مختار بادشاہوں سے جھگڑائی کی۔

تو اکبر اعظم نے کشمیر کے عوام کی بے مینی کو ختم کرنے کے قلعہ ناگرتگر کی عظیم تفصیل بنانے کا کام اس لیے شروع کیا۔ اور اس پر اس وقت کے سکے کے مطابق ایک کروڑ وں لاکھ دینار خرچ کیے تاکہ کشمیریوں کو کچھ سکے مل جائیں اور وہ اُسی کی سستی میں اپنی متاعِ گمشدہ سے غافل ہو جائیں۔ چنانچہ ہری پرت بہت قلعہ کی تفصیل کے کاغذی دروازے پر اکبر کے دور کی یہ پالیسی یوں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اور آج بھی پتھر پر کندہ ہے۔

کرودھ ملک از خزان فرستاد

دو صد استاد و بندہ ہی جملہ چاکر

نہ گرو بیچ کس بے گار اس جا

تامی یافتند از خدمت نفس زر

(یہاں کوئی فریاد نہیں کرتا کیونکہ تمام لوگ اُس کے (اکبر کے) خوانے سے

روپے پاسے ہیں۔)

میرے خلاف مقامی اور ہندوستانی اخبارات میں جان بوجھ کر کردار کشی کی ایک مہم چلائی گئی۔ یہ الزام لگایا گیا کہ میں ایک رنگینے سفلیں اور شاہ کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اور میں نے اپنے استغفال کے لیے لاکھوں روپے کی لاگت سے امریکہ سے ایک کینڈلک کا منگوائی تھی۔ حالانکہ یہ بات درست نہ تھی۔ ایک کینڈلک کا حکومت نے ضرور امریکہ سے منگوائی تھی۔ یہ کامشورائے کے لیے زیر مبادلہ حاصل کرنے کے لیے مراکز کے ساتھ مل کر ہی ہوئی تھی۔ خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ لیکن یہ میرے لیے نہیں خریدی گئی تھی۔ بلکہ ان متعزز شخصیات اور مہمانوں کے استغفال کے لیے لائی گئی تھی جو ہندوستان سے کشمیر میں وارد ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں جو امر لال کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ جب وہ دربار آئے تھے تو وہ کھل کر میں جیٹا بن کر رہے تھے۔ جاتے ہیں

ایک ہی کار ایسی تھی۔ جو صدر ریاست کے استعمال میں رہتی تھی۔ ہمیں بار بار آن سے یہ کار مستعار لینا پڑتی تھی اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ کار جلوس کے بچوں کی گڑ جاتی اور ہم اپنا سامان لے کر رہ جاتے۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے کامیٹے نے ایک کیڑ لک کار خریدنے کی منظوری دے دی تھی۔ اس کو حفاظت کے ساتھ رکھنے کے لیے میرے سرکاری مکان میں ہی ایک مناسب گیراج موجود تھا۔ چنانچہ یہ کار وہیں رکھی گئی تھی۔ کار کے انجن کو درست حالت میں رکھنے کے لیے روزانہ اسے تین یا چار میل چلانا پڑتا تھا۔ شاید ایک آدھ مہرہ میں بھی اس پر سوار ہوا ہوں۔ میں اتنا ہی متعلق میرا اس کار کے ساتھ تھا۔ لیکن میرے معاملات کو بڑی کتاب سے مشغول اور اق اڑا لائے تھے۔ دوسرا کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے میں بیروٹیوں رکھتے تھے مشہور کیا گیا کہ میں نے یہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے منگوایا تھی۔ حالانکہ اس پر سٹیٹ گیراجز کا نمبر درج تھا۔ ریٹائر سے دہائی تک سبھی کو معلوم تھا کہ یہ کسی شخص کے لیے خریدی گئی ہے۔ بعد میں اس کار کی بڑی غلطی اور دھوم دھام کے ساتھ لاٹری کرائی گئی۔ تاکہ کچھ نہ کچھ کمپنیز بھی خریدیں ہی جاسے۔ اسی طرح کچھ لائبریریوں اور پارکوں کو میرے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔ ان سے میرا نام ہٹایا گیا۔ میری تعداد پر دفاتر سے تو خیر تعلیمی اداروں سے بھی غائب کرائی گئیں۔ درسی کتابوں میں تاریکی حوالے کے طور پر میرا نام جہاں بھی آیا تھا وہاں سے اسے محو کر دیا گیا۔ الفرض میرے نام کو عوام کے حافضے اور کثیر کی تاریخ سے مٹانے کے لیے ہر حربہ آزمایا گیا۔ لیکن فرسودہ الہی کے مطابق اللہ تعالیٰ انسان کی جانوں سے بہت بہتر اور بہت گہری چالیں جانتا ہے۔ اُن کی یہ ساری کوششیں کار ناک بن گئیں۔ جو ان کے ظلم کا ہاتھ دراز ہوتا گیا عوام کا اعتقاد بھی اُن سے اٹھ گیا اور عوام کو یقین ہو گیا کہ میں ایک گستاخی اور ہر ہر ساری بات

ہوا ہوں۔ میں جیل میں ایک عجیب سکون اور توکل کے ساتھ حالات کی اس پہنچ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں اور کو کبھی کیا سکتا تھا؟ زندگی کے تجاہد سے میں اپنا فرض ادا کرنا سب سے بڑی فرحت سمجھتا ہے باقی عواقب انسان کے نہیں اُس کے خالق کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ اسی لیے میں کبھی کبھی یہ شعر لکھتا تھا

شکست و فتح نصیبوں سے ہے دلے اسے تیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

واقعہ یہ ہے کہ دُئی۔ پی۔ درنے اپنی ریشہ دوانیوں سے کشمیر لوہ میں راج اس کہانت کو صحیح ثابت کر دیا تھا کہ قدر جب عروج پر ہوتے ہیں تو کشمیر پر زوال آتا ہے۔ اُن کے ہی ایک صدر برتن درنے قلعہ میں رنجیت سنگھ کی فوجیں کثیر رہے آئی تھیں۔ اور کشمیر میں ظلم و ستم کا سیاہ ترین دور شروع کر دیا تھا۔ اُن کے یہ اسلٹان بعد میں سکون کو دغا دے کر گلاب سنگھ کے گماشتے بن گئے۔ اور راج گلاب درنے ۲۹ اپریل ۱۹۵۷ء میں زائد کر میں ۲۸۔ شاہنشاہ کو زندہ تندی میں غرقاب کر کے دم لیا۔

بخشی برادر س کارپوریشن

بخشی غلام محمد نے کچھ مدت کے بعد اپنی وزارت میں توسیع کر دی۔ مشیام لال صراف اور گردھاری لال دو گروہ کے علاوہ اس میں میر تقی ام اور غلام محمد صادق کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ڈی۔ پی۔ ورکھنے کو تو ڈپٹی ہوم منسٹر ہی رہے لیکن وہ درحقیقت وزارت داخلہ کے سپاہ سفید کے مالک تھے۔ غلام رسول نیر کو بھلیو اسمبلی کا اسپیکر بنایا گیا۔ لیکن غلام محمد صادق وزارت صحت و تعلیم کے ساتھ آئین ساز اسمبلی کی صدارت سے بھی چپٹے رہے۔ پہلے پہل تو میر سے ساتھ گرجا رشتہ آئیروں، آرمی ریز، جاگی ناتھ ترنہ، مشیام لال کو، واماہ اور لیدو پر شاد شرمہ کو قلاب میں رکھا گیا۔ لیکن جس کسی نے اپنی وفاداری تبدیل کی اس کو ہار کے پھر تلامذوں میں سے لیا گیا۔ البتہ بین افسروں نے اپنی وفاداری تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کو بدستور میں خانوں میں بند رکھا گیا۔ ان میں خواجہ غلام احمد عثمانی، ریشہ کشمیر پرنس، خواجہ علی شاہ ڈچی رونیو منسٹر، خواجہ محمد امین ڈاکٹر و کنٹرول، خواجہ غلام محمد مین، میر غلام رسول، مرزا غلام قادر بیگ، پنڈت کیشپ بندھو، خواجہ غلام محمد

پیر محمد افضل محمدوی، خواجہ مبارک شاہ اور صدر الدین محمد پور وغیرہ شامل تھے۔ ممبران اسمبلی میں سے ملک غلام حسن لال، جاگی ناتھ گرو، حکیم حبیب اللہ سوہرا، مرزا غلام محمد بیگ، لیدو، رونیو منسٹر، غلام رسول اور بہت سارے ممبران نے اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں کچھ لوگوں نے سپر ڈالری اور عافیت کا راستہ اختیار کر لیا۔

بخشی غلام محمد نے امن دستے (پیس بریگیڈ) کے نام پر فتنوں کی ایک جماعت تشکیل کی اور اسے سرکاری چھتر چھایا کا اعزاز عطا کیا۔ اس میں وادی کے بدنام فاضل کو بھرتی کیا گیا۔ جس کو وہ اپنے طوفانی دستوں TORM TROOPERS کی حیثیت سے استعمال کرتا رہا۔ ان کے ہاتھوں لوگوں کو شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ بلکہ بخشی دور کی بدترین فتنہ گردی کا مظاہرہ اسی بریگیڈ نے کیا۔ یہ لوگ عام شہریوں کے لباس میں چلتے پھرتے تھے۔ لیکن ان کی حرکات و سکنات پر برابر نظر رکھتے تھے۔ اور جس کسی پر ذرا بھی شک گذرنا کہ وہ نئے نئے نظام کو فساد رانہیں ہے اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ شریفیوں کی گڑیاں اچھال کر دہشت پھیلاتا ان کا راج الوقت سکہ تھا۔ سس بریگیڈ کو لوگ حقارت سے "مفتضح فقیر" یعنی "اندھیالے کے بھڑے" کے نام سے پکارتے تھے۔ اس غلام سسٹم کے لیے پولیس کا سپیشل سٹاف تشکیل دیا اور آرمانی کا شہرہ آفاق مرکز بن گیا تھا اور اس کی ہاک ڈور بخشی صاحب کے خاص مستند سپرنٹنڈنٹ پولیس غلام قادر شیخ حوتی گاندہلی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کو بھی اپنے ہتھانے کو ایک ایسے اوتیو کیپ میں تبدیل کر دیا تھا کہ لالوں کو بھی اس کی صفائی پر رشک آ جاتا۔ وہاں اذیت رسانی کے نئے نئے طریقے اختیار کیے گئے تھے۔ جن میں ننگی انسانی پیٹ پر گرم استری پھرنا بھی شامل تھا۔ گاندہلی کی صفائی اور سنگ وٹی کے تھپے سن کر رنج بھی مٹنے

روز سبھی تھیں لوگ یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور ہر سے برداشت کرتے تھے کیوں کہ
 رشنوائی کا ہر دروازہ بعد سجدہ جہاں کے لوگوں کی بات ہی کیا۔ ایک بار ہندوستان
 کے مشہور سوشلسٹ رہنما اشوک مہتہ کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف
 لائے۔ اُن کو لال چوک کے نزدیک سر بازار پٹانگیا اُن کے ساتھ ایک قانون شریعتی
 و مستند دہلوی جی تھیں جن کی بے رحمی کی گئی۔ جب میرے بڑے لڑکے فاروقی نے
 اُسے پچاسے کے لیے مداخلت کرنا چاہی تو فتنے اُس کے پیچھے بھی بڑھ گئے اور اُسے
 ایک دکان میں پناہ دینا پڑی۔ میری بیگم کو بھی دھمکیاں دی گئیں کہ اگر اُس نے کہیں پر اپنی
 زبان کھولی تو اُس کی بھی سیل پڑی کی جائے گی۔ بخشی کے ایک پروردہ فتنے
 سلیم مثال اور اس کے بھائی حسد مثال نے جو نوکر پولیس میں ایک بڑا اثر تھا، بیگم کو
 دن و رات ڈھونڈنے لگا لیاں سنائیں۔ الغرض ہر طرف فتنہ گردی اور طوائف الملوکی کا دور
 دورہ تھا۔ اس سارے خلفشار کے پیچھے کمیونسٹوں کا عیار نہ اور استاد اعجاز کا کام
 کر رہا تھا۔ وہ اپنے غلطے کو منظم کشمیریوں پر آزمانا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب نے
 عوام کا اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا اور اُن کے سوشلی جذبات کو ابھار
 کر سیاسی فائدہ اٹھانا چاہا۔ ابھی سے متبیل عام نظمی ستاروں کو بلوا کر اُن کے گزٹ
 ریج کرانے گئے۔ مختلف جگہوں پر رقص و ناچ اور دھچک فتنہ کے مظاہر آراستہ کی گئیں۔
 شگوفہ باوام کے باغات میں تارے اور لٹنے کی مظاہر منتقد ہوئیں۔ جہاں بھی لوگوں کی تھیلیں
 ہوتی تھیں، بخشی جیب سے سیکے لٹال کر اُن کی طرف پھینکتا تھا۔ فرعون و ہامان کی
 طرح اُن پر خندہ زن ہوتا تھا۔ بخشی جیب فریو نو کو اس طرح الغلام و اکرام سے نوازتا
 تھا تو اُس کا جو اپنا عالم ہوتا اُس کے تعصوب کے لیے بڑے دہر دست تحمیل کی
 مزدور تھیں۔ اُس نے خود بھی نا جائز دولت سینے کا سلسلہ تیز کر دیا۔ کشمیر کے جنگلات

والے کے روٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آج بھی ماٹیں اپنے بچوں کو ڈرانے کے لیے
 کسی بدروح کے بدلے گاندھرجی کا نام لے کر انھیں سداوتی ہیں۔ گاندھرجی انتہائی بدترتیب
 بد لگام اور بدتربان بھی تھا۔ اور کسی شخص کی عزت اُس کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں تھی۔
 جیسا کہ میں نے شش ماہ اپنی چند روزہ رہائی کے دوران کہا کہ اُس کے شعورو
 شمارے صاف متشرع تھا کہ ایک جرم کو پولیس کی وردی پہنادی گئی ہے۔ میری ذات
 اور میرے بال بچے تو اُس کے ریکم خلوں کا خاص طور پر نشانہ بنتے رہے اور وہ
 پنڈھارے لے کر نہیں لگایاں دیتا رہا۔ لیکن قدرت کے سیراں دور سے اندھ نہیں۔
 وہ ایسی عبرت انگیز موت مرا کہ خدا کیسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اُس کی موت پر
 آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا اور اپنی قوم سے وفا کرنے کا اُسے یہ صلہ ملا کہ جیب تک
 کشمیری قوم کی رگوں میں حیت کا خون جوش مارتا ہے اُس کا نام نفرت و حقارت سے
 لیا جاتا رہے گا۔ خا عابد پرویا وادی الایبصار۔ یعنی دیکھو اُسے جو دیدہ عبرت
 لگاہ ہو۔

بخشی عبدالرشید، بخشی غلام محمد سے قربت کی وجہ سے سرکار اور تنظیم دونوں
 پر چھاپا تھا۔ وہ ایک ایسے گمراہ میں پیدا ہوا تھا جس کا مافی بہت ہی دغا تھا۔
 اُس کا والد قادر خان ایک وقت کشمیر کے لڑکوں کو سچا کر پٹار دے بازار میں
 پیش کروانے کا وعدہ کرتا تھا۔ بخشی رشید خود بھی واجبی طور پر ہی پڑھا لکھا تھا۔
 لیکن اتر ساحول میں پرورش پانے کی وجہ سے اس میں کوکھلی آغوش اور رعوت بہت
 زیادہ گھڑائی تھی۔ اُس نے بھی عوام کو اپنے نظموں و ستم کا شکار بنا کر رکھا تھا۔ اُس کے ادوار
 چند بدکار اور بد اخلاق اٹھامں منڈلاتے رہتے تھے۔ میں نے انھوں کی لڑکی کی عزت
 و عصمت تک محفوظ نہیں تھی۔ شراب و کباب اور ناہ نوش کی تھیلیں اُس کے دربار میں

پر خوب ہاتھ ڈالا اور اپنے عزیزوں کو محنتوں کے جوش سونا اگلنے والے بڑے بڑے
 ٹھیکے الاٹ کر دیئے۔ جو لوگ جو بیڑیوں میں رہتے تھے وہ چشمِ دون میں تعلقات کے
 مالک بن گئے۔ بخشی صاحب نے درخیز و مارا نے "روٹ پرست" کی ایک نئی منصب دہی
 کی طرح ڈالی۔ ریاست کی سرکوں پر گاڑی پلانے کے لیے ایک کاغذ کا پتہ ہاتھ میں
 تھا دیا جاتا تھا۔ جس کی قیمت میں سے تیس ہزار روپے تک ہوتی تھی۔ یا تو لینے والا
 اسے ایک ہاتھ لے کر دوسرے ہاتھ فروخت کر کے نقد سودے سے مستفید ہو جاتا
 تھا یا پرمٹ کس گاڑی والے کے ہاتھ میں دے کر ہر ماہ پانچ سو سے ہزار روپے تک
 گھر بیٹھے بیٹھ رہتا تھا۔ جو کسی نے رشوت کو ایک فنِ لطیفہ کی شکل دے دی تھی۔ چنانچہ
 انھوں نے نہ صرف اندرونِ ریاست کی ایک پوری نسل کے خیر کے چراغ اور ریاست
 کی شمعیں بھجا دیں بلکہ ریاست سے باہر کے بااثر اور چرب زبان لوگوں کو لالچے سے بھرا
 بنا لیا۔ ان میں پنجاب کے کچھ وزیر، پارلیمنٹ کے اسپیکر، مرکزی وزراء کے سیکریٹری
 کچھ صحافی اور دوسرے اہم لوگ شامل تھے۔ اس طرح سے وہ اپنی ناجائز حکومت کی
 طنائیں ہر سمت اور ہر جانب سے مضبوط باندھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ مشیتِ الٰہی کی کچھ
 اور ہی منظور تھا۔ یہ سارے بھٹکڑے بے اثر ہی نہیں بلکہ خطر رساں بھی ثابت ہوئے
 گئے اور ان کی بدنامی روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ ان کے متعلق شکایات جواہر لال نہرو
 کو پہنچ گئیں۔ لیکن بھلا وہ اس کا کیوں اور کیسے مدد کرتے انھوں نے تو بخشی کو کھلی
 جھوٹ دے رکھی تھی۔ پنڈت پریم ناتھ دوگرہ سے میری گرفتاری کے بعد بخشی غلام محمد
 نے خوب ہنگامیں بڑھائی تھیں۔ اور ان سے کہتا رہتا تھا کہ شیخ عبداللہ کو ہم نے آپ ہی
 کے ساتھ زیادتی کرنے کی وجہ سے جیل بھیج دیا ہے۔ اس کے علاوہ پریم ناتھ جی اور ان
 کے حواریوں کو بھی مراعات و مہنایات سے مالا مال کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ

اس کی کارستانیوں کا ردِ نادر کرتے تھے۔ ایک دفعہ دوگرہ صاحب نے پنڈت جواہر لال
 سے شکایت کی کہ بخشی غلام محمد بے تحاشا جائداد بنا رہا ہے۔ پنڈت جی نے جواب میں
 کہا کہ جائداد ہی تو بننا ہے اور یہ جائداد بہر حال ہمارے ملک کی زمین و آسمان
 کے درمیان واقع ہے اس کو اسے کہاں چلا جائے گا؟ پنڈت پریم ناتھ جواہر لال جیسے
 بلند کردار رہنما کی زبان سے یہ بات سن کر ششدر رہ گئے اور خاموشی سے چلے آئے۔
 بخشی غلام محمد نے اس سلسلے میں اپنا مضابطہ کردار استقدر واضح کر دیا تھا کہ اس نے
 ایک دفعہ سرکاری ملازموں کے ایک بڑے مجمع میں کھلے بندوں ان سے یہ کہا کہ اگر میرے
 وقت میں حکمِ دولت نہیں بنا سکتے تو تم سے زیادہ بدبخت کوئی اور نہ ہو گا۔ اس کا
 نتیجہ ظاہر تھا۔ اوپر سے نیچے تک ہر سرکاری ملازم نے خوب ہاتھ مارنا شروع کر دیئے
 اور حکومت ایک بازاری طوائف بن کر رہ گئی۔ جس کو غرض مند سرکاری ملازمین غلام
 پرچہ کار دھن دولت بٹور کرتے تھے۔ حرام اور حلال فعلوں اور مقررہ قدیں بن کر رہ
 گئیں۔ بددیانتی اور بے ایمانی کا رنگ ناق عام ہو گیا۔

ان حالات میں شاید پنڈت جواہر لال کے دل میں ان کی سوتی ہوئی شائستگی
 نے آنکھ کھلی اور انھیں میری وہ بات یاد آگئی ہوگی جو میں نے انھیں بخشی غلام محمد
 کی بے راہ رویوں کے متعلق بتائی تھی۔ انھوں نے اپنے ایک پڑے دوست پی سمران
 کو میرے پاس بھیجا۔ میں سب جیل گز میں نظر بند تھا۔ پی سمران موبین کلدہ (مکرم پور) میں
 میں ایمر بخشی کے دورانِ ملک کے وزیر قانون بنے، اور جرنیل کمال سنگھ کے والد تھے۔
 ان کے ساتھ میری درینہ جان پہچان تھی۔ یہ کسی کام کے پہانے سے سرٹیکر آئے تھے۔
 لیکن وہاں سے سید سے میرے پاس گھر پہنچے۔ یوں تو وضع داری تھا کہ ہوتے انھوں نے
 کہا کہ میں خود شوقِ ملاقات کی وجہ سے آیا ہوں۔ لیکن ان کی حرکات و سکنات سے ظاہر

معاذ کے کوئی مشوقی ہے اس پر وہ زندگی میں " وہ مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے گذشتہ ناخوشگوار واقعات کو بھول جانا چاہئے۔ اور پھر کشمیر کی عنان حکومت کو قبول کر لینا چاہئے۔ تبھر ان صاحب بڑے تانت و آئینہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان یوں تو کشمیر کی حرقی اور کشمیری عوام کی بہتری کے لیے گراں قدر رقومات کشمیر بھیج رہا ہے۔ لیکن اس میں سے نصف سے بھی کم جائز مقاصد پر صرف کیا جاتا ہے۔ باقی سب خود برد کیا جاتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نے اپنی لوگوں کی قیامی پینڈت جی کے سامنے کر دی تھی۔ اس وقت بس مرہ کی کوئیل ہی بھوت رہی تھی اور اس کا بروقت مدد دیا گیا جاسکتا تھا۔ لیکن پینڈت جی نے ان کو راہ راست پر لانے کی بجائے انھیں کے ہر دھار نظام مملکت کر دیا اور مجھے غالب کے اس شعر کے مصداق چلا کر دیا

میں نے کہا کہ بزمِ نان چاہئے غیر سے تھی
میں کے ستمِ ظریفیت نے تم کو اٹھایا کر یوں

اب تو رشوت کی نفی کو پہل ایک تیار درخت بن چکی ہے اور اس کو اٹھاڑ پھینکنا ایک بے حد مشکل امر بن گیا ہے اور پھر مسئلہ کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ میں نے جو کچھ پینڈت جی سے کہا تھا اس میں میری ذاتی خود غرضی کو دخل نہ تھا۔ میں نے محض اپنا فرض نبھاتے ہوئے انھیں حقائق سے روشناس کیا تھا۔ فیصلہ ان کا تھا اور انھوں نے فیصلہ کر لیا اب انھیں اس فیصلے کے نتائج بھگٹنا پڑیں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے سب سے بڑے معصیت یعنی وقت کا انتظار کروں گا۔ تاکہ یہ خود میری بریت اور معصیت کا فیصلہ صادر کر دے۔ پھر اسے سبھراجن صاحب سے سن کر چپ ہوئے اور رخصت چاہی۔

اور کہا گیا ہے کہ بخشی صاحب نے کشمیریوں کے مسئلہ جذبات کو ابھار کر اپنا آؤ

سیدھا کرنے کی کوشش کی اور ان کے باطن کی روشنی بھانسنے میں اپنی بلاشبہ بڑی زبردست صلاحیتیں صرت کر دیں۔ اس وقت وہ بھول گئے کہ میں قوم کے جذبہ خودی کو بیدار کرنے کے لیے ہم نے اتنی معصیتیں اٹھائیں اور بے مثال قربانیاں دی تھیں اور ہزاروں شہیدوں نے سر زمین کشمیر کو اپنے پاک خون سے لالہ زار بنا دیا تھا اس کو انھوں نے کس طرح پامال کر دیا۔ اور ہماری تحریک کو بہت پیچھے دھکیل دیا۔

یک لحظہ خافض یوم و مدد سالہ راہم دور خدا!

فطرت کا یہ دستور رہا ہے کہ کبھی کبھی برائیوں میں بھی بھلائی کا ایک پہلو مغمور رہتا ہے۔ بقول غالب ؎

لطافت ہے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں پاتی

بخشی صاحب کے دور میں کچھ اچھے کام بھی ہوئے۔ ریاست میں پہلی بار میڈیکل کالج اور دکنل انجینئرنگ کالج کی بنیادیں پڑیں۔ تعلیم کو پراگری سے یونیورسٹی سطح تک نفٹ بنایا گیا۔ اس کے نتائج آئندہ کے لیے یکساں طور پر اچھے درجے کی تعلیم پانے بے روزگاری پر مبنی تھی اور سب کے لیے ملازمتوں اور روزگار کا بندوبست کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی چونکہ کشمیر کے لوگ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے تھے لہذا مجموعی طور پر اس کا اثر مثبت ہی ہوا۔ بخشی صاحب نے کچھ تعلیمی کام بھی کیے۔ سر سیکر میں نیا سیکرٹریٹ، فورسٹ ریسرچ سٹر، سٹیشنر، میٹروپال اور کچھ دوسری اہم عمارتیں بنوا دیں۔ جن شہر کو بے حد وسعت دی۔ وہاں کے لگی کوچوں کو کشادہ کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ بڑی بڑی سڑکیں بنوائیں۔ وہاں بھی سیکرٹریٹ اور اسمبلی کی شاندار عمارتیں تعمیر کیں۔ دیہات میں آمدورفت کے لیے بڑی بڑی سڑکیں اور ٹرینوں کی تعمیر یونیورسٹی کو رہائشی دانش گاہ بنوانے کے لیے ابتدائی ڈھانچہ کھوایا۔ لیکن انھوں نے

انہی ساری عمارتیں کھڑی کرنے کے باوجود ایک ایسی عمارت کو ڈھایا جو تاج محل اور اہرام مصر سے زیادہ قیمتی اور اہم ہوتی ہے اور وہ تھی کشمیریوں کے کردار کی حالت کا توڑا جو تو نے آئینہ حتمی سال دار تھا

بخشی صاحب ذاتی طور پر کچھ انسانی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت میں متضاد عناصر پہنچے تھے مثلاً وہ بڑے سنگ دل اور غلام بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کا ایک بڑا وصف ان کی سخاوت تھی۔ انہی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں انھوں نے اس کے کئی مظاہر کیے۔ بہت سے بے نوازیں اور تنگ دستوں کو بھی چھوٹے چھوٹے نایڈ سے پہچانے اور گریز میں بھی دسترخوان اور نگر جاری رکھا اس کی وجہ سے ایک شخصوں طبقے میں ان کے تئیں محبتیں بھی پیدا ہو ا اور بعض لوگ آج بھی ان کے اپنے کاموں کو یاد کرتے ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور میں وہ مصور کے محل میں کسی نہ کسی طرح تنہا رہا۔ مجھے جیل خانے میں اخبارات بھی ملنے لگے۔ اور ایک ریڈیو بھی دیا گیا جس کے تمام اسٹیشن سرچر کے ہوا بند تھے۔ تاکہ میں محنت ریڈیو کشمیر میں سکون لیکن شاید ریڈیو کو ٹھہر بند کرنے والوں کو یہ علم نہیں تھا کہ میں نے سائنس میں ڈگری لی تھی۔ میں نے یہ تہ توڑ دی اور ساری دنیا کے اسٹیشن بیچے گئے۔ اور میری بیوی کو الاؤنس کی پیش کش کی گئی تھی۔ لیکن اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن جواہر لال نے مداخلت کی تو ایک سال کے بعد میری بیوی کو مجبوراً الاؤنس قبول کرنا پڑا۔

کچھ عرصے بعد حکومت نے میرے ساتھ قید کمانچے کے لیے دو تین ساتھی اور بھیج دیے۔ جن میں غلام محمد شاہ اور غلام محمد بٹ بھی تھے۔ میرے بال بچوں کو بھی میرے پاس آنے کی اجازت اور کبھی کبھار وہاں ٹھہرنے کی اجازت دی گئی۔ جواہر لال

کے ردیے سے ظاہر تھا کہ انھیں اپنے کچے پر رنج ہے لیکن تیر کمان سے ٹکل چکا تھا۔ اب اس اقدام کو غلط قرار دینے کا یاد ا پس لینے کا یار ان میں نہیں تھا۔ اگرچہ وہ برابر کہتے رہے کہ انھیں میری گرفتاری سے بے خبر رکھا گیا بلکہ یہ قدم ایک عملی ناگزیر FATE ACCOMPLI کے طور پر ان کے سامنے پیش کیا گیا لیکن عقل سلیم کو اس غدر کے ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ میری گرفتاری ایک معمولی بات نہ تھی کہ تنگ کا کوئی بڑے سے بڑا حاکم تنگ کے وزیرِ اعظم کو باخبر رکھے بغیر اس کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ اس کے بین الاقوامی مضمرات تھے۔ یہ ساری دنیا کے لیے ایک بڑی خبر بن گئی۔ اور دنیا بھر کے اخبارات اور نشریاتوں نے اسے خوب اچھا لایا اور اس پر ایسے تبصرے کیے جس سے ہندوستان کی اخلاقی مشیہہ مجروح ہو کر رہ گئی۔ یہ درست ہے کہ رفیع صاحب جواہر لال کے بہت ہی قریبی معتقد تھے۔ لیکن ان کے لیے بھی وزیرِ اعظم کی مرضی کے خلاف ایسا اقدام کرنا مشکل تھا۔ اگرچہ کچھ دیر کے لیے عرض بھی کر لیا جائے کہ مجھے پندت جی کی بے خبری میں گرفتار کر لیا گیا تھا تو وہ آخر تک کے وزیرِ اعظم تھے وہ اس غلطی کو درست بھی کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پھر یہ بات بھی تو ہے کہ پہلے ہی۔ آئین۔ ملک نے اور اب سر دھانی گوال نے جنھیں پہلی بار مسز اندرا گاندھی نے جواہر لال کے ذاتی کاغذات دیکھنے کی اجازت دی، ہمانا چاہا ہے پر مجبور دیا ہے اور میری گرفتاری میں جواہر لال کے علم و انہی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بہر حال جب ملک میں کوئی گیارہ سال کے بعد ان سے دی میں ملا تو جواہر لال نے پھر اس بات کو دہرایا کہ میری گرفتاری اگرچہ ان کی لامصلحی میں ہوئی۔ لیکن یہ حیثیت وزیرِ اعظم وہ اس کی اجتماعی ذمہ داری سے کچھ نکل سکتے ہیں؟

میری گرفتاری میں نوکر شاہی کے پھر زوں کے اوپر سیاسی سطح پر چڑھ کر

نے جو اہل کمال کے ہاتھ مضبوط کیا کیے وہ مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی تھے۔ دونوں اصحاب کی قائدانہ صلاحیتوں کا زمانہ قائل ہے۔ لیکن دونوں کو اپنے فرستے میں کوئی عوامی بنیاد نہیں ملی سلی تھی۔ رفیع صاحب کے آبائی صوبے اتر پردیش کے مسلمان تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ انھیں پاکستان بننے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، پاکستان کی تحریک کے ہر اہل دستے کے طور پر کام کرتے رہے۔ اور مولانا آزاد کو جمہوری مرکزی اسمبلی میں پہنچنے کے لیے صوبہ سرحد میں خان بادشاہ کے سامنے دامن پھیلا نا پڑا۔ شاید دونوں بزرگوں کو میری اپنے فرستے کے لوگوں پر گرفت بہت پسند نہیں آئی تھی اور وہ مسلم قیادت کے معین میں مجھ کو خواہ مخواہ اپنا رقیب و حریف تصور کرتے تھے۔ اس لیے ”اے روشنی ملیع تو برہمن بلا شادی“ کے مصداق وہ مجھ کو بٹانے میں ایک نفسیاتی اور اعصابی تسکین محسوس کرتے رہے۔

میں آدھوڑ میں ہی ہی قید تھاکر پھنڈت جیالال کلم وہاں مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ کلم صاحب تحریک میں ہمارے چرانے ساتھی رہے تھے۔ اور میں نے آزادی کے بعد انھیں کشمیر کی عدالت عالیہ کا ایک جج مقرر کرنے میں یہی کئی سختی میں وہ اس منصبِ جلیل پر ہی فائز تھے۔ وہ بڑے خوش مذاق اور عرفیانہ طبیعت کے مالک تھے۔ اور ان سے گفتگو ہمیشہ ایک برکت و نریش ہوا کرتی تھی۔ یہی مذاق کے بعد انھوں نے معاملات کو تسکین کے لیے پہل کرنے کی چٹنی کش کی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں اس قسم کا کوئی اقدام کرنے سے منع کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ ”کہا ہے سانپ نیکل ایک لہر میں کر“ جو کچھ بھی ہوا ہے اب اس سے اتر اور کیا ہوگا؟ پھنڈت جی کو اب نئے دوست شہزاد ہوں۔ وقت خود ان پر واضح کرے گا کہ میں نے نہ ہندوستان سے بے وفائی کی اور نہ پھنڈت جی کی ذات سے۔ میں نے حالات

کو اس ضمن میں ان کے سامنے رکھا اور فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے مسکنیت کو مستحکم قرار دیا اور مہتمم کو اپنا اعتماد دے کر نظام مملکت آس کے سپرد کر دیا۔

آدھوڑ میں گری کا زمانہ آگیا۔ اور ہم نے مطالبہ کیا کہ ہمیں کسی نسبتاً ٹھنڈے مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ کچھ دیر کے بعد ہی گدیہ حکومت نے کچھ مکان کرائے پر دیے۔ وہاں نظربندی کا ایک کیس قائم کیا۔ اور ہمیں وہاں منتقل کر دیا۔ یہ کیس گدیہ کے جنگل میں واقع تھا۔ حکومت نے یہ کیس بنانے کے لیے بے شمار دولت خرچ کی خاص کر مگر بھارت کیس کے ارد گرد تعمیر کی گئیں۔ بلکہ خادار تار کے ایک زمین بہت سے منظر کھلے کر دیئے گئے۔ گدیہ بجلی کا لال تھا۔ اس لیے کیس پر گھیرانی رکھنے کے لیے چاروں طرف گیس پائپ نصب کرنے کے لیے بیسوں کھمبے کھڑے کیے گئے۔ گیس پائپ تو گھنڈہ بھر کے بعد ہی سمجھ جاتے تھے۔ مگر اس بہانے حکومت کے منظور نظر لوگوں کی خوب چاندی ہوتی تھی۔ کچھ دن کے بعد ریگ صاحب، مرزا غلام محمد ریگ، خواجہ غلام احمد عثمانی، مولوی محمد اکبر، خواجہ حبیب اللہ زنگر اور خواجہ علی شاہ کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ مکان کے ارد گرد خادار تار کا جنگل لگا دیا گیا اور منٹرل ریزرو پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا مگر ہم قید میں ہونے کیلئے دن کا نئے رہے۔

ایک دفعہ میرا فرزند فاروق پھنے پھرانے کپڑوں میں مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور نہایت بے چارگی کے عالم میں کہنے لگا ”پاپا! ہم کیا کریں؟“ میں نے جواباً کہا کہ اگر شہزادہ پاپا کسی حادثے میں کام آجائے تو تم کیا کرتے؟“ اس نے کہا ”پھر خدا پر بھروسہ کرتے؟“ میں نے کہا کہ آج بھی وہی خدا ہے۔ وہی تمھاری مشکلات آسان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اسی کی طرف لوگوں کو اور یہ نیکر مندی چھوڑ دو۔

اسیر بے تقصیر

نظر بندی کیسے میں ہم اپنے عوام سے دور اپنے گھر سے دور بلکہ دنیا و جہاں سے دور مظلومیت کے دن کاٹ رہے تھے۔ لیکن بھلا یہ بات بھی صاحبانِ اقتدار کو کہاں گوارا ہوئی۔ انھوں نے وہاں بھی ہماری نیند پر حرام کرنے کی ٹھکانی۔ مرزا غلام محمد بیگ پر گوارا پر پڑوسو سوائی انتہائی ناگ میں خرد و زور کرنے کے الزام لگا کر ان کے خلاف خواہر جہدک شاہ نقشبندی سیسٹن جج پر مشتعل ایک ایک نفری تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ مرزا غلام محمد بیگ ایک آزمودہ کار شریف اور جوانمرد بہ پیشمن کا نفرتی کارکن تھے۔ راجواڑہ شاہی میں ذلیلار تھے۔ اس لیے ان کے اندر عوام کے ساتھ آنکھیں میٹھنے، عین دین اور اہد بیت کرنے کا بڑا سلیقہ موجود تھا بے چارے بڑے پریشان ہو گئے اور اذیت کا جواب لکھنے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ہماری موجودگی ان کے لیے کافی حوصلے کا باعث بنی یہ سب کاروائی انتقامی جذبے کے تحت کی گئی تھی اور اس کا مقصد مرزا صاحب پر دباؤ ڈالنا تھا۔ لیکن جج نے ان کو بری کر دیا اور اس طرح بخشی مراد بیگ دراصل ایک جیل میں ہم اپنا وقت پڑھنے لکھنے، دوست احباب کے خطوط کا جواب لکھنے یا

کھیل کود میں گذرتے تھے۔ جیل کے اندر آنے یا باہر جانے کے وقت سخت تلاشی کی جاتی تھی۔ میرے دولڑکے فاروق اور مصطفیٰ بچے پور میڈیکل کالج میں تربیت حاصل کرنے کے لیے داخل ہو چکے تھے۔ انھوں نے جس ناسازگار اور ناموافق فضا میں اپنی تعلیم پوری کی وہ بھی ایک مذکورہ بھری داستان ہے۔ ہر کوئی ان کی طرف انگلیاں اٹھاتا تھا۔ ایک دفعہ تعطیلات پر فاروق گھر جاتے ہوئے گدے گذرے اور ملاقات کے لیے گدے سب جیل کا رخ کیا۔ پچارے کی تلاش اس سختی سے کی گئی کہ اس کے چمکے چھوٹ گئے۔ اس کے پاس کالٹ کپیلے کی کچھ گیندیں تھیں۔ تلاشی لینے والوں نے اس شک کا اظہار کیا کہ یہ ہم کے گویے ہیں۔ فاروق نے بڑی کوشش کی کہ جیل کے دروازہ پر اصل کیفیت کھل جائے۔ لیکن وہ رٹ لگاتے رہے کہ یہ ہم ہیں۔ اس پر فاروق نے کہا کہ ان کے دو چمکے کر دو تو تمہیں اصلیت معلوم ہو جائے گی۔ آخر خدا خدا کر کے اس کو اندر آنے دیا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگی ہوئی تھی۔ اس نے یہ ماجرا ہمیں سنایا تو شفقت پوری نے جوش مارا۔ ہم نے کیسپ کے افسران کو ملی کئی سنائی اور بدبختی جی کے نام ایک احتجاجی تار بھی روانہ کیا۔ راتوں رات کیسپ میں تحقیق ہوئی۔ آرپی کی ٹکڑی کو بدل دیا گیا اور نئی ٹکڑی بگداشت کے لیے آگئی۔ ظاہر ہے کہ بدبختی جی ہمیں تنگیت میں نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مقامی صوبیداروں یعنی بخش اور ان کے ساتھیوں کی پالیسی بہت ہی انتقامانہ تھی۔

مشیر کے عوام میں بس تو کر دیے گئے تھے۔ لیکن میری یاد ان کے دلوں سے کسی طرح نہ ہوتی تھی وہ ہمارے لیے تڑپ رہے تھے اور بخشی صاحب اور ان کے ساتھی یہ کہہ کر ان کے زعموں پر تنک چڑھ چکے تھے کہ اب شیخ عبد اللہ اور اس کے ساتھیوں کو قیامت کے روز بھی دیکھ پاؤ گے۔ یہ لوگ طاقت کے نشے میں بدست تھے کہ جن ہمدردوں

پر انھوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے وہاں سے انھیں کوئی نہیں ہٹا سکتا لیکن بعض مآتب کو یہ رقم تاریخ کے اس خندہ زرباب کا کیا علم تھا جو مستقبل کے طعن میں پوشیدہ تھا انھیں کیا معلوم تھا کہ وقت آنے والا ہے جب انھیں کے ساتھ انھیں گرفتار کر کے انھیں اسی جگہ پر پہنچا دیں گے جہاں انھوں نے اپنے تمس اور مرنے کو پہنچا دیا تھا اور جن بد عنوانیوں کا اِزام وہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر تحویپ رہے تھے اُن سے بدرجہا بدتر بد عنوانیاں اُن کے ساتھ ہر چیکادی جائیں گی۔ بعد میں انھیں بد عنوانیوں کی جواب دہی کے لیے ایک ٹیکر کمیشن کے سامنے کھڑے میں کھڑا ہونا پڑا اور اپنے گناہوں کا حساب چکانا پڑا۔ شائد ایسے ہی موقع کے لیے غالب نے کہا تھا

راک ایک قطرہ کا مجھے دینا بڑا حساب

خون جگر و دلت بڑگان یار تھا

انسانی فطرت کی مہوہ سامانیاں اور بوجھیاں کیا خلوت کیا جلوت اور کیا آزادی و کیا اسیری ہر جگہ اپنی پتلیوں جھڑتی رہتی ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں بیچ تڑکے گدگپ کے تار کے جھکے کے ساتھ ساتھ ٹھیل رہا تھا میں نے جھکے سے باہر بہہ دینے والے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی کو اپنے آستار سے سبق لیتے ہوئے دیکھا۔ مجھے بھی کچھ دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میں نے چپ چاپ کھینچنے کی کوشش کی کہ آستار اُن کو کیا درس دے رہا ہے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے شکار آستار سپاہیوں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف خوب زہر بھرا رہے تھے اور تاریخ کی ماہیں توڑ رہے تھے۔ وہ انھیں بتا رہے تھے کہ کس طرح محمود غزنوی نے سو مناتہ اور دوسرے ہندوستانی مفردوں کو لوٹا اور مساکروا۔ اور لگ بھگ سب نے ہندوؤں پر کیا کیا ستم توڑے۔ علیٰ غلظت القیاسی ظاہر ہے کہ جن سپاہیوں کو بے گناہ شہریوں کی عزت و عصمت، جان و مال

کی حفاظت کے لیے بھرتی کیا گیا ہو، اُن کے دلوں میں جب یہ آتش گیر مادہ بھردیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے چنانچہ اس عاقبت اندیشی کے عواقب سارے ملک میں نظر آ رہے ہیں۔ جن سنگھ اور آ۔ ایس۔ ایس نے منظم طریقے سے نظم و نسق کے ہر شعبے میں اپنے آدمیوں کی دہاندازی کی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر ب۔ ا۔ ایس۔ ایف، سی۔ آر۔ پی اور فوج ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ بہر کیف۔ میں کچھ دیر بعد دوسرے مستند راہ اور دل ویل میں سوچا رہا کہ میں ملک میں ایسے مکتب اور ایسے مظلوم وجود ہوں وہاں بچوں کا کام تمام نہ ہو گا تو راہ کیا ہو گا؟

ایک دفعہ ہم کیمپ میں بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی گپ بانگ رہے تھے کہ پنڈت کیشب بندھوجی بوسے کہ بخشی حکومت نے خوراک پر سبڈری، پونڈری سبڈنگ مفت تعلیم اور دوسرے عوامی بہبودی کے اقدامات کا جو اعلان کیا ہے اس سے ہمدردی جماعت کو کافی نقصان پہنچے گا اور لوگ شاید نہیں بھول جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ شائد وقتی طور پر ایسا ہو لیکن ان اقدامات سے آئندہ جب ریاست کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس وقت لوگوں کو یاد آئے گا کہ ان معاملات کے بارے میں ہمارا وقت کتنا صحیح تھا۔ کسی قوم کے خمیر کو ان شہدہ بازیوں سے خریدنے کے طریقے اگرچہ جیسے ملک میں ناکام رہے ہیں تو یہاں بھی اُن کی ناکامی کی پیش گوئی کرنا مشکل نہیں۔ کسی قوم میں مفت خوری کی معنی عادت ڈال دی جائے اس کا دست سوال اُسی قدر دراز ہوتا جائے گا۔ وہ خود رزق حلال کمانے سے عار کرے گی۔ اور بالآخر یہ سارا بوجھ مرکز کو اٹھانا پڑے گا۔ یہ مانی بوجھ چونکہ سال بہ سال وزن میں بھاری سے بھاری ہوتا جائے گا۔ اس لیے مرکز کی گردن بھی اس کے وزن سے ٹھکنے چلی جائے گی۔ بالآخر مرکز اس کو اتنی کی لپٹ جان کر اپنے آپ کو اس کے پھندے سے آزاد کرنے کی کوشش کرے گا اور لوگ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اسی طرح اعلیٰ

سلطنت مفت تعلیم کے جو نتائج میسر تعلیم کے زوال اور تعلیم یافتہ بے روزگاری کی صورت میں برآمد ہوں گے وہ بھی اودھم مچا دیں گے۔ ہمیں صبر و تحمل سے کام لے کر حالات پر نظر رکھنا ہوگی۔ تاریخ گواہ ہے کہ زیادہ دیر نہیں گذری جب کہ یہ حالات پیش آنے لگے اور ریاست کی کئی اقتصادی اور اخلاقی بحران کی طوفانی لہروں پر ڈولنے لگی۔

گدگد میں جسے تہمت سے دوستوں کے غلط مزاج اور موصول ہوتے تھے میں نے ان کے جوابات بھی لکھے جن میں سے بعض ایک مجموعے کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ تحریک کے واقعات کو قلم بند کرنے کا خیال بھی مجھے آیا۔ چنانچہ میں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کئی نوٹ بک بھی لکھوائے۔ غلام ٹکڑا و میری زبان سے واقعات سن کر قلمبند کرتے تھے۔ لیکن شہ ۱۹۱۹ء میں جب مجھے چند ہفتوں کے لیے رہا گیا تو یہ سارے نوٹ صبح پوس کی چہرہ دستیوں کی نذر ہو گئے۔

شہ ۱۹۲۰ء میں تحریک آزادی سے قبل میں نے ایک خواب دیکھا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جس کا نتیجہ ظاہر ہونے میں ۳۳ سال کا عرصہ لگا۔ گدگد میں بھی میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا بیاہ کسی ہندو گھرانے کی ایک لڑکی کے ساتھ رہا یا جاتا ہے۔ جب وہیں کوئے کر میں اپنے گھر کی طرف سفر شروع کرتا ہوں تو راستے میں ایک مسٹر منہندو وزیر بیچے رام دان کا مارچ سنٹر میں مجھ میں انتقال ہو گیا (مجھے سے ملتا ہے۔ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ ان کے خاندان کی عورتیں اپنے مکان میں میٹھی ہوتی ہیں اور وہ مجھ کو دیکھنا چاہتی ہیں اور دست بوسی کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے ہر بات کو نیچے انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود اوپر چلا گیا۔ وہاں عورتوں نے ملائی اشرافیوں کا خندان پیش کیا اور میں نیچے چلا آیا کیا دیکھتا ہوں کہ ساری برسات معدہ ذہن کے غائب ہے اور اس بات کا بھی کوئی شرع نہیں کہ انھوں نے کوسا راستہ لیا۔

بہر حال میں نے اکیلے اکیلے سفر شروع کر دیا۔ اور دامن کوہ میں ایک گڈ ٹری پر ڈلک بھرنے لگا۔ اتنے میں کوہ سارے گوریاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں کچھ گھبرانے لگا۔ لیکن پھر خود ہی سوچا کہ شاید کوئی شرکاری اپنا حقوق پورا کر رہا ہے۔ میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں لیکن بات کا کوئی نام و نشان نہیں پاتا آخر یہ گڈ ٹری ایک شاہراہ کے ساتھ گئی۔ شاہراہ پر گاڑی کے سپیروں کے کچھ نشان دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اب میں اصل ڈگر پر آچکا ہوں۔ میں دائیں جانب کو موڑ گیا۔ راستہ کیا دیکھتا ہوں میرا گھر ایک عالی شان محل کی صورت میں کھڑا ہے۔ میری کسی شخص کے ساتھ کو مجھ کو گلی میں اس کو مکان کا غسل خانہ دکھانے کے لیے لے گیا۔ اور شیشے کی طوطا اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہنے لگا کہ یہ شیشہ سونے ریلینڈ سے منگوا یا گیا ہے۔ میں مکان کے دالان سے گذرتا ہوا کمرہ میں گیا۔ ایک کمرے میں، میں نے طلائی کرسیاں بھی ہوئی دیکھیں میں اسے تخت گاہ CROWN CHAMBER سمجھا۔ میں کمرے سے باہر آ رہا تھا کہ مجھے اپنی خوش دامن اپنی طوطا آتی ہوئی دکھائی دیں۔ انھوں نے میرے کانڈے پر ایک نرم و نفیس دوشادہ اوڑھا دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجھے کلام پاک قراوت و خوش الحال کے ساتھ سناتے کے لیے کہا۔ میں نے سورۃ البقرہ کی آخری آیت کریمہ پڑھنے کے ساتھ سنائی اور خود زارو قطار روئے لگا اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا اندازہ شاید مجھ سے بہتر قارئین کرام لگا سکیں گے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میرا خواب بے معنی ہرگز نہیں تھا اور مستقبل کی نشانات بے ہوشے تھا۔

میری خوش دامن میر تقی بیگم ایک پارسا اور فقہ ترین خاتون تھیں۔ وہ ایک نہایت ہی خوش افتاد بی بی تھیں۔ اور ان کی تربیت کا اثر میری بیگم پر بڑا گہرا ہے۔ میری خوش دامن میری امیری کے دوران ہی وہی میں ولی کا دورہ پڑنے سے انتقال

لوگئیں اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے آستانے کے بیرونی احاطے میں مدفون ہیں۔ میں نے جیل سے اُن کے تعویذ و مزار کے لیے اقبال کے چند اشعار بھیجے تھے۔ چنانچہ میری غیر حاضری میں ہی انھیں مرحومہ کی قربت پر سنگ مرمر کی ایک تختی پر کندہ کر کے نصب کر دیا گیا۔

میں نے جیل میں مرقبیاں بھیجی و غیرہ پائے کا جڑ بھیجی کیا۔ وہاں بہت گھاس اُگتی تھی۔ اور جانوروں کی افزائش بہت آسانی سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بہت جلد اُن پیارے پیارے بے زنبالوں کا ایک پورا کنبہ میرے ارد گرد جمع ہو گیا۔ جن سے میں جی بہلا کر بچتا۔ بعد میں کچھ رہائی کے وقت اپنے ساتھ لے آیا۔

محلی حکومت آئینی اور قانونی لحاظ سے ایک ناجائز اولاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا جنم اور اس کی پرورش گناہ اور رازداری کے ایسی ماحول میں ہوئی اور ہندوستان کو اس ایک جھوٹ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے کتنی ہی کذب بیانیات کرنا پڑیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ میرے چند ساتھیوں کو اصولی معاملات یا پالیسی میں مجھ سے کچھ اختلافات تھے، جس کی اطلاع مجھے ۱۹۵۳ء کی صبح تک نہیں دی گئی۔

تھی تو کہیں کے لیے انھیں مشترکہ قراہ کا سہارا لینا چاہیے تھا۔ جمہوریت میں ایسے مواقع کے لیے باقاعدہ دستور العمل موجود ہے۔ انھیں اپنے جہدوں سے مستغنی ہو جانا چاہیے تھا اور اسمبلی کے اندر میرے خلاف باخاطب عدم اعتماد کی قرارداد پاس کرنا چاہیے تھی۔ اگر اس قسم کی تحریک پاس ہوتی تو دنیا خود جان جاتی کہ میں کتنے پانی میں تھا۔ اور مجھے خود اپنے جہد سے مستغنی ہو جانا پڑتا۔ لیکن پارلیمانی جمہوریت کے ان اصولوں اور ضوابط کو شکرا گیا اور صدر ریاست نے کسی رسمی اختیار کے بغیر مجھے برخاست کیا۔ بخشی قلام محمد کو وزیر اعظم بنانے کی کاروائی بھی قطعی غیر آئینی تھی۔

اس بحران کے وقت چونکہ یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی کہ کس لیڈر کے ساتھ کتنے ممبران اسمبلی میں اس لیے صدر ریاست کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی حمایت میں اسمبلی کے اندر کتنے لوگ ہیں۔ چنانچہ اُن کے اس اقدام سے فوری طور ظاہر ہو گیا کہ انھوں نے ریاست کے ایک آداؤ آئینی سربراہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مکمل طور پر ساریش کے ایک شریک کار کی طرح عمل کیا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی شک تھا تھا تو وہ ۱۹ اگست ۱۹۵۴ء کو میری گرفتاری کے بعد رفع ہو گیا۔ جب کئی عوام نے بیک آواز نئی حکومت کے ناجائز ہونے کا اعلان کیا اور بے نظیر مظاہروں سے واضح کر دیا کہ وہ جمہوریت کے اس قتل کے سربراہ خلاف ہیں۔ انھوں نے اپنے بے گناہ سینوں کے کوڑ کھولی دیئے۔ اور گولیوں کے سامنے اپنی چھاتیاں تان دیں۔ لیکن دستا پر ثابت کر دیا کہ وہ کس کے حمایتی اور وفادار ہیں۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ حکومت پیدا ہونے ہی اپنی موت آپ مر چکی اور دھڑام سے زمین ہوس ہو چکی ہوئی۔ لیکن فوج سے، آر اے پی، میٹیا اور دوسری مسلح طاقتوں نے اسے تیغ و تفتنگ کی بیساکھیوں سے کھڑا کر رکھا۔

جب ستمبر ۱۹۵۴ء میں میری گرفتاری کے بعد اسمبلی مرتبہ اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا تو اس کا مقصد یہی تھا کہ اُن اقدامات کی توثیق کی جائے جو رات کی تاریکی میں کیے گئے تھے۔ مجھے اپنے حریفوں کی نازک صورت حال کا علم تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ریاست کی یہ دیوار آوازہ حق کی ایک بٹی پکارتے ٹوٹھ جائے گی۔ اس لیے میں نے اسمبلی کے صدر کو ۳۰ ستمبر ۱۹۵۴ء کو حسب ذیل فریقہ بھیجا۔

”معلوم ہوا ہے کہ اسمبلی کا اجلاس ۵ راکٹر کو شروع ہونے والا ہے چونکہ میرے رتبہ اور موقع کے متعلق سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ اس لیے

میں آپ سے اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے حقوق و مراعات کی نگہبانی کا واسطہ دلاتے ہوئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اجلاس میں میری اور باقی نظریہ مند ممبران اسمبلی کی حاضری کے انتظامات کیے جائیں۔

اس کے ساتھ ہی میں نے صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم کی خدمت میں حسب ذیل تار بھیجا۔

”کثیر اسمبلی کا اجلاس ۵ اکتوبر سے شروع ہو رہا ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ اس میں میری پوزیشن اور حیثیت کے بارے میں اہم امور زیر بحث لائے جائیں۔ میں نے سپیکر سے درخواست کی ہے کہ اجلاس میں میری موجودگی کے انتظامات کیے جائیں۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ آپ اپنے مشورے اور رہبری سے اس بات کو ممکن بنائیں۔ جو امور اسمبلی میں زیر بحث آئیں گے وہ آئین اور جمہوریت سے متعلق ہیں اور یہ ساری باتیں پہلے سے آپ کے محبوب مقاصد میں شامل ہیں۔“

لیکن میری ان کوششوں کا نتیجہ معلوم تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ میری موجودگی سے اسمبلی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ اور وہ دوسرا کوئٹہ دکانے کے قابض ذریعہ بن گئے اس لیے انھوں نے انتہائی من مائے طریقے سے میرے مسئلہ حق کو پامال کیا۔ میرے خلاف الجوان سے بڑی خفگی کے ساتھ طرفہ فیصلہ کر دیا گیا اور مجھے اپنے آپ کو نہایت ہی سنگین الزامات کے خلاف دفاع کرنے کا ابتدائی و سانی حق دینے سے بھی صاف انکار کر دیا گیا۔

آزاد ہندوستان کی تاریخ پر ایک دلچسپ اور نگاہ ڈالتے ہوئے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جو روایت اس طرح کا حکم کی گئی تھی اس نے ہندوستان میں جمہوریت کی جامہ داری

کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جس کی پیٹ میں بعد میں ٹھنک کی دوسری ریاستیں بلکہ خود مرکز بھی آگیا۔ جس منطق کو مشغلہ میں حق بجانب ٹھہرایا گیا اس نے خود بچھو بوٹی کی طرح پھیل کر ہندوستانی آئین کے ساتھ گھلوا کر سیلابی دروازے کھول دیے۔ جو رہنما مشغلہ میں جمہوریت کے قتل پر مصیبتنا خاموش رہے آخر اس سیلاب کی لہروں میں خود بہہ گئے۔ اور لوگوں کی بات تو رہے دیکھئے خود جواہر لال کو اس جہنم کی سنگینی کا احساس تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے دنیا اور ہندوستان میں جمہوری اعلیٰ قیادت کا جو طلسم قائم کر رکھا تھا اس پر کثیر میں میرے ساتھ روا رکھا گیا رویہ ایک بدنامی کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرواچی کوپال نے ان کی مستند سوچ عری میں جیسے مسز اندرا گاندھی کا راستہ اور اعتبار حاصل ہے، صاف اعزاز کیا ہے کہ یہ بات سہو کے ضمیر میں کانٹنے کی طرح چھوڑ دی تھی، انھوں نے ۱۸ اپریل ۱۹۵۵ء کو مجھے جو خط لکھا اس میں اس بے قراری کا عکس صاف جھلکتا ہے۔

”ہم جو بڑی ذمہ داریوں کے اٹھارے ہیں، کو ہر قسم کی کارفرما قوتوں سے سابقہ چڑتا ہے اور اکثر وہ رہنما کی مرضی کے بغیر اپنی شکیں اختیار کرتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی دنیا میں بڑے بڑے متذہب جو خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک قوم کی تقدیر پر قابض کر لیتے ہیں، اپنے سے بڑی کارفرما طاقتوں کے تحریروں سے تنگ کی طرح ادھر سے ادھر پھرتے ہیں۔“

یہاں پر ہمیں پھر تاریخ کی طوفانِ راحت کر کے دیکھنا پڑے گا کہ دینی کے کسی ملکران کی کثیر کے ساتھ یہ پہلی دشمنی و شواہس گمات نہیں تھی اور تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ اگر اعظم جیسے اولو اعظم شہنشاہ نے مشغلہ میں اسی طرح یہاں کے آخری خود مختار شہنشاہ یوسف شاہ جک کو ہیکر دے کر دہلی بگایا اور وہاں اسے تمام

اخلاق و آداب کی غلامت درزی کرتے ہوئے نظر بند کر دیا۔ افسوس فرمادی کہ انڈیا کے مشہور مصنف و نثریست کو رکھنا پڑا کہ یہ اکبر اعظم کے دامن پر ایک بہت بڑا دانہ ہے۔ بہر کیف کبھی حکومت نے اب زرد و ہوا پر اور تیغ و شمشیر کے امتزاج سے کشمیر میں قبرستان کی سی خاموشی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور ہندوستان جلد از جلد ادغام اور انضمام کے معاملے کو اُٹے سے جانا چاہتا تھا۔ میں اُن کے راستے کا بڑا پیروں تھا۔ اس لیے جب میں بہت گیا تو اب اس کام میں دیر کیوں ہوتی؟ پھر روس کے کرپوٹ اور بیکٹان نے ہندوستان کی کشمیر کے معاملے میں سرنگور اکرمیہ محو کی تھی۔ لہذا آئین سازی کے کام میں فریاد شہادت تعمیل کا عمل شروع کر دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ آئین ساز اسمبلی کے تمام ممبروں کو حیل خانوں سے ربا کر دیا گیا۔ ایک میں تھا کہ جسے ربا کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ ربا شدگان میں مرزا محمد افضل بھی ایک شامل تھے۔ میں نے آئین ساز اسمبلی کے صدر غلام محمد مصدق کو پھر لکھا کہ وہ مناسب جمہوری ماحول کی بھائی کے بغیر نہ سنے اہم کام کی تکمیل میں جلدی نہ کریں۔ میں نے انھیں بتایا۔

”وہنا فوتنا اور کا دیکھا جو اخباری اطلاعات ہم تک پہنچتی ہیں اُن سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہت جلد ریاست جموں و کشمیر کے لیے ایک آئین بنانے کے ارادے سے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ٹکایا جا رہا ہے صاف ظاہر ہے کہ ریاست کی تاریخ میں اس اقدام کو ایک خاص اہمیت حاصل رہے گی۔ بنا بریں میں ملک کے دبا سے ہونے لاکھوں لوگوں کی طرف سے اور ساتھ ہی اس عظیم الشان عوامی تحریک کے نام پر جو گذشتہ ایک چوتھائی صدی سے ملتی آئی ہے، اپنے آپ پر فخر سمجھتا ہوں کہ آپ کو ان خطرناک نتائج

سے آگاہ کروں جو آپ کے اس اقدام سے متوقع ہیں۔ اگرچہ اس میں کافی تاخیر ہوئی ہے لیکن مجھے پھر بھی امید ہے کہ آپ جلد بازی سے کام لینے کی پکارتے توقف کریں گے جس سے رائے عامہ کو ملوث بنا ڈالا ہے اور جمہوریت کی صحیح نشوونما کو کافی حد تک نقصان پہنچا پایا ہے۔ میں اس خط میں اُن واقعات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ ریاست کے عوام اس وقت جین حالات سے دوچار ہیں اور ریاست کے اندر جو فضا موجود ہے کیا اُس کے ہوتے ہوئے عوام کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق کسی آئین کی تکمیل کی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے؟“

میں نے صادق صاحب سے درخواست کی کہ میرے جیاد جمہوری حق کے مطابق وہ مجھے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں شمولیت کا موقع فراہم کریں صادق صاحب نے کافی انتظار کے بعد میرے خط کا جواب دیا۔ اور اس دوران وہ دہلی و تھانے تعلیم کی کانفرنس میں شرکت کے بہانے سے بھی گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے خط کا جواب دہلی کے اعلیٰ ایوانوں کے بڑے بڑے شیعہ نویسوں نے تیار کیا تھا اور صادق صاحب نے محض بڑی مہر کی طرح اس پر تالعداری کے ساتھ اپنے دستخط کیے تھے۔ غالب کے اس شعر کے عمل استعمال کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے مگر کوئی غلہ گیر بھی تھا

خط کے جواب کا جواب میں، میں نے ایک اور مکتوب صادق صاحب کی خدمت میں بھیجا جس کا جواب بھی اُن ہی وجوہات کی بنا پر بہت دیر کے بعد معمولی مولیٰ مولیٰ خط و کتابت ایک الگ کتابچے کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ میں نے صادق صاحب کو ایک چٹھی

میں یاد دلایا تھا کہ ان سے بہ حیثیت صدرِ آئین ساز اسمبلی کے کس باوقار طرزِ عمل کی توقع تھی اور انھوں نے کس طرح اپنے جہدے کی توقیر کو مٹی میں ملا دیا۔ میں نے لکھا تھا۔

”مائے دہندگان کے حقوق و مراعات کے نگہبان کی حیثیت سے آپ کے فرائض اور ذمہ داریاں نہایت اہم اور انتہائی نازک تھیں۔ ہر وہ شخص جو اس عہدے پر فائز ہوتا ہے جمہوریت کی تسکین و ابات کے تحت اس کی تقرری کے ساتھ اس کے سارے جماعتی تعلقات ختم متصور ہوتے ہیں اور اس سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ پوری اضیاط سے کام لے کر اپنی فیر جانبداری اور عہدگی کا ثبوت دے کر اقدار اور توازن کی بہتر صورت قائم رکھے۔۔۔۔۔ لیکن کیا آپ نے وراستہ مشاہدہ اور اس کے بعد اپنے فرائض کی انجام دہی اور طرزِ عمل میں اس اونچے معیار کو قائم رکھا یا نہیں؟۔۔۔۔۔

آپ پہلے شخص تھے جس نے میری گرفتاری کے فوراً بعد وراستہ کے اعلان کو برحق و بروقت اور موزون قرار دیا۔ آپ نے یہ بھی اور وہی جانچ کر پر یہ الزامات لگائے کہ میں نے کشمیر کو دوسرا گوریا بنانے کے لیے پھیر ملی طاقتوں سے ساز باز کی۔ آپ نے اس وقت دھکی دی کہ حکومت کے پاس یہ الزامات ثابت کرنے کے لیے ایسی شہادت موجود ہے جس کی تردید نہیں ہو سکتی۔ ان سنگین الزامات کے متعلق آپ کی اس نام نہاد شہادت کو ابھی اب تین سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا لیکن ابھی ان کو دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ اور یہ بات دلچسپی سے غالی نہیں کہ آپ کی اس لمبی چٹھی میں جس کا جواب میں دے رہا ہوں کہیں بھی لوٹ کی طرح رٹی ہوئی اس خیر ملک کے ساتھ سازش کی کہانی کا ذکر تک موجود نہیں۔“

میں نے صادق صاحب کو برسیلی تذکرہ یہ بھی لکھا تھا کہ وراستہ کے بعد ریاست میں جو مظالم روا رکھے گئے ان سے ریاست میں آئین سازی کا سارا ماحول متاثر ہو گیا ہے اور اسمبلی کا متاخذہ کردار ابھی مشکوک بن گیا ہے۔ صادق صاحب نے برسیلی ڈیٹا میں ان مظالم کے وقوع پذیر ہونے سے ہی انکار کر دیا۔

چہ دلاوار است و ذورے کہ بکت چرخ دارد

چنانچہ انھوں نے لکھا کہ ”میں نے کسی جگہ اور کسی موقع پر یہ نہیں دیکھا کہ ہندوستانی فوج کو مظالمین کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔“

ظاہر ہے کہ صادق صاحب متحرک مقامات کی نگہبند کر رہے تھے۔ یہ نظر کا تصور تھا یا ریت کا تصور۔ وہ تو خود وہ جاہلین میں سے تھے لارڈ برڈوڈ کی کتاب ”دو قومیں اور کشمیر“ کا یہ مشاہدہ انھیں یاد دلایا۔

”فوج کی شہادت روک لی گئی تھی اور جوانوں کو خبردار ہو کر رہنے کی ہدایت ملی تھی۔ سرگرمی کے بازاروں میں وراستہ کی شمع سے ہی ٹینک دکھائی دیئے اور علاقے کے مختلف نمایاں اور مرکزی مقامات پر شہریت یافتہ گورکھا بتائین کو مامور کیا گیا تھا۔“

چنانچہ میں نے صادق صاحب کو لکھا۔

”آپ تھیں لیکن دولا نا چاہتے ہیں کہ آپ نے کہیں بھی کسی موقع پر ہندوستانی فوج کے جوانوں کو فسادات کے لیے استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔ میں آپ سے یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ انھیں کیوں نہ دیکھ سکے۔ لیکن میرے لیے مشکل ہے کہ میں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کروں۔ مجھے تب خبر نہار کیا گیا تھا کہ ایوانِ چھاؤنی سے احمد پور نظر ہندی کیپ تک میرے ساتھ پورے طور پر مسلح

ہندوستانی فوج کا ایک بھاری دستہ تھا۔

بہر کیف، صادق صاحب اور ان کے آقاؤں سے حقائق کا کیا جواب بنتا وہ
ادھر ادھر کے مسائل کا گریڈ کرکھٹا سمجھتے کہتے رہے چنانچہ میں نے ان سے مقابلہ کیا کہ

”موجودہ حکومت اور اسمبلی کے اندر آپ کی پارٹی نے ممکن طور پر راستے
دہندگان کا اعتماد کھو ڈالا ہے اور وہ بھی صورت میں عوام کی سیاسی
اقتصادی خواہشات یا تہنوں کی غماندگی نہیں کرتے اس لیے آپ کو
کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ عوام پر کوئی آئین ٹھوس دیں..... لیکن اس
کے باوجود آپ اپنے ارادوں پر بغیر آپ کے لیے داعیہ فطریہ یہ
ہے کہ آپ اسمبلی سے مستعفی ہو جائیں اور ممکن طور پر آزادانہ فضا میں غیر
جانبدارانہ اتہام سے راستے دہندگان کا دوٹو حاصل کریں اور اس طرح
وٹیا کو اپنی نمائندہ حیثیت کا ثبوت دیں۔“

میں نے ان سے یہ گزارش بھی کی تھی کہ مجھے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں
شمولیت کا موقع دیا جائے۔ لیکن ان کے جمہوری ضمیر نے دم توڑ دیا تھا۔ دوران جائز
اور معقول گفتارشات کو نظر انداز کر گئے۔ بھلا جو حکومت الیوان کے قائد اور وزیر اعظم
کو اپنی بے گناہی کی وضاحت میں دو لفظ بولنے کی اجازت دینے سے انکار کر دے اس کے میروں
سے مستعفی ہونے کی کیسے توقع رکھی جاسکتی تھی۔ بعد میں جی۔ ایس۔ ملک نے اپنی کتاب
”نہرو کے ساتھ میرے سال“ میں یہ بے بنیاد دعویٰ کیا کہ آئین ساز اسمبلی کے صدر کی
حیثیت سے غلام محمد صادق مجھ سے آئین ساز اسمبلی کے زیر غور مسائل کے سلسلے میں
جو میں میں بیٹے تھے حقیقت یہ ہے کہ انھیں نہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ حرکت

جی۔ ایس۔ ملک صفحہ ۶۶۵

لیکن میرے ساتھیوں کی جبل سے رہائی سے قبل ہم نے آئین کے پروگرام کے متعلق
آپس میں مشاورت کی۔

پارٹیشن کانفرنس پر بخشی گروپ نے ممکن طور پر قبضہ فاصلا دیا گیا تھا
ہمارے ہمدرد کارکن کسی نام کا ڈھانچہ کھڑا کر کے منظم ہونا چاہتے تھے اور تحریک
کو آگے لے جانا چاہتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ تحریک کا کس نام سے اسباب کیا جائے؟
میری ذاتی رائے تھی کہ ہمیں نیشنل کانفرنس کی وراثت سے دستبردار نہیں ہونا
چاہیے۔ کیا ہوا اگر چند خاصوں نے توپ و تفنگ کے ساتھ اس پر اور اس کے
اداروں مثلاً قیام پتھر اور اخبار ”خدمت“ وغیرہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ نیشنل کانفرنس
کا ماضی شاندار رہا ہے اور اس کے کارنامے بھی قابل فخر ہیں۔ ہمیں اس ساری
میراث کو قابضوں کے سپرد کر کے تماشائی بن کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ لیکن نیشنل
کانفرنس میں جو رابطہ جھڑپ سے دوچار ہوئی تھی اس سے اس کی سالک عوام میں
کافی گرہ لگی تھی۔ اس لیے میری بات نہیں مانی گئی۔ اور بیگ صاحب نے اپنی پہلی
رہائی کے دوران وزارت مشغول کو مفاہراتے شادی کے قیام کا اعلان
کر دیا۔ اس پر رہنماؤں کا اجماع ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ میرے عزیز ساتھیوں
نے جو بدعہدی کی تھی اس نے مجھے اتنا دل برداشتہ کر دیا تھا کہ کسی تنظیم کے
ساتھ براہ راست متسلک ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس لیے میں اس نئی تنظیم
سے رسمی طور پر الگ ہی رہا۔ اگرچہ میری سیاسی اور اخلاقی تائید و حمایت اس
کے ساتھ تھی۔ بیگ صاحب نے سرنگر کے ایک جلسے میں اس کا اعلان کیا اور
خود اس کے بانی صدر بن بیٹھے۔

آئین ساز اسمبلی میں بیگ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے آئین سازی کے

کام کو ہاتھ میں لینے کے لیے کچھ مہلت مانگی، لیکن سکرن پارٹی دہلی کی لاشی سے اپنی جاری سٹی اور تعین میں تھی۔ اس پر بیگ صاحب اور اس کے گروپ نے اسٹی کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ بیگ صاحب سرنگر سے اپنے آبائی گھر اسلام آباد واپس جا رہے تھے کہ انھیں لیڈ پورہ کے قریب گرفتار کیا گیا۔ اس طرح وہ رہائی کے شیک پانچویں روز وہیں پہنچے جہاں سے انھیں جھڑ گیا تھا۔ انھیں فوراً گد سب جیل بھیجا گیا۔ ان کے گروپ کے باقی ارکان بھی قید کر دیے گئے۔

بیگ صاحب کے ساتھ بخشی صاحب کی رفایت ان کی سیاسی رفاقت کے آغاز سے ہی شروع ہوئی تھی۔ دونوں اپنی اپنی خوبیاں رکھتے تھے۔ اور دونوں کے اوصاف تحریک کے مختلف پہلوؤں میں الگ الگ طور پر چمکتے اور اثاثہ ثابت ہوتے تھے۔ بخشی صاحب ایک مابہ متعین تھے اور ان کی تبلیغی صلاحیتوں سے جماعت کو بڑی تقویت ملی تھی۔ انھیں عوام کی نفسیات پر گہرا عبور حاصل تھا اور مکی تعلیم کی کمی کے باوجود عوامی تعلقات میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا وہ بے پناہ حافظے کے مالک بھی تھے۔ اور اس سے ان کی شخصیت میں ایک گہرائی پیدا ہو گئی تھی۔ مرزا محمد افضل بیگ ایک مابہ قانون دان ہیں۔ اور ان کی قانونی موشگافیوں اور کلمہ دائیوں سے بھی تحریک کو کافی فائدہ ملا۔ وہ اپنے مشابہ میں ایک اعلیٰ پایے کے پارلیمنٹریں تھے۔ اور انھوں نے کچھ اہم پارلیمانی معرکے کرے۔ ان کی جذبہ قربانی بھی تھا۔ اور وہ مالیات اور دیگر شعبوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے دونوں دوسری اہم ترین پوزیشن حاصل کرنے کی کمک دود میں رہتے تھے اور ایک دوسرے سے چٹک رکھتے تھے۔ دونوں کے دلوں میں زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ بھی موجزن تھا۔ دونوں کے خاندان وسیع تھے۔ جو اپنی ان سرخیں ہستیوں کے

منصب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب کو میں نے اپنا نائب وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ بیگ صاحب اور ان کا کتبہ یہ سمجھتے تھے کہ تبلیغی قابلیت اور قربانیوں کے دیکاروں کی حیثیت سے یہ دراصل بیگ صاحب کا حق تھا۔ بخشی صاحب کو بیگ صاحب کے ان احساسات کا علم تھا۔ اور اس لیے وہ ان کو اپنے عزائم کی شاہراہ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ بخشی صاحب کو سیاست میں کوئی اخلاقی مصلحت پریشان نہیں کرتی تھی اور وہ اس مشہور مقولے کے قائل تھے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جاتا رہے۔ اور اگرچہ بڑے دیکے نہیں تھے لیکن ان کی ذہنی ماسحت چانگیہ کے بے رحم سیاست کار کے قالب میں ڈھلی تھی اور چانگیہ سیاسی حریفوں کو قتل اور زہر سے پشانے کا اساطیلہ فوری دائر کرنا ہے۔ چنانچہ بخشی صاحب نے بیگ صاحب کو کوئی بار جان نقصان بھی پہنچانا چاہا۔ ایک دفعہ جب بیگ صاحب ہمارے ایک مشتہر کہ دوست لکھن پال کے ساتھ کار میں اسلام آباد سے سرنگر آرہے تھے تو لیڈ پور کی چڑھائی پر ایک تیز رفتار ٹرک اچانک ان کی کار سے جا ٹکرایا۔ یہ کوئی اتفاقیہ بات نہ تھی بلکہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ لیکن جسے اندر رکھے اسے کون سمجھے۔ بیگ صاحب اور ان کے ساتھی ہال ہال بچ نکلے۔ البتہ کار تباہ ہو کر رہ گئی۔ دوسرا قاتلانہ حملہ ان پر اسلام آباد میں ہی ہوا لیکن یہاں بھی وہ بچ نکلے۔ گد میں ڈاکٹر گنجیو ہمارے داروہ جیل تھے۔ انھوں نے بیگ صاحب کو اس خونخاک مارے آگاہ کیا کہ بخشی صاحب نے انھیں ڈاکٹر گنجیو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ بیگ صاحب کو دینے والی دوا بیوں میں کوئی ایسی دوا شامل رکھیں جس سے بیگ صاحب آہستہ آہستہ ملک عدم کی طرف گمراہ ہو جائیں۔

لیکن موت و حیات کے معاملے قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ اس لیے
انسانی ارادے یہاں بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سطور کی تحسیر کے وقت
مشرق کی سازش کے اہم ستون بخش صاحب، صادق صاحب اور ڈرگاہ پرست اور
کب کے منزل عدم تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن بیگ صاحب ابھی فضل ازدی سے
زندہ و سلامت ہیں۔

▲▲▲

(۵۶)

روسی ریچھ کشمیر میں

گدیں ہم نظر بندی کے دن گزارتے رہے کیچ کلڈرٹھ کے ذریعے مفاہمت
کا راستہ ہموار کرنے کی کوشش ہوتی رہیں۔ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت
نہیں تھا کہ اس کے پیچھے دہلی کا ہاتھ تھا یا وہ خود ایسا چاہتے تھے۔ لیکن کوشش ضرور
جاری رہی۔ جواہر لال ایک عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ یاروں کے
پارٹے لیکن ساتھ ہی ساتھ کان کے کچے بھی تھے۔ جواہر لال کی شخصیت خود ان کے
کہنے کے مطابق دہری شخصیت (SPLIT PERSONALITY) تھی۔ نظریاتی طور پر
وہ جمہوریت پسند اور روشن خیال تھے اور بائیں بازو کی طرف ان کا واضح رجحان
تھا۔ وہ یوں تو فیصلہ کن موسائی کے نظریات سے ہم آہنگ تھے مگر گیتن کے عملی
تجربات کو پسند کرتے تھے۔ الفرین ان کے تصور پرست ذہن نے سوشلزم اور
جمہوریت کا ایک عجیب آمیزہ تیار کیا تھا۔ جس کی روپ رکھیا پر گاندھی واد کا اثر اس
سہلی ساتھ تھا۔ ان کی تربیت رئیسانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ خوشامد سے
متاثر ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر اگر کوئی شخص ان کے مزاج میں وضع ہو کر باحواط

قسم کی ذہانت آمیز خوشامد کرتا تو نہر و بہت لطف اندوز ہوتے تھے، انھوں نے ساری
 عمر اس قسم کے مصائبوں کو اپنے ارد گرد رکھا۔ وہ شعر فہم اور کتب میں بھی تھے۔ لیکن
 ان کے مزاج میں اوجہ کو بھی داخل تھا۔ وہ اختلاف رائے کو طبعاً پسند نہیں کرتے تھے۔
 کئی ایسے مواقع آئے جب میں نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو آشکار دیکھا۔ ایک دفعہ
 میں الہ آباد میں ان کے والد کے بنائے ہوئے مشہور آئند بھون میں ان سے ملے گیا
 لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر دتھی۔ بی۔ بی۔ کمری بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ پروفیسر
 دتھی ایک اعلیٰ پایہ کے دانشور تھے۔ دونوں کسی مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ کہ
 پروفیسر صاحب نے جو بات کہل سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
 جو اہل آلائش بازی کی طرح بھوک اٹھے اور انھوں نے اس قدر شرس زبان میں
 پروفیسر کو ڈانٹا کہ خود میں عرق انفعال میں ڈوب گیا۔ جو اہل لال کے منہ میں چلائے
 چلائے تھا اچھا بھرا اور کہنے لگے "یہ سب بکواس ہے، بالکل بکواس" ERRANT
 NONSENSE " کہتے کہتے وہ منٹھیاں بیچنے لگے۔ پروفیسر بچارہ ہکا بکا رہ گیا
 اور پچھلی پچھلی آنکھوں سے جو اہل لال کو دیکھنے لگا۔ لیکن جو اہل لال کا فتنہ حسب معمول
 جلد ہی اتر گیا۔ اس کے ساتھ انھیں اپنے طرز کلام پر ندامت بھی ہوئی اور انھوں نے
 پروفیسر سے ایسے انداز و ثربانی کے ساتھ معافی مانگی کہ ان پر خواہ مخواہ پیار آنے لگا
 تلاقی ماخات کے طور پر انھوں نے پروفیسر صاحب کی موضوع چاہے سے بھی کی دای
 طرح وہ میری موجودگی میں گوپالا سوامی آئینگر پر ایک دفعہ مساوی کی گفتگو کر گئی
 طرح گرے بھی اور برے بھی۔ گوپالا سوامی نے تجویز پیش کی تھی کہ کشمیر کی آئین ساز
 اسمبل ہند کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی تو شیئی کی قرارداد منظور کرے۔ گوپالا سوامی آئینگر
 جو عمر میں بہتر سے بڑے تھے وزیر اعظم کا یہ جلال دیکھ کر بہت بن کر رہ گئے جو اہل لال

کے مزاج کے اس میلان سے لوگ واقف تھے۔ اس لیے بہت کم اشخاص کو ان کے
 منہ پر ان سے اختلاف کرنے کی ہمت پڑتی تھی۔ بہر کیف میں کہاں سے کہاں نکل آیا۔
 گد سب تیل میں مجھے یہ اٹامہ بھی ملا کہ میں چاہوں تو جو اہل لال خود گد کیس میں
 مجھ سے ملنے کا موقع دکھانے کے لیے کوئی بہانہ اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے من پر
 گہرا سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے آداؤ کی فکر نہیں کی۔ اسی دوران اس وقت کے صدر
 جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد براستہ باہال کشمیر جانے والے تھے۔ مجھ سے پوچھا گیا
 کہ اگر میں چاہوں تو وہ سفر کے دوران کد میں ٹھہریں گے اور مجھ سے ملیں گے۔ لیکن
 میں نے ادب کے ساتھ معاملہ کو ٹال دیا۔ میں ایک ذہنی بیچ و تپ سے گذر رہا تھا۔
 میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ انھیں میری بیٹی میں چھرا گھونپنا تھا سو
 گھونپ چکے۔ انھیں میری کردار کشی کرنی تھی۔ سو اس میں انھوں نے شک کی ساری
 گندگی استعمال کی اب بعد از جنگ داویلا تو بس دی معاملہ ہوا۔ خ
 کی میرے قتل کے بعد اس نے جتنا سے توبہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی کشمیر کی خصوصی حیثیت سے خوش نہ تھے۔ وہ بھی ریاست
 کے ملک کے ساتھ مکمل ادغام کے حامی تھے۔ اگرچہ طبعاً بڑے نیک عظیم اور منکر لہذا راج
 تھے لیکن خیالات میں بے حد قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ سردار پٹیل کے ساتھ
 ان کی گڑھی چھتی تھی۔ لیکن نہر سے بہت کم بنتی تھی۔ چنانچہ سردار کی ہی قوت بازو
 سے وہ صدارت کے راج سنگھاسن پر گند چھینکے۔ میں کامیاب ہوئے۔ ورنہ جو اہل لال
 چکر ورتی راج گوپال اچاریہ کے قتی ہیں تھے۔ جن کے ساتھ ان کی بڑی ذہنی قربت
 تھی۔ لیکن سردار پٹیل بھی میری گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انھوں نے نہرو کی ایک شبیلے دی
 اور راجندر پرشاد صدر بن گئے۔ البتہ نہرو اور ان کے درمیان آخری وقت تک

جیتلش اندر رہی اندر ملگتی رہی اور ہندوؤں کے مشوروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بلکہ انھوں نے صدر جمہوریہ کے منصب کو ہندو دھرم کی رسوم و روایات سے جس طرح جوڑ دیا اس پر ہندوؤں کو ایک نمایاں آئی تھیں۔ راجندر پرشاد کی زندگی میں ہی ہندوؤں نے اپنے پرانے دوست ڈاکٹر راجا کرشنن کو صدر جمہوریہ بنادیا۔ اور ان کے ساتھ ان کی بچی رنجی۔ اگرچہ جینی حملے کے وقت راجا کرشنن ہندو کے گتے نہیں بھیجے تھے۔

دن گذرتے گئے اور بین الاقوامی حالات نے ایک نئی کروٹ لے لی۔ دنیا کی دو بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت روس کی آپسی رقابت تیز ہونے لگی۔ امریکہ کے ذریعہ خارجہ جان فورسٹر ڈس ایک بڑی طاقت و شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے امریکی صدر آئزن ہاور کے اعصاب پر اس قدر غلبہ حاصل کر لیا کہ وہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ انھوں نے خارجی تعلقات میں انتہا پسندی یعنی (BRINK - MANSHIP) کے دشمنان کو اس قدر تقویت دی کہ ان کی پالیسی کی کوئی یہ مشکوک بات بن گئی کہ جو ملک ہمارا دوست نہیں ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔

اس کے برعکس جواہر لال نہرو نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد تاوا پسندی کے اصول پر رکھی تھی۔ اس لیے وہ ان عظیم طاقتوں کے تئیں ہند کی پوزیشن کو توازن برقرار رکھنے کی ڈگری پر گامزن تھے۔ لیکن اس بات سے بھی گھٹنا اور کار نہیں کیا جاسکتا کہ ذہنی طور پر وہ سوشلسٹ ملکوں سے زیادہ قربت محسوس کرتے تھے۔ امریکہ ان کے اس میلان کو پسند نہیں کرتا تھا۔ پاکستان کی بنیاد جو کہ کسی مثبت نظریے کی بجائے نفرت اور رد عمل REACTION پر رکھی گئی تھی لہذا اس کی پالیسی کسی واضح اور جامع اصول کی بجائے اس انداز سے وضع ہوئی تھی کہ ہندوستان کی تاریخ اختیار کرتا ہے، ہندوستان کسی مسئلے کے متعلق جو موقف اختیار کرتا ہے پاکستان تقریباً لازمی طور پر اس کی مخالفت سمت میں دوڑنے لگا۔

اس بین الاقوامی جنگ زد گری میں اُسے امریکہ کے ہندو مخالف رویے میں جانے امان نظر آئی اور ان کو اپنے ساز اور اپنے ذرائع کی جسامت سے جس احساس کمتری اور عدم تحفظ کے جذبے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کو تسکین دینے کے لیے اس نے امریکہ جیسی عظیم طاقت کی چتر چھایا میں پناہ لینے میں قیام پزیر نہ تھی۔ چنانچہ امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں کے ساتھ اس کے کئی فوجی معاہدات طے پائے۔ جن میں سینٹو اور سینٹو نام کے معاہدے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں نے پاکستان کو ایک اور حیثیت میں مبتلا کر دیا۔ یعنی پاکستان کی اس روش سے روس سخت برہم ہو گیا۔ اور اس نے اپنی اس بیزاری کو پورے راز میں رکھنے کی بجائے اسے سر بازار بیان کر دیا۔ کاسب سے فوری اقدام نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اقوام متحدہ میں جہاں مختلف عوامل کے تحت پاکستان کو کشمیر کے مسئلے پر واضح برتری حاصل ہو گئی تھی۔ اور اس نے ہندوستان کا تافیر متنازعہ کر رکھا تھا۔ پانچ واضح طور پر پلٹ گیا۔ روس تو اس وقت تک اقوام متحدہ میں ممان تھپتے بھی نہیں سامنے آتے تھے نہیں۔ کار قیہ اپنا سنے ہوئے تھا۔ گلاب وہ کھٹے ہندوؤں پاکستان کو سبق سکھانے کے لیے آگے آ گیا۔ ہندوستان کے لیے قیہ۔ اللہ دے اور ہندو نے "والی بات تھی۔ اس نے ان حالات سے فائدہ اٹھا لیا اور اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے کو مردو خانے میں رکھنے کی اجازت اس میں سے ہو گئی۔ اور جس سے بھی مارشل اسٹالین کی طلسمی پسندی کو مصداق قرار کیا نہاد سے زیادہ ملکوں کو اپنے اثر و رسوخ میں لانے کی ایک نفیتم مہم شروع کر رہا تھا۔ جو اسٹالین دشمنی DE-STALINATION کا ایک حصہ تھی۔ چنانچہ جواہر لال نہرو کی دعوت پر کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ دیکھ کر کچھ اور روس کے وزیر اعظم کولاخین ہندوستان آ گئے۔ ہندوستان میں روسی رہنماؤں کا نہایت عالی شان میمانے پر سواگت کیا گیا۔ انھیں ملک کے اہم شہروں میں گھمایا گیا۔

جہاں ان کی خوب آؤ بھگت اور خاطر واقع ہوئی۔ ہندوستان اس وقت بین الاقوامی حکمت عملی کے محاذ پر ایک فیصلہ کن کامیابی حاصل کی جب روسی رہنماؤں نے اقوام متحدہ میں مسئلہ کشمیر کی سماعت کو طاق نسیان کی نذر کر کے اور پاکستان اور اس کے اتحادی امریکہ کے رد عمل سے قطعی طور پر بے نیاز ہو کر کشمیر کا دورہ کرنے پر آمادگی ظاہر کرنی پڑی اور وہ دوسرے مسئلہ میں سرنگر آئے۔ ان کا خاص بہار جب آٹوانی کرنے والے حیثیت جہانوں کے حلقے میں دہی سے سرنگر آیا تو یہ آسمانی نظارہ گدگد کپکپ کے اوپر سے بھی گذری۔ اور ہم اپنے قفس سے ان آزاد طائر کو دیکھتے رہے۔ ہندوستان کو ظلم تھا کہ اس دورے کی کامیابی یا ناکامی سے اس کی خارجہ پالیسی کے کچھ امکانات وابستہ ہیں۔ پٹانچر سرنگر میں ان کے استقبال اور پذیرائی کے لیے زبردست کوششیں شروع کی گئیں۔ دوسرے کی برفانی ہواؤں میں رات رات بھر محرائیں بکھری کر دی گئیں۔ دیوار کے سرسبز اور شگلا درخت جنگلوں سے اکھاڑ کر جلوس کی سڑکوں پر ایستادہ کر دیے گئے۔ لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا رہے گئے۔ وادی کے اطراف و اکناف سے مقدس گاڑیوں میں لوگ سرنگر لائے گئے اور انھیں دن بھر کا نقد معاوضہ بھی پیش کیا گیا۔ مہانوں کا درباری جلوس بھی نکلا لایا۔ رات کو سرنگر کی تختہ پہاڑیوں پر چراغاں کرنے پر بے دریغ روپیہ بہا لایا۔ جیسے ڈل میں آتش بازی چھوڑ کر ڈوگرہ زمانے کے ایک رنگیلے صوبیدار کا آرام کی جیسے مقامی لوگ "کچر پہ شروڈ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، یاد تازہ کی گئی۔ مہانوں کو کشمیر کی شہرہ آفاق لٹریٹ خواہنے اور شہر آفتاب بھلانے میں بھی لڑ کر شرکت کیا گیا۔ چنانچہ ایک تقریب میں بخشی خاندان متحدہ نے کچھوٹ کے مندر میں کشمیر کا شہر رشتہ پر غمگین دیا اور اس فوج کو ہندوستان کے شہر ہی ذرائع نے دنیا بھر میں خوب اچھا لالہ پتہ لکھانوں کی حالت اس وقت مشکل خیر بھی بن گئی جب عوام کہیں کشمیر شہر زندہ باد کے نعرے

بلند کر رہے تھے۔ یہ وہ بڑی معصومیت سے کر رہے تھے۔ کیونکہ انھیں تحریک کے آغاز سے ہی اس نعرے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بالآخر شیر گڑھی سرنگر کے باغ میں ایسے کسی جشن تاج پوشی کے سے انداز میں سجایا گیا تھا۔ ایک بڑی تقریب میں انھیں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس موقع پر ریاستی حکمرانوں کے علاوہ مسز اندرا گاندھی بھی اپنے نامور والد کے ذاتی مخالفانہ کی حیثیت سے موجود تھیں۔ دہلی کے حکمرانوں کی دوراندیشی اور سرنگر کے تابعداروں کی خدمت گذاری رنگ لائی اور گیتا کچھوٹ نے روسی زبان میں اپنی تقریر کرتے ہوئے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ روس کشمیر کو ہندوستان کا ٹوٹ انگ سمجھتا ہے۔ "انھوں نے کشمیر لوں کو یہ بھی بتایا کہ روس ان کا اتنا نزدیکی پر دوی ہے کہ اگر انھیں کبھی روس کی امداد کی ضرورت محسوس ہو تو وہ پہاڑ پر چڑھ کر سیٹی بھجائیں۔ ہم فوراً حاضر ہو جائیں گے۔" گیتا کچھوٹ کا یہ اعلان ساری دنیا میں ایک اہم خبر بن گیا۔ دنیا کی ایک عظیم طاقت کے سربراہ کی طرف سے اس قسم کا دو ٹوک اعلان دراصل پاکستان کے مندر پر ایک انتقامی چپت تھی۔ اور اس کی صدائے بازگشت سے ساری دنیا گونج اٹھی۔ بعد میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ پاکستان نے روسی رہنماؤں کو ہندوستان سے واپسی پر پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی، جس کو کچھوٹ نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جب تک پاکستان امریکہ کے ساتھ اپنے فرقی معاہدات کا رشتہ نہیں توڑتا ہم اسے منہ نہیں دلائیں گے۔

روسی رہنماؤں کا یہ دورہ مسئلہ کشمیر کی ہی نہیں بلکہ برصغیر کی سیاسیات میں ایک اہم موڑ کی نشیبت رکھتا ہے۔ اس سے ہند کے ساتھ روس کے اس قریبی تعلق کی بنیاد مستحضر ہو گئی جس نے بعد میں چین کے خلافت ایک نئے عالمی اتحاد کی میزان تیار کی اور امریکہ کے ارادوں کے آگے بھی بندھنا دیا۔ کشمیر کے سوال پر ہندوستان کو

سلاہتی کونسل میں مغربی ملکوں نے کافی پریشان کر رکھا تھا۔ اب اسے ایک اہم عالمی طاقت کی کلمہ کھلا پشت چٹائی حاصل ہوگئی اور جس نے دنیوی نہایت ہی غیر عقلی اور فیسر منصفانہ طاقت کا استعمال کر کے دنیا کی رائے عامہ کو لاجوارہ لے لیا کر دیا۔ حیرت ہے کہ اپنے آپ کو انصاف، جمہوریت اور تہذیب کی طرہ دار کہنے والی بڑی طاقتوں نے دینوکے وحشیانہ اور غیر عقلی ہتھیار کی اختراع کی اور وہ اس کے بل بوتے پر انصاف، عدل اور جمہوریت کا تعلق کرتی رہی ہیں اور پھر بھی اپنے جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ شاید دینوکے ہی غیر عقلی اور نامنصفانہ ہتھیار کا تصور کر کے علامہ آقبال نے لکھا تھا۔ ۷

دیو استبداد جمہوری قبا میں پاسے کو ب

اور انھوں نے جیتے الا قوام پر جو زور دیا پچھتی کسی تھی وہ اقوام متحدہ پر بھی پوری تھی
چسپاں کی جاسکتی ہے ۷

من ازیں ہمیش ندا نم کہ کفن دزدے چند

بہر تقسیم قبور نچنے ساختہ اند

بہر کیف۔ یہ تو ایک جملہ متعرضہ تقابلات روسی لیڈروں کے دورے کی بہری تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دورہ کشمیری عوام کے خلاف نفسیاتی جنگ کا ایک حربہ تھا اور اس کا مقصد انہیں مذہبی طور پر مغلوب اور مرعوب کرنا تھا۔ ماننا چاہیے کہ اس میں جو ہر آلان نہ ہو کسی حد تک کامیابی نصیب ہوگئی اور ہندوستان اپنے ارادوں میں اور زیادہ شیر ہو گیا۔

ہندوستان کے گلے میں حق خود ارادیت کی جو گرہ پھنس کر رہ گئی تھی وہ اسے کسی دیکسی طور پر نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کوئی مناسب حیلہ نہیں مل رہا تھا۔

نہرو نے صرف کشمیر کے عوام کو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے ملکوں کو بار بار یقین دہانیاں کرائی تھیں کہ ہندوستان کشمیر کو جبر نہیں کرنا چاہتا۔ کشمیر میں اس نے صرف اس لیے فوج بھیجی کہ وہاں کے عوام کے حق خود ارادیت کی حفاظت کی جائے اور ان کو آزادانہ رائے شماری کے ذریعہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں یا ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کو یہ بہانہ معاہدہ ۱۹۵۱ء اور دوسرے دفاعی معاہدات میں پاکستان کی شمولیت نے فراہم کر دیا۔ اس میں امریکہ خاص طور پر اس کا حلیف تھا۔ پاکستان کو جب شرط درمیشی موار تو امریکہ نے اسے بیچ منجھدار میں چھوڑ کر اپنا راستہ لیا لیکن فوری طور پر اس کا فائدہ ہندوستان نے اٹھایا۔ روس کی حمایت سے شہد پاکر اس نے اعلان کیا کہ ان دفاعی معاہدات میں پاکستان کی شمولیت نے صورت حال کو اس حد تک تبدیل کر دیا ہے کہ اب ہندوستان کشمیری عوام کے ساتھ اپنے کے ہونے میں الا قوامی وعدوں پر پابند نہیں رہ سکتا۔ یہ عجیب منطق تھی کشمیریوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ لیکن انھیں دوسروں کے گناہوں کے لیے سزا دی جا رہی تھی۔ یعنی بالکل افس کشمیری کا ہواٹ کے منہم کو سچ ثابت کیا جا رہا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ ایک اونٹ نے جنوبی کشمیر کے گاؤں کھٹل میں کپاس پر مٹھ مٹا کیا اور اس کی پاداش میں شمالی کشمیر کے گاؤں کھادان یار میں ایک بولا ہے کہ اس کاٹ لی گئی۔ کیوں کہ کپاس اور بولا کے آپس میں دور کا رشتہ ہوتا ہے۔ پاکستان کے اعمال کی جواز دہ آس مٹی چاہتے تھے لیکن سزا ملی ہے چارے کشمیری عوام کو مٹی میں غول سج ثابت کر دیا گیا۔

بہ جرم تصفیٰ کی سزا ملک مفاعیات

میساکہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے جو ہر آلان منقسم شخصیات رکھتے تھے وہ جمہوری قدروں

کے احترام کے درس دیتے، جب کبھی ان کا خمیر جھاگ رہا ہوتا تو وہ ان قدروں کو پا مال کرنے سے باز رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ان کا یہ خمیر کبھی ارد گرد کی گھریاں سن کر بعض اوقات اٹھ کھڑے گلتا۔ اور اس وقت وہ اپنے مقرر کردہ معیار سے اخوات کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ لیکن ان کے طرز عمل کی ستم تلفی اس سے زیادہ حیرت انگیز تھی۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ میں ان اقوامی صورت حال بدل جانے سے ہندوستان اب ان قوم داریوں اور وعدوں کا پابند نہیں ہے جو میں نے کشمیر کے معاملے میں تسلیم کیے تھے، لیکن انہوں نے دروازے کو بالکل بند بھی نہیں کیا۔ جب ۱۹۴۷ء میں چین نے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوستان کے لیے ایک نہایت نازک صورت حال پیدا کر دی تو پھر کو کچھ پاکستان کی دوستی کا خیال آیا۔ کچھ قوامی سرحدوں پر پاکستان کا دباؤ کم کرنے کے لیے اور کچھ مغربی طاقتوں کے کہنے سننے پر، جو چین کے خلاف ہندوستان کو متشجع کرنے کے لیے سامان حرب و سردہ بھیج رہے تھے، نہ ہونے پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کرنے سے گریز نہیں کیا۔ حالانکہ اس کا اصل مقصد اس مسئلے کو کچھ مغربی طاقتوں کو کھنکھ دینا اور پھر مناسب مرحلے پر اٹھیں اٹھیں دیکھا نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ چینی طے کے وقت پاکستان کی اس کشمیر کے معاملے میں چھوٹ گئی، اور اس کے ساتھ ہی اس نے کشمیر سے ہاتھ دھویا۔ چینی طے کے وقت ہندوستان کے دفاعی انتظامات اور اس سے زیادہ اس کے خوراک کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن صدر پہلے کرتا تو اس کے نتیجے کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن صدر ایوب خان کی کلیل مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں تھی وہ وعدہ فدا کے تصور میں مست رہے۔ ہندوستان نے ابتدا میں بڑی براہ راست شفقت دکھائی۔ مجبوراً اور سوراں سنگھ

نے برطانیہ کے وزیر دفین سٹرنز کی لگائی تجاویز پر طولی مذاکرات کیے، کشمیر کی چناب کی سرحدی لکیر کے مطابق ہندوستان کا سوال بھی بڑی ہی سنجیدگی سے زیر بحث رہا۔ لیکن جو بھی چین کی گرفت و قبضہ پر گئی، ہندوستان نے بھی گفتگو کی میز کو آٹ دیا۔ پاکستان نے کشمیر کا سوال پھر سلامتی کونسل میں اٹھایا۔ اس باروی کے کرکٹ میٹنگ نے ہندوستانی و ندر کی قیادت کی۔ اس نے ہندوستانی موقف کے سلسلے میں سلامتی کونسل کے سامنے ایک لمبی چوڑی تقریر کی، جو اپنی طوالت کے باعث اقوام متحدہ کی کئیوں میں اب بھی ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کرکٹ میٹنگ نے ایک ماہر پینٹر نے بازی طرح ہندوستانی موقف پر اعتراض کرنے والے ممالک کی اپنی کمزوریوں کو آغا کر دیا اور انہیں "وہاں کو ذرا دیکھو ذرا سہ قریب دیکھو" کہہ کر لاکھ لاکھ اپنی گرم گفتگو کی رو میں کرکٹ میٹنگ نے سلامتی کونسل کے پلیٹ فارم پر پہلی بار ہندوستان کے دینے ہوئے تمام قول و قرار کی افشائی کر دی انہوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ بین الاقوامی حالات نے اتنا بڑا پٹلا کھایا ہے کہ ہندوستان کے لیے اپنے وعدوں کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ کرکٹ میٹنگ نے بڑے قدماائی انداز میں تقریر کی۔ اس نے کونسل کے ممبروں کو خوب تشویش دھر ان کے دلائل بھی بڑے کمبوندے تھے اس لیے ان کی تقریر کا بالکل اثر ہوا۔ سلامتی کونسل میں ایک قرار وار پیش ہوئی جس میں ہندوستان کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تھا۔ کونسل کے گیارہویں سے نو ممبروں نے اس کے حق میں ووٹ دیے۔ لیکن روس نے ویٹو کا نصیب گرز دیا اس نے ویٹو کا کرپل بھی پاکستان کے معاملے میں استعمال کیا۔ قرار و پاس ہونے سے پہلے ہی غیر قدرتی موت مرمی۔ کونسل کے ممبران ہاتھ ملنے رہ گئے۔ چنانچہ معاملے کو انعام میں رکھا گیا جہاں یہ آج تک طاقتی نسیان کی زینت بنا ہوا ہے۔

ظالموں کے چھکے چھوٹ گئے

سفرۃ میں مجھے جن حالات میں گرفتار کیا گیا تھا اُس سے ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ کو سخت دھکا لگا تھا۔ لیکن مجھے بغیر مقدمہ چلائے سالہا سال تک نظر بند رکھنے اور اُس کی وجوہات کے بارے میں پُتہ نہ چلنے سے تو ہندوستان کی آبرورہی حوت آگیا۔ اور دنیا بھر میں اُس کے بلند بانگ اخلاقی اور جمہوری وعادی کا بھرم بھی ٹھٹھکا گیا۔ ان دنوں جب بھی جواہر لال نہ ہندوستان کا کوئی اور نمائندہ ملک سے باہر جاتا تو اُن سے ہر جگہ اِس بات کی وضاحت طلب کی جاتی اور اُن کے چہرے پر تجوایاں اُڑنے لگتیں۔ کچھ ایسے بین الاقوامی لیڈر بھی ہندوستان آئے جنہوں نے جواہر لال کو مشورہ دیا کہ اگر وہ دنیا میں ہندوستان کا اخلاقی بھرم بنائے رکھنا چاہتے ہیں تو کشمیر کے نظربندوں کو یا تو رہا کر دیں یا اُن کو عدالت کے سامنے پیش کریں۔ کرشننامینن جب سلامتی کونسل کے اجلاس کے بعد وطن لوٹے تو انہوں نے بھی اِس قسم کے تاثرات ظاہر کئے اور مشورہ دیا کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو باضابطہ فوجداری کیسوں میں نامزد کر کے مقدمات میں الجھا دیا جائے۔ تاکہ ہماری گرفتاری کے بارے میں دنیا کے سامنے کوئی جواز پیش

کیا جاسکے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں بھی پریشان رکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے سلامتی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اِس بات کا اعلان بھی کیا کہ مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر فوجداری کے مقدمات عائد کیے جا رہے ہیں۔ واپس آکر انہوں نے اُن جھوٹے وعادی کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ننگ و دو شروع کر دی۔ اِس تہم کے پہلے حصے کے طور پر ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں پر شعل کشمیری کیٹیاں قایم کی گئیں۔ ان کیٹیاں میں سرکار کے حاشیہ نشین اور متکثر نظر مسلمانوں سے تجاویز پاس کرائی گئیں۔ چین میں ہندوستان کے موقف کی حمایت اور کشمیر کے حالات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ حیرت یہ تھی کہ کشمیر کے حالات کے بارے میں سینکڑوں ہزاروں میل دور رہنے والوں سے جو پہلے ہی اقبیلی ہراس (MINORITY COMPLEX) کے بوجھ کے تلے ہانپ رہے تھے۔ شہادت و لوائی جاری تھی۔ لیکن ہندوستان کو اُس وقت کسی نہ کسی طرح عالمی رائے عامہ کے سامنے اپنا جھوٹا سچا مقدمہ پیش کرنے کی فکر تھی چنانچہ اُن کاروائیوں اور قراردادوں کی خوب تہیہ ریزیڈ اور اخبارات کے ذریعہ کرائی گئی۔ اسس کا مقصد دنیا کو یہ باور کرانا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کشمیر کی پالیسی کے سلسلے میں حکومت ہند کے ہم گواہ ہیں۔ اِس سلسلے میں نکل ہندوستان کے ایک بھاری کالفرنس لکھنؤ میں منعقد کرائی گئی جس میں ہندوستان کے مشتمل ممبران پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے مسلمان ارکان نے شرکت کی۔ اِس کے کرتا و کھاتہ حافظ محمد ابراہیم تھے جو اُس وقت مرکزی کابینہ کے ایک ”مستقوم“ وزیر تھے۔ بخشی غلام محمد اور اس کے کشمیری حواریوں نے اِس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بخشی صاحب کو سرکاری خزانے کی قیمت پر اپنی عنایات خسرواد کی خائشاں کاغوب موقع ملا۔ لیکن یہ بیل بھی منڈے

نہیں چڑھ سکی کہ حبش کی تقدیر ہی میں نگرانی لکھی ہوئی ہے وکل جال الحق وذهق
الباطل انالباطل کانت ذھوقا القرآن

پنٹت جو اہر لال نہرو میری مسلسل نظر بندی سے خوش نہیں تھے۔ لیکن اس
بارے میں کوئی دو ٹوک رویہ اختیار کرنے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ میری نظر بندی
کے دوران انھوں نے کئی بار کشی صاحب کو مجھ پر ہار کرنے کی صلاح دی۔ بخشی جیل
حواسے کر کے یوم صاب کو اتار رہا۔ لیکن جو اہر لال بنیاد طور پر ایک شائستہ آدمی
تھے اور لقبول راج گوبال آچاریہ ہندوستانی رہنماؤں میں سب سے زیادہ مہذب۔
ان کے سینے پر میری بے گناہ قید کا وزن ایک آسیب کی طرح مستوی ہونے لگا۔
انھوں نے ۱۱ جنوری ۱۹۵۷ء کو کرن سنگھ کے نام لکھا۔ جو ان دنوں کشمیر کے معاملوں
میں کافی ذخیل تھا۔

”جہاں تک میرا تعلق ہے میرا کشمیر کسی شخص کو ذریعہ مقدمہ چلائے نظر بند
رکھنے کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ میں نے ماضی میں اس پر اتنی بار اعتراض
کیا ہے کہ میرے اس کو ناپسند کرنے پر کوئی شک نہیں ہوتا چاہئے۔“
اسی سال انھوں نے ۱۵ اگست کو بخشی قلام کو لکھا۔

”یہ نظر بندی مجھے سے خود غلام استحکام کا ایک زبردست سبب بن جائے
گی۔ اور ہمارے خلاف ہند اور ہند سے باہر بڑا ناخوش گواری ہوگا۔
اس کے علاوہ اس کا اثر کشمیر پر بھی کچھ بہت اچھا نہ ہوگا۔“

آخر دسمبر ۱۹۵۷ء میں جو اہر لال میری گرفتاری کے بعد پہلی بار سرنگار آئے
اور وزیر اعظم کی رہائش گاہ میں بخشی قوام نے انھارے ایک جیلے میں تقریر کرتے ہوئے
کہا کہ میں ۱۹۵۷ء کے بعد اسی جیلے میں آیا کیوں کہ مجھے مسیح عبداللہ کی گرفتاری

کا ٹکڑا ہوا تھا۔ اور میں ان کی عدم موجودگی میں کشمیر آنے پر مائل نہیں ہوا تھا۔ انھوں
نے اس جیلے میں میری امرکانی رہائی کا ایک ہلکا سا اشارہ بھی کیا۔ جو اہر لال کے اس
قسم کے بہت سے اشاروں کو بخشی صاحب نے شرائط چالبازی سے ناکام بنایا تھا۔
اس لیے کچھ ہی دن میں یہ بات بھی فراموش ہو گئی۔ ۱۱ جنوری ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ
کشمیر کا سپیکر جنرل پولیس ڈی۔ فوکیو مہرہ اچانک کدیل میں مجھ سے ملنے کے لیے
آیا اور مجھ سے رخصت سفر باندھ لینے کو کہا۔ میں نے وہر پوچی تو کہا کہ آپ کو سرنگریل
میں تبدیل کرنے کے احکامات صادر ہوئے ہیں۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کو
وہاں پہنچاؤں گا ڈری باہر کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ آپ تیار ہو جائیے۔“

میں نے مہرہ کی بات سن کر اسے فوراً بتایا کہ میں قیدی کی حیثیت سے کبھی
بامہال پار نہیں جاؤں گا۔ اگر آپ مجھے کدیل میں نہیں رکھنا چاہتے تو بے شک مجھے صوبہ
جموں کی کسی دوسری جیل میں منتقل کر دیجئے۔ لیکن میں کبھی اس حالت میں کشمیر
نہیں آؤں گا۔ مہرہ صاحب کو اس پر تاؤ آگیا انھوں نے بڑے رعونت آمیز لہجے میں
کہا کہ اگر میں نہ مانوں تو وہ طاقت کے ذریعے اپنے حکم کو عملی جامہ پہنائیں گے۔
میں نے جواباً کہا کہ ”آپ بائیں بھارت استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں میں
اپنی جان دیدوں گا اور آپ میری لاش جو اہر لال تہرہ کو تھکے کے طور پر بھیج سکتے ہیں۔“
مہرہ نے عریضہ جی جنوری کی روٹیاں توڑی تھیں اور ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء بھی متحدہ
ہندو ایسے مستحکم لہجے سے دہرا رہا اور نری سے کہنے لگا کہ سرنگریلے جا کر شاید
مجھے ہار دیا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اگر حکومت نے میری رہائی کا فیصلہ کر لیا ہے تو
مجھ کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ میں خود جانے کا بندوبست کر دوں گا۔ اس وقت شام
کے ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت چل کر آدمی رات
کو کشمیر میں داخل ہونے میں کیا بھید ہے۔ آدمی رات کو گھر پہنچوں گا اور لوگ

مجھ سے ملے آئیں گے۔ سر دی میں پڑوسی عورتیں آئیں گی تو اس غنڈہ گروی کے دور میں کسی کی بے عزتی ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس لیے روانی کا یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ اس بحث بھی میں کافی وقت صرف ہوا۔ مہرہ نے اپنی حکومت سے رابطہ قائم کیا اور انھیں ان حالات سے آگاہ کیا۔ بات جواہر لال نہرو تک پہنچ گئی۔ چنانچہ ان کے کچھ پڑے ہوا کہ مجھے گد میں ہی رہا کر دیا جائے۔ مہرہ سمجھتے تھے کہ بے لے آئے اور کہنے لگے کہ اگر ہم ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں تو ٹرانسپورٹ کا غلط خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ لیکن آپ چونکہ ہمارے ساتھ کشمیر آنا نہیں چاہتے اس لیے آپ کو ٹرانسپورٹ کا خود بندوبست کرنا ہوگا۔ شام ہو چکی تھی۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ میں نے مہرہ صاحب سے کہا کہ گاڑیاں تو آپ ساتھ لے ہی آئے ہیں۔ رات کو انھیں یہیں رہنے دیجئے۔ صبح ہم انہی میں کشمیر چلے جائیں گے۔ لیکن انھوں نے ایک نہ منی۔ میں نے ان سے کہا کہ بصورت دیگر ہمارے لیے پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے۔ کیوں کہ گد میں ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام نہیں۔ لیکن مہرہ صاحب نے معذوری ظاہر کی۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم کو رات بسر کرنے کے لیے سب جیل میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن انھوں نے اس کو بھی نہیں مانا اور کہا کہ ”آپ کا نام آج ہی جیل کے رجسٹروں سے خارج ہونا چاہیے۔ لہذا آپ یہاں سے اسی وقت چلے جاسیے۔“ مہرہ حال ہمارا تمام سامان گد کے ڈاک بیٹنگ میں پہنچا دیا گیا، اور میں خواجہ علی شاہ اور صوفی محمد اکبر کے ساتھ ڈاک بیٹنگ گیا اور یہیں سے مہرہ صاحب بھی فظروں سے واصل ہو گئے۔ شیخ فیروز الدین ہمارے سپرنٹنڈنٹ جیل تھے۔ انھوں نے ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنے میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔ البتہ سفر خرچ کے لیے ہم تین نفوس کو کسی ایک ایک سو روپے دیدیئے۔ اب ہم کہ جن میں ٹرانسپورٹ کا

انتظام کریں تو کیا کریں؟ جنوں میں فون کرنے کی کوشش کی تو منبلی فون کو بند پایا۔ سرنگر کا بھی یہی حال تھا۔ جنوں سرنگر روڈ کو ٹرانسپورٹ کے لیے بند کر دیا گیا۔ مجبوراً ڈاک بیٹنگ میں ہی پڑے رہے۔ ہماری رہائی کی خبر کو دنیا بھر کی نشر گاہوں اور اخبارات نے بڑھ چڑھ کر شائع کیا۔ وہی سے ملک کے اندر اور باہر کے بہت سے ممتاز صحافی اور اخباروں کے ایڈیٹر گد پہنچ گئے۔ اور وہاں ایک بڑی کاغذی فٹن میں، میں نے ان کے سوالات کے جواب دیئے۔ میں نے ان سے کہا کہ ”مجھے نہ تو علم ہے کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اور نہ یہ معلوم ہے کہ مجھے کیوں رہا کر دیا گیا ہے البتہ میں کہہ سکتا ہوں کہ سسٹم میں نے ہندوستان کو نہیں بلکہ ہندوستان نے مجھے دھوکا دیا۔ اور اگر مرکزی حکومت میں تحریک ہے تو وہ میرے خلاف بیرونی طاقتوں سے ساز باز کرنے کے الزام کی غیر جانب دار تحقیقات کر لے“ میں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ ”۱۹۴۷ء میں جب میں نے آزادی کی جدوجہد شروع کی تو ہندوستان کے کچھ حلقوں نے مجھے کفر و فتنہ پرست کہا۔ لیکن مسئلہ میں عین اس وقت جبکہ گورنمنٹ میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم تھا میں نے ثابت کر دکھایا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اب اگرچہ کوئی امتحان آئے تو میں اپنے عمل سے دکھا دوں گا کہ میں ثابت قدم ہوں۔ شیخ عبداللہ اپنے ضمیر کا سودا عہدوں اور روپے کے جھوٹی نہیں کر سکتا اور نہ وہ فوجوں سے ڈرتا ہے۔ وہ صرف خدا کے ساتھ جھجک سکتا ہے۔ وزارت عدلیٰ میرے لیے مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مجھے خود منزل نہیں ہے۔“ میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ ”مجھ پر بیرونی طاقتوں کے ساتھ ساز باز کرنے کے جواز الزامات لگائے گئے ہیں ان کی تحقیقات کی جانی چاہئے۔ اگر آج بھی میں اس الزام میں مقصور وار نہ ہوں تو ہندوستان کے ایک ایک شہری

سے معافی مانگنے پر تیار ہوں۔ ورنہ ہر مسر اقتدار طبقہ پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کردار کشی کی تلافی کرے۔" میں نے فائز شہزاد پاشا اور ملکی جی کی اچانک موت کی تحقیقات اور اصل تجربوں کی نشان دہی کا مطالعہ بھی کر دیا۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ جب شہزادہ میں دوسری جگہوں پر بے گناہ لوگوں کا قتل کیا جا رہا تھا میں نے گاندھی جی کے آدرش کی پیروی کی۔ میں اب بھی اس پر کاربند ہوں۔ گاندھی جی مجھے روشنی کا ایک مینار دکھائی دیتے تھے اور وہی ایک ایسی شخصیت تھے جو سپاٹی اور انہوں کے لیے زندہ رہے اور انہی کے لیے شہید ہو گئے۔ کسی اخبار نویس نے مجھے کہا کہ کرشننا سین نے مساحتی کو مسلل میں کشمیر کے بارے میں جو زبردست بحث کی اُن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ میں ایک وکیل ہوں۔ قانونی طور پر ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ لیکن اگر کشمیر کو قانونی موشگافیوں کے ذریعہ جیتا جاسکتا تو پاکستان کے جو دھری ظفر اللہ خان یہ مہر کہ کب کا سر انجام دے چکے ہوتے۔ کشمیر ایک اصولی اور انسانی مسئلہ ہے اور اس کو اُس روشنی میں دیکھا جانا چاہئے اس لیے کشمیریوں پر یقین کی بجائے گاندھی جی کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور یہ خود شہزادہ دوڑا دوڑا آہنی کے پاس روشنی اور سکون پانے کے لیے گیا۔ ہفتہ اخبار "بلتر" بمبئی کے مدیر روسی کرچیا بھی جو میرے پرانے واقف تھے، آئے۔ انھوں نے مجھے شہزادہ دیا کہ میں کشمیر جانے کی بجائے دہلی کا درس اختیار کروں۔ اور جو ہر کال سے یوں کسی اخبار نویس نے کچھ کہا تو کسی دوسرے نے کچھ اور۔ میں نے اُن سے کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم ایک چھوٹی سی میل سے ٹھیک کر بڑی جیل میں آ گئے ہیں۔ میں نے آئی۔ جی۔ پی۔ کے سلوک کے بارے میں بھی اخبار نویسوں کو انتہائی زیادہ کسی اخبار نویس نے مذاق میں پوچھا کہ اگر ڈاک جیل کے آپ کو تین دن کے بعد جو قاعدہ کے مصلحتی ڈاک بھیجے

میں رہنے کی سب سے زیادہ مدت ہے، نکالا جائے تو آپ کہاں جائیں گے؟ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ گد میں کوئی مسجد نہیں ہے مگر گوردوارہ ساتھ ہی ہے۔ ہم وہاں جا کر پناہ لیں گے۔ گورو کا لنگر تو کسی پر بند نہیں۔ اور اگر اس میں بھی کوئی رکاوٹ آگئی تو میں دونوں بھتاؤں کی طرح پد پتار کرتے ہوئے کشمیر کی طرف چل پڑوں گا۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا اور کا نفرنس خوشگوار ماحول میں ختم ہو گئی۔ لیکن ایک بہت بڑے اخبار "ناؤ آف انڈیا" نے دوسرے دن دو بپا کے ذکر کو اس بات سے جوڑ دیا کہ میرے ذہن میں کٹر کو آؤ اور کرانے کے لیے ایک انقلابی منصوبہ ہے اور میں کشمیر جا کر گاؤں گاؤں گھوم کر لوگوں کو انقلاب پر ابھاروں گا۔ ج

اندھے کو اندھے میں بہت دور کی ٹوٹھی

ہمدی گد میں سے ربانی ایک سو پے مجھے منصوبے کا حصہ تھی۔ موسمِ انتہائی سردی کا تھا۔ جسے کشمیر میں چٹلا کلان کہتے ہیں۔ بخشی صاحب نے ہندوستان کے بہت سے اخبارات کے نمائندوں کو ڈی۔ ڈے (D. DAY) سے پہلے ہی سرنگر بلایا تھا۔ اور ریڈو ہومز میں اُن کے قیام و طعام کے علاوہ ناؤ و نوش کا بھی سہمت اعلیٰ انتظام کر رکھا تھا۔ منصوبے کے تحت ہم کو پولیس کی گمرانی میں سرنگر پہنچا دیا جانا تھا۔ اور وہ بھی شام کے وقت۔ جب لوگ سردی اور اندھے سے بچنے کے لیے اپنے گھروں میں گھس گئے ہوں اور ہمارے استقبال کے لیے کہیں کوئی آواز ہی بلند نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی اجتماع لگ سکے۔ اخبار نویس جب یہ کیفیت دیکھ لیں گے تو خام ہند میں اس خبر کا چرچا کریں گے کہ لوگ ہمیں بھول چکے ہیں۔ اور ہمارے حق میں پانچ سال کی نظر بندی کے بعد زندہ باد کا ایک نعرو بھی نہ لگا۔ لیکن انسان جب اپنی جانوں پر اتار آتا ہے تو وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ منشا نے اپنی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ گد میں ہم اپنی

روز رُکے رہے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہماری سرسنگر واپسی کب ہوگی، اس لیے سری گمر میں رُکے ہوئے انبار نویس تجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ انھوں نے اس شخص کی ہوتی سردی ہی نہ کہ کا رُخ اختیار کیا اور وہاں تجھ سے ملاقات کی۔ دوسرے خدا کا کرنا کیا جو کہ میرا اور زادہ شیخ عبدالرشید کسی کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ وہ بذریعہ موٹر بھرتوں سے سرسنگر کی طرف آ رہا تھا کہ اُدھم چور میں اسے بھی روک دیا گیا۔ لیکن دوسرے دن آئے آگے بڑھنے کی اجازت دیدی گئی۔ لہذا پہنچ کر وہ تجھ سے ملا اور میں نے اسے تاکید کی کہ وہ سرسنگر میں ٹرانسپورٹ کا انتظام کر کے لہذا جھجوا سے شیخ عبدالرشید سرسنگر پہنچا تو اس نے دوسرے دن ہمارے لیے ٹرانسپورٹ بھجوا دیا اور ۱۱ جنوری کو ہم سرسنگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ سنڈل ریزرو پولیس پھیلا دی گئی ہے۔ دکانیں بند ہیں اور لوگوں کو اکٹھا ہونے کی اجازت نہیں۔ خوف و وحشت کی فضا چاروں طرف طاری ہے۔ ہم اسی حال میں سفر کرتے ہوئے بانہال پہنچے۔ وہاں اس خوف و وحشت کے باوجود جو بھی ہمارے آنے کی خبر پھیلی تو جامع مسجد میں ایک بڑا گھنٹا بول گیا۔ میں نے اجتماع سے خطاب بھی کیا۔ اس کے بعد ہم دُور بانہال کو عبور کرنے کے لیے آگے بڑھے جیسے قوت ہو رہا تھا۔ ہم نے رات ویری ناگ کے ڈاک بیگے میں گذارنے کا ہر دگرام بنایا تھا۔ جو بانہال کے اس پار پہاڑ کے وامن میں واقع ہے۔ اتنت ناگ سے کچھ دوست ہماری اگوائی کے لیے آگئے تھے۔ اور ان کے چہرے بٹرسے سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑے سہجے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دوست حاجی غلام محمد کو چاک سے میرے کان میں کہا کہ انھوں نے رات کے کھانے کو انتظام کیا تھا۔ لیکن ڈاک بیگے کے تمام دروازوں کو متعلق کر دیا گیا ہے۔ میں نے قلعے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا

اور کہا کہ موقع پر ہی حالات سے نمٹ لیں گے۔ کچھ دیر کے بعد ہم ویری ناگ کے ڈاک بیگے پر پہنچے۔ میں نے پوچھا تاچہ کی تو ڈاک بیگے کے چوکیدار نے جواب دیا کہ بخشی صاحب کے آدمیوں نے سارا ڈاک بیگہ ریزرو کر لیا ہے اور دروازوں پر تالے لگا کر چلے گئے ہیں۔ تجھے یہ کیونین بہت گھلا اور میں جان گیا کہ بخشی صاحب کے آدمیوں کو تو یہاں رہنے سے کوئی دلچسپی نہیں البتہ وہ ہماری نیندیں حرام کرنے پر تھے ہرے ہیں۔ چنانچہ میں تالے توڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ پیچھے رہیں۔ کیونکہ میں خود تو تالے پاؤں میں جانے کے لیے کربستہ تھا۔ لیکن میں اپنے ساتھیوں کو مبتلائے تعصبات نہیں کروانا چاہتا تھا۔ آخر کار خدا نخواستہ کہ ہم کرون میں داخل ہو گئے۔ حاجی غلام محمد صاحب نے، خدا انھیں کروت کروت جنت نصیب کرے بڑی محنت سے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ اور ہم نے شدید جلاڑے میں کشمیری ضیافتوں کا خوب لطف اٹھایا تا وہ سرسنگر سے بھی کچھ ساتھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے وہاں کے حالات سناتے ہوئے کہا کہ ہر طرف سی۔ آ بی بچا دی گئی ہے اور لوگوں کا گھروں سے نکلنا تک متعلق کر دیا گیا ہے۔ پٹوں اور سڑکوں پر پولیس اور فکڑے تعینات کیے گئے ہیں۔ اور لاروں، بسوں اور تانگوں کی نقل و حرکت میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ تاکہ لوگ ہمارے استقبال کے لیے قلعہ نہ ہو سکیں۔ مولانا محمد حمید مسعودی اور غلام محی الدین ہمدانی بھی سرسنگر سے تشریف لائے۔ مسعودی میں اور اس کے بعد انھوں نے جو رول ادا کیا میں نے اس پر ان کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب میرا غصہ منٹا پڑ گیا تو میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ واقعی اپنے کیے کا پشیمان ہیں تو ہمیں ماضی کے گئے شکلوں کو لپیٹ کر ایک نیا دور قیام پلٹنا چاہیے۔ اور یہ موقع ہے کہ آپ سرسنگر جا کر لوگوں کا حوصلہ اٹھائیں

اور ان کے دلوں میں جاگزیں دہشت کو دور کرنے کی سعی کریں۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ سرینگر کی دو تین گلیاں ملکہوں پر اپنی عمرانی میں عمرانی گھڑی کروادیں اور پھر تمام شہر میں لوگوں کا حوصلہ خود کر آئے گا اور بخشی ٹولے کے یکے کرانے پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے انہیں کچھ اور مشورے بھی دیئے اور وہ واپس سرینگر کی طرف چل پڑے۔

دوسرے دن یعنی ۱۸ جنوری کو ہم ناتھ کے بعد نکلے، جنوری میں عام طوف پر وادی میں موسم امیا اور رہتا ہے مگر اس دن کھل کر دھوپ نکلی ہوئی تھی اور جاڑے کا آسمان کشمیر کی فیروزنی فضا پر کسی اوتی گھینے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہم پہلے دورو پہنچے تو چانک جھنڈوں اور جھاڑیوں سے جیسے لوگ پھوٹ پڑے۔ ڈورویں ۱۵۵۰ میں گولیوں سے ایک درجن سے زیادہ فرزند ان کشمیر کو جام شہادت پلایا گیا تھا۔ ان شہیدوں کو جس جگہ پر دفن کیا گیا تھا۔ اس کا نام و نشان مٹانے کے لیے وہاں ایک پارک ایجاد کی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے یہیں پر عوام سے خطاب کیا۔ میں نے کہا:

”مجھے آپ سے ایک طریق مدت تک بند رکھا گیا۔ ہمارے مخالف گلا پھانڈ پھاڑ کر چلاتے تھے کہ کشمیریوں نے مجھے بھلا دیا ہے لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے لوگوں کو مفت چاول دے کر ان کے دمان کو خرید لیا ہے۔ لیکن میں کہتا تھا کہ میری قوم کو چاول کی خیرات خرید نہیں سکتی۔ آج میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جو تھے آج میں سچا۔ خدا نے پھر ہمیں ایک دوسرے سے ملادیا ہے۔ دہلی کی کوئی طاقت دلوں کے رشتوں کو توڑ نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے نر اور جبر فوج اور لالچ ہر ایک جائز و ناجائز طریقہ استعمال کر کے آپ کے ادھر میرے اس تعلق کو توڑنے کی سرکوشش کی گئی۔ لیکن انہیں نام وادی اور ناکامی کے سوا

کچھ اٹھ نہیں آیا جو لوگ آپ کو ڈراما کی کوشش کرتے ہیں وہ خود مجرور ہیں اور اپنے من کے چور سے کہتے ہوئے ہیں۔ آپ کو ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ سچائی اور نیکی کا شعار اپنائیے۔ پھر آپ کو کوئی طاقت مقرب نہیں کر سکتی۔ آپ نے تھریس اور استبداد دونوں کا مقابلہ جس جگر وادی سے کیا ہے وہ کشمیر کی تاریخ میں شہری حروف سے لکھا جائے گا۔ موزن اس بات کو فخر سے بیان کرے گا کہ جب آپ کے سفیانا جذبات کو ابھارنے کے لیے نہایت کمزور حرکت کی جا رہی تھیں تو آپ نے استقامت اور اصول کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح اپنی اور اپنے وطن کی عزت اور لاق پالائی

یہاں سے انت ناگ کی طرف چلے تو گاؤں گاؤں میں مرد و زن بچے بوڑھے اور جوان سبھی سڑکوں پر آؤند آسے اور بخشی صاحب کی تمام شاہراہ چالیں اکارت ہو گئیں۔ دیار گام کے بڑے جلسے کے بعد انت ناگ میں بہت بڑا اجتماع سما۔ اور مکالموں کی چھتیں تک لوگوں سے اٹھ گئی تھیں۔ یہاں کے مشہور شیر باغ میں جو شیر کشمیر کے لقب کی مناسبت سے چکا رہا جاتا ہے، ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں کا مجمع تھا۔ میں نے یہاں پر بھی تقریر کی اور لوگوں سے کہا کہ میرے قید کیے جانے کے بعد حکومت ہند نے تجویزوں کے ذریعے اور کھول کے منہ کھول دیئے کہ آپ کا رشتہ ہم سے کٹ جائے مگر غرض اور وفا کا رشتہ کتنا مضبوط ہے اس کا اندازہ آج سبھی کو پورا ہے۔ پھر سچ بھارہ، اوتی پورا، پانچور، الغرض جہاں جہاں آبادی تھی وہاں وہاں میرے پہنچ جانے پر نقشہ ہی پلٹ جاتا تھا۔ جو لوگ میرے آنے تک دیواروں کی آڑ اور مکالموں کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے میری جھلک پاتے ہی خوشی سے چھدک کر باہر آجاتے۔ حکومت نے تپوں پر میرے بھٹا دینے تو لوگ کشمیریوں کو لے کر گیاروں تک آگئے۔ الغرض انقلاب

کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر طرف لوگوں کے ٹھٹھے کے ٹھٹھے نظر آتے تھے مجھے
 جگہ جگہ لوگوں سے خطاب کرنا پڑا اور ان کی وحشت دور کرنا پڑی۔ لیکن اب ایک
 اور مشکل پیدا ہو گئی۔ جنوری میں کشمیر میں بڑے چھوٹے دن ہوتے ہیں یعنی پانچ بجے
 شام ہو جاتی ہے اور میں وہاں جلد سے جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ تاکہ بعد میں دیہات
 سے آئے ہوئے لوگوں کو اندھیرے اور کھلاکے کی سردی سے راحت نہ ہو۔ لیکن لوگ
 مجھے اس طرح گھیرے میں لے جیتے کہ میرے لیے آگے بڑھنا محال ہو جاتا۔ طوعاً و کرہاً
 میں نے اپنے ہاتھیں ایک موٹا ڈنڈا اور لوگوں کو بتانے لگا کہ وہ مجھے راستہ نہ دیں
 گے تو میں اسی سے ان کی توقع کروں گا۔ لیکن وہ رستے کشمیری عوامیادہ اس کو میری
 ادا سمجھنے لگے اور میری گاڑی کے آگے اس طرح بچھڑکھٹکے گئے کہ ان ہی پر ٹوڈے کا
 وار ہو۔ مجھے ان کی اس سادگی اور خلوص پر بڑا پسند آیا۔ لیکن جمہوری تھی۔ میں نے
 خدا کا نام لے کر ٹوڈے کو علامت کے طور پر دفن فرمایا۔ اچھا لاش شروع کیا اور ہماری
 گاڑی سرینگر کی حدود میں داخل ہو گئی۔ اس استقبال کا مبالغہ فلوں میں نہیں سما
 سکتا۔ لوگوں کی والہانہ عقیدت میرے تئیں ان کی پروانہ وار محبت اور حکومت وقت
 کے خلاف ان کی بیزاری اور نفرت ان کی ایک ایک حرکت سے ٹپکی پڑتی تھی۔ عجیب
 نظارہ تھا۔ پانچ سال تک تعلیم و جبر اور مکروہ کا مینار ہزاروں شہیدوں کی ہڈیوں
 بلے شمار مال و زرا اور سنگ و آہن کے مستحیادوں سے تعمیر کیا گیا تھا وہ عوامی انجمن
 کے ایک ہی ریلے میں حرف غلط کی طرح "توبہ ہو کر رہ گیا۔ اسی دن کی بات ہے کہ
 بعضی غلام محمد پڑشاہ چوک میں تاج ہوئی کے ایک کمرے کو کھینک گاہ بنا کر اور دور میں
 آنکھوں پر لگا کر چوری نیچے جیوس کا تماشا دکھا کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک
 اور ساتھی تھے۔ جب بعض صاحب نے انسانی سروں کا یہ منظر دیکھا ہوا سمندر اور

اس کی پر جوش موج زنی دیکھی تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر اپنے ساتھ بیٹھے
 ہوئے ساتھی سے کہا کہ میری ساری عبادت اور ریاضت رائیگان ہو گئی ہے۔ ایسا لگتا
 ہے کہ میرے ساتھ ایک نفس بھی نہیں ہے۔ اس صورت کو بدستے کے لیے کوئی اور طریقہ
 آزمایا نہ گئے گا اور شیخ صاحب کو پھر جیل واپس بھیجنا پڑے گا تاکہ نہ رہے ہانس اور
 نیچے ہانسری۔"

دیری ناگ سے سرینگر تک کوئی چودہ پندرہ گھنٹے مجھے تقریباً ایسا تھوہ
 رہنا پڑا اور لوگوں کے پیار و محبت کا ہاتھ بلا کر جواب دینا پڑا۔ درجنوں مقامات
 پر تقریر کرنا پڑی۔ اس کے علاوہ لاکھوں عقیدت مندوں کے جوش و خروش
 سے ساق پر پڑا۔ چنانچہ اس محنت و مشقت سے میرا الگ ڈکھڑکا رہا تھا۔ بڑی
 مشکل سے ہم خانقاہ مٹھی کے صحن پاک میں پہنچے۔ وہاں میں نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا
 اور نماز ادا کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت ہندوستانی اخبارات کیں
 طرح یا تو مشتہر مرغ کی لڑت ریت میں مرد و باکرہ مقابلے سے آنکھیں پھڑا رہے تھے
 یا جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے دوسرے دن کے اخبارات
 سے ہوا۔ جس دن میں سرینگر پہنچا اس دن اتفاق سے اقوام تھا۔ لیکن سارا
 شہر ہی کیا بلکہ اودھ کشمیر شڑوں پر آمنا مینا تھا۔ مگر دنی کے سرکردہ اخبارات
 نے خبر یوں دی۔ "شیخ عبداللہ سرینگر میں۔ چھٹی منانے والے جہوم نے نعرے
 بلند کیے۔" البتہ ہمیں کے ہفتہ وار "بٹر" نے جھوٹ کی قطعی کھول دی اور
 لکھا کہ "یہ غلط بیانی خود ہندوستان کو نے دوسرے کی کیوں کہ شیخ صاحب
 کا ایک دوست تیرہ کی طرح استنبال ہوا اور ان کی راہوں میں کشمیریوں
 نے آنکھیں پھٹا دیں۔" اسی طرح میری آمد کی خبر پا کر کچھ غیر کلی شبلی وچرن اور

نشریاتی اداروں نے جو خاص ٹیمیں بھیجیں۔ انھوں نے اس غنیم
جوش و خروش اور استقبال کی عکس بندی اور صدا بندی دنیا بھر کے نشریاتی سلسلوں
پر پیش کر کے صورتِ حال کو آئینہ دکھا دیا۔ ▲▲▲

قصہ سیلی اور مجنوں کی فوجداری کا

میری غیر جانمزی کے دوران غشی صاحب اور صادق صاحب ایک دوسرے
سے الگ ہو گئے تھے اور بقولِ شاعرِ قوت بدیلی اور مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی۔
مکمل آہنچی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ ان دو کے درمیان اقتدار کے لیے گھٹو جوڑ کے علاوہ
اور کوئی قدر مشترک موجود نہیں تھی۔ چوں کہ دونوں کا خیال تھا کہ جب تک میں
واقعات کے مرکز میں ہوں ان کے غواب شرمندہ تعبیر ہو سکتے۔ اس لیے دونوں
میرے خلاف سازش میں جُٹ گئے تھے۔ لیکن جیسے یہ سکرانٹ دور ہو گئی تو ان کے
دلوں کی کدورت اپنا رنگ دکھانے لگی۔ صادق صاحب کے ساتھ ان کے دوسرے
ساتھی دنگا پرشتاد و در، میر تقی میر، گروہاری لال، ڈوگرہ، تربوین دت، موتی لال
میترا، رام پیا، امرت، کرشن، دیو سلطی وغیرہ بھی بعضی کی بدشعور کائنات سے الگ
ہو گئے اور انھوں نے جمہوری ٹرینٹل کائنات کے نام سے اپنی ایک دوکان سمجائی۔
جس پیشی غلام محمد کو انھوں نے سٹور میں اپنا مسئلہ رہنما مان لیا تھا اور اس کی تعریفوں
میں زمین و آسمان کے تلابِ طاف نے اب اس بھٹکی کو وہ ایسی ایسی صلواتیں سناتے

لگے کہ تو یہی سبیل حقیقت میں وہ اپنے ساہا سال کے جانے بوجھے منشوے کی تکمیل کے
خواب دیکھ رہے تھے۔ اُن کا بنیادی مقصد کشمیر میں طاقت و اقتدار پر چھا جانا تھا۔
اور پھر کشمیر کو بنیاد بنا کر سارے ملک میں کمیونسٹ نظریے کی توسیع و استحکام کرنا تھا۔
میری ذات کو بخشی کی مدد سے ہٹا کر وہ مجھے تھے کہ راستے کا سب سے بڑا خطرہ ٹھکانا
گیا ہے اب وہ دھیرے دھیرے بخشی کا بھی پتہ لگانا چاہتے تھے۔ بخشی غلام محمد کی جن خامیوں
کا احساب میں نے ۱۹۵۷ء میں شروع کیا تھا اور جن کی وجہ سے میں اس کو الگ کر دینا
چاہتا تھا۔ اب اشتراکیوں نے انہی خامیوں کو اچھان شروع کیا اور بخشی کو بچانے کے
لیے جتن کرنے لگے۔ انھوں نے ۱۹۵۷ء کے واقعات و معاملات کے لیے بھی جتنی کوکڑا
شروع کر دیا۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۵۷ء میں کشمیر میں جو حادثات پیش آئے اور جو
مقام ڈھانے لگے اُن کا جنم اور منبع یہی کمیونسٹ فوجی رہی تھی۔ انھوں نے ہی کشمیر میں
کی بغاوت کو پہلے کا خونیں باب لکھا اور اس میں اُن کے پیش رو اور رہبر ڈی۔ پی۔ ور
تھے۔ لیکن یہ فوجی اس بات پر نگہ کر رہی تھی کہ عوام کا حلقہ کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے وہ
سڑھ کی لانی کو قوت کو بخشی کے سر ٹھوپ کر اپنے آپ کو نہایت دہندگان میں شمار
کرواتا چاہتے تھے۔ بخشی غلام محمد اُن سے زیادہ پوش اور چالاک ثابت ہوئے
انھوں نے ایک طرف کمیونسٹوں کی کمزوریوں کو بھانپ کر انھیں نالودش اور وحش و
مستی میں غرق کر دیا اور دوسری طرف اندری اندر اپنی طاقت کو مستحکم اور مضبوط کرنے
لگے۔ کمیونسٹوں کا خیار ٹوٹا تو انھیں ہوش آیا۔ انھوں نے بخشی سے علیحدہ ہو کر کھلم کھلا
ہیں کے خلاف محض ترتیب دیں۔ بخشی غلام محمد نے کمیونسٹوں کی مشاورت سے پس
برگیڈوں کا جو قوتدارہ لشکر منظم کیا تھا اُس کو انہیں کے خلاف اگسٹ اور ستمبر میں
صادق صاحب ڈی۔ پی۔ ور اور میر قاسم کی چٹائی بھی کروادی۔ لیکن وہ بے نفع ثابت

کا موقع آنے لگا تو صادق صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو اندازہ ہو گیا کہ وہ حکومت سے
الگ رہ کر بخشی صاحب انھیں اسمبلی تک پہنچنے ہی نہیں گے اور اس طرح سے اُن کی
سیاسی تجویز و تکلیف محکم ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ جو ہر لال نہرو کی سفارش سے کر
بخشی صاحب کے چرفوں میں پھونچ گئے۔ صادق صاحب نے اعلان کیا کہ بخشی صاحب
کے ساتھ اُن کے برادرانہ اور خاندانی تعلقات ہیں اور وہ انھیں بدستور اپنا لیڈر
مانتے ہیں۔ قاسم صاحب نے کہا کہ بخشی صاحب کے پاس اگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنے گھر
میں واپس آ گیا ہوں۔ چنانچہ بخشی صاحب نے صادق صاحب ڈی۔ پی۔ ور کو دھارتی
لال ڈوگرہ اور میر قاسم کو پھر اپنی وزارت میں لے کر کچھ وقت کے لیے رام کر لیا۔ اور
یہ بخشی صاحب کے پھر سے گن گانے لگے۔ بہر حال بات ۱۹۵۷ء کی ہو رہی ہے صادق صاحب
اُس وقت بخشی سے برسرِ پیکار تھے اور کمیونسٹوں کی اختیارات کے مطابق وہ اب مجھے
مجھ بخشی صاحب کے خلاف جنگ زدگری میں استعمال کرنے کی ٹھان رہے تھے چنانچہ
میری رہائی سے کچھ عرصہ قبل انھوں نے جیل میں ہی مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط کا باب و
جو اُن خطوط سے بالکل بدلا ہوا تھا جو انھوں نے صرف ایک ڈیڑھ سال قبل آئین سدا
اسمبلی کے معاملات کے سلسلے میں مجھے لکھے تھے۔ اب اقتدار کے ساتھ ساتھ اُن کی
رعزت اور نشہ اقتدار بھی چلا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خط میں مجھے کہا کہ ”تحریک
آزادی کی ابتدا اس سے مئی ۱۹۷۱ء اور اسٹون کام کرنا اور محرم تھا۔“ انھیں اب
اس انداز کے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ”جب سارا ترغیر نفرت کے شعلوں میں
جھلس رہا تھا تو آپ نے وہ قوی نظریے کو شکست دینے کے لیے جو ساری سازم کے
انجام دینے وہ قومی آزادی کی لڑائی میں عزت و احترام کا مقام حاصل کر چکے ہیں انھوں
نے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اب یہیں چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو بھول کر متحد ہو جانا

چاہئے۔ اُن کے خط کا ایک پتہ یہ تھا۔ "تفصیلات میں کسی جگہ ہمارا آپس میں اختلاف ہو سکتا ہے ان اختلافات کو آنا وادہ مباحثے اور باہمی مشورے کے جمہوری طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے ۱۹۵۰ء میں مملکتی صاحب سے اسی جمہوری حق کا احترام کرنے کی درخواست کی تھی۔ مجراہوں نے حکومت کے لئے اور سخت میں شکوک تھی۔ اب انھیں یہ سب کچھ اُن وقت یاد آ رہا تھا جب بخشی صاحب نے اُن کو کرکری سے نکلکا دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے خلاف سامراجی سازشوں کے بنیادی اختلافات کو بھی بھول گئے تھے۔ دروغ گو را حافظ نہا شد۔

میری رہائی کے فوراً بعد صادق صاحب نے اپنے ایک ساتھی موٹی لال میری کو بھی میرے پاس قاصد بنا کر بھیجا۔ انھوں نے یہ پیش کش کی کہ میں بخشی کے خلاف مجوزہ متحدہ محاذ کی قیادت سنبھالنا قبول کروں۔ انھوں نے یہ بھی پیش کش کی کہ میں بخشی کے خلاف جن کو بہادریوں تو وہ برسہا برس سے ساتھ کی گئی زیادتیوں کے لیے معافی مانگنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے اُن پر اعتبار کیا اور غالی ہاتھ واپس لوٹا دیا۔ لطیفہ ملاحظہ ہو کہ جب میری کئی گھنٹے تک مجھے منوانے میں ناکام ہو کر واپس صادق کو کہاں چلے گئے تو صادق نے اُن سے بڑی تقویض کے ساتھ پوچھا۔ "کیا تم اب بھی ہمارے ہی ساتھ ہو یا بندی پار کر گئے۔" اُن ہی دنوں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ایک رہنما نے آئے۔ اُنھیں سرینگر آئے اور انھوں نے مجھ سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ نتیجہ احمد نے ۱۹۵۰ء کے نرے کو متشکم کرتے اور اس کے بعد کشمیر لوں پر ظلم و ستم روا رکھنے کے لیے کشمیر اور وزیر کا دل ادا کیا تھا۔ اب وہ کانیاں بن کر بڑی ڈھٹائی سے مجھ سے ملنے کے لیے آنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اُن

سے صاف کہہ دیا ہے۔

میں باز آیا مجت سے آٹھانو پاندان اپنا

البتہ جب مجھے تین ساڑھے تین مہینے کے بعد ۱۹۶۹ء اپریل ۱۹۵۰ء کو پھر گرفتار کر لیا گیا تو صادق صاحب نے میری اس گرفتاری کی بڑی مذمت کی۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا کہ۔

"شیخ صاحب کی گرفتاری سے کشمیر کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔

خاص کر ایسے وقت میں جب کہ وہ عوام کو پُر امن رہنے کی اپیل کر رہے تھے

سیاسی حالات رعب اصلاح ہو رہے تھے اور پُر امن و مستحکم حالات میں

یہ اقدام قطعاً غیر مصلحتانہ ہے۔"

میں نے اپنی رہائی کے فوراً بعد محسوس کر لیا تھا کہ میری رہائی دراصل میری نئی

اور طویل گرفتاری کا پہرسل ہے اور بقول شاعر

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے

لیکن میری طبیعت نے اس جبر کے آگے سر خم کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے حکم و جبر کے شکنجے میں بکڑی ہوئی قوم کو کچھ سے نکلانے کا فیصلہ کر لیا۔ سرینگر و بیچ کے دوسرے روز حضرت ابو بکر صدیقؓ کا عرس حضرت بل میں منایا جا رہا تھا۔ میں دن میں ہی دیں گیا اور میں نے ایک عظیم اجتماع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بخشی حکومت کی فتنہ گردی کا نقاب تار تار کیا۔ میں نے عوام سے کہا کہ "اُن کی عزت و آزادی پر فدا کہ خائے والے آخر کار ناکام و نامراد ثابت ہو جائیں گے۔ لیکن شروع سے کہہ کہ وہ اپنے دل میں عزم و ایمان کی شمعیں روشن رکھیں۔ میں نے کہا کہ کشمیر کا فیصلہ نہ کرنا چاہی میں ہو سکتا ہے نہ دینی میں، نہ ماسکوں میں اور نہ واشنگٹن میں کشمیر کے اصل مالک اس کے عوام ہیں

اور وہی اس کا فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد شہر میں جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہیں
نے مخالفتہ مسلح، جامع مسجد اور تحریک حریت کے قدیم مراکز پر لوگوں سے خطبہ کیا۔
لوگ نہر ہری صودی کے باوجود لاکھوں کی تعداد میں آئے، میں تلاوت قرآن کریم کے
بعد علامہ اقبال کی کوئی نظم خوش الحانی کے ساتھ سناتا، چنانچہ جامع مسجد میں ان کی
مشہور غزل سن

آئینِ جوانِ مردان حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شہیدوں کو آتی نہیں رُو بائی

مستثنیٰ توجیع پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی، غرض سارے کشمیر میں ایک نیا دلدل
پیدا ہو رہا تھا اور عموماً جو سب سے رات چھاگئی تھی اس میں درازیں پڑنا شروع ہو گئی
تھیں، میں نے عوام کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے ایک اور پروگرام شروع کیا۔ یعنی ہر شہر
شہر میں چن چن کنیوں کے افراد مسلمان اور اس کے بعد ظالموں کی گولیوں کا نشانہ بنے تھے
یا جن کنیوں کے افراد جیسوں میں اپنی زندگی کے بہترین ایام گزاریے تھے، میں نے ان
کے گھر جا کر ان کے لواحقین اور پسندگان کی مزاح پسری کرنا شروع کر دی۔ اس طرح
میں شہر کے مختلف محلوں میں جاتا رہا۔ میں جہاں بھی جاتا تھا ناٹا ناٹا نعرے آمد کی خبر جنگ
کی آگ کی طرح پھیل جاتی اور فوراً مجھے میں ایک زبردست بھیڑ جمع ہو جاتی، خاص طور
پر عورتیں تو چشم زدن میں پرے باندھ لیتیں اور اپنے خاص انداز میں گیت گانے لگتیں
مجھے یاد ہے کہ میں آئسٹیا بازار کے اندر دینی غلطی میں گیا تو لوگ فوراً جمع ہو گئے اور عورتوں
نے چھتوں پر دائرے بنا کر ”وہ تو“ شروع کر دیا۔ اسی لمحے کی زندہ دل عورتیں تھیں
جنہوں نے تحریک کے ابتدائی برسوں میں ڈوگرہ فوجوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔
ایک بار جب شہر میں کر فیڈ نافذ کر دیا گیا تھا اور مہاراجہ کے سپاہی رسالہ گھوڑوں

پر سوار ہو کر محلے میں گشت لگایا کرتے تھے، ماسٹر جی کی عورتوں کو ایک عجیب ٹرسٹوجھا۔
انہوں نے اپنے اپنے مکانوں کی چھتوں پر خالی ٹین کے کسٹے زور زور سے بجانا شروع
کر دیے۔ یہ آوازیں رسالہ گھوڑوں کے لیے ناٹاؤں تھیں۔ چنانچہ وہ فوراً ہی بدک گئے
اور بدحواسی میں سر پہ بھاگے دوڑنے لگے، کئی سپاہی تو زور و کثر باندھے ہوئے گھوڑوں
سے گر کر زمین پر آ رہے۔ باقی نے یہ حال دیکھا تو ڈر کے مارے اپنے گھوڑوں کو نہ کر ڈنگ
ہو گئے۔ اور پھر انہیں اس طرف آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

ان حملہ دار جلسوں میں لوگوں نے چھترے سے بخشی حکومت کی تاننا شاہی اور غلت ٹو
گردی کی شکایت کی اور قلعہ قادر کا اندر بی سپرٹنڈنٹ پولیس کی وحشیانہ پندار سامانوں
کا رونا روایا، قادر کا اندر بی بخشی قلعہ محمد کا خاص مستند بن گیا تھا، اس نے سر سیکر کی
سب سے بار و قی طرح رینڈیڈ می روڈ پر سپیشل سیٹ کے نام سے اپنی ایڈارسانی کا
اڈہ قائم کیا تھا۔ جہاں شریف شہر پول اور ان لوگوں کو بین پر میری طرف داری کا سبب
ہوتا، ایسی ایسی اڈیتیں پہنچانی جاتی تھیں جن کو سن کر رو گئے کھڑے ہو جاتے تھے واقعہ
یہ ہے کہ گاندربی میں ایک مجرم کی روت حلوں کر گئی تھی۔ بہر کیف، انسانی سادہ رخ کے
تاریک دوروں میں ایسے سپاہہ کار دار قوم کے ہم پر پھوڑوں کی طرح اُسکر آتے ہیں۔
میں نے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ قلعہ دار شہری وقایع کی کشیداری بنائیں جس میں مجھے کے
مختار ترین لوگ شامل ہوں، اور جب قلعہ کے کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں
تو یہ شہری کمیٹی ان کا سامنا کرے، اس طرح سے بربریت کا یہ ماحول ختم ہو جائے گا۔
انہی دنوں مہاتما گاندھی کا یوم شہادت آ گیا، ہندوستان ہم پر جو مظالم ڈھا
رہا تھا ان کے باوجود میرے دل میں مہاتما کے تئیں عزت و احترام کے جذبات میں کوئی
کمی نہیں آتی تھی، مجھے دُشواس تھا کہ گاندھی کی روح ان کے جانشینوں کے ہاتھوں کشمیر

میں روار کے گئے ظلم و تشدد سے منغمم اور منظم ہوگی۔ اور میں یہ بھی سوچتا تھا کہ قسمت نے ہندوستان اور ہمیں طاقت آزمائی کی جس رشتہ کشی میں مبتلا کر رکھا تھا اس میں مہاتما گاندھی اور ان کے اصولوں کا آشیرداد اور فیروہ برکت ہمارے ساتھ تھی چنانچہ میں نے اس گھٹنا ٹوپ اندھیرے میں اس سرزمین سے، جہاں سے گاندھی کی روشنی کی کرن نظر آئی تھی یہ بیان جاری کیا۔

” مہاتما گاندھی جدید زمانے کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک تھے۔ جنھوں نے زندگی بھر ہی قوع انسان کی آزادی اور سہائی اور عدم تشدد کے اصولوں کے لیے جدوجہد کی۔ انھوں نے تشدد اور فرقہ وارانہ منافرت اور جھوٹ کی گویوں کے آگے شکرتے ہوئے اپنی چھاتی پیش کر کے دنیا کو یہ سبق دیا کہ ان اصولوں کا پرچم بلند رکھنے کے لیے زندگی جیسی متاع بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ گاندھی جی کی شہادت کی دسویں برسی کے موقع پر میں برصغیر بھر میں ان کے کرداروں کا حوالہ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ کشمیر کے معاملے میں صرف سہائی اور عدم تشدد کو اپنا چہانہ بنائیں اور اس مسئلے کو ان ہی دو اصولوں کی بنیاد پر حل کرتے میں مدد کریں۔ “ ▲▲▲

حضرت بل قتل کیس

میری ان سرگرمیوں سے لوگوں کا دبا ہوا حوصلہ بحال ہونے لگا اور انھوں نے حالات پر ایک صحت مند ذہن کے ساتھ نظر ڈالنا شروع کی۔ یہ صورت حالی بخشی نظام محمد کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ وہ خوف اور سازش کے اکسچین پر زندہ رہ رہے تھے چنانچہ انھوں نے بڑے جتن کے ساتھ صورت حال کو دیکھانے کے لیے ریشہ دوانیاں شروع کیں سب سے پہلے تو انھوں نے یہی مشہور کر دیا کہ میں رضا کاروں کو بھرتی کر کے کشمیر میں بغاوت برپا کرانے کی تیاریاں کر رہا ہوں ان کے اس جھوٹ کو طاقت پر واز نتختہ کے لیے اٹلی جیس کا ڈائریکٹر بی۔ این۔ ملک اور ہندوستانی اخبارات کے کچھ زرخیز نمائندے پیش پیش تھے۔ ملک نے قراچی کتاب میں لکھا ہے کہ مجھے رہا کرنے میں دراصل حکومت کی ایک مصلحت تھی۔ وہ مجھے کسی نہ کسی سازش میں ملوث کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے ایک فراموشی میں میرا کہ سننے دو سب سے دنیا کو یہ بھی یاد کرانے کی بھری قید دراصل جو زمانہ سرگرمیوں کا قیہ تھی۔ چنانچہ اپنی کتاب ” تہرہ کے ساتھ میرے برس “ میں وہ لکھتا ہے۔ ”جب شیخ صاحب کو رہا کیا گیا تو ہمیں یقین تھا کہ وہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ

لیں گے جن سے ہمیں ان کے خلاف مزید ثبوت مل جائیں گے۔ اس لیے ہم نے ان کے خلاف کیس دائر کرنے میں جلدی نہیں کی۔

میری سرگرمیاں آپ سب میں تھیں۔ مگر ان سے ریاست میں جوش و خروش کی ہر پیدا ہو رہی تھی۔ اس لیے بخشی قلام محمد نے جارجاٹ طریقہ سے مجھے مشغول کرنے اور غریبوں میں آگ لگا دینے کی کوششیں شروع کیں۔ ۱۴ جنوری کو میں نے شہر میں اپنے پروگرام کے مطابق ایک جلسہ پتھر مسجد میں کرنے کا اعلان کیا تھا۔ پتھر مسجد ہماری تحریک کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اور یہیں پر مسلم کالفرنس کویشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا تاریخی جلسہ لیا گیا تھا۔ پتھر مسجد کے ساتھ ہی تاجپاد منزل کی غارت بھی واقع ہے جو ہماری تحریک کا اصرافی مرکز رہا تھا۔ اور جس پر اس وقت بخشی صاحب نے ہندوستانی قوت کی مدد سے قبضہ کیا تھا۔ میرے پتھر مسجد کے جلسے کا اعلان ہونا تھا کہ بخشی قلام محمد نے دہلی کے حکمرانوں کو اطلاع کر دی کہ دراصل میں رضا کاروں کے ساتھ تاجپاد منزل پر دھاوا بولنے والا ہوں انھوں نے فریاد بھی کی کہ اگر تاجپاد منزل ان کے ہاتھوں سے چلا گیا تو ان کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ ملک اور جاسوسی کے دوسرے ذرائع نے یہ پروپیگنڈہ زور و شور سے کیا اور جواہر لال اور وزیر داخلہ پرنسپل پنت کو بے حد پریشان کر دیا۔ چنانچہ حکومت نے قوت کو بھاری مشین گنوں اور ٹینکوں کے مسلح کر رکھا تھا۔ وہ پتھر مسجد میں معصوم عوام کے اجتماع کا انتظار کر رہی تھی تاکہ وہ کبھی جلسے پر نہانے سے صورت حال کو بگاڑ دے اور اس علاقے کو خون کے دریا میں غرق کر دے۔ اس طرح سے ایک نوکشیرویل کے تازہ ہوتے ہوئے جو مصلے پھر سو جاتے اور دوسری طرف مرکزی حکومت کو بھی میری گرفتاری کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ میں نے یہ اطلاع منیں قومی اس پیج پر پہنچا کہ ہمیں دشمن کے پھیلنے ہوئے

جہاں میں نہیں چھٹنا چاہتے۔ نہ میں اپنے معصوم عوام کا ناحق خون خرابہ کرنے کی اجازت دینی چاہئے۔ اور نہ ہی اس دوران میں غلط ڈالنا چاہئے۔ کیونکہ اس قسم کے ماحول میں صرف بخشی اور اس کے عوام دشمن خواری ہی پنپ سکتے تھے۔ چنانچہ میں نے جلسہ حضرت بل میں کرنے کا اعلان کر دیا اور اس طرح سے بخشی اور ملک اینڈ کو بھری ہوئی ہندو قوت کو ہاتھوں میں بے کف افسوس لئے رہ گئے اور دہلی میں جواہر لال نہرو کا نانو کم ہو گیا اور انھوں نے چین کی سانس لی۔ لیکن بخشی قوت نے اپنا یہ داؤں خانی ہوتے دیکھا تو انھوں نے آخر خود حملہ آور ہونے کی چال سوچی تاکہ کسی نہ کسی طرح کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ ۲۱ فروری کا دن تھا۔ حضرت بل میں معراج شریف کی جمعہ کو ایک نہایت عظیم اجتماع ہوا۔ اسی دن دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اور ہم نے اس بڑے اجتماع میں جس عظیم عالم دین اور تاجپاد آزادی کی صحت یابی کی ایک قرار واد منظور کی۔ بخشی صاحب نے اسی دن ایک شرارت آمیز منصوبے کے تحت آثار شریف کے شمال کی طرف جہاں آج کل یونیورسٹی ہے اپنی ایک قومی بیچ دی۔ جہاں انھوں نے لاؤڈ سپیکر لگائے اور اناپ مشنپ تقریر میں شروع کر دیں۔ اس کاروائی کا صاف مقصد اس تحریک دن پر صورت حال کو کشیدہ کرنا اور تصادم کی صورت پیدا کرنا تھا۔ مجھے بھی حضرت بل کے اجتماع کے سامنے خطاب کرنا تھا۔ میں نے تقریر شروع کی تو لاٹھوں کا مجمع موجود تھا۔ چنانچہ جب میں تقریر کر رہا تھا۔ تو جلسہ گاہ کے ایک کونے میں چھ لوگوں نے نوصات طور پر بخشی حکومت کی شہ پر آئے تھے اور جڑ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لوگوں کا بے پناہ اثر و حام تھا اور وہ جو کتا بھی تھے۔ اس لیے شہر ہندوں کی ایک نہ پہلی اور وہ عوام کے تیور دیکھ کر فوجی حکمران بہر کیف جلسہ ختم ہوا۔ نماز ادا ہوئی اور میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لوگ بھی

زیارت کر کے واپس جا رہے تھے کہ خبر آئی حضرت بل میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے اور غشی غلام محمد کے ایک طرف دار کو چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ حالانکہ بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ دار اس بد نصیب آدمی ہی الدین بانڈے کو خود اسی کے ساتھیوں نے بکرا بنی اسرائیل بنا دیا تھا کہ ہمارے خلاف جبر و ظلم کی کوئی سازہ ہم شروع کرنے کے جاؤں بل جائے بس پھر کیا تھا۔ بخشی صاحب کی ساری پولیس حرکت میں آگئی اور انھوں نے مار دھڑا اور کپڑے دکھڑا کہ بالبالا سلسلہ شروع کر دیا۔ حضرت بل قتل کیس کے سلسلے میں صوفی محمد اکبر، مولانا محمد سعید اور خواجہ علی شاہ جیسے ضعیف العمر اور مرز بزرگوں کو بھی دھرا لیا گیا۔ میرے اکثر ساتھی تو میل میں ہی پڑے تھے۔ اب کچھ کچھ ساتھیوں پر بھی ہاتھ ڈالایا کہ میں بالکل یکہ و تنہا دار جاؤں پالیسی بھی جی کہ میرے تمام پرکٹ دینے جائیں اور اُس کے بعد مناسب وقت پر مجھے پھر بابہ جولاں کر دیا جائے۔ اس کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا کہ کرشنا امین جو غشی غلام محمد کو بہت پسند کرتے تھے اور اس کی تعریفیں کرتے رہتے تھے، اس کے دعوے کے لیے بھی مصاحف فرما کر دیا جائے کہ میرے خلاف بہت سے فوجداری مقدمات موجود ہیں، حکومت نے شہر میں فسادات کی آڑ میں وعدہ کیا اور دوسرے تعزیری قوانین لاگو کر دیئے۔ میں نے اپنا وقت گزارنے کے لیے صورہ میں ایک مسجد کی تعمیر جدید شروع کی۔ صبح و شام لوگوں سے ملتا رہتا۔ اور دن بھر مسجد کی تعمیر کے کام کی نگرانی کرتا رہتا۔ اسی دوران عبدالغفر کی تقریب سعید آگئی، میں ایک کھلی جیپ میں اپنے گھر سے نوہنہ دین کولی ہمارا چٹا ٹیبلٹ لٹکوا نواکول اور سیک ڈائفر سے ہوتا ہوا عید گاہ کی طرف چلا۔ راستے میں مرگ کے دو ڈنڈے طرف لاکھاد لوگ مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ عوامی مسکافوں کی چھتوں والوں، برآمدوں اور کھڑکیوں میں میدرفت گار مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ آن کے رنگ برنگ کے ملبوسات سے فضا میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی میں

راستے میں کئی زیر عتاب ساتھیوں کے گھر عید مبارک کہنے کے لیے بھی گیا۔ میسری جیپ کے عقب میں ہزاروں لوگ نعرے دگاتے، تکبیریں پڑھتے جا رہے تھے۔ اور لوگوں کا اس قدر اڑھام تھا کہ اب جیپ ڈرائیور نہیں چلا رہا تھا بلکہ آن گنت ہاتھ اُس کو کھینچ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ آج پانچ سال کے بعد کشمیری مسلمان اس شان سے عید منا رہے ہیں۔ سروی کے باوجود کوئی تین لاکھ کا جمع عید گاہ میں موجود تھا۔ جس میں مستورات کی بھاری تعداد بھی شامل تھی۔ حکومت نے انسپکٹر جنرل پولیس ڈی۔ ڈبلیو مہرو کی سرکردگی میں مسلح پولیس کے کئی بلائین تعینات کئے تھے اور آجی ٹوپیاں پہنے ہوئے پولیس کے سپاہی ایک فوجی کیپ کا ٹنڈر پیش کر رہے تھے۔ سارا کشمیر اس وقت حقیقت میں فوجی کیپ ہی بنا ہوا تھا۔ اس اجتماع کی ایک خاص بات یہ تھی کہ غشی غلام محمد کو وہاں آنے کی جرات نہیں ہوئی۔ میری قید کے دوران وہ پولیس کے پیرسے میں باقاعدہ عید گاہ اگر نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن اُن دنوں مسلمانوں کی کم ہی تعداد وہاں موجود ہوتی تھی اُس دن انھوں نے پانچ سال کے بعد اپنا معمول توڑ دیا۔ وہ عید سے ایک دن پہلے جنوں چلے گئے۔ وہاں نماز عید ادا کی اور پھر سرنگرن چلے گئے۔ دنیائے دیکھو لیا کہ آتش و آہن اور زرد و ہواہر کے ہر ممکن ہتھیار سے سہارا دے کر جس تیس مار تان کو خالد کشمیر کے نام سے کشمیری عوام کی مسئلہ قیادت کے مقابل پیش کیا جا رہا تھا۔ اُس کے پیر کتنی کچی اور کمزور تھی کے بنے ہوئے تھے۔ میں نے عید گاہ میں عوام کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

”اے مسلمان کشمیر! آج میں عید الفطر کے موقع پر اپنی طرف سے اپنے ساتھیوں کی طرف سے اور اپنے رفیقوں کی طرف سے جو ہم سے جتنا قید و بند کی ستمناہی برداشت کر رہے ہیں آپ کو عید مبارک پیش کرتا ہوں۔ اور

ساتھ ہی درخواست کرتا ہوں کہ اُن ساتھیوں کے حق میں دعا کی جائے جو
جلیب حق کی پاداش میں ہم سے اور اپنے اہل و عیال سے دور ہیں۔ دُعا
کیجئے کہ خدا انھیں صبح سلامت رکھے اور انھیں صبر وداشت عطا کرے۔ ۛ

میں نے اس موقع پر عوام کو یہ بھی بتایا کہ ”آج صبح میں آپ کو پیام عید دینے کے لیے
کسی نکتے کی تلاش میں تھا کہ قرآن مجید کو کھولوں اور جو سب سے پہلی سورۃ لکھی
اسے اپنا پیام اذکار کروں۔ چنانچہ وہاں میری نظر سب سے پہلے القصص کی سورۃ پر
پڑی۔ اس سورۃ میں بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے
ساتھ ان کی کشمکش اور پھر اُن کی فتح کا ابراہیم بیان کیا گیا ہے۔ بعد میں سی۔ آئی۔ ڈی۔
والوں نے اسے عوام کو اُکسانے والی ایک نہایت ہی اشتعال انگیز تقریر قرار دیا۔
انھوں نے کہا کہ میں حکومت کو فرعون کہہ کر بکار رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ حکومت
اس خطاب کی ہر طرح سے مستحق تھی۔ واپسی پر میں پھر چیپ میں ایستادہ ہو کر تارہ بڑا
چھتر مل کر نگر امیر اکدل اور ڈول گیٹ کے راستے واپس گھر آیا۔ اور اُس وقت بھی
سڑک کے دونوں طرف ہزار ہا مردوزن میری آگوائی کے لیے کھڑے تھے۔ اس
سے بخشی کی گھبراہٹ میں اور زیادہ اِمنافہ ہو گیا۔ چنانچہ ہمارے متعلق غلط فہمیاں
بیدار کرنے کی قہم اور تیز کر دی گئی۔

میں نے اس صحت حال پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور مولانا سید کو
دہلی جاسے اور وہاں میرا ایک بیان اخبارات کے نام جاری کرنے کی عاہدیت دی
میں نے انھیں جواہر کمال وغیرہ سے ملنے کی بھی تاکید کی تاکہ وہ اُن کے باقی انصاف
کو جان لیں۔ پھر متحدہ قیوم گیلانی بھی اُن دنوں دہلی میں تھے۔ انھوں نے مجھے دہلی آنے
کی صلاح دی۔ لیکن میں ابھی محال کا جائزہ ہی لے رہا تھا اور اس سوچ میں تھا

کہ میرا وہاں جانا کس حد تک مفید رہے گا؟ البتہ میں نے جواہر کمال کے نام ایک
خط لکھا۔ جس میں میں نے اپنے موقف اور خیالات کے متعلق کچھ باتوں کی وضاحت
کی۔ خط کا متن درج ذیل ہے۔

”سر سیکر۔ ۱۱ اپریل ۱۹۵۵ء

محترمی پنڈت جی!

جب سے مجھے نظر بندی سے رہا گیا ہے بخشی غلام محمد اور اُن کے ساتھی اپنی
گذشتہ غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میری سرگرمیوں کو قصداً و غمداً غلط
طریقے پر پیش کر رہے ہیں۔ یہ سب عداوتوں کا ایک بات ہے کہ اس پر پبلینڈے کی
آڑ میں مختلف طبقوں کے سینکڑوں کشمیریوں کو جن میں وکیل ڈاکٹر، تاجر، ریاست
کے سابق وزراء اور سابق امیران لوگ سب شامل ہیں۔ پلا کوئی جرم عائد کیے
ہوئے خراست میں رکھا گیا ہے۔ یا جھوٹے اور بے بنیاد فوجداری مقدمات میں
پھنسا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ
اس سے بھی بڑا ہے جو میل کے حکام اخلاقی قیدیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔
پولیس جان بوجھ کر کسی عدالت میں اُن کا چالان نہیں کرتی۔ تاکہ گرفتار شدگان
کو زیادہ مدت تک اپنی تحویل میں رکھ کر انھیں روحانی و جسمانی اذیتیں پہنچاتی رہے۔
معزز شہر پولیس کو انسانی جینس بیورو میں رکھا گیا ہے جہاں انھیں اذیتیں دی جاتی ہیں کہ
نازی کیپوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے جھوٹے
بیانات دیں یا ایسے بیانات پر دستخط کریں جن سے عوامی رہنماؤں کو لبا و دست
کے مجرم میں پھنسا یا جاسکے۔ پولیس رولز کی دفعہ ۱۰۱ کے تحت عام جلسوں پر بھی
پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور ساری وادی کو شہر غوثاں میں تبدیل کر دیا گیا ہے

سی۔ آپنی آپس بر گلیڈ، طیشیا اور پولیس کو عوام کے ذہنوں میں خوف و دہشت پیدا کرنے کے لیے شہروں میں ہی نہیں وادی کے طول و عرض بلکہ ضلع ڈوڈھہ تک پھیلا دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ میں یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا ہوں کہ اس حصے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ہندوستان کی جہوری مشین یہ کیسے چل رہی ہے۔ مگر میری خاموشی اور ساتھ ہی کچھ نہ کرنا بھی ۱۹۷۲ء کی سازشوں کی تیندیں حرام کر رہا ہے اور وہ پھر اس جوڑ توڑ میں ہیں کہ کس طرح مجھے وہ بارہ جیل میں ڈالا جائے۔

مجھے تعجب ہوا جب بخشی غلام محمد نے حال ہی میں حیدر آباد اور ممبئی میں تقریر کرتے ہوئے مجھے پیرہے لے لیا و انعام لگایا کہ میں رضا کاروں کی بھرتی کر رہا ہوں اور اس کے لیے روپیہ جمع کر رہا ہوں تاکہ کسی موزوں و مناسب وقت پر چوری طاقت کے ساتھ حکومت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر دیا جائے۔ یہ ایک ایسے شخص کی ایک اور مداعنی اختراع ہے جس نے نہ صرف کشمیری عوام سے بے وفائی کی بلکہ آپ کو بھی خود اقتدار حاصل کرنے کے لیے قادی ماکر شہوت اور لوٹ کھسوٹ سے اپنے خاندان کے لیے دولت اکٹھی کر سکے۔ ۱۹۷۲ء میں آپ کو اور آپ کے کچھ رفقاء کے کار کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کا نتیجہ اسی سال وراگست کے ساتھ کی صورت میں رونما ہوا۔ پھر پھر پیرہے انعام لگایا گیا کہ میں ریاست کو خود مختار بنانے کے لیے ایک غیر ملکی طاقت سے ساز باز کر رہا ہوں۔ اس انعام کو ثابت کرنے کے لیے وہ خط و کتابت شائع کرنے کی دھمکی بھی دی جو میں نے مرحوم ابو الکلام آزاد مرحوم رفیع احمد قدوائی اور آپ کے ساتھ کی تھی۔ میں نے انھیں میں سے بھی لکھا کہ وہ اس خط و کتابت کو شائع کریں۔ لیکن انھیں یہ شائع کرنے کی آج تک ہمت نہیں ہوئی ہے۔ چونکہ اس دھمکی کے انعام کو وہ اور

نہیں کر سکا اس لیے اب وہ پھر وہی پروا نکھیل کھیل رہے ہیں۔ اور وہی دہلی و کشمیر میں اپنے معاون سازشوں کی مدد سے میری سرگرمیوں کے متعلق ملک کے اندر شراغیں فضا پیدا کرنے کی کوششوں میں لگے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ایک ایسے شخص سے دھوکا نہ کھائیں گے جو ادب و اخلاق سے بھی عاری ہے۔ آپ تو بخوبی واقف ہیں کہ میں سازشوں اور دروغ بیانیوں میں کبھی نہیں پڑتا۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے حکومت ہند کی اس پالیسی سے اختلاف ہے جو کشمیر کے باب میں اس نے اختیار کر رکھی ہے۔ اپنے ان خیالات کو میں نے کسی سے پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس دس سار جگہوں کو ختم کرنے کے لیے میرے خیال میں یہی صحیح طریقہ ہے کہ کشمیری عوام کو ان کا حق خود ارادیت دیا جائے۔ یہ وہ مطالبہ ہے کہ جس کی تائید و حمایت ایک زمانے میں آپ بھی بڑے جوش و غروش سے کرتے آئے ہیں اور جس کے تحفظ کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۷۲ء میں اپنی مسلح فوج بھی بھیجی تھی۔

باوجود ان تمام واقعات کے جو اگست ۱۹۷۲ء میں رونما ہوئے تھے۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اس سلسلے کو حل کرنے کی کنجی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں کی اختیار کردہ پالیسی سے آپ دھوکا نہ کھائیں ورنہ یہ آخر کار سب کے لیے تباہ کن ہوگا۔

آپ کا مخلص شیخ محمد عبداللہ

اس خط کے لکھنے کے چند ہی روز بعد ممبئی کے کشمیری پنڈت سر سیکر آئیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جواہر لال نہرو نے انھیں مداخلت دیکھنے کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ ایک باؤس بوٹ میں مقیم تھیں۔ پنڈت کیش پ بندوق نے ان سے رابطہ قائم کر لیا اور انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا کہ غشی صاحب کے کانوں میں اس کی جھنک پڑ گئی۔ ان کا سارا محل جھوٹ اور غریب کاری پر کھڑا تھا۔ انھوں نے بھانپ لیا کہ اگر میں نے مسز پنڈت سے تروڑ و کشمکش کی تو شاید ان کی دروغ گوئی کا پردہ فاش ہو جائے گا اور ریت کا بنایا ہوا محل زمین بوس ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے ملاقات کی قوت ہی نہ آنے دی۔ اور مجھے وہرا پر مل مشہ کو کچھ گرفتار کر لیا گیا۔ میرے گھر کی کاغذی لینے کے لیے قادر گاندھری کو تعینات کیا گیا۔ اس نے گھر کے کونے کدروں کی نہایت سختی کے ساتھ تلاشی لی۔ میرے تمام ذائقہ خاں کا غذاات اور دوسرا ریکارڈ سب کچھ پولیس کے ہتھ چڑھ گیا۔

مولوی محمد سعید کو میں نے دہلی جوہدیاات دے کر بھیجا تھا ان کو اس نے وہاں پہنچے ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے کوئی اخباری کانفرنس نہ بلائی۔ البتہ میرے بیان کو اخباروں میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ جواہر لال اور مولانا آزاد کے تاثرات سمجھنا سیکھ جائیں۔ لیکن انھوں نے وہاں سے آکر چپ سا دھ فی جھے گرفتاری کے بعد سچہ گدہیل پہنچا دیا گیا۔ مولوی صاحب کو بھی کچھ دیر کے بعد وہیں پہنچا دیا گیا تو اس وقت انھوں نے مجھے بتایا کہ جب مولانا آزاد دے ملاقات کرنے کے بعد میں واپس جا رہا تھا تو مولانا آزاد نے دروازے سے آواز دے کر مجھے بلایا اور کہا ”شیخ عبداللہ کی مدد کی جانی چاہئے۔“ مولانا بہت کم بولتے تھے۔ اور ان کا ہر جملہ جہان منہی لیے ہوتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ غشی غلام محمد کی چالاکوں کو بھانپ چکے تھے اور ان کا ہوا دار کرنا چاہتے تھے۔ شاید رفیع صاحب کی طسرح انہیں بھی اپنے کیے پر کھٹنا دھو رہا تھا۔ اور وہ اصلاح احوال کے خواہشمند تھے۔ لیکن انہیں موت نے فرصت نہ دی۔ میں ابھی باہر ہی تھا کہ ان کی بیماری کی خبر ملی۔

لیکن ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اور چند ہی دنوں کے بعد ان کی وفات ہو گئی۔ یاد رہے کہ رفیع صاحب کا میری نظر بندی کے دوران ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اگرچہ ان کی ہیئت پر غشی اور صادق صاحب قیسی شالیں چڑھانے کے لیے دتی اور بارہ ہفتے گئے۔ لیکن یہ اتم سے زیادہ شکرانے کے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں کیونکہ رفیع صاحب اپنے آخری دنوں میں غشی اور صادق کے دکھائے ہوئے سبز باغ کی حقیقت جان چکے تھے اور وہ میرے ساتھ روارکھی گئی زیادتی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اندر ہی اندر گڑھتے رہتے تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کے سامنے کیا تھا۔

جب میں ابھی جیل سے باہر ہی تھا تو خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ حکومت ہمارے خلاف نام نہاد سازش کا مقدمہ تیار کرنے کے لیے جتن کر رہی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی کئی تقریروں میں اس نحو سازش کا بھانڈا کھوڑ دیا تھا اور ان وحشیانہ طور طریقوں کی مذمت بھی کی۔ جو ہمارے ساتھیوں کے ساتھ اذیت رسانی کے کیچوں میں بڑھ چکے تھے تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح مقدمے کے لیے کسی طور کوئی بنیاد فراہم کر سکیں۔

مقدمہ سازش

میری گرفتاری کے بعد دہشت گردی کا سلسلہ پھر عام ہو گیا میرے ساتھیوں کو چون چن کر حضرت بن قتل کیس کے جعلی مقدمے میں مانو کر لیا گیا۔ اور ان پر طرح طرح کی سختیاں روا رکھی گئیں۔ اُدھر ریاستی حکومت مرکزی محکمہ جاسوسی کی مدد سے ہمارے خلاف سازش کا ایک فرضی مقدمہ گڑھنے میں بھی مصروف تھی۔ اور اس سلسلے میں روسیہ پانی کی طرح بہا جا رہا تھا۔ میں جیل سے باہر ہی تھا کہ ہمیں اطلاع ملی کہ ہمارے جیل کے ساتھیوں پر زبردست سختیاں کی جا رہی ہیں تاکہ ان سے جھوٹی گواہی حاصل کی جاسکے۔ بہر حال کشمیر سازش کیس کے کاغذات جو برٹال نے دیے تھے ان سے وہاں ان کی کوٹھی پر پرنٹ گونج رہی تھی اور محکمہ جاسوسی کے بہت سے افسران نے ان کا ملاحظہ کر کے مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۱۵ مئی ۱۹۷۱ء کو جوں کے سپیشل مجسٹریٹ کی عدالت میں زیر دفعہ ۱۲۱-۱۲۰-۱۱۱-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-۱۱۵-۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸-۱۱۹-۱۲۰-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴-۱۳۵-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳-۱۴۴-۱۴۵-۱۴۶-۱۴۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۰-۱۵۱-۱۵۲-۱۵۳-۱۵۴-۱۵۵-۱۵۶-۱۵۷-۱۵۸-۱۵۹-۱۶۰-۱۶۱-۱۶۲-۱۶۳-۱۶۴-۱۶۵-۱۶۶-۱۶۷-۱۶۸-۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲-۱۷۳-۱۷۴-۱۷۵-۱۷۶-۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷۷-۱۴۷۸-۱۴۷۹-۱۴۸۰-۱۴۸۱-۱۴۸۲-۱۴۸۳-۱۴۸۴-۱۴۸۵-۱۴۸۶-۱۴۸۷-۱۴۸۸-۱۴۸۹-۱۴۹۰-۱۴۹۱-۱۴۹۲-۱۴۹۳-۱۴۹۴-۱۴۹۵-۱۴۹۶-۱۴۹۷-۱۴۹۸-۱۴۹۹-۱۵۰۰-۱۵۰۱-۱۵۰۲-۱۵۰۳-۱۵۰۴-۱۵۰۵-۱۵۰۶-۱۵۰۷-۱۵۰۸-۱۵۰۹-۱۵۱۰-۱۵۱۱-۱۵۱۲-۱۵۱۳-۱۵۱۴-۱۵۱۵-۱۵۱۶-۱۵۱۷-۱۵۱۸-۱۵۱۹-۱۵۲۰-۱۵۲۱-۱۵۲۲-۱۵۲۳-۱۵۲۴-۱۵۲۵-۱۵۲۶-۱۵۲۷-۱۵۲۸-۱۵۲۹-۱۵۳۰-۱۵۳۱-۱۵۳۲-۱۵۳۳-۱۵۳۴-۱۵۳۵-۱۵۳۶-۱۵۳۷-۱۵۳۸-۱۵۳۹-۱۵۴۰-۱۵۴۱-۱۵۴۲-۱۵۴۳-۱۵۴۴-۱۵۴۵-۱۵۴۶-۱۵۴۷-۱۵۴۸-۱۵۴۹-۱۵۵۰-۱۵۵۱-۱۵۵۲-۱۵۵۳-۱۵۵۴-۱۵۵۵-۱۵۵۶-۱۵۵۷-۱۵۵۸-۱۵۵۹-۱۵۶۰-۱۵۶۱-۱۵۶۲-۱۵۶۳-۱۵۶۴-۱۵۶۵-۱۵۶۶-۱۵۶۷-۱۵۶۸-۱۵۶۹-۱۵۷۰-۱۵۷۱-۱۵۷۲-۱۵۷۳-۱۵۷۴-۱۵۷۵-۱۵۷۶-۱۵۷۷-۱۵۷۸-۱۵۷۹-۱۵۸۰-۱۵۸۱-۱۵۸۲-۱۵۸۳-۱۵۸۴-۱۵۸۵-۱۵۸۶-۱۵۸۷-۱۵۸۸-۱۵۸۹-۱۵۹۰-۱۵۹۱-۱۵۹۲-۱۵۹۳-۱۵۹۴-۱۵۹۵-۱۵۹۶-۱۵۹۷-۱۵۹۸-۱۵۹۹-۱۶۰۰-۱۶۰۱-۱۶۰۲-۱۶۰۳-۱۶۰۴-۱۶۰۵-۱۶۰۶-۱۶۰۷-۱۶۰۸-۱۶۰۹-۱۶۱۰-۱۶۱۱-۱۶۱۲-۱۶۱۳-۱۶۱۴-۱۶۱۵-۱۶۱۶-۱۶۱۷-۱۶۱۸-۱۶۱۹-۱۶۲۰-۱۶۲۱-۱۶۲۲-۱۶۲۳-۱۶۲۴-۱۶۲۵-۱۶۲۶-۱۶۲۷-۱۶۲۸-۱۶۲۹-۱۶۳۰-۱۶۳۱-۱۶۳۲

کی کوشش کی گئی۔ بخشی صاحب نے بیگ صاحبہ کو مانگو کرتے سے چکچکا ہٹ ظاہر کی اور کہا کہ انھیں کشمیر بھر میں مادر مہربان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لہذا اگر بیگ صاحبہ کو اس میں شام کیا گیا تو وہ کشمیر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اس کے علاوہ جواہر لال کی طبع شرافت بھی کام آئی اور انھوں نے ایک متوازن قانون کو فراموش میں شامل کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ پنڈت سہو دیکھ کر دیکھ مجھے بھی فراموش میں شامل کرنے کے بارے میں شش و پنج میں رہے لیکن جب زیادہ دباؤ ڈھونڈا گیا تو انھوں نے اپنی عادت کے مطابق ”کم سے کم مراعت“ کا راستہ اپنا کر ان کر دی۔ میرے خلاف ایک خفیہ چالان ۲۳ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو پیش کیا گیا۔ اور میں نے سازش کے پہلے قزم کی حیثیت سے مرزا محمد افضل بیگ کی جگہ لے لی۔ چنانچہ میں سہ ماہ اکتوبر کو پہلی بار عدالت میں قزموں کے کٹہرے میں پہلی نشست پر بیٹھ گیا۔

سازش کا مقدمہ جموں میں شروع کیا گیا۔ وہاں ہنر کے قریب جواہر لال کے پاس چناب سے نکالی گئی ہے، ایک سپیشل جیل بنایا گیا۔ سپیشل جیل دارمحل قیدی بڑی بوٹی ”کوٹھ“ کا ایک گروام تھا جس میں مکمل جھگڑا لے گیا راج بھنگا کر تھے۔ ان ہی گیراج میں کوٹھ کا ذخیرہ کیا جا تھا۔ اب ان گیراجوں کو مناسب ترمیم و تجدید کے بعد کڑوں میں تبدیل کیا گیا تھا اور اس کے آگے ایک مین پولش ورنڈا بنایا گیا تھا جس سے گرمیوں میں آگ بھڑکی تھی۔ چار پانچ کنال کے قریب صحن بھی تھا اور اس احاطہ کو ایک اونچی دیوار تعمیر کر کے الگ کر دیا گیا تھا ہر طرف سی۔ آر۔ پی۔ کے مسلح سپاہی پہرہ دیتے رہتے تھے۔ بلکہ دیواروں پر بے ہوش اپنے بڑبڑوں سے مسلح سپاہی جیل کے اندر وئی جیسے پر بھی نظر نہ کرتے تھے۔ اس جیل میں میرے علاوہ بیگ صاحب اور گد میں ہمارے دوسرے ساتھیوں کو منتقل کرایا گیا۔ پنڈت

نیدرکنو ہاک کو سپیشل جج مقرر کیا گیا۔ کلکتہ کے ایک بڑے سپر مسٹر مرزا کو استعفا دے کا بڑا وکیل بنایا گیا۔ بخشی صاحب نے سرنگر اور جموں بار کے چندہ چندہ وکیلوں کو بڑی بڑی رقوم دے کر استعفا کی فہم میں داخل کر لیا اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں صفائی کے لیے کسی قابل وکیل کی خدمات حاصل نہ ہو سکیں۔ بہر حال ہم نے متحدہ لٹریٹ قریشی ایڈووکیٹ کو وکیل صفائی مقرر کیا۔ مرزا محمد افضل بیگ بھی ان کا ہاتھ بٹاتے رہے اور خواجہ تبارک شاہ اور خواجہ قلام محمد شاہ بھی معاونت کرتے رہے۔ ہم نے ہندوستان کے بڑے بڑے وکیلوں کو وکالت نامہ لینے پر راضی کرنا چاہا لیکن حکومت ہند اپنا اثر و رسوخ پوری طرح کام میں لاد رہی تھی۔ اس لیے ہمیں ہر ایک نے شکا جواب دیا۔ آخر میں راجی پھار کے ایک وکیل مسٹر محی الدین احمد نے ہمارا وکالت نامہ قبول کیا۔ جب ہندوستان سے ہمیں کوئی اور قابل وکیل دستیاب نہ ہو سکا تو ہم نے جواہر لال نہرو کو خط لکھا۔ اس میں ہمیں نے اس ستم ظریفی کی طرف اشارہ کیا کہ ”مسلطہ میں نہ کشمیر چھوڑ دو“ کی تحریک کے سلسلے میں جب مجھ پر بغاوت کا مقدمہ مہاراجہ کی حکومت نے دائر کر دیا تھا تو خود آپ نے اور آپ کی تحریک پر مسٹر صفت علی، دیوان چمن لال اور پنڈت کے مسٹر سہاسنے نے ہمارے وکالت نامے قبول کیے تھے۔ اور آپ خود بھی پہلی بار سپر مسٹر کاگوں زیب تن کر کے میرے دفاع میں عدالت کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ آج بھر میں ایک سازش کیس میں موٹ کر دیا گیا ہوں لیکن سارا ہندوستان چھان مارنے کے باوجود ہمیں ایک قابل وکیل صفائی دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔ اب جب کہ آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہیں میں آپ سے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ میرے وکیل صفائی نہیں، لیکن اچھی سی توقع ضرور

دکھوں گا کہ آپ کسی قابل وکیل کو اشارہ کر کے اُسے میرا مدافع بنا کر لایا جائے۔ جو اب رائل نے اس خط کا جواب تو یقین دیا اور ایسا لکھا تھا کہ اُن کے کلکٹر شناس ذہن کو اس گنتی ہوتی بات سے متاثر بھی کیا تھا۔ لیکن اقتدار کی مصلحتوں کے پیش نظر انھوں نے ادھر ادھر کی معذرت کر کے معاملہ گول کر دیا۔ مجھے اُن سے کسی مدد کی امید نہیں تھی۔ محض یہ چیز خوں سے ملی جائے اسد کے جذبے کے تحت میں نے انھیں شونی سے مخاطب کیا تھا۔ اُن کے جواب سے ظاہر تھا کہ تیر لٹائے پر لگ گیا ہے اور میرے لیے اتنی ہی تسکین بہت تھی۔

میں نے ذاتی طور پر اپنا انفرادی دفاع کرنے کی پروا نہیں کی اور نہ کسی جرح کا جواب دیا۔ بلکہ جب استغاثہ بار بار سازش کی رٹ لگاتا رہا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور ایک مرتبہ میں نے کہہ دیا کہ میں نے کبھی قشتاد میں یقین نہیں کیا ہے اور نہ سازش میرے خیر میں شامل ہے۔ لیکن اگر آپ پھر بھی جھوٹ بولنے پر مصر ہیں تو مجھ سے سن لیں کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کسی کی مدد حاصل کرنا سازش نہیں ہے۔ دلائل و براہین کو بھی ایک وقت برہمنی کا رجحان کہا گیا تھا۔ لیکن وہ بیسویں صدی کے ایک عظیم انقلاب کا باقی ثابت ہوا۔

ہندوستان سے مایوس ہو کر ہم نے انڈن کے ایک مشہور جبر سرسٹر ڈنگل فٹ کو اپنا جڑا وکیل مقرر کیا۔ انھوں نے اپنے جو نیرتہ پنیک کو بھی جنوں لایا۔ اس طرح ہم نے بھی ادھر ادھر کے ڈکلاء جوڑ کے اپنے بچاؤ کے لیے ایک قیمتی قربانیاں دیں۔ اور اپنے دفاع میں جت لگے۔ استغاثہ نے اپنی رام کہاٹی شروع کی۔ ہم پر بھارت بھارت کے الزام لگائے گئے۔ جن کی تان اس بات پر فوٹنی تھی کہ ہم نے پاکستان سے رابطہ قائم کر کے پاکستان سے روپے، اسلحہ اور ہم حاصل کیے اور ہم کشمیر میں ایک

خونی انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ برہمنی دستاویزات بڑی سخت سے گزری تھیں اور جھوٹے گواہوں کو بڑی قیمن دے کر پکڑ پکڑا لی گئی تھی۔ اُن کی جمنوں کے ایک مہمان خانے میں خوب خاطر تواضع کی جا رہی تھی۔ اور وہاں میٹھ و عشرت کے تمام اسباب بہم رکھے گئے تھے۔

مقدمہ کی وجہ سے ہمارا جیل کا معمول بدل گیا۔ جس طرح ملازم صبح سویرے دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ ہم بھی نہاد وھو کر دس بجے کے قریب کمرۂ عدالت میں حاضر ہو جاتے تھے۔ جو کہ جیل سے نکلتی ایک مکان میں قائم کیا گیا تھا۔ کھانے کے وقت تک اور بعض اوقات اس کے بعد بھی عدالت کی کارروائی جاری رہتی۔ استغاثہ کی طرف سے پراسیکیوشن اور ڈکلاء کا ایک پورا لشکر عدالت میں حاضر رہتا تھا۔ ہم بھی ان پر جرح کرتے رہتے۔ اور اس طرح دن گذرتے جا رہے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد استغاثہ کی طرف سے ایک مشہور وکیل گیشور پرشاد بڑے وکیل بنا دیئے گئے۔ کچھ مدت کے بعد جواہر لال نے اپنا ذاتی دعوہ استعمال کر کے گوالیار سرورپ پاٹک صاحب کے نام پر جبریت نمک کے نائب صدر بنائے گئے۔ استغاثہ کا بڑا وکیل مقرر کر لیا۔ پنجاب کے ایک بڑے پبلک پراسیکیوٹر ایم۔ اے۔ مندرہ استغاثہ کی کمان سنبھالے رہے اور بھی کئی مقامی و غیر مقامی ڈکلاء کی اس مقدمہ میں خوب چاندی ہوئی۔ چنانچہ نکل اخراجات کا حساب لگایا تو خرچے کا بن چار پانچ کروڑ روپیہ کے لگ بھگ بنا۔

میری کمرۂ عدالت میں کبھی کبھی ڈکلاء استغاثہ اور نیج سے خوب ٹوک جواہر لال کرکتی تھی۔ ہم اس استغاثہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ سب جھوٹ پر مبنی ہے اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ لیکن قدرت نے ہمیں

ہندوستان کے رہنماؤں کی فریب کاری اور دغلی پالیسی کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک بہت اچھا اور عمدہ نسخہ تھا اور ہم اس کا خوب فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ استعماری بہت کھتا ختم ہونے کے بعد جب دفاع کی باری آئی تو جی تبدیل ہو گیا۔ شری مہن کرشن بکو چونکہ سیشن جج تھے مقررہ کی سماعت کے لیے سپیشل جج مقرر ہوئے، بکو صاحب نیشنل کالفرنس کے کارکن رہ چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب میں نے عمان حکومت سمبلی ٹوکنو صاحب کی برقیٹیف تقرری کی گئی تھی۔ وہ ترقی کرتے کرتے اسپیشن جج ہو گئے تھے۔ اور انہی کے سامنے ہم قزموں کی حیثیت سے پیش ہو رہے تھے، دنیا کے بھی کیا نیارے رنگ ہیں۔ بہر حال ایک جج کی حیثیت سے بکو صاحب کی شہرت اچھی تھی۔ ہم نے اپنا دفاع شروع ہی کیا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات نے ایک زبردست پلٹا کھایا۔ ہندی عینی بھائی سبھائی کے نعرے لگاتے ہوئے ہندوستانی حکمران اپنے گلے تنگ کرتے آئے تھے۔ لیکن اچانک چین کے ساتھ ان کی لڑاؤ اور تیفائی سرحدوں پر ایسی ضمن گئی کہ فوج کشی کی فوٹ آگئی۔ چین نے تربت اور سیکیانگ کے صوبوں کو طمانے کے لیے لداخ کے اتصالے چین علاقے سے ایک شاہراہ چوری چھپے تعمیر کر لی تھی۔ اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے علاقوں میں گھس آئے تھے۔ بڑائی ہوئی تو ہندوستان کو زبردست پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اور اسے اپنے علاقے میں اندر تک وکیل دیا گیا۔ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کی بڑی تعداد کو چھینوں نے جنگی قیدی بنایا اور ان کے کثیر سامان حرب پر قبضہ کر لیا۔ بیخا میں چین کی پیش قدمی ایسی تیزی سے ہوئی کہ ایک وقت ہندوستان نے اسام کو غالی کرنے کا منصوبہ بنایا اور کلکتہ کو غیر محفوظ سمجھا جانے لگا۔ ہندوستان چونکہ پاکستان کو اپنا پہلے غبر کا دشمن سمجھتا تھا۔

اس لیے اس کی بہت سسی بیہین فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر تعینات تھیں ہندوستان کو کلکتہ کا تھا کہ اگر اس نے ان فوجوں کو وہاں سے ہٹا کر یعنی سرحدوں پر قبضہ دیا تو کہیں پاکستان کشمیر پر حملہ آور نہ ہو اس لیے نہرو نے بڑی پریشانی میں امریکہ سے اندھا کی کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے اور اس سے یہ یقین وہابی حاصل کرے کہ وہ ہندوستان میں جنگ کے دوران کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے گا جس سے ہندوستان کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ قدرت کے کام بھی کچھ عجیب ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے نہرو کو شمال سے آنے والے خطرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خیردار کیا تھا اور اس خطرے کے تدارک کے لیے ہندوستان و پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی تھی اس کا جواب نہرو نے بڑے غور کے ساتھ دیا تھا کہ ”مشترکہ دفاع کس کے خلاف؟“ انہیں چین کے ساتھ اپنی دوستی پر اتنا گھمنڈ تھا کہ وہ پاکستان کے صدر کی اس تجویز کو خاطر میں ہی نہ لائے۔ لیکن اب وہی ہندوستان امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے سلسلے میں میری جوابدہی سے ایک ٹی ٹی ٹی ہوئی۔ کرشنا سیتھن پر ان کا کافی اعتبار تھا۔ اور وہ ان کو بیرونی ملکوں کے دوروں پر روانہ کرتے رہتے تھے۔ کرشنا سیتھن خود ایک کیولٹ کارڈ ہولڈر تھے۔ اس لیے ان کو بڑے خطرے سے بچتے تھے کہ دنیا میں ہندوستان کا صرف ایک دشمن باقی رہا ہے اور وہ ہے پاکستان لیکن اس کے باوجود ہندوستان کو شکایت تھی کہ پاکستان چین کے ساتھ کیوں گھمنڈ کر رہا ہے؟ میں نے اپنی بات چیت میں بظہر ہی کے ساتھ یہی سوال چھیڑ دیا میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان ایشیا میں ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے ارد گرد جتنے بھی ملک ہیں وہ اس سے چھوٹے ہیں۔

کی تجارتی منڈیاں مشترک ہیں۔ بلکہ چین پرانے زمانے میں آن چڑھتا بعض بھی روچکا ہے۔ اور وہاں چینوں کی بڑی بڑی آبادیاں اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً لائشیا، انڈونیشیا، بلکہ سارا جنوب مشرقی ایشیا اس کی مثال ہے۔ چین کو کبھی یہ گوارا نہ ہوگا کہ ہم اُس کی ان مخصوص منڈیوں میں گھس جائیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حالات اس بات کا اشارہ دیتے ہیں کہ چین اور ہندوستان کی دوستی کے پورے کو بڑی احتیاط اور تدبیر سے پروان چڑھایا جانا چاہئے۔ جو ہر لالہ لوے کو بڑا عظیم ایشیا کو مغربی سامراج کے استیصال سے صرف ہند اور چین کی دوستی ہی بچا سکتی ہے۔ میں نے اس پر آن سے پوچھا کہ کیا نفسیاتی طور پر چین ہند کو اپنے برابر درجہ دینے پر راضی ہوگا؟ چین کو تو پرانے کال سے ہی اپنے آپ کو ایک آسمانی حکومت کے رُبوب میں پیش کرتا آیا ہے وہ اپنی تہذیب کو سب سے قدیم اور عظیم سمجھتا ہے اور باقی دنیا کو نیم وحشی تصور کرتا رہا ہے۔ ایشیا میں تو وہ اپنی بڑائی میں کسی کی شرکت کا بالکل ہی روادار نہیں۔ ان حالات میں ہندوستان کو اپنے اندر اس قسم کی ریشتمند طبعی قوت پیدا کرنی چاہئے کہ اُس کے ارد گرد کے ممالک اُس کے محور کے گرد گھومیں اور چین کی گود میں نہ جا پڑیں۔ جو ہر لالہ کے منہ پر اس طرح کی کھری کھری کہنا کار سے دارو والا معاملہ تھا۔ لیکن انھوں نے میری باتوں کو صبر و سکون سے سنا۔ بہر کیف، چین نے ہند پر حملہ کیا تو میں نے جو سپیشل جیل سے جوہر لال کو ایک خط لکھ کر ان باتوں کی یاد تازہ کرائی اور اس بات پر زور دیا کہ وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی ساری قوت اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھانے کی مہم کر لیں۔ اور ان ممالک میں پاکستان کا نام بھلا آتا ہے۔ چین کے حملے نے یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں کر دی کہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔

اس لیے ان کو یہ خط ہمیشہ دامن گیر رہے گا کہ کہیں ہندوستان کی بڑی چھلی کسی وقت اُن کو کھل نہ جائے۔ اس لیے اگر ہندوستان یہ چاہتا ہے کہ یہ ہمسایہ ممالک اُس کے ساتھ دوستی کے بندھن میں بند رہیں تو اُس کے لیے اُس ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان اُن کو اپنے قول و فعل سے یہ یقین دلانا کہ ہندوستان کو اُن کی آزادی چین لینے سے نہیں بلکہ اس آزادی کو مضبوط کرنے سے دل چسپی ہے اور اس غرض کے لیے وہ اُن کی امداد کرنے کو بھی تیار ہے۔ یہی ہے ممالک ہندوستان کے بچے دوست بن سکیں گے۔ اور اُس کے ارد گرد گھومتے رہیں گے۔ لیکن اُس کے برعکس اگر ہندوستان نے "بڑے بھائی" کے دُغم غم اختیار کر لیے اور وہ ہر وقت اُن کے معاملات میں جان بڑھاتا جائز طور پر ہانگ اڑاتا رہا تو ان کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں گے اور وہ ایشیا کی ایک اور عظیم طاقت چین کی گود میں پہنچ جائیں گے۔ اگر جوہر لال کا چٹانہ اور معتد ترین ساتھی بار بار یہ اعلان کرتا پھرے کہ اُس کا دنیا میں صرف پاکستان دشمن ہے تو پاکستان کی نظر میں بھی اپنے سہارے کے لیے کسی اور طاقت کی طرف توجہ نہیں رہے گی۔ اور وہ طاقت یا تو چین ہوگا یا امریکہ میں نے پٹری پٹی کو یہ چیتا دنی بھی دی کہ ہندوستان دنیا کے تمام ممالک سے جن میں چین ایک خاص اہمیت رکھتا ہے دوستی بڑھاتا چاہتا ہے لیکن اس دوستی کے اظہار میں ہمیں ایک قوانین قائم رکھنا چاہئے۔ ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے کی رٹ لگو کر یہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ مختلف ممالک میں دوستی یا بھی مفاد کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ لیکن چین اور ہند کے درمیان حالات کا جو تناظر ہے اُس کے مطابق تصادم کے امکانات نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک ہی سرحد ہے جو کئی علاقوں میں غیر متعین اور غیر واضح ہے۔ ہندوستان اور چین

ان کا دفاع مشترک اور ان کی اقتصادیات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کی زبان، ثقافت، دین، مہن اور خون مشترک ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم تنگ نظری کی سطح سے اوپر اٹھ کر آپس کے اختلافات حل نہیں کر سکتے جو اہل لال کو چین کے حملے تک لیتے تھا کہ ہندو چین دوستی کے بعد پاکستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک کی مدد کوئی مجال ہے اور نہ اہمیت، لیکن ہندو چین جنگ نے اس نظریے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا۔

پنڈت نہرو کو چین کے حملے نے ہلکے رکھ دیا۔ ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہی برک لگی تھی۔ ہندوستان کا چین، اقوامی وقار مند پڑ گیا تھا۔ اور اس کی عملداتی سالمیت کے لاسے پڑ گئے تھے۔ جو اہل لال نے دنیا کے تمام دوست ملکوں کے نام و ناموس کے اتھارے رواں کیے اور بہت سے ملکوں میں اپنے خاص المی بھی بچھ دیئے۔ امریکہ سے خاص طور پر فوجی مدد طلب کی گئی اور اس نے آمنا کہتے ہوئے جدید ترین اسلحہ کی کئی کمپین اپنے دیو میکل ڈانسپورٹ طیاروں کے ذریعہ رات دن ہندوستان پہنچا دیں۔ دوسری طرف، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، امریکہ اور برطانیہ نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پاکستان کو کوئی شراکت کرنے سے باز رکھا۔ پاکستان کشمیر پر نظروں لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے بھی اپنا لشکر بڑھا دیا۔ نہرو نے اس مجبوری میں بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ راستے میں چین نے اچانک ایک طرف جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ چین نے ہندوستان کے فوجی غرور کا بھرم توڑ کے رکھ دیا تھا اور اب بے مثال فیاضی کا مظاہرہ کر کے اس کو دنیا میں اور بھی شرمندہ کر رہا تھا۔ بہر حال اپنے سر پر ملتی ہوئی تلوار کو ساکن ہونے دیکھ کر جو اہل لال نے چین کی سانس لی۔ ہندوستان کے سر پر آئی ہوئی بلاں لگی تھی۔

جب کد جیل میں یعنی جیل کی خبر پہنچی تو ہمیں قدرتی طور پر کافی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب ہماری ریاست کی سر زمین پر ہندوستان کے علاوہ چین کے پالے کی بین الاقوامی طاقت کیل کانٹے سے لیں مگر مصروف جنگ تھی۔ اور ظاہر ہے کہ چین کے خاص حالات اور سیاسی موقف کے پیش نظر اب تیس اور امریکہ کے لیے بھی اس تنازعہ سے الگ رہنا ممکن نہ تھا۔ قسمت نے ہمیں اس اہم اور نازک گھڑی میں جیل خانے میں بے بس قیدیوں کی حیثیت سے ڈال رکھا تھا۔ لہذا ہم اپنا فریضہ ادا کر سکتے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں جو خیالات تلاطم مچا رہے تھے ان کو میں نے جو اہل لال نہرو کے نام اپنے درنمبر ۱۹۴۷ کے خط میں اس طور پر قلمبند کیا۔

”ہماری شہائی سرحدوں پر اچانک دھماکے کے ساتھ جو صورت حال پیدا ہوئی اس سے سارا ملک ایک گمبیر حالت سے دوچار ہو گیا ہے۔ اس موقع پر مادر وطن کے تمام فرزندوں کو اس صورت حال کی طرف توجہ کرنا ہے اور حالات کو نبھانے اور مددھارنے کے لیے کوشش کرنا ہے۔..... مجھے اندیشہ ہے کہ ہم سبھی نے حالات کی خطرناکی کا پورا اندازہ نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ خطرہ اس سے کہیں زیادہ مستقل اور نیر آشوب ہے۔ جتنا یہ سطح پر دکھائی دیتا ہے۔ ہم سب کو قربانیوں اور کھٹائیوں کے لیے تیار ہونا ہے۔ تاکہ مصوٰع حال میں موجودہ خطرے کا مقابلہ کریں۔ کوئی سرسری نظریہ کوتاہ بینی کا ثبوت اور خود کشی کا باعث بنے گا۔.... آزادی ناقابل تقسیم ہے اور اسے سارے برصغیر کے لیے مشترک اور مستقل طور پر محفوظ بنانا ہے۔ اس لیے ہمیں اختلافات کی وجوہات کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو ہر سیاسی ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کو کشیدہ بنائے ہوئے ہیں۔ برصغیر کی گذشتہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے مصائب ہمیشہ ہمارے اندرونی تفرقوں سے پیدا ہوئے۔ یہی تفرقات اور

تباہات، غلط فہمیاں اور غلط اندیشیاں تھیں۔ جن سے حوصلہ پکر بیرونی تملہ آوروں کو برصغیر پر حملہ کرنے کی جرات ہوئی اور بعد میں وہ پہاں کے آقا بن کے رہ گئے۔
..... تقسیم نے یقینی طور پر ہمارے وطن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ایک مصنوعی جغرافیائی دیوار دونوں کے درمیان حائل کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہم اس دیوار کو دونوں کے دل اور دماغ کا بخوارہ کرنے کی اجازت نہ دیں۔ افسوس یہ ہے کہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تقسیم نے ہند اور پاکستان کے درمیان ایسی ہی ذہنی دیواریں حائل کر دی ہیں۔ اس کے نیچے نفرت اور بے اعتمادی کا غبار پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر اس مشترکہ مصیبت کا متحدہ طور پر مقابلہ کرنا ہے تو تمام تعلقہ عناصر کو یک جا ہو کر صفیں آراستہ کرنی چاہئیں۔ ہندوستان ایک وسیع اور وشال ملک ہے۔ اس لیے اس کی ذمہ داریاں بھی اسی لحاظ سے بڑی ہیں۔ ہندوستان کا منصب ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ ممالک میں اعتماد اور پھوسے کی لہر پیدا کرے۔ اسے اگر اس سلسلے میں پہل بھی کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تاکہ آزادی اور عزت کی مشترکہ میراث نکالے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان ایسا کر سکتا ہے اور اس کے ہمسایہ ملک بھی خندہ پیشانی سے اس کی دوستی کا ہاتھ تمام میں لگے۔“

سپیش جیل میں اب ہم نے گھر کا سامانوں کا نام کر دیا تھا۔ حکومت اگرچہ رویہ پانی کی طرح بہا کر ہمیں تجرم ثابت کرنا چاہتی تھی لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے گواہوں پر ہماری دعوامان دار جرنے نے مقدمے کے نیچے آویڑ دیے تھے۔ خود مستیٹ محلے کے چہرہ پر بھی ہوا یاں آڈر ہی تھیں اور ان کے ہاتھ پر ناکامی کی لکیر بن جلی قلم سے تحریر نظر آ رہی تھیں۔

جیل میں دن گزارنے کے لیے ہم نے اپنا ایک داخلی نظام حیات سار تہیب

دیا تھا۔ مختلف امور کے لیے کمیٹیاں مقرر کی گئی تھیں۔ مثلاً منگر کمیٹی، اس کا کام خورد و نوش کی اشیاں منگوانا، ان کو چیک کرنا، کھانا پکانے کی نگرانی کرنا، ساتھیوں کے سامنے روزمرہ کھانے کا مینو پیش کر کے ان کی پسند و ناپسند کی روشنی میں اس کی مناسبت ترمیم و اصلاح کرنا وغیرہ شامل تھا۔ یہ تین افراد پر مشتمل ہوتی۔ اور مہینہ کے بعد اپنی چائنشین کمیٹی کو چارج دیتی۔ ڈائینس کمیٹی، اس کا کام مقدمہ کے کاغذات کا مطالعہ اور ان کی پیروی کرنا ہوتا۔ وکیلوں سے مشورے اور گواہوں کے بیانات کے متضاد اور کوڑو سپلوٹکا لٹا بھی اس کے فرامین میں شامل تھا۔ اطلاعات کمیٹی کا کام اخبارات جیل والوں سے حاصل کر کے انہیں جیل کے درخاۃ میں تقسیم کرنا ہوتا۔ یہ ریڈیو کی خبریں سن کر ان کے متعلق بھی ہمیں آگاہ کرتی۔ طبی کمیٹی کا کام روزانہ ساتھیوں کی صحت کے متعلق چوچہ گچہ کرنا، دوا دارو کا انتظام کرنا اور ہمارے ساتھیوں کی غذا کے متعلق منگر کمیٹی کو اطلاع دینا ہوتا۔ اس کے علاوہ جیل کے باغ کی ترتیب و تہذیب کے لیے تمام ساتھیوں کی ذمہ داری لگائی گئی تھی۔ نماز کے اہتمام کے لیے پیر عبدالغنی اور بمتری نذیر کو اذان اور دوسرے وجاہات کی ذمہ داری لگائی گئی تھی۔ صبح سویرے ہم افان کی آواز پر اٹھتے اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو جاتے جسے مسجد کے طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ باہر نور کی ندیاں آہستہ آہستہ رات کی خلعت کو دھونے لگتیں اور اندر میری امامت میں نماز شروع ہو جاتی۔ میں قرأت اپنی پرسوز آواز میں کرتے لگتا تو کبھی کبھی کچھ آصحاب پر رقت طاری ہو جاتی اور ان کی ہچکیاں بند جاتی۔ پھر ہم اپنے مقدس کلمات اور اودادو آفا کر پڑھتے۔ تو عجیب سرور حضور کا عالم پیدا ہو جاتا اور ہمارے دل بیسے پاکیزگی کے چشموں میں نہا لیتے۔ اس سکون و طمانیت کی لذت بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے کمروں میں جا کر کلام مجید کی تلاوت

کرتے اور اپنی رحوں کو اس سرشارِ عرفان کی کرفوں سے متور اور معتطر کرتے یاں کے بعد
میں اپنے ہاتھ میں کمال کے کرصحن کی پتھر میں زمین میں پھول کھلانے کے لیے معذوف ہو جاتا
باغبانی میرا محبوب مشغلہ ہے اور مجھے فنی و دوق زینوں کو نرم کر کے ان میں رنگ اور
نغمہ آراستہ کرتے ہیں ایک عجیب لطف آتا ہے چنانچہ جنوں جیل کی محنت کا نتیجہ یہ
ہوا کہ یہ بیابان ایک مہکتے اور چمکتے گلستان میں تبدیل ہو گیا۔ چاروں طرف پھولوں
کے تعلق، سبزے کی روشنیوں اور گلیوں کے چمن لہرا رہے تھے۔ سرو و شمشاد کے پاسان
اس چمن کی نگہبانی کرتے ہوئے معلوم ہوتے۔ اور گلوں کے رنگ برنگ پھول شان گل
پر کسی مست شباب کی طرح لپکتے رہتے۔ اور تو اور ہم نے نمونوں کی سنگسار سرزمین پر
چنار اگانے کا تجربہ بھی کیا اور یہ نازک مزاج پودا جو کشمیر کی لطافت آمیز اور نرم و
نازک فضاؤں کا ناز پروردہ ہے، جنوں کی پستانوں میں ہماری محنت سے بار آور ہونے
لگا چنانچہ کچن بھی چنار کے ان درختوں کو ہاں سرسبز و جوان دیکھا جاسکتا ہے۔ غرض
جیل کا گلشن سارے نمونوں میں مشہور ہو گیا۔ جیل کا احاطہ پھول پتی کے رنگ سے
ریشک گلزار اور ان کی مہک سے عبلہ عطار لگتا تھا۔ اگر کوہ باری شاعر فیضی وہاں
آتا تو یہ عالم دیکھ کر بے ساختہ پکارا۔ ج

دریں گلشن ز جوشِ خندہ گل

نمی آید بگوشش آوازِ مکتبسل

ہم نے جنوں میں ہونے والی پھولوں کی نمائش میں جیل کے دار و فہ کی معرفت پھولوں
کے نمونے کیجے اور وہاں سے انعامات بھی حاصل کیے۔ جب ہمیں یہ انعامات ملے
تھے تو ہم کچن کے سے جذبات کا لطف حاصل کرتے اور خوب چمکتے تھے۔
پھولوں کے علاوہ ہم نے سبزی ترکاریوں کے بیج بھی کشمیر لکھنؤ وئی نمائش سے

منگوائے۔ احاطے کو ہوا کر کے اور اس کو چمن زار بنانے میں خوب لطف آتا تھا۔ میر
غلام رسول جو ریاست کے چیف انجینئر رہ چکے تھے اپنے کاندھوں پر مٹی کے ٹوکریں
آٹھائے نظر آتے۔ اور ہمارا ہاتھ بٹاتے۔ شاید ان کو پہلی بار زندگی میں یہ معلوم کرنے
کا موقع حاصل ہوا کہ مزدوروں پر اس قسم کی مشقت کرتے ہوئے کیا گذرتی ہے۔ جلد ہی
جیل کے صحن میں کشمیری ساگ کے پتے، شمار، مٹر، پالک، پودینہ، وحشیہ اور بیگن بہ افراط
اگائے گئے۔ بعد میں ہم اپنے باغ کی سبزیاں شوق سے کھاتے تھے اور ان میں جیل جو لذت
حاصل ہوتی وہ ملکوں کے عوض حاصل کی گئی سبزی باجی میں کہاں جنوں کے لوگوں میں
باغبانی اور پھول اگانے کا کم ہی شوق ہے لیکن ہماری کوششوں سے وہاں اس
طرف کچھ توجہ ہونے لگی۔

ہم جیل میں کھیل کود کے انتظام میں بھی لگے رہے۔ چنانچہ وہاں بیس مینشن
باقاعدگی کے ساتھ کھیلی جاتی تھی۔ لیکن جب میری ٹانگ کا پٹھا کھینچ جانے سے ٹوٹ گیا
تو میں اس کھیل میں حصہ نہ لے سکا۔ ان ہی دنوں مجھے چٹھوں اور ٹانگوں میں تکلیف کی
شکایت رہنے لگی۔ میں نے فوراً اپنی غذا میں کمی کر لی۔ یہاں تک کہ میں نے چاول اور
چپاٹی تک کھا نازک کر دیا۔ بہت جلد میرا وزن گھٹ گیا اور مجھے افادہ محسوس
ہونے لگا۔

عیدین پر جیل میں خاص اہتمام ہوتا۔ ہم لوگ بال بچوں سے دور قوم سے مجبوراً
جیل کی سلاخوں کے پیچھے یہ دن مناتے۔ دنوں میں جذبات کا طوفان اُٹھ اُٹھتا۔ لیکن کسی
کے چہرے ٹکڑے پر پائوسی نظر نہ آتی اور سبھی جذبات کے سیلاب پر صبر و ضبط
کے بندھ باندھے رہتے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں عیدین کے لیے سرنگر سے وازہ دان منگوانے
کا انتظام کروالیتا لیکن ایسا نہ ہو سکتا۔ تو ہم جیل میں ہی بیس منگوا کر آئے دن کر دالیتے

اور تازہ گوشت حاصل کر کے خود دواڑہ وان کے تمام سالن بنا لیتے۔ مجھے کچھ بیان نہ
کا کچھ تجربہ ہے اور میں اس دن خود باورچی خانہ کا انتظام سنبھال لیتا۔ خاص طور پر گوشت تیار
تیار کرنے میں کافی محنت درکار ہوتی۔ کثیرہ آب گوشت شیر خام میں چربی والے گوشت
کو پکا کر سے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ جب ہم آب گوشت تیار کر رہے تھے تو خواجہ
علی شاہ تشریف لائے ان کو دواڑہ وان کھانے کا خوب تجربہ ہے۔ وہ بوسے کر کثیری آشپاز
اس میں تھوڑی سی چینی بھی ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کچھ پر جب اس کے شوربے میں
چینی ڈالی گئی تو بعد میں ایسا معلوم ہوا کہ ہم آب گوشت کے بدلے کھانڈ میں تیار کیے
گئے قہوے کی چمکیاں لے رہے ہیں۔ عید کن وہ ہم بڑے اہتمام سے ڈائیننگ ہال میں
ضیافتیں سجاتے اور کھانا کھاتے۔ افسران میں کو مدعو کرتے۔ قیدیوں میں کھانا تقسیم
کرتے اور طعام کے بعد شعور و شاعری الطیفوں اور قہقہوں کا دور چلتا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں جیل کے سبزہ تار میں باغبانی میں مصروف تھا کہ انسپٹر
جنرل پولیس مسٹر جہو آگئے۔ مہر و صاحب کو خوشی غلام محمد نے خوب سرچڑھا رکھا تھا
اور مقدمہ سازش کی وجہ سے ان کا ناچوں گمی میں اور سرکار کھالی میں تھا۔ اس لا ڈ
پیارے اُن کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ اور وہ اپنی اوقات بھول کر غیر متعلقہ
معاملات میں ٹانگ اڑانے لگے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ شیخ صاحب بکنا اچھا
ہوتا کہ آپ جواہر لال نہرو کے ساتھ مصالحت کرتے۔ میں نے مسکرا کر مضبوطی کے
ساتھ جواب دیا کہ آپ ملازم سرکار میں اپنا کام کیجیے اور اپنی تنخواہ حاصل کیجیے۔
سیاسیات کے کبھی بڑے میں اُجھٹے سے باز رہیے۔ لیکن جہو کے سر پر بھوت سوار تھا۔
بھلا نرم باتوں سے کیا اُترتا۔ لگا اصرار کرتے۔ اس پر مجھے تالا دیا گیا اور میں نے انہیں
السا ڈانٹا کہ وہ میرے سامنے سے ایسے غائب ہوئے جیسے گھر کے سر سے سیلنگ

اور آئندہ احتیاط کا مدن تھا کرتے رہے۔

کبھی کبھی جیل کے اندر رہنے والوں میں معمولی باتوں پر خوشی واقع ہوتی اور معاملہ
روشنے منانے تک آجاتا۔ یہ رعنائش تاش کے پتوں کھانے پینے کی چیزوں وغیرہ پر بھی
ہوتی۔ دراصل جیل میں آدمی کی نگاہ محدود ہو جاتی ہے۔ اس کی طبیعت میں چڑچڑاہٹ
آجاتا ہے۔ انسان کے دل کی عجیب کیفیت ہے بلند یوں کی طرف مائل پر واز ہو تو
اس میں تقویم اور ہفتیوں کی طرف توجہ ملنا شروع کر دے تو اسفل السافلین سے جگرتے
کیا خوب کہا ہے ۛ

گئے اُتر تو بس اک مشت خاک ہے انسان
بڑھے تو وسعت گوین میں ستارہ کے

عدالت کے کمرہ میں بھی مقدمے کا سوانگ جاری تھا۔ اب اس کی تمام سنجیدگی زائل
ہو چکی تھی اور یہ ایک ڈھونگ بن کر رہ گیا تھا۔ میں کورٹ کی کاروائی کے دوران
اکثر کوئی کتاب یا اخبار کے کڑیاں بعد میں مصروف رہتا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز لیکن
جب عدالت میں استغاثہ کی طرف سے کوئی برداشت سے باہر نامقولیت کا مطالبہ
سامنے آجاتا تو میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتا اور کہہ اُٹھتا کہ ہمارے نزدیک
اس کاروائی کی حقیقت ایک نانگ سے زیادہ نہیں ہے۔ جو دلی کے مشورے پر یہاں
کھلا جا رہا ہے۔ اس پر استغاثہ کے وکیلوں کو مہربان لگ جاتیں۔ وہ خوب شور و
غوغا کرتے۔ لیکن بعد میں خود اپنے ہی ایلٹے ہوئے خون میں مل جھن کے رہ جاتے۔

کبھی کبھی کوئی گواہ ایسی ہے پر کسٹنا کہ اس میں پریش میں آجاتا۔ مجھے قانونی
مشورہ گانیوں سے کم ہی دل چسپی رہی ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں گواہوں پر جرح کرتا۔ اُن
کی حالت ایسی غیر ہو جاتی کہ وہ ساری پڑھائی نوٹی پٹی بھول جاتے اور شتم شتم

کئے گئے۔

دوسرے کو ہر سال میرے رفقاء جیل میں میری سالگرہ خوب دھوم دھام سے مناتے۔ میں اگرچہ اس دن کچھ جذباتی سا ہو جاتا تھا مگر یہ تقرب عید کی سی تقرب میں تبدیل ہو جاتی۔ کئی مرتبہ تو رشتیوں پر ایسی حالت طاری ہو جاتی کہ وہ آنسو بہانے لگتے ہیں انھیں دلاسا دیتا اور کہتا کہ یہ آزمائشیں راقم حق میں استقلال کا انعام ہوتی ہیں اور انہی سے ہماری قوم کی جبین پر روشن مستقبل کی حریر اُجالے کے حروف میں رقم ہو رہی ہے۔

ہم جتوں جیل میں ہی تھے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے بمبئی میں انتقال کی خبر آئی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی استحقاق جوں کے شہر پر ہوائی جہاز کے ذریعے کبیر دی گئیں۔ شاید وصیت کرتے وقت مہاراجہ کو یاد نہیں رہا کہ ان کے خاندان اور خود انھوں نے کشمیر پر ایک سو سال مشائخ سے حکومت کی تھی۔ یہاں کے نظاروں کا خوب لُغت اُٹھا یا تھا اور یہاں کی دولت کو دو دو ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ استحقاق کے معاملے میں بھی انھوں نے اپنی جائیداد رکھی۔ مجھے اس موقع پر کشمیر کے عظیم حکمران زین العابدین کی یاد آگئی۔ زین العابدین کے یرکاح میں جوں کے راجہ کی دو بیٹیاں کے بعد دیر سے آگئی تھیں۔ جب یہ رانیاں دسہر کا شہوار سناٹیں تو سلطان کے سامنے پر تلک لگانے کی خواہش کرتیں۔ اگرچہ سلطان شرع کے پابند جسے پاکیزہ مسلمان تھے۔ لیکن وہ مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں بڑی خندہ پیشانی سے اس مذہبی روایت کی پاسداری کی اجازت دیتے۔ اس سلسلے میں مجھے زین العابدین کے کردار اور رعیت نوازی کی ایک اور مثال یاد آ رہی ہے۔ وہ جیل ورکے درمیان بنے ہوئے معنوی جزیرے ”زمینہ پ“ میں مقیم تھا کہ آئے

دور دامن کوہ میں ایک پانگی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے اپنے کسی درباری سے پوچھا کہ یہ کس نام کی سواری ہے؟ کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ یہ راجواری کے راجا کی جو ایک ہندو تھا ابھی ہے۔ جسے اس نے غیر سگالی کے طور بادشاہ کے حرم میں داخل کرنے کے لیے بھیجا ہے لیکن بدشاہ نے اس کو اپنی منکوہ بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تاوان سنگی میں ہی ہوں اس کو مانا کہہ ٹپکا ہوں۔ اب اس کے ساتھ شادی اخلاق سے بعید ہوگی۔ چنانچہ اس کو پوری تعظیم کے ساتھ انعام و اکرام دے کر واپس بھیج دیا گیا۔ اور اس طرح اخلاق بندی کی ایک مثال چھوڑ دی۔ بہر حال ہم نے جوں میں میں مناسب الفاظ میں اظہار غم کیا۔ میں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ آنجنابی مہاراجہ سے ہم ڈٹ کر ملے تھے۔ لیکن ان کی طبی خودداری قابل تعریف تھی۔ انھیں جوں و کشمیر کی الگ اور انفرادی شخصیت کا احساس تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ ریاست سے باہر چلے گئے تو پھر ان کے غور کرنے واپس آنا برداشت نہ کیا اور نہ وہ کبھی حکومت ہند کے حاکموں کے دروازے پر دیکھ گئے۔ البتہ ان کے یہ اوصاف اس نظام کی بحیثیت چمکے گئے جس کے وہ خاصے تھے اور جو کل رنچہ کا تھا۔ اس دن عدالت ہماری تجویز پر کوئی کارروائی کے بغیر نہ گئی۔

عدالت میں باہر سے ہمارے بلے والے کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمیں وہاں کا شی نامتھ بامزئی نظر آئے۔ غالباً وہ مجھ سے جو امر لال کی اکابر کوئی بات کرتا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے دوسرے ہی ہاتھ ہا کر ان کے سلام کا جواب دے کر بات کو مائل دیا۔ اسی طرح راجستھان کے ایک لیڈر نے راجن ویاس مجھ سے ملنے کے لیے آئے وہ میرے پڑانے دوست تھے۔ وہ سٹیشن میوزک لائبریرس میں ہمارے ساتھ کام کر چکے تھے۔ لیکن اب وہ جو امر لال تھوڑی لگا ہوں گے۔ جس کا ذکر میں پہلے کہیں

کر چکا ہوں۔ میں شعیب احمد شعیب سے پہلی بار عدالت کے کمرہ میں ملا۔ مجھے یہ فوجوان اپنی رفتار، گفتار اور اطوار کے لحاظ سے آفت کا پر کالہ نظر آیا۔ میں اس کے فصیح اور پُر اعتماد لہجہ، دلجو اور تیزی و طراری پر عیش عیش کر اٹھا۔ اور سوچنے لگا کہ کیا واقعی کثیر میں ایسے جگمگ، مگمگ کرنے والے فوجوان پیدا ہو گئے ہیں؟ لیکن اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ بعد میں اس کے کردار کا کیت و کم پوری شدت کے ساتھ سامنے آ گیا۔

اس طرح کئی اور ساتھی اس مقدمے میں دل چسپی لیتے تھے۔ اور ان سے عدالت کے کمرے میں ہی ملاقات رہتی تھی۔ بدلتی چوری ایک ایسے ہی شخص تھے۔ کہیں کہیں کمرہ عدالت میں کچھ دلچسپ واقعات بھی رونما ہوتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ مٹھانے کا ایک گواہ عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ یہ پونچھ کے علاقے کا ایک گوجر تھا جس کو استقلانے کے کسی نقطے پر شہادت دینے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ہم نے اس سے سوال کیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں سے کس سے تمہیں زیادہ محبت ہے؟ اگرچہ وہ ایک ان پڑھ گوجر تھا لیکن جس نے ایک بڑا جراتور اور گڈتہ جواب دیا کہ مجھے سب سے زیادہ اپنی بھینس سے محبت ہے۔ اس پر ساری عدالت قبضے سے گونج اٹھی۔ انہی دنوں کا ایک اور واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہے۔ میری سالگرہ کے دن مجھے مس بر دولہا سارا بھائی کی طرف سے مبارکباد کا ایک خط موصول ہوا۔ انہوں نے راجندر ناتھ شیگور کی ایک نظم بھیجی تھی۔ نظم میرے حالات اور میری ذہنی کیفیت سے کی ایسی چمکی ترمجانی کرتی تھی کہ میں اس کو پڑھ کر کھڑک اٹھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے خود راجندر ناتھ نے میری صورت میں بیڑ کر کے نظم تمجین کی ہے۔ شاید یہی وہ شاعرانہ اعجاز ہے جس کی طرف غالب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ میرے دلی ہیں

نظم اتنی زوردار اور مستقل آہی دیت کی حامل ہے کہ میں اس کا اردو ترجمہ دیت کرتا ایک خوشگوار فریضہ خیال کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان تھا "اکیلے چلے" "مقنوں ہے۔"

"اگر تمہاری پکار سننے کے لیے کوئی نہ آئے تو تم اکیلے چلو
اگر تم سے کوئی بات نہ کرے

اگر سب اپنا منہ پھیر کر چلیں

تب بھی راستے کے کانٹوں کو تم اپنے لبو لہان پیروں سے روندتے چلو
اگر تمہارے لیے چراغ نہ چلیں

اگر اندھی ابرسات اور اندھیری رات میں سب لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیں

تب بھی تم اپنے غم کی آگ سے اپنے دلی کو سٹگاتے اور ہلاتے ہوئے آگے بڑھو
اور اسے اکیلے۔ اکیلے ہی روشن رہنے دو۔"

سپیشل جیل میں دن گذرتے گئے۔ میرے رفیق مجھ سے کہنے لگے کہ ہندوستان نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا اور اس کے راہنماؤں نے ہماری دوستی کا جو جواب دیا ہے اس کے بعد تم کیوں اور کس بات کے لیے اپنا رشتہ اس ملک کے ساتھ قائم رکھ سکتے ہیں؟ ان کا شکوہ ٹھیک تھا اور گوہر بجا اگر میں نے ان سے کہا کہ ہم نے اپنا رشتہ ہند کے ساتھ آدھشوں کی کیسانیت پر جوڑا ہے اور جب تک ہندوستان ان آدھشوں کی علیاداری کا دعویٰ کرتا ہے ہماری جگہ کہیں اور نہیں ہے۔ چاہے ان کا عمل ان کے قول سے کتنا ہی متضاد کیوں نہ ہو۔ ہم آدھشوں کے لیے جدوجہد

کر سکتے ہیں اور ان کے لیے فضا سازگار بنا سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان کا وجود تو ان آدمیوں پر قائم ہی نہیں ہوا۔ لہذا سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت کے لیے وہاں گنجائش نہیں۔ ہم نے جو خواب کشمیر میں دیکھے ہیں ان کا تو پاکستان میں شرمندہ تعبیر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ اس لیے ہمیں ہندوستان میں ہی رہ کر اپنے آدرشوں کی بنیادیں استوار کرنا ہوں گی۔

ہمارے ساتھیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جن کو کسی خاص وجہ کی بنیاد پر تو نہیں البتہ بخشی صاحب کی ناراضگی کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ بخشی صاحب ان کو اپنے شیشے میں آکر نہ رکھ سکے تھے۔ ان پر بے انتہا ظالم توڑے گئے۔ انہیں پوچھ گچھ راز و گیشن، مراکز میں عذاب کا نشانہ بنایا گیا۔ آخر برداشت کرتے تو کہاں تک؟ ان کے مزاج میں یہ سختیاں جیلوں کی صلاحیت واجبِ حد تک نہ تھیں۔ اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح گلوٹامی حاصل کرنے کے لیے باخود پیر مارنے لگے چنانچہ انہوں نے حکومت سے رابطہ قائم کر لیا اور بالآخر رہائی حاصل کر لی۔ بعد میں یہ ذمہ نہ کھوئی ہوئی غلامتوں پر بحال ہو گئے بلکہ بقایا جات کی رقومات بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارے ان ساتھیوں میں بندھن جی، غلام محمد ٹیکن، میر غلام رسول اور محمد امین آبی گڈر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تھک تھک کے ہر مقام پر دوچار رہ گئے

(غالب)

▲▲▲

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

کشمیر کے سینکڑوں پیر سازش کیں کا سوا ملک رچانے کے لیے مرکز اور بخشی سرکار نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن تقریباً پانچ سال کا عرصہ گزر جانے اور کوئی ڈھائی کروڑ روپیہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود کیں کی چال اُلٹی پڑ رہی تھی۔ درودِ گو کا حفاظت نہیں ہوتا اور یہ پرانی کہاوت مکروۃِ عدالت میں سماعت کے ہر روز دوہری قوت کے ساتھ سچی ثابت ہوئی جاتی تھی۔ استفانہ نے کذب و افترا کا جو جال بٹنا تھا وہ اب تار تار پھوٹا جا رہا تھا اور یہ مقدمہ ساری دنیا میں مذاق اور تمسخر کا موضوع بن گیا۔ جس میں خود ہندوستان کی گت بن رہی تھی۔ چنانچہ دُنیا کے اس مُرد کی ترجمانی لندن کے مشہور اخبار ”آئرنور“ نے اپنی ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں اس شاہ سُرخ کی تحت شائع ہونے والی خبر میں کی۔

”شیخ عبداللہ پہ مقدمہ لیکن کپڑے میں خود ہندوستان“

SHEIKH ABDULLAH ON TRIAL BUT INDIA IN THE DOCK

جو آج لال سے لاکھ اختلاف ہوں۔ مگر کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ وہ بڑی مشکل میں

[illegible]

پتیا بغیر اذن مری کیا مجال تھی

در پر وہ چشم یار کی شہ پائے پی گیا

یہ بخوبی کانگریس اپنی کامان کی ایک بینک میں پیش ہوئی۔ جو اگست ۱۹۶۲ء کے اوائل میں ہوئی۔ بخشی غلام محمد بھی اس میں موجود تھے۔ جب سبھی ممبروں نے اپنے استعفیٰ جوامہ لال کے ہاتھ میں تحفہ دیے تو بخشی صاحب نے کیسے خفا میں اُٹھارہ جاسکتا تھا ان کے مزاج میں ایک جواری کی طرح بڑی بلیک bluff کا فضا غالب رہا تھا۔ اور محسن اتفاق ہے ان کی کچھ بازیاں سیدی بھی گر چکی تھیں۔ چنانچہ وہ ایک اور داؤ کھیلنے کے

تھے۔ بقول راج گپال اچاریہ وہ اپنے دور کے ہندوستانی سیاست دانوں میں سب سے زیادہ شائستہ اور مہذب تھے۔ جتنا پتھر وہ اپنی اور اپنے ملک کی شہینہ کی اس ڈرگت پر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے۔ وہ بار بار بڑبڑاتے رہتے کہ اس سازش کیس کا ناکم ختم کیا جائے۔ لیکن ان کے ارد گرد بخشی صاحب اور اس کے حواریوں نے اپنے ظفروں کی ایسی فیصل کھڑی کئی کہ وہ صاف پتھر اکر رہ جاتے۔ وہ جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں غلامین معمول کثیر آئے اور بخشی کو اشاروں اور لکناؤں سے اپنے دل کا ماجرائے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن حیدر سازی اور پہاڑ بازی کے پختہ دلوں نے بخشی ان کی ہر پہل کو مات دینا شروع کیا۔ جواہر لال نہرو درویش برجان درویش کے مصداق بار بار آپے سے باہر ہوتے رہے اور اپنے ضمیر کے کانٹے کی تلاش سے بے قرار ہو کر انھوں نے بخشی صاحب کو یہ کہہ کر اختلاف قلب میں مبتلا کر دیا کہ وہ یہاں سے سیدھے جموں جا کر مجھ سے قید میں ملاقات کریں گے۔ بخشی صاحب پھر بھی نال مثل کرتے رہے تو جواہر لال نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ ان کا پتہ کاٹ دیں گے اب اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک موزوں گھڑی کا انتظار تھا اور اس۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی صحت مند زندگی کے بعد می گرن شروع ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بھونگ کے سامنے اپنی غلطالیوں کے تباہ کن عواقب دیکھ رہے تھے۔ ان کی تیاری دنیا کا سارا ڈھانچہ ہمارا ہوتا تھا۔ خارجی معاملات میں ہندوستان کا وقار انتہائی پست ہو گیا تھا۔ اور داخلی معاملہ بھی جواہر لال کی سرقتی شخصی شخصیت کا مظہر ٹوٹنا جا رہا تھا۔ انھوں نے پہلے کر شتیا سین اور جرنل کپا۔ این۔ کول کا لیڈان کر کے اس سٹیبل کا رخ موڑنا چاہا لیکن انھیں خود اپنی کامیابی میں اپنے رفیقوں اور حریفوں کے سامنے لہو لہاتے ہوئے نظر آنے لگے۔ یہ بے زبان حریف جو ان کے سامنے

تھی، انھوں نے یہ حال دیکھا تو مرکزی حکومت کو لکھا کہ انھیں اپنا اقتدار اپنے جانشین کے سپرد کرنے سے پہلے شیخ محمد عبداللہ کو برا کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن جواہر لال نہ گولیاں نہ کیٹلتے تھے وہ جانتے تھے کہ بخشی سے سب کچھ اپنی فنی موتی لاج کا کچھ حصہ بچانے کے لیے کر رہا ہے اور یہ ہارسے ہوئے جواری کا داؤں ہے، انھوں نے اس اقدام کا بہرہ اُن کے سر ہاتھ سے لے لیا کہ ریڈیو انجینئرز کے کھڑے میں اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے یکدم تہما چھوڑ دیا۔

بخشی غلام محمد کو اقتدار کی جو عطا گئی تھی وہ انھیں بار بار کسی نہ کسی روپ میں اس کے ساتھ چھڑ رہے پراساری تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہرو کے منظور نظر الزاکار اور اپنے پرانے قریب صادق صاحب کو وزیرِ اعظم بننے کا موقع نہیں دیا۔ اور اپنے ایک غیر معروف کٹھ پتلی شمس الدین کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ لیکن طاقت کا چمکدایا تھا کہ انھوں نے نہ سر ہنگار نہ ہی جوں میں وزیرِ اعظم کی رہائش گاہ خالی کی بلکہ وہ بدستور ریاست کے پلاننگ بورڈ کے چیرمین کی حیثیت سے براجمان رہے۔ نئے وزیرِ اعظم کو دفتر جانے سے پہلے ضروری کاغذات ایک میرٹھشی کی طرح اُن کی توجہ میں لانا پڑتے تھے۔ اور بعد میں وزیرِ پنج کر وہ ان ہی کے زبانی اسکا مات کے مطابق کارروائی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بخشی صاحب کا دن بھر کا مشغلہ افسروں کو براہ راست فون کر کے غلط سلسلہ سفارشیں کرنا ہی گیا۔ چونکہ افسر جانتے تھے کہ اصل اقتدار اُن کے ہی پاس ہے۔ لہذا وہ شمس الدین کٹھ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس کے علاوہ بخشی کا نفرین اور اوقاتِ اسلامیہ کے سربراہ بھی بنے رہے۔ دوسری طرف ماموں زاد بھائی بخشی عبدالرشید بھی سرکاری کام کا ج میں برابر دخل اندازی کر رہے تھے۔ اور شمس الدین کی کٹھمی انتظامیہ ملی کے ان دو باتوں کے درمیان پستی جا رہی تھی۔

یہ کرہستہ ہو گئے اور تنگ میں آکر اپنا استعفیٰ جواہر لال کو پیش کر دیا۔ بخشی صاحب کا گمان یہ تھا کہ کشمیر میں انھوں نے کمزور قریب کا چھندا پھیلانے میں مرکزی حکومت کی جوامادی ہے اس کے پیش نظر جواہر لال اُن کو مستعفی ہونے کی اجازت نہ دیں گے اور وہ لوگ گرفت میں صوبہ شہیدان میں شامل ہو جائیں گے۔ جب جواہر لال نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر اُن سے سوال کیا کہ آپ تو کانگریس کے ممبر نہیں ہیں پھر آپ پراس فیصلہ کا اخلاق کیسے ہو گئے تو بخشی صاحب نے باہیں کھل گئیں کہ جواہر لال پر اُن کا جادو چل گیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بڑے طعنان سے چار آنے کا ایک چمکتا ہوا کھنکھنا ہوا اسلحہ جیب سے نکال کر یہ کہتے ہوئے ہوا میں اچھال دیا کہ یہ رنگیت کی قیس ہے اس کو قبول کر کے مجھے کانگریس کا ابتدائی ممبر بنائیے۔ جواہر لال نے ایک مشتاقی کھلاڑی کی طرح صیاد کو خود اپنے ہی دام میں پھنسنے ہوئے دیکھا تو خاموشی سے استعفیٰ وصول کر کے اپنی مسل میں رکھ دیا۔ جب دوسرے دن جواہر لال کے فیصلے کا اعلان ہوا تو ایک سیاسی دھماکے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے مارجی توکسیا، لال بہادر شاستری، جگجیو رام، کام راج ناڈرا، چندر بھان گپتا کے ساتھ ساتھ بخشی غلام محمد کو بھی جکڑ کر دیا تھا۔ بخشی غلام محمد نے جواہر لال کا فیصلہ نہ دہی میں سنا اور ہاتھ سے رو گئے۔ دوسرے دن وہ علی الصبح اُترے ہوئے چرسے کے ساتھ سر ہنگار آئے اور یہاں اپنی سلطنت کا تختہ الٹتے دیکھ کر اور بھی حواس باختہ ہو گئے۔ انھوں نے اپنے حامیوں سے جیسے کرائے اور پھر اُن مجلسوں میں نعرے لگوائے "پنڈت جی پھر سوچو" استعفیٰ واپس لو، لیکن غیل خان کے فائدہ اُڑانے کے دن چلے گئے تھے۔ اُن کی دل نہ لگی تھی۔ اور وہ وزیرِ اعظم کے اس سنگھاسن سے بے آبرو ہو کر محروم کر دیے گئے جس کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنے تحسین سے ہی کیا اپنی قوم سے بھی وفا کی

صادق صاحب ، دینی اور ان کے ساتھی اس صورت حال کو کب تک برداشت کرتے انہیں معلوم تھا کہ دینی کا دست شفقت ان کی پیٹھ پہلا رہا ہے اور مرکز شمس الدین سرکار کو ایک ناجائز اولاد کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ایک قیامت کی چال چلی گئی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو کشمیری قوم اس ہوش و تاب خیزے بجو بگی ہوئی گرفتار شریف حضرت بل سے حضور پیغمبر اسلام کے موسے مقدس اپنی قرا گاہ سے غائب پائے گئے ہیں۔ دیکھو حضرت بل اور اس میں موسے مبارک کے قیام کی تفصیل پہلے میان کی جا چلی ہے۔ موسے مبارک شیشے کی ایک ٹی میں نصب تھے جو چاندی کے ایک ظرف میں چھپے سے یسوست ملے گئے تھے۔ شیشہ ایک طرف سے تھمرامیڑ کی طرح اس طرح بنایا ہے کہ اس جانب سے کچھ بھی دیکھا نہیں جاسکتا۔ الیہ سامنے سے موسے مبارک نظر آسکتے ہیں۔ یہ صورت مسئلہ سے قائم تھی۔ افغانوں کے عہد میں ایک فرعون مزاج سے دوبارہ آزاد خان نے موسے مقدس کی اس خاصیت کی کہ یہ آگ کے شعلوں میں بھی محفوظ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ، کی آزمائش کرنا چاہی۔ روایت کے مطابق اس نے موسے مبارک کو چاندی کے ظرف سے الگ کرنے کے لیے ہمازور مارا لیکن ناکام رہا۔ البتہ اس گمشدگی میں موسے مبارک کے اوپری حصے میں خفیت سا اثر آگیا ہے مقدس تبرک کے پائیں حصے میں اسے نمایاں و دیدہ زیب بنانے کے لیے ٹھیکوں کی طرح کے آؤریزے بنائے گئے ہیں۔ جنہیں کشمیری زبان میں ”غلطن“ کہہ کر پیکارا جاتا ہے۔ دیدار کے وقت زیارت کا تہجد اور اسی تبرک کو طہارت و تطہیر کے بعد سبز عبا پہن کر شہنشاہان وید کے سامنے لاتا ہے۔ اس تبرک کو بہتر تھلی غلات اور فروٹ کی چوب کاری کے ایک مندوچے میں رکھ کر زیارت کے بچوں بچ واقع ایک بڑے کمرے میں رکھا جاتا ہے جس کے دروازے پر مضبوط تانے لگائے جاتے

ہیں۔ چارپان مجاور کے پاس امانت رکھتی ہیں۔

اس دلدوز واقعہ سے پہلے ، ۴ دسمبر کو اس کا دیدار عام درگاہ کے بڑے مجاور مرحوم عبدالرحیم شاہ باندے نے کر لیا تھا۔ اور ۴ دسمبر کو کسی صاحب اثر و شہسوار کے کہنے پر مجاور مذکور نے ہی اس کو نجی طور پر موسے مبارک کا دیدار کرایا۔ یہ موسم کشمیر میں سردیوں کے نقطہ عروج یعنی چلے کلان کا زمانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اطلاعات کے مطابق اس رات عشا کی نماز کے بعد زیارت میں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ صبح جب رحیم شاہ زیارت میں پہنچا تو وہاں یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ دروازے کا تالا ٹوڑ دیا گیا ہے اور اس چوٹی مندوچے کو جس میں موسے مبارک رکھے ہوئے تھے ، گھلا چھوڑ دیا گیا ہے لیکن اس حدت کے یلین میں جس مقدس شے کا گوہر ابدار چمکتا تھا وہ غائب کر لی گئی ہے۔ بس پھر کیا تھا یہ تبرک ایک صاحب کی طرح نیکی اور صلہ کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔ وادی میں برت باری ہو رہی تھی۔ لیکن اس وحشت ناک اطلاع نے دونوں میں جذبات کے الٹاؤ روشن کر دیے۔ ہر طرف ہڑام پچ گیا۔ زہرہ زہرہ ہوا میں عقیدت کے شعلوں کو چمکانے کی بجائے انہیں اور پکڑنے لگیں۔ ساری وادی میں کار و بار زندگی متھل ہو کر رہ گیا۔ احتجاجی اور احتجاجی مظاہروں کا بے نظیر سلسلہ شروع ہوا حکومت سے عضو معطل بن کر رہ گئی۔ عوام کے غم و غضب کے سامنے دس سال کا ویرانہ استبدادی نظام پھر ستر کا پینے لگا۔ جس کو کوئی دہائی نے غولادی ہتھیاروں اور سونے کی چمک و مک سے اپنی واپست میں سیدہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا کر دیا تھا۔ شمس الدین اور اس کے سارے حوالی مولائی اپنی سرکاری کوششوں میں بے بس قیدیوں کی طرح محسوس ہو گئے۔ عوام کا ایک عظیم جلوس جب مظاہرے کرتا

ہو الال چوک پہنچا تو بخشی دود کا معام پہلوان بخشی رشید ایک جیب میں فوٹے بھرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ وہ حمل کا اندھا تو تھا ہی۔ نہ شمع کے تیر بچان سکا اور نہ تقدیر کی منطق بھانپ سکا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ اس عوامی سمندر کی غضب ناک لہر ہے جس کے خروش کے سامنے بڑے بڑے فرعون و ہامان تنکوں کی طرح ایسے بہ گئے ہیں کہ پھر قورسٹ کی غلام گردشوں میں اُن کا نام و نشان تک باقی نہ رہ سکا ہے۔ اس نے اپنی بھونڈی آواز سے کچھ تنکائے کی کوشش کی کہ جمع میں سے ایک آتش باز کا گولی حضرت داؤد کے چیلنے کی طرح پر کھولتی ہوئی آئی اور بخشی رشید کے جاوت ملنا وجود کے ساتھ ہی اُس ماسرے طاغوتی نظام کے لیے پیغامِ اہل بن کر گری جس کی بنیاد سٹھہ کے جاننا ز اور جاں نیشار شہیدوں کی جوان تہیوں پر رکھی گئی تھی۔ بقول شاعر:

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلہ پُر بیچِ کتاب

عبدالرشید بخشی جو غلام کا ایک قلبِ مینار نظر آ رہا تھا اس لہر میں ایسا ڈوبا کہ پھر اُس کا نام و نشان بھی نظر نہ آیا۔ عوام کا پھرا ہوا باغی چلچھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے بخشی برداروں، جنھیں عوام ہٹاؤ بی۔ بی۔ سی (بخشی برادر س کارپوریشن) کہہ کر پکارتے تھے کے وہ سینٹا ہال اور موٹل مندر آتش کر دیئے، جن کے حصول کے لیے اُنھوں نے اپنی قوی و قناری اور خاقی دیانت کا نیلام کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خشتِ ناک عوام نے ریڈیو کشمیر سرینگر کا وہ جھوٹا مندر بھی آتش کر دیا جہاں سے مرکزی سرکار اور بخشی انتظامیہ نے کشمیری عوام اور اُس کی قیادت کے خلاف کِردار کشی اور بہتان تراشی کا زہر دس سال تک اگلا تھا۔

وادی کے ان تلامذہ تیز واقعات سے وئی کے ایوانوں میں ہولناک وزرہ آگیا اور خوابِ خرگوش میں مست و بی کے مکران جو بخشی کی پلائی ہوئی جوس و ہوس کی فینون

کے اثر سے پینک میں تھے بھی اُنکھوں سے دیکھتے کے دیکھتے رو گئے۔ یہ خبر ساری دنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی اور دنیا بھر کے نشریاتی اور اطلاعاتی اداروں نے اسے خوب تشہیر دی۔ تہذیب و حالات کی کردت سے گھبرا گئے۔ اُنھوں نے خود ریڈیو سے کشمیری عوام کے نام بڑی پچھے دار اپیل نشر کروائی۔ لیکن خود ریڈیو جھوم کر اُنھیں دہ تنکوں سے کہناں ٹاٹے جاسکتے ہیں۔ قدحِ حواس میں تہہ و نہ پھر بخشی جو وجود ہی کے ایوانوں میں ہی کا رہ گدا ئی لے کر مارا پھرا ہوا تھا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق سرینگر حالات پر قابو پانے کے لیے بھیجا۔ بخشی صاحب سرینگر آئے۔ اور ریڈیو پر تیس ماہِ خاقی بگھارنے لگے۔ لیکن جوہنی عوام کو اُن کی آدمی کی اطلاع ملی اُن کی رہائش گاہ پر ہڈیوں دیا گیا جس کو بچانے کے لیے پولیس اور فوج نے اُن کو کھلی کے عین سامنے کتے ہی سرفروشوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ لیکن اس کے بعد بخشی کو عوام کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ بھی ہندوستانی سنگینوں کے سامنے اس اپنی رہائش گاہ میں ایک قیدی کی طرح امیر ہو کر رہ گئے۔

تہہ و نہ آگ کے شعلوں کو فرو کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر آزمائی۔ ایک مرتبہ پر مرکز سے پولیس، فوج اور پروٹیکشن کے بڑے بڑے سرفروشن پر مشتمل ایک بھاری ٹانک فورس سرینگر اس غرض کے لیے روانہ کیا گیا کہ وہاں شمس الدین کی کٹھ پتلی حکومت کا رسمی طور پر ختم سنا کار کرنے کے بعد گورنری راج قائم کیا جائے۔ لیکن عین وقت پر مصلحت اُسے آئی۔ اُس وقت کرن سنگھ کشمیر کا صدر ریاست تھا۔ ہندوستان نے اگست ۱۹۴۷ء میں آئین اور قانون کی بلاورینغ عصمت کوٹ جی کی تھی لہذا آئینی نزاکتوں کو بالائے طاق رکھنے میں اسے کوئی گزیر نہ تھا۔ لیکن یہ بات کہ انتظام کی مال ڈور بردار ریاست کے اُس مہاراجہ کے ولی عہد کے ہاتھ میں دی جائے تب سے

کشمیری عوام کی بے مثال قربانیوں نے فراموش کرنے پر مجبور کر دیا تھا، میکاؤلی سیاست کے علمبرداروں کے حسب منشا نہ تھی۔ کیونکہ اس طرح سے ایک طرف تو دنیا میں یہ گھلا آثر قائم ہو تا کہ موسے مبارک کو کرن سنگھ کی گدی بحال کرنے کے لیے غائب کر دیا گیا ہے اور دوسری طرف چانکیہ نیتی کو اپنے جہرے سے نقاب ہٹا کر پردہ عجز میں سامنے آ جانا پڑتا۔ بھلا اگر پردے کے پیچھے وہ کر اس سے زیادہ گھناؤنی چالیں کھینچی جاسکتی ہوں تو اپنے سرانجام لینے کی کیا تک ہے؟ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۲۸ نومبر ۱۹۶۳ء کو اچانک ریڈ یوسرنگر سے اعلان کیا گیا کہ موسے مبارک کی بازیافت ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلات اُس وقت تو کیا، آج تک عام نہیں کی گئی ہیں۔ یہ کس نے غائب کیے تھے اور پھر کیسے اچانک واپس مل گئے؟ یہ سچہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ایک وقت پارلیمنٹ میں اعلان کیا گیا کہ سازش کا سراغ لگا لیا گیا ہے اور چند لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں انھیں پھر رہا کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ سارے معاملے کو خاموشی کی ایک سازش کا کفن پہنا کر دفن کر دیا گیا۔ آدھر سوویت یونین نے اپنی نمان لگائی کہ یہ امریکہ کی خفیہ ایجنسی سی۔ آئی۔ اے۔ کی کارستانی ہے اور ہندوستان کے بہت سے حلقوں نے اس کارشت پاکستان کی تحریک پسندی سے جوڑا۔ بعض حلقوں نے اس کا اصلی مجرم بنی غلام محمد اور اس کے خاندان کو قرار دیا۔ اور اس کی یہ تاویل پیش کی کہ وہ اقتدار سے محروم ہو کر بے حد بوجھلا گیا تھا۔ وہ حالات کو اس قدر بگاڑنا چاہتا تھا کہ بگڑی کو بنانے کے لیے تھرو اس کو وزارت فنی کا پرہیز عطا کرے اور اسے معلوم تھا کہ اس قسم کا بگاڑ موسے مبارک جیسی جذبات انگیز شخص کو پھر بھی بپا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ اور حلقے اس واردات کے پیچھے صاف تو ذی۔ پی۔ دراور ان کے اشتراک کی لٹے کی شاطرانہ چال کار فرما دیکھتے ہیں۔ ان حلقوں کے

استدلال کے مطابق صادق اور ان کے حواری سیاسی صحراوردی میں مبتلا ہونے کے بعد سخت سراپا سید ہو گئے تھے۔ وہ سوہنہ کوٹ رہے تھے کہ کوئی کارٹیر واد کے باوجود اور بخشی غلام محمد کے سیاسی بن باس کے باوجود وہ بدقسمت کے بدستور رہے اور اقتدار کی گھٹا مہینہ سے دور ہو کر چونکہ وہ مذہب نام کی کسی شے کے شفیق نہیں تھے۔ انھیں موسے مبارک سے کوئی جذباتی وابستگی یا دل بستگی نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے اس کی حرمت و تقدس سے آنکھ چر کر اپنا دار لگا لیا۔ العزمی بھانٹ بھانٹ کی بویوں میں یہ معاملہ اور بھی زیادہ آچھ گیا۔ بقول شاعر:

قد پریشان خواب میں از کثرت تعبیر من

کشمیر کے سوال کے لایحل میں یہ عقدہ بے حد بڑا رہا ہے اور اب تک سارا سراسر تہہ بہا رہا ہے۔ اگرچہ بھولا ناٹھ ملک نے جو اس وقت مرکزی محکمہ چاموسی کے ڈائریکٹر تھے اور کشمیر میں اس معاملے میں تفتیش میں خود سرگرم تھے، اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ ان کو اس راز کا علم ہے۔ لیکن یہ مرتے دم تک ان کے دل میں ہی مدفون رہے گا۔ کون جانے یہ مجذوب کی بڑے یا کسی خونفراک حقیقت کچھ پائے کی چال۔

موسے مبارک کی اس طوفان خیز تحریک نے جو تہ لال ہندو کے پہلے سے ہی تھے ہوسے، اعصاب کا بڑا حال کر دیا، کشمیر کے معاملے میں انھوں نے جو قلاب بازی شروع میں کھائی تھی اس کا احساس گناہ انھیں اندر ہی اندر رکھتا جا رہا تھا۔ غمیر کے کانٹے کی یہ چھین موسے مقدس کی ادبی میٹن نے اور زیادہ تیز اور تو کھیل بنا دی کیونکہ ان کے بیدار شعور کو اس جھگڑنے نے یہ سمجھا دیا تھا کہ کشمیر میں ان کا ہر قدم غلط پڑا ہے اور انھیں رزہ رزوں اور چالوں سے ٹوٹ لیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس بیجان کی تہ میں مذہبی عقیدت مندی کے جذبات تو ہیں ہی لیکن اس کے پیچھے سیاسی نا آسودگی کی

وہ جوا بھی دیکھ رہی ہے جو مسلمانوں کے بعد روشن ہو گئی تھی۔ چنانچہ نبی۔ امین۔ ملک خود بیان کرتا ہے کہ اُن دنوں جوا قرآن کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کشمیر کے تازہ ترین واقعات سے انھیں دن میں چار مرتبہ سرنگر سے براہِ راست مطلع کیا جاتا تھا اور انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر اسی سلسلے میں انھیں رات کو گہری نیند سے بھی جگا کر پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ تبہ وہ اُن دنوں اکثر اُداس رہتے اور خود اپنے ہی آپ سے بڑبڑاتے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ہم فروری ۱۹۶۶ء کو موئے مبارک کی بازیافت کا اعلان ہونے کے صرف ایک دن بعد یعنی ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو جبکہ وہ بھونیشور اڑیسہ میں کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اُن پر دماغ کے فالج کا پہلا حملہ ہوا اور پھر تبہ کو کبھی پوری طرح تندرست نہ ہو سکے۔ کشمیر اور موئے مبارک نے اُن کے سانس اعصابی نظام کو تیز کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ بات اُن کے حق میں جاتی ہے کہ اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد انھوں نے کافی مافات کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے لیکن اب اُن کا وقت پہلا گیا تھا اور اگرچہ وہ چار باغ پہنچے اور جینے گریہ اصل جوا ہلال نہیں تھے ایک چلتا پھرتا کھنڈر تھے۔ ▲▲▲

... بدلا ہوا زمانہ تھا

موئے مقدس کی بازیافت کا اعلان تو کیا گیا لیکن لوگوں کے دلوں میں بدگمانیوں اور شبہات کا ایک طوفان بپا ہو گیا تھا۔ وہ بڑی مشکوک نظروں سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ موئے مبارک واقعی اصلی موئے مبارک تھے یا نہیں۔ یہ مرحلہ نازک تھا۔ لیکن مولانا محمد سعید مسعودی نے اس موقع پر ہندوستان کی بڑی خدمت کی۔ انھوں نے اپنی چرب زبانی کا سارا علم بروئے کار لا کر سید میرک شاہ کا شافی اور چند دوسرے بزرگوں سے اس کے اصلی ہونے کی تصدیق کرائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان شہادت کرنے والوں میں نابالغ میر واعظ مولوی محمد فاروق بھی شامل تھے۔

اس سارے سانحے کے پیچھے کس قسم کی سفاکانہ ذہنیت کام کر رہی تھی اس کا اندازہ اب بات سے ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت نے پارلیمنٹ میں بڑے طعشق سے اعلان کیا کہ اس نے غزنیوں کا سراغ لگا لیا ہے چنانچہ اس سلسلے میں تیار درگاہ رحیم شاہ باندھے اور ایک معمولی سرکاری ملازم عبدالرشید کو ماخوذ بھی کیا گیا۔ لیکن بعد

میں وہ مقدمہ بھی گاؤں خورد ہو گیا۔ اور آج تک اس کے انجام کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں۔

ہم جیل خانے سے اس المناک سانحے کا تشویش اور تذبذب کے ساتھ مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ ذاتی طور پر حضرت بل کی تعمیر و استمال کے کام سے ساہا سال سے وابستہ رہا تھا۔ اور اوقاتِ اسلامیہ کے بانی اور صدر کی حیثیت سے میں نے اس بعترہ عالیہ کی قلمی تریش خراش اور تزیین و تہذیب میں بے حد محنت کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کشمیری مسلمانوں کی اجتماعیت اور مرکزیت کی علامت ہے اور اگر اس باسعادت مرکز کے جذب و کشش میں کوئی فرق آگیا تو وہ شیرازہ ہی منتشر ہو جائے گا جس نے کشمیری مسلمانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرو کر ان میں وحدتِ بی کا ایک روں افزا احساس پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس پہچان کا رستانی کے چھپے اس سازش کے خوفناک سائے اہستہ بڑے نظر آرہے تھے۔ قوم کا جو مودو تھا وہ یقیناً کی سلاخوں کے پیچھے بھی ہمارے دلوں کو مضطرب کر رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے قید خانے سے ہی اس واردت اور اس کی آڑ میں کشمیریوں کو دلے کی کوشش سخت احتجاج کیا اور جوابہ لال ہنر و کوتاہ روانہ کیے کہ اس سانحے کی تھپتی کے ساتھ تحقیقات کی جائے۔ اور مجرموں کو کبھی کر وارتک پہنچایا جائے۔ اس سلسلے میں میرے اس خط کا اقتباس ان محسوسات کی ترجمانی کرتا ہے جو میں نے ۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو سپیشل جیل جوں سے صدر ہندوستان ڈاکٹر راجا کرشنن کو لکھا۔

”یہ ہمساری چچی تیلی رائے ہے کہ یہ پہچان نہ کاروائی کوئی الگ تھلک وقوع نہیں ہے۔ جس کا کشمیر کے ماضی قریب کے واقعات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ گذشتہ برسوں میں کشمیر ایک غیر انسانی صورت حال

سے دوچار ہو گیا ہے۔ اخلاقی اور روحانی اقدار کو ضمیر کی کسی غلطی کا احساں کیے بغیر بھڑا میں جھونکا جا رہا ہے۔ یہ عمل واقعتاً ۱۹۴۷ء میں شروع کیا گیا جب کشمیر میں جمہوریت کا بے شرمانہ قتل کیا گیا۔ اس کے بعد اخلاقی اقدار کی دھجیاں برسرِ عام اڑائی جاتی رہیں اور اس کاروائی کو کشمیری عسکرانوں کی پشت پناہی حاصل رہی۔ قانون اور انصاف کے تین محارت کی باقی رہی اور عوام کی زندگی اور عزت سفاکانہ غنڈہ گردی کے رحم و کرم پر رہ گئی اس عمل کو توڑنے کی کوشش کرنا تو درکنار ہندوستان کے خزانہ عامہ کا کروڑوں روپے کشمیری عوام کو کرپٹ کرنے اور ان کی روح کھل دینے کے لیے خرچ کیا جا رہا تھا کہ ان کے احساسِ حیثیت کو انہوں نے پلا کر سلا دیا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی اس سیاسی کارستانی کا مقصد اگر کشمیری عوام کی سیاسی زندگی کا شیرازہ بکیرنا تھا تو نوازہ وار دات کا مقصد کشمیریوں کو ان کے اس روحانی مرکز سے محروم کرنا ہے جو انھیں آزماش اور اجتلا میں سکون و اطمینان بخشتا آیا ہے۔ یہ کشمیری عوام کے سیاسی و روحانی اور اخلاقی انتہا کا عمل مکمل کر دے گا اور ان کو بعد میں گونگے چوپایوں کی طرح اگلتا آستان بن جائے گا۔ تجھے یقین واثق ہے کہ آپ اس تناظر میں موجودہ ایلیہ کی بنیادگی اور اس کے تباہ کن اثرات کا بہ خوبی اندازہ کر سکیں گے۔“

سانحہ مومے مقدس کے سلسلے میں مولوی محمد فاروق پہلی بار سیاسی میدان میں سامنے آئے۔ انہیں دو ایک سال پہلے ہی بخشی غلام محمد نے اپنی ایک شاطرانہ چال کے تحت میر واعظ کی مسند پر بٹھایا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں اس سبزہ آغا نے فوجیہ نوآموز اور دینِ دُنیا کے علوم و رموز سے بے خبر فوجیان کے سر پر عامہ فضیلت باندھ دیا

تھا۔ اور اس کے نزدیک ہاتھوں میں ہندی رجائی تھی۔ اُس کے بعد میر واعظ خاندان اور اس کے مداحوں کی میر سے ساتھ روایتی مضامین کے شعلوں کو پھر سے پھڑکانا شروع کیا تھا۔ وہ مولوی فاروق اور اُس کے تابعین اور اقارب کی داسے اور دُرسے بھی خاطر قواضع کرتا رہا۔ لیکن نو آموز میر واعظ سیاسی میدان میں کیا جتے؟ انہیں لگی ڈنڈا کیلئے اور سنا لگوں کے طواف کرنے کی جوت پڑ گئی تھی۔ اُسی کا نشہ اُتارنے میں کئی برس لگ گئے۔ اور کبھی کبھی اپنی عادت سے مجبور اور بے بس ہو کر وہ عربی برقعہ میں چھپ کر سینہ دیکھنے جاتے رہے۔ لیکن موئے مبارک کی طوفان نیز تحریک میں ایک لہر کے تھپڑ سے میرے تیکہ کشیر کی سیاسی سطح پر اُچھڑا۔ مولوی محمد مسد نے عوام کے جوش و خروش پر بندھ باندھنے کے لیے ایک مجلس عمل یا ایشین کمیٹی تشکیل دی۔ حسن اتفاق سے ان کی اور غشی غلام محمد کی پسند کے دائرے پہر ایک ہی محور پر ایک دوسرے سے بفل گیر ہو گئے۔ یعنی مولوی صاحب کی نظر انتخاب غشی صاحب کے چہیتے مولوی فاروق پر مرکوز ہو گئی اور انہی کی درپردہ کوششوں سے نوع مر مولوی ایشین کمیٹی کے چہرہ بین بن گئے۔ ایشین کمیٹی میں عام طور پر مختلف مذہبی گروہوں اور تفریقوں کے نمائندے شامل کیے گئے تھے۔ میرے فرزند فائز فاروق نے بھی اس کی کاروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن مولوی مسعود نے بڑی ہوشیاری سے یہ محاذ رائے شہماری کے کارکنوں کو اس کمیٹی سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ مولوی مسعود نے عوام کو جو میری ربانی کا مطالبہ کر رہے تھے، مشورہ دیا کہ وہ شیر کشیر زندہ باد کا نعرہ بھی نہ دیں۔ کیونکہ اُس سے بقول ان کے اس مذہبی معاملے کو سیاسی رنگت حاصل ہو جائے گی۔ اور انہیں پیدا ہوگی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان کشیر کی رہنمائی کرنے کا حق صرف مذہبی علماء کو ہے اور وہ اندر ہی اندر یہ لچری پکا رہے تھے کہ کشیر میں ملکوں کی اجارہ داری کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ خود اس

قطب الرجال میں مرکز و محور بن کر چھائے رہیں لیکن ملک ایک تک محدود رہ سکتے۔ بقول اقبالؒ ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا یہ اشتراک زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ مولوی فاروق نے اس پلیٹ فارم کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہا وہ اس پر تاحیات چھائے رہنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن بہت سے اہل اثرائے ارکان کو یہ منظور تھا اس لیے مولوی فاروق اپنے طبقاتی رول اور فائداتی روایت کے عین مطابق رسمی تڑا کر بھاگ گئے۔ انہوں نے عوامی ایشین کمیٹی کے نام سے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی۔ لیکن اس کا ذکر بعد میں موئے مبارک کی تحریک نے دبی کے ایوانوں کو زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ اور انہیں اپنی دس سالہ کشمیری پالیسی کی غلط اندیشی کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا۔ جواہر لال نہرو کا تو بہت ہی بُرا حال تھا۔ انہیں اب اندازہ ہو گیا تھا کہ کشمیریوں کو نہ رکے لالچ یا بندوق کے خوف سے دبا یا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ وہ کشمیر میں سیاسی سطح پر ایک نئی ابتدا کر کے زخمی دلوں پر پھپھار کھنا چاہتے تھے۔ لی۔ این۔ ملک نے مرکزی کابینہ کی ایمر جنسی سب کمیٹی کی ایک ہنگامی میٹنگ کی روئداد قلمبند کرتے ہوئے نہرو کے ان احساسات کا نقشہ کھینچا ہے۔

” وزیراعظم نے کہا کہ اگر پندرہ سال تک ہمارے ساتھ رہنے کے باوجود کشمیر اس پر مستحکم صورت حال میں متبلا ہے کہ موئے شخص جیسے بظاہر سادہ معاملے پر لوگ استدلال مشتعل ہو جائیں کہ وہ حکومت کا ہی تختہ اڑٹ دینے کے لیے اُنچے کھڑے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں مسئلے کی گہرائی سمجھانے کے لیے ایک نیا اپروچ اختیار کرنا چاہیے اور کشمیر کے متعلق اپنے انداز فکر اور زاویہ نظر میں انقلابی تبدیلی پیدا کر لینی چاہئے۔ انہوں نے اس بات

پر بالخصوص ظاہر کی کہ ہم نے کشمیر کے لوگوں کے لیے اتنا کچھ کیا لیکن پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہیں۔ وزیر اعظم نے کہا شیخ محمد عبداللہ کا کشمیری عوام پر بھی زبردست اثر ہے اور بدستور ہونے حالات میں کشمیر میں کسی ایسے سیاسی جمہور کے متعلق نہیں سوچا جاسکتا جس میں وہ شامل نہ ہوں۔

ادھر ہندوستان میں بھی چکر دوڑتی راج گوبال آچاریہ اور بے پرکاش نرائن کے علاوہ میرا پارلیمنٹ کی ایک بھاری تعداد نے بھی میری رہائی کو کشمیر کی افراتفری ختم کرنے کی واحد کلید قرار دے کر ان پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔ ایک دن جوہر لال نے اپنے وزیر داخلہ گلزاری لال انندہ کو جو کشمیر میں سخت گیری کے حامی اور کشمیریوں کو نظر حقارت سے دیکھنے والے گروہ کے سرغنہ تھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ صدر سازش کب تک یونہی بے چواری کی راوی کی طرح بھٹکتا رہے گا اور شیطان کی آنت کی طرح حوالہ پکڑے گا؟ یہ صورت حال ناقص برداشت ہے اور ہم کب تک ان لوگوں کو تفریق بیج کے لیے چین کی سلاخوں کے پیچھے بند رکھ سکتے ہیں؟ گلزاری لال انندہ نے جواب دیا کہ اگر مقدمہ واپس لیا گیا تو ہم سب لوگوں کے ساتھ ساتھ حکومت کی پوزیشن بھی متعطل و خیز بن جائے گی۔ جوہر لال انندہ و بیماری کے تابڑ توڑ حملوں سے بے دم ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں اب بھی اتنا کس بن باقی تھا کہ ان کے آگے ان کے کسی مشیر یا وزیر کو مجالِ سخن نہ تھی۔ ان کی تباہی میں اب بھی کوئی چنگاری بھڑک کر دھماکہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ جوہر لال نے اپنے مشہور آفاقی قہقہے کے زیر اثر لال پیلے ہو کر قدرت کی فاکل ان کے منہ پر دے ماری اور نرجس ہو کر بدائے ”جہنم میں جائے یہ فاکل۔“ میں شیخ محمد عبداللہ کو جلد از جلد قید سے باہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ”جوہر لال کا فیصلہ افسوسناک اور فساد خیز حالات ابھی کے مطابق ترجیح اختیار کرنے لگے۔“

موتے مبارک کی لہجہ شن کے سیلاب میں غشی غلام محمد کے ساتھ ساتھ ان کے منعم شمس الدین بھی ایسے ڈوبے کہ نابود ہو کر رہ گئے۔ جوہر لال نے اپنے خاص مستحلال بہادر شاستری کو بتوں بھیا اور ان کے ایک ہی اشارہ ابرو پر شمس الدین کا سنگھاس اُٹھ گیا۔ شاستری کی موجودگی میں غشی غلام محمد کے گھر میں مکران جماعت کا ایک اجلاس ہوا جس میں غلام محمد صادق کو پارٹی کے پارسیاں پانڈی کا نیا لیڈر بن لیا گیا۔ غشی کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ جس رقیب کو اقتدار سے دور رکھنے کے لیے اس نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا تھا اب اپنے دلجوی ولی نعمت کے اشارے پر وہ اسی کا نام و نثار اعلیٰ کے لیے تجویز کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ مجب نہیں وہ غالب کا یہ شعر گنگناتے رہے ہوں۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہنسنا ز بار

اسے کاش جانتا نہ تیسری رہ گذر کو میں

بہر کیف صادق صاحب نے غشی کے مقابلے میں بازی جیت لی اور دہلی کو ہالینڈ حاصل ہو گیا کہ جس منظور نظر کو وہ بڑی کوششوں کے باوجود برسرِ اقتدار نہ لاسکتے تھے وہ اسی تلامذہ میں اندر گھس آیا اور وزیر اعظم بن بیٹھا۔ میری رہائی کا جو سہرا نئی دہلی نے غشی کے سر باندھنے سے انکار کر دیا تھا وہ اس نے انعام کے طور پر صادق کے حق میں منظور فرما دیا کہ اس فوری وارڈ آنہ کار کی کچھ تو قیہ بن جائے۔

۸ اپریل ۱۹۷۷ء کو ہم حسب معمول میںل کے معاملے سے عدالت کے کٹہرے میں آئے تو وہاں اچانک ہمارے خلاف مقدمہ سازش واپس لینے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلان غیر متوقع نہیں تھا بلکہ واقعات کی منطق صاف طور پر اس سمت کی طرف سفر کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن جب واقعی مقدمے کو واپس لینے کا اعلان

واقعہ کروا کر جوہی سرنگر سے فراغت ہوئی، میں وہی آنا چاہوں گا۔

میل سے باہر آئے ہی مقامی شہریوں نے ہمیں ایک جلوس کی شکل میں گھمایا سارے
جوں شہر نے ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا اور ہم ایک بڑے جلوس کے آگے آگے
ڈاک بیٹھے بیٹھے۔ جہاں ہمارا ڈیرہ لگ گیا۔ شام کو نئے وزیر اعظم غلام محمد صادق مجھ سے
ملنے کے لیے ڈاک بیٹھے آئے اور بیگ صاحب نے انھیں اپنی بدلتی ہوئی سٹی سے خوب ستایا
یہ سٹی ان کے بعد میرا آن سے پہلا مسافر تھا اور ہم خندہ پیشانی سے گفتگو کرتے
رہے۔ ادھر کشمیر میں عوام نے اسی دن اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک جشن
پراغاں کیا۔ صرف مکوں اور کٹوں پر ہی نہیں بلکہ ہاؤس بوٹوں اور کشتیوں میں بھی
لاکھوں چراغ روشن ہو گئے۔ یہ چراغاں کشمیر کی تاریخ میں بے مثال بن گیا۔ نئی دہلی
کے بدلے ہوئے تیوروں کا اندازہ دلی اور سرنگر کے ریڈیو سے ہو گیا۔ انھوں نے
سٹی کے بعد پہلی بار جمادی حیات میں ہونے والے مظاہرہوں کی کچی خبریں ویرنا
شروع کیں۔

بخش غلام محمد ان دنوں جوں میں ہی رہائش پذیر تھے اور انھوں نے وہ سرکاری
بنگلو جس وقت تک بھی خالی نہیں کیا تھا۔ جو وزیر اعظم کی منیجٹ سے آن کی قیام گاہ
تھا۔ ان کی والدہ کا چند ماہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے تدفین کے لیے من
کے یہاں جائے تدفین فیال کیا۔ یہ گیارہ سال کے بعد ہماری پہلی ملاقات تھی۔ بخشی صاحب
کے چہرے بٹرسے سے نقابت اور ان کی آنکھوں سے تمامت کا اظہار کرا پڑ رہا تھا۔
سچی تو یہ ہے کہ وہ کچھ دیر کے لیے مجھ سے آنکھیں ہی چارہ کر کے۔ چنانچہ ہماری گفتگو
رسمی مالک مالک اور مزاج پرستی تک ہی محدود رہی۔ دوسرے روز جوں کے شہریوں
نے ہمارے اعزاز میں ایک عہد ان دیاج میں صادق صاحب، بخش صاحب، پنلر

ہوا تو میں ایک لمحے کے لیے ستائے میں آ گیا اور سوچنے لگا کہ جموں کی بظاہر عالی شان
عمارت کس طرح سچائی کے ایک ہی جمونکے سے ریت کی دیوار کی طرح ڈھ جاتی ہے اور
اس زمانہ قدامتداری میں کتنی صداقت کوٹ کوٹ کر بکری ہوئی ہے۔ وقل جالہ الحق
وذہق الباطن ان الباطن کان ذہوقا۔ بہر کیف خوشی اور شادیوں نے مجھے
فورا اُس ذہنی مراتب سے باہر نکالا۔ ہمیں باعزت طور پر بری کر دیا گیا تھا۔ میں بیگ صاحب
صوفی محمد اکبر خواجہ علی شاہ اور دوسرے ہم نفسوں کے ساتھ باہر آیا تو کچھ اور ہی عالم
نظر آیا۔ بقول شاعر ع۔

مجھے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

ظلم و قسود کے بادل چٹ گئے تھے اور فیض میں ایک نئی تبدیلی کی بشارت رس
گھول رہی تھی۔ جموں کے ہی نہیں سرنگر اور دوسرے دور افتادہ علاقوں سے ہمارے
محب اور اصحاب ہمیں مبارکباد دینے کے لیے میل کی ولیمز پر اکٹھا ہو گئے تھے۔ ابھی ہم
کھلی فضا میں اڑنے کے لیے پرواز ہی رہے تھے کہ جواہر لال نہرو کی طرف سے ان کا
ایک خاص انجی میرے پاس آن کا کتبہ لے کر آیا۔ یہ صاحب خطے کر دو دن پہلے
جموں پہنچے گئے تھے۔ لیکن انھیں مجھ سے ملنے کے لیے فوری موقع نہ دیا گیا۔ اس لیے انھیں
امانت محمد کچھنپانے کے لیے شکست زندان کی گدای کا انتظار کرنا پڑا۔ میں نے یقیناً
چاک کر کے خط پڑھا تو مجھے جواہر لال کا لب ولہجہ ہی بدلا ہوا نظر آیا۔ انھوں نے
بڑے ہی محبت آمیز انداز میں مجھے دہلی آئے۔ آن کا ذاتی مہمان بننے اور پھر بے تکلف
تبادلہ خیال کی دعوت دی تھی۔ لیکن میں سرنگر جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اور دہلی جانے
سے پہلے قوم کے مزاج اور حالات کی میزان کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں
نے جواب میں فوری طور دہلی آنے سے معذرت طلبا کر لی۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی

اُس دن کاساں ہی کچھ اور تھا۔ شاید فیض نے کسی ایسے ہی معجزہ رستاخیز کے متعلق کہا ہو گا۔

ڈال کر کوئی گروں میں طوق آگیا

لا دکر کوئی کاندرھے پہ دار آگیا

جب رات کو جھٹ پنے کے وقت میں تجاہد نزل پہنچا تو وہاں عوام ایک زلزلہ کی سی لے میں نعرے لگا رہے تھے۔ ”الانگ لیو عبداللہ“۔ ایک تومی جشن کا عالم تھا۔ اوہیں نے بہت سی خواتین و بزرگوں کے چہروں پر خوشی کے آنسوؤں کی دھاریاں بہتی ہوئی دیکھیں۔ اس بے پناہ مظاہرے نے مجھے تقریباً مہبوت کر کے رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ قوم جو گیارہ سال کے جبر و قہر کے بعد اس طرح اپنے رانوں اور انگلوں کی ٹانگ سمجھا رہی ہے اس کی قسمت میں سر ہندی اور ارغندی مفقود ہو چکی ہے۔ بہر حال میں نے اپنے اندرونی جذبات پر قابو پا کر اپنے آپ کو سنبھالا اور عوام کی تجبہت کا شکریہ ادا کر کے انھیں رخصت کیا۔ میرے ذہن میں قدرت کی کار سازی اور اس کی رحمت پر اعتماد کرنے کے انعامات کا عجیب نقشہ ابھر رہا تھا۔ عوام تو جوشیہ میری آواز کو اپنے دل کی دھمکنی سے ہم آہنگ پاتے رہے لیکن جو چہرے ششہ میں میری گرفتاری سے پہلے کھینچے رہتے تھے ان کی رعونت نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ بی۔ این۔ ملک نے اپنی میٹھی کے ماحوؤں کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ اس فریاد پر لکھ دیا ہے ”ہمیں کے تمام سابقہ و موجودہ دشمن اُس کے سوا گت میں اُس کے پاؤں پر ماتھا رکھنے لگے۔“

قاضی عبدالودیع لاہیصار۔ دوسرے دن حضور ی باغ میں ہمارے اعزاء میں ایک عظیم استقبالی اجلاس منعقد ہوا جس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی۔ مولوی محمد سعید نے استقبالی اندرز پیش کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں عوام کو واقعات کی تازہ کروٹ سے

پریم تاجہ ڈوگرہ اور کچھ ہی پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ میری گنتی میں نے اپنی مختصر سی تقریر میں کہا کہ ”میں ماضی کی تغلیب کو قبول کر نہ صرف کشمیر میں نہ دور کا آغاز کرنا چاہئے بلکہ ہندوستان اور پاکستان کو بھی ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوششیں کرنی چاہئیں کیونکہ دوستی اور مصلحت میں ہی ہند پاکستان اور کشمیر کے عوام کی بھلائی ہے۔“ کشمیر کی صحیح سمت سیاسی صورت حال جو جھوٹ پر ہزاروں بے گناہوں کے ابو اور بے شمار روپے کے سرت بے جا سے قائم کی گئی تھی حقیقت کی ایک ہی کرن سے پھگل کر رہ گئی۔ بی۔ این۔ ملک تقریباً یقین کرنے کے انداز میں اپنی میٹھی کے دوپٹاؤں کے اوپر مندر گزرتے ہوئے کا یہ منظران دردناک الفاظ میں کرتا ہے۔

”اُس کے (یعنی راقم الحضور) کے اُسارے مخالفت سر کے بن اُس کے استقبال کے لیے دوڑے اور اُسے کشمیر کہہ کر پکارا۔“

چرائی ٹھیکیاں اب گلہ دستہ طلاق نسیاں بن گئی تھیں اور ہم ایک نئی فضا پیدا کرنے کی لگن میں تھے۔ جوں میں چند روز قیام کے بعد ہم سڑک کے ذریعے کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جگہ جگہ ہمارا ادا الہاد استقبال کیا گیا۔ میں گیارہ بارہ برس کے بعد ڈوڈہ اور کشنواز گیا۔ اور وہاں کے عوام نے اپنے انکساف سے مجھے باغ باغ کر دیا۔ وہاں سے پھر رُخ وادی کشمیر کی طرف ہوا۔ اور اراپہل کو ہم وادی میں داخل ہوئے۔ ہمارے ساتھ سرگروہ اخبار نویسوں، فوٹو گرافروں اور دنیا بھر سے آئے ہوئے ٹیلی ویژن کمپنیوں کے مشاہدوں کی ایک بڑی ٹیم بھی ہم سفر تھی۔ بانسہال سے لے کر سرنگرن تک عوام کا ایک لامتناہی سمندر تھا۔ اور ہم گویا ان کی تجبہت کی لہروں پر دواں دواں جا رہے تھے۔ سرنگرن میں ایسی آرائش تھی کہ مکاؤں کی دیواریاں تک نظرات آتی تھیں۔ عوام کے جوش میری زندگی کے ہر موڑ پر کبھی خندان کبھی گریاں نظر آتیں گے لیکن

آگاہ کیا اور کہا کہ ”جب تک ہند اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے مسئلہ کشمیر میں گہر نہیں موجود رہی گی۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کے مفادات اسی بات میں متفق ہیں کہ یہ ہمسایہ ملک ایک دوسرے پر قابو کرنا سیکھیں اور ایک دوسرے کے قریب نہ آجائیں۔ اس سلسلے میں نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ قدرت نے مجھے اس رول کے لیے شاید بچا کے رکھا ہے۔ لہذا اگر میں اس اہم ترین کام میں کسی کام آسکوں۔ تو میں اپنا حقیر حصہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ ▲▲▲

ملا کی اذال اور مجاہد کی اذال اور

پچھلے صفحات میں کئی مقامات پر میر واعظ خاندان کی تجھ سے ذاتی پیشک اور تحریک آزادی کے بڑے دھارے سے ان کی عداوت کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اس خاندان کی خاص روش نے کشمیر کی سماجی، مذہبی اور سیاسی زندگی میں بڑے نکل کھلائے ہیں۔ اور نتیجہ ہوا کہ یہیں اس لیے مناسب ہے کہ اس اجمال کی کچھ گہری کھول دی جائے۔ میر واعظ صاحبان کے خاندان کا طلوع انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوا۔ اور قرآن سے آئے ہوئے ایک بزرگ شخص کے دو بیٹوں نے آپس میں سرنگری کی مسجدوں اور زیارت گاہوں میں وقفہ کرنے کا نواہ کیا۔ ایک بیٹا رازداری کدلی میں مقیم ہوا اور میر واعظ کلاں کہلایا۔ جبکہ دوسرا کلاشیورہ میں بس گیا اور میر واعظ خورویا میر واعظ ہمدانی کہلایا۔ ان میں ہمدانی مفادات کی کشمکش شروع ہو گئی۔ میر واعظ ہمدانی کے بیٹوں کوڑیہ اور میر واعظ کلاں کے بیٹوں کو کوٹہ کہہ کر یاد کیا جاتا رہا۔ اور ان کی آپس میں نہایت ہی فوجی مسائل پر سرگمٹیوں بھی ہو جاتی تھی۔ اگرچہ رازداری کدلی کے میر واعظ صاحب اپنے آپ کو میر واعظ کشمیر کہہ کر پکارنے لگے لیکن علما ان کا رٹوٹ ٹپکے

بعض مضامین تک محدود تھا۔ اس خاندان میں پہلے قابل ذکر شخص واعظ محمد سبکی ہوئے۔ جن کے زمانے میں اس خاندان کو شہرت ملی۔ ان کے فرزند میر واعظ رسول شاہ نے نصرت الاسلام سکول کی بنیاد رکھی۔ مولوی رسول شاہ مسلمانوں کی تعلیمی بیداری میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان کے چاشن میر واعظ احمد اللہ اپنی درویش صفت طبیعت کی وجہ سے احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور ان کے شاگردین ملک آن کی تعلیم کرتے تھے۔ سر شیکر کی جامع مسجد کو سلطان سکندر نے پانچ سو سال پہلے تعمیر کیا تھا۔ اس مرکزی عبادت گاہ کے میر واعظ کی حیثیت سے اس خاندان کا ایک مرتبہ بن گیا تھا اور خاص طور پر ہمارا جیسے دربار میں اُسے رسائی کے علاوہ کچھ مراعات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ خود ہمارا خاندان اُن کا معتقد تھا اور میں اُن کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُن کی مذہبی پیشوائی اور بزرگی سے قطع نظر اُن میں قومی دروہی تھا۔ مگر وہ خدا کو دھرتلاہ جس پر ذاتی اور خاندانی عافیت کی مصلحتیں غالب آ جاتی تھیں۔ چنانچہ جب لارڈ ڈیلنگ کشمیر آئے اور کچھ مسلم خاندان کے اہلکار خاتہ معلیٰ میں ایک مٹھارہ ہوا اور میمورنڈم وایسراے کو پیش کیا گیا تو اُس کے ساتھ میر واعظ خاندان، مفتی شریف الدین صاحب وفیرہ کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر اُن کے جانے کے بعد ڈوگرہ سرکار نے سختی شروع کی۔ تو میر واعظ اور مفتی حاشا دلا کہتے ہوئے اس میں اپنے رول ہی سے متکبر ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نذر خواجہ سعد الدین شاہ اور نور شاہ نقشبندی پر پورا بھٹن نہ صرف ریاست بدر کر دیا گیا بلکہ جن کی جاگیر میں بھی ضبط کرنی گئیں اور میر واعظ مفتی صاحبان صاف بچ گئے۔ میر واعظ احمد اللہ کی وفات کے بعد میر واعظ یوسف شاہ نے راجستھان لاہور کے داروغہ کے فارغ التحصیل تھے۔ اور اُن میں ابتدا میں اپنے ملاطمتی کی روایات کے مطابق کچھ قومی خیالات و جذبات بھی موجزن تھے چنانچہ میں اس بات کا

بار بار احزانت کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے ابتدائی مہینوں میں اُنہوں نے جذبہ قومی سے سرشار نہ ہوں کی اُس جنبش کی حتی المقدور حوصلہ افزائی بھی کی جس کی راہنمائی میں کرتا تھا۔ واقع یہ ہے کہ انہی کے فضیل نہیں جامع مسجد کے منیج سے قوم کے ساتھ مکالمہ شروع کرنے کا موقع ملا۔ میر واعظ یوسف شاہ نے ابتدا میں خود عوام کو بتایا کہ وہ ہساری دکھائی ہوئی راہ کو اختیار کریں۔ یہ ابتدائی مصافحہ مستقبل کی مستقل رقابت و عداوت کی تمہید ثابت ہو گا اس کا تصور بھی ہم ذکر کر سکتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولوی یوسف شاہ ذاتی مرثیت کے لحاظ سے ایک سادہ لوح اور بھولے بھالے آدمی تھے۔ لیکن اپنے خاندان کے ترقی کی حیثیت سے وہ اس کے مطابق مفادات کے پاسدار بھی تھے۔ اور یہ اُن کے گرد کھڑے ملازمین، استحصالیوں، رجعت پسندوں اور حاشیہ نشینوں کا ایسا گہرا تھا جو اُن کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھنے پر اُستعد تھا۔ جو جن تحریک کی کو اپنی ہوتی گئی ہے سرفروشن اور معنوی غازیوں کی پہچان ہونے لگی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہونے لگے۔ میری لگن اور غرضوں اور سب سے زیادہ فضل خداوندی نے مجھے تحریک کے صدر نشین بنک پہنچا دیا۔ مولوی یوسف شاہ اور اُن کے حواری اس صورت حال سے پریشان ہونے لگے۔ اُن کے حاشیہ نشین انھیں بتانے لگے کہ اگر اس طرح ایک "عامی" عوام کے دلوں پر چھاپا یا تو میر واعظ کی عزت و تہمت خاک میں مل جائے گی۔ مولوی یوسف شاہ انسان ہی تھے اس پر ہکا بکے میں آ گئے اور انھیں غالب کے الفاظ میں "سایہ شارب گل" بھی "افنی" قرار دے دیا۔ اُن کے اپنے مفادات بھی خطر میں تھے۔ اور حکومت کا چالاک صیاد ناگ میں پھنسا تھا۔ اس نے جال پھینکا۔ طبیعت طبیعت سے جانی اور بقول فقہی کا شیری ج۔

دام ہر گلیہ زمین بود گرفتار مستدیم

باش کا کر خضائی یہ ڈرتا ہے مجھے سایہ شارب گل افنی نظر آتا ہے مجھے (غالب)

میں ہوا تو وہ زمین نے تقریباً ایک راسے ہو کر کھجے اس کی مدارات کا شرف بٹھا چنانچہ مولوی صاحب کے ہم جلسوں نے اسے اُن کی حق تلفی قرار دے کر انھیں خوب آگسایا۔ اُس وقت وہ مسجد کی آگ کو سینے میں ہی جاتے رہے۔ لیکن بہت جلد وہ سلم کافر نے سے الگ ہو گئے۔ اور انھوں نے ڈوگرہ سرکار اور اُس کے ٹمک خواروں کے اشارے اور ہمارے سے جلد ہی آزاد مسلم کافر نے سیاسی دوکان کا سائین بورڈ لگا لیا۔ یہ ہماری تحریک میں پہلا شگاف تھا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ اس کی پشت پر وہ بزرگ تھے جو اپنے آپ کو کشمیری مسلمانوں کی قومی اور قریٰ نجات کا علمبردار قرار دیتے تھے۔ آزاد مسلم کافر نے اصل ہمارا راجہ اور اُس کے وفیہ خواروں کے مفادات کی لکھوائی کے لیے عوام میں تفرقہ ڈالنے اور بیرونی توجہ کو ہمارا جس کی حکومت کی کاروائیوں سے ہٹا کر ذریعہ معاملات اور ذاتیات میں الجھانے کا کام کرتی رہی۔ اس میں مولوی یوسف شاہ کے خاص مشیروں منشی احمد شاہ وکیل اور دوسروں کے علاوہ درپردہ ہمارا راجہ کے ایجنٹ یا کدو وغیرہ بھی تارلاتے رہے۔ کسی شاعر نے یوسف کنگان اور مولوی یوسف شادی کی ہم تہائی کا جوڑ کر کیا انھیں چوٹ کی۔

یوسف تو مصر میں لپکا سونے کے تول سے
یوسف نے سستی بیچ دی آزاد پارٹی

مولوی یوسف شاہ کے حمایتی جب عوامی سطح پر مسلم کافر نے کالیاں بیکانہ کر کے تو وہ اچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ انھوں نے خُندہ گردی شروع کر دی۔ شہر میں بوسے شروں کر دیئے۔ اور بارہا قتل و غارت کی نوبت بھی آئی عوامی ذہن نے مولوی صاحب کے حامیوں کے لیے "بکرا" نام اور ہمارے حامیوں کے لیے "شیر" کی اصطلاحیں وضع کیں۔ ہمارے حامی تو غیر میرے لقب "شیر کشمیری" کی مسابقت سے "شیر کھانا" بن گئے۔ بکرے

میں ڈوگرہ کو جب کھجے ڈوگرہ سرکار نے دوسری بار گرفتار کر لیا تو ساری وادی میں احتجاج کا طوفان اُٹھ آیا۔ راجہ ہری کشن کول نے کچھ دن پہلے ہی وزارت عظمیٰ کی گدگی سنبھالی تھی۔ اُس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے میرا وعظ یوسف شاہ پر ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خاندان لوگوں کے مذرونیاز پر پلٹ آیا ہے۔ اس لیے اس کو شاخ و تیز کی بلی کی سی جھلک دیکھا کہ یہ شیٹیں ہی اُٹا کر جاسکتا ہے۔ اور پھر سرحد و ملت کے اس ظاہری منبع کو ہی مسلمانوں میں چھوٹ ڈالنے کے نامور کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس حکمت عملی کے مطابق ہی ہری کشن کول ایک طرف عوام پر قیامت توڑتا رہا اور دوسری طرف اُس نے میرا وعظ کے دو مصاحبین محمد پنڈت اور کامیہ پنڈت کے ذریعے انھیں اپنی کوٹھی پر بلایا۔ اس نے خوشامد کا پہلا ناگہ کار گرنسٹ آزما تے ہوئے میرا وعظ کو کشمیر میں ہمارا راجہ کے بعد سب سے قابل احترام شخص قرار دیا میرا وعظ کی رگ اُٹا عوام کی بے نیازی اور بے مہری سے سخت ڈوگرہ بھی تھی۔ چنانچہ شاہرہ سرکاری افسر کا تیرنشانے پر لگا۔ مولوی صاحب نے ایک ایسے برقیے پر دستخط کر دیئے جو واسرائے ہند کے نام بھیجا جانا مقصود تھا اور جس کا مضمون یہ تھا کہ "کشمیر کے مسلمان ہمارا راجہ کے وفادار ہیں۔ یہ قوم کے خلاف میرا وعظ صاحب کا پہلا اور تھا۔ اور پھر واقعات گواہ ہیں کہ انھوں نے کچھ ذکر نہیں دیکھا۔ جب میں رہا ہو کر آیا تو مولوی صاحب نے حق ٹمک ادا کرتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ لیکن میرا بیان و خابندہ چڑکا تھا اور اب میرے لیے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑنا ناممکن نہ تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب ناراض ہو گئے اور انھوں نے پہلی مرتبہ ہمارا راجہ گنج سرینگر کی کافتی مسجد میں کچھ پر راہ راست تیر پھیلے۔ "بقیہ راجہ جی مونچوں کے لوگ مسلمانوں کو گواہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی بیوقوفی کا ان لوگوں کو کیا حق ہے جو حسرت کی پیروی نہ کرتے ہوں؟"

جب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جون و کشمیر مسلم پولیٹیکل کافر نے کالیاں بیکانہ پتھر مسجد

میں ہوا تو وہ زمین نے تقریباً ایک راسے ہو کر کھجے اس کی مدارات کا شرف بٹھا چنانچہ مولوی صاحب کے ہم جلسوں نے اسے اُن کی حق تلفی قرار دے کر انھیں خوب آگسایا۔ اُس وقت وہ مسجد کی آگ کو سینے میں ہی جاتے رہے۔ لیکن بہت جلد وہ سلم کافر نے سے الگ ہو گئے۔ اور انھوں نے ڈوگرہ سرکار اور اُس کے ٹمک خواروں کے اشارے اور ہمارے سے جلد ہی آزاد مسلم کافر نے سیاسی دوکان کا سائین بورڈ لگا لیا۔ یہ ہماری تحریک میں پہلا شگاف تھا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ اس کی پشت پر وہ بزرگ تھے جو اپنے آپ کو کشمیری مسلمانوں کی قومی اور قریٰ نجات کا علمبردار قرار دیتے تھے۔ آزاد مسلم کافر نے اصل ہمارا راجہ اور اُس کے وفیہ خواروں کے مفادات کی لکھوائی کے لیے عوام میں تفرقہ ڈالنے اور بیرونی توجہ کو ہمارا جس کی حکومت کی کاروائیوں سے ہٹا کر ذریعہ معاملات اور ذاتیات میں الجھانے کا کام کرتی رہی۔ اس میں مولوی یوسف شاہ کے خاص مشیروں منشی احمد شاہ وکیل اور دوسروں کے علاوہ درپردہ ہمارا راجہ کے ایجنٹ یا کدو وغیرہ بھی تارلاتے رہے۔ کسی شاعر نے یوسف کنگان اور مولوی یوسف شادی کی ہم تہائی کا جوڑ کر کیا انھیں چوٹ کی۔

یوسف تو مصر میں لپکا سونے کے تول سے
یوسف نے سستی بیچ دی آزاد پارٹی

مولوی یوسف شاہ کے حمایتی جب عوامی سطح پر مسلم کافر نے کالیاں بیکانہ کر کے تو وہ اچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ انھوں نے خُندہ گردی شروع کر دی۔ شہر میں بوسے شروں کر دیئے۔ اور بارہا قتل و غارت کی نوبت بھی آئی عوامی ذہن نے مولوی صاحب کے حامیوں کے لیے "بکرا" نام اور ہمارے حامیوں کے لیے "شیر" کی اصطلاحیں وضع کیں۔ ہمارے حامی تو غیر میرے لقب "شیر کشمیری" کی مسابقت سے "شیر کھانا" بن گئے۔ بکرے

اس لیے بکرسے کہلائے کیونکہ ایک تو وہ شیروں کے مقابلے میں بڑے بزدل تھے اور دوسرے وہ لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ انگریزی میں داڑھی کو "GOATEE" کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے اور یہ مناسبت کرے کی مہون منت ہے۔ شیر بکرا فسادات نے بار بار شہر کی فضا کو مکدر کر دیا۔ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ اگر ہماری جماعت کا کوئی بھدر ویر وادھ کے حمایتیوں کے گڈھ میں چلا جاتا وہاں اس کا ٹاش کوٹ لیا جاتا اور اس کی مار پیٹ بھی کی جاتی تھی۔ "نعرہ میدری۔ اسہ گڑھو ژاوری" کہہ کر اس کی چادر رنگ اتار دی جاتی۔ پھر اس کی اطلاع شیر خٹوں میں پہنچ جاتی تو وہاں میر و اعظم صاحب کے حمایتیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا۔ ایک لطیفہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہے ایک دیہاتی شہر آیا کسی ملاقات سے ہمارا ہاتھ جو "بکروں" کی آماج گاہ تھا۔ انھوں نے اُسے پوچھا کہ تم بڑا ہو کہ شیر اس بجارسے کو غیب کا حال کیا معلوم تھا۔ اُس نے کہا کہ "شیر جوں" بس پھر کیا تھا یہ لوگ اس پر فوٹ پڑے اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ بچارہ خاک بھارتا ہوا آگے بڑھ گیا یہ اتفاق سے شیروں کا علاقہ تھا۔ انھوں نے سچی دیہاتی سے یہی سوال کیا۔ اُس نے اب کے جان بچانے کے لیے کہہ دیا کہ "بکرا" جوں۔ چنانچہ اُس کی نئے سرے سے مرمت ہوئی۔ اُس نے کسی طرح گھوڑا بھی لکڑی اور تیرسے تھکے میں جا پہنچا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی یہی سوال اس سے پوچھا تو اپنے تلخ تجربے کی بنا پر اُس نے بھولے پن سے جواب دیا "شیر اور نہ بکرا میں تو مادہ بھیڑ ہوں"۔ اُس کی توقع کے عین مطابق اب کی بار اُسے کسی نے نہ مارا اور نہ پٹا۔

تحریک حریت کشمیر میں جن حریت پسندوں کو سزائے قید یا جرمانے کی سزا دی جاتی تھی ان کو گرفتار کرنے میں یوسف شاہی پر وہ خبیہ جاسوسوں کا رول ادا کرتے تھے۔ کچھ مجاہدین پر جرمانہ عائد ہوا تھا اور وہ یہ جرمانہ ادا نہ کراتے تھے۔ ایسے موقعوں

پر ان کی جانکادوں میں بھی سرکار ضبط کر کے انھیں نیلام پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ یوسف شاہی پر وہ نیلامی کے وقت بڑھ چڑھ کر بولیوں میں حصہ لیتے اور جانکادوں پر قبضہ جما لیتے۔

جوں جوں عوامی تحریک میں آہوار آتا گیا۔ مولوی یوسف شاہ الگ تھلک ہوتے گئے اور اپنی بارش گاہ کے ارد گرد چند قتلوں تک ان کا اثر دور سونگہ سمٹ کر رہ گیا وہ مایوسی میں حکومت کی طرف جھٹکے چلے گئے اور آخر کار انھوں نے ایک وفد جامع مسجد میں ہمارا کبیر کشمیر کو خدا کا سایہ (ظلال اللہ) قرار دیا اور ان کی اطاعت کا مشورہ دیا۔ یہ دیوبند کے اُس فارغ التحصیل کا سجدہ سہو تھا جس کی مادر علم نے شیخ الہند مولانا محمد امجد علی جیسے مجاہدین آزاد پیدا کیے تھے۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی جابر اور ظالم حکومت سے ٹکر لیتے میں گذاری۔ شاید مولوی یوسف شاہ کو مارے دیوبندی قبیلے میں یہ مشتمل فقر حاصل ہے کہ انھوں نے عوام کے خلاف برسر پیکار حکومت سے وطن پرستوں کی خدمت حاصل کرنے میں کوئی ننگ نہ بکھی۔

مولوی یوسف شاہ کے پیروں ہی تھے جنھوں نے ۱۹۳۷ء میں تحریک "کشمیر چھوڑ دو" کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ ہمارا جگہ کے سپاہیوں کے نیزے کشمیری سر فرشتوں کے چنگر پیر رہے تھے اور مولوی یوسف شاہ اور ان کے پیروں کو "مرحبا" مرحبا کہہ رہے تھے جب پنڈت توجہ رالال کشمیریوں کی تحریک کی حمایت کے لیے کوہا لپہنچے تو وہاں بھی لوگوں نے اُن کے خلاف مظاہرے کیے ان میں جنوں کے ہما سہا میوں اور کشمیر کے پنڈت فرقہ پرستوں کے ساتھ ساتھ میر و اعظم صاحب کے بکرسے بھی شور و غوغا کر رہے تھے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ میر و اعظم پارٹی کو "میں" وفاداری "کے لیے کشمیر و بار کی طرف سے لہرانا چڑھا مواضہ دیا گیا۔ میر و اعظم صاحب و وقتاً ایک سیاسی آدمی تھے ہی نہیں

لیکن منصب اور کرام کی ہوس میں وہ ہماری تحریک کو سبوتاژ کرنے کی خواہش رکھتے والوں کے آڈ کاربن بن گئے۔ جناح صاحب کی بھی ان کے متعلق یہی رائے تھی۔ جب وہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر آئے تو ہمارے ساتھ ان کے اختلافات نے بڑی نژادی صورت اختیار کی مولوی یونس شاہ نے ان کا خوب ساتھ دیا، لیکن اس کے باوجود ان کی مولوی صاحب کے متعلق جو رائے تھی اس کے متعلق چودھری غلام عباس خان جیسا گواہ کہاں لے گا؟ چودھری صاحب اپنی کتاب "کشکش" میں جناح صاحب کے ساتھ اپنی اور مولوی یونس شاہ کی ایک مشترکہ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے بغیر کسی توجہ کے میرا وعظ کو اردو میں مقابلہ ہو کر فرمایا کہ آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ سیاست سے کنارہ کش رہیں۔ آپ کی حیثیت مذہبی ہے اور اس حیثیت سے ہم آپ کی اسی طرح عزت کریں گے جس طرح آریع ہشپ آت کشمیری کا انگریز کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح آریع ہشپ سیاست سے الگ تھلک رہتا ہے آپ کو بھی رہنا چاہیے۔"

بعد میں تو جناح صاحب نے مولوی صاحب کو کشمیر کی سیاست کا ROTTEN EGG کہہ کر بھی پھکارا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے وقت جب پاکستان میں کشمیر پر جرح خانی کی تیس ارباں بھر رہی تھیں تو ان کے کچھ اڈی میر واعظ کے پاس آئے اور پاکستان کے مزاحم سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ جب حملہ آور فوج فاتح کی حیثیت سے سرنگرم میں داخل ہو تو آپ ان کا استقبال کریں اور اس کے لیے آپ کو پاکستان آنا پڑے گا۔ مولوی صاحب رات کی تاریکی میں پاکستان چلے گئے۔ جب صبح کو وہاں پہنچا تو وہ وہیں رو گئے۔

لیکن وہاں بھی ان کا مولویانہ مزاج ان کے ساتھ رہا۔ روایت کے مطابق حکومت پاکستان انھیں "آزاد کشمیر کا سپلا صدر بننا چاہتی تھی، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر واپس چھڑا لیا کہ اس طرح ان کے خیال کو کشمیر میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بعد میں جب حالات ذرا سنبھلے تو دیکھا کہ وہ ہمت چھپھڑ گئے ہیں اور یارانِ نیرگام آگے نکل گئے ہیں، چنانچہ انھوں نے سردار اسحاق جی سے نوآموز کے ماتحت وزارت تعلیم کا تھمنا سنبھالنے کو بھی نصیحت جانا۔ بعد میں مولانا یونس شاہ آزاد کشمیر کے صدر بھی بنے اور پاکستان کے موقت کی حریت کے لیے انھوں نے عرب ملکوں کا وسیع دورہ بھی کیا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے مولوی صاحب کا کشمیر سرنگرم میں ہی رہ گیا تھا۔ ان کی خواہش کے مطابق ہم نے میر واعظ صاحب کی مسلم اور بچوں کو پورے احترام و عزت کے ساتھ پاکستان جانے کی اجازت دی۔ اپنے آخری دنوں میں میر واعظ صاحب کشمیر آکر اس کی شفیق مٹی میں خواب ابدی میں لیٹ جانا چاہتے تھے، لیکن سیاسی حالات نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

تقسیم کے بعد کرا پرائی کا شیرازہ بھگ گیا لیکن اس کے لیے چٹے چٹے حاشی اپنی روش میں باز نہ آئے اور موقع کی ناک میں رہے۔ تاکہ پھر سے اپنا وجود منو سکیں ۱۹۵۲ء میں جب یحییٰ غلام محمد اور ان کے ساتھیوں نے چٹے چٹے گرفتار کر دیا تو یحییٰ صاحب کی عیار اور زمانہ ساز رنگا ہوں نے پڑا سے رنگوں کو گریڈ ناشر دے کر دیا۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ کرا پرائی کسی اقتدار یا نظریاتی اساس پر کام نہیں کرتی، انھیں تو چند ملاؤں کی مزدوریت ہے اور احمق اور قوت کی فات سے بغض و عناد ہی ان کا مقصد حیات ہے۔ آدمہ یحییٰ جیسے جتن کرنے کے باوجود نہ تو اپنے آپ کو عوامی سطح پر قابل قبول بناسکے تھے اور نہ ہی میری ذات کو کشمیری عوام کے دلوں سے محو کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے میر واعظ منزل کی طرف پھر نظریں دوڑانا شروع کر دیں وہاں انھوں نے پڑانے

حواریوں کو پھانسی ہوئی انھوں سے تاکتے ہوئے دیکھا تو وہ کھجے کرے

حضرت داعظ ہیں راضی رخص پر

دیر کیا ہے اب پڑے ٹیلے پہ تھاپ

مولوی عتیق اللہ تو خیر پہلے ہی گوشت نشین تھے۔ اب وہاں میر و داعظ بنے تو کون بخشی صاحب نے اپنی سیاست گری میں آؤ دیکھنا تاؤ ایک چودہ ہندہ سالہ کلنڈر سے لڑکے کے سر پر دستار فضیلت باندھ دی اور اسے میر و آؤ کثیر قرار دیا۔ یہ مولوی فاضل تھے۔ جو اس وقت تک لڑکپن کے تقاضوں کے تحت گلی کوچوں میں اچھل کودتے رہتے تھے۔ اور جن کے پاس نہ علم تعلیم اور نہ علم جدید کی کوئی سند تھی۔ یہاں عتیق صاحب بڑی لگن اور صبر سے اس پودے کو سرکاری سرپرستی اور روپے پیسے کے پانی سے سیریتے رہے اور انھوں نے میر و داعظ خاندان کے ٹمک خواروں کو بھی نوازنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ میل بہت دنوں تک منڈھے نہ چڑھ سکی۔ موئے مبارک کی لہجی نشین میں یہ ٹمک لگ گیا اور اب کی بار اس کو مستور کرنے میں مولوی محمد سعید مسعودی کا فتنہ انگیز ذہن کامیاب رہا۔ جو محمد عتیق خاتم محمد کا اقتدار سر نہ کر سکا اسے مولوی مسعودی کے احساس محرومی نے پورا کر دکھایا۔

مولوی مسعودی کے متعلق اشارہ جو چکا ہے کہ ان کی سرشت میں فتنہ انگیزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور انھیں بغیر لڑانا خوب آتا ہے۔ اپنی قربانوں، سادہ زندگی اور علم و فضل کے باوجود وہ کثیر ی عوام میں اپنے لیے جگہ نہ بنا سکے اس لیے ان کی ساری صلاحیتیں سازشوں کی طرف مرکوز ہو گئیں اور وہ خود نہ بھی اپنے کسی گھرے کے ذریعے میرے اندر تحریک کے ساتھ اپنی کینہ پروری کا حساب چکانے کی کوششیں کرتے رہے۔ سچ ہے میں وہ عتیق کے مشیر فاضل تھے۔ انھوں نے نہ صرف میری گرفتاری پر اس

کی مٹھ بٹھو کی بلکہ وزارت سازی میں بھی مشورہ دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی طلاقِ لسانی اور قوتِ گفتار کو بلاسے طاق رکھ کر پارلیمنٹ میں، جس کا ہم نے انھیں ممبر بنا کر بھیجا تھا کشمیر کے حالات اور کشمیریوں پر ہونے والے مظالم کے بارے میں چپ سادھ لی۔ جب کوئی ان سے اس کی توجہ طلب کرتا تو وہ عجیب و غریب جواب دیتے کہ ”میری خاموشی ہی میری گفتگو ہے اور میری چپ میری قربانی“ بعد میں عتیق اور مسادی نے اقتدار میں شرکت کے خوف سے مسعودی صاحب کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن وہ بھی موقع کی طاق میں رہے۔ سچ ہے میں انھوں نے عتیق صاحب کے ساتھ حساب چکا دیا اور مولوی فاروق کو کسی نہ وہ وقت کے بغیر ایکشن کٹی کا صدر بنوایا۔ ان دنوں مولوی صاحب گھٹنوں میں روئے منزل میں صرف کر کے سیاست کے نئے طفلِ کتب کو گھٹنوں گھٹنوں چلنے کے گڑ سکتا رہتے ہوئے نادانانہ طے انھیں یایوس نہیں کیا اور انھوں نے بعد میں کثیر ی قوم میں انتشار پیدا کرنے کے روایتی اور خاندانی رول کو پھر سے سنبھالا۔ مجھ سے ذاتی و شخصی کے علاوہ پھر روشن کر دیے اور شہر میں مدت کے بعد شیر کمرہ کی علت پھر سے چھوٹ پڑی۔

مولوی فاروق کو اپنی بساطِ اوقات سے بڑھ چڑھ کر اچھالنے میں دہلی کے بعض حلقوں کا ہاتھ بھی کار فرما رہا ہے۔ جب محاذِ رائے شماری یایوس نے کشمیری عوام کی مدد و جہم کی کو اونچی کرنے کی کوششیں کیں تو دہلی کے اُن حلقوں کے اشارہ ابرو پر مولوی فاروق اپنی بے سری راہگی چھڑتے رہے اور معاملات سے توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے رہے جب مشعلہ میں ہم نے کشمیر ایکارڈ کیا تو مولوی فاروقی نے اس کے خلاف سرگرمیوں کا پہلا قدم اٹھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حالانکہ خود ان کے قلم بزرگ نے میرے ساتھ اس کے دورِ پاکستان میں مجھ سے وہاں کشمیریوں کی مالیت زار کا ذکر بیان کیا تھا۔ خود خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دوں جن سے اُن کے

یہ کشمیر آنا ممکن بن جائے۔ اور وہ وہیں پر اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام گذار سکیں۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے ۱۹ جولائی ۱۹۵۰ء کو جواہر لال نہرو کے نام ایک خط میں کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کی واضح طور پر حمایت کی تھی۔ اس خط کے کچھ اقتباس ملاحظہ ہوں۔

”مسئلہ کشمیر کے دس سالہ تعقل اور مختلف النوع حالات و واقعات نے اب ایسے مسائل و حقائق سامنے لار کھے ہیں جن کا تصور کبھی دس سال پہلے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ پڑے علاقہ کو دنیا میں ترمیم و نظر ثانی کی ضرورت پیدا ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دس سالہ ذاتی تجربہ و مشاہدات اور بدلے ہوئے حالات میں آپ سے اس موضوع پر بات چیت کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ حالات موجودہ کشمیر کا انڈیا کے ساتھ الحاق بہتر حل ہے۔ اس عمل کو آخری اور قطعی شکل دینے کے لیے موثر کام کرنا اب ہمارا مشترکہ مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارا باہمی تعاون بھرپور اور اعتماد کے ساتھ عمل کرنا لازمی ہے۔۔۔۔۔ میری دلی خواہش ہے کہ دس سالہ تنازعہ اب جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ تاکہ اہل کشمیر بھی انڈیا کے دوسرے باشندوں کی طرح اپنی ترقی اور خوش حالی کے لیے بہترین متوجہ ہوں۔ آپ کے دل میں کشمیر اور اہل کشمیر کی فلاح و بہبود کے لیے جو نیک جذبات و خواہشات موجود ہیں ہم ان سے بخوبی واقف ہیں اور پھر آپ کے اور ہمارے درمیان ہم وطنیت کا جو مستحکم رشتہ ہے، یہ چیز کشمیر یوں کے اعتماد و اطمینان کے لیے بڑا سامان ہے۔“

مقطع میں البتہ یہ سخن گشت رانہ بات لانے کی ضرورت ہے کہ موتوی صاحب نے یہ خط جولائی ۱۹۵۰ء میں لکھا جب میں بخشی اور اس کے دہلوی آقاؤں کے خلاف سب سے شدید لڑائی میں مصروف تھا۔ ہمارے خلاف کشمیر سازش کیس دائر ہو چکا تھا اور بخشی کی گرفتاریاں عرصہ پر تھیں۔ موتوی خاندان کا چونکہ مجھ سے کوئی نظریاتی جھگڑا نہیں تھا اور وہ صرف

میری ذات کے مخالف تھے، اس لیے انھیں یہ موقع اچھی نظر آیا تو مجھے لگانے کے لیے غنیمت فخر آیا تھا تاکہ وہ کشمیر اگر میری طرف سے مطمئن ہو کر وادعیش دے سکیں۔ لیکن قدرت کو کیا منظور تھا۔ اس کا مولوی صاحب اندازہ نہیں کر سکے۔ اور یہ چال بھی اٹھنی پڑ گئی۔

یہ تو ایک جملہ مستر متھا۔ اصل بات ۱۹۵۰ء میں مولوی فاروق کے رول کی ہو رہی تھی۔ جو نہی ہم نے اقتدار سنبھالا وہ ایک کارڈ کی مخالفت بھول گئے۔ اور کانگریسیوں نے ہمارے خلاف کینہہ پردہ دی اور کر دار کشی کی جو ہم چلائی اس میں ان کے ساتھ گٹھا بنے گئے۔ ان کے بیانات کو مدہنی اور سر بیکر کے ریڈیو نے خوب اچھا لانا شروع کیا۔ اور اس طرح وہ کانگریس کے قریب تر آ گئے۔

لیکن ۱۹۵۰ء کے عام چناؤ میں جب شمالی ہندوستان۔ سر کانگریس کا حلقہ تھا اور مرکز میں کانگریس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ تو مولوی صاحب کو ایک لحظے کے لیے بھی ضمیر کی ککب محسوس نہ ہوئی۔ اور وہ جتنا کی گاڑی پر چڑھ گئے۔ انھوں نے میرے رواجی مخالفین کے عظیم اتحاد میں شمولیت ہی نہیں کی بلکہ اس کے سرخیل بن گئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کیا کیا کال کلائے نمایاں انجام دیئے اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی فاروق صاحب نے اپنے سیاسی آئیڈیولوجی اور مسعودی کی توقعات و وعدہ چڑھ کر پوری کی ہیں۔ ▲▲▲

موجود تھے۔ اور ان کا سارا جسمانی نظام متاثر ہو گیا تھا۔ یہ بات ان کی ہر اداسے آشکار ہو رہی تھی۔

کوئی دم کا مہماں ہوں اسے ابلی معطل !
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بہر حال فوٹو گرافروں کے اصرار پر برآمدے میں، جہاں جو اہر آں میرے استقبال کے لیے خاص طور سے تھے کچھ تصویریں کھینچوالی گئیں اور اس کے بعد ہم آؤپر کے کمرے میں چلے گئے۔ پندرہ بجتی تھی بڑی دسوزی اور لپا جوت سے گذشتہ واقعات پر معذرت ظاہر کی، آنکھوں نے کہا کہ جو کچھ ہوا وہ میری مرضی و منشاء کے خلاف ہوا اگر تجھے اس پر کافی افسوس ہے لیکن یہ حیثیت وزیر اعظم میں اس کی حتمی ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتا۔ باقی دل کا حال جو ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ پندرہ بجتی بڑی دل فریب اداؤں کے مالک تھے۔ اور جس حالت اور جس گلوگر آواز میں انھوں نے یہ باتیں کہیں اُس سے میں آہیدہ ہو گیا۔ تجھ پر بھی ایک گہری جذباتی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُن سے کہا کہ میں انھیں وزیر اعظم سے زیادہ اپنا بھائی سمجھتا تھا اور جو کچھ میرے ساتھ گذری ہے وہ میرے لیے اس لحاظ سے انتہائی خلاف توقع تھا کہ میں جو اہر لال شہزاد کے راج میں اس قسم کے سلوک کی امید نہ رکھتا تھا۔ بقول شاعر :

”یوسف کو قید اور زینا کے عہد میں“

لیکن یہ اُس زندگی کے لوازمات ہیں جو میں نے اپنے لیے اختیار کی ہے اور اس دیگر پر ایسی کھانسیوں اور خند توں کا درپیش آنا تجھ جیسے مسافر کا مقصد رہے۔ بہر حال اگر میں آپ کو یہ یاد کرانے میں کامیاب ہو سکا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی فریب یا دغا نہیں کی تھی اور نہ ہندوستان کے ساتھ بے وفائی تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ

۶۳

جواہر لال کے ساتھ آخری ملاقات

ہمارے سلیب بیان کا دھاگہ سسٹنہ میں تیل سے ہمداری رہائی اور سرسری لگم میں آمد تک پہنچ گیا تھا کہ بیچ میں کچھ اہم معاملات پر خاص فرسائی کرنا پڑی۔ آدم برسر مطلب سرنگرمیں چند روز قیام کرنے کے بعد میں نے اور بیگ صاحب نے جواہر لال کی باضابطہ دعوت پر دہلی کی طرف کوچ کیا۔ پالم کے ہوائی اڈے پر جواہر لال کی طرف سے میرا مخلصانہ اور پُر جوش استقبال کیا گیا۔ پندرہ بجتی تھی یہی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی، نائب وزیر خارجہ راجدیش سنگھ اور وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کو کھجے لینے کے لیے ہوائی اڈے پر بھیج دیا تھا۔ ہوائی اڈے سے میں اندراجی کے ساتھ صحافیین ہوتی باؤں چلا گیا۔ پندرہ بجتی تھی جیسے تپاک سے ملے لیکن وہ پچلے کے سے پندرہ بجتی کہاں رہے تھے۔ میں انھیں گیارہ سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ شبلی کی طرح لال بھجوا کا اور گرم تھے۔ شاعر نے کشمیریوں کو لالہ زونہ کہہ کر اپکارا ہے اور جواہر لال کو دیکھ کر اس تشبیہ کی صداقت اور کفایت کا پورا ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ مڑھا گئے تھے۔ ان کی کمر خیدہ تھی، ان کے چہرے پر پژمردگی اور ان کے گالوں پر چھریاں ابھرتی تھیں۔ جھونپڑیوں فالج کے حملے کے اثرات

کھٹن اور بی تیار رائیلاں نہیں گئی۔ واقعہ یوں ہے کہ جو کچھ ہوا وہ گنگناؤں کی سازش کا نتیجہ تھا جس میں ہماری بدقسمتی سے آپ جیسا ہمارا پیش بھی اُلجھ گیا۔ لیکن اب نامی کے نوکڑے رونے اور انتقام گیری کی راہ اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر ہم نامی میں ہی اُلجھے رہے تو مستقبل ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ ہندوستان کو ابھی گھیرے مسائل کا سامنا ہے اور ان کو آپ کی زندگی میں حل نہ کیا گیا تو یہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جائیں گے اور اس لیے ہماری زندگی کی جتنی ساقیں بھی باقی ہیں، انہیں پورے عزم و ارادے سے ان مسائل کو حل کرنے کی طرف لگانا ہوں گی۔" میں نے مسئلہ کشمیر کا ذکر چھوڑتے ہوئے کہا کہ میری نظر میں سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے۔ چین اور ہندوستان کی باہمی ٹکرات میرے اس نظریہ کو اور زیادہ تقویت پہنچاتی ہے کہ ہندوستان کو اپنے چھوٹے پڑوسی ملکوں کے ساتھ فراعزہ دلائے اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہئیں تاکہ ان کے اندر یہ خیال پیدا ہو کہ ہندوستان ان کا ہم در دوست ہے اور اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس صورت میں ہم ان چھوٹے پڑوسیوں کو اپنا محموم تعاون بنا سکتے ہیں۔ ان ممالک میں پاکستان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ہند اور پاکستان دونوں ملکوں کا دفاع ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور دونوں کی مشق کہ کوشش کا مطلب گار اور محتاج، دونوں کی تجارت بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور دونوں میں رہنے والے باشندے جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے ایک ہی ملک کے باشندے تھے۔ ان کی زبان نہیں بہن کچھ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والیاں ایسے ناطے ہیں جس کے شیرازہ میں وہ اس طرح ایک دوسرے سے ٹکے ہوئے ہیں کہ زمین پر ہوا رے کی جو کھینک دی گئی ہے وہ سراسر بناوٹی اور معنوی لگتی ہے۔ وقت آگیا ہے جبکہ ہندوستان کو ایک فراعزہ دل بڑے بھائی کی طرح پہلا قدم اٹھانا چاہئے اور کشمیر کی گتھی کو کٹ بھانسنے میں پہل کرنی چاہئے کیوں کہ اسی نے ان دو کے درمیان

کدورت کی دیوار عائل کر دی ہے۔ پشت پستی ہے کہا کہ میں ان احساسات سے پوری طرح محقق ہوں اور اپنی زندگی کی شام میں یہ کام سرانجام دینا چاہتا ہوں جو میرے پہلے طے ہونا چاہئے تھا۔ انھوں نے کہا کہ شاید تقدیر نے آپ سے قربانیوں کا اتنا بڑا خراج اس لیے وصول کیا ہے کہ آپ اس معاملے میں پہلی کی حیثیت انجام دیں۔ چنانچہ آپ اس اچھے کام کے لیے سلسلہ جہاتی کرنے کے لیے اس وقت سب سے موزوں شخص ہیں۔ بہر حال طے یہ ہوا کہ میں پاکستان جا کر صدر پاکستان فیصلہ مارشل صدر ایوب خان کو دہلی آنے کے لیے آگاہ کروں اور یہاں دونوں ملکوں کے نمائندے سیزر آئے ساتھ ساتھ میچر کشمیر کے اس تنازعے کو پڑھانے کے لیے عملی کوشش کریں۔ "پشت پستی ہے کہا کہ ان کی صحت کا جو عالم ہے اس کی وجہ سے وہ خود راہ لیندھی جانے کی حالت میں نہیں ہیں۔ لیکن اگر فیصلہ مارشل ایوب خان دہلی آئیں تو کام آسان ہو سکتا ہے۔ آج تک کشمیر کے معاملے کو حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ دونوں ملکوں کے دوست ملکوں کا وعدہ دونوں ملکوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں ہر ایک کو زیر غور لایا جائے گا اور متبادل تجاویز کو کیے بعد دیگر تجاویز کو کسی قابل قبول اور معقول حل پر منگلی رکھی جائے۔ اور اس کو بنیاد بنا کر اس معاملے کا حتمی فیصلہ کر دیا جائے گا میں نے جو اہل کمال کے لہجے کے خلوص کو محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا کہ اب وہ صدقہ دل سے معاف نہیں کرے گا۔ وہ ہیں۔ چنانچہ میں نے پاکستان جانے پر حامی ہو کر دہلی میں جب ہم گفتگو میں مصروف ہی تھے تو فیصلہ مارشل ایوب خان کے تاجرواہ وال اور میرے نام آئے کہ کشمیر کے معاملے میں پاکستان بھی ایک فریق ہے لہذا جو بھی فیصلہ اس کی غیر حامی میں ہو گا وہ اس کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔ انھوں نے مجھے پاکستان آنے کی دعوت بھی دے دی۔ اب کوئی شک و کاوت نہ تھی۔ اس لیے پاکستان جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اسی دوران مدراس کا دورہ کیا جہاں میں نے ہند اور پاکستان کی دوستی کے قدیمی ممبر دار راج گپال آپجاریہ کی اپنے نازک مشن کے لیے آئیر واد چابی راج گپال آپجاریہ نے خوف و رعایت کے بغیر جواہر لال کی غلط پالیسیوں کی مخالفت کی تھی اور پاکستان و کشمیر کے بارے میں وہ بار بار ان کو ٹوکتے رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بزرگ سیاست دان میں صرف عقل و دانش ہی نہ تھی بلکہ اخلاقی جرأت کا بھی جوہر تھا۔ اس خوبی نے انہیں اپنی قوم کا ضمیر نگار CONSCIENCE KEEPER بنا دیا تھا۔ اور اس لیے میں ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ اپنی پیرائے ساری کے باوجود بڑی گرم جوشی سے ملے انھوں نے واقعات کی نئی کڑبڑ پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ جواہر لال نے ان کی صحیح رائے کو نظر انداز کر کے چالچلوں اور مصاحبوں کے آگے سپردِ الدی تھی اس لیے یہ صورت حال پیش آئی بہر حال صبح کا بھولا اگر شام کو گھڑائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اور جواہر لال میں ابھی اس قدر دم غم ہے کہ ان کے جیتے جی کوئی ان کے فیصلے پر انگشت ٹھانی نہیں کر سکتا۔ میں پونا آشرم بھی گیا اور آپجاریہ و فو باجھارے سے بھی ملا۔ وہ بھی اس مشن کی کامیابی کی دعا کرنے لگے۔ جے پیرکاش نرائن میرے ویرینہ دوست تھے اور ہند پاک آشتی کے بڑے زبردست حامی۔ میں ان سے بھی ملا اور انھوں نے بھی اس پہل پر مجھے جو صلہ دیا۔ اس کے علاوہ میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راج گھنشن اور نائب صدر ڈاکٹر ذکریا حسین سے بھی ملا۔ اور دونوں نے اس مشن کے لیے خیر سگئی کا اظہار کیا۔ اور ہر پختہ جی اپنی خرابی صحت کے باوجود دہلی سے باہر کی مصروفیات کے لیے بھی طوعاً و کرہاً رضامندی ظاہر کرتے تھے۔ اور اپنے شخصیت و نثارِ جسم کے لیے اور زیادہ پوچھتے رہتے تھے۔ وہ ان ہی دونوں خیال کی مجدد پر کسی کارخانے کا افتتاح کرنے کے لیے بھی گئے۔ جیسی انہی دونوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا اور جواہر لال وہاں بھی پہنچ گئے۔ وہاں کچھ کچھ کمیٹی لوگوں نے جواہر لال

اور میری گفتگو پر خیال آرائی کی توجہ اہر لال نہرو نے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیے ایک تقریر بھی کر دی۔ یہ زندگی میں ان کی آخری عام تقریر تھی اور یہ ٹھیکاً کشمیر سے متعلق تھی۔ میرے مجوزہ دورہ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے پختہ جی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ ”شیخ عبداللہ سیکولرازم کے اصول پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جس سے ان اصولوں کو کسی نوع کا نقصان پہنچے گا۔ احتمال ہو کہ وہ اس دور قومی نظریے کو بھی نہیں مانتے جو قیام پاکستان کی اساس ہے۔ تاہم ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندوستان کے لیے اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے بھی پاکستان کے ساتھ اس و آشتی کی زندگی گزارنا ناممکن نہ ہونا چاہیے۔ اور اس طرح کشمیر کی گتھی بھی سمجھ سکتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنی کوششوں میں ہم کامیاب ہی ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو ہندوستان کو پاکستان کے ساتھ مسلسل تصادم کے بوجھ کو اور ان تمام تباہ کن کوجو اس میں مضمر ہیں، برداشت کرتے رہنا ہر گز مجھے توقع ہے کہ ہندوستان سے ہر اسامان ہونے اور اس سے نفرت کرنے کے جذبے سے بھی پاکستان کو نجات حاصل ہو سکے گی۔ مجھے اس کی بھی امید ہے کہ دونوں ملکوں کے لیے ایک دوسرے سے قریبی اور دوستانہ تعلقات قائم کرنا بھی ممکن ہو سکے گا۔ اور اس میں دونوں کی بھلائی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ انگریز کے ساتھ تو وہ دونوں ملکوں کی خفیہ خدمت سر انجام دیں گے۔ اس مقصد کے حصول کی کوشش میں ہم ہر طرح امداد کرنے کو تیار ہیں۔“

مجھ سے واپس دہلی آئے تو ہم ان سے پوچھے۔ وہ کچھ دنوں آرام کرنے کے لیے ڈیرہ دون جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کو رخصت کرنے کے لیے ہم بھی ہوائی اڈے پر گئے۔ جہاز میں رخصت ہونے سے پہلے انھوں نے مجھ سے اودائی مصاحفہ کیا تو انھوں

نے اپنے ضعف کے باوجود میرا ہاتھ محبت سے دبا دیا۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا خالی پن اور سنجیدگی تھی۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ کشمیر کی مٹی کی ہلکے سے شرابور اس عظیم سموت اور میرے سنہایت ہی پیارے دوست اور بڑے ہی زبردست صیاد کے ساتھ یہ میرا آخری مٹھا نمہ ثابت ہوگا۔ وہ کسی جاہل جراتگاہ جاتے رہے اور پھر وہاں آکر ہمارے ساتھ ہاتھ لاتے رہے ایسا لگتا تھا کہ ان پر موت کا سایہ پڑ چکا تھا اور ان کو اس کی پیش قیاسی (PREMONITION) گھما رہی تھی۔ بہر کیف وہ ڈیرہ دون روانہ ہو گئے۔ اور ہم دوسرے دن ایک پاکستانی طیارے کے ذریعہ راولپنڈی کی طرف پرواز کر گئے۔ میرے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ، مولوی محمد مسعودی، خواجہ مبارک شاہ دہلوی، خواجہ مبارک شاہ نقشبندی، چودھری محمد شفیع باغی، اور میرے فرزند فاروق بھی شامل تھے۔ اور اس کے علاوہ چند ہندوستانی اخبارات کے نمائندے، جانے سے قبل میں نے اپنی پاکستان یا تری کی غرض و غایت کے متعلق ایک بیان جاری کیا تھا۔ جس کے کچھ حصے یہاں نقل کرنا یہ محض نہ ہوگا۔

”دونوں ملکوں کے تعلقات کی کشیدگی نے ایک مشکل تناؤ پیدا کر رکھا ہے۔ جو اکثر ورنہ لگائی کا روپ دھار لیتا ہے اور بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے چنانچہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں بدترین و بہشت زدگی کا شکار ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں اچھے شہری کی زندگی گزارنے کی صحت مندانہ اہلیت کھو بی جا رہی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان جس تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں اس کی رفتار کو اگر روکا نہ گیا تو ایشیا میں اقتدار کا توازن درہم برہم ہوگا اور پورا برصغیر تباہی کے شعلوں کی پیٹ میں آجائے گا۔ ہم ایک بھیانک صورت حال کی پیدائش میں ہیں۔ اور اگر ہم نے دونوں ملکوں کے تعلقات میں خرابی کو بڑھتے دیا تو ہماری آنسو والی تسلیں

ہمیں معاف نہ کریں گی۔ تعلقات کی خرابی کی رفتار روکنا دونوں ملکوں کے لیڈروں کا اہم ترین فریضہ ہی نہیں بلکہ ایسے ڈرائیو ڈھونڈنا اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی ان کے لیے ضروری ہے۔ جن سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان میل جول اور دوستی پیدا ہو اس سلسلے میں مسئلہ کشمیر مسئلہ طور پر سترہ برسوں سے دونوں ملکوں کو مشتعل کرتا رہا ہے چنانچہ ہماری کوششیں یہ ہوئی چاہئیں کہ اشتعال کا یہ سبب دور ہو اور اس مسئلے کا کوئی دوستانہ حل نکل آئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایسا حل ہونا چاہئے جس سے نہ تو کسی ملک کو شکست کا احساس ہو اور نہ ہندوستان کی سیکولر بنیادیں ہی کھرھوں نیز اس سے ریاست کے عوام کی آزادی کی تکمیل بھی ہو سکے اور انھیں باعزت مقام مل سکے میں اس غرض کے لیے پاکستان جا کر صدر ایوب خان اور وہاں کے دوسرے لیڈروں سے بھی بات چیت کروں گا۔ ▲▲▲

.... ٹوٹی کہاں کمند

واولینڈی پیچھے تو چمک لالہ کے ہوائی اڈے پر ایک میل لگا ہوا تھا۔ ابھی میں جہاز کے دروازے سے نکل کر پہلی دوسری سیڑھی پر ہی قدم رکھ پایا تھا کہ سب سے پہلے میرا وقت کیوسٹ شاہ نے میرا استقبال کیا۔ وہ عیارے کی سیڑھیوں پر چڑھ آئے اور مجھ سے ملٹ گئے۔ وہاں ہمارے کچھ اور بھی دیرینہ دوست اور شہنشاہ آئے ہوئے تھے۔ جن میں چودھری غلام عباس خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ ہم سے جوانی میں جدا ہو گئے تھے اور اب ہم بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ صدر ایوب نے اپنے جوان سال دہریہ خارجہ میں ڈاٹاکار علی سیٹو کو میرے غیر مقدم کے لیے بھیج دیا تھا۔ کشمیریوں اور ہمارے دوسرے ٹھوڑوں کا بھی بڑا انجم تھا۔ سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک یکٹے ہی برسوں کے بعد ملے آئے تھے۔ اس لیے جذبات پر قابو نہ تھا۔ بڑے تپاک سے غصے لگا کر اور ہاتھ چلا کر ہمارا غیر مقدم کیا گیا۔ مجھے ایک بند کار میں شہر کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں دو طرف لوگ قطار میں باندھے کھڑے تھے اور کئی جگہوں پر بھیدنٹ پانٹوں کا بیانا لہریز کر کے سڑک پر بھی

درا آئی تھی۔ لوگ مجھے فطرتیاتی سے دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن کچھ نہیں پاتے تھے۔ مجھ سے ان کی مایوسی کا ماحراجا دیکھا نہ گیا۔ اس لیے میں نے سیکورٹی فورس سے پوچھے بغیر کار کو کرایا اور ایک کھلی جیب میں سوار ہو گیا۔ مجھ کو صاحب بچارے پھیر میں پیچھے رہ گئے۔ پاکستان سیکورٹی پولیس نے میرے اس اقدام کو پسند نہیں کیا۔ لیکن اس سے لوگوں کے چہرے پھول کی طرح کھلنے لگے اور سبھی میرا انعام تھا۔ آخر کار ہم مختلف شاہراہوں سے گذر کر صدر پاکستان کے سرکاری مہمان خانے میں پہنچ گئے۔ جہاں ہمارے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہم فیملی مارشل ایوب خاں سے ملنے کے لیے ایوان صدر گئے۔ صدر ایوب بڑی محبت سے پیش آئے اور ازراہ لطف یہ بھی کہا کہ ان کا بچی تو چاہتا تھا کہ وہ میرے استقبال کے لیے بذات خود ہوائی اڈے پر آئیں لیکن پروٹوکول اور رسمیات کی بندشوں نے انہیں بے بس بنا دیا۔ ہمارے ذیلی گیش کے ممبران کے متعلق ان کا کیا تجزیہ تھا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ البتہ ایک نجی ملاقات میں صدر نے مولوی محمد سعید کے متعلق اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اور ہمارے وفد میں ان کی شمولیت کا ذکر ایسے طریقے پر کیا جیسے انہیں یہ بات پسند نہ آئی ہو۔ صدر باقی لوگوں سے کافی تپاک کے ساتھ ملے۔ اور کچھ تھے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اور چیدوں کے علاوہ کشمیر کی صوفیانہ موسیقی میں استعمال ہونے والا ساز منظور بھی ان کے لیے لے گئے تھے۔ ایک سوتاروں پر مشتمل یہ دنوار ساز کشمیر میں مسلمان لائے تھے اور سارے ہندوستان میں صرف یہیں استعمال ہوتا رہا۔

میں نے صدر ایوب کو مسند کشمیر کا پس منظر کافی تفصیل سے سنایا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں دلائل کے ساتھ اس بات کا ذکر بھی کیا کہ پاکستان کے اربابِ صل و عقد نے کس طرح کوتاہ اندیشی سے کام لے کر اس مسئلے کو آج بھادیا۔ صدر ایوب نے چرسے ختم کی اور تھوڑے میرے استدلال کو سنا اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے تسلیم کیا کہ ان کے ملک کے غلطیاں مرزد

کر لیا کہ انھوں نے جو بات بھی تھی وہ حقائق سے دور تھی۔

بہر کیفیت، بات صدر ایوب سے میری گفتگو کی ہو رہی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان تجویز پر غور کرنے کے بعد آپ ہی فیصلہ کر لیں آیا کوئی ایسی تجویز ہے جس کو مناسب تبدیلی اور کات چھانٹ کے بعد سمجھوتے کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے مگر ایسی کوئی تجویز نکل آئی تو بہت بہتر اور خدا نخواستہ اگر کچھ نہ ہو سکا تو بھی آپ کا کچھ نہ بگڑے گا۔ کم از کم یہ آپس پر مدھٹ جائے گا اور آپ ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے جس سے دونوں ملکوں اور اُن کے عوام کو فائدہ ہی فائدہ ملے گا۔ حالات میں تناؤ کم ہو جائے گا اور اگر اس سمت کوشش فوری صورت سے جاری رہی تو کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور کسی معقول حل کی رہ گزر سانسے آسے گی۔

صدر ایوب نے جو اہر لال ہی کی طرح میرے محسوسات سے اتفاق کیا اور دہلی تشریف لانے کی میری تجویز کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ اسس ملاقات کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ جس کی اطلاع میں نے دہلی بھیج دی اور اس کے متعلق باقاعدہ سرکاری اعلان بھی شائع ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ یہ ملاقات جوں کے وطن میں ہوگی۔ میرے پاکستان آنے کا رشتہ کامیاب ہو گیا تھا اور میں اب اطمینان سے آنے والی چوٹی کاغذ رشتہ کی طرف مشتاقانہ نگاہ مرکوز رکھے ہوئے تھا۔

اسی رات راولپنڈی کے مشہور لیاقت باغ میں، جیسے تقسیم سے پہلے کمپنی باغ کہا جاتا تھا اور جہاں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان ایک قاتل کے ہاتھوں گولی گئے سے جان، جان آفریں کے سپرد کر چکے تھے، میرے اعزاز میں ایک شہری استقبالیہ منعقد ہوا۔ لیاقت باغ کا چارچوپہر تعلقت سے سجرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف انسانی سروں کا ایک سمندر نظر آ رہا تھا۔ "اتحاد پاکستان" ٹانجر کے انداز سے

ہوتی آئی ہیں لیکن غلطیوں کی دلدل گردنہ سے کچھ نہ ملے گا۔ البتہ اُن کا مداوا دھونڈنا ہوگا۔ صدر ایوب نے چانک کہا کہ کنفیڈریشن اس کا علاج مرکز نہیں ہیں ان کی اس بات سے چونک گیا اور میں نے کہا کہ نہ معلوم آپ کنفیڈریشن کا قاعدہ کیوں لے بیٹھے۔ میں تو کنفیڈریشن کی تجویز پیش نہیں کی۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ بندت جی کے ساتھ میرے پر آئے سامنے آجائیں اور اُن تمام تجاویز پر باہمی تبادلہ خیال کریں جو اس گفتگو کو سلجھانے کے سلسلے میں آج تک سامنے آئی ہیں۔ اور میں کنفیڈریشن کا قیام بھی شامل ہے۔ صدر ایوب خاں اپنے ملک کے سیاسی اہلکار چڑھاو کے پیش نظر کنفیڈریشن کے سلسلے میں بار بار دہی ہی کہتے رہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "رجس رزق سے آتی ہو یہ واز میں کوتاہی" میں جو کچھ میں شائع ہوئی، میری طرف کچھ ایسی باتیں منسوب کیں جو سراسر غلط تھیں۔ چنانچہ میں نے ریکارڈ کو درست کرنے کے لیے یکم ستمبر ۱۹۶۶ء کو انھیں ایک خط لکھا تھا۔ جس کا ایک انقباس یوں ہے۔

"آپ نے اپنی کتاب میں کنفیڈریشن کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے آپ کے اس بیان میں مجھے تناقض نظر آتا ہے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری اس گفتگو کو اپنے ذہن میں تازہ کریں جو مرزا محمد افضل بیگ کی معیت میں آپ سے ہوئی تھی..... کشمیر کے کشمیری کی کوئی ہندوئی کی تجویز ہم اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے اور حق تو یہ ہے کہ جو ہر لال ہندو نے بھی ہمیں کوئی مخصوص تجویز آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ ہم اس مٹی کے بنے ہوئے لوگ نہیں ہیں..... میرا سارا زور اس پہلو پر تھا کہ طریقہ اپنی بے لوث روش ترک کر کے دوسروں کا نقطہ نظر بے تعین و گمان بننے پر آمادہ ہوں۔"

صدر ایوب نے میرے مراسلے کا جواب دو سے دو کہ اس بات کا خاموش اقرار

کے مطابق دولاکہ کی حاضری حتیٰ کہ جن میں برقعہ پوش خواتین بھی تھیں۔ چودھری غلام عباس نے مجھے خوش آمدید کہا اور حسب معمول ایک جذباتی تقریر کر ڈالی۔ مقامی مسلم لیگ کے صدر کی جانب سے ایک لاکھ روپے کا چیک ہماری خدمت میں پیش کیا گیا جس کو میں نے یہ کہتے ہوئے شکریہ کے ساتھ واپس کیا کہ اسے کشمیری مہاجرین کی بہتری کے لیے خرچ کیا جائے۔ محمد یوسف قریشی نے ہمارے لیے ایک سپانسر پیش کیا۔ چودھری غلام عباس نے اپنی تقریر میں چین اور پاکستان کی دوستی کو خوب اچھا اور اس کے مقابلے میں ہند اور پاکستان کی دوستی پر چھینٹے اڑائے۔ انھوں نے چین کو مسئلہ کشمیر کا ایک فریق بھی قرار دیا۔ چودھری صاحب نے رنگین آنکھیں بھریں کہ عظیم ترین رہنما اور مسلمانوں کا سب سے بڑا بھی خواہ قرار دیا۔ میں جب تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو مجھے غلط شوق سے تقریباً بے قرار ہو گیا۔ میں نے علامہ کلام پاک شروع کی تو جیسے میں فوراً سکوت طاری ہو گیا۔ میں نے یہ نظم پڑھی

”کسی کے آگے نہ ختم ہو سکی میری گردن
کسی جگہ میری آواز آج تک نہ دہی“

ترجمہ سے سنائی تو لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ بہر حال میں نے اپنی تقریر میں پاکستان کے لوگوں پر واضح کیا کہ ترجمے نے ان کو یہ بات سکھادی ہوگی اور انھیں خود اس بات کا اندازہ ہو گا کہ ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ کشمیر کے حل کے لیے وہ کسی بیرونی ملک پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنی نگاہیں ہندوستان کی ہی طرف اٹھائیں۔ ان کا مفاد اس تدبیر میں پوشیدہ ہے۔ اس سے پہلے پاکستان امریکہ اور برطانیہ پر بھروسہ کرنے کا خیازہ عجلت چکا ہے۔ اب چین کو اپنا مشکل کشا ماننا غلطیوں کو مگر مکر کرنے کے برابر ہو گا۔ بین الاقوامی سیاسیات میں دوستی کی بنیاد مشترکہ مفادات ہوتے ہیں۔

وہ ختم ہو گئے تو دوستی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان اور پاکستان کو جغرافیہ اور تواریخ نے ایک دوسرے سے گانچہ رکھا ہے۔ ان کے مفادات مشترک ہیں۔ فضا میں وقتی طور پر چاہے کتنی ہی کشیدگی کیوں نظر نہ آئے وہ حقائق سے بے جاگ نہیں ہو سکتے۔ کسی خارجی دن ہند اور پاکستان کے عوام اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوں گا اور وہی ان کی نجات کا دل ہو گا۔ رات کو صدر ایوب خاں نے ہمارے اعزاز میں ایک دعوت دی جس میں پاکستان کے سرکردہ اشخاص کے علاوہ چودھری غلام عباس نے وراغظ یوسف شاہ کے۔ ایچ خورشید صدر آزاد کشمیر اور اسلام آباد کے دوسرے علمائین نے شرکت کی۔

میں نے راولپنڈی میں ایک پرنٹجوم اخباری کانفرنس سے بھی خطاب کیا اور دنیا بھر کے اخباری نمائندوں کے سامنے اپنے دورے کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ میں نے اسی پریس کانفرنس میں یہ خوش خبری بھی سنائی کہ پاکستان کے صدر ہندوستان کے وزیر اعظم سے ملنے کے لیے دہلی آنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ یہ غیر حسب توقع ماری دنیا میں اولین اہمیت حاصل کر گئی اور شاہ سرخیوں کے ساتھ بین الاقوامی پریس میں چھپ گئی۔ راولپنڈی میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں میر وراغظ یوسف شاہ سے ملنے ان کے مکان پر پہنچی گیا وہاں ان کے برادر زادہ مولوی قمر الدین بھی موجود تھے۔ مولوی یوسف شاہ پاکستان سے کافی دل برداشتہ نظر آئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ان سے غلطی ہو گئی ہے لیکن اب وہ اس بات پر متحمل نہیں رکھتے ہیں کہ کشمیر کی نجات اُس کی مشکل آزادی میں مضطرب ہے اور یہ کچھ اس مقصد کے حصول کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ چودھری غلام عباس کے مکان پر بھی ان کے بال بچوں سے ملنے کے لیے گیا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لہذا کوئی سیاسی گفتگو نہ ہو سکی۔ رسمی سلیک ایک

پری آگیا کرنا پڑا۔ چلتے چلتے مولوی عبدالرحیم اور کچھ اور چڑھنے اجاب سے بھی آمنت سامنا ہو گیا۔

میرے پاکستان پیپچے سے پہلے ہی میرے نام ایوانِ صدر کی معرفت تاریخوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا۔ پاکستان کے کونے کونے سے جن میں لالہ موسیٰ، سیالکوٹ، پشاور، کوہاٹ، کوٹلہ، بنوں، گجراتوالہ، وزیر آباد، ملتان، الہ پور، خیر پور، کراچی، حیدرآباد، لاہور اور کتنے ہی دوسرے شہر شامل تھے۔ مجھے وہاں آنے کی دعوتیں وصول ہو رہی تھیں۔ یہ دعوتیں مقامی کشمیری باشندے، پُراٹے جمہدین آزادی، سیاسی سماجی اور ثقافتی تنظیمیں بھیج رہی تھیں۔ بعض ذاتی دوست اس بات پر بڑا زور دے رہے تھے کہ میں اُن کے شہر آتے وقت اُن کے گھر آنے کی فرصت ضرور نکال لوں۔ مشرقی پاکستان کی اس وقت جنگ و دشمنی نہ تھا، اسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی طرف سے مجھے ڈھاکہ، چانگام، کوئٹہ اور دوسری جگہوں کا دورہ کرنے کی دعوتیں مل رہی تھیں۔ ایک دعوت تو مجھے منیر جنرل حبیب اللہ کی طرف سے پبلنگ سے بھی ملی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اپنا چین کا دورہ اوتھورا چھوڑ کر واپس کراچی پہنچ رہے ہیں تاکہ میری دہاں آمد کے موقع پر موجود رہیں۔ میں چاہتا تو تھا کہ جتنے زیادہ مقابلات پر ممکن ہو چلا جاؤں۔ لیکن وقت کم تھا۔ پھر بھی میں آزاد کشمیر، لاہور، سیالکوٹ اور ایک آدھ دوسرے شہروں میں جاتے پر تمہ تھا۔ لیکن ”مارچ خیالیم و فلک درج خیال“

میں نے بہر حال منظرِ آباد جانے کو اولیت دی۔ یہ کشمیری تاریکین وطن کا صدر مقام تھا۔ اور میں اپنی آنکھوں سے اُن کی حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اور اُن کے دلوں کو ٹٹولنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۹۹ء کی پُر آشوب تاریخ کو میں منظرِ آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ پاکستان کے عہدین کے علاوہ پریس نمائندگان کی بڑی جمعیت

بھی تھی۔ ابھی ہم راستے ہی میں تھے کہ یہ ہوشِ نر یا غیر نر کی جواہر لال نہرو کا انتقال ہو گیا ہے اور ہمیں فوراً راولپنڈی واپس آ جانا چاہیے۔ میں یہ خبر سن کر سکتے میں آگیا اور کچھ دور کے لیے جیسے مجھے اس پر یقین ہی نہ آیا لیکن شدنی کو کون ٹال سکتا ہے۔ میں نے جگر تھام کر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ہم چونکہ منظرِ آباد کے بالکل نواح میں پہنچ گئے تھے۔ لہذا واپس آنے کی کچھ تکلیف معلوم نہ ہوئی۔ منظرِ آباد کے تمام رنگ میں جنگ پڑ گیا تھا۔ بہر حال ہم نے صدر آزاد کشمیر کے ایچ۔ نور شید کے ساتھ جیسے جیسے کچھ فوٹے نہر مار کیے۔ اُن کے بعد ایک بہت بڑے اجتماع میں خطاب کرنا پڑا۔ یہ جلسہ جو میرے استقبال کی خوشی میں ہوا گیا تھا اب جواہر لال کا سوگ منانے کا تاریخی جلسہ بن گیا۔ میں نے گلوگیت آواز کے ساتھ جواہر لال کی موت پر اظہارِ رنج و غم کیا اور کہا کہ یہ کشمیری بد قسمتی ہے کہ اس مہرِ سزاوار موز پر جب جواہر لال اس معاملے کو سنبھالنے کے لیے کرسمت ہو گئے تھے انھیں وصیت اچل نہ ہمارے درمیان سے اٹھالیا۔ میں نے پاکستان آنے کی غرض و غایت یہ بیان کرتے ہوئے غمزہ سامعین کو تسلی دی کہ انھیں اس سانحے سے انوس نہ ہونا چاہیے۔ شائد اللہ کو کچھ دیر اور ہماری آزمائش منظور ہے۔ ہمیں اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ شام کو ہم آٹے پاؤں راولپنڈی پہنچے۔ وہاں بھی سیاسی مطلع پر غم کی کالی بلی چھا گئی تھی۔ افق پر آجائے کی جو درجہ ملی گیر نمودار ہونے لگی تھی وہ جواہر لال کی موت سے ایک دم گلابی گئی اور پاکستان کے زخمِ ششدد تھے کہ اب کیا پیش آئے والا ہے میرا کراچی، لاہور اور سیالکوٹ کا دورہ دوسرے کا دھارہ گیدہ اطلاعات کے مطابق اُن شہروں میں میرے استقبال کے لیے بڑی لمبی چوڑی تیاریاں کی گئی تھیں۔ اور لوگ بڑی مشتاقانہ دنگھوں سے میری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ خود میں بہت سے دستوں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن قدرت کو اس وقت یہ ملنا منظور نہ تھا۔

رات کو میری ملاقات فیملی مارشل ایوب خان کے ساتھ ہوئی جس میں ذوالفقار علی بھٹو بھی موجود تھے۔ صدر ایوب کی نگاہیں جیسے غلاؤں کو گھور رہی تھیں۔ میں نے اُن کو مشورہ دیا کہ اب ہمیں کچھ وقت کے لیے صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔ تاکہ نئی دہلی میں نئی حکومت تمام اقتدار سنبھال لے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ موجودہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کی کوشش کریں تاکہ مناسب وقت پر پھر چھوڑے ہوئے دھانچے جوڑنے کی سعی کی جاسکے۔

صدر ایوب ہندوستان میں جو اہم لال کی جانشینی کے بارے میں تین مذہب میں مبتلا تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ جانشینی کی جنگ میں شاید ہندوستان میں عدم استحکام پیدا ہو اور پھر کثیر کے مسئلہ کو سلجھانا تو دور رہا نئے حکمران کہیں اندرونی معاملات سے توجہ ہٹانے کے لیے پاکستان پر فوج کشی نہ کر سکیں۔ میں نے صدر ایوب کو مشورہ دیا کہ وہ ان موسموں کو دل میں نگہ نہ دیں۔ البتہ اس وقت جو اہم لال کی شان کے شایان ایک اعلیٰ سطح کا سرکاری ڈپٹی کمشنر دہلی بھیج دیں۔ جو اہم لال کی آخری رسومات میں پاکستان کی نمائندگی کرے۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی اور ذوالفقار علی بھٹو کو جو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ اور صدر کے بعد وہاں کی سب سے اہم شخصیت تھے، ہمارے ہی ساتھ نئی دہلی جانے کا فریضہ سونپا۔ چنانچہ ہم لوگ اکٹھے ایک ہی چہار میں دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ اگرچہ موقع کی سبیدگی کی وجہ سے راستے میں سبھی اپنے اپنے خیالات میں گم رہے اور کوئی بات چیت نہ ہو سکی کہیں کو معلوم تھا کہ یہ اس خطبہ ذہین اور تیز فوجیوں کے ساتھ ہماری آخری ملاقات ہوگی اور جس شخص کا مستقبل اس وقت اس قدر شاندار نظر آ رہا تھا وہ آخر کار راولپنڈی میں ہی سولی کے رستے پر جھولی کر اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دے گا۔

صدر ایوب خان ایک متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔ شکل و صورت کی

جاذبیت اور قد و قامت کی وجاہت انسان کو فوراً اپنی جہانگیر کھینچ لیتی ہے وہ مردانہ وجاہت کا تجسم پکیرتے۔ دروازہ قدر، فرہم جسم اور چوڑے چمکے ہاتھ کے باعث انسان ان کی موٹھیں بڑی نستعلیق تھیں گویا سونے کے تار سیلیقے سے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ انھوں نے اپنی ساری عمر فوج میں گذاردی تھی۔ اُن کی مسکراہٹ بڑی دل موہ لینے والی تھی۔ لیکن بات کرنے میں وہ نفاست اور مصلحت پسندی نہیں رکھتے تھے۔ جو ایک ڈپلومیٹ کا خاصہ ہوتی ہے۔ جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا لگی لپٹی کے بغیر اُسے زبان پر لاتے۔ اور اس میں سے خصوص کی خوشبو آتی۔ انھیں پاکستان کے ساتھ یہ پناہ تحبث تھی۔ اور اپنے ملک کو خوش حال اور فرخندہ خال دیکھنا چاہتے تھے۔ میرا ذاتی طور پر تاثر یہ تھا کہ بڑی برطانوی کے بعد پاکستان کو ایک میساجل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اُس کا اظہار لیاقت باغ کے حصے میں بھی کیا۔ جس سے اگرچہ کچھ پیشانیوں پر بل بھی پڑے لیکن یہ میرے خیال میں اظہار حق کے برابر تھا۔ ممبر اخباری لکھا کہ اگر صدر ایوب کو وقت مل گیا تو وہ پاکستان کو آہستہ آہستہ سیاسی اور اقتصادی ابتری کے سمندر سے باہر لے آئیں گے۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اُن کے گرد چاندیوں کا گھیرا رنگ ہوتا گیا اور اُن کا تعلق عوام سے بڑی حد تک ٹوٹ گیا۔ وہ چاندیوں کی عینک سے ہی اپنی قوم کی حالت دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ جو بالآخر ان کے زوال کے ساتھ ساتھ پاکستان کے حصے بخرے ہونے کا باعث بن گیا۔

اس کے برعکس ذوالفقار علی بھٹو کی تربیت ایک دوسرے ہی قسم کے ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسے باپ کے بیٹے تھے جس کی عمر سیاسی شطرنج پر چالیں چلنے میں گندمی تھی۔ اس لیے بیٹے پر بھی اس چیز کا اثر تھا۔ انھوں نے خود بھی بڑی تیز و طاقتور طبیعت اور ذہن رسا پایا تھا۔ اور سیاسی میدان کی بازگیری سے بھی خوب واقف تھے۔ دورہ

پاکستان کے دوران مجھے اُن سے گفتگو کا کم ہی موقع ملا۔ مارشل ایوب کے ساتھ ہماری جو ملاقات ہوئی اس میں اگرچہ مجھ کو صاحب موجود تھے لیکن وہ سعادت مندی کے انداز میں چپ ہی سا رہے۔ انسانوں کے ظاہر اُن کے باطن سے کبھی کبھی کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ اُس وقت کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ سعادت مندی دراصل اُن کے عزائم کو چھپانے کا ایک پوزر (POSE) بلکہ نقاب ہے۔ بہر کیف، حکومت پاکستان نے میرا یہ مشورہ صدق دل سے تسلیم کر لیا کہ جب تک نئی دہلی میں نئی حکومت اپنے پاؤں نہ جمالے اُس وقت تک پاکستان کو صبر سے کام لینا چاہئے اور متہ کرات شروع کرنے پر زور نہ دینا چاہئے۔ ▲ ▲ ▲

فریضہ حج اور سیر مونی ممالک کی سیر

دہلی واپس پہنچ کر میں سیدہ عاتین محمودی ہاؤس گیا۔ سوگواروں نے ساری کوٹھی اس کے وسیع باغ بلکہ مرگ تک کو گھیر لیا تھا۔ کچھ آنکھوں میں سچی درد مندی کے آنسو تھے مگر بہت سے لوگ جیسے تماشا بین بن کر ٹھہل رہے تھے۔ میں اُس کمرے میں گیا جہاں جواہر لال کا جسدِ خاکی ہندوستان کے سرنگی قومی جھنڈے میں لپٹا ہوا درشنوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ اُن کے چہرے پر ایک ولعناز تبسم تھا۔ جو نہی میری نظر اُن کے مژدہ چہرے پر پڑی میرے اندر سے آنسوؤں کا فوارہ چھوٹ گیا۔ اس شخص کے ساتھ میری کتنی ہی قوی اور ذاتی یادیں تلخ اور شیریں دونوں وابستہ تھیں۔ اسی کی شخصیت کے چادوئے ہمیں کانگریس کے قریب لایا تھا۔ اسی کو مشن میں سارے ہندوستان کو چھوڑ کر غلوم کشمیریوں کی حمایت کے لیے کوالہ میں بیڑوں کی محراب سے گزندہ ٹپڑا تھا۔ اسی نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ہمیں قیدی بنا ڈالا تھا۔ ادراپ اس وقت جب کہ یہ سارے داروغہ مشاہدینا چاہتا تھا۔ اسے پر لوک کا بلاوا آگیا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے ٹھوٹ ٹھوٹ کر رویا اور مجھے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لینا پڑا۔ بہر حال تقدیر سے کس کو فخر ہے؟ اُن کا آخری درشن

کرتے ہوئے میں نے اُن کے چہرے پر حسرت انگیز نظر ڈالی۔ ہندوستان کا جواہر اور کشمیر کا لال چل بسا تھا۔ اور یہ ہندوستان تاریک کے ایک دور کا خاتمہ تھا۔ بعد میں میں نے اُن کی ارحمی کے جلوس میں شامل ہو کر شامتی دن میں اُن کی آخری رسوم میں بھی حصہ لیا۔ برطانیہ کی نمائندگی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور روس کی ایکسی کو سی گن کر رہے تھے۔ اور بھی سرکردہ بین الاقوامی شخصیتیں موجود تھیں۔ کشمیر سے سختی اور صادق دونوں آئے ہوئے تھے۔ بعد میں، میں اُن کی استحقاق کا ایک حصہ سر بیگم نے آیا اور اُن کی خواہش کے مطابق اسے سر بیگم سے متصل دریائے سندھ اور جہلم کے سنگم میں بہادیا۔ اُن کی یاد میں پرنسپ پارک میں ایک بڑے ماحولی جلسہ سے بھی میں نے خطاب کیا۔

جواہر لال کی موت کے فوراً بعد پہلے تو گلزارِ سی لال نندہ نے سب سے سینئر وزیر کی حیثیت میں قائم مقام وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ لیکن بعد میں لال بہادر شاستری صدر کانگریس کا مرزا کی تدارک کے مدد سے وزیر اعظم مقرر ہوئے شاستری ایک شریف انسان اور اعتدال پسند مدبّر تھے۔ اُنھوں نے وزیر اعظم بننے کے فوراً بعد اپنی پہلی پالیسی تقریر میں جواہر لال کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ جب چند دنوں کے بعد میں اُن سے پہلی بار ملا تو میں نے ان سے بھی یہی التماس کی کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو جو کاتوں رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور پھر موزوں وقت پر دو ملکوں کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جائے جہاں سے یہ جواہر لال کی اچانک وفات کی وجہ سے کٹ گیا تھا۔ شاستری نے وعدہ تو کیا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن گلزاری لال نندہ کا کابینہ میں خاصا اثر تھا۔ اُنھوں نے حالات کو جو کاتوں پر رہنے نہیں دیا۔ بلکہ ہندوستان میں کشمیر کے احوال کی رفتار تیز کر کے رکھنے کے لیے دھبے بھرے۔ حد تک کہ اُنھوں نے ہندوستانی آجین کی دفعہ ۳۰۰ کا جس کے تحت کشمیر کو ایک خصوصی

حیثیت حاصل تھی، اثر زائل کرنے کے لیے کئی قوانین پاس کروائے اُنھوں نے ہر اُس دور کو بند کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ جہاں سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان روشنی اور مکالمے کا تہا بولہ ہو سکتا تھا اور بہتر تعلقات قائم کرنے کی امید کی جا سکتی تھی، ریاست کے اندر بھی اُنھوں نے بخشی دود کے طور طریقوں کو پھر سے رواج دینے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اُس آزادی کی شمع کو گل کرنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں جو موسے مبارک کی تحریک میں کشمیریوں نے اپنے خون سے روشن کی تھی۔

اُدھر ریاست کے اندر صادق صاحب اور بخشی صاحب کے درمیان اقتدار کی رس کشمی تیز ہو گئی۔ تہہ کی موت کے بعد بخشی نے پھر داؤ لگائے اور طالع آزمائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اُنھوں نے ریاستی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر اپنی جوڑ توڑ کی صلاحیتوں کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میران کی اکثریت کو اپنے ساتھ گانٹھ لیا اُن کا ارادہ دوسرے دن اسمبلی کے فز پر حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر کے اس کا تعلق قیع کرنا تھا۔ لیکن ڈی۔ بی۔ ودا اور کرن سنگھ نے کشمیر میں دہلی کے عمران آفیسر بلکہ ریڈیڈنٹ وشنو بھاسے کی مدد سے راتوں رات نئی دلی سے رابطہ قائم کر کے پانسے آٹ دیا۔ بخشی غلام محمد کو علی الصبح گرفتار کر کے اسی جگہ پھینچا دیا گیا جہاں تکلیف گیارہ برس قبل اُنھوں نے مجھے قید کر لیا تھا۔ یعنی تاراناوس اودھ پور بخشی کا قص بن گیا۔ ۳۔

لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

اسی صبح ایک ذرا مافی اعلان کے ذریعے کشمیر اسمبلی کا سیشن برخواست کر دیا گیا اور بخشی غلام محمد کی بدعتوانیوں اور بددیانتیوں کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن کی تقرری کا اعلان کر دیا گیا۔ بخشی غلام محمد کے دل پر اس بیفارسے کی گڈری اس کا اندازہ کرنا

مشکل نہیں۔ خاص طور جب یہ بات، نظریں رکھی جائے گن کے پیش نظر کوئی اعلیٰ مقدمہ نہ تھا۔ محض ذاتی اقتدار کی بھائی تھی۔ لیکن کشمیر میں شہداء کے بعد جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہر اخلاقی اور قانونی معیار سے ناجائز تھا۔ لہذا بخشی صاحب کو شکایت کا کوئی حق نہ تھا۔ کیونکہ انھوں نے کشمیر کو اندھیر مگر کی بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں اس غیر جمہوری اور غیر آئینی طرز عمل کی مذمت کی۔ کیونکہ بخشی صاحب کے ساتھ میرے لاکھ اختلافات بھی ہیں کشمیر کو ایک نوآبادی کی طرح سے دیکھنے کی ذہنیت کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اور اس اقدام سے اسی نوآبادیاتی ذہنیت کی توثیق آتی تھی۔ بعد میں سپریم کورٹ کے ایک سابق جسٹس نے ایک نگر پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن نے بخشی صاحب کو شدید بدعنوانیوں کا مکتب قرار دیا۔ اس کمیشن کی ایک ضخیم رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ جس میں شہداء سے علاوہ ایک کشمیر میں بخشی کی کارستانیوں کا سارا کچا چھاؤں ہے۔ بخشی کے ساتھ اس طرح سے ہندوستانی آتماؤں نے حساب مچکا دیا کہ غالب کے اس شعر کا باہر اسانے آگیا ہے

اے ایک قوطہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر و دیعت، رش گان یار تھا

بخشی صاحب دو مہینے یعنی آٹھ جیل میں رہے تھے کہ ان پر پول کا دورہ پڑا۔ جس شخص کو ہندوستان نے دس سال تک "کشمیر کے مردِ آہن" اور "خالدِ ہند" کے روپ میں آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ چند مہینوں میں ہی بچکے اور تیرپے لگا بعد میں ان کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن اقتدار کی جو دوی ان سے روک گئی تھی۔ ہزار درہ مارنے کے باوجود وہ ان پر دوبارہ مہربان نہ ہوئی اور وہ اس کے فرق میں چند سال تک دھبی میں کا مظاہرہ کرنے کے بعد انتقال کر گئے۔

جب کچھ ماہ گزر گئے اور دہلی میں نئی حکومت جو آہر لال کی موت کے دھچکے کے بعد ٹھکانے سے کام کرنے لگی تو میں پرسش احوال کے لیے پھر دہلی گیا۔ میں نے وہاں وزیر اعظم شاستری اور کچھ دوسرے مرکزی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ وہی کی ساری فضا بدلی ہوئی ہے۔ وہاں کشمیر کے معاملے کو پھر برت غاسنے میں رکھ دیا گیا تھا۔ شاستری بڑے اخلاق سے پیش آئے مجھے لگا کہ ان کا پس چلتا تو وہ جو آہر لال کے آغاز کو انجام تک پہنچانے میں ی خوشی محسوس کرتے۔ لیکن وہ جو آہر لال کی سیاسی اور عوامی طاقت سے محروم تھے۔ اور وہ اپنے رفقاء کو اپنا ہم نوا بنانے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ بلکہ کچھ کچھ ان سے دیتے بھی تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس حالت میں فی الحال کسی فیصلہ کی اقدام کی توقع فضول ہے اور صورت حال اقبال کے اس شعر کے مترادف ہے

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے، فردوس ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا اٹھان مقصود ہے؟

دین اشنا میں نے وہ فریضہ ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا جو سنتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہر مسلمان پر فرض کیا گیا ہے اور جس کا دامن ایک فطیم ترین قزاقی سے پیوستہ ہے مرین شریف جانے کی حسرت میرے دل میں تھی اور میں جلد سے جلد اس فرض کو پورا کرنا چاہتا تھا میری میزبانی میں اس فریضے سے مسکندوشی کے لیے بیکار تھیں چنانچہ ہم حج بیت اللہ کی تیاریوں میں لگ گئے۔ مرکزی حکومت نے ہمارا پاسپورٹ جاری کرنے میں کوئی تاخیر نہیں دالی اور ہم فروری ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے میں سرنگر سے روانہ ہو گئے۔ میرے ساتھ بیگم صاحبہ کے علاوہ مرزا محمد، فضل بیگ، پیر عبدالغنی اور ایک باورچی غلام محمد تھے۔ پیر عبدالغنی کو بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال کے لیے خاص طور پر ساتھ رکھا گیا تھا۔ حج کے ساتھ ساتھ ہم بلاؤ اسلامیہ کے کچے اور ملکوں کا دورہ بھی کرنا چاہتے تھے چنانچہ

ہمارے پروگرام میں ایچ آئی وی، سرکاری اور غیر ملکی اور افغانستان جانا بھی شامل تھا۔ اور ہم فرانس اور انگلستان جانے کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔ ہم پہلے قاہرہ پہنچے۔ پھر وہاں سے لندن، پھر اس اور قاہرہ سے لہوتے ہوئے راج کے موٹے پر پھر جدہ پہنچ گئے۔ اُس وقت وہاں مدت کامل قدوسی ہند کے سفر تھے۔ مدت کامل ۱۹۷۵ء میں ہمارے چین بکری رہ چکے تھے۔ جب پہلی بار ہم جدہ پہنچے تھے تو انھوں نے ہماری خوب آؤ بھگت کی تھی۔ انھوں نے ہمیں اپنی رہائش گاہ پر دعوت دی۔ میں کہا، کھانا اور ہماری خاطر خواہ دیکو بھال کرتے رہے لیکن اب دوسری بار جدہ پہنچے پر ان کے تئو بدے ہوئے نظرات نے لگے۔ وہ نہ صرف ہم کو مارنے کی سعی کرتے نظر آئے بلکہ ہمارے سایے سے بھی ڈرنے لگے۔ وہ صاف تھی۔ جو بھی ہم نے ساحل ہند کو چھوڑا تھا ہمارے خلافت پر وگنڈا کی زبردست ہم شروع کر دی تھی۔ یہ ہم ان تمام ملک میں جاری کی گئی تھی جہاں ہم جانے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے۔ ہندوستان کے سفارت خانوں کے ذریعے ان ملکوں کی حکومتوں بلکہ سربراہوں پر زبردست دباؤ ڈال گیا تھا کہ وہ نہ ہماری طرف التفات کریں اور نہ ہی ہمیں شرف ملاقات بخشیں۔ ان ملکوں کے اخبارات کو ہمارے خلاف خصوصی پروگنڈہ مواد بھیجا گیا تھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مختلف اوقات میں ہم نے ہندوستان کے حق میں کیا کچھ کہا تھا اور پاکستان کی مخالفت میں کیا کچھ۔ ہم جس ملک میں بھی گئے ہم نے اس پر وگنڈے کا جال بنا ہوا دیکھا۔ لیکن اپنی سرکردہ گوشوں اور بے حساب ذرائع کے استعمال کے باوجود ہم بے سرو سامان درویشوں کے مقابلے میں ہندوستانی وزارت خارجہ کو ٹونڈی کھانی پڑی۔ ہم جس ملک میں بھی گئے ہماری خاطر خواہ آؤ بھگت کی گئی۔ اگرچہ ہماری کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی۔ لیکن ہمیں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔

مجھے اس تعلق میں مصر کے مرحوم صدر جمال عبدالناصر کے ساتھ ملاقات کی یاد آتی ہے۔ انھوں نے ہم سے ملنے ہی اس بات پر سخت نفی کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے نمائندے ان پر کیوں اس طرح زور ڈال رہے تھے کہ وہ ہمیں شرف ملاقات نہ بخش اور نہ ہماری پذیرائی کریں۔ عبدالناصر نے ایک معنی خیز جستم کے ساتھ ہمیں بتایا کہ انھوں نے ہندوستانی کارندوں کی اس حرکت کو بہت ناپسند کیا۔ صدر ناصر نے ہم سے یہ بھی کہا کہ وہ میری آؤ بھگت ایک عظیم مجاہد آزادی کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس میں کوئی دخل نہ دینا چاہئے تھا اور اگر اس نے دیا ہے تو میں اس کو خاطر میں نہیں لاسکتا۔ انھوں نے ہمیں شیریں جوش میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے رکھا ہمارے استعمال کے لیے سرکاری گاڑیاں رکھی گئیں۔ اور خاص سرکاری آفیسر کو ہماری اعانت کے لیے ہمارے ساتھ رکھا گیا وہاں کے مقتدر اخبار "المجربہ" نے مجھے کشمیر کی تحریک آزادی کا سپر سالار کہہ کر کپکارا۔ کشمیر کے حالات پر صدر ناصر نے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مصر برصغیر ہندوستان کے استحکام میں خاص دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کے پھن مارتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے برصغیر ہند و پاک ایک سدا بہن اور فضیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے مصر کے عوام کی دلخواہش ہے کہ وہ دونوں ممالک کے درمیان جو بھی تنازعہ ہو اس کو خوش اسلوبی سے حل کیا جائے اور ہم اس کے لیے نہ صرف برابر کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس سلسلے میں حسب منشا ہر قسم کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں۔

صدر ناصر ایک سادہ اور شفاف زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں بھی ہر طرح سے سادگی ملتی تھی۔ مرحوم ناصر شکل و صورت، اقدار و قامت اور اندازِ شکم کے لحاظ سے ایک متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی نشست و برخاست اور اندازِ کلام میں کوئی

مجھے اس تعلق میں میرے مرحوم صدر جمال عبدالناصر کے ساتھ ملاقات کی یاد آتی ہے، انھوں نے ہم سے ملنے ہی اس بات پر سخت تشجب کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے نمائندے ان پر کیوں اس طرح زور ڈال رہے تھے کہ وہ ہمیں شرفِ ملاقات نہ بخشے اور نہ ہماری پذیرائی کریں۔ عبدالناصر نے ایک معنی فیز بستم کے ساتھ ہمیں بتایا کہ انھوں نے ہندوستانی کارندوں کی اس حرکت کو بہت ناپسند کیا۔ صدر ناصر نے ہم سے یہ بھی کہا کہ وہ میری آؤ بھگت ایک عظیم مجاہد آزادی کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو اس میں کوئی دخل نہ دینا چاہئے تھا اور اگر اس نے دیا ہے تو میں اس کو خاطر میں نہیں لا سکتا۔ انھوں نے ہمیں شیریں پوش میں سرکاری مہانوں کی حیثیت سے رکھا ہمارے استعمال کے لیے سرکاری گاڑیاں رکھی گئیں۔ اور خاص سرکاری آفیسر کو ہماری رعایت کے لیے ہمارے ساتھ رکھا گیا وہاں کے مقتدر اخبار ”انجھوریر“ نے مجھے کشمیر کی تحریک آزادی کا سپہ سالار کہہ کر پکارا۔ کشمیر کے حالات پر صدر ناصر نے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مصر پر مصری ہندوستان کے استحکام میں خاص دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت کے پھیلنے سے ہونے والا خوف ان کو روکنے کے لیے بے یار و مددگار ہے۔ اس لیے مصر کے عوام کی دلا خواہش ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان جو بھی تنازعہ ہو اس کو خوش اسلوبی سے حل کیا جائے اور ہم اس کے لیے نہ صرف برابر کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس سلسلے میں حسبِ منشا ہر قسم کا ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں۔

صدر ناصر ایک سادہ اور شفاف زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر بھی ہر طرح سے سادگی چلتی تھی۔ مرحوم نائبِ سرکل و صورتِ اقد و قامت اور اندازِ مشق کے لحاظ سے ایک متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی نشست و برخاست اور اندازِ کلام میں کوئی

رعونت اور اکثر فوں نظر نہیں آتی تھی۔ بلکہ اس میں سادگی کی شان چلتی تھی۔ بیگم جمال عبدالناصر بھی سادگی اور شرافت کا مجسمہ نظر آتی تھیں۔ اور لاگ اور گاؤں سے بہت دور قاہرہ میں ہم نے کچھ اور شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ جن میں انوار السادات جو اس وقت مصر کی قانون سازی کے سپیکر اور اب وہاں کے صدر ہیں، اور جامعہ ازہر کے شیخ اعظم شامل تھے۔ محمد حسین بیگلے سے ہم کئی بار ملے۔ وہ اس وقت مصر کے سب سے بڑے اخبار ”الاجرام“ کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اور صدر ناصر کے قریبی معتد اور مشیر۔ بیگلے بڑے ذہین اور طباع آدمی ہیں۔ اس وقت عرب دنیا میں ان کی ایک قابل ترین صحافی کی حیثیت سے وہاں کی میٹھی ہوئی تھی اور انھیں بڑے بڑے امیروں، وزیروں اور لیڈروں سے زیادہ وقار اور اثر و رسوخ حاصل تھا۔ سعودی عرب میں ہم نے شاہ فیصل مرحوم سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ ہم نے نیاز مندی کے طور پر ان کی خدمت میں کشمیر کے کچھ تحائف بھی پیش کیے جنھیں انھوں نے بڑی شکرگزاری کے ساتھ قبول فرمایا۔ وہ ایک قابلِ فہم اور ذہین اور روشن دماغ اور میدار مغز بادشاہ تھے۔ اس کے علاوہ اپنی گفتگو میں وہ بھی خاصے صاف گو و دایق ہوتے تھے۔ بڑی ذہن افزا بات تھی کہ حرمین شریفین کی کلیدی ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ عرب ملکوں بلکہ پورے اسلام کو ان سے کافی امیدیں تھیں، اور ان کے شلوص و ذہانت سے امیدیں تھیں کہ وہ اسلام کے احیائے نو میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔ لیکن غم کرنے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ وہ اپنے ہی فائز العقل عزیز کے ہاتھوں اجل کا جام پی گئے۔ کشمیر کے سوال پر انھوں نے گلی لپٹی کے بنیہ کہا کہ سعودی عرب کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا حامی ہے اور حامی رہے گا۔ کیونکہ سعودی عرب کی حکومت اور عوام سمجھتے ہیں کہ یہی قرونِ انصاف ہے اور یہی معقولیت کا تقاضا بھی۔ انھوں نے

سے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ اپنے وطن کے معاملات و مسائل سے اپنے آپ کو گہرے طور پر شامل رکھیں۔ اور وہاں غیر فرقہ وارانہ نقطہ نظر کو مضبوط بنائیں میرے اس بیان پر چند ممالک کے نمائندوں نے اگرچہ تیوریاں چڑھا دیں لیکن کانفرنس نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کوئی ریفریس منظور نہ کرنے کے متعلق میرے مشورے سے اتفاق کر لیا۔ کانفرنس میں آن مسلم ممالک میں جہاں آزادی کی لڑائی جاری تھی آزادی کی تحریک کو تقویت دینے کے معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی بنائی گئی جس میں میرے علاوہ عراق کے ایک سابق وزیر اعظم و اکثر فاضل جلالی فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی مرحوم اور پاکستان کے فائز فضل الرحمن یہ حیثیت ارکان مقرر کیے گئے۔

انجرائز میں بھی ہمیں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا۔ ہماری مسلماتائیں انجرائز کے مختلف لیڈروں سے ہوئیں۔ جن میں وزیر خارجہ بوطوقیتا، کرنل جوی ہوتین اور خود صدر ملک احمد بن بیلہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابھی ہم انجرائز پہنچے تھے کہ دوسرے دن اچانک چین کے وزیر اعظم چو ان لائی وہاں پہنچے۔ صدر ملک نے ایک عظیم مہمان کی حیثیت سے ان کے اعزاز میں ایک شاندار استقبال کیا۔ جس میں مجھے اور بیگ صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ استقبال میں انجرائز کے مشیر وزیر اسکرود رہنما فوجی افسر اور عوامین موجود تھے۔ کرنل بوتھ چین ایک کونے میں خاموش ایستادہ تھے۔ ان کے ساتھ ملک سلیک ہوئی تو ہم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ ان کے چہرے ایک خبرنگاری اور تجدد کی برس رہی ہے۔ جیسے وہ ہجوم افکار میں گم سم ہوں۔ ایسی غفلتوں میں جہاں اس قسم کی چیل چیل ہو چوہوں پر جو بشارت نظر آتی ہے، ان کا چہرہ اس سے یکسر خالی تھا۔ کسے معلوم تھا کہ جلد ہی وہ صدر ملک کو ہی گرفتار کر کے خود انجرائز کے سیاہ و سفید

ہماری بڑھ چڑھ کر آزادی اور تعلیم کی اور ہمارے آرام و آسائش میں ذاتی دلچسپی دکھائی۔ راج کی رسومات میں غسل کعبہ کو بہت توقیر و تقدس حاصل ہے۔ اور اس موقع پر نمازین بارگاہ کو ہی وہاں پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ مرحوم شاہ کی شفقت تھی۔ کہ انھوں نے غسل کعبہ کی اس خاص انخاص تقریب میں ہمیں اپنے شانہ بشانہ رکھا۔

راج کے زمانے میں پاکستان سے آنے والے دوستوں سے بھی ہمارا سلام کلام رہا ہمارے دیرینہ اور مخلص ساتھی میر محمد مقبول گیلانی صرف ہم سے ملنے کے لیے وہاں آگئے تھے۔ چنانچہ ان سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ اس زندگی میں ہم ان کے ساتھ آخری بار مل رہے ہیں۔ کیونکہ واپس پاکستان لوٹ جانے کے بعد وہ تباہ ویر زندہ نہیں رہے۔ ان کی بڑی شدید تنہا تھی کہ وہ اپنے محبوب وطن کشمیر اگر اس کی پہچ اور شفیق آغوش میں ہیشہ کے لیے سما جائیں۔ لیکن یہ معصوم سی آرزو ہندوستانی حکمرانوں کی ہش و دھرمی کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔ بالآخر وہ اس تمنا کو اپنا داغ جگر بنا کر دیار غیر میں اس دنیا سے چل بسے۔

پاکستان کے افسروں میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایمر مارشل نونان قابل ذکر ہیں۔ ان سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کیا محال کہ ان کے مندر سے کوئی ہکا اشارہ بھی اس قسم کا ملتا ہو کہ پاکستان ہندوستان کے خلاف کسی اقدام کے تانے بانے بن رہا ہے۔ کونہ غلطی میں اپنے قیام کے دوران میں نے وہاں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ ہماری اگرچہ کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی لیکن ہمیں ممتاز مجاہدین آزادی کی حیثیت سے اس میں مدعو کیا گیا تھا۔ کانفرنس کی رسم افتتاح شاہ فیصل نے خود انجام دی اور اس کی صدارت ان کے برادر شہزادہ عبدالعزیز نے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کانفرنس میں جب ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو ہوئی تو میں نے بڑی بے بسی

کے مالک بن جائیں گے اور اپنی اصلیت کا مظاہرہ کر کے انچائز کو مستحکم بخشیں گے۔
 بن تیلہ ان کے برعکس ایک پھلتی اور چمکتی پہلی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ انچائز کی زبردست
 جنگ آزادی کے نیر اور انقلاب کے ایک جری قائد مانے جاتے تھے۔ اور خود ان کی
 طبیعت میں نمود و نمائش کا رجحان تھا۔ بطور تینکا کے چہرے سے ذہانت چمکتی تھی۔
 جب ہم ان سے ملنے کے لیے ان کے دفتر گئے تو انھوں نے کہا: "آپ بھی کی طرح ہم نے
 بھی بہت دیر تک اپنی امیدیں اقوام متحدہ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن وہاں ہمیں
 کھوکھلی اور غالی باتوں کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ چنانچہ وہاں سے یاموس ہو کر ہم نے اپنے
 قوت بازو کو آزمایا چاہا اور میدان کارناموں کو دھڑپے۔" اس کے بعد انھوں نے کوہی
 سے باہر ایک وسیع و عریض قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان ہزاروں
 شہیدوں کے خون کا فیض اور فضل ہے کہ ہم اس وقت آزاد ہیں۔ انچائز کے عوام کی
 آواز کا اعلان ان ہی شہیدوں کے خون کی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ چو۔ این۔ لائی
 کو دیئے گئے استقبالیہ میں وہ بن تیلہ کے ساتھ جہان خصوصی کے جلو میں ایک طرف کو
 بیٹھے ہوئے تھے۔ اور خاص مدعوین کو چو۔ این۔ لائی سے تعارف و تلمع کے لیے الگ الگ
 بلارہے تھے۔ چنانچہ سبھی بلایا گیا۔ میری چو۔ این۔ لائی کے ساتھ علیک ملیک ہوئی تو
 نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور شام کو نیچے الگ ملنے کے لیے وقت دیا۔ چنانچہ
 جب میں اور ایک صاحب وقت متقررہ پر ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو ہمارا انتظار کر رہے
 تھے۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب اور بڑا سرا مسکراہٹ تھی۔ لیکن اس مسکراہٹ کے
 کے پیچھے کیا تھا اس کا اندازہ نہ بہت مشکل تھا۔ ہم نے ان سے اس معاہدے کے متعلق
 دریافت کیا جو انہی دنوں چین اور پاکستان کے مابین گھلگٹ کے سرحدی معاملات
 کے متعلق ہوا تھا۔ گھلگٹ ہماری ریاست کا ایک حصہ تھا اور وہیں اس کے معاملات

نے قدرتی طور پر میری دلچسپی جی جان لائی تھی۔ مگر مگر لیکن مستحکم لمحے میں جواب دیا کہ "چین
 اپنے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ تمام جھگڑوں کو جن میں
 سرحدوں کے جھگڑے بھی شامل ہیں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہنسی خوشی پٹانا چاہتا ہے۔
 کشمیر کے شمال کی طرف گھلگٹ کا علاقہ اس وقت پاکستان کی تحویل میں ہے اس کی سرحد پر
 چین کے ساتھ ملتی ہے اس لیے اس کا تین چین کے نقطہ نگاہ سے ضروری تھا۔ لیکن اس
 معاہدے میں ہم نے ایک شرط یہ لگا دی ہے کہ یہ معاہدہ اُس وقت تک برقرار ہے گا جب
 تک گھلگٹ پاکستان کی تحویل میں ہے۔ اگر کسی سمجھوتے کی وجہ سے آئندہ حالات بدل
 جائیں تو ہندوستان یا کسی اور قوت کو جو گھلگٹ کا والی بن جائے، حق حاصل ہوگا کہ وہ
 اس معاہدے میں ترمیم و تبدل کا مطالبہ کرے۔"

اس کے بعد چین اور ہندوستان کے تعلقات پر بات چلی اور ہم ان کی وسعت
 مطالعہ پر دلگ رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان خود ایک توسیع پسند ذہنیت
 رکھتا ہے۔ لیکن انشا ازم چین پر تھو پتا ہے۔ چین اتنا وسیع ملک ہے اور اس کے پاس
 اس قدر علاقہ ہے کہ مزید زمین تو صوفٹلے کی نہ ضرورت ہے اور نہ فرصت۔ انھوں
 نے جو امر لاپرواہی کی گھی ہوئی کہاؤں کے کچھ اقتباسات کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ خود
 تحریر پر ہندوستان کے توسیع پسندانہ عزائم کا خاکہ کھینچنے کے ہیں اور اب ہندوستان ان
 خاؤں میں نگہ بھرے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ اپنے امر و کردار کے علاقوں تک ہی کیا جاوا اور
 سمجھتا کہ اپنے سامراجی محور کے علاقے خیال کرتے ہیں اور اپنی فابری روشن خیالی کے
 غلاف میں قدیم ہندو راج کی تجدید اور توسیع کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ چو۔ این۔ لائی
 ایک ہوشیار اور ذی فہم شخص تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ گفتگو کی تنیدی سے انھوں
 کسی قدر بوجھل ہو گیا ہے تو انھوں نے فوراً موضوع کا رخ بدل ڈالا اور ہم سے بالکل

غلام توفیق سوال کیا "کیا آپ بھی چین گئے ہیں؟" جب ہم نے نفی میں جواب دیا تو انھوں نے بڑی اداکاری سے تعجب ظاہر کیا اور کہا کہ چین تو آپ کا اس قدر قریبی پڑوسی ہے کہ آپ اپنے مکان کی چھت سے اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں گن سکتے ہیں۔ اور پھر چین اور کشمیر کے مابین میں بہت سے روابط ہیں۔ انھوں نے ہمیں چین آکر وہاں کی سیر کرنے اور کشمیر کے متصل چینی علاقوں کے حالات دیکھنے کی دعوت دی۔ ان دنوں انڈونیشیا کے صدر سکارنو کے ساتھ چینیوں کی میٹنگیں بڑھ رہی تھیں، چنانچہ جو آئین لائی نے جس علاج دی کہ ہم انڈونیشیا پہنچ جائیں وہاں سے ہمیں چین پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ ہم نے سخت طعناظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور اتفاقاً کہا کہ چین جانے کا شوق کس کو نہیں اور مناسب وقت پر ہم ضرور چین دیکھنے کے لیے وقت لگالیں گے۔ اس کے بعد ملاقات ایک خوشگوار انداز میں ختم ہوئی اور چینی وزیر اعظم نے اپنی پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔

میں نے اپنی پہلی فرصت میں اس ملاقات کی تفصیل انگریز میں متعبر ہندوستانی سفیر کو بھیج دی لیکن چینی وزیر اعظم کے ساتھ جو نامہ لگا رہے تھے انھوں نے اسی اثنا میں خبر پبلنگ بیجودی اور پبلنگ ریڈیو نے اسے بڑھا چڑھا کر نشر کیا۔ ادھر مغربی ممالک کے سرکردہ اخبارات نے اس خبر کو شاہ شہریوں کے ساتھ شائع کیا اور ایس کرنا ہندوستانی حکمرانوں کے لیے ساڈ گولال کپڑا دکھانے کے برابر اشتعال انگیز ثابت ہوا اس خبر کا نشر ہونا تھا کہ ہندوستانی اخبارات کے تیور بدل گئے۔ ہندوستانی حکومت کا ذہن اور ذہن بدل گیا اور ملک میں ہمارے خلاف نفرت پھیلانے اور کردار کشی کی جہم نقطہ عروج کو پہنچا دی گئی۔ پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر ہم پر طعن طعن کے الزام عائد کیے گئے۔ کسی نے ہمیں ہندوستان بدر کرنے کا بھیاناب تو کسی نے ہمیں

ہندوستان طلب کر کے زندان کی سلاخوں کے چھپے وکیلے کی تجویز پیش کر دی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سفرِ حج پر فوراً رخصت مندی ظاہر کرتے ہوئے گھڑاری لال نندہ اور اس کے ہم خیالوں نے جس سازش کا پھندا تیار کیا تھا اس کو ہمارے گھٹے میں لگانے کے لیے اب ملک کے اندر اور باہر عوام کو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ اور اس سلسلے میں ہر قسم کی تہمت تراشی اور بہتان تراشی جائز اور برحق سمجھی جا رہی تھی۔

لندن کے قیام کے دوران ہم نے وہاں کے وزیر اعظم یا حکومت کے کسی اور مہمے دار سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی پرسہل ہوئی۔ البتہ وہاں مختلف اداروں اور انجمنوں نے ہمارے اعزاز میں کئی استقبالیہ تقاریب کا انتظام و انصرام کیا بلکہ جوائی آڈے پر بھی ہمارا بڑا پر جوش عوامی استقبال ہوا۔ جوائی آڈے پر ہمارے استقبال کی کہانی کے ساتھ ایک اور دلچسپ واقعہ چڑھا ہوا ہے۔ ہم ہندوستان کی سرکاری ایر لائن ایر انڈیا کے جہاز میں لندن جا رہے تھے۔ ہندوستانی حکام کو خوب معلوم تھا کہ جوائی آڈے پر ہمارے استقبال کے لیے ایک بڑا اڈہ کام موجود ہے اور ہمارے استقبال کو بڑی پلمبلی ملے گی۔ چنانچہ جینیوا کے آڈے پر جہاز کو کئی گھنٹے تک روکے رکھا گیا۔ اور حذر یہ کیا گیا کہ جہاز کا کوئی پڑے خراب ہو گیا ہے۔ ہمیں صبح سویرے لندن پہنچنا تھا۔ اور حکومت ہند کے کارندوں کا خیال تھا کہ کچھ گھنٹوں کے انتظار کے بعد منتظر لوگ تھک ہار کر پلے جائیں گے۔ اسی بنا پر شام کو جہاز لندن پہنچا۔ لیکن ہمارے استقبال کے لیے آئے ہوئے لوگ بڑے سخت جان تھے۔ وہ بارہ گھنٹوں کی تاخیر کے باوجود وہیں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے ٹھن کے باوجود ہمارا بڑی محبت اور خلوص سے خیر مقدم کیا۔ انگلستان کا پریس بھی غضب کا شہد اور آزاد ہے اور ہم پریس کی توجہ کا خاص مرکز بن گئے۔ ہندوستانی

بانی کمیشن کی ساری کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور وہاں ہماری سرگرمیوں کی تفصیلات برابر چھپی رہیں۔ انگلستان میں ہزاروں کشمیری باشندے روزگار تعلیم و فہرہ کے سلسلے میں مقیم ہیں۔ اور ان میں زیادہ تعداد پونچھ اور میرپور کے تارکین وطن کی ہے یہ لوگ کافی عرصے تک سمندری جہازوں میں کام کر کے روٹی روزی کماتے رہے اور بالآخر انگلستان کے مختلف شہروں میں پہنچ گئے جہاں یہ مقامی کارخانوں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی جفاکشی کی بدولت بڑی جاکمادیں بنائی ہیں۔ چنانچہ برمنگھم، ٹانگھم، گلاسکو، شفیلڈ، برڈفورڈ اور مانچسٹر اور ایسے ہی صنعتی شہروں میں ان کا خاصا اثر ہے۔ انھوں نے ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہمیں اپنے شہروں میں بے گھر۔ وہاں ہمارا استقبال کیا اور ہمیں مختلف عوامی تقریبات میں بولنا پڑا۔ انفرنس لندن کے قیام کا زمانہ ہمارے لیے خاصی مصروفیات کا وقت رہا۔

آخر ہندوستان میں شہرت پسندوں اور کٹر جمہوریوں نے ہمارے خلاف طوفان بے تحیزی بپا کر دیا۔ اس حد تک کہ اس کے تشبیہ شرے سات سمندر پر انگلستان کے ساحل پر ہمارے سکون میں غلغل ڈالنے لگے۔ ایک دفعہ انگلستان میں اس زمانے میں ہندوستان کے بانی کشن داس جیوراج مہتہ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور شرے شکایت آمیز لہجے میں بولے کہ میں یہاں ہندوستان کے خلاف مہم چلا رہا ہوں اور اس کے سبب ہندوستانی وزارت خارجہ ہی دبی سے روزانہ ان کی باز پرس کرتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ لندن میں جو کچھ بھی کرنا یا کہنا ہو اس کا خلاصہ یہاں کے اخبارات میں روز چھپتا ہے۔ ہمارے جیسوں میں ہندوستانی اخبارات کے نامہ نگار بھی شامل ہوتے ہیں۔ آپ براہ کرم اس بات کی نشاندہی کیجئے کہ ہم نے کون کس سیاست

ہندوستان کے خلاف کہی ہے۔ جس پر ہندوستانی وزارت خارجہ کو تاؤ آتا ہے۔ مہتہ صاحب نے بڑی مسلکینی سے جواب دیا کہ اخبارات میں تو ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے فوراً جواب میں کہا پھر آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اپنی حکومت کو ہی تہذیبیہ جبرائیل دور میں گراؤ کو کوئی ہکاش وانی آتی ہے کہیں ہندوستان کے خلاف لندن میں مہم چلا رہا ہوں۔ جیوراج مہتہ کہتے تو کیا کہتے۔ اپنا سامانہ بھر کر رہ گئے۔

ہندوستان میں ہمارے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مہم چلائی جا رہی تھی اور ہماری مشہور کورس بے خروج کیا جا رہا تھا کہ کشمیر کے سلسلے میں جو پہل جو اہر لال شہر و سنے کی تھی اس کا ہر ارتعاش ختم کر دیا جائے۔ اور ہمارے خلاف سخت اقدامات کے لیے نفسیاتی فیضا تقیہ کی جائے۔ اُدھر کشمیر میں محاذ اے شکاری کے خلاف پولیس کمیشن شروع کیا گیا تھا۔ سچ پر روانہ ہونے سے قبل میں نے عوام سے کہا تھا کہ وہ ان کالی بھیرٹوں سے جو قوم کے جسم سے چونکوں کی طرح چبٹی ہوئی ہیں اور اس کا خون پلانی کر موتی ہو رہی ہیں کوئی واسطہ نہ رکھیں اور ان کے ساتھ ترک تعلقات کر کے ان کو اخلاقی اثر میں لانے کی کوشش کریں۔ تاکہ انھیں احساس ہو کہ وہ اپنے پانچویں کام عیسوی سرگرمیوں سے کس طرح قومی مفادات کو زک پہنچا رہے ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے اس پر عمل شروع کیا۔ تو ان کالی بھیرٹوں کی حالت قابل رحم بن گئی۔ ان کو حمایت بنوانے کے لیے نائی نہ ملتا تھا۔ اور وہ مر جاتے تو ان کو اگرچہ کشمیری قبرستان تک قمرہ پہنچانے کے لیے چند آدمی بھی میسر ہو جاتے پھر بھی ان کے جنازے میں کوئی شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح یہ بات دنیا کے سامنے آگئی کہ قوم کے بڑے دعائے سے ہٹ کر یہ لوگ کہتے بے توقیر بن گئے۔ یہ لڑائی گدھوں کی چار دیواریوں میں بھی پہنچی گئی۔ چنانچہ قومی جذبے سے معمور گئی با عزت و دختران کشمیر نے اپنے بے رنگ و

ناموس شوہروں کے ساتھ گذر بسر سے بھی انکار کر دیا۔ اور اپنے مائیکہ علی گئیں۔ دہلی میں اس تحریک سے ایک ہڈیاں کی سی کیفیت ظاری ہو گئی۔ یہ تحریک مہاراجا گاندھی کے عدم تشدد اور ترک ممالوات کے اصولوں کے عین مطابق تھی اور اس میں تشدد کا کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن دہلی میں ماسدو سماج کے بڑے ہمت گھڑا سی لال نندہ جیسے لوگ بیٹھے تھے۔ انھیں بھلا گاندھی وادے کیا دلچسپی تھی؟ وہ صرف طاقت کی زبان سے واقف تھے۔ چنانچہ محاذ کے کارکنوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کاروائی شروع کر دی گئی اور کوئی دو ہزار نفوس کو کال کوٹھڑیوں میں دھکیں دیا گیا۔

ہندوستانی حکمران بڑی چالاکلی سے یہ ٹانگ کھیل رہے تھے۔ وہ ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یا تو ہم ڈر کر ہندوستان کی طرف رخ ہی نہ کریں گے اور اس طرح سے انھیں ہمیشہ کے لیے اس دوسرے خلاصی ہو جائے گی اور کشمیر کے لوگ بھی ہمیں بھول جائیں گے یا اگر بالفرض محال اس طرفانی فضا میں ہندوستان لوٹنے کی ہمت بھی کی تو پھر بھی محکمہ انوں کو میری گرفتاری کے لیے جواز مل جائے گا بعد میں مجھے دوستوں نے بتایا کہ لال بہادر شاستری نے کاہینہ کے اجلاس میں داسے دی تھی کہ میں ہندوستان ضرور واپس آؤں گا اور میں ایسا آدمی نہیں کہ ڈر کے مارے میدان سے بھاگ جاؤں۔ لیکن گھڑا سی لال نندہ نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ میں سہم جاؤں گا اور ہندو پاک کی سرزمین پر قدم رکھنے سے گریز کروں گا۔ اندرا گاندھی اس وقت کاہینہ کی ایک ٹرکن بھیتیں، انھوں نے مجھے گرفتار کرنے کے خلاف رائے دی تھی۔ چنانچہ سبھی لوگ ڈھللی یعنی کاٹھکار ہو گئے۔ بہر حال جب ہم نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو حکومت نے طے نہ کر سکی تھی کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ کشمیر سے مولانا محمد سعید مسعودی ہم کو سند میں بھیج رہے تھے کہ آپ کا دہلی

وطن آنے کی بجائے باہر رہنا ٹھیک رہے گا۔ موٹوی صاحب شاید یہیں منظر سے ہٹا کر اپنی قیادت کا کچھاجا چراغ جلانا چاہتے تھے کیونکہ ہمارے ہوتے ہوئے ان کی وال نہیں لگتی تھی۔

آدھر میں ہندوستان سفارت خانے کی طرف سے بتایا گیا کہ اگر ہم فوری طور دورہ اوجھڑا چھوڑ کر واپس نہ لوں تو ہمارا پاسپورٹ منسوخ کر دیا جائے گا اور ہمارے سفر کی دستاویزات کی توسیع سے بھی انکار کر دیا گیا۔ ہم نے فوراً فیصلہ کیا کہ ہمیں واپس وطن روانہ ہونا چاہئے۔ اور تقیہ زمین برسر زمین کے مصداق وہیں نئی آزمائشوں کے آگے سید پر ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ جب ہم واقعہ ہندوستان جانے والے ہمارے میں پرواز کر رہے تھے تو اس کی اطلاع مل گئی۔ اب وہ کہیں تو کیا کریں۔ فوراً رات گئے کاہینہ کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ لال بہادر شاستری نے نندہ کو یاد دلایا کہ انھوں نے جو کچھ میرے بارے میں کہا تھا وہ صحیح ثابت ہوا ہے اور میں نے رافزار اختیار کرنے سے انکار کر دیا ہے بہر حال میری نظر ہندی کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔ ہمارا جہاز صبح صادق کے وقت پالم پر اترا۔ اس وقت ستارہ سحری ہلک۔ ہلک۔ گمگم کر رہا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہوائی اڈہ ایک پولیس کیپ میں گیا ہے۔ اور اسکو واماب سے لیس پولیس ہماری منتظر ہے جو ہمیں ہمارا جہاز ٹھہرا پولیس نے اسے گھیر لیا۔ آدھڑا اخباری خاندانوں کو بھی ہماری آمد کی سبکدلی مل گئی تھی۔ وہ ہماری تصویر لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ پولیس والوں نے ڈنڈے اور ڈھالیں اس طرح کھڑی کر دیں کہ ہمارے وجود انہی کے عقب میں چھپ گئے اور یہی فوٹو اخبارداروں میں چھپ گئے۔ بہرہیت مجھے اور ایک صاحب کو ایک دوسرے جہاز کی طرف لے جایا گیا اور بنگلور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

بہر کیفیت۔ بیگم صاحبہ اور ہمارے دو اور ساتھیوں کو وہی جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن بیگم صاحبہ کے کشتی میں داخلہ پر پابندی عائد کی گئی۔ البتہ پیر عبد الغنی اور باورچی کو گھر لوٹنے کی اجازت مل گئی۔ مرد دلہن اور ہمارے کچھ اور دوست ہوائی اڈے کے باہر کھڑے تھے۔ مگر صاحبہ اُن کے گھر چلی گئیں۔

اُدھر کشتی میں بیک وقت زبردست اقدامات کیے گئے۔ کوئی ایک درجن اخبارات جن میں محافزہ شہری کے وہ اخبارات بھی شامل تھے جنہیں ہم نے سنا تھا۔ لیکن رہائی کے بعد شروع کیا تھا، بند کر دیے گئے۔ بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اس اقدام پر کشتیوں نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ لوگوں کو گولیوں اور لاشی سے چل دیا گیا۔ یہاں تک کہ جامع مسجد کے ایک جلسے میں اس قدر تار پڑا لاشیاں برسائی گئیں کہ مولوی محمد سمیعہ مسعودی اور خواجہ می الدین قرہ کے کپڑوں پر بھی لاشیاں چڑی اور اُن کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ▲▲▲

(۶۶)

جلا وطنی کی صعوبتیں

جب ہمارا جہاز جنگو پہنچا تو وہاں سے تین ایک موٹر کار میں جنسکار اونا کشتی پہنچا دیا گیا۔ جو تالانڈو میں ٹیگري سپرائیو میں روانہ ہے۔ راستے میں سرنگ پٹنہ پڑتا تھا جو سلطان ٹیپو کا دارالسلطنت رہ چکا ہے اور جہاں اُن کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ مجھے اُن کے مزار پر حاضری دینے کا شوق تھا۔ چنانچہ ہم نے کار روکوائی اور اس عظیم شہد دستانی کی تربت پر نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ٹیپو نے ایک راسخ عقیدہ مسلمان کی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ دکن میں ایک سچی سیکولر سٹیٹ قائم کی تھی۔ وہ انگریزوں کے خلاف آخری دم تک لڑے۔ اگر خود اُن کے بھڑوں نے اُن سے غداری نہ کی موتی تاج شاہینہ دستا کی تاریخ مختلف ہوتی، بہر حال اُسی دن ہم اونٹنی پکے گئے۔ اب مجھے اور پھر وہی تہنائی۔ اور بال و پر کٹنے کا ماتم۔ لیکن ہم نے اس پر صبر و شکر کے ساتھ اپنی اپنی زندگی کے معمولات شروع کر دیئے۔ ابھی مشکل سے ہمارے قیام کو ہمیدہ پیر گذر تھا کہ ایک صاحب کی بھت بگولگی اور ڈاکٹری مشورے کے مطابق انہیں سرنگ پٹنہ منتقل کر کے نشاط باغ کے قریب ایک جنگل میں نظر بند رکھا گیا۔ اونا کشتی ایک بار دوق چکر ہے۔ وہاں سیاحوں کی ریل چلی رہتی ہے اور وہاں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ہر جمعہ کو میں نماز کے لیے جامع مسجد جاتا تو وہاں ایک عین لگ جاتا تھا اور لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ مجھے اونٹنی کی میونسپل

حدود میں نقل و حرکت کی آزادی تھی۔ کسی بظراۃ قسم کے منسٹر نے مرکز کو بتایا کہ کوئی ایک غیر محفوظ جگہ ہے اور وہاں ہزاروں آدمی مجھ سے ملنے کے لیے آجاتے ہیں۔ اس لیے مجھے کوڑا کی کنال جیسے الگ تھاگ مقام میں رکھا جائے۔ جہاں لوگوں کی آمد و رفت نسبتاً کم ہے اور میری حفاظت کے بہتر انتظامات ہو سکتے ہیں۔

اوئی کے مختصر قیام کا ایک واقعہ ابھی تک میرے صغیر ذہن پر تازہ ہے جب میں وہاں جانے مسجد میں نماز کے لیے جا کر تاؤم کڑی ٹھکڑا سرائی کے کارمنے میرے دائیں بائیں منوس پر چھائیوں کی طرح منڈلاتے رہتے اور کسی کو میرے ساتھ بات کرنا تو درکنار میرے پاس پہنچنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ایک وفد ایک آدمی نے جو شکل و صورت سے کشمیری لگتا تھا مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب سلام دیا اور کشمیری میں اُس کی خیر و عافیت پوچھی۔ جس کا اس نے کشمیری میں ہی جواب دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ حکمہ سرائی کے عقل کے اندھے یہ سمجھے کہ میں نے اپنی زبان میں اُسے کوئی خفیہ اور خطرناک پیغام دیا ہے۔ اصلیت یہ تھی کہ یہ شخص ایک خاندان تھا جو کسی انگریز کے ساتھ اڈا کنڈ میں کام کرتا تھا۔ مجھے سلام کرنا اس کے لیے بہت بھنگ ثابت ہوا اُس کو گرفتار کر لیا گیا اور اُس کے شناختی کاغذات کشمیر بھیج دیئے گئے۔ جب تک وہاں سے پوچھا تاچہ کا جواب نہ آیا اس بے گناہ کو حوالات کی ہوا کھانا پڑی۔ جب مجھے خبر ملی تو میں نے ہمت احتجاج کیا۔ اسی طرح ایک برطانوی صحافی مسٹر سرائی کو بھی اسی جگہ پر کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہے اوئی میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اُسے وہی پٹنیا پانچا لیا اور وہاں جا کر جی اس کی جان چھوٹی جتا چمر ان تمام عوامل کے نتیجے میں مجھ کو اڈا کنڈ سے اٹھا کر کوئی کنال پٹنیا پانچا لیا۔ وہاں ایک بڑا گلاہ "کوہ نور" نامی میری قیام گاہ تھا۔ اب میں کوہ نور میں اکیلا دھندلا رہا تھا۔ لیکن جلد ہی بیگم صاحبہ کو بھی میرے پاس آنے کی اجازت دی گئی اور وہ چارے فرزند نسبتی

غلام محمد شاہ کے ساتھ میرے پاس پہنچ گئیں۔ وقفے وقفے سے میرے بچے اور بچیاں بھی وہاں آتی رہیں اور اب قاعدہ اجازت حاصل کر کے میرے پاس ہفتے دو ہفتے گذرتے رہے اگست شروع کے دوسرے ہفتے میں کشمیر کے متعلق اطلاعات آنے لگیں کہ پاکستان نے اپنے دراندازوں کو وہاں بھیجا ہے۔ اتفاق سے پہلی خبر درست کوئی۔ جو کشمیر میں میری خلافت آئین برطانی اور گندری کی ۱۲ ویں برسی کے طور پر منایا جا رہا تھا۔ ساری ریاست میں اٹھل پھٹل مچ گئی اور حکومت ہند کو بھاری فوجی کمک کشمیر پہنچانا پڑی۔ میں نے دل ہی دل میں تمنا کا شکر ادا کیا کہ اس موقع پر میں کشمیر سے ہزاروں میل دور کوئی کنال میں پڑا ہوا ہوں۔ ورنہ گھڑاری لال سندھ کی تماش کے لوگ مجھ پر ہی سزا بار اور سازش کا الزام تحویب دیتے اور کہتے کہ ج کے دوران میں نے ہی پاکستانی افسروں کو کشمیر میں درانداز بھیجے کی ترفیب دی تھی۔

بعض اوقات انسان کو واقعات کی سطح بڑی ناگوار اور کڑی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدا بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ بعد میں یہی کڑوا ہٹ اُس کے حق میں شہد اور انگبین کا کام کرتی ہے۔ شاید اس تازہ ابتلا کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔ میں نے کوڑا کی کنال میں کوئی تین سال جیسے تھے کر کے گزار لیے۔ جے پر کاشش نرائن اس دوران مجھ سے ایک مرتبہ ملنے کے لیے تشریف لائے۔ کوڑا کی کنال ایک خوبصورت اور خاموش جگہ ہے۔ جہاں یورپ اور امریکہ کے بہت سے مشن کام کرتے ہیں۔ "کوہ نور" کے پاس ہی ایک کالونٹ واقع ہے۔ وہاں کی استانیات ہمارے لیے بڑی ہمدردی اور دردمندی کے جذبات رکھتی تھیں۔ اور کبھی کبھی کالج کی تقریبات میں ہمیں بلایا بھی کرتی تھیں۔ وہاں زیر تعلیم بچیاں دور دور سے تعلیم کے لیے آتی تھیں جیسے ممبئی وغیرہ۔ وہ بھی ہم سے لعل ملی تھیں۔ اور ہمیں پیار کرتی تھیں۔ ہمیں ان سے

مکان سو گنڈلیں میں نظر بند کر دیا۔ یہاں کے ارد گرد بہت اونچائی تک خاردار تار کا جکڑ لگایا گیا تھا اور پولیس کا زبردست پہرہ بٹھایا گیا تھا۔ میں اندر بیٹھا ہوا دنیا کی اس سب سے بڑی جمہوریت کے لیڈروں کے کچھ دیکھ رہا تھا اور صبر و شکر کے ساتھ حالات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اس دوران باہر کی دنیا میں کچھ اہم واقعات ہوئے بشمیر میں دراندازی نے ہندوستان کی پوزیشن ہلاک رکھ دی۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ میں پہلی مرتبہ کشمیر کی ٹرائی کشمیر سے باہر دو ملکوں کی بین الاقوامی سرحد تک جا پہنچی۔ مینسکوں کی کچھ خوفناک ٹرائیاں ٹری گئیں اور فضا میں لگے تانگے کے ہوائی جہازوں کی ٹکریں DOG FIGHTS ہوئیں۔ دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے شہروں پر بم برسائے۔ ہندوستانی فوج کے جنرل جتوہری کے اس اعلان کے باوجود کہ وہ رات کا کھانا لاہور کے چم خانہ کلب میں کھائیں گے، اچھو کھال کے کنارے الگ کر دی گئی۔ آخر کار دونوں روپیہ اور بے شمار جانوں کی قربانی کے بعد جنگ ٹک ٹک کر گئی۔ مسئلہ کی ابتدا میں روس نے ایک سفارتی معرکہ مارکر وزیر اعظم شاستری اور صدر ایوب کو تاشقند کی سرزمین پر گھسکے دیے آئے پر راضی کر لیا۔ اسی کانفرنس میں صدر ایوب اور جتوہری کے دستے الگ ہوئے کی بنیاد پڑ گئی۔ کافی عرصے کے بعد سمجھوتے کا اعلان ہوا۔ لیکن سمجھوتے کا اعلان ہونے کی رات کو ہی لال بہادر شاستری دیارِ خیر میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے اور ہندوستان میں ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ آخر کار نئے بارشلا گر کالمرج ناوار کی مدد سے جواہر لال کی بیٹی مسز آندرا گاندھی وزارتِ اعلیٰ کے اٹھک امیدوار مراد بی ڈیسا کی شکست دے کر برسرِ اقتدار آئیں۔

اسی دوران کشمیر میں مسئلہ کی ابتدا میں انتخاب کا ایک اور ڈھونگ چا لایا۔

کافی دیر کا پیدا ہو گیا تھا۔ ہم ہر روز پولیس کے کڑے پہرے میں کوٹوالی کی سہمت ہی ستر بھیل کے ارد گرد گھومنا کرتے تھے اس جہیل میں سیر کرنے کے لیے کشتیاں وغیرہ بھی رکھی ہوئی ہیں اور ہم نے بھی کئی بار بھیل میں کشتی پر بیٹھ کر سیر کی اور کشمیر کے بھیل ڈول کی یاد تازہ کر لی۔ کبھی کبھی سیر کرتے ہوئے کوئی راہ گیر ہم سے علیک سلیک کی کوشش کرتا لیکن بعد میں اسے پولیس کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ الغرض پولیس کسی کے میرے ساتھ سلام کلام کی روداد نہیں تھی۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ مشہور فلمی اداکار محمد یوسف خان جو دلیپ کمار کے فلمی نام سے پہچانے جاتے ہیں ہم سے ایک مافی تقریب میں ملے وہ ہمارے پاس بیٹھے آئے اور ہماری خیر عافیت معلوم کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے سلام دعا کا تبادلہ کرنے کی جسارت کی پاداش میں اس پائے کے فنکار کو بھی اربابِ اقتدار کے عتاب کا نشانہ ہونا پڑا۔ مسئلہ میں جب ہندوستان جنگ چھو گئی تو ہمارا مکان سے نکلنا ہی بند کر دیا گیا۔ کسی منیجر نے مرکزی حکومت کو یہ اطلاع دی کہ پاکستان مجھے پہلی کا پیر بھیج کر اخوا کر کے بے جاے گا۔ اور مرکز کے اگلے ٹھکانے جعفریہ کے سارے سبق بھول کر اپنی ضعیف الاعتقادی کو آشکارا کر گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو تھوڑی بہت ورزش ہیں روزانہ سیر کرنے کے بہانے میسٹر ہوتی تھی اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب پلٹنا چلنا بند ہو گیا تو میرے جسم میں شکر کی مقدار بڑھنے لگی۔ ورزش اور چل قدمی سے فاضل شکر خرچ ہوتی ہے لیکن ایک ہی جگہ بیٹھ رہنے سے خون میں اس کی سطح بڑھنے لگتی ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا اور ذیابیطس کی پریشان کن بیماری کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ جب بیماری نے نازک صورت اختیار کر لی تو مجھے دہلی لاکر آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں علاج و معالجے کے لیے داخل کر دیا گیا۔ میں وہاں ایک مہینہ رہا۔ صحت یابی کے بعد مجھے وہی کے ہی ایک

اس وقت محاذ کی تقریباً ساری قیادت جیل کے اندر تھی۔ بلا مقابلہ کامیابوں کا یہ دنگل جیتنے کے بعد بیک صاحب اور دوسرے لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن میں بھی بھی اپنے قفس میں بدستور بند رہا۔ ۲ جنوری ۱۹۷۱ کو نئی دہلی کے جوسٹرک مجسٹریٹ مسٹر مٹن اچانک میرے زندان خانے میں آئے اور انھوں نے مجھے رہائی کا پروانہ دیا۔ مجھے جس دن رہا کر دیا گیا اس دن عید کا روز مسعد تھا۔ چنانچہ میں نماز عید کے لیے عید گاہ گیا۔ جہاں میری رہائی کی خبر پہنچ گئی تھی۔ مجھے ایک بھاری اجتماع نے گلے لیا اور میں نے نماز کے بعد تقریر کر کے ہنسے کہا کہ میرا مقصد یہاں سے ہے کہ اس برصغیر میں رہنے والے عوام تشویش اور اضطراب سے آزاد ہو کر اطمینان و مسکن کی زندگی گزار سکیں چنانچہ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہند اور پاکستان ایک دوسرے کے قریب اگر نفرت کی دیوار کو ڈھادیں۔ میں نے کچھ دنوں بعد وزیر اعظم مسٹر انندرا گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ پہلے میں انھیں اپنے دوست جواہر لال کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ بھی خاندان کے ایک فرد اور بزرگ کی حیثیت سے میرا احترام کرتی تھیں اور یہ خوشگوار بات تھی کہ ایک ایسی طاقتور ہندوستان کی وزیر اعظم مقرر ہوئی تھیں جن کی رگوں میں کشمیری خون موجود ہے اور جو کشمیر کی تحریک آزادی اور اس مسئلے کے سلسلے نشیب و فراز کا گہرا علم رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے دو سال کے عرصے میں ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک آزاد ذہن اور زبردست قوت فیصلہ کی مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی انسانی صلاحیتوں اور سیاسی فراست کا مظاہرہ کر کے اپنے جہاں دیدہ و حریفوں کو ناگوں چنے بیچوائے تھے۔ جب کانگریس سنڈی کیٹ نے مسٹر گاندھی کو مسز آر جی جیسے ہندی طبیعت کے رہنما کے خلاف چننا تھا تو ان کا خیال تھا کہ وہ اس "گوئی گویا" کو سنگھاس پر بٹھا کر اپنی مانیاں کر سکیں گے لیکن حکومت پاتے ہی اچانک اس گوئی گویا کی پالٹ

گئی اور اس نے ان بادشاہ گروں کو ان کی اوقات دکھا دی۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کو اس نئے رول میں دیکھ کر نہ تو خفا وادے سے متعلق میری گفتنی ہی یادیں تازہ ہو گئیں۔ میں نے ان کے ساتھ طویل ملاقات کی۔ اور کشمیر کی گتھی کو سمجھانے کے متعلق اپنا عندیہ پھر پیش کیا۔ اپنی رہائی پر میں نے ایک برس کا نفع بھی مستحق کی اور پاکستان جا کر ان دھاگوں کو پھر سے جوڑنے کا عزم ظاہر کیا۔ جو تہرہ کی موت کی وجہ سے فٹ گئے تھے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ حکومت ہند کو میرے اس دوسرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے بھی اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔

رہائی کے بعد کچھ دن میں نے دہلی میں ہی قیام کیا۔ اور مرکزی حکومت نے پیش کش کی کہ میں اسی بیگلے میں ٹھہر سکتا ہوں جس میں مجھے نظر بند رکھا گیا تھا۔ میں نے مناسب کرایہ دینے پر رضامندی ظاہر کی اور یہ کافی برس میری تحویل میں رہا۔ البتہ بعد میں کشمیر گورنمنٹ نے اسے حاصل کر لیا۔ بیگ صاحب کو بھی نواح میں ٹھہر بہ کوئلہ لین کرایہ پر لینے کی اجازت دی گئی۔ اس دوران میں نے پھر جے کاش نرائن، راج کپال اچاریہ اور دونبا سچا کے سے ملاقاتیں کیں۔ وہ حالات کی نئی ہیج سے کچھ خوش نظر نہ آ رہے تھے اور انھوں نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا۔

میں سہ ماہی کو سرینگر کے لیے بندر لید طیارہ روانہ ہوا۔ کشمیری عوام نے پھر میرے لیے عقیدت کا بے پناہ مظاہرہ کیا اور نہایت ہی گرمخوشی اور تپاک سے میرا استقبال کیا۔ میں نے عوام سے ملنے کے لیے کشمیر کا دورہ شروع کیا اور دیکھا کہ وہ کشمیر کے سیاسی نظام سے بدستور ناراض و نالاں ہیں۔ میں نے ان کی ہمت بندھائی اور انھیں یقین دلایا کہ وہ دن دور نہیں جب کشمیری عوام پر بے ضابطہ انتخابات کے ذریعے ایجنٹ ٹھونسے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور وہ ریاست میں اقتدار کے حقیقی مالک و مختار بن جائیں گے۔

.... اور جائوت ہار گیا

ہماری آزادی کا نیا دور تھا۔ ہم نے تنظیم کے تشریف توڑے کو پھر سے جوزنا شروع کر دیا۔ محاذ رائے شماری کی صفوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے کئی کاروائیاں کیں۔ اس کے علاوہ میں نے اوقات اور دیگر خیراتی کاموں کی ترتیب و تدوین میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اسی زمانے میں میں نے حضرت بن کی تعمیر جدید کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اور شہر و دیہات میں اس کی تعمیر کے لیے نقدی و جنبی رقومات اکٹھا کرنے کی مہم شروع کر دی۔ میری سالگرہ پر میرے کچھ عقیدت مندوں نے مندرانے کے طور پر کئی لاکھ روپے جمع کر کے مجھے تحفہ کی صورت میں پیش کیے لیکن میں نے اس رقم کو سرنگرمین جدید سازو سامان اور طبی سہولیات سے آراستہ پیراستہ ایک ہسپتال کی تعمیر کے لیے مخصوص کر کے کا اعلان کر دیا۔ اس غرض کے لیے آنچل جوبیل کے کنارے ایک کشادہ اور پرفضا جگہ چن لی گئی۔ اور شیر کشمیر فیشنل میڈیکل انسٹیٹیوٹ کا خیال ذہن کی غلطیوں سے باہر آکر سنگ و خشت کے پیکروں میں ڈھلنے لگا۔ مکان کی بات ہے کہ کشمیر سرکار نے بھی اس کام میں نہ صرف ہمارا حوصلہ بڑھایا بلکہ اس کے لیے زمین مہیبتا

کرنے پر رضامندی بھی دکھائی۔ اس کے علاوہ بھی ہمارا ہاتھ ڈالنے میں پیش پیش رہی چنانچہ ہم نے کام چلانے کے لیے صورہ میں ایک نالی کلینک POLY CLINIC - ۲۰ بستریوں پر مشتمل ایک ہسپتال اور مولانا آزاد روڈ پر ایک پاتھولوجیکل لیبارٹری (PATHO-LOGICAL LABORATORY) اور دوسرے کام شروع کیے۔ ساتھ ہی ساتھ میڈیکل انسٹیٹیوٹ کا جامع منصوبہ یعنی ماسٹر پلان مکمل کر کے اس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اس کی تعمیر کا کام آج دس بارہ سال گذرنے کے بعد بھی جاری ہے۔ سازو سامان کے لیے آرڈر دیئے جا رہے ہیں۔ اور ڈاکٹروں کا انتخاب مرحلہ وار کیا جا رہا ہے امید ہے کہ تین چار سال کے اندر ریاست کی یہ بڑی ضرورت پوری ہو جائے گی۔

اس ہسپتال کی تعمیر کا ٹیم کیسے چھوٹا، اُس کی بھی ایک کہانی ہے۔ تحریک میں چونکہ ہمارے مسلمان ہم وطن ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے تھے۔ اس لیے وہی اکثر حکومت اور پولیس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے تھے۔ یہ صورت حال برابر جولائی ۱۹۳۷ء سے شروع ہوئی اور اُس وقت تک جاری تھی جب وہ گوبیوں اور لائٹھوں کا شکار ہو کر لہو بہان ہو جاتے تھے تو ان کے فوری علاج معالجے کے لیے سرکاری شفا خانوں کے کواٹر آن پرنسپل کے دونوں کی طرح بند ہو جاتے تھے۔ اگر کسی کو شک شکوے کے لیے داخلہ مل بھی جاتا تو بھی اس کے ساتھ ہمدردی کی بجائے سنگدلی اور بے رحمی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس پر کچھ حساس مسلمانوں کی رنگوں میں غیرت نے جوش مارا اور انھوں نے اپنا ایک ہسپتال بنانے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ رقومات بھی بنک میں جمع کرائی گئیں۔ مگر میری دوسری معروضیات کی وجہ سے یہ کام اور صوبائی رہا۔ لیکن جب میری سالگرہ پر میرے عقیدت مندوں نے ایک خط پر رقم یہ کہہ کر میرے حوالے کی کہ میں جس کام میں بھی چاہوں یہ روپیہ استعمال کر سکتا ہوں تو میں نے اُن کی اس دیرینہ خواہش

کو پورا کرنے کے لیے اس ہسپتال کی تعمیر کو اولین ترجیح کا مستحق بنانا۔۔۔۔۔ اب یہ ایک نیم سرکاری ہسپتال کی حیثیت سے ابھر رہا ہے اس پر موجودہ اندازوں کے مطابق بیس کروڑ کی لاگت آئے گی۔ حضرت بنی کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور اس بقعہ عالیہ کی حالت کشمیر میں اپنے طرز کی پہلی عمارت ہے انسٹی ٹیوٹ کے حدود خال اگرچہ ابھر آئے ہیں لیکن اس کی تکمیل میں کچھ اور وقت درکار ہوگا۔ لیکن جب یہ پورا ہوگا تو بہت سی سہولیات اور خصوصیات کی وجہ سے یہ ملک بھر میں اپنی نوعیت کا ایک انفرادی اور امتیازی ثقافتی ہوگا اور کشمیر کے لوگوں کو ریاست کے باہر کے شہروں اور ہسپتالوں میں در در کی ٹھوکرین کھانے کی حققت اور صعوبت سے نجات دلائے گا۔

اس دوران اوقات کی تنظیم اور اس کے اثاثوں کی توسیع کی طرف بھی میں نے کافی توجہ دی اور شہر دیہات میں بہت سی مساجد و کاناں و مکانات تعمیر کیے گئے۔ اس سے نہ صرف اوقات کے لیے آمدنی کے نئے ذرائع پیدا ہو گئے۔ بلکہ نائین کی ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ سرنگر کے، جینتیرنگ کا لچ میں فرقہ وارانہ گروہ شروع ہو گئی۔ یہ لچ مرکزی حکومت کے اہتمام سے کھولا گیا ہے۔ اور دگلا حضرت بن کی بقی میں واقع ہے۔ طلباء نے حضرت بن جانے والی سڑک پر ٹریفک روک دیا۔ جب ریاستی حکومت عاجز ہو گئی اور فرقہ وارانہ دبا کے جراثیم پھیلنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تو میں نے تماشائی بننے کی بجائے میدان میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اکیس انجینئرنگ کالج گیا اور وہاں طلباء کو اس قسم کی قابل نفرت سرگرمیوں سے دور رہنے کی ایپیل کی میں نے افسوس بتایا کہ یہ سوال کشمیریوں کی قومی روایت کے احترام کا ہے اور اس پر کوئی کھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ باز نہ آئے تو میں معاملہ عوام کے سپرد کر دوں گا۔ اس اپیل کا غلط جواب نہ دیا۔ میں تنگ سڑک کھلا رہا اور ٹریفک کو بحال کرنے میں مدد دیتا رہا۔

تعمیر یہ را کہ اسی دن جمعہ کی نماز باجماعت حضرت بن میں ہزاروں شہریوں نے ادا کی اور صورت حال معمول پر آ گئی۔

سیاسی محاذ پر ہم نے قماذرائے شکاری کو تقویت دینے کے ساتھ ساتھ ریاست کے مختلف کتے ہائے فکر سے تعلق رکھنے والی شخصیات اور جانتوں کا ایک نمیش پیو پلہ کنوشن مجاہد منزل میں منعقد کیا۔ اس کنوشن میں اگر ایک طرف محاذ کے مرزا محمد افضل بیگ شامل تھے تو دوسری طرف نیشنل کالفرنس کے بخشی غلام محمد بھی تھے ایک طرف عوامی ایکشن کمیٹی کے مولوی محمد فاروق تھے تو دوسری طرف جموں کے بلراج پوری تھے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد سعید مسعودی، خواجہ غلام محی الدین قرہ، پنڈت پریم ناتھ بٹناز وغیرہ بھی کنوشن میں آئے اور کشمیر کی کتنی کتب سمجھانے کے لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ مجھے اتفاق رائے سے کنوشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ کنوشن کے اختتام کے لیے ہم نے شری جے پرکاش نرائن کو دعوت دی۔ یہ ان کا پہلا دورہ کشمیر تھا۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۵۷ء میں جب میں "کشمیر جھڑو" تحریک کے سلسلے میں قید کاٹ رہا تھا جہنم میں چلائی جانے والی ہماری کسان تحریک کی حمایت کے لیے وہاں آئے تھے مگر وادی کا یہ یہ ان کا پہلا دورہ تھا چنانچہ محاذ رائے شماری نے ہماری روایت کے مطابق ایک مختصر ہندوستانی اور سرکردہ مجاہد آنا دی کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا۔

شری نرائن نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں خود کشمیریوں کے حق خود ارادیت کا حامی رہا ہوں اور ان قربانیوں کی دل سے داد دیتا ہوں جو شیخ صاحب کی قیادت میں کشمیریوں نے دی ہیں لیکن ۱۹۵۷ء کی ہند پاک جنگ کے بعد صورت حال میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اس لیے مسئلہ کشمیر کا حل اب ہندوستانی آئین کی چار دیواری کے اندر ڈھونڈنا ہی ممکن ہے۔ آپ اس چار دیواری کے اندر ہر قسم کے حقوق اور تحفظات طلب

کرنے کے جہاز ہیں جن کی سارے ملک کے محب وطن حمایت کریں گے۔ بے پرکاش
نراٹن نے کہا۔

”تقسیم برصغیر کے وقت جب تمام ملک کے مسلمان جناح صاحب کے پرچم تلے جمع ہو کر
دوقومی نظریے کے حامی بن گئے تھے۔ دو چلے ہوئے ستارے اس ترجمان کی اقتدار
رو کے ترجمان بنے۔ جموں کشمیر اور صوبہ سرحد ان دو حصوں میں رہنے والے مسلمانوں
نے دوقومی نظریے کے سیلاب میں بہہ جاتے سے انکار کر دیا۔ اس منہج کے انظور
دوست ہی مذہبی عقیدہ رکھنے والے اعلیٰ قدر و امانت اور پرکشش مسلمانوں کی قیادت
کی وجہ سے ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ اور خان عبدالغفار خان۔ شیخ محمد عبداللہ کی
ثابت قدمی، جرات، غیر فرقہ وارانہ نظریے اور روشن خیال قیادت کا ہی نتیجہ تھا کہ
جن کی وجہ سے آج کی ہندوستانی کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ وہ کشمیر کو ہندوستانی
سیکیورٹیز کی ایک شائستہ مثال کے طور پر پیش کرے۔۔۔۔۔ حال ہی میں انجینئرنگ
کالج بنگلور میں جو واقعات پیش آئے ان میں بھی شیخ عبداللہ نے اپنے غیر مستنزل
غیر فرقہ وارانہ نقطہ نظر کا ثبوت دیا۔۔۔۔۔ اگر کوئی شخص فضول خیال آدمی کا شکار
نہیں بننا چاہتا تو یہ بات، جو بہت سے لوگوں کے لیے کتنی ہی کڑی کیوں نہ ہو،
ماننا پڑے گی کہ شیخ عبداللہ کشمیر میں اب بھی کلیدی حیثیت کے مالک ہیں۔ لہذا
اس وقت تک کشمیریوں کی بڑی تعداد کے لیے کشمیر کا کوئی حل نہیں ہو سکتا جب
تک اس کو شیخ صاحب کی رضامندی حاصل نہ ہو۔“

اس موقع پر بعض غلام محمد کے خطبے کے چند اقتباسات منہ کا مزہ بدلنے کے لیے
پیش کیے جاتے ہیں۔ جو شخص کشمیر میں ناجائز سیاسیات اور فریب کارانہ انتخابات کا
بادا آدم تھا۔ جو مرکزی الیکشن کمیشن کے دائرہ کار کو ریاست پر توسیع پدہ کرنے کو

ایک امرت دھار سمجھتا تھا۔ وہ اب اقتدار سے محروم ہو کر کس حالت نزار کے ساتھ
منہ ربا تھا۔

”ہم نے ریاست کے لوگوں کو جمہوریت دینے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بات
تسلیم کرنی چاہیے کہ جن عام انتخابات کو ہم خوب بانس پر چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ ان
کے تعلق یہ ایک واقعہ ہے کہ ریاست کے عوام کو نوٹ کے بغیر ریاست کے عمران
چنے کا کوئی آزادانہ مواقع فراہم نہیں کیا جاسکا ہے۔ مرکزی الیکشن کمیشن کے تحت
جو انتخابات ہوئے ان میں افسروں اور اہلکاروں کے طریق کار کو ریاستی عدالت عالیہ
نے قابل ملامت قرار دیا۔۔۔۔۔ ہمیں کشمیری عوام کے اس تاثر کو محو کرنے کے لیے
کوششیں کرنا ہوں گی کہ ان کے عمران کسی اور مقام سے نامزد کیے جاتے ہیں۔۔۔۔۔
ہمیں لوگوں کے دلوں میں جاگزیں اس احساس کو دور کرنا ہوگا کہ صرف وہی اپنی قسمت
کے مالک ہیں۔ صرف وہی اپنے عمران چنے کا حق رکھتے ہیں اور یہ عمران صرف ان کے
اعتماد کے بل بوتے پر ہی اقتدار میں رہ سکتے ہیں۔ شاید کسی ستم خیزیت نے ایسے ہی
موقعوں کے لیے کہا تھا۔“

وہی قتل بھی کرے ہے وہی کے ثواب اٹا

بہرکیت میں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا۔

”یہ عمل اور موقع جو اس کونیشن میں حصہ لینے والے معززین کو میسر ہے، ایسا
نہیں کہ اس کو ماضی کے گڑھے مڑے اٹھانے، نکتہ چینوں یا انزام تراشیوں اور
ان کا جواب دینے کے لیے استعمال کیا جائے جو میا سوبیت چمکا۔ اس پر ہمیں نہ مقررہ
نہ کیمن۔ ہم اس کونیشن میں اگر ماضی کے واقعات کا جائزہ لیں گے، جو ہمیں لینا ہی ہوگا
کیونکہ اس کے بغیر مستقبل کی صحیح تصویر مرتب نہیں ہو سکتی تو یہ جائزہ لینے سے ہمارا

واقعہ ایشیہ نشاط میں سبھی کتب خیال کے نمائندوں کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت طعام منعقدی۔

دوسرے دن صندوقی باغ میں ایک عام جلسہ ہوا۔ میں نے زوردار لیے مسین حق خود ابدانیت کو قوموں کا بنیادی حق قرار دیتے ہوئے کہا کہ آزادی دی نہیں جاتی یعنی جاتی ہے اور نامساعد حالات سے نوجوانوں کا حوصلہ پست نہیں ہونا چاہیے شری جے پر کاش زرائع کو جو شیخ پر موجود تھے، میری یہ تقریر ناگوار گذری۔ لیکن وہ یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے۔ ہماری سب سے بڑی ضرورت کشمیر کے لوگوں کا حوصلہ قائم رکھنا تھا۔

وقت گزر گیا۔ حکومت کشمیر نے اپنی پکڑدھکڑ اور داروغہ کا سلسلہ جاری رکھا اور یہاں کے نوجوانوں کو مختلف فرمیں اور جعلی مقدموں میں ناخوڑ کر کے آٹن پر تھپان روا رکھیں۔ وہ ان الزامات کو عدالت کے سامنے کبھی ثابت نہ کر سکے۔ لیکن اس سے کہیں پناہی کا حوالہ قائم ہونے میں ضرور مدد ملی۔

اسے میں پارلیمنٹ کے وسط عدلیٰ انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ برصغیر میں مورتحال بوجان خیر تھی۔ بیجی خان کے مدد میں تدبیر اور سیاسی تدانوں کی متکون مزاجی نے پاکستان کے مغربی اور مشرقی حصوں کے درمیان فائدہ بخشی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اور ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں مشرقی جنگ لگی میں ایک دوسرے کے آٹنے مانتے کھڑی تھیں۔

ایکشن کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی میدان میں کود پڑنے کا فیصلہ کیا۔ ہم ان دنوں دہلی میں تھے۔ چنانچہ ایکشن کی صورت حال کے لیے تیار رہے اور اس سلسلے میں متغیر مشورہ کرنے کے لیے میں نے سرنگرم میں کارکنوں کا ایک اجلاس طلب کر لیا۔ ۸ جنوری کو میں

مقدمہ صرت یہ ہو گا کہ ہم موجودہ تعطل کا کوئی حل نکالیں۔ ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہم اس بنیادی مسئلے پر سوچیں کہ یہاں کے عوام کی مشکلات کیسے ختم کی جائیں۔ کونسا طریقہ اس گتھی کو سمجھانے کے لیے اختیار کیا جائے تاکہ عوام غربت، بھارت، مملات اور ان کے مغلوب کن اثرات سے نجات حاصل کریں۔ میں یہ بات جو کھو اور رنگ کے ساتھ کہتا چاہتا ہوں کہ جنگ بندی لائین کے اس پار سے ہم نے بچھڑے ہوئے جن بھائیوں کو اس اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی تھی ان کو ضروری سہولیات میسر کرنے میں ارباب اقتدار نے نقل سے کام لیا۔ جس سے وہ اس کنونینشن میں شامل نہ ہو سکے تھے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جنگ بندی لائن کے دوسرے طرف سے آئے والوں کی اس اجلاس میں موجودگی ہمارے کام کو آسان کرنے کا موجب ہوتی ہے۔

اس کنونینشن میں بہت سے بچھڑے اور بچھڑے ہوئے ساتھی مدت کے بعد ایک جہت کے نیچے جمع ہوئے۔ کوئی ڈھائی سو ٹی ٹی گریٹ ریاست کے کوئے سے آئے تھے اور دن سے بھی وہاں کے کشمیریوں کے نمائندے آئے۔ ہندوستان کے کچھ ممتاز دانشوروں اور صحافیوں نے مصغیرین کی حیثیت سے شرکت کی۔ لیکن اس کنونینشن نے غلام محمد صادق کے دعویٰ کو بے نقاب کر دیا وہ بار بار دعوت مبارزت دیتے رہے تھے کہ کشمیر کے معاملے پر استدلال اور مکالمے کو بنیاد بنا نا چاہئے۔ اور مخالفین کو سیاسی مباحث کے ذریعے قائل کیا جا نا چاہئے۔ وہ ابتداء میں اس کنونینشن کے حامیوں میں سے تھے لیکن آخر پر وہ اقتدار کے قلعے میں پھنسا ہو کر یہاں آئے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکے۔

اس کنونینشن سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ سیاسی فیضا میں ایک خوشگوار اتھل چھل پیدا ہو گئی اور سماجی اور ذاتی سطح پر تناؤ کم ہو گیا۔ بلکہ بعض صاحب نے اپنے مکان

بڑی کوشش کی اور سرنگر قائد اور اچھے بیچے کے ہماری جماعت کے ہمدرد ایکشن میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ لیکن وہ حکومت کے جبر و ستم سے اتنے بے ہوئے تھے کہ کسی کو پرہیز کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ مولوی محمد سعید، غلام محی الدین قرہ، حاجی محمد سبحان، خواجہ غلام محمد بٹ، بسنت باغ، انور سبھی نے میدان میں کود پڑنے سے گریز کیا۔ مولوی محمد سعید نے مخصوص لیے میں کھلا بھیجا کہ بخشی غلام محمد کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مرکزی حکومت اس کی پخت پر ہے اور اس کو ہر قیمت پر کامیاب کرے گی۔ چاہے اسے فوج ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔ اُن کا یہ جملہ جھجکا سرنگر کی پارلیمانی نشست پر کانگریس کی کامیابی ہندوستان کے لیے کشمیر کے واپس آنے کی جڑ ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ بخشی غلام محمد کو چند ہی دن پہلے کانگریس ہائی کمان نے صادق صاحب کی پرواہ کیے بغیر سرنگر کی پارلیمانی نشست کے لیے اپنا امیدوار چن لیا تھا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ بخشی غلام محمد ہر حالت میں اس اہم نشست پر کامیاب ہو جائے گا۔ بہر حال بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن اچانک شمیم احمد شمیم ہمارے پاس آئے اور کہا کہ انھوں نے سرنگر میں بخشی غلام محمد کے خلاف چناؤ ڈرنے کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کر دیے ہیں اور ہماری امداد کے طالب ہیں۔ شمیم احمد کا ہماری جماعت سے کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ یہ بخشی کے ہی اوردہ اور پروردہ تھے۔ بخشی سے رشتہ توڑنے کے بعد اُس نے صادق صاحب سے اپنا رشتہ جوڑا تھا۔ اُسے یہ ہمارے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا کہ ان پر اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ کیونکہ اُن کا سارا وجود شک کی شبہات کی دھند میں لپچا ہوا تھا اور ریگ صاحب و شاہ صاحب دونوں اُن کی مدد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن میں نے اُن سے کہا کہ اس وقت سیاسی نقطہ نگاہ سے بخشی کے ہونا ایک اہم بات ہے اور ہم صرف ایک میٹ پر اُن کو ہرگز کشمیر کے عوام

واپس سرنگر آنے کے لیے جہاز میں بیٹھا۔ ہم لوگ پرواز کی تیاری میں لگ گئے اور ہینیاں و فریو باندھنے لگے۔ اچانک ایئر پوسٹس کا یہ اعلان شن کر ہم حیران رہ گئے کہ ہر ڈائرینگ نہیں جاسکے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ کسی نے ہم رکھ دیا ہے۔ اس طرح سے ہمارا سامان جہاز سے اٹھا لیا اور ہم واپس اپنے ڈیرے پر آ گئے۔

میرا تھا اعلان سنتے ہی ٹھٹھا کا تھا کہ وال میں ضرور کالا ہے اور ہم وغیرہ رکھنے کا ایک بہانہ کیا گیا ہے جس کے پردے میں اصل عزائم کو چھپانا مقصود ہے۔ حکومت ہند کی اس ڈسٹ گفٹاری کا، کاؤنڈ دوسرے دن سامنے آ گیا۔ ہم علی الصبح جاگ کر نواز و فریو میں معروف تھے کہ ہماری رہائش گاہ کا دروازہ ٹھٹھا کے آواز آئی۔ ہمیں قہری طور پر مطلع کیا گیا کہ ریاستی حکومت نے پیگ سکیورٹی ایکٹ کے تحت ہمارے داخل کشمیر پر پابندی لگا دی ہے۔ ادھر مرکزی وزارت داخلہ نے اعلان کیا کہ محاذ رائے شماری کو غلط قانون جماعت قرار دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ خواجہ غلام محمد شاہ بھی وہی میں ہی رہ گئے۔ جنوں سے اطلاع آئی کہ ریاست بھر میں وسیع پیمانے پر محاذ کے کارکنوں کی گرفتاریاں مل میں لائی گئی ہیں اور اس کے ذخائر کو تہہ پتہ کیا گیا ہے۔ ادھر پیگ صاحب سرنگر جانے کے لیے جوں سے آگے روانہ ہو چکے تھے۔ اُن کی کار کو اودھو پور کے پاس روک لیا گیا اور انھیں بھی ریاست بدر کر دیا گیا۔ اس ساری کارروائی کے مقاصد صاف تھے کہ محاذ رائے شماری ایکشن کے میدان سے ہٹایا جائے تاکہ ہندوؤں کی لوگ پر خاموش کیے گئے کشمیری عوام صندوق کے ذریعے اس ساری فریب کاری اور جعل سازی کا تختہ الٹ کر درکھ دیں اور اُن کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کی رسوائی کا سامان نہ ہو جائے۔

ہماری بڑی خواہش تھی کہ ہماری جماعت بھی انتخابات میں حصہ لے میں نے

کے اصل جذبات سے تڑپنا کو اُٹھ کر سکتے ہیں اور علامتی طور پر ہندوستان کی کشمیری پالیسی کے خلاف کشمیری عوام کے عدم اعتقاد کو ثابت کر سکتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی شخص جو بخشی غلام تختہ کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے ہماری امداد حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے کہ بخشی غلام تختہ کی مقبولیت کا جو بھرم قائم کیا گیا ہے اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اب سوال تھا کہ کشمیریوں کو کشمیر کی حریت کے لیے کیسے آمادہ کیا جائے اور انہیں کیونکر یہ باور کرایا جائے کہ اُسے ہماری تائید و حمایت حاصل ہے؟ چنانچہ ہم نے انتخابی مہم کی تیاریات کے لیے میگ ممبران کو بڑی آہستگی اور خاموشی کے ساتھ سرنگر رواد کر دیا۔ میگ ممبران نے موسم کی ناسمعدت، برت باری، بارش اور جازے کی سختی اور ذرائع کی کمی کے باوجود ایسی زبردست انتخابی مہم چلائی کہ بخشی چاروں شانے چت ہو گئے اور اپنے کینفر کو دار کو پہنچ گئے۔ ساری دنیا کو معلوم تھا کہ اس جالوت (GOLIATH) کے پیر کتنی کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک علامتی (SYMBOLIC) لڑائی تھی۔ مرکزی حکومت کے نامزد کیے ہوئے ایک ایسے آدمی کو جس نے کشمیر میں مسلسل، اسال تک حکومت کی تھی بے پناہ ذرائع کے باوجود ہمارے نامزد کیے ہوئے ایک عام امیدوار نے جسے مولانا سمیع الدین نے کھبا کہہ کر پکڑا تھا، شکست فاش دی۔ اس سے ہمارے لوگوں میں بھی ایک نیا حوصلہ اور سٹاک پیدا ہو گئی۔

جالیوٹر GOLIATH: اہل قرآن متفکری میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہ باطل کا نمائندہ تھا۔ جو حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں جو طاوت کی فوج کے ایک سرکرہ تھے۔ مار گیا۔ (م۔ ی۔ ۱۷)



کشمیر اکارڈ - حکمتِ عملی کی تبدیلی

پاکستان میں صورتِ حال مزید بگڑ گئی اور بنگلہ دیش کے قیام کے لیے صورتِ حال سازگار ہو گئی۔ ادھر اب پھر ہمارے لیے نظرِ مندی اور صلاحِ وطنی کی صعوبت شروع ہو گئی۔ میری چھوٹی لڑکی شادی ہونے والی تھی، ہمارے متعلقہ ہونے والی تھی۔ میں نے حکومت سے درخواست کی کہ مجھے اس میں شمولیت کرنے کی اجازت دی جائے لیکن حکومت تو انسانی جذبات سے عاری ہو گئی تھی۔ کچھ ایسی شرائط اس کے ساتھ ثابت کرائیں کہ میں ہرگز انہیں قبول نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ مجھے دہلی سے اپنی عزیز بیٹی کو ٹیلی فون پر رخصتی کرنا پڑی۔ میرے بچے بچے اس خوشی کے موقع پر اپنے درمیان نہ پا کر تڑپ رہے تھے۔ لیکن میرے سوا چارہ کیا تھا؟ اس میدان کا اسمِ اعظم ہی میرا ہے اور وہ بھی میری بیٹی، یعنی انسان کو ہر مصیبت کو کسی رنج کا احساس کیے بغیر خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرنا پڑتی ہے۔ انا اللہ مع الصابرین۔ اب تیرے صغیر کے حالات اور زیادہ بگڑ گئے تھے۔ مشرقی بنگال میں حکم کھلا خانہ جنگی شروع ہو گئی اور ہندوستان اس میں نرا وہ قوت ہوتا گیا۔ ادھر ہندوستان میں احمد آباد بھونڈی وغیرہ

میں زبردست فسادات ہوئے۔ جن میں مسلمانوں کو بڑا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ خان عبدالغفار خان گاندھی جی کی صدھالہ تقریبات کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے شری پور کے پد کاش نرائن نے ان کے دورے کا انتظام کیا تھا اور وہ گاندھی قانون شکنی کے جہانِ رسے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی بھی گئے اور احمد آباد بھی۔ جہاں انہوں نے ان فسادات کے لیے حکومت کو ذمہ دار ٹھہرا کر حکومتِ ہند کے لیے شرمندگی کا سامان پیدا کر لیا۔

میں بھی تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملاقات کر رہا تھا۔ اپنے وزیرِ دوست کو میں نے جسانی لحاظ سے نوکافی کر دیا۔ لیکن ان کا ذہن خوب چاق و چوبند تھا۔ انہیں کانگریس کی قیادت سے زبردست شکوے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کے نظریات سے ان کی غیر متزلزل وفاداری کے باوجود وقت آنے پر کانگریس رہنماؤں نے انہیں بھیلوں کے حوالے کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس رہنما اصولوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کی پہلی بوسو سمجھتے ہی وہ سارے اصولی آدرش بھول گئے۔ ان میں بڑے وقار نام کو نہ رہی اور اقتدار پانے کے بعد وہ ساری آدرش اور اصول بھول گئے۔

خان عبدالغفار خان کے شاندار ماضی اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے ملک کے عوام میں ان کے لیے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ وہ جہاں جاتے ان کا شاندار استقبال کیا جاتا اور ان کی خدمت میں تحلیاں پیش کی جاتیں۔ دہلی میں بھی انہوں نے ایک عوامی اجتماع سے خطاب کیا۔ انہوں نے ہندوستان میں عوامی زندگی کے گرے ہوئے مہیا اور سیاسیات میں بددیانتی کے اثرات پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں ان کی خدائی خدمت گار تحریک کے طرز پر ایک جماعت

تشکیل دی جائے۔ مجھ کو بھی اس نئی جماعت کے ابتدائی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ میں نے خدائی خدمت گار کے کام کے ساتھ اتفاق تو نہیں کیا لیکن انسانی بلاری کے نام پر ایک جماعت کی تشکیل دے دی گئی۔ شری ہے پر کاش نرائن اس کے صدر اور میں اس کا نائب صدر منتخب ہوا۔ اس تحریک کی شروعات بہت اچھی ہوئی اور اس کے ساتھ عوام کی بہت سی توقعات وابستہ ہو گئیں۔ خیال کیا جانے لگا کہ یہ ہندوستان سے فرقہ پرستی کے ہم قائل کو دور کرنے کے لیے کافی مدد و معاون ہوگی۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بھی جھگڑا پیش کے بحران کی نذر ہو گئی۔ ہے پر کاش نرائن نے خلافت معمول اس کے کام کو غلط سمتوں میں وسعت پذیر کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس دراز دستی کی تاب نہ لا کر روشنی کی یہ کرن بکھلا کر رہ گئی۔ اُنہی دنوں مجھے شری نرائن کے اُس بیان سے بھی بڑا اچھا ہوا جب انھوں نے احمد آباد کے انسانیت سوز فسادات کی ذمہ داری یہ کہہ کر اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں پر ڈال دی کہ وہی ان میں پہل کرتے ہیں۔ ایک اقلیت جو اپنی جان کے لیے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے لڑ رہی ہو کیسے خود اپنی تباہی کے لیے پہل کر سکتی ہے۔ اُس کا شری نرائن نے کوئی خیال نہیں کیا اور نہ اس حقیقت کا کہ ان ننگ انسانیت فسادات میں جانی اور مالی نقصانات کا اوسط اور تناسب کون سی کہاٹی زبان حال سے بیان کرتا ہے۔ کیا شری نرائن سیاست میں الگ تھلک رہنے کے بعد اب مقبولیت کے لیے گھبرائیوں کی طرف دیکھ رہے تھے؟

بادشاہِ خان کچھ دیر ہندوستان میں رہنے کے بعد واپس کاہل جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ جو رومات ان کو پیش کی گئی تھیں اُن کی مائیت چالیں لاکھ کے لگ بھگ تھیں۔ یہ عرصہ قلندر نے رقم تو اپنے ساتھ لے گیا اور اُس کو زرمبادلہ میں تبدیل کر لیا۔ البتہ اپنے جلسوں میں اُس نے ہندوستانی لیڈروں کو خوب کوسا کر وہ آزادی کے اتنے

برس گزر جانے کے بعد بھی فرقہ واریت کے زہر کو نہیں مٹا سکے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے کو میں نے ہمیشہ ایک نہایت ہی سنگین معاملہ گردانا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس میں معصوم بے گناہ اور قبیح جانوں کا آگاہ ہوتا ہے۔ باجیا اور پاک دامن بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے۔ جائیداد اور اقتقا دی امانتوں کو غارت کیا جاتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں تعصب، نفرت اور تنگ نظری کا کینسر موجود ہے۔ اس لیے میں نے ہمیشہ اس زہر کے سانپ کا سر کچلنے میں کبھی درودِ علایت سے کام نہیں لیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر میں تحریک کا آغاز ہوا تو اُس وقت اس کا باہری خول مسلمانوں کی مظلومیت کی ترجمانی تھا۔ لیکن ہم نے اُس وقت بھی فرقہ وارانہ اشتی کے بڑے تقاضوں کو دھوکا نہیں کیا۔ اسلام میں گائے کا بھی ذبیحہ جائز ہے اور اُس وقت سارے برطانوی ہند میں اس پر کوئی قانونی پابندی عائد نہ تھی۔ لیکن میں نے اپنے چند انتہا پسندوں کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے ہم مذہبوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ ہمیں اپنے غیر مسلم بھائیوں کے لیے غیر لگائی کے جذبے کے طور پر اس فریضے پر پابندی بٹانے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ یہ صورت آج بھی قائم ہے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اس فریضے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود کسی بھی حکومت نے اس صورت کو نہیں بدلا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس اشتی اور خیر لگائی کی جڑیں کشمیر کی عظیم روایات میں بہت گہری جلی گئی ہیں۔ اُن کے علاوہ ہم اس سوال پر مثال خود اپنے گھر سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں ہم نے کشمیر میں جتنے کشمیری پنڈتوں اور دوسرے غیر مسلم بھائیوں کی حفاظت کو اولین اہمیت دی اور ان کا بال بیکانہ ہونے دیا۔ ۱۹۴۹ء کے بعد جبکہ میں اقتدار سے بہت

دور غلاب کی سختیاں سہہ رہا تھا میں نے وقت و قدر دارانہ اتحاد کے لیے اپنی متعدد بحیرہ کوشش کی۔ جب کشمیر میں مسئلہ میں "ہمک آف ناچ" اور دوسرے واقعات کی بارگشت میں شہ پسندوں نے فرقہ وارانہ منافرت کے لادو کو بھڑکانا چاہا تو واقعات گواہ ہیں کہ میں نے اپنا سارا اثر و سوجھ بوجھ استعمال کر کے اس دھارے کا منہ موڑ دیا۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے شعلوں کو مہا گنا گدھی نے اپنے مصلحتی خون سے ٹھوڑی دیر کے لیے بھادیا لیکن یہ سات سروں والا اثر و ہا بار بار اپنا سہہ لٹکا رہا ہے اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اس نے ہمیشہ میرے سکون و اطمینان کے خرم میں آگ لگائی ہے۔ نفرت کا بیو یا نفرت اور نصیحت کے سوا اور کچھ پیدا نہیں کر سکتا اور انسان کا یہ ایک ابتدائی مرض ہے کہ وہ حیرانیت کو روکے۔ لیکن کشمیری ہونے کے ناطے ہمارا رقص اس سلسلے میں بڑا ہی تیز ہوتا ہے۔ جس کو شاید کشمیر سے باہر پورے طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔ کشمیر میں ہندوستان اور ہم صرت زمین کی خالی نہیں ٹرے ہیں۔ یہ دوسری سیاسی اقتدار اور دور و روحانی رقبوں کے درمیان کشمکش ہے کشمیر سیکولرزم کی لیبارٹری اور ہندوستان کے اس طے بطن معاشرے اور تمدن کی علامت بھی ہے اور میدان جنگ بھی۔ جو رنگ رنگ کے بھجوں سے ایک خوبصورت گلدستے کی طرح پرویا گیا ہے اس گلدستے میں دراوڑی نسل کے خیالات بھی ہیں۔ اس میں آریاؤں کی روحانی پہلست بھی ہے۔ اس میں عرب کا سوز بھی ہے۔ اس میں غم کا ساز بھی ہے۔ اس میں ویاڈی زبان کے مغرب کی روشن خیالی بھی ہے۔ اور اس میں باطنی گڑبڑ مشرق کی روحانیت کا جلوہ بھی۔ اگر اس شیرازے کا ایک موتی بھی گر گیا تو یہ ماری لالے کار ہو کر رہ جاتے۔ یہ ہم نے اپنی طوط سے دی وجہ کی بازی لگا کر مسلم اکثریت کے کشمیر کو دو قومی نظریے کے چبڑوں سے نکال کر سیکولر ہندوستان کے گلدستے کا گل

سر سپہ بنادیا۔ لیکن اگر نفرت کی آگنی جتنی ہی رہے تو یہ سارا گلدستہ ٹھیکس کے رہ جائے گا۔ جو سیکولر لازم اور اس کی صلاحت کشمیر کی موت بھی ہوگی۔

نفرت کا یہ بیو یا کشمیر تدر خطہ کا ہے اس کا اندازہ دو قومی نظریے کے سب سے بڑے علمبردار محمد علی جناح کو بھی تھا۔ چنانچہ جب پاکستان وجود میں آیا تو دوسرے ہی دن انھوں نے اعلان کیا کہ پاکستان میں غیر مسلم اور مسلم کی کوئی تفریق نہ ہوگی۔ کیونکہ ہم سب سے پہلے پاکستانی ہیں اور بعد میں کچھ اور۔ لہذا ہم سب کے گٹھ جوڑ صاحب کو یہ اعتراض حق اس احساس نے گرا دیا کہ باہمی نفرت کسی قوم کی تعمیر کی اساس نہیں بن سکتی۔ اس کے علاوہ مغرب کی آزاد خیالی کی جس اہرے ان کا غیر بننا تھا۔ وہ اب اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان کو صحیح راستہ دکھا رہی تھی۔

ہندوستان جب ہمارے ورثے میں آیا تو یہ صرت کسی خاص نسل یا مذہب کی آماج گاہ نہ تھا۔ اس کی آزادی کے لیے اگر جماعت سنگھ سے خون بہایا تو راج گرو نے بھی جان کی قربانی دی اور اسی طرح اشفاق اللہ بیہ سے ہزاروں مسلمان مجاہدوں نے بھی گردنیں کٹوائیں۔ ہندوستان کی آزادی کے جرنیلوں میں بہادر شاہ ظفر، جرنیل نجف خان مولانا فضل الحق خیر آبادی، بدر الدین قلیب جی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، علی برادران اور مسلمانوں کے عظیم دینی پیشوا شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا انور شاہ کشمیری مولانا عبدالحق سندھی، مولانا حسین احمد مدنی اور کتنے ہی مشاہیر کی آؤ سحر گاہی اور فرقہ بانوں کا نم موجود ہے۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں سے خطا نہیں سرزد ہونے کا امکان موجود ہے لیکن ان پر پہل کا الزام لگاتے سے پہلے ان کی نفسیات کا صحیح سماجی اور سیاسی تناظر میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں پہل چاہے کوئی بھی کرے۔ یہ کوئی اچانک اور بے ربط معاملہ نہیں ہوتا

پہل محض دیاسلانی کی ایک تہی کا کام کرتی ہے۔ اُس کے لیے مواد برسوں پہنیں تو ہمیں
سے جمع ہوتا رہتا ہے اور اسی جمع شدہ مواد میں شکست خوردگی، مایوسی اور افسردگی کا
روح احمد آباد جیسے فسادات کے شعلے پھڑکا رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان ہمارے
ملک میں اقلیت میں ہیں۔ اگر اُس کی مخالف سمت سے کوئی پہل ہوتی ہے تو اسے خاموش
رہنے کے مواء چارہ نہیں۔ کیونکہ اکثریت کی پہل سے آنکھ چرا نا خود اُس کے مفاد میں ہے۔
البتہ اگر کہیں اس کی طرف سے تحریروں کی خطا ہوئی تو ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ یہ
سوچنا ہے محل نہ ہو گا کہ کیا مسلمان پر کسی احساس مرگ : DEATH WISH نے اپنا
تعرّف جمایا ہے جو وہ پہل کر کے اپنی اجتماعی خودکشی کا سامان فراہم کرے اس سلسلے
میں فسادات کے ہلاک شدگان کے اعداد و شمار بہت سے حقائق سے پردہ اٹھا
سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ سارے جانداروں کی فحاصلت یہ ہے کہ وہ اُس وقت تھکرتے
یا جھپٹ پڑتے ہیں جب انہیں اپنی جان کا خوف ہو۔ نفسیاتی اعتبار سے ہر خوف زدہ
آدمی ایک امر کا تابع ہو سکتا ہے۔ اگر اُس کے احساس جرم کو گند کرنا مقصود ہو تو
اُس کو خوف کی نفسیات سے نجات دلانی چاہیے۔ خوف کے زیر اثر ابن آدم انسانیت
کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آتا ہے۔ جس طرح وحشی جانور خوف کے زیر اثر اوسان
کھو کر چل کر پھرتے ہیں پہل کرتے ہیں اُسی طرح انسان خوف کے اندھیار سے میں عقل و
خرد کی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ انہیں 'سماجی'، 'سیاسی'
اقتصادی اور ثقافتی سطح پر تحفظ اور مساوات کا یقین دلایا جائے۔ ایسا کرنے سے
حیرت انہی کی نفسیاتی صحت بھال دی ہوگی بلکہ سارے ہندوستان کی ذہنی و روحانی
اور جسمانی نشانی کی کسان پیدا ہو جائیں گے۔

بلکہ دلش کا بحران شدید ہوتا گیا اور اس کے نتیجے میں ملٹ میں ہند اور
پاکستان کی جنگ چھڑ گئی اور نزلہ برقعہ ضعیف کے مترادف کشمیر میں پھر جنگ کے
شعلے پھلک اٹھے۔ لیکن اب کی بار پاکستان کو میدان میں واضح طور پر شکست ہوئی۔
بجلی خاں کا پست گٹ گیا اور مشرک بھٹو ایک دیکھ خوردہ اور لوسے گٹلوسے پاکستان
کے صدر بن گئے۔ کشمیر کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق ایک لمبی بیماری کے بعد
بچدی گلوہ کے بڑے ہسپتال میں انتقال کر گئے اور سید سیرت قاسم کے ہاتھوں میں اقتدار
سوئپ دیا گیا۔ شملہ میں مسز اندرا گاندھی اور مشرک بھٹو کے درمیان ملاقات ہوئی اُس میں
مازونیاز بھی ہوئے جس کے نتیجے میں پاکستان کو بلکہ دلش میں قیدی بنائے گئے تو سہ
ہزار فوجی واپس کیے گئے۔ آزاد کشمیر کے کچھ علاقوں پر بھی ہند نے قبضہ کر لیا تھا۔ ان کو
واپس لوٹا دیا گیا اور طے پایا کہ وہ اس سوال پر آئندہ بھی باہمی گفت و شنید کریں گے۔
اسی دوران کشمیر میں اسمبلی کے انتخابات منعقد کرنے کا وقت آیا۔ ہماری جماعت کے پر
اس لیے کاٹ دیے گئے تھے کہ وہ عوامی انتخابات میں حصہ لے کر جمہوری ذریعہ سے
اقتدار پر قبضہ کر کے ہندوستان کی شبلی دکرائے۔ چنانچہ ہمارے جماعتی طور پر انتخابات
میں حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ اب کے خواجہ محمد الدین قزوا اور کچھ دوسرے
ساتھیوں نے ہماری حمایت سے انتخاب لڑنے کے لیے ہاتھ پیر مارا۔ شروع کیے بعضی غلام
کو جس طرح ہم نے شکست فاش دی تھی اُس سے اُن لوگوں کے مڑھ جائے ہوئے
خوٹے پھر جوان ہو گئے تھے اور اب سیاسی مطلق پر محمد الدین صاحب کے قریب دلاور
مولوی مسعودی کے دوست صادق صاحب بھی ذریعہ بن گئے۔ لہذا انہوں نے انتخابی
جنگ لڑنے کے لیے قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ خواجہ محمد الدین قزوا اور خواجہ تھاکر شملہ
تو دہلی بھی آئے اور ہم سے بات چیت بھی کی لیکن واپس لوٹتے ہی انہیں مولانا مسعودی

اور کسی ایسے سیاسی کارکن کو میں میں بھروایا گیا جس پر زرا بھی شبہ نہ ہو اور انتخابات کے اس قریب میں حکمران جماعت کے لیے کسی قسم کی شکل پیدا کر کے لگا یعنی غلام محمد کی شکست کے تجربے نے حکمرانوں کو ہراساں کر دیا تھا چنانچہ انھوں نے کسی قسم کی "واردات" کے لیے گنجائش ختم کرنے کے لیے اب کی بار بیگم صاحبہ کی کشمیر واپسی پر بھی پابندی کا حکم صادر کر دیا اور محاذ رائے شماری کو خلافت قانون جماعت قرار دیا گیا۔ اس کے وفادار پر تائے چڑھا دیئے گئے اور کارکنوں کی پکڑا وھلکا بھی کی گئی۔ البتہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کشمیر میں جماعت اسلامی کے کچھ ممبران کو حکمران جماعت کے ساتھ مفاہمت سے بدولت اسمبلی میں پہنچنے کی اجازت دی گئی۔ اسمبلی انتخابات طے پا گئے تو ہندوستان کے لیڈروں اور ان کے کشمیری حاشیہ نشینوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہندوستان میں میرے بہت سے ہمرد دوست بھی تھے۔ ان کی طرف سے مجھ پر دباؤ بڑھتا گیا کہ ماضی کی تھیں کو بھول کر پھر سے توحی وھارے میں شامل ہو جاؤں۔ دوسری طرف جنوں و کشمیر کا نظم و نسق بھی بگڑتا جا رہا تھا۔ اور قریب یہاں تک پہنچ گئی کہ ریاست کے نئے وزیراعلیٰ سید میر قاسم نے کئی عام تعریبات میں بر ملا رد کہا کہ صرف شیخ محمد عبداللہ ریاست کی بگڑتی ہوئی حالت کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔

میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے کہا کہ میرا ہندوستان کے ساتھ رفاہی کی واقعیت ہر اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اہماتی کی حدود پر ضرورت ان کے اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے۔ ہم نے مسئلہ میں اہماتی کی حدود طے کر کے آئے آپس میں معاملات کی رو سے جس طرح دفعہ و نشہ کی شکل میں طے کیا تھا۔ ہندوستانی رشتہاؤں نے زبردستی اور غیر آئینی طور پر اس کو مانی کرتے ہوئے تسخیر کر لیا ہے۔ یہی امر ہمارے راستے جملہ ہونے کی بنیاد بنا دیا اگر ان حدود کو پھر سے بحال کیا جائے تو ہمارے آپس اختلافات

رفع ہو سکتے ہیں۔ ان بنیادوں پر اگر وزیراعظم مسز اندرا گاندھی مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں تو میں اپنی طرف سے رضامند ہوں۔ چنانچہ وزیراعظم نے اس سلسلے میں پہلی کی۔ انھوں نے اپنے سیکرٹری بی۔ این۔ ہاکس کو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ بھیجا جہاں میں ان دنوں زیر علاج تھا۔ ملاقات کا وقت طے ہوا اور میں انسٹی ٹیوٹ سے وزیراعظم سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ انھوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ کشمیر کے معاملات پر گفتگو ہوئی مسز گاندھی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ "شیخ صاحب! جو کچھ بھی ہو اسے ہاس کو بھول جائے کی ضرورت ہے۔ ہم پھر ایک نیا باب شروع کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا کہ "اگر آپ کا ارادہ ہے تو میں آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھام لینے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میں نے جو کچھ بھی سہارا برداشت کیا ہے وہ ایک مقصد کے حصول کے لیے تھا۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں اور اگر ہم اب بھی ایک صحیح سمت کی طرف گامزن ہو سکیں تو اس سے زیادہ خوش آئند بات اور کونسی ہو سکتی ہے۔"

اس تمام گفتگو کے نتیجے میں صورت حال میں بہتری پیدا ہونے لگی۔ مسز گاندھی کے ساتھ طے ہوا کہ معاملات کا جائزہ لینے اور اُنہیں سلجھانے کی تہا وزیراعظم اور میں کی جائیں۔ اس دوران محاذ رائے شماری پر سے پابندی ہٹائی جا چکی تھی بیگم صاحبہ اور بیگم صاحبہ کو بھی کشمیر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ مجھے ۵ جون مسئلہ کو رہا کیا گیا۔ مسز گاندھی کے ساتھ میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۹ جون کو میں کشمیر آیا۔ یہاں میرا بھر جھٹ بھرا استقبال کیا گیا اور ضروری باغ میں حسب دستور ایک عظیم اجتماع میں مجھے سپاس ادا پیش کیا گیا۔ میں نے جلسے میں لوگوں کو بتایا کہ "شری مینی اندرا گاندھی کے ساتھ میری جو ملاقات ہوئی ہے اس میں ہم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہم کشمیر اور ہندوستان کے تعلقات میں ماضی کی کمپلیوں کو بھول کر ایک نیا باب شروع کریں گے۔"

اور یہ کوشش کی جائے گی کہ جو غلط فیماں پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے ایک باعزت راستہ تلاش کیا جائے۔ کچھ لوگ پاکستان کے اس مسئلے کا فرقی ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا پاکستان نے اپنے وکیل ہونے کا وکالت نامہ یہاں کس کو دیا ہے۔ اگر پاکستان میں طاقت اور جہت ہے تو وہ اپنی یہ پوزیشن منوا سکتا ہے میری اپنی قوم سے یہی درخواست ہے کہ وہ اپنی نجاست کے لیے پاکستان یا چین یا کسی اور ملک کی طرف نہ دیکھیں۔ ہمیں خود اپنی تقدیر کی آکھیں سلجھانا ہوگی۔ یہ ملک ہمارا ہے اور اس کے فیصلے صرف ہم کر سکتے ہیں۔ میں نے اس صلے میں مرزا افضل بیگ کو اپنی طرف سے وزیراعظم ہند کے نمائندے جی پارٹھاساراسھی سے مذاکرات کے لیے نامزد کر دیا۔ پارٹھاساراسھی جواہر لال نہرو ریونیورسٹی دہلی کے سابق وائس چانسلر اور کشمیر کے ایک سابق وزیراعظم گوپالا سوامی آئسٹنگر کے صاحبزادے ہیں۔ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ اور فراخ فہم دانشور ہیں۔ اور ہمیں محسوس ہوا کہ وہ کشمیر کے مسئلے پر تعصب کی عینک چڑھا کر بات کرنے پر حاضر نہیں کریں گے۔

ہم نے اپنی لڑائی کو چھوڑ دیا اور اسے ایک کانفرنس کی میز پر منتقل کر دی تھی۔ یہ مقاصد کی باتیں نہیں بلکہ ملکیت مل کی تبدیلی تھی۔ یہ مذاکرات بھی بڑے مہر آزمائے ہوئے برس با برس کی پڑی ہوئی گڑبوں کی عقدہ کشائی کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن دونوں نمائندوں نے کافی عرصہ ریزی سے کام لیا۔ اس دوران میری ہندوستان کی وزیراعظم اور دوسرے لیڈروں سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا نقطہ نظر بہتر طور پر سمجھا جانے لگا۔ مجھے صوفیہ اس بات کی تلاش تھی کہ وزیراعظم اسٹیٹ ٹوڈر کریں لیجے اور محبت مندر طریقے پر ریاست میں جمہوری فضا تعمیر کرنے سے گریز نہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ اس مرحلے پر انتخابات سے کچھ لوگوں کو گٹھ سے

مردے اکٹھا کرنے اور اعتماد کی فضا کو مکدر کرنے کا موقع ملے گا۔ بہر کیف، فردی حشر میں یہ مذاکرات ایک انجام کو پہنچے اور دونوں نمائندوں نے اپنے سربراہوں (PRINCIPALES) کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس پر میں اور مسز اندرا گاندھی دہلی میں ملے۔ اور ہمارے درمیان اس مفاہمت کا اعلان ہوا جسے ”کشمیر مفاہمت (کارڈ)“ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کشمیر میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ ▲▲▲

.... وہ اپنی ٹونہ بدلیں گے

۲۳ فروری ۱۹۷۹ء کو میں دہلی سے ٹرن کے ذریعے جیوں ہینیا تو سٹیشن پر علوم کا ایک بڑا جمہور استقبال کے لیے موجود تھا۔ دنیا میں ایک نئی تبدیلی کے آثار تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ نخلت کی لمبی رات کا خاتمہ ہو رہا ہے اور آفتاب پر ایک نئی صبح کی گہری روشن ہو رہی ہیں۔ لیکن میرا وطن مستقبل کے اندیشوں میں کھویا ہوا تھا۔ اگست ۱۹۷۷ء کی رات کی تاریکی میں شب خون مارا گیا تھا اس کے اثرات نے ساری ریاست میں اغلاقی فحشاء کے سے حالات پیدا کر دیئے تھے اور اس کا اثر سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے سرچشموں کو بھی نہ ہر اکود نہ رہا تھا۔ بائیس سال کی کمین مانیوں کے بعد یہ حالت پیدا کرنے والے خود را و فرار اختیار کر رہے تھے اور ہمارے کنزروں پر اس کے انسداد و علاج کی حوصلہ آزما ذمہ داریاں ڈال رہے تھے۔ پھر میں خود پہلے کی طرح نہ جمان تھا اور نہ میری صحت و لمبی رہی تھی۔ لیکن کفر کی تقدیر پر ہر احماد اب بھی غیر متزلزل تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید قدرت نے مجھے ان گھن آرائشیوں میں ڈال کر بھی اس لیے محفوظ رکھا تھا کہ میں اس نازک مرحلے پر

اپنی قوم کے کام آجاؤں۔ اس تصور سے مجھے ڈھارس ملی اور میں نے خود اعتمادی کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو نئے فزع کی انجام دہی میں جھونک دیا۔

تو میں میں یہ اقیام سرکاری مہمان خانے میں رہا جو مہاراجہ کے وقت میں ایک پرفضا بارگ میں تعمیر کیا گیا ہے اور جو اس خاص جیل سے معمولی مسافت پر واقع ہے جہاں مجھ پر کثیر سازش کیس کا مقدمہ چلایا تھا۔ اسی دن سپریم کورٹ کے جج دیوٹر کی عارت میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کی ایک خاص نشست ہوئی۔ جس میں مجھے اتفاق رائے سے پارلیمانی پارٹی کا نائبین لیا گیا۔ اس نشست میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر دیا کانت برہا بھی موجود تھے۔ میرا نام سکندرشوہنے داسے وزیر اعلیٰ سید مہر قاسم نے پیش کیا اور اس کا بظاہر گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن مجھے صورت حال کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر کرن سنگھ کی موجودگی بھی ایک عجیب رنگ مہنوق کی اہمیت کی طوط اشارہ کر رہی تھی۔ وگت ۱۹۷۹ء کو جب مجھے وزارت اعلیٰ سے خیراتی طور پر الگ کر دیا تھا تو انہی کے دستخطوں کا حکم نامہ میرے ہاتھ میں تھا دیا تھا اور اب وہی ہاتھ میرے گلے میں خیر داری قبول کرے پر پھرتوں کے بار ڈال رہے تھے۔ میں نے کثیر اکلہ کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات کے دوران وزیر اعلیٰ مسز اندا گاندھی سے کہا تھا کہ اگر کشمیر کے متعلق واقعی ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے تو اسلئے کے سننے اور بالکل آزادانہ انتخابات منعقد کیے جانے چاہئیں۔ اس طرح عوام ایک جمہوری عمل کے تحت اپنی پسند کے نمائندے چنیں گے اور ہر طبقہ خیال کو اقلہ کی آزادی نصیب ہوگی۔ میں سمجھتا تھا کہ ۱۹۷۹ء میں عوامی اعتماد کی جس امانت پر ایک سازش کے تحت ڈاکر ڈالا گیا تھا۔ اس کو پورے جواب و انصرام کے ساتھ علوم کو واپس لوٹا دیا جائے تاکہ جمہوری عمل اور جمہوری اداروں پر ان کا کھویا ہوا اعتماد

پھر بحال ہو جائے۔ انہیں عام انتخابات ریاست کے مرہضانہ سیاسی ڈھانچے کی نشانی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھیں گے۔ لیکن وزیر اعظم نے اس مشورہ کو قبول کرنے میں تامل سے کام لیا۔ انہوں نے کہا کہ فی الحال کانگریس پارلیمانی پارٹی ٹھوکر قائدین سے لگی اور بڑی پالیسیوں، پروگراموں اور فیصلوں میں کسی قسم کا رخ پیدائے نہ کرے گی۔ ان کا رویہ، اپنی اسٹیبل کے بارے میں کچھ ایسا تھا کہ مجھے مقررہ میر کا یہ ستر لکھ لایف ٹائم شیڈول اتنا خاصہ آئندہ صوبہ صوبہ کریں جنگ ہو چکی

اسے زبان دراز تو سب کچھ بولے گئے

میری سادہ لوحی ملاحظہ ہو کہ میں نے اس جھوٹی قسم پر اعتبار کر لیا اور اپنے گزشتہ تجربے کو پس پشت ڈال کر غلط فہمی کے ساتھ اشتراک پر آمادہ ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد مجھے اس غلطی کی تلخی کا از سر نو اندازہ ہونے والا تھا۔

میں نے لیدر بننے جانے کے بعد اپنی حقیر ترقی پر یہ کہا کہ دہلی اکارڈ کو میں اس اعتماد کی کمال سے تعبیر کرتا ہوں جس میں مسلم لیگ بال آگیا تھا اور میرے دہلی کوئی تعلقی موجود نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ تحریک اور تاریخ کی جڑیں میری جڑیں ہیں۔ یہاں پر پیدا ہونا اور پھر ملنا کوئی افواہی باتیں نہیں ہیں۔ میرے ساتھ میرے ساتھیوں نے جو معاملہ کیا وہ اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے اور اس کی کیفیت و کم پر فیصلہ صادر کرنا میں مؤرخ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ میں اپنی نئی ذمہ داری پورے غلوں کی بنیاد پر سنبھال رہا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ دوسری جانب سے بھی وشواس گھٹا کی تاریخ دہسرائی نہ جائے گی۔

اس روز پارلیمنٹ میں کثیر اکارڈ کی دستاویزات پیش کی گئیں اور ایوان کے ہر طبقے نے اسے ایک بہت اہم کارنامہ قرار دیا۔ مسز اندرا گاندھی نے شبلی فون پر مجھے

اکارڈ کی توثیق کی خبر سنائی اور مبارکباد دی۔ لیکن رات کو آل انڈیا ریڈیو نے اپنی روایات کے عین مطابق اس اکارڈ کو کچھ ایسے کپڑے پہنے سے پیش کیا جیسے کانگریس پارٹی نے کوئی بڑا قلعہ فتح کیا ہو اور جیسے مرکزی حکومت نے اپنی طرف سے کوئی اقرار نہیں کیا تھا۔ میرا مانتا تھا کہ اگر ابتدائے عشق میں ہی ایسی اعتماد شکنی سے کام لیا گیا ہے تو آگے کیا کچھ پیش آئے گا۔ دوسرے دن صبح کو دہلی ریڈیو نے اپنی چالک دھمکی کو ٹکڑ کر دیا۔ اور میرے اندیشوں کو کچھ اور تقویت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ جب ملک نئی دہلی سے اس طرح ملے کے بارے میں دریافت نہ کیا جائے۔ میرے حلف لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرے دن صبح میں ایک بار نون تقریب کے انتظامات مکمل کیے جا چکے تھے اور حلف لینے کے لیے دس بجے صبح کی ساعت مقرر کی گئی تھی۔ کسی طرح سے میری سوچ کی بھینک سید میر تقی میر اور کچھ اور اصحاب کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ میرے پاس چلے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر سب انڈیا بے اعتمادی سے کی جاتی ہے تو میں اقتدار سے دور اپنے غرقہ فقر میں ہی ٹھیک ہوں۔ تاہم صاحب نے ریڈیو کی شرارت آمیز کوبائی کو تسلیم کر لیا اور کہا کہ نیچے کی سطح پر بھی اس کے رد و نما ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ لیکن اس کی سزا ریاست کے عوام اور ان کے خیر خواہوں کو نہیں دی جانی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس معاملے کی طرف وزیر اعظم کی توجہ مبذول کرائیں گے۔ کچھ اور فیصلوں نے بھی اسی قسم کی دلیل پیش کی اور میں مقررہ وقت سے کوئی پونا گھنٹہ دیر سے راج بھون پہنچا۔ جہاں گورنر مشرقی کشمیر گھنٹہ گھنٹہ جہانے مجھے وزارت کا حلف دلوا دیا۔ میرے ساتھ ڈرا محمد افضل بیگ، محکمہ راج کی داس اور موتمن قریب نے بھی کابینہ کے وزیروں کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ کشمیری عیب بات تھی کہ ان میں سے کوئی بھی کانگریس پارٹی سے تعلق نہ رکھتا تھا اور نہ ریاستی قانون ساز یہ کارکن تھا۔ میرے خیال میں یہ پارلیمانی جمہوریت

کی تاریخ میں ایک انوکھی مثال تھی کہ قانون ساز کے دو ایوان موجود ہوں اور ان سے کامینہ کا کوئی ممبر متعلق نہ ہو۔ بیک صاحب تو میرے دیرینہ ساتھی تھے ہی۔ وراگت کو انھیں میرے ہی ساتھ گزینا کر لیا گیا تھا۔ جبکہ وہ میری کامینہ میں شہرہ مال تھے اور اب وہ پھر میرے ساتھ اپنا منصب حاصل کر رہے تھے۔ ٹھاکر دیوی داس اور اور صونم نرپور نہ گائیس سے وابستہ تھے اور نہ ہماری جماعت مجاڑا کے شکاری سے ان کو میں نے اس لیے اپنی ٹیم میں شامل کر لیا تاکہ اس کے کسی رکن کی شہرت پر کوئی انگشت نہ مٹائی نہ کر سکے اور نہ اس کا سہارا کے بعد ہونے والی بے راہ روی سے کوئی داس بڑا ہو۔ اس کے علاوہ ٹیم کے ارکان کی ذاتی خوبیاں اور لیاقت بھی منسلک ہوں اور دو حتمی تصفیات کی چھوٹ چھات سے بھی پاک ہوں۔ تاکہ وہ ریاست کی اخلاقی اور سیاسی تعمیر نو کے سلسلے میں میرے خوابوں کے خاکوں میں رنگ بھر سکیں۔ ٹھاکر دیوی داس جنوں کے ایک اچھے وکیل رہ چکے تھے اور اس وقت اپنی کورٹ کے جج تھے جن جنوں سے کسی نیک نام قابل آدمی کو جس کا دامن و افکار نہ ہو، اپنی کامینہ میں لینا چاہتا تھا۔ میں نے بہت سے دوستوں سے رائے لی تو برگیس ڈیر گھنڈا آسنگھ اور ٹھاکر دیوی داس کے نام ابھرنے لگے۔ بیک صاحب کو میں جانتا تھا لیکن وہ اب عمری اس منزل میں تھے جہاں ان سے اس حوصلہ آرا کام میں ہاتھ بٹانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ٹھاکر دیوی داس کا نام تو میں سن چکا تھا۔ لیکن ان کو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کی ذہانت اور لیاقت کی تعریفیں ٹھیک ٹھیک پہنچیں تو میں نے ان کو سند لے بھیجا کہ اگر وہ اپنے لوگوں کی خدمت کے نیک کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہیں تو انھیں اپنا اکرام وہ منصب چھوڑ دینا ہو گا۔ انھوں نے خوش خوشی میری پیشکش منظور کر لی۔ پھر جب عدالت عالیہ میں ان کے رفقاء انھیں واداعیہ دے

رہے تھے تو مجھے بھی اس تقریب میں بلا لیا گیا۔ میرے ساتھ ہی بیک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ میں اس سے قبل نہ ٹھاکر دیوی داس سے ملا تھا اور نہ ان کو پہچانتا تھا اس لیے میں نے بیک صاحب سے دھیمنے لیجے میں پوچھا کہ ٹھاکر دیوی داس کون صاحب ہیں؟ پھر انھوں نے مجھے ٹھاکر صاحب کی شکل دکھادی اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ موصوف نرپور لداخ کے باشندے تھے اور ریاست کی انجینئرنگ مروس میں کافی مدت تک خدمات انجام دینے کے بعد ابھی شہرت حاصل کر کے سکند و مشن ہو چکے تھے اور اکارڈ کے وقت ہندوستان کی طرف سے بیرونی منگولیا میں سفیر کی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ انھوں نے میری دعوت پر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنا اعلیٰ منصب ترک کر دیا اور ہمارے قافلے میں شامل ہو گئے۔ مجھے اس سلسلے میں وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے بھی درخواست کرنا پڑی کہ وہ نرپور صاحب کو سفارتی تھمڈے سے سکند و مشن کروں جو انھوں نے بلا تامل قبول کر لی۔

حلف اٹھالیئے کے بعد ہم کو جلوس کی صورت میں جموں کے سیکرٹریٹ تک پہنچایا گیا جہاں ایک عوامی جلسے سے خطاب کرنے کے بعد میں نے نئی کامینہ کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اولین میٹنگ میں ہی ہم نے سیاسی بے راہ روی اور انتظامی اخراج تفریق کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ پُر خطر مگر برکت مندانہ اقدامات اٹھائیے کا اصول طے کیا۔ انتظامیہ کا سارا اہل اہل ڈھانچہ نئی تبدیلی سے غافل تھا۔ اور ہمیں اپنے اقدامات کی عمل آوری کے سلسلے میں چھوٹک چھوٹک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس لیے ہم نے چند دنوں تک انتظامیہ کے مسائل کی تقصیص اور ان کے انسداد کے لیے موزوں اور کارگر اقدامات سوچنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا۔ میں نے اسی روز کوئی بائیس برس کے بعد ریڈیو سے ریاستی باشندوں کے نام اپنی ایک نشری تقریر میں منظم طے

کی ذمہ داریوں اور اس کی کیفیت کے بارے میں کہا،

”اکتیس سال کے طویل وقفے کے بعد میں آج ایک اور بار باسٹی انتظامیہ کی ذمہ داریاں سنبھال رہا ہوں۔ اس دوران مجھ پر میرے ساتھیوں پر اور آپ پر کیا گزری اس سے سبھی واقف ہیں اور میں یہ شکایت دہرا کر آپ کی سمجھ خواہی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔ میں اس مرحلے پر ان واقعات و شخصیات پر بھی کوئی فیصلہ صادر کرنے سے احتراز کروں گا۔ جو اگست ۱۹۷۹ء میں میری گرفتاری اور اس کے بعد رونما ہونے والے حالات کے ذمہ دار تھے۔ میں یہ فیصلہ مستقبل کے مورخ اور آنے والی نسلوں پر چھوڑتا ہوں کہ وہی اس بارے میں بے لاگ اور غیر جانب دارانہ رائے دیتے کے اہل ہو سکتے ہیں۔۔۔ میری ساری زندگی چند بنیادی قدروں کے تحفظ اور اپنے جموطنوں کی عزت و آبرو کے لیے وقف ہے اور مجھے یہ کہنے میں تاق نہیں کہ ایک اسی سال پہلے اقتدار کو ٹھکرا کر آج اکیس سال بعد زمام اقتدار سنبھالنا میری دیکھا ہوا نہیں انہیں قدروں کے تحفظ اور مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے گذشتہ میں بائیس برسوں کی بدانتظامی اور بے راہ روی سے پیدا شدہ صورت حال کے تصور نے مجھے بہت دنوں تک اس کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا کہ آیا مجھے ان حالات میں وزارت کی ذمہ داریاں سنبھالنا چاہئیں یا نہیں۔ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ میں ایک اتفاقاً پیدا ہونے والا دوسروں کی غلطیوں پر حرف نہ بولتا اور جب لوٹنی، احساسِ فحش اور دیانتداری کا تقاضا تھا کہ ذاتی معافیت اور مصلحت کی سطح سے بلند ہو کر بڑی ہونے صورت حال کو مدبّر بنانے سے روکنے اور غریب عوام کے زخموں پر

مرہم رکھنے کے لیے مجھے حالات کی سنگینی اور مسائل کی پرواہ کیے بغیر آگے آنا چاہیے۔ ایک قرار کا راستہ تھا اور دوسرا پیش قدمی کا اور ماضی گواہ ہے کہ میں نے ناسا عدالتوں سے گھبرا کر کبھی قرار کا راستہ اختیار نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی میں نے انتہائی ناسا عدالتوں پر عہدہ ترین صورت حال میں نئی ذمہ داریاں سنبھالنے سے گریز نہیں کیا ہے۔“

چند دن جموں میں اہم معاملات کی بنیغ ٹھٹھنے کے بعد میں کابینہ کے ساتھیوں کے سمیت سرسنگر کی طرف روانہ ہوا۔ سارے راستے میں لوگوں کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اور ہر جگہ گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ ۲۰ مارچ کو ہم بانہال پارکر کے وادی کشمیر میں پہنچے۔ بہار کی آمد بخفی اور کشمیر سما کی لمبی رات کے بعد رنگ اور خوشبو کے خوبصورت دفتر پھر کھول رہا تھا۔ اس روح پرور فضا میں عوام نے سرسنگر تک سارے راستے کو سجایا تھا اور ہر جگہ لوگوں کے ٹھٹھنے کے ٹھٹھنے نظر آ رہے تھے اس دن سمر پور کو سرسنگر کے لال چوک میں عوام کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جمع ہو گیا تھا۔ چھ ایک مقامی اخبار نے گرام کی کلائی مردہ دے ہوئے ”تاریخ کا سب سے عظیم ترین اجتماع“ قرار دیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا:

”اس امر کے باوجود کہ بعض لوگوں نے طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر آپ کو پریشان کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ آپ نے میرا پرہیزگاریت استقبال کر کے ان سب کو بر جستہ جواب دیا ہے۔ سرحد کے پار پاکستان کے حکمرانوں نے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہئیں۔ لیکن آپ نے ان کو خاطر میں نہ لایا۔ آج سے چند دن پہلے پاکستان کے بڑے حکمرانوں نے اپنے ”آزاد کشمیر“ کے دوسرے میں کہا تھا کہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادیں

رہی کاغذ کے پڑے ہیں تو میں نے اس پر سخت احتجاج کیا تھا اور کہا تھا کہ کشمیری عوام نے اپنا خون بہا کر اقوام متحدہ سے یہ حق منوالیا ہے اور ہم اس کی قراردادوں کو ردی کا کاغذ نہیں سمجھتے ہیں پاکستانی حکمرانوں سے پوچھتا ہوں کہ ریاستی عوام کے حق خود ارادیت کی بات کرتے ہوئے کیا انہیں یہ خیال آیا کہ وہ ان پندرہ لاکھ کشمیریوں کو جو آزاد کشمیر میں رہتے ہیں، حق خود ارادیت دیں؟ وہ پہلے اپنے گھر کو سمجھیں اس کے بعد ہماری غمگساری کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں کے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد رہا ہے۔ انہیں کشمیری کو خوبصورتی سے دلوچھی ہے یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود سے نہیں۔ میں کشمیری عوام کو ان مصائب سے نجات دلانا چاہتا ہوں جو ایک مصنوعی قیادت اور فریب انگیز نظام کو ان پر مسلط کر کے پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت قانون کی عملداری اور دیانتدارانہ انتظام کی بجائے قوم کی فلاح و بقا کا اولین تقاضا بن گئے ہیں۔

کچھ ہی دنوں میں انتظامیہ پر ایک نظر ڈالئے اور مسائل کا صحیح المقدور جائزہ لینے کے بعد ہم نے اصلاح احوال کا بیڑا اٹھالیا۔ سیکریٹریٹ حکومت کا دل ہوتا ہے لیکن اس کو ایک اچھا خاصا مچھلی بازار بنادیا گیا تھا کوئی بھی شخص کسی بھی وقت سیکریٹریٹ میں دندا نہا سکتا تھا اور کچھ بدنام قسم کے عناصر ہر وقت اس کے برآمدوں میں اپنی تھوکتھنیاں اٹھاتے ہوئے ادھم مچاتے نظر آتے تھے۔ اس کا زیر سیکریٹریٹ کے کارپردازوں میں بھی سرائیت کر گیا تھا۔ اور دفتر کے کمروں میں ایک غیر منیدہ احوال نظر آتا تھا۔ ہم نے اس اتری کو ختم کرنے کے لیے سیکریٹریٹ میں دھلکے قواعد بنائے اور فوری طور پر نافذ کر دیئے۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں میں سیکریٹریٹ اور دوسرے

دفتروں کی حاضری میں باقاعدگی اور کام کرنے میں قرینہ پیدا ہونے لگا۔ ہر خانے جہاں سرکاری ملازم اوقات کار میں بھی گپ شپ کرتے رہتے تھے، سنان پڑ گئے۔ تعلیمی اداروں اور امتحانی مراکز میں جہاں نقل کرنے کو تقریباً قانونی جواز عطا کیا گیا تھا، صورت حال سدھرنے لگی۔ میں نے خود امتحانی مراکز کا دورہ کیا اور ہر نگران علی کو ہدایت کی کہ نقل کی بدعت کا سختی سے سدباب کریں۔ چنانچہ دیکھتے ہی نقل کا روگ، جو صرف ہفتہ بھر قبل ناقابل علاج معلوم ہوا تھا، تقریباً بڑے اکیڑوا گیا۔ ہم نے ریاست کے اقتصادی ڈھانچے کی صحبت بحال کرنے کے لیے ریاست کے لائق گورنر شری کشمی کانت جھکی صدارت میں ایک ڈیپنٹ ریویو کمیٹی بنائی۔ جیسا صاحب، جنہیں میں ان دنوں سے جانتا ہوں، جب وہ جواہر لال کا ہاتھ بٹاتے تھے، ایک لالین اور قابل ہستی ہیں۔ چنانچہ اس کمیٹی میں جیسا صاحب کے علاوہ ملک کے کچھ پہلی صف کے ماہرین اقتصادیات بھی شامل کیے گئے۔ کمیٹی نے ہمارے مسائل کا دور رس نظر سے جائزہ لیا اور اس کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں بعد میں نئے منصوبوں کے خاکے تشکیل دیئے گئے اور ان پر عمل آوری کا کام شروع کر دیا گیا۔

۱۹۵۷ء میں میری گرفتاری کے بعد ریاست کی اقتصادیات کو ایک بڑا نمہ لگا دیا گیا تھا جس کی بنیاد سیاسی رشوت ستانی پر تھی۔ بخشی غلام محمد اور ان کے کتا پیڑز کے اشتراک میں کام کرنے والے سیاسی مسائل کی تیز آج کم کرنے کے لیے کشمیریوں کو ضمیر کے بدلے شک کے راستے سے جوہر بنا لینا چاہا تھا۔ چنانچہ ان کو سستے چاول ماسٹن پر فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ دہلی کے حکمرانوں کو بتایا گیا کہ اگر کشمیریوں کو سستے چاول فراہم کیے گئے تو وہ سیاسی مسائل اور شیخ محمد عبود کو قبول جائیں گے۔ حکومت خود کو تہذیب و ستانی مارکیٹ سے ہٹنے والوں چاول

خریدتی تھی لیکن انھیں ریاست میں بہت کم نرخوں پر بیچتی تھی اور اس طرح خزانہ غلہ پر کروڑوں روپے کا گھٹا لانا جا رہا تھا۔ معنی صاحب اس سستی ٹیکہ پر ہی کو اپنی سیاسی حکمت عملی کا نہایت کارگر شہسوخ سمجھتے تھے جس وقت ہم نے رشتہ میں حکومت سنبھالی اس وقت غدارک پر بندے جانے والے اس خسارے پر جسے صرف عام میں سبسڈی (SUBSIDY) کہہ کر پکارا جاتا تھا، کی مالیت میں سن کر کروڑ سالانہ سے بجاؤں کر گئی تھی اور ریاست کی آمدنی کے ذرائع کو لگھن کی طرح کھوکھلا کر رہی تھی۔ میں سب سب سب کی سیاسی اور اقتصادی جوازیت کو مشکوک سمجھنے کے علاوہ اس کی اخلاقی اساس کو منہک سمجھتا تھا کیونکہ اس طرح سے سرکاری قومی سطح پر بھکاری پن کی سرپرستی کر رہی تھی اور قوم کی حیثیت کی رگ کو کاٹ رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو مردود سببی ختم کرنے کی ٹھان لی تیس دن اس فرض کے لیے تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی کانفرنس طلب کرنی جس میں پردیش کانگریس کے سرکردہ عہدیدار بھی شامل تھے۔ سبھی شرکانے سب سب سب ختم کرنے کے اصول کی سرگرم حمایت کی۔ پردیش کانگریس کے نمائندوں نے اس کی پوری حمایت کی۔ چنانچہ ہم نے ان کے قول پر اعتبار کر کے اس کے مردود خاتمے کا آغاز کر دیا اور اس طرح سے بچائی ہوئی رقم کو ترقیاتی اور روزگار فراہم کرنے والے کاموں پر صرف کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن بہت جلد یہ بات اشکارا ہو گئی کہ ہمارے مخالفین اور خاص طور پر ہمارے کانگریسی اتحادیوں نے اپنے قول و قرار سے مغرور ہو کر سب سب سب کے معاملے پر عوام کو چمک دے کر انھیں ہمارے خلاف اکٹھا شروع کر دیا لیکن یہ بات بڑی امید افزا تھی کہ اس مخالفت، اعسائے اور بے اصولہ مخالفت کے باوجود عوام نے ہمارے اس اقدام کی منسوخت اور اس کے صحت مند سپلو کو بھانپ لیا۔ اور ابتداء میں کچھ مشکلات سہلنے کے باوجود اس قدم کے اصلاحی پہلو

کو پسند کر لیا۔ کانگریسیوں کی مخالفت کا وہنگ ان کی روش کے مطابق مٹا تھا۔ وہ ہمارے سامنے تو اس اقدام کے دور رس قائد کی حامی بھر رہے تھے۔ لیکن بیٹے پیچھے اسے عوام و ضمن اقدام قرار دیتے تھے۔ اگرچہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کانگریسیوں کے ایک جماعتی کنونشن میں سب سب سب ہٹانے کے فیصلے کو ہر لحاظ سے قابل تہنیت اور جرأت مندانہ قرار دیا۔ پھر بھی مقامی کانگریسی لیڈر اپنی ہی ہانکتے رہے۔

نئی سوچ کو روک دینے میں لانے کے لیے سرکاری انتظامیہ ایک انتہائی اہم اقدار کی حیثیت رکھتا تھا مگر بائیس سال کے سیاسی زوال اور انتظامی اخلاقی نے اس کی رگ رگ میں کوڑھ کا زہر بھریا تھا۔ ایک نکتہ تو اس کا علاج ممکن نہیں تھا۔ لیکن اپنے مقاصد کا سراغ دینے کے لیے ہم نے اعلیٰ عہدوں پر مامور کچھ "شہرت یافتہ افراد" کو یا تو چل کر دیا یا انھیں ریاست کی چراگاہ سے واپس بھیج دیا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انتظامیہ کی ہر سطح پر اس کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔ یوں ویاتنداری، محنت اور قابلیت کی مجموعی بے بسی قدموں کا چرچا پھرنے لگا۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد میں نے اپنی کامیابی پہلی توسیع کی۔ ہم نے نئے تقاضوں کی روشنی میں جو اصلاحی اور تعمیری کام شروع کیے تھے ان کی وجہ سے بوجھ بڑھنے لگا تھا اور کامیابی کے ذریعوں کا ہاتھ پٹانے کے لیے نئے اور نوجوان ساتھیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ کانگریسی اقتدار سے الگ ہو کر ماہی بے آب کی طرح تزیل رہے تھے اور کئی اہم کرنے والے اس بڑھتی ہوئی بے چینی کی طرف میری توجہ مبذول کرائی تھی۔ توسیع کے وقت میں نے صرف وزراء کے مملکت اور نائب وزیروں کی سطح پر تقریریں کیں۔ ہمارے ساتھیوں میں سے عطا اللہ شہر ودی، علیک حبیب اللہ غلام محمد شاہ، غلام نبی کوچک اور کانگریسیوں میں سے منگت رام، رگبیل سنگھ، بھوجو رام

جو دھرمی محمد اسلم، کا جو محمد علی اور نرنب بیگم کی تقرری کی گئی۔ اس کے علاوہ ہندوستان
موجودہ کشن بکو، جو مقدمہ سازش میں ہمارے بیچ رہ چکے تھے، بھی ایک وزیر مملکت بنا
دیئے گئے۔

انتظامیہ کے علاوہ ایک فعال اور مستعد سیاسی جماعت کا وجود ہمارے مقابلہ
اور منشور کی بجا آوری کے لیے نہایت اہم درجہ رکھتا تھا۔ نئے حالات میں محاذ کے
کارکنوں نے محسوس کیا کہ ان کا دائرہ کار 'مفہوم'، 'مسانی' اور 'مقاصد' کے اعتبار سے بدل
گیا ہے۔ چنانچہ محاذ کے خصوصی اجلاس واقعہ مجاہد منزل سر سیکر میں ایک عظیم اکثریت
کے ساتھ محاذ کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب نئی تنظیم بنانے کا سوال آیا۔ تو میں نے نیشنل
کانفرنس کو پھر سے زندہ کرنا مناسب خیال کیا۔ سرفہرہ میں میری گرفتاری کے بعد نیشنل
کانفرنس پر مکتبی غلام محمد نے غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد ریاست میں غنڈہ گردی
اور اخلاقی پستی کے جو مظاہرے کیے گئے تھے اس کی وجہ سے یہ جماعت غامی بدنام
ہو گئی تھی۔ اور غلام محمد محاذ قرار ان کے ساتھیوں نے دہلی و بار کو اپنی وقاداری کا
زیادہ یقین دلانے کے لیے ریاست میں کانگریس کی شرع منظر کی تھی۔ لیکن یہ جماعت
کبھی بھی عوامی سطح پر مقبول نہ ہو سکی۔ حالانکہ اسے دہلی کے حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل
رہی اور اس کو مرکز اور آل انڈیا کانگریس کے خزانے سے بھاری رقمات کیے جانے
بھی دیتے جاتے رہے۔ لیکن میں بہر حال نیشنل کانفرنس کی ایوانوں کا حامی تھا چنانچہ میں
نے محاذ کے صدر مرزا افضل بیگ اور پردیش کانگریس کے رہنما سید میر قاسم کو
نیشنل کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دیتے ہوئے اپنے خیالات کا پتہ ہمیشہ کیا۔
میں نے بیگ صاحب کے نام لکھا۔

”اب جبکہ آپ نے محاذ کو توڑنے کا باقاعدہ اعلان کیا ہے۔ ایک نئی

سیاسی جماعت کے قیام کا مسئلہ ایک ذہنی ورزش نہیں بلکہ ایک محسوس اور
فوری ضرورت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے تاکہ موجودہ سیاسی غلام
دور ہو اور ہم ریاستی عوام کے سامنے ایک مثبت اقتصادی پروگرام اور
صحت مند سیاسی نظام کا وہ خاکہ پیش کر سکیں جس کی خاطر ہم نے اقتدار
کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔ نئی جماعت کا فیصلہ کرتے ہوئے میں اپنے
بنیادی مقاصد، اپنی جدوجہد کی تاریخ، اپنے سیاسی رول کی اہمیت،
اپنی انفرادیت اور اپنے ماحول کے تعاون کو مد نظر رکھنا ہو گا۔ میں کسی
قیامت پر یہ نہیں چٹھو نا چاہتا کہ ہم ایک شادمانی اور قابل فخر لڑائی
کے مالک ہیں اور ہمیں اس تاریخی تسلسل کو درہم برہم نہیں کرنا چاہئے۔
جس پر ہماری عزت اور عظمت کا بیزار قیام ہے کیا ہم اپنے ماضی سے صرف
اس لیے دست بردار ہو جائیں کہ ہماری جدوجہد کے ایک اہم محمور پر کچھ
دبڑوں نے ہمارے قافلے پر شب خون مارا تھا وہ دوست جو نیشنل
کانفرنس کے اس دور سے۔ حاکفہ ہیں کہ جو سرفہرہ کے بعد اس سے
وابستہ ہے ان کو یہ بھانسنے کی ضرورت ہے کہ شش کے خون آشام دور میں بہت
سے مندوں مسجدوں اور عبادت گاہوں پر بھی غاصبوں اور لٹیروں نے
جبراً قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن انہی نے نہ ان عبادت گاہوں کی تباہی نہ گئی اور نہ ان کا تعلق
قاسم صاحب کے نام میرے خط کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

”میں پورے غلوس اور صدقہ دہی کے ساتھ آپ کو اور آپ کے دوسرے
ساتھیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ فوجی اخلاقات ذاتی ترقیجات ماضی
کی تفتیش اور فوجی اندیشوں کو سمجھ کر آپ بھی نیشنل کانفرنس میں شامل

جو کہ اپنی اس عظیم میراث کے وارث بن جائے کہ جو ہم سب کے لیے باعث
افتخار اور قابل اعتبار سرمایہ ہے..... مجھے اس بات کا احساس ہے کہ آپ
اس وقت ایک ایسی سیاسی تنظیم سے وابستہ ہیں جو اپنی شاندار روایات کے
اعتبار سے ملک کی سیاسی تاریخ میں اہم حیثیت کی مالک ہے۔ لیکن گرواس
کے باوجود میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نیشنل کانفرنس میں شمولیت
کی دعوت دے رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس اور نیشنل کانفرنس
کے تعلقات میں ہمیشہ رفاقت کی بجائے رفاقت کا جذبہ کارفرما ہے یہی
وجہ ہے کہ مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف نیشنل کانفرنس کو
ہمیشہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپہ سالاروں کی حریت و اتحاد
حاصل رہا۔ اسی طرح کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان ایسی اتحاد
تعاون اور اشتراک عمل کی ایسی فضا قائم تھی کہ اس بات کی کبھی ضرورت
ہی محسوس نہیں ہوئی کہ دونوں جماعتوں کو مدغم کیا جائے..... ۱۹۴۷ء
کے بعد نیشنل کانفرنس کے بول اور ۱۹۴۷ء میں نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں
مدغم کرنے کے فیصلے کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس میں سیاسی
تقاضوں کا نہیں بلکہ وقتی مصلحتوں کا دخل تھا۔ اب جبکہ خوش قسمتی سے فضا
بدل گئی ہے اور آپ کے اور ہمارے سامنے وہ مجبوریاں نہیں ہیں جیسی ماضی
محبوب تنظیم نیشنل کانفرنس کا از سر نو احیاء کر کے ان تدریجوں کو پھر سے
زندہ کرنے میں مزید تاخیر نہیں کرنا چاہئے کہ جن سے ہماری تاریخ اور ہماری
آئندہ والی نسلوں کی تقدیر وابستہ ہے۔

معاذ کے کارکن تو میری آواز پر لبیک کہہ کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے۔

لیکن پرورش کانگریس کے منصب دار بھلا کیوں اپنے مفادات سے دست بردار ہو کر جاننا
کی اس بستی جوں گنگا سے کنارہ کش ہو جاتے جو پرورش کانگریس کے نام پر مرنے پر شہ
سے بچو مٹی مٹی اور ان کے گھروں کو سیراب اور شاداب کرتی تھی۔ دوسرے وہ میرے
اقتدار سنبھالنے کو ایک عارضی دور سمجھتے تھے اور ان کے ایک گھر کے بھیدی کے مطابق
جس نے اشرافیوں کی بندر بانٹ پر استغنی دے کر ان کے خلاف متوازی تنظیم کھڑا کرنا
وہ دہلی کے کسی ڈاکٹر کی رپورٹ پر اس لگائے بیٹھے تھے کہ میری صحت مجھے چند ماہ سے
زیادہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دے گی اور اس کے بعد وہ پھر اپنی کھوئی ہوئی جنت حاصل
کر پائیں گے۔ انھوں نے اپنی ڈیڑھ راونٹ کی مسجد ڈھانے پر آمادگی ظاہر نہیں کی لیکن
نیشنل کانفرنس اپنے قیام کے فوراً بعد ریاست بھر میں مقبول ترین عوامی تنظیم بن گئی
آجی دنوں مسز اندرا گاندھی سربراہ گئیں تو انھوں نے ایک پوریم بارغ میں کانگریسیوں
کے ایک بیٹے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں کانگریس کو توڑا نہیں جاسکتا اور
اگر یہاں صرف ایک ممبر اس کے ساتھ رہے تو پھر بھی یہ جماعت یہاں قائم رہے گی۔
کانگریسی حکومتوں کے خلاف یہاں بدو باقی اور بدو عثمائی کے شدید الزامات تھے۔ مسز
گاندھی نے ان کا ذکر کرتے ہوئے زبان کی ایک ہی جھبش سے اپنے لاڈلوں کو یہ کہہ کر
بری کر دیا کہ گندگی کہاں نہیں ہوتی۔ کسی عیالشان قایلین کا کوہ آتشا کر دیکھئے اس
کے نیچے گرد کی موٹی تہہ جی نظر آئے گی۔ ”مسز گاندھی کی اس تقریر نے میرا سارا ناکہ دود
کر دیا اور اس کے چند ہی روز بعد لال چوک میں نیشنل کانفرنس کا ایک عظیم جلسہ
مفتوح ہوا۔ جہاں میں نے برسر عام نیشنل کانفرنس کی ابتدائی شکست کا فائدہ بھر کر اس
میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ میں نے بیٹے میں کہا:

”جہاں مسز اندرا گاندھی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے وجود

اور اس کی تشکیل کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں وہاں اس فیصلہ کو حتیٰ طور پر قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار صرف یہاں کے لوگوں کو ہے اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت اُن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونس سکتی نیشنل کانفرنس کے ساتھ ہادی تحریک اور تاریخ کے شہسہ لے وابستہ ہیں اور ہم اپنا استراحتیہ کار کے اسی تنظیم کو مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں یہی مسز اندرا گاندھی کے چیلنج کا میری طرف سے جواب ہے۔"

میں نے اسی جلسے میں نیشنل کانفرنس کی ابتدائی رنگینیت کا فارم حاصل کیا۔ نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں اُس وقت اور استحکام پیدا ہو گیا جب مشاعرہ میں جوں کے سالانہ اجلاس میں مجھے اس کا پھر سے صدر چن لیا گیا میرا نام اس صدارت کے لیے سبکدوش ہونے والے صدر بیگ صاحب نے تجویز کیا تھا۔ حالانکہ میں اُس وقت انتظامیہ کے کام کا ج کے ساتھ تنظیم کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہو نا خاصا مشکل خیال کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کا انہماک اپنے نقطہ صدارت میں ان الفاظ میں کیا۔

وہ آپ اپنی محبت اور عقیدت کے جوش میں میری عمر میری صحت اور میری غیر معمولی مصروفیات کو بھی نظر انداز کر گئے۔ آپ شاید بھول گئے کہ میری عمر کو بیچ کر انسان کا جسم اور اس کے گاندھے بہت زیادہ بوجھ اٹھانے کے اہل نہیں رہتے۔ آپ نے اُن ذمہ داریوں کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جو ریاستی حکومت کی سربراہ کی حیثیت سے مجھ پر عاید ہوتی ہیں۔"

بہر کیفیت مجھے تنظیم کے رفیقوں کی خواہش، اُساثر پڑی اور اس طرح سے اس تنظیم کا فواد دی ڈھاچہ کھڑا ہو گیا جس نے مشاعرہ کے انتخاب میں ایک چٹان کی طرح با د مخالفت کے طوفانی موجوں کا ترن موڑ کر رکھ دیا اور ہماری تحریک کے چراغ کو

روشن رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

نیشنل کانفرنس کی تنظیم کو نئے کانگریسی حلقوں کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے حکومت اور نیشنل کانفرنس کے خلاف اُٹھم تیز کر دی۔ وہ اس قول کو دہراتے خمیر کی کسی غلطی کے بغیر متحرف ہونے لگے۔ جو انھوں نے مجھے اقتدار کی ذمہ داریاں سونپنے وقت اور کا بینہ میں اپنے نمائندے بھیجتے وقت کیا تھا۔ انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے اُن راشی افسروں کی حمایت بھی شروع کر دی جنھیں ہم نے انتظامیہ کی تقبیر کے مقصد سے چلا کر دیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے اپنی پارلیمانی پارٹی کا ایک علیحدہ لیڈر بھی چن لیا تھا۔ جس نے اعلان کیا کہ ان افسروں کو کانگریس کے ساتھ رہنا کی بنا پر ناپاک دیا گیا ہے۔ کانگریس مخالفت کے جوش میں اس حد تک گئی کہ انھوں نے اناج کی خوش خرید و تم کو ناکام بنانے کے لیے بھی ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت کے پاس اناج کا ذخیرہ جمع نہ ہونے پائے اور اس طرح سے غذائی قلت کا ماحول پیدا ہو جائے۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس طرح عوام کے لیے مصیبتیں کھڑی ہو جائیں۔ وہ تو کسی قیمت پر حکومت کے لیے پریشانی کے اسباب بہم کرا چاہتے تھے۔ صورت حال کو بگاڑنے میں آل انڈیا ریڈیو کے دہلی سٹرک اور جوں سٹیشنوں نے بھی اُن کی خوب ہمت افزائی کی اور اُن کے غلط سلط بیانات کو خوب اچھا لاء خراک اس تصادم اور ٹکراؤ کی آوازیں دہلی کے ایوانوں میں گونجنے لگیں۔ کانگریس ہائی کمان کی نگاہ میں اس تصادم کو روکنے کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ کانگریسی لیڈروں کو کا بینہ کے درجے کا وزیر بنایا جائے میں نے اس شرط پر ایسا کرنے کی حامی دہی کہ پھر نیشنل کانفرنس کے کچھ اسمبلیوں کو بھی کا بینہ کے درجے کا وزیر مقرر کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ میں اپنی نیم کے لیے کانگریسیوں کا انتخاب کرتے وقت اپنی

پسندے کام لوں گا۔ یہ جمہوری روایات کے عین مطابق تھا۔ لیکن دہلی کے حکمرانوں کو کشمیر میں اپنی من مانیوں کرنے کا جو چمک بڑی تھا اس کی وجہ سے یہ اُن کے حسبِ دل خواہ نہیں تھا۔ بہر صورت کاگرسی علی محمد نیک اور عبدالغنی گوئی وغیرہ کی تقرری پر اصرار کرنے لگے۔ میں نے نیشنل کانفرنس کی ترجہائی کرنے والے وزیروں کا درجہ بڑھانے کا فیصلہ کیا اور سترے وزراء کے حلف لینے کے لیے راج بھون میں ایک تقریب کا انتظام کیا گیا۔ معاملہ بالکل طے تھا اور میں راج بھون جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ دہلی سے اطلاع آئی کہ کاگرسی نامزدگان کو حلف نہ اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ اگر نیشنل کانفرنس کے وزیروں نے ہی حلف اٹھایا تو صورت حال بگڑ جائے گی۔ اس سارے معاملہ کی ہدایت کاری مسز اندرا گاندھی یہ نفسی نفیس انجام دے رہی تھیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ اس واضح بیان کو فراموش کر رہی تھیں۔ جس کے تحت انھوں نے مجھے یہ کہہ کر کاگرسی پارٹی کی قیادت پر آمادہ کیا تھا کہ مجھے اپنی قیادت کا مکمل اختیار دیا جائے گا۔ یہ صاف و شواہد گہات تھی۔ لیکن حالات کی نزاکت اور کاگرسیوں کے ارادوں کا اندازہ کر کے میں نے اس اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرنا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو راج بھون میں مقررہ تقریب پر میں نے کہا:

”مجھے آہستہ آہستہ کہ آج کی تقریب وزارت کی کونسل میں کانگریس پارٹی کی جمہوریہ شرکت سے مسرت انگیز ہے گی، اور میں نے اس مقصد کے لیے کاگرسی کے چار سرکردہ ارکان کو کابینہ کی سطح پر ہاتھ بٹانے کی دعوت دی تھی۔ لیکن موجودہ غلط فہمی سے بغض آمیز رجحان ہے اور میں نے محسوس کیا کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت کے اس مقصد کے حصول میں رکاوٹیں

پیدا ہوں گی اس لیے میں نے گورنر سے استدعا کی کہ اس تقریب کو ملتوی کیا جائے۔“

کاگرسیوں کی اس دغا بازی کا پس منظر یہ تھا کہ وہ گردھاری لال ڈوگر جیسے لوگوں کو کابینہ میں لے آنا چاہتے تھے۔ ڈوگر صاحب نے ۱۹۴۷ء میں جوروں ادا کیا تھا اس کی وجہ سے میرا اُن پر افساد اچھا گیا تھا اس لیے میں نے اُن کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پردیش کاگرسی کے کچھ اہم برہمن سبلی جی میں محمد رفیع اودھوی، محمد اشرف خان وغیرہ شامل تھے۔ پردیش کاگرسی میں جوئے والی دھاندلیوں سے مستغفر ہو کر نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گئے تھے۔ میں ان نوجوانوں کی صلاحیتوں کو بھی مفید طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کاگرسی اُن کو انتظامیہ کی کوئی ذمہ داری سونپنے پر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ اسی طرح ہم نے سرنگرم میں بلدیاتی انتخابات کا اعلان بھی کر دیا تھا اور وزارت کے اتحادیوں کی حیثیت سے کاگرسیوں کو سیشن پیش کی تھیں اور اُن سے کہا تھا کہ ہم ان سیشنوں کے لیے نیشنل کانفرنس کے امیدوار کھڑے نہیں کریں گے۔ کانگریس کی شہر میں کوئی ساکھ نہ تھی۔ لیکن وہ دہلی کی پشت پناہی کی بنا پر آسمان میں اڑ رہے تھے۔ انھوں نے اس معاملے کو بھی وجہ نزع بنالیا۔ چنانچہ ۲۴ اکتوبر کو دہلی میں وزیر اعظم کی صدارت میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں دو کانت بردادوں ہمت، میر تقی میر، قائم اور مفتی سید نے شرکت کی۔ اس میٹنگ میں حلف لینے کی تقریب کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کی اطلاع سرنگرم میں موجود کاگرسیوں تک پہنچائی گئی۔ کاگرسی رہنماؤں کی یہ عہد شکنی اُن کے اصل ارادوں کا پتہ دیتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ شبہ اُن کے زیادہ بھیاں گ کرنے کی صرف استدائی رہی ہر سبلی تھی۔

میں نے دیا وہیں اگر کانگریسیوں کو متعون کرنے سے انکار کر دیا۔ ۳۰ اکتوبر کو
چند شریف کے ایک عوامی اجتماع میں، میں نے چیتاؤنی دی کہ ہم مخالفت کے نام پر
کسی کو نہ اپنی قسمت سے کیٹنے کی اجازت دیں گے اور نہ ہی دیاؤں میں اگر کوئی غلط
قدم اٹھائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کاہینہ میں توسیع پر رضامندی خیرگانی کے جذبے
کے طور پر ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن کانگریسیوں نے میں و غیرے کا مظاہرہ کیا ہے اس
کے پیش نظر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اب کاہینہ میں قطعی طور پر کوئی توسیع نہ
کی جائے گی۔ ▲▲▲

دوسرا شب خون

۱۲ جون شنبہ کو جب احمد آباد ہائی کورٹ کے جسٹس جگت موہن سہنانے مسز
اندرگاتھدی کے خلاف دائر شدہ انتخابی قعدہ داری کا تاریخی فیصلہ سنایا۔ تو اس
وقت کے صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد صاحب سرنگرمیں تھے۔ اسی دن علی الصبح ماسکومیں
بندوستان کے سفیر کا پرست اور کے دہلی میں انتقال کی خبر آئی تھی۔ اور ان کے
سدو خانی کو آخری رسوم کے لیے سرنگر پہنچانے کے انتظامات ہو رہے تھے تو والدین صاحب
نے مسز گاتھدی کے خلاف فیصلے کی خبر سنی تو اس کے املاکانی عواقب کا خیال کر کے ان
کو دہلی لوٹنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ لیکن دہلی سے فوراً ہی اطلاع آئی کہ ان کے لوٹ
آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ موزی وزیر داخلہ برہاندر پڑی جو سرنگر آئے
ہوئے تھے واپس روانہ ہو گئے۔ ڈی۔ پی۔ وہ کی آخری رسوم میں شرکت کے بعد میں
۱۳ جون کو دہلی پہنچا تو وہاں مجھے ایمر جیسی کی پوری شدت کا اندازہ ہو گیا مسز گاتھدی
سے میں نے پرسش احوال کی تو انھوں نے کہا کہ ملک میں حالات قانون سے باہر ہو رہے
تھے اور حزب اختلاف انتشار اور محنت کے شعلوں کو بھڑکارا تھا۔ لیکن خود میں پوری

طرح مطہر نہ ہوا۔ بے پراکش نوائے اور مارچی بھائی کی سیاست سے اختلاف ممکن تھا۔ لیکن انھیں وطن دشمن قرار دینا زیادتی تھی۔ انھیں جن حالات میں حراست میں لیا گیا تھا وہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک افسوسناک اور اندوہناک باب کا آغاز تھا۔

کشمیر میں ایمر جنسی کا اثر کچھ داجی سا بھی رہا۔ اگرچہ وفاق کی ایک اکائی کی حیثیت سے ہمیں باقی کتبے کے ساتھ کادہ سے سے کادہ ہلا کر ملنا تھا لیکن عملی طور پر یہاں ایمر جنسی کی افراط و تفریط سے احتراز کیا گیا۔ خاص طور پر اخبارات کی سنسرشپ کے معاملے میں تو یہ فرق نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔ ہم نے اخبارات پر سنسر کی پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ لیکن مرکزی وزارت اطلاعات برابر اصرار کرتی رہی کہ ہم اس معاملے میں مرکز کے نئے قواعد کی پیروی کریں۔ ریاستی اخبارات مرکزی اور ریاستی معاملات پر لفظاً آزادی سے رائے ظاہر کرتے رہے۔ جس سے مرکزی وزارت اطلاعات کی بے چینی اور بڑھوٹگی۔ مرکزی وزیر برائے اطلاعات و نشریات وی۔ سی شکرلا تو اس قدر عیش میں آ گئے کہ انھوں نے ایک ملاقات میں مجھ سے کہا کہ وہ ریاست میں سنسرشپ کے نئے قواعد کا نفاذ ریاستی انتظامیہ کی بجائے مرکزی محکمہ اطلاعات کی مقامی ایجنسیوں سے کروائیں گے۔ میں نے شکرلا صاحب کو شکراتے ہوئے مگر مضبوطی سے جواب دیا کہ وہ جو چاہیں کریں۔ لیکن ریاستی حکومت سنسرشپ کے اطلاق کے مسئلے میں ان کا ہاتھ جتانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ آخر کار انھیں اپنا غصہ پی لیا ہی پڑا اور ریاستی اخبارات سنسر کی قبضہ سے بچ گئے۔ ان دنوں ریاست میں متعدد آزادانہ ماحول قائم تھا کہ میرے ہیبت سے ہندوستان دو دستوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ میری نظر بندی کے زمانے میں جب وہ چٹان کوٹ سے جوں یا سرنگر پہنچے

تھے تو انھیں ایسا لگتا تھا کہ وہ روشنی سے تاریکی میں آ گئے ہیں۔ لیکن اب اس کے برعکس وہ جوں یا سرنگر پہنچے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ وہ گھٹن سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ بشیم احمد بشیم ان دنوں پارلیمنٹ میں سرنگر کی منابندگی کر رہے تھے۔ ان کو میرا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ جب انھوں نے ایمر جنسی پر تاثر توڑنے شروع کیے تو اس کے ڈانڈے میری ترغیب کے ساتھ ملائے گئے۔ مرکزی حکومت ان کو قید کرنے کے لیے سوچنے لگی۔ وہ جو کچھ سیاسی طور پر میرے ساتھ منسوب تھے لہذا میری صلاح لینا مناسب سمجھا گیا۔ میں نے مرکز کو اس سے باز رکھا اور کہا کہ انھیں آزادی خالی کی ہر کرن کو اس طرح چھانے کے لیے کمر بستہ نہیں رہنا چاہیے۔ البتہ ان حالات کا اندازہ کر کے میں نے میرے نوکر کو صلاح دی کہ وہ دانشمندی اور احتیاط کے ساتھ اپنی آزادی کا استعمال کرے۔

مئی ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ میرا دہلی جانا ہو کچھ ہی ہفتے پہلے ترکان گیت کا المناک ساتھ پیش آیا تھا۔ لیکن سنسرشپ کی وجہ سے اس کی پوری تفصیلات سامنے نہ آئی تھیں۔ دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے چیرمین مشرک جاسم حسن مجھے دہلی میں تعمیر ہونے والی کچھ نئی بستیاں دکھانے کے لیے لے گئے۔ جب میں کچھڑی پور کی بستی میں پہنچا تو میں نے سیکڑوں لوگوں کو کسی انتظام کے بغیر ایک وسیع میدان میں ڈیرہ جمائے پایا میں نے اس بد انتظامی کی وجہ دریافت کی تو چیرمین صاحب نقلیں جھانکے لگے۔ یہیں پر کچھ انھاس نے ترکان گیت کی تہرما مانیوں کا ذکر کیا تو میں نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے اپنے ساتھ دو آدمیوں کو ہمراہ لیا۔ جن کے مکانات ترکان گیت کے نرے میں شمار کیے گئے تھے۔ جب میں ترکان گیت پہنچا تو وہاں ہفتوں کے بعد ایک اچھی خاصی بھڑا اکٹھا ہو گئی۔ ان کے چہروں پر خوف اور گمراہی کے علاوہ تشویش اور فکر مندی کے آثار بھی صاف نمایاں تھے۔ میں ابھی لوگوں سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ کچھ پوری پور سے آئے

ہوئے ایک آدمی نے تجھے اطلاع دی کہ اس کے دوسرے ساتھی کو پولیس پکڑ لے گئی ہے۔ پہلے تو تجھے حیرت ہوئی، لیکن استفسار پر معلوم ہوا کہ اطلاع صحیح ہے میرے ہمراہ وزیر اعظم کے خصوصی ایچی ٹیڈر بھی تھے۔ انھیں جب اس بات کا علم ہوا تو وہ کافی سنبھلے لیکن ان کی مداخلت سے گرفتار شدہ آدمی رہا ہو گیا۔ میں نے لوگوں کو تسلی دی اور ان کی ذہنی قتل و غارتگی کی دلدوز کہانیاں سنیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ترکمان گیٹ کے ساتھ کے دوسرے داروں اور کچھ بڑے بڑوں کو میرا یہ دورہ کافی ناگوار گذرا تھا۔

ایمر جنسی لاگو ہوئی تو مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ملک کی سیاسی فضائی ترقی کے لیے اس کڑوی دوائی کا استعمال کچھ عرصہ کے لیے ضروری ہے۔ لیکن دن گذرتے گئے اور ایمر جنسی کے وہ محدود فائدے جو پہلے پہل محسوس کیے گئے تھے ناپائیدار ہونے لگے۔ دفنائیں لگنی آئیں گھبرنے لگی۔ میں نے ابھی دونوں ایک تقریر میں کہا کہ قومی مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے حل کیا جانا چاہیے اور عسکری اتحاد و کام کا وہ اختیار کثرتِ نظریں کے لیے ہی نہیں اپوری قوم کے لیے نقصان دہ ہے۔ میں نے کہا کہ جے پرکاش نرائی اور مزاری ویسیا کی جیسے لیڈروں کی حُب اور وطنی اور وطنی شک و شبہ سے بالاتر ہے اور ان کی قربانیوں کا ریکارڈ انھیں ملک میں عزت و احترام کی جگہ دلانے کا ضامن ہے۔ ابھی دونوں کا ٹکرائس کے تازہ وارد اور طالع آزمائے پارلیمنٹ کی مجلسِ مشترکہ میں ہوئے تھے۔ انھوں نے کانگریسوں کے ایک جلسے میں تجھے مشورہ دیا کہ مجھے جے پرکاش نرائی کی خدمت کرنی چاہیے۔ اس موقع پر ستائیسویں مرتبہ سے رہا نہ گیا اور میں نے چار شریف کے ایک بھاری اجتماع میں کہا کہ جے پی کے ساتھ ہمارے لاکھ اختلافات ہیں لیکن ہم ان کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اگر کچھ لوگوں کی نگاہ میں اپنی وفاداری کا اظہار کرنے کے لیے جے پی کو گالیاں دینا ضروری ہیں تو میں اس

مقابلے میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ جے پی اس وقت ہندوستان کی جنگ آزادی لڑ رہے تھے جب ششجی جوشن پیدا ہوئے تھے۔ ان بیانات سے ایمر جنسی کے علمبرداروں کے ابرو کھینچ گئے لیکن میں نے اس کو زیادہ خاطر میں نہ لایا۔ میں جے پی کی رہائی کے بعد دوسرے مسائل میں بھی جے پرکاش کو ہسپتال میں ان کی عیادت کو گیا اور بعد میں بمبئی کے ایک پبلک جلسے میں میں نے ایمر جنسی کو ہٹانے کی تجویز بھی پیش کی جس کو مسٹر بی پانڈیوں کے باوجود اخبارات نے شائع کیا اور ایمر جنسی کے خلاف یہ اس سطح پر اور سرکاری منصب پر فائز کسی عوامی لیڈر کی پہلی آواز تھی۔

جنوری ۱۹۷۷ء میں مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ تو ذکر عام انتخابات کا اعلان کیا جو میں نے چندہ میں سنا۔ جہاں میں کشمیر کے آخری خود مختار سلطان یوسف شاہ چک کے چار نکوین تین تین بیٹیوں کی شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ یوسف شاہ چک کو رغل بادشاہ اکبر نے گفت و شنید کے لیے دہلی بلا لیا تھا۔ اکبر کی دنگا ہیں مدت سے کشمیر پر تسلط حاصل کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کی فوجوں کو بار بار کشمیریوں کی شجاعت کے سامنے ہتھ کی کھائی پڑی تھی چنانچہ جہاں شمشیر ناکام ہوئی وہاں اس نے تدبیر آزمائے کا فیصلہ کر لیا اور یوسف شاہ کو ضمیر کی کسی غلطی کے بغیر اور معاہدات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سہار کے علاقہ سہوک میں جلاوطن کر دیا۔ جس کی موت وہیں پر ہوئی اور چار سو سال کے بعد کشمیری عوام کے خاندان سے اس عظیم تحب و عن اور نمون لطیفہ کے قدردان کی عزت افزائی کے لیے جاری تھے میں نے وہاں اس کے مزار پر کچول اکادری کے تیار کیے ہوئے ایک کتبے کی نقاب کشائی کر کے چار سو سال کا قہر نپکانے کی ایک معمولی کوشش کی بعد میں میں نے جے پرکاش نرائی سے جو اپنے قدم کٹوان کے مکان میں رہتے تھے، یہی صورت حال پر گفتگو کی۔ جے پی اپنی خراب صحت کے باوجود میدانِ جنگ میں کود پڑنے کے لیے

پھر پھر وہ ہے تھے اور اس کو جمہوریت کی بنانی کے لیے آخری معرکہ سمجھتے تھے۔ نئی دہلی کی کچھ کمر
جب میں مسز اندرا گاندھی سے ملا تو میں نے انھیں اس نئی پہل کے لیے مبارکباد دی اور
امید ظاہر کی کہ اس سے جمہوری اداروں کا وقار بچے بحال ہو جائے گا۔ مسز گاندھی
نے خواہش ظاہر کی کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس پارلیمانی انتخابات
میں استقامتی معاہت کر لیں۔ چنانچہ ہم نے راست کی کچھ نشستوں میں سے تین پر نیشنل
کانفرنس اور تین پر کانگریس کے امیدوار کھڑا کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ انتخابات میں میری
بلگ سرنگر کے امیدوار چن گئیں کیونکہ جماعت میں سابق منبر شمیم احمد سمیت کی مخالفت
عروج پر تھی۔ بلگ صاحبہ کے مقابلے پر اگرچہ ہمارے پڑے اور نہ جسے بھی ٹیٹن اکٹھا ہو گئے
لیکن وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئیں۔ کانگریس نے اپنی لیڈر کی یقین دہانی کے
برعکس جگہ جگہ پر وہ اور کئی صورتوں میں حکم کھلا نیشنل کانفرنس کے امیدواروں کی
مخالفت کی۔ بلگ صاحبہ کے خلاف انتخاب لڑنے والے امیدوار مولوی افتخار علی کانگریس
کی وساطت سے یہ کیلیکشن کوئل کے ممبر بنے تھے اور کانگریس جبروں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

پارلیمنٹ کے نتائج کا اعلان ہوا تو ملک میں ایک بھونچال سا لگایا۔ برسرِ اقتدار
کانگریس عبرتناک شکست سے دوچار ہو گئی اور آزادی کے بعد پہلی بار مرکزی حکومت
سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ نو وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اپنے فرزند نے گاندھی اور برہمنی
کے بڑے بڑے مشعل برادرین، جمنی لال، دوچارین، تشکلا وغیرہ کے ساتھ بارگئیں۔
شمالی ہندوستان سے لگیا کانگریس کا صفایا ہو گیا۔ یہ ایریسٹی اور اس کی زیادتیوں کے
خلاف عوام کے غضب و غضب کا پھر قہر اظہار تھا۔ اس مسئلے پر جانے تو یہ تھا کہ کانگریس
محنت حاصل کر کے اپنے زوال کے اسباب جاننے کی کوشش کرتے لیکن ریاست کے
کانگریسیوں پر اس کا بالکل اثر پڑا۔ انھوں نے مرکز میں اپنی سرپرستی کے حلقے کو

زمین بوس ہوئے دیکھا تو ان پر حواس باخشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور انھوں نے
ایک اور سیاسی شب خون کے لیے زہر بکتر پہنا شروع کر دیے۔ یہ شب خون اپنے
عزائم اور خون آشامی کے لحاظ سے مسودے کے کرنے سے بہر طور کم نہ تھا۔

جونہی مرکز میں جنما پارٹی کی وزارت کے قیام کے بعد کالمت روشن ہو گئے پر پیش
کانگریس کے لیڈروں نے ریاست میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے تیاریاں شروع
کر دیں۔ میں مرکزی لیڈروں سے گفتگو کرنے کے لیے دہلی چلا گیا تو میری پہلیے پیچھے
کانگریسیوں نے جوں میں گورنر کو ماسد بھیجا کہ ان کی پارلیمانی پارٹی نے مجھ سے اعتماد
واپس لے لیا ہے۔ انھوں نے پرورش کانگریس کے صدر مفتی محمد سعید کو لیڈر نامہ دار کے
گورنر کو درخواست کی کہ وہ اس کو نئی وزارت بنانے کی دعوت دیں۔ اس کے علاوہ
گورنر کی لال ڈوگرہ کو نائب وزیر اعلیٰ بنانے کا بھی اعلان کیا گیا۔ انھیں اقتدار کی
کرسیاں سنبھالنے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ آئین میں اپنی بنائی ہوئی متعلقہ دفعہ کو
بھی بھول گئے۔ ریاستی آئین کی دفعہ ۷۷ (ب) میں صاف تصریح کی گئی تھی کہ ایسے حالات
میں گورنر کے لیے وزیر اعلیٰ کا مشورہ ماننا لازمی ہے لیکن آئین کا وہ مسودہ تو دہلی سے
ہٹ کر آیا تھا۔ اب انھیں متعلقہ دفعہ یا ذاتی تو کیسے؟ انھوں نے تیس وزیروں پر مشتمل
کابینہ تشکیل بھی دے رکھی تھی اور حالت اسماعلے کی تقریب کے لیے شیر وانیال ملک
سلوا دی تھیں۔

دہلی میں، میں نے مسز اندرا گاندھی اور دوسرے لیڈروں سے کہا کہ وہ ایک
اور بار مجھ سے اعتماد شکنی کر رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر اپنا پنڈت چھاپا کہ وہ جو کہ
اختیار کھڑے ملی ہیں اور شکست خوردہ ہیں اس لیے ریاستی کانگریس اب ان کا کہا نہیں
مانتی۔ دراصل کانگریس ایک تیرے دو کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو وہ حکومت پر کاہنی

ہونا چاہتے تھے دوسرے اُن کا اندازہ تھا کہ مجھ کو وزارتِ اعلیٰ سے الگ کرنے کے
 نتیجے میں ریاست میں افراطی پیدا ہو جائے گی اور وہ اس گڑبڑ کا الزام مرکزی حکومت
 اور جنٹا پارٹی پر عائد کریں گے۔ اکارڈ کے بعد اولیٰ اول تو اُن کا خیال تھا کہ مجھ سے
 وہ مشکل اور غیر مقبول اندامات کو واپس لے گئے۔ پھر ۱۹۴۷ء کی طرح اندرا گاندھی جیلے
 حواس کی آڑ سے کر سکتے نظر بند کر کے اُن کی حکومت بنائے گی۔ لیکن جب مرکزی
 کانگریسی وزارت ہی ڈوب گئی تو انھوں نے آخری دایہ کھیلنا کہ کشمیر میں ہی کانگریسی
 حکومت قائم کر کے جنٹا پارٹی کے لیے مشکل صورت حال پیدا کرید اس نکل ہوئی
 بدعہدی کو دیکھ کر میں نے اپنے آئینی حق کا استعمال کرتے ہوئے گورنر سے اسمبلی پر خوات
 کرنے اور نئے انتخابات کرنے کی سفارش کر دی۔ معاملہ دہلی تک جا پہنچا جسے وزیرِ اعظم
 مراد جی ڈیسائی نے مجھ سے کہا کہ وہ کشمیر اسمبلی کو، جہاں کانگریس کی اکثریت ہے، پر خوات
 نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ کانگریسی آسمان سر پہ اٹھائیں گے کہ اقتدار میں آتے ہی ہم
 نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ ایک ایسی اسمبلی کو برخواست کر دیا جہاں کانگریس اکثریت میں
 تھی۔ میں نے وزیرِ اعظم کی توجہ ریاستی آئین کی دفعہ ۵۳ (ب) کی طرف دلائی۔ انھوں
 نے اس معاملے کی نسبت اپنی وزارتِ قانون کی رائے طلب کی۔ وہاں سے انھیں وہی
 مشورہ ملا جس کی وضاحت میں نے کر دی تھی۔ اس کے بعد اُن کے لیے کوئی اور چارہ کار
 نہ رہا۔ اس طرح سے گورنر نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۷ء کو اسمبلی کو ٹوٹ کر نئے انتخابات کا اعلان
 کر دیا۔ ریاست پہلی بار گورنری راج کے تحت آگئی اور کانگریسی بواہوسوں کو لینے
 کے دینے پڑ گئے۔ اگرچہ کانگریسی لیڈروں کا یہ شب خون بے حد رنج و دہ اور عہدہ
 غیر اخلاقی تھا لیکن قدرت کے کھیل بھی کہتے زیادے ہوتے ہیں کہ اُن کی اس ناشائستہ
 حرکت سے ہی ایک عوامی اسمبلی کے انتخابات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا جیسا کہ میں

اشارہ کر چکا ہوں میں نے اس انتخاب کے لیے دہلی اکارڈ کی گفت و شنید کے دوران
 ہی کئی بار مسز اندرا گاندھی سے استہزاء کی تھی، لیکن وہ اس کو ہارٹالقی رہی تھیں۔ اُن
 کے بعد جو انتخابات منعقد ہوئے اُن میں پردیش کانگریس کے یہ سورما نہ صرف
 چاروں شاخے جیت کر گئے بلکہ وادی سے بھی کانگریس کی مصنوعی تنظیم کا مکمل منہایا
 ہو گیا۔ ■ ■ ■

جنتا کی لیغا رپیا ہو گئی

گورنر راج کے قیام کے بعد ہمارے لیے نئی آزمائشوں کا ایک مہر آزمادور شروع ہوا۔ ریاست میں مشرکے بعد انتہا ہست کی تاریخ نہایت سیاہ رہی تھی اور اکثر حالات میں ہم کو بڑی ڈھٹائی سے انتخاب کے میدان سے دور رکھا جاتا تھا اور پھر چوری چھپکاری سے اپنے منظور نظر امیدواروں کو منتخب قرار دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی نصیبوں کا مارا اس کلی ہوئی بے ایمانی کے سامنے سیدہ آن کرکھو ہوا تو اسے طرح کی دھاندلیوں سے بہت دی جاتی۔ کچھ دھاندلیاں تو اس قدر طبع زاد تھیں کہ بڑے بڑے مشاہیر بھی عیش عشق کرتے تھے۔ کاغذات نامزدگی کی مستلوں اور حلف ناموں کی چوری تو روزمرہ کی باتیں بن چکی تھیں۔ مخالفت امیدواروں کا افوا بھی لگ بھگ معمول بن ہی چکا تھا۔ نئے حالات میں صورت حال کچھ اور مخدوش بن گئی تھی۔ مرکز میں جو حکومت برسرِ اقتدار آئی تھی اس کے بہت اہم اراکین کے ساتھ میرے نظریاتی اختلافات چلے آ رہے تھے۔ یہ بات بھی صیغہ ساز میں نہ تھی کہ ان میں سے کچھ ذاتی طور پر بھی مجھ سے پر حاش رکھتے تھے۔ گورنر راج کے بعد جب میں واپس گیا اور میں نے مرکزی رہنماؤں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ریاست میں نیشنل کانفرنس کے ساتھ انتخابی اشتراک کریں تو انھوں نے اس کو تسلیم نہیں

کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ پنجاب میں اکالیوں سے ایسا اشتراک کر سکتے ہیں تو نیشنل کانفرنس کے ساتھ ایسا کرنے میں کیا مضائقہ ہے تو آئیں بائیں شائیں کر کے معاملے کو بال گئے۔ انھوں نے بیروت یہ کہا کہ نیشنل کانفرنس کو توڑ دیا جاتا چاہئے۔ لیکن میں نے اس تجویز کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور جواب دیا کہ اب معاملہ ایکشن کے میدان میں ہی طے ہو گا۔ یوں لگتا ہے کہ انھیں کشمیر سے کچھ فوجیتاؤں نے یہ اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ ”جنتا پر“ پیر پنچال کو عبور کر کے کشمیر میں بھی موجیں مار رہی ہے اور اس کا زور نیشنل کانفرنس کے خیمے کی طن میں ڈھیلی کر رہا ہے۔ نئی حکومت کے لیڈروں کو اپنی تازہ کامیابی کے نشے میں یہ خوش فہمی بڑی سہادی معلوم ہوئی وہ اس خیال سے ہی بچھوئے نہ ساتے تھے کہ شیخ عبداللہ اور اس کی جماعت، جنھیں مرکز میں ان کے کانگریسی پیش رو طاقت یاد ولت سے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے، کو نئے حالات میں کشمیری عوام کے ذریعے بھی نیا دکھایا جائے گا اور اس طرح سے ان کے سرو بہرہ اندھ جائے گا۔ جس کی آزمودہ جو آسراں کو بھی رمی تھی اور سربراہان کا مذہبی کو بھی۔ میں جانتا تھا کہ ان کو یہ خوش فہمی مہنگی پڑے گی۔ لیکن اس وقت وہ سچی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھے اور جب میں نے انھوں نے انتخابی اشتراک کے متعلق میری تجویز کو میری کمزوری سے بھی تعبیر کیا ہو۔ میں اپریل ۱۹۷۱ء کو سرنگرہ لوٹا تو وہاں میرا استقبال بڑی گرم ہوشی سے ہوا۔ لال چوک کے ایک بہت بڑے اجلاس میں، میں نے نئی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ جنتا پارٹی میں میرے کچھ پڑانے دوست موجود ہیں لیکن میں کشمیری عوام کی تقدیر جنتا پارٹی کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ میں نے کانگریسیوں کی دشمناس گھات کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا کہ صرف نیشنل کانفرنس ہی ریاستی عوام کی عزت و آبرو اور آزادی کی حفاظت کرنے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتی ہے۔

نئی صورت حال کی بوموٹھ کر وادی میں میرے اور شیخ کا فرض کے تمام نئے
پڑائے ریاضی اور تازہ دم رقیب اور حریف ایک ناپاک اتحاد میں جٹ گئے۔ ایک
طرف جوں کے جن سنگھی فرقہ پرست اور پٹے ہوئے جاگیردار اپنے پھن بہرے لگے اور
دوسری طرف کشمیر میں مولوی قاروق اور ان کے پیرو اپنی دم قاتحانہ آغاز سے لڑنے
لگے ساہسال سے کچھ تہائی میں دیکھ ہوئے مولانا سمیع کی شاخ امید پھر لہلہانے
لگی حالانکہ لٹلٹلے پار لیاؤی انتخابات میں جب میں نے انھیں بخشی غلام محمد کے خلاف
لڑنے کی دعوت بھیجی تھی تو وہ ڈر کے مارے کئی کترا گئے تھے انھوں نے اس وقت یہ
کہہ کر رافرا اختیار کی تھی کہ بخشی غلام محمد کی حیثیت ہندوستان کی دفاعی حکمت
عملی کا ایک حصہ ہے۔ بھلا میں کیسے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال سکتا مولوی صاحب
مرکز میں میرے چند گتہ جینوں کو برسر اقتدار دیکھ کر باغ باغ ہو رہے تھے اور ان کی دبی
جوئی ٹھوڑیاں سطل پر آکر اب لچائی ہوئی نظروں سے مسند اقتدار کو تاک رہی تھیں۔
فی الدین قاروق صاحب بھی برسوں کے خواب خرگوش سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھے اور لیلانے
اقتدار سے بکھار ہوئے کے لیے اپنے سفید بالوں میں جتنا مادہ کہ خضاب کرنے لگے تو صاحب
اپنے چہرے بھائی غلام محمد صادق کا وزارت، اعلیٰ کے زمانے میں سفارشوں کا بہت اہم
مرکز و محور تھے اور اس طرح بالواسطہ اقتدار کے مزے لوٹ رہے تھے۔ جب لٹلٹلے میں
نے مولانا سمیع کے انکار میں جو جانے پر قرعہ صاحب کو بخشی غلام محمد کے مقابلے میں ٹھرنے
جو جانے کی دعوت دی تو وہ بھی سیٹے حوالے کر کے میدان سے رن فریکر ہو گئے۔ لیکن اب
ان کو پھر اقتدار کی دیوی ہنسکرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور انھوں نے نہ آؤ
دیکھا نہ آؤ اور ہمارے مقابلے میں کو گئے۔ یہ کہم پختہ نماز جو ہیں باور سے نئی دہلی میں
اپنا قہر سجانے اور اپنا کاروبار چمکانے کے شغل میں کشمیر کو بھول بیٹھے تھے راتوں رات

سرنگار پہنچ گئے اور شیخ مخالف محاذ کے آتایق بن بیٹھے وہ یہ بات بڑی آسانی سے فراموش
کر گئے کہ جس مراد پر بھائی اور اہل بہار کی بچائی کی قیادت وہ قبول کر رہے ہیں ان کو
وہ بار بار ہندو راج قائم کرنے والے جنونی اور رجعت پسند قرار دیتے رہے ہیں۔ ان تمام
شکست خوردہ جرنیلوں کا غضب العین مرث ایک نقطہ پر مشتعل تھا۔ نفرت —
شیخ عبد اللہ اور اس کی جماعت سے نفرت۔ اس کے علاوہ ان کے باہن کوئی قدر مشترک
موجود نہ تھی بلکہ یہ اکثر بھانٹ بھانٹ کی بولیاں بولتے رہے تھے۔ چونکہ نفرت کسی پائیدار
جماعت یا فتح یابی کا اینٹ کار نہیں بن سکتی۔ اس لیے ان کا انجام بھی معلوم تھا۔ لیکن ان
عقل کے اندھوں کو گمان تھا کہ نیشنل کانفرنس کی مخالفت مرکزی حکومت کی بھڑک چھاپا
میں وہ پھر سے بخشی غلام محمد کی سنت تازہ کر سکیں گے اور میرے خلاف اپنا آخری
مگر فیصلہ کن موعر کجیت سکیں گے۔ واقعات گواہ ہیں کہ معرکہ کس کا دائرہ ثوابت ہوا؟
کشمیر میں منڈا کی شاخ قائم کرنے کے لیے سب سے پہلا شوک مہنتہ نا نا سخی
دیش گوب، بھانڈو پر تپ سنگھ وغیرہ پر مشتعل ایک وفد سرنگار آیا۔ انھوں نے مولانا سمیع
مولوی قاروق، فی الدین قاروق اور دوسرے لوگوں سے لمبی لمبی ملاقاتیں کیں اور اپریل
کو شوک مہنتہ نے سرنگار میں مولانا سمیع کے جٹا پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔
ہمارے دوسرے مخالفین نے بھی دھڑا دھڑا جٹا پارٹی میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔
ان میں بخشی غلام محمد کے بھائی بند اور شام لال صراٹ جیسے پٹے ہوئے جہرے بھی
شامل تھے جو پارٹی اب وجود میں آ رہی تھی وہ سچے معمول میں بھان متی کے کٹے سے
مشابہت رکھتی تھی۔ بھلا کشمیر کے مولوی قاروق اور جموں کے چمن لال کپتہ میں کونسی
چیز مشترک تھی؟ صرف یہ کہ وہ نظریات، اعتقادات اور اصولوں کو فراموش کر کے
میری ذات اور میری جماعت کو نیچا دکھانا چاہتے تھے، انہی دونوں اہل بہار کی بچائی

جارج فرنانڈیس اور دوسرے بنگالی سرکار کشمیر آتے رہے اور نیشنل کانفرنس کی شرکت کے لیے اپنے مقامی دوستوں کے ساتھ کچھ دلی پکارتے رہے۔ اشوک ہنسن کو میں کافی دیر سے جانتا تھا۔ چنانچہ ان کے قیام سرگرمی کے دوران میں نے انھیں اپنے گھر کھانے پر بلا یا۔ اس وقت میرے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ اور مٹھا کر دھوی داس بھی تھے۔ ہمت صاحب نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ ان کی جماعت بنیادی اور اصولی طور پر نڈت جو اہل کمال نہرو کی کشمیر پالیسی کے خلاف ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ جو اہل کمال کی پالیسی کی مخالفت کشمیری اس اندرونی خود مختاری کی مخالفت کا دوسرا نام تھا۔ جس کی ضمانت آئین ہند کی دفعہ ۳۵۷ میں دی گئی ہے۔ چنانچہ جنتا پارٹی کا یہ عندیہ زیادہ دیر تک چھپ نہ سکا اور مستر ظریف یہ ہے کہ اس کا سب سے پہلا اظہار میرے محترم دوست جے پرکاش ترائی نے نئی الدین قزو کے نام ایک انتہائی مکتوب میں کیا۔ جے پرکاش جو ۱۹۴۷ء میں آئین ہند کی چار دیواری میں کشمیر کے لیے ہر ممکن اندرونی خود مختاری کی وکالت کر چکے تھے اپنے مکتوب میں لکھا تھا:

”کشمیر نے آج تک ہندوستان کے ساتھ ایک قسم کی علیحدگی کا صحیح ظاہر کیا ہے اور مجموعی طور پر وہ ان کی سیاسیات ملک کے بڑے سیاسی واقعات کے دھارے سے ہم آہنگ نہیں رہی ہے۔ اب جبکہ آپ کشمیر میں بنگالیوں کی قیام کرنے کے لیے سرگرم ہیں مجھے امید ہے کہ یہ سیاسی پہلو پاٹ دی جائے گا۔“

ابھی اس بیان کی صدائے بازگشت بخونہ ہوئی تھی کہ جنتا پارٹی کے ایک اور روشن چراغ سچرا منیم سوامی نے اعلان کیا کہ وہ دفعہ ۳۵۷ کی تسبیح کے لیے ہر ممکن زور لڑائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اب آئی وائی کی حدود واضح ہو گئی تھیں۔ اندر سے ہماری تحریک کے بھگوڑے ساتھی اور روایتی اور نظریاتی دشمن اپنے ناپاک عزائم پورا

کرنے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لیتا چاہتے تھے اور باہر سے ہماری تحریک اور تنظیم کے بنیادی اصولوں اور مقاصد کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ریاست میں جنتا پارٹی کی گورنری راج کے نظام کو اپنی ٹیڈا کے طوفانی دھتے کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ انتظامیہ بحیثیت مجموعی ہمارے مخالفین کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ ایک غیر ریاستی ریٹائرڈ آفیسر ستارا والا کو گورنر کا مشیر اعلیٰ بنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ وہی ستارا والا ہے جس کے کارنامے بیان کر کے کسی نے مرزا محمد افضل بیگ کو ڈرنا چاہا۔ بیگ صاحب نے اپنی حاضر جوابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ”گھبراہٹ نہیں وہ اگر ستارا والا ہے تو ہم انھار والا ہیں۔“ یہ بات عام تھی کہ انھیں نیشنل کانفرنس کو کسی نہ کسی طرح مات دلائے کا مشن سونپ دیا گیا تھا۔ جنتا پارٹی کے صدر دفتر کے لیے شہر کے بارونق ترین علاقے میں ”نارٹ لاج“ کا عایشانہ بنگلہ الاٹ کیا گیا جس کو سرکاری سیکرٹریٹ کے بعد سب سے زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔ جنتا کے لیڈ ہر مرحلے پر حکومت کے ممولات میں ٹانگ اڑاتے رہتے تھے اور ہر وقت حکمرانوں کے ساتھ ہمنوا رہتے۔ حکومت نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کا قافیہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میری پرانی تصویریں دفتر اور دوسری عام جگہوں سے رات کے اندھیرے میں غائب کر دی گئیں۔ اُدھر سے جنتا کی مرکزی کمان کے اپنی جھنڈیوں کے قتل گھول دیئے اور لاکھوں روپے کے کرنسی نوٹ کشمیر کے جنتا لیڈروں کی جیبوں میں چھپانے لگے۔ جیپوں، پدھڑوں اور دوسرے اقتصادی ساز و سامان کی کوریج شروع ہو گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ کشمیر کی سیاسی فوج کشی میں کوئی کشمیر نہیں رہی تھی ہے اس کے مقابلے میں نیشنل کانفرنس کے ذرائع بڑے محدود تھے۔ نشر و اشاعت کے تمام اداروں پر ہمارے مخالفین کو بالادستی حاصل

تھی اور ہماری آواز بلند کرنے والا کوئی ترجمان موجود نہ تھا۔ اس بے سرو سامانی میں اگر کوئی چیز ہمارے آڑے آئی تو وہ کشمیری عوام کی سیاسی بصیرت اور ان کا قومی شعور تھا عوام نے مخالفین کے آڑے ہوئے غبار کو اپنی بصارت میں شامل نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اپنے سیاسی شعور کی بینک دگا کر یہ بات سمجھ لی کہ جنگ دراصل ان کی قومی خودداری اور اس کے اخلاقیات کے مابین ہے۔

ہمارے مخالفین کے ہتھکنڈے جن قدر سخت ہوتے گئے ہمارے عوام کو نیشنل کانفرنس سے اسی قدر زیادہ وابستگی پیدا ہو گئی۔ ان دنوں کاغذی گنڈے بارہولہ تک سرشار رنگ کے پھر رہے ہمارے تھے۔ یہ پھر بے دراصل ان کی بیدار ہونے والی فیرت کی آئینہ نگاہ تھی مگر جو شیطانی اظہار تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے جارے ہیں کشمیریوں کے جذبہ آزادی کے شکوے انارکلی کے رنگ میں لہہاٹ اٹھے ہوں۔ لیکن جوش کی یہ لہرجوں جوں بھر جاتی تھی جتنا پارٹی کے لیڈر اسی قدر بوکھلا رہے تھے ذرائع نشر و اشاعت پر جتنا ہے اس قدر اجارہ حاصل کر لیا کہ کانفرنس نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اُدھر ہمارے مخالفین نے ہمارے کانکون پر تشدد آمیز حملے شروع کر دیے۔ ۱۸ جون کو نیشنل کانفرنس کے دو کارکن موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ گنڈستان کے ایک سرکردہ نیشنل کانفرنسی عبدالحق بٹ کو گاڑی کے نیچے لایا گیا اور پھر اس کی لارینٹ کر کے قسے پانی میں ڈال دیا گیا۔ تاہم یہ نہ نزدیک نیشنل کانفرنس کے ایک اور کارکن عبداللہ بٹ کو پتھری گھونپ کے قتل کر دیا گیا جب وہ اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر منٹک مرگ کی خدمت جا رہا تھا۔

اُدھر دلتا ایڈویس ہم سے کچھ اور آواز مانٹوں کا خراج حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مئی کے آخری ہفتے میں مجاہد منزل کے ایک جیلے میں نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم کا آغاز

کرتے ہوئے ہارنی کے امیدواروں کی فہرست عوام کے سامنے رکھی میں نے اس بات کا اعلاہ بھی کیا کہ کشمیر کی اندرونی خود مختاری کے سوال پر کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی اور ہم کسی دباؤ سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ سمراجن کو گاندھیل جاگرمین نے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر لیے اور پھر دیہات کے دورے کا پروگرام بنالیا۔ اُسی ہفتے میں علاقہ بڈگام کے دورے پر روانہ ہوا۔ راستے میں ایک جگہ ہمیں گھوڑوں پر مسافت طے کرنا تھی۔ میں بچپن سے گھوڑ سواری کا شوقین رہا ہوں اور اپنی سیاسی زندگی میں میرا خاصا وقت گھوڑے کی پیٹ پر صرف ہوا ہے۔ مگر وہ قہر ہے جب کا کا آتش جواں تھا۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا لیکن جب جیلے کے بعد واپس آیا تو میں نے چھاتی میں درد کی ٹیمپیں اٹھتی محسوس کیں۔ پھر گھر پہنچا تو درد کی شدت بڑھتی ہی گئی۔ چنانچہ ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا اور معلوم ہوا کہ تجھ پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا ہے یہ میرے لیے انتحالی مہوفا سے علیحدگی کا سگنل تھا۔ چند دن کے بعد جب میری حالت بگڑ گئی تو دہلی سے ڈاکٹر مجاہد اور ڈاکٹر بیجا میرے علاج کے لیے سر بیگڑائے۔ ان دنوں میری سبک ڈوڈہ ضلع کے دورے پر تھیں جب میری حالت نازک ہونے لگی تو گورنر جھانے جو ایک موزٹر اینٹ ہیں، شخص اخلاق کا مظاہرہ کر کے ان کو دہلی سے واپس بلانے کے لیے پہلی کو پڑھجھوایا اور وہ ہمارے فزینڈ ڈاکٹر فاروق کے ہمراہ پناہ دورہ اُدھورا چھوڑ کر واپس آ گئیں۔ ان کو واپس لکھن میں دیکھ کر مجھے ایک سکون سا ہوا۔ لیکن اگلے ڈیڑھ ماہ کے لیے میں صاحب فزٹ ہمارا اس دوران کشمیر لوں نے جیلے اور طلبوں کا اہتمام کر کے میری صحت مندی کی دعائیں کیں اور خیر و برکت کی جمانوں کا بھی اہتمام کیا۔ آخر کار کشمیری عوام کی واہانہ اور پرنسٹون دعاؤں نے اپنا اثر دکھایا اور میں باری پر آپستہ آہستہ قانونیے رنگ میں اپنے ہم وطنوں کے غلوں اور محبت کے مظاہرے سے جلد صحت مند ہوا۔ انھوں نے نہ صرف

رات دن میری صحت یابی کے لیے دعائیں کیں بلکہ جانوروں کی قربانی اور مالی چڑھاوے پیش کر کے بے مثال ایثار دکھایا۔

میری حالت میں حقوقِ ساٹھراؤ پیدا ہو گیا تو تشیل کا نفرس کی انتخابی مہم کی طرف سے توجہ مبذول کی جانے لگی۔ میں تو خیر بستر میں کروٹیں بدلنے اور دعا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ لیکن میری سلیک کو اس وقت سے اندازہ محنت اور دوڑ وھوپ سے کام لینا پڑا۔ ایک تو اسے میری صحت کی فکر دانتیگر بھی دوسرے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس نے بڑے تحمل اور خندہ پیشانی کے ساتھ یہ صعوبتیں سہہیں بیگ ساسہ غلام محمد شاہ ڈاکٹر فاروق اور دوسرے ساتھیوں نے بھی بڑی محنت کی اور مادی وسائل کی کمی کے باوجود عوام کا حوصلہ برقرار رکھنے کے جتن کیے۔

اُدھر جنٹا پارٹی کا پارہ خوب چڑھا ہوا تھا۔ کشمیر کی سیاسی فتح کے لیے اس نے اپنی بڑی بڑی توپوں کو میدان میں بھونک دیا۔ جنٹا کے بڑے بڑے جنگاد ری جوق در جوق کشمیر اگر اپنے مقامی صوبیداروں کا حوصلہ بڑھاتے رہے اہل ہماری باپنی چرن سنگھ، جگ جیون رام اور پھر وزیر اعظم مزارچی ڈیسانی بذات خود انتخابی مہم میں جان ڈالنے کے لیے آئے۔ مجھے ان سرگرمیوں کا شکوہ تو نہیں، لیکن یہ بات میرے لیے کوفت کا باعث تھی کہ کشمیر اگر انھوں نے انسانی تعلقات کے کچھ ابتدائی ادب کا رکھ رکھاؤ مناسب نہیں سمجھا۔ مزارچی سمجھا۔ جگ جیون رام اور چرن سنگھ سبھی میرے دیرینہ شیناسا اور دوست تھے۔ وہ سیاسی طور پر مجھے مات دینے کے لیے جو کچھ بھی کر رہے تھے وہ قابلِ فہم تھا۔ لیکن سرسنگرمین قیام کے باوجود انھیں میری بیمار پڑوسی کی توفیق نہیں ہوئی۔ حالانکہ ہمارا گاندھی اور جواہر لال نہرو نے کبھی انسانی تعلقات میں وضع داری کو ہاتھ سے نہیں جاسنے دیا تھا۔ اور ہمیشہ سیاسی اور ذاتی تعلقات کو

ایک دوسرے سے الگ رکھا۔ یہ بات کتنی عجیب تھی کہ جب مزارچی بھائی کو لندن میں میری بیماری کی اطلاع دی گئی تھی تو انھوں نے گورنر کے نام اپنے برقیے میں کہا کہ ”کلک کواچی شیعہ صاحب کی بڑی ضرورت ہے اور ان کی بیماری سے مجھے سخت تشویش لاحق ہوئی ہے۔“ لیکن جب وہ سرسنگر آئے تو وہ میری عیادت کے لیے چندر نٹ نہ نکال سکے حالانکہ اس دورے میں وہ مولوی فاروق صاحب کے یہاں عیادت کھانے کے لیے گئے۔ جہاں مولوی صاحب نے انھیں بڑے فخر سے اس کرسی پر بٹھایا جس پر تیس سال پہلے ان کے چچا مولوی یوسف شاہ مغفور نے محمد علی جناح مرحوم کو بیٹھا تھا۔ اس موقع پر مولوی فاروق کے یہاں جمع ہونے والے طاغی نے مزارچی بھائی کا لوک گیت کے ان دونوں سے خیر مقدم کیا۔

سبز دستار نسجی چٹے رعنی پاکستا نلک غازی آو
دھماکے سبز دستار پر حضرت پیغمبر اسلام کی مہربان ہے۔ ہمارے یہاں
پاکستان کی غازی نے قدم رنجہ پڑایا ہے

اس سلسلے میں وہ مکالمہ دلچسپ ہے جو مولوی فاروق اور مزارچی بھائی کے مابین میواغظ منزل میں ہوا۔ مولوی فاروق نے مزارچی کو خوش کرنے کے لیے کہا کہ جس کرسی پر آپ تشریف فرما ہو گئے ہیں اس پر کبھی جناح صاحب بیٹھے تھے۔ مزارچی نے جھٹ پٹ کہا۔ انشوری کی رہا ہے اس کرسی کو بھی ہم نے فتح کر لی۔ ابہر حال شاید مرکزی لیڈروں کی اس بے رخی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ریاستی جنٹا پارٹی کے لیڈر انھیں میرے پاس آنے سے روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ لیکن کچھ اخلاقی قدریں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کسی قسم کے باؤں میں توڑنا نہیں جانا چاہئے۔ جگ جیون رام اور چرن سنگھ نے سرسنگر کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے مجھ پر بڑے ناز و اعزاز کیے۔ چرن سنگھ نے

یہ کہا کہ اگر شیخ صاحب سمجھتے ہیں کہ وہ پھر حکومت سنبھال سکیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ بلکہ جیون رام نے ”اندراء شفقت“ مجھے سیاست سے ریٹائر ہوئے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ مجھ پر دلی کی بیماری کا حملہ ہوا تھا۔ مجھے جگ جیون کے اس بیان سے اس لیے بڑا کرب ہوا کہ ان جیسے شائستہ بزرگ سے اس سطح پر بات کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے دوسرے دن ان عموں کے جواب میں اپنے بستر علالت سے بیان جاری کیا۔

”میں نے ہمیشہ جگ جیون رام اور چرن سنگھ کی عزت کی ہے اور وہ پوری طرح مجھ سے اور میری زندگی سے واقف ہیں۔ دوستی کا اتفاق تھا کہ وہ حالیہ دوروں کے وقت اپنے بیمار دوست کی عیادت کو آتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس طرز عمل سے مجھے نا یوسی ہوئی۔ انھوں نے جیٹا پارٹی کے کارکنوں پر حملے کا ذکر تو چھپا لیکن نیشنل کانفرنس کے دو کارکنوں کی موت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مشرک جیون رام نے مجھے ایسا مشورہ دیا جو وقار و دفاع کے منصب کے روایتی آداب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آئیں ان کی محنت اور محنت کے بارے میں یاد دہانی کرانے کی ضرورت نہیں اگر جگ جیون کو اس وقت جبکہ وہ ڈھاکہ میں شدید بیمار ہو گئے تھے، سیاست سے ریٹائر ہوئے کا مشورہ دیا جاتا تو یہ کتنی ناشایان بات ہوتی“

دفترِ اعظمِ قمر آباد جی ڈی ای آفریں کشمیر آئے اور انھوں نے پہلی کاپی کا استعمال کر کے شوبیان، کوہگام، اسلام آباد، جیٹا پارٹی، اوتنی پور، پانپور، چین، ہندوہ، ترہگام اور آفریں سرگرم میں تقریریں کیں۔ لیکن یہ بات ان کے حق میں جاسے گی کہ مولوی قاریوں کے یہاں دس ملائی اور گاما جگ کے حلوے سے نکتہ اندوز ہونے کے

باوجود انھوں نے انتخابات کو مٹوئی کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔ یہ تجویز جتنا کہ مقامی لیڈروں نے پیش کی تھی۔ وہ ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے ہجرت ناک انجام کو ٹاڑ گئے تھے اور اب انتخابات مٹوئی کر کے دھاندلیاں کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ لیکن وزیرِ اعظم نے ان کی توقعات پر اوس پھیر دی۔

ووٹ ڈالنے کی تاریخ جوں جوں نزدیک آتی جا رہی تھی ہمارے مخالفین کی بدعوا ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ انھوں نے نفسیاتی جنگ کے غیر اخلاقی حربے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ نیشنل کانفرنس کا کنون کا حوصلہ توڑنے اور عوام میں انتشار پیدا کرنے کے لیے یہ افواہ پھیلائی گئی کہ میرا انتقال ہو گیا ہے اور میرے جسد کو برت میں محفوظ رکھا جا رہا ہے۔ اس قسم کی افواہیں زیادہ تردید بات میں پھیلائی گئیں۔ میں نے ووٹ ڈالنے کے دن سے دو چار دن پہلے اپنے بستر علالت سے ایک خاص اپیل جاری کی۔ جس میں عوام کو ان ہنگاموں سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ میں نے اپنی اپیل میں یہ بھی کہا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ووٹ ڈالنے کے لیے نکلیں۔ تاکہ انتخابی بے ایمانیوں کے مواقع کم سے کم باقی رہیں۔ میں نے اپنی نجیافت اور کمزور آواز میں اس اپیل کو صدا بند بھی کر دیا اور اپنے نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم کے اختتام پر گاندھی پارک کے چلے میں تنہا دایا گیا۔ اس اپیل کے اثر کے متعلق دہلی کے ایک سرکردہ اخبار ”انڈیا ٹائمز“ نے لکھا۔

”شیخ عبداللہ نے بستر علالت سے جوں جوں اپیلوں کو دہلی کے نام جاری کی ہے اُس سے نیشنل کانفرنس کے حق میں پائسلٹ گیا ہے۔ اس اپیل سے مخالفت جماعتوں کے امیدواروں کا سارا اثر زائل ہو کر رہ گیا ہے۔“

۳ جولائی کو لوگ جو حق و جرم ووٹ ڈالنے کے لیے نکلے۔ حالانکہ ساری دکانیں بند رہی تھیں۔ ۵ جولائی کو جب پہلے ناک آنا شروع ہو گئے تو ساری دنیا کو

اندازہ ہو گیا کہ جتنا پارٹی نے جن سوراؤں کو رستم و سگم کی شکل میں پیش کیا تھا، ان کے پیر کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ یہ سارے بت ایک ایک کر کے اوندھے منہ گر گئے۔ یہیں شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ ان حلقوں میں جنہیں ہمارے مخالفت اپنا مضبوط گوشہ سمجھتے تھے، ان کے پہلوانوں کی خفایتیں ضبط ہو گئیں۔ چنانچہ عوامی نفرت کے اس سیلاب میں حمی الدین قرہ، مولوی افتخار، مفتی سعید، غلام رسول کار و غیرہ بھوکوں کی طرح بہہ گئے۔ جہاں نیشنل کانفرنس کو اسٹیج میں سے پچاس نشستوں پر کامیابی مل کر قطعی اکثریت حاصل ہو گئی وہاں ہمارے مخالفین نے اپنی خفایتیں ضبط کروانے میں ریکارڈ قائم کر لیا۔ یہ نتائج اتنے دھماکہ فیز تھے کہ دہلی کے ایوان بھی بل گئے۔ کشمیر میں ہمارے مخالفین حواری غیظ و غضب سے بچنے کے لیے روپوش ہو گئے اور حکومت کو ان کی حفاظت کے لیے ان کے گھروں پر پولیس کا سپرو وچھا دینا پڑا۔

انتخابی نتائج سامنے آ گئے تو ساری ریاست خاص طور پر راجدھانی مرہٹنگر میں جشن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نیشنل کانفرنس نے سجدہ شکر ادا کرنے کے لیے پوٹو گراؤنڈ میں، جو جتنا کے بڑے لیڈروں کے جلسوں کا مرکز بنا دیا گیا تھا، جلسہ طلب کر لیا۔ میری جسمانی حالت اس قدر خلیک نہ تھی کہ میں جلسہ گاہ تک پہنچ سکتا۔ لیکن عوام کی بے پناہ محبت اور ساتھیوں کے بے پناہ اصرار پر ڈاکٹروں نے مجھے انتہائی احتیاط کے ساتھ جلسہ گاہ تک جانے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ مجھے اپنی قیام گاہ سے ہی بس کی چھت پر ایک موٹے پر دراز کر کے جلسہ گاہ تک پہنچایا گیا۔ عوام کا ایک مٹا مٹا ہوا سمندر جوش و خروش میں موجزن تھا۔ میں تقریر کرنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن میں نے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تلاوت کرنے کے بعد علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا:

جب مشق سکھاتا ہے آدابِ خود آ کا ہی
کھلنے میں غلاموں پر اسرارِ مشہدِ شافی

اس کے بعد اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر عوام کی محبت کا جواب دیا۔ جب مجمع خوشی سے لہریں مارنے لگا تو میں واپس گھڑ گیا۔

اسی اثناء میں نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے مجھے اپنا قائد چن لیا اور مجھے گورنر صاحب کی دعوت پر حکومت بنانے کی ذمہ داری قبول کرنا پڑی۔ ۱۷ جولائی کو میں اپنی بیگم کے ساتھ صبح دس بجے کے قریب راج بھون پہنچا اور وہاں اپنی ذمہ داری کا حلقہ اٹھا لیا۔ میرے آگے پھر مستقبل کے پہنچ تھے اور میں جہاں کا نام لے کر اس تسلسل سفر کے لیے پھر کر رستہ ہو کر گامزن ہو گیا۔ مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ رہا تھا:

سفرِ زندگي کے لیے برگ و ساز

سفرِ حقیقتِ حضر ہے مجاز

▲▲▲

آں برہمن زادگان زندہ دل

اس باب کا عنوان اقبال کے ایک شعر سے لیا گیا ہے جو کشمیری پنڈتوں کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ ”ان زندہ دل برہمن زادوں کے چہرے سرخ گل لالہ کو بھی اپنی آب و تاب سے شرماتے ہیں۔ ان کا خمیر ہماری خاک سے آمٹا ہے اور ان ستاروں کا مطلع ہمارا محبوب کشمیر ہے۔“

کشمیر کے خاص سیاسی تناظر میں کشمیری پنڈت جلتے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ان کے متعلق تفصیل سے بات کیے بغیر کشمیر کی مشہد کے ساتھ انصاف ہو گا اور نہ اس زمین جلتے کی لیاقت اور کارناموں کے ساتھ وادی میں ان کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہے لیکن نمک کی یہ چاشنی نہ رہے تو کشمیر کا مزہ ہی پھیکا پڑ کر رہ جائے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں وہ ظلم و جبر کے آلات (INSTRUMENTS OF TYRANNY) کی حیثیت سے سامنے آتے رہے ہیں اور اس لیے ان کا سیاسی کردار متنازع رہا ہے کسی سیم ٹولینے کے کشمیری پنڈتوں کی کشمیر میں اہمیت کا ذکر اس وقت ایک دلچسپ ڈھنگ میں کیا گیا جب کشمیر کے مسئلے

پربہندوستان اور پاکستان کے درمیان رسمہ کشی عروج پر تھی۔ اس سے کہا کہ کشمیر کا جھگڑا دراصل کشمیری پنڈتوں کا گھریلو جھگڑا ہے۔ ایک طرف علامہ شیخ محمد اقبال ہیں جنہوں نے پاکستان کے خیال کو جنم دیا اور دوسری طرف جو اہر لالہ شہر ہیں جو بہندوستان کے وزیر اعظم ہیں۔ اقبال نے خود اپنے نسب کے متعلق کہا ہے :

میں اصل کا خاص سومنتی

آبا مرے لاتی و مناتی

مرا سنگر کہ در بہندوستان دیگر نمی مینی

کہ برہمن زادہ رمز آشنا کے روم و تبریز است

یعنی پاکستان کے جنم داتا اقبال بھی کشمیری پنڈتوں کی نسل سے ہیں اور ایک اور عظیم کشمیری پنڈت — شہزادہ — کے ملک کے کشمیر کے مسئلے پر جھگڑ رہا ہے۔ میں خود مسلمانوں کی اس حسرت سے تعلق رکھتا ہوں جن کے آباواجداد کشمیری پنڈت رہے ہیں اور جن کی رگوں میں اسی برادری کا بہو گردش کر رہا ہے۔ میرے اسلاف چار پانچ پشتوں پہلے کشمیری پنڈت تھے۔ اپنی ساری زندگی میں اس طبقے کے ساتھ میل جول و رشتہ بقول رابرٹ قراسٹ دو پرمیوں کا سارا ہے ”کبھی تلخ اور کبھی شیرین۔ کشمیری پنڈتوں کے متعلق رامیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کی ذہانت، ان کی لیاقت اور ان کی خوبصورتی کے متعلق کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ انھوں نے ماضی اور حال میں کشمیر کی اور اس کی تاریخ میں جو رول ادا کیا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے خود کشمیری کی پچیدہ جتنی کی چند گہیں کھولی جا سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس لیے منظر میں کہ خود کشمیری پنڈتوں کی نفسیات کشمیر کے حالات کے آثار چڑھاؤ سے ایک عجیب معجون مرکب بن گئی ہے۔

”کشمیری پنڈت“ کی اصطلاح دو سو سال سے کچھ زیادہ پرانی ہے یعنی اسے

دلی کے زوال پذیر مغل شہنشاہ محمد شاہ نے تراشا اور وہ بھی اپنے ایک درباری
جے رام بھان کی رسمت ماہر جے رام بھان ایک کشمیری برہمن تھے۔ ان برہمنوں کے
سرخیل جنھوں نے مغل بادشاہوں کی سرپرستی کی خاطر کشمیر چھوڑ دیا تھا اور دلی آگروہ
اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان پنڈتوں نے اپنی
خدا داد قابلیت سے مغل دربار میں زبردست رسوم حاصل کر لیا تھا اور وہ ہندوستان
کے باقی برہمنوں سے اپنے آپ کو بزرگ و برتر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ساتھ
خط امتیاز وضع کرنے کے لیے ایک فرمان کے ذریعے منادی کرا دی گئی کہ آئندہ سے
انھیں کشمیری پنڈت کہ کر پکارا جائے۔ کشمیری پنڈتوں میں اپنی جنم بھومی کشمیر سے
وابستگی کا اتنا فخر یہ جذبہ تھا کہ انھوں اپنا الگ دھرم کشمیری شیومت اختراع کیا
انھوں نے کشمیر میں اپنے لیے باقی ہندوستان سے الگ رسوم اور تہوار مقرر کیے۔
مشہور کتاب "دوستان مذہب" کے مصنف ملاٹھنسی فانی کشمیری نے بھی لکھا ہے کہ
کشمیری پنڈتوں نے اپنے سارے تہ تہ اور تہوار کشمیر میں محدود کر دیئے وہ دیوانی
نہ نہاتے تھے مگر مشہور اتری مانتا تھے۔ انھوں نے کشمیر میں ایک متوازی لنگا ایک
الگ سنگم تہ تہ اختراع کیا۔ ان کے کھانے پینے اور میوہ سوات بلکہ زیورات اور شادی
بیاہ کے رسوم تک باقی ہندوؤں سے الگ تھلگ رہے جو آج تک بھی اپنے انفرادی
خود غاں رکھتے ہیں۔ امرتا تھ، کھیر بھوانی اور شارنیکا کے مقامی تہ تہ اس کے علاوہ
ہیں۔ جن کو اب بیرون کشمیر کے غیر مسلم دوست بھی عقیدت سے پوجتے ہیں۔ کشمیری
مسلمانوں نے اس پہل کا جواب یوں دیا کہ وہ کشمیری پنڈتوں کے رسوم و رواج
اور عادات و خیالات کے اس قدر قریب رہے کہ ان کے اور پنڈتوں کے درمیان
سماجی سطح پر امتیاز ذکر نامشکل ہو گیا۔ کشمیری پنڈت نسب لیکن پنجابی ماحول میں

پہلے ہوئے علامہ اقبال کو کشمیری مسلمانوں کی اس خاصیت و خصلت سے بڑی الجھن ہوئی
تھی اور انھوں نے ان کی "پنڈت مرثت" پر یوں پھینکی تھی
کشمیری کہ بامندگی خود گرفتہ
ہتے سے تراشہ زنگ مرادے

د کشمیری کو بہت پرستی کا اتنا چٹک لگا ہوا ہے کہ وہ قبر کے پتھر سے
بھی مورتیاں تراش لیتا ہے۔

واقع یہ ہے کہ کشمیر میں پنڈت اور مسلمان کا سید بھاڑ ہی نہ تھا اور ان کی
یک جہتی اور یک سوئی کی حقیقت مجموعہ کے اس شعر میں بیان ہوتی ہے
شترہ و چھو سے اُکھے شہجہ کراں پینڈی تہ مسلمان
آہ کھو تہ بہ لیاہ لولہ کے شہجہ خیر و سہ
دیں نے وہاں ہندو اور مسلمان کو ایک ہی جگہ سجدے کرتے دیکھا اور
یہی پریم نگر کی سب سے بڑی خبر ہے۔

یہ کوئی شاعر نہ تعلق انھیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ جہاں مسلمان آج بھی چھوڑ اور ہندوؤں
کی عزت کرتے ہیں وہاں پنڈت آج بھی شیخ نور الدینؒ اور حضرت محمدؐ حرمہؓ کی
نمایاں پر مرادیں مانگتے ہیں۔ لی وید دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور وہ اب تک
یہی فیصلہ نہیں کر پائے کہ وہ ہندو مری یا مسلمان؟ جہاں پنڈت شاعروں نے فارسی
اور اسلامی ادب میں ایسا نئے کیے وہاں مسلمان شاعروں نے شاستر اور شیومت کے
غلطے کا کلمہ کھلا پر جا رکھا۔

کشمیری پنڈتوں کا الگ طبقہ تاریخ کشمیر میں شہبیری دور کے آغاز سے ہی نظر
آتا ہے۔ کشمیر میں اسلام تو اس کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ تبلیغ اور پرچار سے۔ اسلام

کے کشمیر میں طلوع سے پہلے یہاں کی زندگی میں تناؤ اور کشاکش پیدا ہو گئی تھی اور
 بودھوں اور برہمنوں کے درمیان زبردست آویزش جاری تھی چنانچہ ہر شخص دیو
 کے وقت باقاعدہ خانہ جنگی کی نوبت آئی اور کھن پندت نے ہر شخص دیو کو "چھہ"
 قرار دیا۔ ہر شخص دیو اگرچہ ہندو تھا لیکن اُس نے مندر توڑے اور ہونے بچا بندی
 اور پتیل کی صورتوں کو چھٹا کر اُن کے سینے ڈھالے۔ واقع یہ تھا کہ اس سماج میں
 استعمال اور عدم توازن سے زوال کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور یہ اپنے اندر دنی
 تضادات کی وجہ سے کھوکھلا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب اسلام آیا تو اُس میں یہ تضادات
 خصوصی کی بجائی میں اپنے والے عوام کی اکثریت نے لبیک کہا۔ اسلام اُس وقت ایک
 فوٹے ہوئے جاگیر داری سماج کی دم گھومتے والی فضا میں رہن سہن کرنے والی
 جنتا کے لیے نئے خیالات اور نئے ضابطہ حیات کے تازہ جھوکے لے کر آیا تھا۔ اسی
 وجہ سے اسے قبول عام بھی حاصل ہوا۔ اور اُس نے کشمیریوں کی تخلیق اور ارتقائی
 قوتوں کے سرچشمے بھر جاری کر دیے۔ رہی سہی کسر صفوں اور ریشیوں نے اپنے
 پاکیزہ کردار، نیک نفس عوام دوستی اور انسان پسندی سے پوری کر دی۔
 رنجلی ذات کے دیے کچھ ہوئے عوام اگرچہ اسلام پر ایمان لے آئے لیکن برہمنوں
 کا اعلیٰ طبقہ عموماً متوجہ اپنے روایتی دھرم اور مسلک پر ڈٹا رہا۔

یہ سلسلہ جس رہا تھا کہ سلطان سکندر کے وقت میں ایک کشمیری برہمن مہتہ پٹ
 نے اسلام قبول کر لیا اور اس نے اپنی دختر سلطان کے نکاح میں بھی دے
 دی۔ اس نے اپنا نام سمیت الدین رکھا۔ مہتہ پٹ کے خلاف کشمیری برہمنوں نے بڑا
 شدید رد عمل ظاہر کیا۔ چنانچہ اُنہیں نے اُن کا زور اور اقتدار ختم کرنے کی کھان لی
 وہ لکھ کر بھیج دی تھا اور اُسے معلوم تھا کہ مندروں اور استھانوں کے ساتھ
 لے کر کشاکشی کی بجوت کے ممنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

مفاہات خصوصاً کا ایک بڑا سلسلہ یہ جڑا ہوا جنہیں ہے بلکہ یہ طاقت کے متوازی مرکز
 بننے کی صلاحیت اور ذرا غلط بھی رکھتے ہیں۔ اُس نے مندروں کے ساتھ چھوٹا چھڑ
 شروع کر دی اور برہمنوں کو بھی ہراساں کر دیا۔ چنانچہ اُن میں سے بہت سے لوگ
 اپنا عزیز وں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور سارے بھارت ویش میں تسبیح کے دافوں
 کی طرح بکھر گئے۔ وہ مہتہ پٹ کے متعلق بھی طور پر کہہ سکتے تھے کہ ج
 من از میگانگان ہرگز نہ تالم
 کہ با من آنچہ کرد آن آشنا کرد

لیکن سکندر کے فرزند سلطان زین العابدین نے مہتہ پٹ کی اس پالیسی کو ترک
 کر دیا اور اس کی نگاہی ماناقت بھی کر دی۔ اُس نے جگن ناتھ پوری، دہلی اور گجرات
 تک اپنے مشن بھیجے اور روٹے ہوئے کشمیری برہمنوں کو واپس کشمیر لے کر آواہ
 کر لیا۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے خاص نسخے جن میں "اتھروید" کا نادر نسخہ
 بھی شامل ہے خاص تلاش سے کشمیر لایا۔ کشمیر میں ان برہمنوں کو اعلیٰ عہدوں پر
 فائز کر دیا اور اُن کو جاگیریں دیں۔ وہ اگرچہ ایک راسخ الاقتصاد مسلمان تھا مگر
 خود اُن کی مذہبی کتابوں "نیل مت پرائن" اور دوسرے شاستروں کا پابند عقیدت
 سے مستحق تھا۔ وہ برہمنوں کے خاص ہتھیاروں میں شریک ہوتا تھا اور وہاں اپنے
 ماتھے پر تلک بھی لگا تھا۔ اس کی برہمن فوازی اس حد تک عام تھی کہ اس کا درباری
 مودع جو راج مات لکھتا ہے کہ وہ برہمنوں کا کھد کھلا طرفدار ہے۔ واقعہ یہ ہے
 کہ ہندوستان میں صحیح قسم کی سیکولر روایات کی بنیاد سلطان زین العابدین پٹشاہ
 ہی نے ڈالی۔ اس سلسلے میں شیعہ عجم کے ساتھ سوزہ ہند کا آمیزہ تیار کرنے میں کشمیر
 کے اس فطیم فرزند کو اذیت کا شرف حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں

صحیح قسم کی سکیورٹی روایات کی بنیاد سلطان زین العابدین بدشاہ ہی نے ڈالی۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس عظیم کشمیری کے کارناموں کو ابھی تک جائز جگہ نہیں ملی ہے۔ اس کے ایک تئیس سو سال بعد نعلی اعظم اکبر بادشاہ نے غنچ شاہ کی تقلید کی۔ زین العابدین کی برہمن فرائی قصہ بڑھی ہوئی تھی کہ جیسا لال کلم کے لکھنے کے مطابق اس کا لقب ہی "بدشاہ" پنڈتوں کا بادشاہ ہو گیا۔ جو اس وقت استعمال سے بدشاہ بن گیا۔ اس نے گاؤں کشی پر قانونی پابندی لگا دی۔ جو آج بھی کشمیر میں موجود ہے۔ علم عام ہے اس جذبے کی صدائے بازگشت میں گائے کا گوشت ہی نہ کھایا اور وہ آج گائے کا گوشت سے کوئی رغبت نہیں رکھتے۔ اسلام کے طوع سے پہلے کشمیری برہمنوں نے عظیم ہستیاں پیدا کیں۔ جن میں مکہ چوگ، اچھوگت، کھیتندرا، متیل دیو اور کھنچ پنڈت جیسے طبیب، عالم، فلسفی اور مورخ شامل ہیں۔ کشمیری برہمنوں کی علمی اور تہذیبی کامیابیاں اتنا رنگ لائیں کہ قدیم ہندوستان میں دکن بلکہ تامل دیش کے لوگ اس کو شار دایشیہ تسلیم کرتے تھے اور شاردا علم کی دیوی سرفوتی کا ہی ایک اور نام ہے ان دور دراز جگہوں پر اب بھی رواج ہے کہ جب کوئی برہمن اعلیٰ تعلیم (مریویا) ختم کرتا ہے تو وہ کشمیری طرف منہ کر کے سات قدم اٹھاتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ اس رسم کو "ست پدی" کہتے ہیں۔ خود بدشاہ کے وقت میں اس کا افسر الاطباء شری پت تھا۔ جس نے اس کی جان بچا کر اپنے جتے کے لیے خاص مفادات حاصل کیے۔

مغل بادشاہ اگرچہ مذہب کے لحاظ سے مسلمان تھے لیکن کشمیر میں ان کی سیاسیات کا سارا انداز سامراجیوں کا جیسا تھا انھیں معلوم تھا کہ مسلمان آمرانہ اور جاگیرداروں نے ان کی بالادستی کی حمایت کی ہے اس لیے انھوں نے کشمیری پنڈتوں پر زیادہ انحصار کیا

اور سب سے پہلے کشمیریوں میں اختراق کا بیج اسی سیاست گری کی مصلحتوں کے مطابق بویا گیا۔ پنڈتوں کی سرپرستی کر کے مغل بادشاہوں نے ان کی اقلیتی گروہ MINORITY COMPLEX کو ابھارا اور انھیں دہلی کے مغزوں کی حیثیت سے بڑھا دیا۔ شروع کیا۔ چونکہ کشمیش مذہب کی بنیاد پر نہ تھی، سیاست کی بنیاد پر تھی۔ لہذا انھوں نے کشمیر میں اقتدار کے امیدواروں مسلمان آمر کو نچا دکھانے کے لیے کشمیری پنڈتوں کو اپنا حلیف بنالیا۔ اکبر بادشاہ بڑا دور اندیش اور معاملہ فہم بادشاہ تھا۔ اس نے پنڈتوں کے ہتھیاروں میں شرکت کی اور انھیں جاگیریں دیں۔ اس کے علاوہ اس نے ان کے جذبہ امتیاز کو تقویت بخشنے کے لیے آرتھ سٹ نامی پنڈت کو گمان کی مراد کی نگہداشت پر مقرر کیا۔ اس نے کمرانہ اور مرانہ شمالی و جنوبی کشمیر کے گورنر کشمیری پنڈت بنادے۔ جادو ناتھ سرکار جیسے لاگ مورخ لکھتا ہے کہ مغلوں کے زمانے میں بہت کم کشمیری مسلمان اعلیٰ عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کو جان بوجہ کہ امور سلطنت سے الگ رکھا جاتا تھا۔ مگر کشمیری پنڈت پر بہت اعتبار کیا جاتا تھا۔ تاکہ کشمیر کے بطن میں مغل سلطنت کا ایک قابلِ اعتبار پنجواں کا لم پیدا کیا جاسکے۔ مسلمان پر مغل فوج کے عہدے بند تھے۔ لیکن پنڈتوں پر رکھتے تھے۔ خاص طور کشمیر کے سرحدی مقامات میں جہاں صرف مسلمانوں کی آبادی تھی۔ کشمیری میرو پنڈت کو مکمل فوجانہ کی ذاتی محافظ فوج (BODY GUARD) کا نگران اعلیٰ بنا دیا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے جہلم کے قریب اس وقت کمال قابلیت سے چھانگیر کو مہابت خان کی امیری سے رہا کرایا جب مہابت خان نور جہاں سے خار کھا کر اس کے تخت و تاج کے درپے ہو گیا تھا۔ میرو پنڈت کو بعد میں کشمیر میں بڑی بڑی جاگیریں ملیں۔ پنڈتوں کی یہ بالادستی اور سنگت سبب جیسے بادشاہ نے بھی قائم رکھی۔ چنانچہ اس کے وقت

میں ہمیشہ شکر داس پنڈت کا تعظیمی اور انتہائی شہسری پنڈتوں نے فارسی اُسی وقت سے کچھ شروع کر دی تھی۔ جب سے وہ سلطان زین العابدین کے وقت میں اقتدار پر چھاپنے لگے تھے۔ پہلے پہل جن لوگوں نے فارسی کی طرف رجوع کیا ان کو "کارکن پنڈت" کہا جانے لگا اور انھیں حقارت سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ بڑے بڑے پنڈت "بھاشا" یعنی سنسکرت سے ہی لوگ گائے بیٹھے رہنے انھیں "باچہ پٹ" کہا جانے لگا۔ بہت جلد اس طبقے نے دیکھا کہ "کارکن" حکومت کے قُرب میں بھل بھول رہے ہیں اور افتدائی میدان میں ان کی شرافت کا مذاق اُٹا رہے ہیں۔ چنانچہ پھر انھوں نے بھی ڈبکی لگائی اور اس طرح درباری زبان فارسی میں مہارت حاصل کر لی۔ آدھ دہلی کے متعلوکی امور مملکت کی مصالحتیں ان کے آڑے آئیں اور اس طرح سے یہ لوگ دفعتوں پر چھانگے۔ یہ کشمیری پنڈتوں کی ذکر شامی کے آغاز و ارتقا کا سنگ میل ثابت ہوا۔

افغانوں کا دور کشمیر میں ظلم و ستم کے سیاہ دور میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن اُس وقت بھی کشمیری پنڈت اپنی لیاقت کے بل پر عوام انہاس سے کٹ کر ظالموں کی صفوں کے زیادہ نزدیک رہے۔ بلند خان صدوزئی نے لکھا کشاف در پنڈت کو اپنا وزیر اعظم بنایا اور حاجی کریم داد خان نے پنڈت دلال رام کو اپنا پیش کا مقرر کیا۔ اس دلال رام پنڈت کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس سے اس کی زیر کی اور حاضر جوانی کے ساتھ اُس کے طبقے کی موقع شناسی اور شیریں گفتاری کا پتہ بھی ملتا ہے۔ کابل کے حکمران تیمور شاہ قزاقی نے اُسے کابلی طلب کیا۔ پنڈت ماتھے پر قشقہ لگائے ہوئے اس کے دربار میں حاضر ہوا تو افغان حکمران نے پنڈت سے پھر دُکرتے ہوئے سوال کیا "ماتھے پر یہ قشقہ کیوں کینیا ہے؟" پنڈت نے بڑی نرمی سے جواب دیا "یہ قشقہ الف کی شکل کا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ جس کا کوئی شریک و ثانی نہیں

ہے۔" تیمور شاہ نے یہ برجستہ جواب سننا تو زچ ہو کر دوسرا سوال کیا "مگر پھر دوکانوں پر قشقہ کا نشان کیوں لگایا ہے؟" پنڈت نے بڑے اطمینان سے کہا "یہ دو گواہ ہیں جو شریعت کی رو سے اس بات کی شہادت کے لیے ضروری ہیں کہ میرا بیان صحیح ہے۔" تیمور شاہ کو یہ وار بھی خانی گیا تو اُس نے آخری توپ داغ دی۔ لیکن پھر حلق پر قشقہ کے اس نشان کا کیا مطلب ہے؟ "پنڈت دلال رام نے کسی لگت کے بغیر کہا "اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو میرے بیان پر شک ہو وہ اسی جگہ میرے حق پر تلوار چلائے۔"

افغان حکمران لا جواب ہو گیا تو پنڈت دلال رام نے یہ شعر چڑھا۔

بروجہ ام نظر کن و پیشا تہم بہ ہیں

دارغ غلامی شہید مولا ست برجیں

تیمور شاہ اس فصاحت سے ایسا خوش ہوا کہ اُس کا تہہ موتیوں سے بھر دیا اس سلسلے میں کشمیری پنڈتوں کی طبعی کا اندازہ اُس واقعہ سے بھی ہو جاتا ہے جب ایک مسلمان شاعر نے شمع کی تعریف میں یہ شعر کہا۔

سوز او در کعبہ و بیت خانہ یکساں دیدہ ام

من نیلا نم کہ مند ویا مسلمان است شمع

زیریک کشمیری پنڈت یہ کہاں تھے والا تھا۔ یہ استدلال کر کے شمع کو اپنا ہم مذہب بنالیا۔

قشقہ دارد برجیں و ناز دارد در گھو

صاف ہندوی تہاید کہ مسلمان است شمع

افغانوں کے زمانے کی ہی بات ہے کہ ایک کشمیری پنڈت نندرام کو کابل چلا گیا۔

وہاں اپنی لیاقت سے ایسا سرمایہ پیدا کر لیا کہ وہاں کے دربار کی جان بن گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے نام کے پیکر ڈھالے جس پر یہ مصرعہ کندہ تھا۔

”سبم از عبود و ضرب از نند رام“

اس نند رامی روپے کا چلن قبائلی علاقوں میں مسئلہ ایک جاری تھا۔ اسی زمانے میں ولیم مور کرانٹ کہتا ہے کہ اُسے کاہل سے کشمیر تک صرف کشمیری پنڈت حکومت پر چھائے نظر آئے۔ جیسا کہ کم کاہتا ہے کہ افغانستان کے وقت میں سیاسی طاقت کشمیری پنڈتوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ خوش تھے۔ صورت حال اس حد تک پہنچی کہ جب کشمیریوں کے ایک ہمدرد اور غم خوار افغان صوبیدار عطا محمد خاں نے جس نے شیخ نور الدین ریشی کے نام کا سکہ ڈھالا تھا، کاہل کے منظم سے تنگ آکر کشمیر میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور کشمیریوں کو انتظامیہ میں حصہ دینے لگا تو کشمیری پنڈت آمرانہ کاہل پیچھے اور اس کی سرکوبی کی درخواست کی۔ چنانچہ کاہل سے ایک بڑا لشکر آیا اور عطا محمد خاں کو کھل دیا۔

کشمیری پنڈتوں نے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھی کشمیر ملایا۔ اس کو ایک بار کشمیر کی ہم میں سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی مگر پنڈت تیرہ دنوں سے اسی جتنی پڑھائی کہ وہ کشمیر پر حملہ آور ہو گیا اور قابض بھی۔ کشمیر میں سکھوں کی حکومت کا زمانہ اپنے منظم کے لحاظ سے افغانستان سے بھی بازی لے گیا۔ مگر کشمیری پنڈت اس دوران بھی راج سنگھ اس کے قریب ہی رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کے مشہور درخاندان کا عروج اسی زمانے میں ہوا۔ اس دور میں کشمیری پنڈت بادشاہ گرد (KING MAKERS) بنے رہے۔ مہاندیجہ دوران کا خاص معتدا در کشمیر کا زبردست حاکم تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات پر سکھ حکومت کا شیرازہ

بکھر گیا تو کشمیری پنڈتوں نے انگریزوں اور گلاب سنگھ کے چڑھتے ہوئے سورج کی طرف رخ موڑ لیا۔ بیرلہ درپیلے ہی گلاب سنگھ کا دوست بن چکا تھا۔ گلاب سنگھ نے اس کے بیٹے راج کاک در کشمیر کا گورنر بنا دیا جس نے اپنی سختیوں سے دارغ شمال کی آمدنی چار لاکھ سے بارہ لاکھ روپے سالانہ تک پہنچا دی اور اسی کی میداد کے نتیجے میں زلزلہ میں موجود دنیا کی پہلی مزدور بغاوت ہوئی جہاں درجنوں شالاباغ ندی میں غرق کر دیئے گئے۔ گلاب سنگھ کے کشمیری پنڈتوں پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ اس نے ہندت مہاندیجہ کو درجنوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن جب ضلع میں انگریزوں نے مہاراجہ پر تاپ سنگھ کو مجبور کر کے کہ یہ یعنی کونسل بنادی تو ایک ممتاز کشمیری پنڈت مہاندیجہ کول در مشیر مال بنا دیئے گئے۔ اس زمانے میں بھی سرواٹر لارنس کے قول کے مطابق جو اس وقت کشمیر میں بندوبست اراضی کے کوشش تھے۔ ”ساری قوت برہمنوں کے جو کشمیری پنڈت کہلاتے ہیں، ہاتھ میں تھی۔ مسلمان کاشت کاروں کو برہمنوں کے آرام آسائش کے لیے بریگار پر مجبور کیا جا آتا۔“ پنڈت کا لفظ ہی حکمران کے مترادف تھا۔ چنانچہ دیہات میں اب بھی انھیں حاکم اور مہاراجہ (مہاراجہ کا مخفف ”رازہ“ در راجہ) کہہ کر پکارنے کا عادی رہا۔ مسلمان باہر نہیں ہوا۔ موجودہ صدی کی ابتدا سے ہی کشمیری پنڈت اپنی موقع شناسی کی بنا پر انگریزی تعلیم میں آگے رہے اور انتظامی عہدوں پر چھائے گئے۔ لیکن انھیں جلد ہی پنجاب سے آنے والے ہندو افسروں کا سامنا کرنا پڑا تو انھوں نے سٹیٹ بیکٹ کا لغو لگایا جس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست میں ملازمتوں پر ریاستی باشندوں کا حق فائق تسلیم کیا جائے۔ ریاستی باشندوں کا مطلب عملاً کشمیری پنڈتوں سے ہی تھا کیوں کہ وہی تعلیم میں آگے تھے۔ ادھر جنوں کے راجپوت ڈوگر سے مہاراجوں کی سرپرستی سے آگے بڑھ رہے

تھے۔ مہاراجہ پر تپ سنگھ کے آخری زمانے کی بات ہے ان دنوں اس کے خالق آزما بھتیجے ہری سنگھ کی اس کے ساتھ سیاسی آویزش چل رہی تھی۔ چنانچہ ہری سنگھ اور اس کے زیر اثر جموں کے چند عناصر نے کشمیری پنڈتوں کے ساتھ مل کر اس تحریک کو خوب اچھالا اور آخر کار یہ تحفظات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ بہت جلد مفادات کے چکر میں وہ خود اپنے اسی مہتما و مقصد کی مخالفت کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملا بیٹھ گئے۔

جب ۱۹۴۷ء میں کشمیر میں تحریک آزادی کا آغاز ہوا تو مہاراجہ کی انتظامیہ پر کشمیری پنڈتوں کا غلبہ تھا۔ سر جے بہادر سپرونی کے واسطے اس کے واسطے اور کیلاش نرائن کسمر کی مہاراجہ کے ساتھ کاڑھی چھٹی تھی۔ چنانچہ جب یہاں کے عوام نے اپنی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کی تو دو گروہ مہاراجوں نے کشمیری پنڈتوں کو اپنے مفادات کی ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور انہیں اس بات کی شہ دہی کہ دراصل یہ ہندو مہاراجہ کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت ہے۔ ایک پرانے کشمیری پنڈت راجہ ہری کرشن کو کو وزیر اعظم مقرر کر کے اس کے ہاتھوں ظلم و ستم کا دور روا رکھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر ایک عرصے تک کشمیری پنڈت جیسے روشن خیال لوگ اس جھانے میں رہے اور انھوں نے سارے ہندوستان کے ہندو پریس میں "کشمیری پنڈت خطرے میں" کا شور مچا کر ڈالا۔ مگر ہم بار بار انہیں یقین دلاتے رہے کہ یہ تحریک ہرگز غیر مسلموں یا کشمیری پنڈتوں کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ظالم و مظلوم کی لڑائی ہے۔ جہاں ظالموں میں غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی موجود ہیں وہاں مظلوموں کی صف میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اور کشمیری پنڈت بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کچھ معمولی سرکاری نوکیلاں

مسلمانوں کو بھی بیٹھے گئیں تو پنڈت صاحبان گھبرائے کہ اب ان کے رزق کا آخری ذوالہ بھی چھین جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف "روٹی ایکشن" کے نام سے ایک ہنگامہ کھڑا کر لیا لیکن جموں کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ جلد ہی ایک مذاق میں تبدیل ہو گیا۔ اور اپنی موت آپ مر گیا۔ انھوں نے مہاراجہ کو میورنڈم پیش کیا۔ اس میں کشمیری پنڈتوں کے لیے علاقہ کو لگام میں ایک الگ پنڈت وطن (REGION) بنانے کی مانگ بھی کی۔ آخر کار تاریخ کی منطق اس طبقے کے چند ترقی پسند نوجوانوں کو اپیل کرنے لگی۔ پنڈت پر سیم ناتھ بزاز نے گلشنی کشیش میں کہا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کشمیری پنڈتوں کی حالت بہت بہتر ہے۔ کیسٹپ بندھو، جیالال کھن اور دوسرے لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہونے لگے اور آخر کار مسلمان اور پنڈت فیڈروں کے مشترکہ دستخطوں سے وہ قومی منشور "NATIONAL DEMAND" والی دستاویز سامنے آئی جو نیشنل کانفرنس کے قیام کا پہلا پتھر ثابت ہوئی۔ جب مشورہ میں نیشنل کانفرنس کا دورہ ہوا تو کچھ عرصہ کے لیے پنڈت ہمارے کانڈے سے کانڈھا جاتے ہوئے آگے آئے لیکن انہیں جب یہ احساس ہونے لگا کہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ مظلوموں کی اکثریت کو ان کے حقوق ملیں گے اور موافق سے اس اکثریت میں مسلمانوں کا حصہ بڑا تھا تو انہیں اپنی طبقاتی برتری پر زبرد ہونے کا اندیشہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ طرح طرح کے بہانوں سے نیشنل کانفرنس سے الگ ہونے لگے اگرچہ اس کے باوجود بھی بعض روشن خیال اور دور اندیش پنڈت نوجوان نیشنل کانفرنس کے کام میں جوش و خروش سے شریک رہے لیکن سچ تو یہ ہے ان کی حیثیت طبقاتی سے زیادہ ذاتی اور انفرادی تھی۔ طبقاتی حیثیت سے تو وہ جوئی طور پر نیشنل کانفرنس اور تحریک آزادی کے بڑے دھارے سے کٹے ہی رہے۔

بھی نہ ہوگا۔ بہر کیف۔ یہ صورت حال اس وقت اپنی ستم نگر لافانہ انتہا کو پہنچ گئی جب جواہر لال نہرو ڈوگرہ مہاراجہ کی مخالفت اور کشمیری عوام کی حمایت کے لیے ۱۹۴۷ء میں کوہاڑ آئے۔ اس وقت جہاں مہاراجہ کی فوج سنگینوں سے اُن کا راستہ روک رہی تھی وہاں ان کو "واپس جاؤ گے نعرے سنائے والوں میں مولوی یوسف شاد کے پیرو، جنوں کے مہاسبجائی ہندو اور جواہر لال نہرو کے ہم نسب اور ہم گوشت کشمیری پنڈت بھی شامل تھے۔ انھیں کوئی احساس نہ تھا کہ اپنے خون اپنے آدرش اور اپنے وطن کا ساتھ دینے کی بجائے وہ ایک ریت کی دیوار اور ظلم کے پھندے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ شاید شاعر نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا۔

شراب سچ پر ڈالی، کباب خیشے میں

کشمیری پنڈتوں نے ایسی کردار کا مظاہرہ ۱۹۴۷ء میں بھی کیا۔ انھوں نے نیشنل کانفرنس اور اپنے نسب کی عظیم خاتون - اندرا گاندھی کی کانفرنس کا ساتھ دینے کی بجائے جتنا پارٹی کا ساتھ دیا، جس میں ایک طرف جن سنگھ کے عناصر شامل تھے اور دوسری طرف مولوی فاروق کے جکرے۔ بہر کیف۔ رام چند کاک کی فزغونیت جواہر لال کی کشمیر دوستی کے آگے ٹھک گئی۔ کشمیری صورت حال سے پٹا نہ لگایا۔ قبائلی تلاء اور چڑھ آئے۔ اپنے آپ کو پنڈتوں کا دھرم رکھنا کہنے والے مہاراجہ رات کی تاریکی میں ان بے چاروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر دم دیا اور جنوں بھاگ گئے۔ اُس وقت سلسلہ ملک میں انقلابیتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے ساتھ کھلم کھلا ہوا بمباری جاری تھی۔ لیکن کشمیریوں کی قومی روایات سامنے آئیں۔ نیشنل کانفرنسی قیادت کا نظریاتی استحکام اثرے آیا اور ہم نے سب سے پہلے کشمیری پنڈتوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی سلامتی کے لیے اقدامات کیے۔ ہم نے ان کے تیر تھو بھانپا پل

پنچانچہ خود جواہر لال نہرو کو کشمیری پنڈتوں کے گروہ - شمشیں ناٹھ - میں جا کر انھیں فہمائش کرنا پڑی اور انھیں مشورہ دینا پڑا کہ وہ ظالم و مغلوب کی اس جدوجہد میں ظالموں کے خلاف لگن کر آجائیں اور نیشنل کانفرنس کی مصفوں کو مضبوط بنائیں اس سلسلے میں ایک واقعہ دلچسپ ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ کشمیری پنڈت سماجی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ چھوٹ چھات سے پرہیز کریں۔ اُس وقت تو پنڈت خاموش رہے لیکن دوسرے روز جواہر لال کے پاس ایک وفد آیا اور ان سے کہا کہ انھوں نے سماجی سطح پر چھوٹ چھات کی جو بات کہی تھی وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے شاوی بیاہ میں ماشکی اور دوسرے مذہب پر مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جواہر لال نے ایک تمغہ لگا کر کہا کہ "جی ہاں ماشکی تو ہوتے ہیں۔ لیکن رسولی میں اور دسترخوان پر انھیں آنے کی اجازت نہیں۔"

پنڈت صاحبان نے نہرو جی کی یہ فہمائش تو اپنے روایتی اخلاق سے مٹی مگر پڑا لہ وہیں کا وہیں بیچے گا۔" کے مصداق مطلق العنان حکومت کی بیڑھی ٹھونکنے لگے۔ اتفاق سے ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ نے اپنے ایک ملازم رام چند کاک کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔ رام چند کاک صرف کشمیری پنڈت ہی نہ تھا۔ بلکہ کشمیری زبان بولنے والا بھی بس پھر کیا تھا تو کرشناسی کو دلو تا سمجھنے والے کشمیری پنڈت سمجھنے لگے کہ اب انہی کا راج ہے اور انہی کے ٹھانڈے ہیں۔ چنانچہ "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کی مخالفت میں مد علی جناح اور مسلم کانفرنس کے ساتھ کشمیری پنڈت بھی (چند محزناستثنیات کو چھوڑ کر جو انگریزی کہاوت کے مطابق تھے) کو بھی سچ ثابت کر دے ہیں) ہم آواز اور ہم آہنگ ہو گئے۔ یہ بات بڑی فکر انگیز ہے کہ کشمیر میں تحریک آزادی اور خاص طور پر کشمیر چھوڑ دو کے زمانے میں جتنے شہید پولیس اور فوج کی گولیوں سے جان بحق ہو گئے۔ ان میں شاید ایک آدھ کشمیری پنڈت

کی حفاظت کو اولین ترجیح دی۔ تو وہ مولہ سے جہاں راگینی دلوئی یا کھیر بھوئی کا مشہور استحقاق واقع ہے، قبائلیوں کے ڈر کی وجہ سے وہاں کے پنڈت، پجاری اور ہنست تک بھاگ گئے تھے۔ وہاں کے مسلمانوں نے استحقاق کی حفاظت اپنے متبرک مقام کی طرح کی۔ ایسی طرح ہم نے دوسرے مندروں اور تیرتھوں کی حفاظت کے لیے کڑے انتظامات کیے۔ چنانچہ ہماری فحویں میں کبھی پنڈت کا بالنگ بیکانہ ہوا۔ یہ اس قدر شاندار کارنامہ ہے کہ اس سے کشمیر کے اتحاد اور ایہماں کی ایک نئی جوت پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری آئندہ تسلیں اس پر فخر سے سداؤں پر کریں گی۔ جس وقت کشمیری پنڈتوں پر اہل اور قضا کی کشمیری لہراری تھیں اُس وقت یہاں مہاراجے یا ہندوستان کا کوئی سپاہی نہ تھا۔ صرف انھیں اپنے مسلم ہم وطنوں کی خیر سلاگی اور جذبہ محبت کی سپر بچائے ہوئے تھی۔ یہ معجزہ ایسا فرحت بخش تھا کہ برصغیر کے شعلوں کو دیکھنے والے مہاتما گاندھی کی جلتی ہوئی آنکھوں میں بھی اس سے ٹھنڈک پھڑپھڑی اور وہ بے ساختہ پکار اُٹھے تھے کشمیر سے روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔ ”روشنی کی اس کرن میں روشن کشمیر کی رواداری کی روایات نے ڈالا تھا۔ لیکن کشمیر کی پنڈتوں نے ازراہ فوارش اس کا سہارا میرے سر باندہ لیا۔ ان دنوں جب میں پنڈت علاقوں میں جا آتا تھا تو مجھے خاص طور پر سادہ و معصوم پنڈت عوامین کے اچھے لکھنؤوں پر شکر نگداری کا ایسا اثر دیکھنے کو ملتا جیسے میں اپنی حقیر خدمات کے نہایت ہی قیمتی انعامات میں شمار کرتا ہوں۔ کچھ پنڈت دوست تو یہاں تک غلو کر گئے کہ مجھے وشنو کا اوتار قرار دیتے گئے۔ جس نے اُن کی رکھشا کے لیے سستی سر کشمیر میں پتھر جنم لیا تھا۔

میں نے اگر کشمیری پنڈتوں کے لیے کچھ کیا تھا تو یہ کوئی اتارنے کی بات نہ تھی۔ یہ میرے قومی مزاج، ہماری تحریک کے آدرشوں اور خود میرے ذاتی کردار سے مطابقت

رکھتا تھا۔ میں نے ہی تو مسند کے فسادات میں ایک پنڈت خاتون کے مردہ جسم کو کوئی دن کے بعد ششان گھاٹ پہنچانے کے لیے جان و حکم میں ڈالی تھی اور میں نے ہی تو جناح صاحب سے تقسیم ملک سے بہت پہلے کہا تھا کہ کشمیر میں دو قومی نظریے کے لیے کوئی جگہ نہیں، مسلم لیگ ریاست سے باہر تو چاہے کرے۔ ریاستی عوام نیشنل کالجس کے پرچم کے اہم شیر و شکر رہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب مسئلہ میں ہم نے پرتاپ باغ سرینگر میں جناح صاحب کے خیر مقدم میں جلسہ منعقد کیا تو وہاں استقبالیہ جلسے میں سپاس نام پیش کرنے کے لیے ہمارے ایک پنڈت ساتھی کلرم صاحب کو بھی چنا گیا۔ مسئلہ کے بعد جب ہم نے کشمیر میں زرعی اصلاحات نافذ کیں تو بد قسمتی سے اُس کی زد میں جنوں کے راجپوتوں کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈت جاگیر دار بھی آئے۔ اس زد میں مسلم جاگیر دار اور چک دار بھی آئے۔ لیکن اپنی آبادی کے تناسب سے کشمیری پنڈتوں کو دربار میں قرب اور اپنی ”خدمات فائدہ“ کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی جاگیریں وغیرہ ملیں۔ لیکن یہ زانے کی منطق اور تاریک فتنوی تھا۔ اس میں کسی تعصب کا کوئی سوال نہ تھا۔ مگر کشمیری پنڈتوں نے اسے عقل و استدلال کی عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ذاتی مفادات اور عقبات تعصب کی ترازو سے ٹولا۔

اس مرحلہ پر بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کشمیری پنڈت ظلم و نا انصافی کے اس نظام کی بقا کے لیے بہت پہلے سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے مسئلہ میں جب کشمیر میں غریب کاشتکاروں کی حالت نازک چرچا برطانوی ہند میں ہونے لگا تو وہی کی حکومت کے مشورے سے کشمیر میں مشورہ گیت کو ہندو دست آزادی کے لیے سیلنٹ کشمیر بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن بڑی بڑی زمینیں اور جاگیریں پنڈتوں نے اپنی مصاحبت اور سرکار فواری کے عوض حاصل کر لی تھیں لہذا انھوں نے اس اچھے ارادوں والے

انگریز آفیسر کے خلاف ایسی مہم چلائی کہ اُسے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر مستعفی ہو کر جانا پڑا اور اس طرح کشمیری پنڈتوں کے خصوصی مفادات پر آئی ہوئی بلائی گئی۔ ان کی شکایات میں چونکہ وزن نہ تھا اور اُن کے استدلال میں کاٹ نہ تھی اس لیے وہ حکم کھلا بحث و مباحثہ کے بدلے کا ناجسوسی اور کھسکسہ کی مہم چلانے لگے۔ دہلی میں جا کر انھوں نے اپنے ہندو مذہب کی دہائی دینا شروع کر دی۔ حالانکہ اُن کے اسلاف نے اپنی کشمیری نوازی کے اختصار میں اپنے لیے سرکاری فرمان کے وزن سے "کشمیری پنڈت" کی امتیازی لکیر کھنچوا دی تھی۔ انھوں نے دہلی کے فرقہ پرست ذہنیت کے چند طاقتور حلقوں کو اُٹھانے کے لیے ہمارے خلاف مروت بھی نہیں کہا کہ ہم فرقہ پرست ہیں بلکہ تحریک حریت کے آغاز کے وقت تراشا ہوا یہ الزام پھر تازہ کر دیا کہ ہم اشتراکی بانٹو یک اور روسی ایجنٹ ہیں۔ وہ کشمیر کو بھول گئے اور فرقہ داری کے پیمانے سے معاملات کو جانچنے لگے۔ بد قسمتی سے دہلی کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی۔ جن کے دل اسی سم اور تالی پر دھکتے تھے۔ چنانچہ کشمیر سے کر دی ہوئی ایک اکھنڈ پاٹھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کشمیری پنڈت پھر مغلوں کے زمانے کی طرح اپنے عوام سے کٹ کر کسی اور کے اشارے پر ناپچنے لگے۔ در قید کے ایک اور چشمہ چراغ درگا پرشاد در نے اپنے بزرگوں کی روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے کارِ خاص میں مہارت حاصل کر لی اور وہ کشمیر کی عوامی تحریک کے جگہ میں خنجر کی طرح پیوست کر دیئے گئے۔ ۱۹۴۷ء کے ایلے میں اس کھسکسہ کا بھی ایک عنصر شامل رہا۔ وہ یہ بھول گئے کہ پاکستان کے ساتھ ساتھ باز کا الزام جس شیخ محمد عبداللہ پر عائد کیا جاتا ہے وہ جب ۱۹۴۷ء کو گھر گھر میں گردش ہوا تو اس کی پارٹی مروت میں کشمیری پنڈت افسروں پر مشتمل تھی لیکن مجھے یہ

اعلیٰ تان حاصل رہا کہ ہمارے ساتھ پنڈت کیشپ بندو اور جاگی ناتھ لکرو نے ہندو کچھ سال جیل میں گزار دیئے اگرچہ ہمیں ان کی غالب اکثریت امریکی، پاکستانی اور صینی ایجنٹ کہہ کر کڑکارتی تھی۔

کشمیری پنڈت ہندوستان میں پچھلے زمانے سے ہی اپنی قلمیت کی دھاک بٹھاتے آئے تھے۔ کشمیری شاعر ملحق دکن گیا تو وہاں کاراج کوئی بن گیا۔ رتن ناتھ مرشد برج خزانہ چلیکست، سر تیج بہادر سپرو پنڈت متونی لال نہرو اور میسون کشمیری پنڈتوں کے تذکرے کے بغیر ہندوستان کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آج بھی سارا ملک اُن کی قلمیتوں کی جولانہ گاہ ہے۔ انھیں ہماری وزارت خارجہ مرکزی سرکاری فوج اور دوسری اہم سرویسوں، پرائیویٹ کمپنیوں اور پریس میں اہم مقام حاصل ہے اور یہ ہندوستان کے شہر لوگوں کی حیثیت سے اُن کا حق ہے۔ دہلی اوزمخوں میں انھوں نے اپنی باؤسنگ کو نویاں اور مٹھا آباد کیے ہیں۔ بہت سے کشمیری پنڈتوں کے قوسرنگز بھون اور دہلی میں بیک وقت مکانات ہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ اپنی بلاوری سے باہر رشتے طے نہ کرتے تھے مگر اب وہ غیر باسیوں کے ساتھ سمبندہ قائم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ اُن کے سارے ملک میں تعلقات ہیں اور رستوخ ہے اور ہم کشمیریوں کو اُن کے کارناموں پر فخر ہے کشمیر میں جمہوری نظام کی بکوتوں کے لحاظ سے آزادی کے شراب اُن بھلون اور جاتیوں میں بھی تقسیم کیے جا رہے ہیں جو تاریخ کی اندھی منطق کے سبب پیچھے رہ گئے تھے۔ چنانچہ اُن میں کشمیر کے دیہاتیوں کے علاوہ گوجر، بکروال، جموں کنڈی میں بسنے والے بزمین اور لداخ اور کرگل کے پسپا ماندہ باشندے وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ کشمیری پنڈت صلاح جان کو پہلے خاص حالات کی وجہ سے ان معاملات میں اگر اجارہ نہیں تو بھی غلبہ حاصل

کشمیری پنڈت اقتدار کی چوبیسوں پر گندیں ڈالے ہوئے ہیں ان کی رسائی کشمیریوں کے لیے فیض و برکت کا سرچشمہ بننا چاہیے بغض و شرارت کا ذریعہ نہیں۔ ملک کے بڑے دھارے میں ان کی ممتاز حیثیت اس قدر نمایاں ہے کہ چند ہی سال پہلے ایک وقت وہ تقریباً سارے اہم مناصب پر فائز تھے۔ کشمیر کے چھوٹے دائرے میں بھی انھیں کشمیریوں نے محبت، شفقت اور پیار دیا ہے اور اپنے جذبات کی صداقت اور سنگینی کا مظاہرہ انتہائی آزمائش کے وقت بھی کیا ہے انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کو ظالموں کے روپ میں دیکھ کر ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ لیکن قدرت کسی متوازن نظام میں اونچ نیچ کے خلاف ہے۔ ریاست میں وہ اونچ نیچ کی فضا جو صدیوں کی غلامی کا نتیجہ ہے، تیزی سے ہوا بہہ رہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے باوجود کشمیری پنڈت اپنی خوبیوں کی وجہ سے آگے آگے رہیں گے۔ کشمیر کے گلدستے کا روپ کشمیری پنڈت کے لالہ احمد جیسے چہرے کی رنگت، اور اس کی ہتھ پتھن کی ہلک کے بغیر ادھر رہا ہے لیکن اُسے بھی جاگیر داری تصورات کی سطح سے اٹھ کر آگے آنا ہو گا۔ ان کی سوچ کا محور ہمیشہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں رہی ہیں اور انھیں حکمرانوں کی خدمت اور جاسوسی — میں سکون ملتا ہے۔ نئی جمہوری بالادی ہڈی کارکن نہیں بلکہ برابر سے بھی ایک آئینہ زیادہ کے شریک و شام ہیں۔ ان میں اتنی دلچ اور دلچ فہم و موجود ہے کہ وہ اپنے آپ کو نئے قعاتوں کے قالب میں ڈھال کر اپنی امتیازی شان برقرار رکھیں انھیں صرف بات کا پیشگو بنا کر یہاں دلی کے جاسوسوں اور کشمیریوں کے پانچویں کالم کاروں، جو وہ برسہا برس سے ادا کرتے ہیں، چھوڑ کر اپنے دوسری کشمیری بھائیوں کے دکھ درد کا ہمدم اور ہم درد بننا چاہیے۔ جنھوں

تھا۔ اس لیے انھیں صورت حال سے کوفت ہو رہی ہے۔ لیکن واقعات گواہ ہیں کہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ اب بھی ریاست کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اپنی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ موجود اور مقرر ہیں۔ اور تو اور جنوں کے کچھ باشندے وہاں ان کی بالادستی پر ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سارے ملک میں جتنی ان کی مانگ اور کھپت ہے ریاست کے کسی دوسرے طبقے کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ تیسرے ریاست میں جتنی کمزوری و فتنہ ہیں ان میں جو تقریریں ہوتی ہیں ان میں کشمیری پنڈتوں کا تناسب ساتھ سے سنو فی صد تک ہے حالانکہ ان کی آبادی کا اوسط دو ڈھائی فیصد سے زیادہ تک نہیں پہنچتا۔ ان حالات میں اگر کشمیری پنڈت صاحبان اپنے بلا شک و شبہ بے اندازہ ذرائع اور ملک گیر اثر و رسوخ اور خاص طور پر صحافتی حلقوں میں اپنے اثر و نفوذ سے طوفان بپا کرتے رہتے ہیں تو ان کے باقی برادران وطن کو اس پر جائز طور پر غلہ ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ واقعات کی منطق کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے جم و طوں کی اکثریت اپنی ریاست کے جغرافیائی مفادات کے تقاضوں اور اس کی ہمیت و ترمیمی کی مصلحتوں پر بھی نظر رکھیں اور صرف دلی کے ایوانوں میں جاگزیں نوکر شاہی کو ہی اپنا قید و کعبہ تصور نہ کریں۔ کشمیری پنڈت ریاست کو اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں اور باقی ملک کے ساتھ اس کے جذباتی رشتوں کو کمزور بنانے کی بجائے ان کے درمیان ایک مضبوطی کا کام کر سکتے ہیں۔ کشمیریوں نے دو قومی نظریے کو مشکوک اپنے کشمیری پنڈت بھائیوں کا ہاتھ تمام لیا تھا۔ ان پر تاریخ نے یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو نہ جھٹکیں جس طرح وہ خود ظلم اور نا انصافی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے دوسرے ہم وطن بھی ظلم و نا انصافی سے ناال ہیں۔ جو ہر کمال اور انداز کا مذہبی ملک میں جہاں

تے فرقہ وارانہ برادری کے لیے خود اپنے ہم مذہبوں کا جگر داری سے مقابلہ کیا۔
مولانا رومی کے اس شعر کا مخاطب شاید وہی ہیں۔ ع۔

تو برائے وصل کردن، آمدی

نے برائے فصل کردن، آمدی



محمد یونس نینگ شیخ مائیب کو مستودہ دکھا رہے ہیں۔



مشیر کمر شیر شاخ محمد عبداللہ کی ایک یادگار تصویر۔



مشیر کمر شیر شاخ محمد عبداللہ کی ایک یادگار تصویر۔

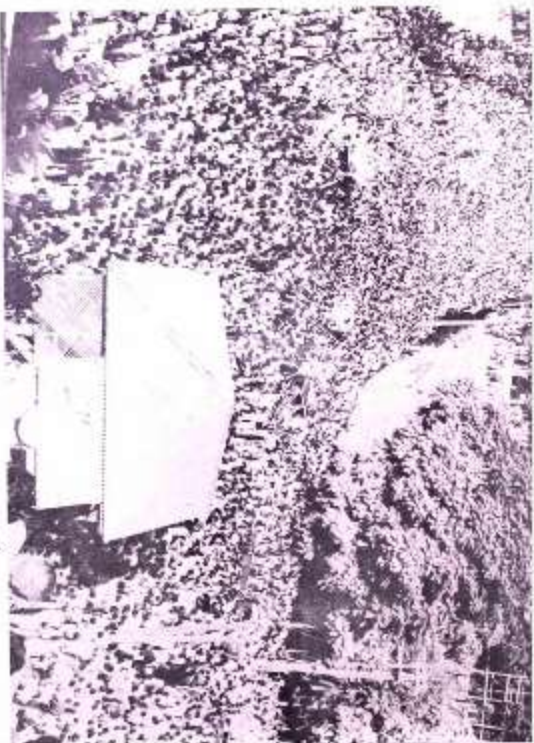


نخواب ابدی :
ہزاروں سال نگہ اپنی بے فوری پہ روئی



صورت چہرہ شہر خیر کا جسم ناک پر پھل نچل کر رہے ہو

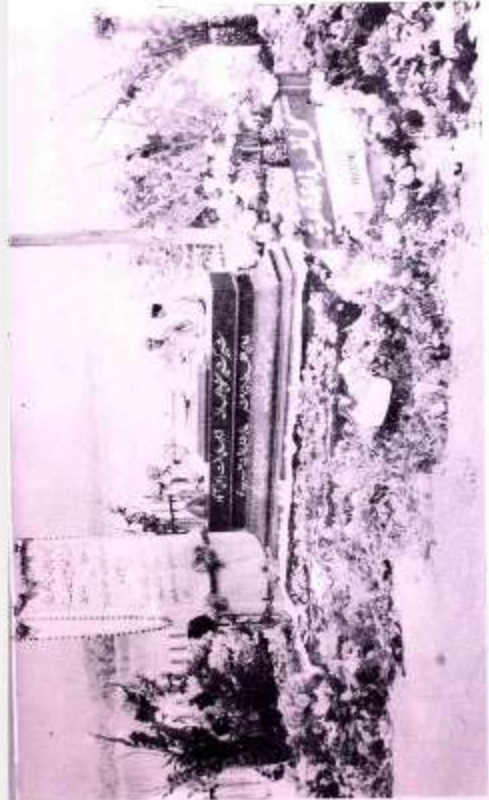
صدر، جنوریہ گیانی، ذریعہ سنگھ، شیشہ کشیہ کو غزنیج عقیدت ادا کرتے ہوئے۔



قوارخ کشیہ، کھسب سے بڑا المیہ،
شیشہ کشیہ کے ہاتھ میں دیں دیا گئے گھوڑوں سے نئے عین شکر باالودہ ہو گئے۔

ضمیمہ جات

- (۱) قومیتوں کا حق خود ارادیت
 (ب) کشمیر جدید کی جانب
 (ج) پیغام اور پروگرام
 (د) میرا پیغام اور ہے.....



پاکستان کا پہلا شاہ:
 نبی اکرم ﷺ کی قبرستان کے کنارے مزار کا منظر

قومیتوں کا حق خود ارادیت

آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس ہندوستان کے موجودہ سیاسی آئین کے جوہر کو مستقبل کے لیے ایک خطرہ عظیم تصور کرتی ہے۔ چونکہ مستقبل حال کے حالات سے بدتر حالات کا حامل ہوتا ہے۔ زمانہ بعد از جنگ کی ٹوکنا رفتاری اور سیاسی تباہی سے جس سے ہندوستان کو لامحالہ دوچار ہونا پڑے گا۔ ہم تجویز آگاہ ہیں۔ سیاست جموں و کشمیر کے لوگوں کی غلامی کا مسئلہ باقی ہندوستانی باشندوں کی غلامی سے وابستہ ہے۔ اس لیے ہم اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ جب کہ انٹرنیشنل کانگریس ہندوستان کو آزاد کرتے ہوئے اپنے مقصد مکمل آزادی کے نزدیک پہنچائے گی اور غیر ملکی حاکمیت کی وجہ سے پیدا شدہ مصائب کا خاتمہ کرے گی جن کا سامنا عوام کو کشمیر کے طور پر کرنا پڑا ہے۔ آج کروڑوں امن پسند انسان جن کو ملوکیت کی جنگ کی ہولناکیوں نے تباہ کر رکھا ہے۔ دنیا میں امن و آزادی کے سورج کے طلوع کے منتظر ہیں۔

آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس اس رائے کو دہراتی ہے کہ صرف چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی آزادی سے ہی دنیا میں مستقبل اور ابدی امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ اسی کوئی کمیٹی جس میں آزاد ہندوستان کے قومی نمائندے شامل

نہ ہوں۔ بین الاقوامی نمائندہ کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ بہر حال ہمارا چہرہ یقین ہے کہ غیر متحده لوگوں کو آزادی ایک ناگہانی عطیہ کے طور پر نہیں مل سکتی اس کو اتحادی تدابیر اور محنت سے حاصل کرنا ہو گا۔ آج تک ہندوستان میں قومی اتحاد کے بارے میں متعدد مرتبہ کوشش کی گئی۔ لیکن وہ سب کی سب ناکام ثابت ہوئیں۔ شملہ کانفرنس کے عالیہ واقعات نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں متحد ہو کر ہی طاقت حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی قوموں کو متحد کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری انڈین نیشنل کانگریس کے فرائض میں شامل ہے جس کی روایات ہندوستانی سیاست میں مشعل نمائی کر رہی ہے۔ لازم ہے کہ ہم لوگ اپنے ماضی کے تجربات کی مدوشی میں یہ توقع باندھ لیں کہ مستقبل کا لائحہ عمل تلاش کرنے کے لیے کانگریس وہ پالیسی اختیار کرے گی جو ایک مشعل راہ ثابت ہوگی۔ ماضی کے تجربات نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اقوام خصوصاً مسلمانوں اور اقلیات کا اعتماد محض رعایات کا اعلان کرنے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اس سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعاون حاصل کیا ہے۔ ہم یعنی نیشنل کانفرنس اپنے دوستانہ تعلقات کی بنا پر انڈین نیشنل کانگریس کو یہ کہنے کی جرأت کرتی ہے کہ وہ اپنی پالیسی پر دوبارہ غور کرے اس سوال پر چھان بین کرنے کے جذبہ کے تحت نئے سرے سے غور کرے کہ مسلمان باوجود آزادی کے غیر متزلزل خواہش رکھنے کے اور باوجود اس کے کہ برگزیدہ مسلمان شخصیتیں کانگریس کے اندر موجود تھیں۔ اور ہیں من حیثیت القوم کانگریس سے کیوں کر علیحدہ ہیں نیز ہم کانگریس کو مشورہ دیتے